زمین کے آنسو
نگہت سیما

پیش لفظ

''زمین کے آنسو'' یہ ناول ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ میں قسط وار چھپا۔ اپنے کئی دوسرے ناولوں کی طرح میں نے معاشرے میں سے کچھ Issues کو لیا اوران پر اپنی کہانی کا تانا بانا بُنا۔ یہ ایک تخیلاتی کہانی ہے۔ تمام کردار فرضی ہیں لیکن وہ اُنہی حالات و واقعات سے گذرتے ہیں جن سے آج کل ہم دوچار ہیں میں نے اس کہانی میں ایک نئی تکنیک استعمال کی ہے۔ کہانی کے اندر کہانی اور ناول کا ہیرو ایک نئی کہانی لکھ رہا ہے اس دوسری کہانی کا راوی ایک شاعر ہے اور حُور عین وہ لڑکی ہے جو اُسے ایک وادی میں ملتی ہے اور جسے تاریخ سے بہت دلچسپی ہے وہ باتوں باتوں میں اپنے المیے کے ساتھ تاریخ کے المیوں کا بھی ذکر کرتی ہے۔ یہ المیہ ہابیل کے قتل سے شروع ہوتا ہے۔ اوراپنے وطن کی سرزمین پر ملنے والی بوری بند لاشوں پر ختم ہوتا ہے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ ہماری نئی نسل کے دل میں اپنی تاریخ جاننے کا شوق پیدا ہو۔ ایک اُستاد ہونے کے ناطے میں جانتی ہوں کہ ہمارے آج کے بچے نہیں جانتے محمد بن قاسم کون تھا، موسیٰ بن نصیر نے تاریخ میں کیا کردار ادا کیا ہے ۔ قرطبہ اور غرناطہ سے ہمارا کیا ناطہ ہے۔ سقوط بغداد کیا ہے، بخت خان بہادر یار جنگ، ٹیپو سلطان، حیدر علی سب کون تھے۔ میں پاپولر فکشن لکھتے ہوئے پوری تاریخ بیان نہیں کرسکتی تھی میں نے صرف یہ کوشش کی ہے کہ ہماری نئی نسل تاریخ کے ان اہم کرداروں کے ناموں سے آشنا ہو جائے اُن کے اندر تجسس پیدا ہو اور شاید وہ تاریخ کے اوراق کھنگالیں اور جان سکیں کہ ہمارا ماضی کتنا شاندار اور تابناک تھا۔ لیکن ہماری غلطیوں نے اسے المناک بنا دیا، اور ہم نے اپنی غلطیوں سے کچھ نہیں سیکھا۔ سو شعوری کوشش سے میں نے یہ تکنیک استعمال کر کے تاریخ کے ان اوراق کا ذکر کیا۔ امید ہے میرے دوسرے ناولوں کی طرح آپ اسے بھی پسند کریں گے۔

میں محترم طارق اسماعیل ساگر صاحب کی ممنون ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ کی طرح میرا مان رکھا اور ''زمین کے آنسو'' کے لئے کچھ لکھا......... میں اپنے قارئین کی بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے ہر قسط کے بعد اپنی پسندیدگی اور تبصرے سے حوصلہ بڑھایا۔

دعاؤں کی طالب

نگہت سیما

''میں نے اسے روتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ گھٹنوں کو چھوتے ہوئے...... اور اس کی اوڑھنی اس کے دائیں کندھے پر جھول رہی تھی، جس کا ایک سرا اس کے دائیں پاؤں کو چھو رہا تھا اور اس کی بے انتہا خوب صورت آنکھوں سے آنسو اتنی آہستگی سے بہہ رہے تھے، جیسے کوئی سبک خرام ندی دھیمے دھیمے ایک تواتر سے بہے۔ اس کے رخساروں پر، کنپٹی کے پاس، ناک کے قریب اِدھر اُدھر آنسوؤں کے نشان تھے، جیسے وہ ابھی روتے روتے چپ ہوئی ہو اور آنسوؤں کے نشان اس کے رخساروں پر رہ گئے ہوں۔ یوں جیسے کوئی ننھا بچہ اپنی میلی مٹھیوں سے اپنے آنسو پونچھے اور آنکھوں سے بہہ کر آنے والے سرمے یا کاجل کی وجہ سے رخساروں پر ملگجے سے نشان رہ جائیں۔

نہ جانے وہ کب روتے روتے چپ ہوئی تھی اور جانے کب اس نے پھر رونا شروع کیا تھا...... آنسو تواتر سے اس کے میلے ملگجے رخساروں پر بہہ رہے تھے لیکن میرا دھیان اس کے آنسوؤں کی طرف نہیں تھا۔ میں تو صرف اس کی آنکھیں دیکھ رہا تھا۔ اتنی حسین...... اتنی نشیلی آنکھیں...... شاید ساری دنیا کی عورتوں کی آنکھوں سے زیادہ حسین۔ اور پتہ نہیں کیوں میرے کانوں میں قاآنی کا قصیدہ گونج رہا تھا۔ قاآنی کا یہ قصیدہ مجھے ہمیشہ سے ہی پسند تھا۔ حالانکہ اس قصیدے کا اس کے آنسوؤں سے تو کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ تو کسی خوب صورت منظر کا بیان تھا لیکن شاید کوئی تعلق تھا......

بنفشہ رستہ از زمین زطرف جوئبارہا

وہا گستہ حورعین زلف خویش تازہا

(ندی کے کناروں پر بنفشہ اُگا ہوا ہے یا خوب صورت آنکھوں والی حور نے اپنی زلفیں بکھیر دی ہیں)

''حورعین!''

میرے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔

حورعین...... خوب صورت آنکھوں والی حور۔

ہاں! شاید میں یہی یاد کر رہا تھا۔ یہی تعلق تھا اس قصیدے کا اس سے۔

میں بے ساختہ ایک قدم اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس نے چونک کر ایک ناراض نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ شاید اس کے ذہن میں فرق پڑا تھا، پھر وہ یوں ہی ناراضی سے مجھے دیکھتے ہوئے چلی گئی۔ اس کی اوڑھنی اس کے پاؤں میں اُلجھ رہی تھی۔

''حورعین!''

میں اُس کے پیچھے لپکا اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔''

ہمدان مصطفیٰ نے قہقہہ لگایا۔

جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے ایبک فلک شاہ نے ایک لاپروا نظر اُس پر ڈالی اور اسی بے نیازی سے حاضرین مجلس کی طرف توجہ دیئے بغیر دوبارہ بولا۔

''ہاں...... لیکن اس سے پہلے اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور کہا تھا......

''میں......حورعین نہیں، زمین ہوں۔ زمین، دھرتی......زمین.....''
عاشی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی بے ساختہ ہنسی کو روکا۔
زمین...... یعنی آسمان کی اپوزٹ (متضاد)......مگر زمین تو اتنی خوب صورت نہیں ہوتی مونی آپا! اور وہ بھلا کوئی
انسان ہوتی ہے کہ روئے؟ اور پھر یہ زمین...... یہ ہماری زمین...... کتنی گندی ہے۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر، کچرا، الا بلا
سب کچھ تو لوگ اس پر پھینکتے ہیں۔''
اس نے منیبہ شاہ کے کانوں میں سرگوشی کی اور اسی طرح اتنی ہی مدھم آواز میں رابیل نے اریب فاطمہ کے کان
میں کہا۔

''یہ اس کا پرانا طریقہ ہے۔ یوں ہی سسپنس کری ایٹ کر کے سب کو اپنی طرف متوجہ کرنا۔''
''مگر کیا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایسے کسی ڈرامے کی ضرورت ہے؟ وہ تو خود ہی سب کی توجہ کھینچ لیتا
ہے۔'' اریب فاطمہ نے چوری چوری دیکھا۔ اپنے رف حلیے میں بھی وہ سب سے منفرد اور شان دار لگ رہا تھا۔
''کیا یہ کسی نئی کہانی کا پلاٹ ہے؟'' عمر احسان نے اس کی طرف مٹھی بھر چلغوزے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
''نئی کہانی.....'' اُس کی آنکھیں یکا یک چمک اُٹھیں۔
''اس کی آنکھیں کتنی لو دیتی ہیں۔'' اریب فاطمہ نے پھر چپکے چپکے اسے دیکھا۔
''ہاں! نئی کہانی کا پلاٹ تو نہیں، آغاز ضرور ہو سکتا ہے۔'' اس کے اندر جیسے لفظ بننے اور بگڑنے لگے۔
''حورعین کے آنسو......نہیں، زمین کے آنسو......'' عنوان خود بخود ہی تشکیل پا گیا تھا۔
''تھینکس عمر!'' اس نے مٹھی میں دبے چلغوزے منہ میں ڈالے۔
''اور یہ عمر.....'' رابیل نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ''اسے پتہ نہیں کیا شوق ہے، اس ایک
فلک شاہ کی خدمتیں کرنے کا۔ اور یہ جو اتنی دیر سے چلغوزے چھیل چھیل کر مٹھی میں رکھ رہا تھا، یہ اس ڈرامے باز ایک شاہ
کے لئے تھے۔ حالانکہ اس گھونچو کو پتہ بھی ہے کہ مجھے یعنی اس کی پیاری آپی رابیل احسان کو چلغوزے چھیلنے سے کتنی کوفت
ہوتی ہے۔ جبکہ چلغوزے مجھے بہت پسند ہیں۔''
اس نے آدھی بات سوچی تھی اور آدھی منیبہ شاہ کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے اس کے کان میں انڈیلی تھی اور پھر
پتہ نہیں اس کی سماعتیں ہی اتنی تیز تھیں یا پھر وہ کوئی جادوگر تھا، دلوں کا بھید جاننے والا کہ اس نے باقی بچے ہوئے
چلغوزے جھک کر رابیل کا ہاتھ پکڑ کر اس کی مٹھی میں منتقل کر دیئے۔
''یہ لیجئے رابیل جی! اتنی محنت سے چھیلے گئے ان چلغوزوں پر آپ کا بھی تو حق بنتا ہے کچھ۔ آخر آپ کے پیارے
بھائی نے چھیلے ہیں۔''
اور رابیل کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔
''میں خیرات نہیں لیتی۔'' اس نے ایبک کا ہاتھ جھٹک کر چلغوزے کارپٹ پر پھینکے اور کھڑے ہوتے ہوئے ایک
حقارت بھری نظر ایبک فلک شاہ پر ڈالی پھر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔
ایبک نے نہ سمجھنے والے انداز میں کندھے اچکائے تو عمر نے خجالت سے ایبک شاہ کو دیکھا۔
''یہ رابی آپی بھی یوں ہی کبھی کبھی بلاوجہ......''
باقی کا جملہ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر چپ ہو گیا تھا۔ حالانکہ یہ بات تو سب ہی جانتے تھے کہ رابیل احسان کبھی کبھی
نہیں بلکہ ہمیشہ ہی ایبک فلک شاہ کو دیکھ کر ایسا ہی کوئی نہ کوئی ردِعمل ظاہر کرتی ہے۔ پتہ نہیں اسے ایبک کی کس بات سے
چڑ تھی۔ اس کی شاندار شخصیت سے، اس کی بے نیازی سے، اس کی ذہانت اور شہرت سے، یا پھر اس کا عمارہ پھپھو کا بیٹا
ہونا۔ عمارہ پھپھو، جن سے بیگم احسان کی کبھی نہیں بنی تھی اور شاید وہی نفرت جو انہیں عمارہ پھپھو سے تھی، انہوں نے اپنی

لاڈلی بیٹی میں بھی منتقل کر دی تھی۔
'پتہ نہیں، چچی جان کو عمارہ پھپھو سے اتنی چڑ کیوں تھی کہ انہوں نے ہمیشہ ہی ان کا ذکر بڑی نفرت اور حقارت سے کیا تھا' منیبہ شاہ نے ایک نظر ایبک شاہ کو دیکھتے ہوئے سوچا، جو عاشی کو کارپٹ پر گرے چلغوزے چن چن کر دے رہا تھا اور وہ منہ میں ڈالتی جا رہی تھی۔ ایبک، ہمدان مصطفیٰ سے پوچھنے لگا۔
''تو پھر آج رات پروفیسر صاحب کے ہاں چل رہے ہو؟''
''آج رات؟'' ہمدان مصطفیٰ نے لحہ بھر سوچا اور پھر پوچھا۔ ''تو کیا آج رات تم یہاں ''الریان'' میں رکو گے؟''
''ہاں۔ اگر تمہارا رات کا پروگرام ہو، جانے کا تو رک جاتا ہوں۔ ورنہ چلوں گا۔''
وہ ہمدان مصطفیٰ سے ہم کلام تھا، جبکہ اریب فاطمہ نے کئی بار نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔
''شاید آج رات میں نہ جاسکوں گا۔ بلکہ یقیناً نہیں۔''
ہمدان مصطفیٰ کو اچانک یاد آیا کہ آج رات تو رابیل احسان کی سالگرہ میں سب نے باہر ڈنر کرنا تھا اور یہ ''الریان'' کی پرانی روایت تھی کہ سب کے یوم پیدائش پر بابا جان کی طرف سے ایک زبردست سا ڈنر ہوتا تھا لیکن کچھ عرصہ سے اس روایت میں اتنی تبدیلی آئی تھی کہ اب یہ کھانا باہر کھایا جاتا تھا۔
''تم بھی چلو نا ایبک!'' منیبہ شاہ کو اخلاق نبھانے آتے تھے۔
''میں؟'' وہ مسکرایا اور مڑ کر منیبہ شاہ کی طرف جتاتی نظروں سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو، کیا تم رابیل احسان کو نہیں جانتیں؟ اور منیبہ اُس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر یک دم بولی۔
''یہ ڈنر تو بابا جان کی طرف سے ہے اور ''الریان'' میں جب بھی کسی کا برتھ ڈے ہو تو بابا جان ہی ڈنر دیتے ہیں۔''
اسے ''الریان'' میں آتے دن ہی کتنے ہوئے تھے سو منیبہ نے اسے بتانا ضروری سمجھا۔ وہ یہاں کی بہت سی باتوں سے لاعلم تھا اور عموماً منیبہ ہی اسے اطلاعات فراہم کیا کرتی تھی۔
''اوہ ہاں! بابا جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' اسے یاد آیا کہ پچھلی بار جب وہ آیا تھا تو بابا جان کی طبیعت خراب تھی۔
''اب تو ٹھیک ہیں۔'' جواب عمر نے دیا۔ ''پاپا کے ساتھ کسی کے ہاں تعزیت کے لئے گئے ہیں۔''
''اوکے......تو پھر میں چلتا ہوں۔''
وہ اس گھر میں صرف انہی کی خاطر تو آتا تھا۔ صرف ان سے ملنے، انہیں دیکھنے کہ یہ اس کی ماں کی خواہش تھی۔ وہ جب بھی لاہور آتا، اماں اپنی آنکھیں جیسے اس کے ہمراہ کر دیتی تھی اور وہ ان کی آنکھوں سے بابا جان کو دیکھتا تھا اور جب واپس بہاول پور جاتا تو ان کی نظریں بار بار اس کے چہرے کا طواف کرتی تھیں۔ شاید انہیں تسلی ہوتی تھی کہ انہوں نے نہیں تو ان کے بیٹے نے تو انہیں دیکھا ہے۔
پہلی بار وہ ہمدان مصطفیٰ کے ساتھ آیا تھا۔ اس گھر میں ہمدان مصطفیٰ ہی وہ واحد شخص تھا جو کبھی کبھار بہاول پور ان سے ملنے آتا تھا اور پچیس سال کی عمر تک اس نے سوائے ہمدان مصطفیٰ کے اپنے کسی ننھیالی رشتہ دار کو نہیں دیکھا تھا۔
وہ جانتا تھا کہ ''الریان'' میں رہنے والے سب افراد کی رائے اس کے متعلق مختلف ہے۔ کچھ اسے پسند کرتے ہیں اور کچھ ناپسند۔ لیکن اپنی ناپسندیدگی کا اظہار رابیل احسان کے سوا کسی نے نہیں کیا تھا۔ اسے رابیل احسان کی اس واضح ناپسندیدگی کی وجہ کبھی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اس نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ اس کے پاس کرنے کو اور بہت کام تھے۔
''پھر کب آؤ گے؟'' ہمدان مصطفیٰ ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔
''پتہ نہیں، کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اگر وقت ملا تو جانے سے پہلے بابا جان سے ملنے آؤں گا۔''
''ایبک بھائی! آپ کتنے دن یہاں ٹھہریں گے؟'' عمر احسان اسے بہت پسند کرتا تھا۔

''شاید تین، چار روز۔''

''تو پھر آپ ادھر ہی کیوں نہیں رہ جاتے؟''

''نہیں یار!'' ایبک نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ ''مجھے کچھ کام ہیں۔''

''تو کیا میں آپ سے ملنے آ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں یار!''

''آپ وہیں ٹھہریں گے نا، کرنل شیر دل کے گھر؟''

ایبک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ آپ کے بھی تو نانا ابا کا گھر ہے نا۔ پھر آپ کو ادھر رہنا اچھا کیوں نہیں لگتا؟'' عاشی معصومیت سے سر اٹھائے پوچھ رہی تھی۔

''جہاں آپ جیسی پیاری سی گڑیا رہتی ہو، وہاں رہنا بھلا ہمیں اچھا کیوں نہیں لگے گا؟'' ایبک نے جھک کر اس کے رخساروں کو دو انگلیوں سے چھوا۔

''میں پیاری ہوں؟'' اس کی نیلی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

''بالکل۔'' ایبک نے تائید کی۔

''لیکن زویا ماما تو کہتی ہیں کہ میں بدصورت بلا ہوں۔'' اس کی نیلی جھیلیں یک دم پانیوں سے بھر گئیں۔

''جھوٹ بولتی ہیں آپ کی زویا ماما۔'' ایبک نے یک دم گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس کی پیشانی چومی۔ ''ارے آپ تو ''الریان'' کی ساری لڑکیوں سے زیادہ حسین ہو بے بی!''

''سچ......؟'' اس نے تائیدی نظروں سے پہلے ایبک اور پھر سب کی طرف دیکھا۔ سب نے ہی سر ہلایا تھا۔ بھیگی آنکھیں پھر جھلملانے لگی تھیں، جیسے نیلے پانیوں میں کسی نے دیے جلا دیئے ہوں۔''

''ویسے مجھے خود بھی پتہ تھا کہ میں ''الریان'' کی ساری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت ہوں۔'' نو سالہ عاشی نے اتراتے ہوئے کہا تو ایبک اور ہمدان بے ساختہ ہنس دیئے اور اریب فاطمہ مبہوت سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اس نے اس طرح کھل کر ہنستے ہوئے ایبک کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ایسی بے ساختہ ہنسی اس کے چہرے پر کتنی سجتی تھی۔

مگر ''الریان'' میں قیام کے ان چھ مہینوں میں صرف چار بار ہی تو اس نے اسے دیکھا تھا۔ ہاں ایک مبہم سی مسکراہٹ ضرور اس کے لبوں پر آ جاتی تھی اور وہ ہر بار اس مسکراہٹ کے معنی ہی تلاش کرتی رہ جاتی تھی۔

ایبک کھڑا ہو گیا۔

''ویسے ایبک بھائی سے پہلے تمہیں یہ بات کس نے بتائی تھی عاشی؟'' عمر نے سرگوشی کی۔

''نانا ابو نے۔'' وہ اترائی۔ ''اور نانا ابو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔''

''ہاں......لیکن رابی آپی کے سامنے یہ بات کبھی نہ کہنا۔ کیونکہ وہ خود کو ''الریان'' کی ساری لڑکیوں سے زیادہ حسین سمجھتی ہیں۔'' عمر کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

ایبک، لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ لئے مڑا تو اس کی نظریں اریب فاطمہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔ اریب نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ ایبک بے دھیانی میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے رخساروں پر سرخی بکھر گئی اور پیشانی پر پسینے کے چند ننھے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ وہ نگاہیں جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی اور اس کی بے حد لانبی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

ایبک کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔ لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے اس

نے سوچا۔
"یہ لڑکی "الریان" کی ان ساری لڑکیوں کے درمیان یوں لگتی ہے، جیسے جنگل میں بھٹکی ہوئی کوئی سہمی سہمی سی ہرنی ہو۔
اس کی غزال آنکھوں میں ایسا ہی سہم ہے....... "غزال۔" اس نے زیرلب کہا۔
"نہیں......حور عین نہیں۔ اس کی آنکھیں تو بالکل......" اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور الریان سے باہر نکل گیا۔
"تم میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ اسے روک لیتے۔ وہ کوئی غیر تو نہیں، ہماری پھپھو کا بیٹا ہے۔ بابا جان کا نواسا ہے۔ اور یہ ڈنر، بابا جان کی طرف سے ہے۔"
اس کے لاؤنج سے نکلتے ہی سب کچھ نہ کچھ بولنے لگے تھے اور اس کے پیچھے جاتا ہمدان دروازے میں ہی رک گیا تھا۔
منیبہ کی آواز پر سب ہی خاموش ہو گئے تھے۔ وہ لاء کر رہی تھی اور اسے ناانصافی کے خلاف اور حقوق کی حمایت میں بولنے کا بے حد شوق تھا۔
"سوائے ہومی کے کسی نے اسے ڈنر کے متعلق بتایا تک نہیں۔" اس کے لہجے سے تاسف جھلکنے لگا تھا۔ سکول سے لے کر اب تک مختلف مقابلوں میں تقریریں اور مباحثے کر کے اسے الفاظ کے اتار چڑھاؤ اور لہجے پر دسترس حاصل ہو گئی تھی۔
"تمہارا کیا خیال ہے، ہمارے کہنے سے وہ رک جاتا؟" یہ حفصہ مصطفیٰ تھی، جو ہر طرف سے بے نیاز ڈرائی فروٹ کی ٹرے گود میں رکھے بہت انہماک سے کاجو کھا رہی تھی۔
"گڑیا جی! آپ کیوں اپنے کام میں خلل پیدا کر رہی ہیں؟ اپنا کام جاری رکھیں۔" زبیر بھی پہلی بار بولا تھا۔
"ویسے جس رفتار سے آپ ڈرائی فروٹ کھا رہی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والے دنوں میں بجلی، پانی اور کئی دوسری چیزوں کی طرح ڈرائی فروٹ بھی ناپید ہو جائے گا۔"
"ناپید ہو جائے گا نہیں بلکہ ناپید ہو چکا ہے غریبوں کے لئے۔" عادل عثمان نے عمر احسان کے کان میں سرگوشی کی تھی، جسے کسی نے نہیں سنا۔ حفصہ نے مٹھی بھر کاجو اٹھا کر ٹرے زبیر احسان کی طرف بڑھائی۔
"لو، تم بھی کھا لو۔ دور بیٹھے کیوں کڑھ رہے ہو؟"
"میں کچھ کہہ رہی ہوں۔" منیبہ کو غصہ آ رہا تھا۔ کسی نے بھی اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔
"کیا ایبک فلک شاہ کو "الریان" کی تقریبات میں شامل ہونے کا حق نہیں ہے؟"
"مگر یہ تقریب "الریان" میں تو نہیں ہو رہی۔" حفصہ منمنائی۔
"مگر یہ تقریب "الریان" کی ہی ہے۔ "الریان" کی شہزادی رابیل احسان کی برتھ ڈے ہے آج۔"
منیبہ کو ایبک کے جانے کے بعد احساس ہوا تھا کہ انہوں نے بڑی بدتہذیبی کی۔ جبکہ تہذیب تو "الریان" کا ورثہ تھی۔
اکثر ایبک کے جانے کے بعد ہی کسی نہ کسی کو احساس ہوتا تھا کہ ایبک کے ساتھ "الریان" میں ناانصافی ہو جاتی ہے۔"
"یہ ہمدان مصطفیٰ کا یار غار اور یہ عمر احسان اس کا فین۔ بقول اس کے چاند کا چکور۔" منیبہ کا موڈ تقریر کا بن چکا تھا اور وہ صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔
"یہ سراسر ناانصافی ہے کہ یہاں "الریان" میں ہم سب، جو بابا جان کے پوتے، پوتیاں ہیں، آج رات ڈنر اڑائیں۔ جہاں سینکڑوں قسم کی ڈشز ہوں اور ان کا اکلوتا نواسا، کرنل شیر دل کی انیکسی میں بازار سے لائے نان چھولے کھا رہا ہو۔"
"بابا جان کا یہ اکلوتا نواسا ہم جیسے ہزاروں کو اس سے شاندار ڈنر کھلا سکتا ہے منیبہ بی بی!" عمر احسان کو اس کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کہ اس کی پسندیدہ ہستی کے متعلق کسی کو، خصوصاً اریب فاطمہ کو یہ گمان گزرے کہ وہ کوئی غریب شخص ہے۔ سوائے اریب فاطمہ کے سب ہی جانتے تھے کہ ایبک فلک شاہ کوئی گیا گزرا بندہ نہیں ہے۔
"بہرحال یہ ناانصافی ہے۔" منیبہ نے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر صوفے کی پشت پر احتیاط سے مارا اور دروازے کے

پاس کھڑے ہمدان مصطفیٰ کو یاد آیا کہ وہ تو ایبک کو گیٹ تک خدا حافظ کہنے جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اور اندر آتی مرینہ عثمان سے زور سے ٹکرایا۔ مرینہ نے بمشکل ناک سے پھسلتی عینک کو سنبھالتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہ ہمدان مصطفیٰ کو کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے اونچی آواز میں پوچھا اور اپنی ناک سہلاتے ہوئے باری باری سب کی طرف دیکھا لیکن شاید کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمدان مصطفیٰ اچانک باہر کی طرف کیوں بھاگا ہے۔ سب ہی اندازے لگا رہے تھے اور گیٹ سے باہر کھڑا ہمدان دُور دُور تک سنسان سڑک کو مایوسی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر تاسف سے سر ہلاتے ہوئے وہ واپس اندر کی طرف مڑا۔

اکثر ہی ایسا ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی اسے باتوں میں اُلجھا لیتا تھا اور وہ جو ایبک فلک شاہ کو خاص مہمانوں کی سی اہمیت دیتے ہوئے گیٹ تک چھوڑنے کی چاہ ہوتی تھی، وہ یوں ہی رہ جاتی تھی۔

وہ سر جھکائے واپس لاؤنج میں آیا تو مرینہ ابھی تک کھڑی اپنی ناک سہلا رہی تھی۔ حفصہ، منیبہ کے کان میں گھسی کچھ کہہ رہی تھی اور عمر احسان اب چلغوزے چھیل چھیل کر عاشی کو دے رہا تھا۔ اسے بچپن سے ہی سب کی خدمتیں کرنے کا شوق تھا۔ پتہ نہیں، یہ کس پر پڑا ہے؟ ہمدان نے سوچا اور تھکا تھکا سا صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کیا ایبک شاہ تمہاری کوئی قیمتی چیز لے کر بھاگ گیا تھا؟'' زبیر احسان نے آج تک کبھی ڈھنگ کی بات نہیں کی تھی۔

''بکو مت۔'' پتہ نہیں کیوں ہمدان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ شاید اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے ایبک کو نہ روک کر اچھا نہیں کیا اور یہ منیبہ صحیح ہی تو کہتی ہے کہ مجھے اسے ڈنر تک رکنے کے لئے اصرار کرنا چاہئے تھا۔

''کیا ایبک آیا تھا؟'' مرینہ کی آواز خاصی اونچی تھی۔ ''اور تم لوگوں نے مجھے بتایا تک نہیں۔ اور حفصہ! تمہیں تو پتہ تھا نا کہ میں پچھلے تین ماہ سے کتنی شدت سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ حفصہ کے پاس ہی دھپ کر کے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

''میں آیا تو تھا تمہارے خواب میں تمہیں بتانے، لیکن تم......'' زبیر نے احسان جتایا۔

''تم سارے اچھے کام خواب میں ہی کرتے ہو۔ کبھی جیتے جاگتے بھی کر لیا کرو۔'' عمر نے چڑایا۔

''مجھے کتنا ضروری کام تھا ایبک سے۔'' مرینہ کا دکھ کم نہیں ہو رہا تھا۔

''مثلاً کیا کام؟'' زبیر نے بھنوئیں اچکائیں۔

''وہ میری فرینڈز نے ملنا تھا اس سے اور میں......''

''ہیں......کیا کے۔ای میں لڑکوں کا کال پڑ گیا ہے؟'' زبیر اُچھلا۔

''بکو مت......ایک سے ایک لڑکا ہے وہاں۔ لیکن جب میں نے ایبک کا بتایا کہ وہ میرا کزن ہے تو ہائے......تمہیں کیا پتہ وہ سب میرے پیچھے ہی پڑ گئیں کہ ہمیں ایبک سے ملواؤ۔ اور وہ میرب تو ہر روز دعا مانگتی ہے کہ اللہ کرے ایبک جلد آئے اور وہ اس سے آٹو گراف لے سکے۔'' مرینہ کو بہت تیز تیز بولنے کی عادت تھی۔ جو جملے باقی دو منٹ میں ادا کرتے، وہ چند سیکنڈ میں بول کر فارغ ہو جاتی تھی۔

''فار گاڈ سیک رینا! اپنی سپیڈ کچھ تو کم رکھا کرو۔ ہمیشہ تمہاری آدھی بات ہی پلّے پڑتی ہے۔'' منیبہ نے کھڑے کھڑے اسے ڈپٹا۔ جبکہ زبیر بے حد تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''رینا ڈیئر! کہیں تمہاری فرینڈز نے یہ تو نہیں سمجھ لیا کہ تمہارا کزن وہ ''ایبک کا کچن'' والا ایبک ہے؟''

''واٹ؟'' مرینہ پورا منہ کھول کر دھاڑی تھی۔ ''میری فرینڈز کا دماغ خراب نہیں ہے کہ وہ اس موٹو ایبک پر عاشق ہو جائیں۔ جو نہ جانے کیا کیا ملغوبے بناتا ہے اور پھر اپنی ہی تعریف کر کر کے پاگل ہو جاتا ہے۔ اور جب ٹھمکا لگاتے ہوئے اس کا کلوز اپ دکھاتے ہیں تو مجھے بے چارے چینل پر رحم آتا ہے۔ ان کے میک اپ کا آدھا خرچ تو اس چاند پر اُٹھ جاتا ہوگا۔ اتنی موٹی بیس......اتنا گہرا بلشر اور اتنی شارپ لپ اسٹک۔''

''اوہ مائی گاڈ!......تمہاری نظر اتنی تیز ہے۔ اور ہم خوامخواہ ہی اس دکھ میں مرے جاتے ہیں کہ ہماری چھوٹو نے پڑھ

پڑھ کر اپنی نظر کمزور کر ڈالی ہے۔'' حفصہ نے تبصرہ کیا لیکن مرینہ بدستور زبیر کو گھور رہی تھی۔
''میری فرینڈز ہرگز اتنی بدذوق نہیں ہیں۔ سمجھے؟''
''لو بھلا۔ اس میں بدذوقی کی کیا بات ہے؟'' زبیر نے لاپروائی سے کہتے ہوئے ٹرے سے کاجو اٹھا کر منہ میں ڈالا۔
''تم نے کبھی کوکنگ پروگرام دیکھے ہوں تو تمہیں پتہ ہو کہ آج کل کی لڑکیاں کتنا مرتی ہیں ان شیفس پر...... اللہ آپ آج بہت خوبصورت لگ رہے ہیں...... سچ، آپ تو بالکل اپنے نام کی طرح اس پروگرام کا چاند ہیں...... ہائے میں آپ کا آٹوگراف کیسے حاصل کروں؟'' زبیر باریک آواز میں کہہ رہا تھا کہ عمر احسان نے اسے ٹوک دیا۔
''اس لئے زبیر بڑی سنجیدگی سے مستقبل میں کک بننے کا سوچ رہا ہے۔''
زبیر نے اسے گھور کر دیکھا۔
''تم ہمیشہ غلط موقع پر انٹری دیا کرو۔ جبکہ تمہیں پتہ ہے کہ اگر دورانِ گفتگو کوئی مجھے ٹوک دے تو میں بھول جاتا ہوں۔''
''خیر یہ کوئی اتنی اہم گفتگو بھی نہیں ہے۔'' عمر نے کان سے مکھی اُڑائی۔
'پتہ نہیں یہ ایبک فلک شاہ کیا ہے جو عمر احسان اس کی تعریفیں کرتا تھکتا نہیں۔ ہمدان اس کے لاہور آنے کا سن کر بے چین ہو کر اس سے ملنے بھاگتا ہے۔ اور اب مرینہ اور اس کی فرینڈ....' اریب فاطمہ نے سوچا۔
اسے یہاں ''الریان'' میں آئے صرف چھ ماہ ہوئے تھے اور ان چھ ماہ میں اسے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ ایبک، عمارہ پھپھو کا بیٹا ہے جو بہاول پور میں رہتی ہیں۔ برسوں پہلے بابا جان کسی بات پر فلک شاہ سے ناراض ہو گئے تھے اور فلک شاہ نے قسم کھائی تھی کہ وہ اور ان کی بیوی کبھی ''الریان'' میں نہیں آئیں گے۔ اور یوں عمارہ پھپھو پھر کبھی ''الریان'' نہیں آئی تھیں۔ اور اب اتنے برسوں بعد کوئی سال بھر پہلے ہمدان مصطفیٰ، ایبک کو اپنے ساتھ الریان لایا تھا۔
اپنی ذاتی حیثیت میں وہ کیا تھا۔ کوئی شاعر، صحافی، ادیب، وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ ٹی وی نہیں دیکھتی تھی۔ کیونکہ ابا، ٹی وی کے خلاف تھے۔ اخبار وغیرہ پڑھنے سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی اور یہاں ''الریان'' میں آکر بھی اس نے ٹی وی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ یہاں سب کی محفل ٹی وی لاؤنج میں ہی لگتی تھی یا پھر لونگ روم میں...... اس وقت بھی وہ سب ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ اگرچہ ٹی وی آن نہیں تھا۔ عموماً جب سب ٹی وی دیکھ رہے ہوتے تو وہ اُٹھ جاتی تھی۔
'اگر فلک مراد شاہ نے کوئی قسم کھائی تھی تو کیا اس کا کفارہ نہیں ہو سکتا تھا؟' اس نے سر جھٹک کر سب کی طرف دیکھا تو عمر بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
''ہمدان! کیا ایسا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ ایبک سلطان اپنا نام بدل کر کچھ اور رکھ لے؟''
''مگر کیوں؟'' ہمدان مصطفیٰ ابھی تک اس تاسف میں بیٹھا تھا کہ وہ آج بھی ایبک کو خاص مہمانوں والا پروٹوکول نہیں دے سکا۔
''بس، میرا جی چاہتا ہے کہ ایبک نام صرف ایک ہی ہستی کا ہو...... اور وہ صرف ایبک فلک شاہ ہو۔''
''عمر! تم کب بڑے ہو گے آخر؟'' حفصہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔
عمر احسان اگر بڑا ہو بھی جاتا، تب بھی ایبک شاہ کے ساتھ اس کی عقیدت کم نہیں ہونا تھی۔ اور یہ بات حفصہ خود بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ کچھ اتنا ہی دیوانہ تھا وہ ایبک کا۔
''اوئے! تم لوگوں نے چائے پی لی؟'' تاسف سے سر ہلاتے ہوئے اچانک ہی مرینہ کو خیال آیا تھا۔ وہ چائے کی بے حد رسیا تھی اور بقول منیبہ کے، اس کے جسم میں خون کی جگہ چائے دوڑ رہی تھی۔
''چائے...... اوہ...... ہاں چائے۔'' منیبہ شاہ، صوفے کے پیچھے سے ہٹ کر صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔
''کس قدر احمق ہو تم سب۔ یعنی ایبک پورے چالیس منٹ یہاں کھڑا رہا اور تم میں سے کسی نے اسے چائے کے

لئے بھی نہیں پوچھا۔ حد ہوگئی بداخلاقی کی۔"

یہ فریضہ تم بھی تو انجام دے سکتی تھیں۔" حفصہ جانتی تھی کہ منیبہ صرف اسے ہی سنا رہی ہے۔ کیونکہ الریان میں اگر کسی کو کچن سے دلچسپی تھی تو وہ صرف حفصہ ہی تھی۔

"میں...... دراصل میں تو اتنی محو ہوگئی تھی اس کی اسٹوری میں کہ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔" منیبہ نے سر کھجایا۔

"اسٹوری...... کیا ایبک نے کوئی اسٹوری سنائی تھی؟" مرینہ نے بے حد اشتیاق سے باری باری سب کو دیکھا اور ناک سے پھسلتی عینک کو سنبھالا۔

"فار گاڈ سیک۔ اب تم اسٹوری سنانے نہ بیٹھ جانا۔" زبیر نے ہاتھ جوڑے۔ "پانچ بج رہے ہیں حفصہ رانی! تم چائے پلواؤ اور پھر سب تیاری شروع کرو۔"

"کیسی تیاری؟" مرینہ پھر چونکی۔

"تمہیں تو اس میڈیکل کی تعلیم نے بالکل ہی بونگا کر دیا ہے رینا! آج رابی کا برتھ ڈے ہے۔" پتہ نہیں کیوں، حفصہ نے چڑ کر کہا تھا۔

"لیکن ہمیں تو آٹھ بجے جانا ہے نا۔ بابا جان نے کہا تھا، آٹھ بجے سے ایک منٹ لیٹ نہ ہوں۔"

"تو چائے پیتے پیتے چھ بج جائیں گے۔ اور تم لوگ چھ بجے سے تیاری شروع کرو گی، تب کہیں آٹھ بجے تک تیار ہونے کا چانس ہے۔" زبیر نے ٹرے میں پڑا آخری کاجو منہ میں ڈالا۔

"اب اتنی بھی غلط بیانی نہ کرو۔" حفصہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"چلو یار! اب چائے تو پلواؤ۔" مرینہ نے آہستگی سے سر دبایا۔

"پڑھ پڑھ کے عینک تو لگ چکی ہے، اب یہ سر کا درد بھی پال لیا ہے تم نے۔ آخر کیا ضرورت تھی میڈیکل میں جانے کی؟"

"ہاں ضرورت تو نہیں تھی، بس......" مرینہ نے کسی قدر حیرت سے حفصہ کو دیکھا۔

"کسی دور میں تمہیں بھی جنون تھا ڈاکٹر بننے کا۔ یہ الگ بات کہ تم انٹری ٹیسٹ کلیئر نہ کر سکیں۔"

حفصہ نظریں چرا کر باہر نکل گئی۔ یہ دکھ ہمیشہ کے لئے اس کے دل میں ثبت ہو گیا تھا کہ اتنی محنت کے باوجود وہ میڈیکل میں نہ جا سکی تھی اور مرینہ، جس نے محض اس کا ساتھ نبھانے کے لئے ایف ایس سی میں بائیو لی تھی، اب "کے۔ ای" کی اسٹوڈنٹ تھی۔

"شاید اسے ہی قسمت کہتے ہیں۔"

منیبہ نے اسے نظریں جھکائے جاتے دیکھا تو اٹھ کر کارپٹ پر پڑی پلیٹیں اور ڈرائی فروٹ ٹرے اٹھانے لگی۔ اور عمر احسان نے کارپٹ پر پڑا ریموٹ اٹھالیا۔ پھر سب ہی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

❁○❁

رات بارش ٹوٹ کر برسی تھی۔ اور یہ موسم سرما کی پہلی بارش تھی۔ ورنہ لگتا تھا جیسے نومبر کی طرح دسمبر بھی یوں ہی سوکھا سوکھا گزر جائے گا۔ لیکن دسمبر کے اس آخری ہفتے میں یہ بارش، فلک شاہ کو خوش کر گئی۔

وہ بہت دیر سے اپنی وہیل چیئر پر بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ان کے بیڈ روم کی اس کھڑکی سے باہر لان کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ صبح سے ہی وقفے وقفے سے ہلکی ہلکی پھوار برسنے لگی تھی۔ پھول، پودے، درخت سب دُھل کر نکھر گئے تھے۔ ورنہ ہر طرف دُھول اُڑ رہی تھی۔

لان میں مالی کے دونوں بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر یوں ہی بے دھیانی سے انہیں

دیکھتے رہے۔ پھر یکایک ایک خیال حسرت کی طرح ان کے دل میں پیدا ہوا کہ وہ بھی ان بچوں کی طرح لان میں دوڑتے بھاگتے پھریں اور آسمان سے برستی ان بوندوں کو اپنی ہتھیلیوں کی اوک میں اکٹھا کریں۔ بالکل ایسے ہی جیسے پھر ایک بھولا بسرا منظر ان کی آنکھوں کے آئینے میں آٹھہرا۔

وہ بارش میں یوں ہی ان بچوں کی طرح لان میں بھاگتے اور بھیگ کر خوش ہوتے تھے۔ ماڈل ٹاؤن کے اس وسیع و عریض گھر کا وہ بڑا سا لان جسے بڑے بڑے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ آم، لیچی، جامن، انار، امرود اور سفیدے کے درخت...... پتہ نہیں اب بھی وہاں یہ سب درخت ہیں یا راحت بھابی نے کٹوا دیئے ہیں۔ وہ کتنا چڑتی تھیں۔

''ان پھل دار درختوں پر صبح صبح ہی پرندے جمع ہو کر کتنا شور کرتے ہیں اور پھلوں سے لان میں کتنی گندگی ہو جاتی ہے۔ جب دیکھو کچے پکے پھل نیچے گرے ہوتے ہیں۔ بس میں اس سال مصطفیٰ سے کہہ کر یہ سب درخت کٹوا دوں گی۔'' وہ ہر سال کہتی تھیں اور ہر سال بابا جان منع کر دیتے تھے۔

''نہ، نہ بچے! اللہ ناراض ہوگا۔ بھلا پھل دار درختوں کو بھی کوئی کاٹتا ہے؟ منع ہے بچے! ان درختوں کو کاٹنا۔''

'آپ کو ان درختوں کا اتنا خیال تھا بابا جان! لیکن ہمارا ذرا خیال نہیں کیا آپ نے...... کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کیسا دل پتھر کر لیا آپ نے۔ ہم تو آپ کے کوئی نہیں تھے لیکن عمارہ تو آپ کی اپنی تھی۔ آپ کی لاڈلی تھی۔ بہت پیار تھا آپ کو اس سے۔ ہم سے اگر غلطی ہو گئی تھی تو آپ تو آ سکتے تھے نا ہمارے پاس۔ آپ ہی ہمیں معاف کر دیتے۔ ہمارے لئے نہ سہی، عمر کے لئے ہی۔ ہمارے لئے ''الریان'' کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ یہ ظلم ہم نے خود اپنے آپ پر کیا تھا لیکن فلک مراد شاہ کے ''مراد پیلس'' کے دروازے تو ہمیشہ آپ کے لئے کھلے رہے کہ شاید...... آپ کبھی اپنی عمو سے ملنے آئیں...... عمو کی آنکھیں تو ہمیشہ دروازے پر ہی لگی رہیں، ہر اہم موقع پر۔ لیکن بابا جان! آپ اتنے ظالم بھی ہو سکتے ہیں؟'

ان کے لبوں سے بے اختیار ایک سسکی سی نکل گئی۔ انہوں نے پوری شدت سے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا ڈالا۔ پتہ نہیں کیوں، انہیں لگا تھا کہ اگر انہوں نے خود کو نہ سنبھالا تو یہ سسکی چیخوں میں ڈھل جائے گی۔ ہونٹوں کو دانتوں تلے دبائے انہوں نے پھر ایک نظر باہر لان پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے بچوں کو دیکھا۔ ہلکی پھوار اب موٹی بوندوں میں ڈھل گئی تھی لیکن بچے ان سے بے پروا لان میں ایک دوسرے کے پیچھے یوں ہی بھاگ رہے تھے۔

'اس سردی میں بھیگنے سے بچے بیمار نہ ہو جائیں۔ پتہ نہیں یہ مالی کہاں غائب ہے۔ انہیں منع بھی نہیں کرتا۔'' انہوں نے تیزی سے ہینڈل گھما کر اپنی کرسی کا رخ بدلا تو ان کی نظریں اندر آتی عمارہ سے ٹکرائیں، جو ہاتھوں میں گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے کا کپ لئے آ رہی تھی۔

عمارہ سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں بے اختیار سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف اُٹھیں۔ دس بج رہے تھے۔ عمارہ کبھی نہیں بھولتی تھیں کہ وہ دس بجے ایک کپ چائے کا ضرور پیتے ہیں۔ خود انہیں بھی آج وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ناشتے کے بعد سے وہ یونہی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔

عمارہ نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا۔ وہ آسانی سے ہاتھ بڑھا کر کپ اٹھا سکتے تھے۔ عمارہ کپ رکھ کر بنا کچھ کہے واپسی کے لئے مڑ گئیں۔

پتہ نہیں کیوں اُنہیں لگا کہ عمارہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور پلکیں بھیگی سی ہیں۔ تو کیا عمارہ کو بھی اس برستی بارش میں 'الریان'' کی یاد آ رہی ہے؟ ایک گہرا درد ان کے دل کو چیرتا چلا گیا۔

کیا ''الریان'' کو یاد کرنے کے لئے عمارہ کا دل کسی موسم کا محتاج ہے؟...... وہ الریان کو کبھی بھول سکتی ہیں جہاں انہوں نے آنکھ کھولی تھی، جہاں ان کا بچپن گزرا، لڑکپن آیا، جوانی آئی۔ جہاں کتنے خوب صورت دن، ہنستے ماہ و سال انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گزارے تھے۔ جہاں سے رخصت ہو کر وہ ''مراد پیلس'' آئی تھیں۔

''عمو!'' وہ بے اختیار انہیں پکار بیٹھے تھے۔ وہ مڑ کر دیکھنے لگی۔

''اپنے لئے چائے نہیں لائیں؟''

''آپ کو پتہ ہے نا میں اس وقت چائے نہیں پیتی۔ گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔''

''لیکن اس موسم میں ذرا سا ساتھ دے دو۔ یا اس معذور کی رفاقت نے تمہیں اُکتا دیا ہے؟''

''فلک!'' عمارہ تڑپ کر آگے بڑھیں۔ ''کیا آپ کو ایسی بات کرنی چاہئے؟ کیا میں نے کبھی کوئی کوتاہی کی؟ کیا میری محبت میں کبھی کوئی کمی محسوس کی آپ نے؟'' وہ بے اختیار شکوہ کر بیٹھیں۔ ان کی خوب صورت آنکھیں نم ہو گئیں۔

''سوری عمو!'' فلم شاہ شرمندہ ہو گئے۔ ''میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ کم از کم میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو دراصل اس خوب صورت موسم میں تھوڑی دیر کے لئے تمہاری رفاقت کا خواہاں تھا۔ پتہ نہیں، کیا یاد آ رہا ہے۔''

عمارہ ان کی وہیل چیئر کے پاس ہی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں۔

''عمو! ناراض ہو گئی ہو؟'' فلک شاہ انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔

''نہیں۔'' عمارہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ذرا سا جھک کر چائے کا کپ اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے شکریہ کہہ کر کپ عمارہ کے ہاتھ سے لے لیا۔

''عمو! مجھے معاف کر دو پلیز۔ میری جلد بازی، میرے غصے کی وجہ سے ''الریان'' تمہارے لئے شجرِ ممنوعہ ہو گیا۔ سارے اپنے بچھڑ گئے۔''

''آپ بار بار کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں؟ اتنی عمر گزر گئی۔ بچے جوان ہو گئے۔ کبھی میں نے آپ سے گلہ کیا، کبھی کہا کچھ؟''

''تو کہو نا۔'' انہوں نے کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔ ''گلہ کرو۔ لڑو جھگڑو۔ برا بھلا کہو۔ مجرم ہوں میں تمہارا۔ تمہیں تمہارے اپنوں سے جدا کرنے کا مجرم۔''

''مجھے کبھی آپ سے گلہ ہوا ہی نہیں فلک!'' عمارہ کا لہجہ دھیما تھا اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

''آپ کو بابا جان کی بات پر غصہ آ گیا تھا۔ آپ نے دانستہ تو ایسا نہیں کیا تھا نا۔ اور غصہ تو یوں بھی انسان کا دماغ خراب کر دیتا ہے۔'' عمارہ نے وہیل چیئر کے ہتھے پر رکھے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''دادا جان مجھے ہمیشہ کہتے تھے، فلک شاہ! اپنے غصے پر کنٹرول کر۔ سُدھ بُدھ کھو بیٹھتا ہے تُو اپنی۔ کہیں غصے میں اپنا ہی کوئی نقصان نہ کر بیٹھے...... اور میں نے کتنا بڑا نقصان کر دہ عمارہ! تمہارا، اپنا، بچوں کا۔ میں تو مجرم ہوں تم سب کا۔ تم مجھے دل سے معاف کر دو عمو!'' وہ دونوں ہاتھ جوڑے معافی مانگ رہے تھے اور عمارہ کا دل جیسے پانی ہو کر آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ انہوں نے بے اختیار ان کے جڑے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا اور اب ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے روئے چلی جا رہی تھیں۔

آج بہت دنوں بعد فلک شاہ پر قنوطیت اور دل گرفتگی کا دورہ پڑا تھا۔ اور ایسے وقت میں صرف ایک ہی تھا، جو انہیں اس ڈپریشن سے باہر لاتا تھا۔ اور ایک پتہ نہیں کب واپس آئے گا۔ تب تک فلک شاہ یونہی بے چین رہیں گے۔ عمارہ نے تاسف سے سوچا اور فلک شاہ کے ہاتھوں پر اپنی گرفت اور سخت کر دی۔

''آپ نے غصے میں بہت غلط بات کر دی تھی۔ اور یہ آپ کا فعل تھا، آپ کی غلطی تھی۔ ہم ''الریان'' نہیں جا سکتے۔ لیکن بابا جان کو کس چیز نے یہاں آنے سے روک کے رکھا فلک؟...... کیا والدین اور بچوں کے درمیان بھی انا ہوتی ہے؟ اور وہ سب جو میرے ماں جائے تھے۔ جن کے ساتھ میں نے اپنا بچپن، اپنا لڑکپن گزارا تھا، ان سب نے بھی مجھے یوں جھٹک کر پھینک دیا تھا جیسے میں کوئی اچھوت تھی۔ جیسے......''

عمارہ کی ہچکی بندھ گئی۔ پچیس سالوں میں پہلی بار عمارہ نے اپنوں کی بے حسی کا گلہ کیا تھا۔

''زارا اور اماں جان کے بعد تو میں جیسے ''الریان'' کے باسیوں کے لئے ایک بھولا بسرا خواب بن گئی ہوں۔ کیوں کیا انہوں نے میرے ساتھ ایسا؟......کیوں مومی!......کیوں......؟''

وہ ان کے ہاتھ چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ فلک شاہ نے بے اختیار اپنا بازو پھیلا کر عمارہ کا سر اپنے ساتھ لگا لیا۔ آج بڑے عرصے بعد انہوں نے انہیں مومی کہہ کر بلایا تھا۔ ان کے کندھے پر سر رکھے عمارہ پھر سسکی تھیں۔

''کیوں مجھے الگ کر دیا انہوں نے؟''

اور اس ''کیوں'' کا جواب تو ان کے پاس بھی نہیں تھا۔ دو سال پہلے زارا کی موت کے بعد تو جیسے ''الریان'' کی طرف کھلنے والا ہر دروازہ بند ہو گیا تھا۔ زارا ان کے لئے وہ روزن تھی، جس کے طفیل وہ ''الریان'' کے ہر دکھ سکھ کو جان لیتے تھے۔ ''مراد پیلس'' میں رہ کر بھی وہ ''الریان'' کے ہر دکھ پر دکھی ہوتے اور ہر سکھ پر خوش ہوتے۔

''یہ زندگی اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے مومی؟......یہ ہم جیسے کمزور انسانوں سے ایسے امتحان کیوں لیتی ہے؟''

عمارہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ فلک مراد شاہ بے حد مضطرب اور بے چین ہو گئے تھے۔

''اب کے ایبک لاہور سے آئے تو میں اس سے کہوں گا کہ وہ عثمان بھائی، مرتضٰی بھائی، مصطفٰی بھائی سب کو یہاں لے کر آئے۔ میں خود انہیں فون کروں گا۔ منّت کر لوں گا۔ ہاتھ جوڑ کر بابا جان سے معافی مانگ لوں گا۔''

''نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اگر انہیں خود مجھ سے ملنے کی چاہ نہیں، میرا خیال نہیں تو پھر میں کیوں؟......نہیں پلیز! آپ ایبک سے کچھ نہیں کہیں گے۔''

''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ والدین اور بچوں کے درمیان کیسی انا؟......تو تم ہی اس جھوٹی انا کا بت توڑ دو، عمو! اپنے اوپر ظلم مت کرو۔ اتنے سالوں سے تم خود کو اپنوں سے جدائی کی سزا دے رہی ہو۔ لیکن اب......میری طرف سے اجازت ہے۔ تم مجھے چھوڑ کر......''

''آپ جانتے ہیں نا فلک! میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر مجھے چھوڑنا ہوتا تو اُس وقت چھوڑ دیتی۔ اب تو آپ کو میری اور مجھے آپ کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟''

آنسو پھر ان کی آنکھوں میں مچلنے لگے۔ اور فلک شاہ چپ چاپ عمارہ کو دیکھے چلے گئے۔ غلطی تو ساری اُن کی تھی۔ اور اس غلطی کا خمیازہ عمارہ بھگت رہی تھیں، پچھلے پچیس سال سے۔ کوئی مر جائے تو صبر آ جاتا ہے۔ لیکن یہ جیتے جی جدائیوں کے عذاب......انہوں نے پل پل عمارہ کو مرتے دیکھا تھا۔ اگر عمارہ ان کی غلطی کی وجہ سے ''الریان'' نہیں جا سکتی تھیں تو پھر وہ کون سی مصلحتیں تھیں، جنہوں نے مصطفٰی، مرتضٰی، عثمان، احسان اور بابا جان کو پچیس سالوں سے یہاں آنے سے روکے رکھا تھا۔

''ارے......چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ میں اور بنا کر لاتی ہوں۔'' عمارہ نے دائیں ہاتھ کی پشت سے رخسار صاف کئے۔ اور کپ لینے کو ان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں، بس ٹھیک ہے۔'' فلک شاہ نے ٹھنڈی چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اور یہ ان کا حد سے زیادہ بڑھا ہوا ڈپریشن تھا کہ انہوں نے ٹھنڈی چائے چند گھونٹوں میں پی لی۔ ورنہ عام حالت میں وہ ٹھنڈی چائے کبھی نہیں پیتے تھے۔ عمارہ چپ چاپ انہیں دیکھے گئیں۔ وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں مروڑ رہے تھے۔

''چاہے تم کچھ بھی کہو عمارہ! لیکن میں اس کے لئے خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا کہ میں تمہارے پیاروں کی دُوری کا سبب بنا ہوں۔''

''ہمارے درمیان بہت پہلے یہ بات طے ہو گئی تھی کہ ہم اس موضوع پر کبھی بات نہیں کریں گے۔ پھر آپ کیوں خود کو اذیت دیتے ہیں؟'' عمارہ نے افسردگی سے انہیں دیکھا۔

فلک شاہ کی نظریں ان کے چہرے کا طواف کر کے اب وہیل چیئر کے ہتھے پر جمی تھیں۔

وہ عمارہ کو یہ نہ بتا سکے کہ جب سے ایک نے ''الریان'' میں جانا شروع کیا تھا اور جس بے چینی سے عمارہ وہاں کے ایک ایک فرد کے بارے میں دس دس بار پوچھتی تھیں، وہاں کی ایک ایک چیز کی تفصیل جاننے کی خواہاں ہوتی تھیں، ایسے میں تو ان کا احساسِ جرم بڑھ جاتا تھا۔ کبھی کبھی کچھ کے لگاتا یہ احساس اس وقت نا قابل برداشت ہو جاتا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ وقت کی طنابیں کھینچ لیں۔ وقت کو واپس لے آئیں، وہیں سے، جہاں سے زندگی نے پلٹا کھایا تھا اور سب کچھ پہلے جیسا ہی ہو جائے۔

وہ ''الریان'' کی اسٹڈی میں بابا جان سے لمبی لمبی بحثیں کرنا، عثمان اور احسان کے ساتھ مال پر گھومنا، شام کے وقت لان میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے دنیا جہان کی باتیں کرنا، اماں جان سے لاڈ اُٹھوانا، زارا کی ذرا ذرا سی فرمائش پوری کرنا۔ یہ سب وہ کیسے واپس لاتے؟

انہوں نے افسوس سے ہاتھ ملے اور عمارہ پر ایک بے بس سی نظر ڈالی جو چائے کا خالی کپ اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

''میں گرم چائے لاتی ہوں۔''

''نہیں۔ رہنے دو۔ جی نہیں چاہ رہا۔'' انہوں نے آنکھیں موند کر سر، کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ اور پھر سینما کی سکرین کی طرح کئی منظر آنکھوں کے سامنے آتے چلے گئے۔

وہ دادا جان کی اُنگلی پکڑے ''الریان'' کے سیاہ گیٹ پر کھڑے حیرت اور خوف سے اس خوفناک کتے کو دیکھ رہے تھے، جو گیٹ کے دائیں طرف بنی باڑ کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔ اس کی لمبی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ اور اس کی سرخ سرخ آنکھیں جیسے انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔ غیر ارادی طور پر انہوں نے دادا جان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ یہ غالباً ''الریان'' کے ساتھ والے گھر کے لان کی باڑ تھی۔ اور باڑ کے اس طرف وہ خوفناک کتا تھا۔

وہ سیّد عبدالرحمٰن کا گھر تھا، جو اس کے پاپا کے دوست تھے۔ اور دادا جان سے ان کی کوئی دُور کی رشتے داری بھی تھی۔ دادا جان نے انہیں بتایا تھا کہ انہیں اب کچھ عرصہ یہاں رہنا ہے۔ وہ بہت روئے تھے۔ وہ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں نہیں آنا چاہتے تھے۔ لیکن دادا جان نے انہیں سمجھایا تھا کہ صرف چند ماہ کی بات ہے۔ اس کے پاپا کا آپریشن ہو جائے گا تو پھر وہ واپس لے جائیں گے۔

''پاپا ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟ آپ اُنہیں ساتھ لے کر آئیں گے؟ پہلے کی طرح وہاں تو نہیں چھوڑ آئیں گے؟''

''نہیں میری جان!......اللہ نے چاہا تو ہم جلد ہی واپس آئیں گے اور آپ کے پاپا، میرے ساتھ ہوں گے۔ بالکل صحت مند۔ آپ بس دعا کرنا۔''

''لیکن وہاں گھر میں دادو بھی تو اکیلی ہوں گی نا۔ میں ان کے پاس کیوں نہیں رہ سکتا؟'' وہ سات آٹھ سال کے تھے لیکن بلا کے ذہین تھے۔ ایسے ایسے سوال کرتے کہ دادا جان بھی کبھی کبھی زچ ہو جاتے۔

''کوئی مسئلہ ہے نا بیٹا!......آپ کی دادو ایک کمزور عورت ہیں۔ آپ یہاں زیادہ محفوظ رہیں گے۔ مجھے اور آپ کے پاپا کو بہت فکر رہے گی آپ کی۔ اور پاپا پریشان ہوئے تو جلدی صحت مند نہیں ہوں گے۔''

''اچھا......'' پاپا کی خاطر وہ مان گئے تھے۔ لیکن وہاں اُس بڑے سے سیاہ گیٹ کے پاس کھڑے کھڑے انہوں نے بھی ایک جواب تراشا تھا۔

''دادو تو مجھے یاد کر کے روتی رہیں گی۔ آپ ایسا کریں، مجھے واپس ان کے پاس ہی لے جائیں۔ میں انہیں بالکل تنگ نہیں کروں گا۔''

''مجھے پتہ ہے۔ میرا بیٹا بہت اچھا ہے اور بہت پیارا۔ وہ تو کسی کو بھی تنگ نہیں کرتا۔ اور آپ کے انکل، عبدالرحمٰن آپ کو دادو سے بھی ملانے لے جائیں گے۔ اور آپ ان سے فون پر بھی بات کرتے رہنا۔''

اس وقت وہ آٹھ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے لیکن یہ سب کچھ انہیں اس طرح یاد تھا، جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ اور

وہ ''الریان'' کے باہر دادا جان کی انگلی پکڑے کھڑے ہوں۔ اور باڑ کے اوپر سے وہ خوفناک کتا اپنی لمبی زبان باہر نکالے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے انہیں گھور رہا ہو۔

اور پھر منظر بدلا۔

وہ ''الریان'' کے ٹی وی لاؤنج میں سیّد عبدالرحمٰن سے مل رہے تھے۔ جنہیں بعد میں وہ سب کی طرح بابا جان کہنے لگے تھے۔ بابا جان انہیں اتنے والہانہ انداز میں ملے تھے، جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔

''کب روانگی ہے آپ کی اور سلجوق کی؟'' اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے انہوں نے دادا جان سے پوچھا تھا۔ اور پتہ نہیں کیوں اُنہیں لگا تھا، جیسے ان کی آنکھیں یکبارگی نم ہو گئی تھیں۔ اور دادا جان نے ہولے سے ان کا ہاتھ دبایا تھا۔

''عبدالرحمٰن بیٹا! اپنے دوست کے لئے دعا کرنا۔''

اور پھر لاؤنج لوگوں سے بھر گیا تھا۔ اور بابا جان ان کا تعارف کروا رہے تھے۔

''یہ آپ کے بھائی ہیں۔ اور اب یہ کچھ عرصہ یہاں رہیں گے۔'' انہوں نے اپنے سامنے موجود چاروں لڑکوں سے کہا تھا۔

''ہمیشہ کیوں نہیں؟'' یہ بھوری آنکھوں والا احسان تھا جو ان چاروں میں چھوٹا اور تقریباً ان کا ہم عمر تھا۔ اس نے بہت بے تکلفی سے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ان سے دو سال بڑے عثمان اور ان سے بڑے مرتضٰی اور ان سے بڑے مصطفٰی تھے جو بڑے سنجیدہ اور بردبار لگ رہے تھے۔ اور ان کے ہاتھ میں کتاب بھی تھی۔

''بابا جان! میں جاؤں؟ میرا کل ٹیسٹ ہے اکیڈمی میں۔''

وہ یک دم ہی اُس دُبلے پتلے، لمبے سے لڑکے سے مرعوب ہو گئے تھے جو چھٹیوں میں بھی پڑھتا تھا۔ احسان سے چھوٹی عمارہ تھی، جو دو چھوٹی چھوٹی پونیاں کئے مصطفٰی کے ساتھ جڑی کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چاکلیٹ اور دوسرے میں گڑیا تھی۔

''ماشاء اللہ! بہت پیارے بچے ہیں۔'' دادا جان نے سب کو پیار کیا تھا۔ اور جب وہ عمارہ کو پیار کر رہے تھے تو اس نے بتایا تھا۔

''ہماری ایک اور بہن بھی ہے۔ اللہ میاں نے فرشتوں کے ساتھ ہمارے لئے گفٹ بھیجا ہے۔ اور جب وہ بڑی ہو گی تو ہمارے ساتھ کھیلے گی۔ فرشتے اسے ٹوکری میں رکھ کر اماں جان کو دے گئے تھے۔''

''بے وقوف!'' احسان نے اسے ٹوکا۔ ''اماں جان اسے ہسپتال سے لائی ہیں اور اس کا نام زارا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔ وہ اماں جان کے کمرے میں سو رہی ہے۔'' احسان نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

زارا صرف پندرہ دن کی تھی۔ اور ''الریان'' میں ان بچوں، اماں جان اور بابا جان کے علاوہ مروہ پھپھو، عبداللہ چچا اور دادی اماں تھیں، جنہیں سب بڑی اماں کہتے تھے۔ عبداللہ چچا کی دُلہن، بینا چچی جن کی سب بچوں سے بے حد دوستی تھی۔ مگر خود شادی کے سات سال بعد ابھی تک بے اولاد تھیں۔ مروہ پھپھو کی ایک دو ماہ تک شادی ہونے والی تھی۔ عنایت بی بی کچن کا کام سنبھالتی تھیں۔ ''الریان'' کے پچھلے لان کی طرف تمام ملازموں کے کوارٹر تھے۔ دادا جان اسی شام واپس چلے گئے تھے۔ ''الریان'' بہت اچھا لگا تھا۔ حالانکہ بہاول پور میں ان کی اپنی حویلی بھی کم شاندار نہ تھی۔ آرائشی آئینوں والی چھتیں، رنگین شیشوں والے دروازے اور کھڑکیاں، حویلی سے ملحق چھوٹا سا باغ، بڑے سے لکڑی کے نفیس گیٹ، گیٹ کے اوپر لگی نیم پلیٹ پر سنہری حروف میں لکھا ''مراد پیلس'' یہ سب انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن ''الریان'' آنے کے بعد تو نہیں صرف ''الریان'' ہی اچھا لگنے لگا۔ شاید اس لئے کہ ''الریان'' میں اتنے سارے لوگ تھے۔ اور ''مراد پیلس'' میں صرف وہ تھے، دادا جان اور دادی جان تھیں اور پاپا جو بہت کم بولتے تھے۔ اُداس اُداس سے پاپا اکثر بیمار رہتے تھے۔ کبھی کبھی اُسے پاس بٹھائے وہ خاموشی سے اُسے یونہی تکتے رہتے تھے۔ اور پتہ نہیں کیوں اسے لگتا تھا، وہ ایسے میں اور اُداس

ہو جاتے تھے۔ پھر وہ اور زیادہ بیمار ہو گئے اور دادا جان انہیں لے کر انگلینڈ چلے گئے۔ پھر دادا جان تو واپس آ گئے لیکن وہ وہاں ہی رہ گئے تھے۔ پھر وہ بہت مہینوں بعد آئے تھے۔ پہلے سے زیادہ کمزور اور زرد۔ لیکن دادا جان کہتے تھے، ڈاکٹر کہتے ہیں وہ امپروو کر رہے ہیں۔ لیکن وہاں سے واپس آنے کے صرف چھ ماہ بعد دادا جان اُنہیں پھر لے کر چلے گئے تھے۔

اُن کا دل ''الریان'' میں لگ گیا تھا۔ مصطفیٰ، عثمان، احسان سبھی چند دنوں میں ان سے گھل مل گئے تھے۔ اماں جان اور بڑی اماں کے ٹوکنے کے باوجود سب ایک دوسرے کا نام لے کر بلاتے تھے۔ کوئی کسی کو بھائی جان نہیں کہتا تھا۔ ہاں، مرتضیٰ کے نام کے ساتھ بھائی لگا دیا جاتا۔ بس زارا کو گود میں لینے کے لئے سب کی معصوم سی لڑائیاں ہوتیں۔ مگر مصطفیٰ بڑا ہونے کا فائدہ اُٹھا کر اُسے اُچک لیتے۔ وہ بھی گیارہ بارہ سال کے تھے۔ لیکن وہ ان کا بہت خیال کرتے تھے۔ اور پھر ایک دن مصطفیٰ نے بہت فراخ دلی سے زارا کو ان کی گود میں دیتے ہوئے اعلان کیا تھا۔

''آج سے زارا، فلک مراد شاہ کی بہن ہے۔ ہم تو اتنے سارے بھائی ہیں۔ اور پھر ہمارے پاس عمارہ بھی ہے۔ لیکن فلک کے پاس کوئی بہن نہیں ہے۔ تو آج سے زارا کو صرف فلک ہی گود میں اُٹھائے گا۔''

''کبھی کبھی عثمان اور احسان بھی اُٹھا لیں گے۔'' انہوں نے بھی فراخ دلی سے اعلان کیا تھا۔

اُس روز دادا جان کا فون آیا تو انہوں نے بڑی خوشی سے دادا جان کو بتایا تھا کہ زارا کو مصطفیٰ نے مجھے دے دیا ہے۔ اور دادا جان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ زارا کے لئے بہت سی چاکلیٹس لائیں گے۔ بس وہ اپنے پاپا کے لئے بہت سی دعائیں کریں۔ اُس روز ان کا آپریشن تھا۔ ''الریان'' میں محبتیں ہی محبتیں تھیں۔ ان سب نے پاپا کے لئے بہت سی دعائیں کی تھیں۔ بڑی اماں نے آس پاس سے خواتین کو بلا کر قرآن خوانی کروائی تھی اور دعا کی گئی تھی۔ دادا جان بھی کہتے تھے کہ ان کا آپریشن کامیاب رہا ہے۔ وہ ری کور کر رہے ہیں۔ بس آپ ان کے لئے دعائیں کرنا۔ دادا جان ہر بار کہتے تھے اور وہ ہر بار انہیں یاد دلاتے تھے کہ انہیں پاپا کو ساتھ لے کر آنا ہے۔ وہاں ہسپتال میں ہی نہیں چھوڑنا۔ انہیں پاپا بہت یاد آتے تھے۔ ایک بار دادا جان نے ان کی بات بھی کروائی تھی ان سے۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ اور انہوں نے ان سے کہا تھا۔

''آپ کو ہمیشہ بہادری کے ساتھ مشکلات اور غموں کو برداشت کرنا ہے۔''

پاپا نے اور بھی کچھ کہا تھا لیکن ان کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ وہ سمجھ نہیں پائے تھے۔ تب دادا جان نے انہیں بتایا تھا کہ وہ پاپا کے ساتھ بہت جلد پاکستان آ رہے ہیں۔

دادا جان نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ وہ پاپا کو اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ لیکن اس طرح نہیں جیسے وہ گئے تھے۔ بلکہ تابوت میں بند، خاموش، آنکھیں بند کئے وہ پُرسکون نیند سو رہے تھے۔

ایک اور منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔

''الریان'' کے لان میں وہ عمارہ کا ہاتھ تھامے ٹہل رہے تھے۔ اور عمارہ انہیں بتا رہی تھی کہ وہ پڑوسیوں کے ڈوگی سے بالکل نہیں ڈرتی۔ اور ابھی ڈوگی باہر نکلے گا تو دونوں اسے دیکھنے چلیں گے۔ تبھی مصطفیٰ اندرونی دروازہ کھول کر تقریباً بھاگتے ہوئے لان میں آئے تھے۔

''مومی!......مومی! آپ کے......''

یہ نام احسان نے انہیں دیا تھا۔ اسے فلک مراد شاہ بہت مشکل نام لگتا تھا۔

''فلک یعنی sky.....آپ کا نِک نیم کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ سب فلک ہی کہتے ہیں۔ ہاں، دادی کبھی کبھی فلکی کہہ کر بلا لیتی ہیں۔''

''نہیں......فلکی تو لڑکیوں والا نام ہے۔'' احسان کو اعتراض ہوا تھا۔ ''میں شانی ہوں تو تم مانی۔ ٹھیک؟''

''لیکن مانی تو مالی چاچا کا بیٹا ہے۔'' عثمان کو اعتراض ہوا تھا۔

''تو پھر مومی ٹھیک رہے گا۔''

یوں ''الریان'' میں آنے کے ٹھیک ایک ماہ بعد وہ فلک سے مومی بن گئے تھے۔

مصطفیٰ ان کا ہاتھ پکڑے انہیں اندر لے گئے تھے۔ لونگ روم میں سب جمع تھے۔ بینا چچی، بڑی اماں، عبداللہ چاچو، اماں جان اور مرتضیٰ۔ بابا جان رو رہے تھے۔ اور بڑی اماں ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے انہیں تسلی دے رہی تھیں۔

''وہ میرا بہت پیارا دوست تھا، اماں جان!...... بہت اچھا، بہت حساس دل۔''

پھر ان کی نظر فلک پر پڑی اور وہ تڑپ کر اُٹھے اور اسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھرلیا اور پہلے سے زیادہ شدت سے رونے لگے تھے۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں۔ انہونی کا احساس ان کے دل میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بابا جان کے بازوؤں میں دبکے سہمے سہمے سب کی پُرنم آنکھوں کو دیکھ رہے تھے۔ تب عبداللہ چاچو نے اُنہیں عبدالرحمٰن کے بازوؤں سے نکالا تھا۔

''بھائی! حوصلہ کریں۔ آپ نے فلک کو پریشان کر دیا ہے۔ بچہ خوف زدہ ہو گیا ہے۔'' بڑی اماں ان کے پاس بیٹھے ہولے ہولے ان کی پیٹھ سہلا رہی تھیں اور نرم لفظوں میں انہیں تسلی دے رہی تھیں۔

''عبداللہ! تم...... تم بتا دو فلک کو۔ میں نہیں بتا سکتا۔''

وہ تیز تیز چلتے لونگ روم سے نکل گئے تھے اور عبداللہ چچا نے انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بہت نرمی اور دھیمے لہجے میں دنیا کی سب سے سفاک حقیقت بتائی تھی۔ لیکن ان کے دل نے کسی بھی حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ دو روز بعد جب وہ بابا جان، عبداللہ چاچو، اماں جان اور مرتضیٰ بھائی کے ساتھ بہاول پور جا رہے تھے، تب بھی ان کے دل نے تسلیم نہیں کیا تھا کہ ان کے اتنے اچھے پاپا اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔ اور دو تین روز بعد بابا جان اُن کی میت لے کر آ رہے ہیں۔

پھر ایک اور منظر آنکھوں کے سامنے سے آ کر گزر گیا۔

وہ دادا جان کی گود میں سر رکھے لیٹے تھے اور بابا جان ان کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔

''اب مجھے اجازت ہے چچا جان؟''

''کاش میں تمہیں روک لینے پر قادر ہوتا۔ عبدالرحمٰن تو کبھی نہ جانے دیتا۔ تم اتنے دن یہاں رہے، ہمارا درد بانٹا، ہمیں احساس دلایا کہ ہم سلجوق کے بعد تنہا نہیں ہیں۔ تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں عبدالرحمٰن!''

''چچا جان پلیز!''

بابا جان نے یکدم سر اٹھا کر دادا جان کو دیکھا تھا۔

''آپ شرمندہ نہ کریں۔ میں سلجوق کی جگہ نہیں لے سکتا۔ لیکن مجھے آپ اپنا بیٹا ہی سمجھیں۔ میں آپ سے دُور نہیں۔ جب آپ کو میری ضرورت ہو، مجھے بتایئے گا۔ میں خود بھی آپ سے غافل نہیں رہوں گا۔ میں نے سلجوق سے وعدہ کیا تھا کہ میں ہمیشہ......''

ان کی آواز بھرا گئی تھی اور وہ دادا جان کے گلے لگ کر رونے لگے تھے۔

''میرا سلجوق مجھے کمزور کر گیا عبدالرحمٰن! مجھے تو اس کے کندھوں پر سفرِ آخرت کرنا تھا اور......''

''چچا جان! آپ نے خود کو مومی کی خاطر سنبھالنا ہے۔ مومی کو آپ کی ضرورت ہے چچا جان! اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے ساتھ لے جاؤں۔ بچوں کے ساتھ اس کا دل بہل جائے گا۔''

''نہیں عبدالرحمٰن! اس کی چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ پھر میں اور اس کی دادی جان کیسے رہیں گے اس کے بنا؟''

وہ اپنے دادا جان کے ہمراہ ''مراد پیلس'' آ گئے۔ وہ ''الریان'' جانا چاہتے تھے۔ انہیں سب یاد آ رہے تھے۔ عثمان،

احسان، زارا، عمارہ۔ لیکن وہ دادا جان اور دادی جان کے ساتھ بھی رہنا چاہتے تھے۔ دادا جان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں کبھی کبھی ''الریان'' میں سب سے ملانے لے جایا کریں گے اور ابھی ان کے پاپا کو اس دنیا سے گئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ آ گئیں۔

''میں زریں ہوں، سلجوق کی سابقہ بیوی۔ میں نے تین چار ماہ پہلے فون کیا تھا کہ میں اپنے بچے کو لینے آ رہی ہوں۔ لیکن آپ اور سلجوق، بچے کو لے کر غائب ہی ہو گئے۔''

''ہم غائب نہیں ہوئے تھے۔ میں سلجوق کو علاج کے لئے انگلینڈ لے کر چلا گیا تھا اور......''

''بچے کو کہیں چھپا دیا۔'' زریں نے بات کاٹی۔ ''جب بھی میں نے فون کیا، میں اپنے بچے سے ملنے آ رہی ہوں، سلجوق کی والدہ نے جواب دیا کہ بچہ فی الحال یہاں نہیں ہے۔ اب کہاں ہے میرا بچہ؟''

اس وقت وہ اور دادا جان، پاپا کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر آ رہے تھے۔ وہ گیٹ کے پاس ہی انہیں ملی تھی۔ غیر ارادی طور پر دادا جان کی گرفت ان کے ہاتھ پر مضبوط ہو گئی تھی۔

''آپ اندر چل کر بات کریں۔ اور مومی بیٹا! آپ اندر جائیں۔''

تب اس خاتون نے پہلی بار غور سے انہیں دیکھا تھا۔

''یہ......میرا بیٹا ہے نا۔'' اور پھر جیسے یقین نے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی تھی۔ وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھی تھی۔

''کیا......کیا نام ہے اس کا؟''

''فلک......فلک مراد شاہ۔'' دادا جان کے لبوں سے نکلا تھا۔ مگر وہ اس کی پھیلی بانہوں کو نظر انداز کر کے اندر بھاگ گئے تھے۔

پھر ایک اور منظر بدلا۔

ان کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی وہ عورت اور عاجزی سے بات کرتے دادا جان، خاموش بیٹھی دادی جان اور دادی جان سے جڑے بیٹھے وہ......

''زرین بیٹا! آپ نے سلجوق کو لکھ دیا تھا کہ آپ کا اپنے بیٹے سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے اور آپ اپنی مرضی سے اسے اس کے باپ سلجوق کے حوالے کر رہی ہیں۔'' دادا جان کا لہجہ دھیما تھا۔

''لیکن اب سلجوق مر چکا ہے اور یہ میرا بیٹا ہے۔ ماں سے زیادہ کس کا حق ہے بیٹے پر؟'' اس کے لہجے کی بے رحمی انہیں بہت بری لگی تھی۔

''اُس وقت یہ ممتا کہاں تھی، جب صرف دو دن کا چھوڑ کر چلی گئی تھیں تم؟......صرف آٹھ دن کا تھا یہ، جب میری گود میں سلجوق نے اسے ڈالا تھا۔ میں نے راتوں کو جاگ کر اسے پالا ہے۔ اب تم حق دار بن کر آ گئی ہو۔ جاؤ، راہ دیکھو اپنی۔ دھکے مار کر نکلوا دوں گی باہر......میرے بیٹے کی قاتل ہو۔ مار دیا تم نے میرے بیٹے کو۔''

دادی جان یک دم غصے میں آ گئی تھیں اور وہ سہم کر دادا جان کے پاس جا بیٹھے تھے۔ دادا جان نے معذرت طلب نظروں سے زریں کو دیکھا تھا۔

''جوان بیٹے کی موت کا صدمہ ابھی تازہ ہے۔ آپ ان کی باتوں کا برا مت ماننا۔ جب آپ کا فون سلجوق کے پاس آیا تھا کہ آپ اپنے بیٹے سے ملنا چاہتی ہیں تو اس کے صرف تین دن بعد ہماری لندن روانگی تھی۔ سلجوق زندہ رہتا تو وہ ضرور آپ سے آ کر رابطہ کرتا۔ اب بھی آپ جب چاہیں، آ کر ملیں۔ جتنے دن چاہیں، حویلی میں رہیں۔ لیکن اسے ہم سے جدا نہ کریں۔ یہ ہمارا اکلوتا پوتا ہے۔ سلجوق کا وارث۔'' دادا جان اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہے تھے، منتیں کر رہے تھے۔

اور پھر ایک اور منظر......

وہ عورت، جس کے متعلق دادا جان نے بتایا تھا کہ وہ ان کی ماما ہیں اور انہیں لینے آئی تھیں، ان کے دل میں ان کے لئے کوئی جذبہ پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ دادی جان سے لپٹے جا رہے تھے۔

''میں نہیں جاؤں گا کبھی بھی۔''

دادی جان زار و قطار روئے جا رہی تھیں۔ بار بار انہیں لپٹاتی، چومتی تھیں۔ دادا جان خاموش کھڑے تھے۔ اور وہ عورت لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ لئے انہیں دیکھ رہی تھی۔ دادی نے اس سے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کا بچے پر کوئی حق نہیں ہے۔ اس روز تو وہ چلی گئی تھی لیکن اس نے بچے کی کسٹڈی کے لئے کیس کر دیا تھا۔

وہ ماں تھی...... اس کا حق صائب تھا۔ پھر وہ برطانوی شہری تھی۔ اس کی پشت پر اس کا سفارت خانہ تھا۔ انہوں نے بہت بڑا وکیل کیا تھا۔ لیکن عدالت نے زریں کے حق میں فیصلہ دیا تھا اور اس دن وہ بڑے غرور سے سر اٹھائے یوں دادی جان کو روتے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی تماشا ہو۔ پھر اس نے انہیں دادی کی آغوش سے کھینچ لیا۔

''بس کریں یہ ڈرامہ۔''

''بیٹا! کبھی کبھی ہم اس سے بات کر سکتے ہیں؟'' دادا جان سراپا التجا بنے کہہ رہے تھے۔

''نہیں۔'' اس نے سختی سے منع کر دیا۔ ''آپ چاہتے ہیں کہ یہ کبھی وہاں ایڈجسٹ نہ ہو سکے۔''

تب انہوں نے اس عورت کے لئے اپنے دل میں بڑی نفرت محسوس کی تھی۔

''تو بیٹا! یہ ہمارے سارے کونٹیکٹ نمبر رکھ لو۔ کبھی کوئی مسئلہ ہو، کوئی ضرورت پڑے...... یا یہ کبھی ضد کرے تو بات کروا دیا کرو۔''

دادا جان نے التجا کی تھی اور اس نے پتہ نہیں کیا سوچ کر وہ نمبر لے لئے تھے۔

پھر یکے بعد دیگرے کئی منظر نگاہوں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ فلک شاہ نے دونوں ہاتھوں سے سر کی کنپٹیوں کو دبایا۔ لندن میں اس شاندار اپارٹمنٹ میں فیروز خان جھگڑ رہا تھا۔

''اسے کسی چائلڈ کیئر ہوم میں بھیج دو۔ میں اسے یہاں برداشت نہیں کر سکتا۔''

''تم ہی نے کہا تھا، اسے لے کر آؤ۔'' زریں اس سے زیادہ اونچی آواز میں چیخی تھی۔

''ہاں۔ لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ سر پر سوار کر لو۔ میں نے کہا تھا، جو شخص لندن جیسے شہر میں اس مہنگے ترین علاقے میں دو دن کے بچے کے عوض اتنا لگژری اپارٹمنٹ دے سکتا ہے، وہ بچہ مانگنے پر مزید بہت کچھ دے سکتا ہے۔''

''لیکن...... میں نے تمہیں بتایا تھا کہ سلجوق مر چکا ہے۔''

''تم تو احمق عورت! بجائے اس کے کہ اس کے دادا سے سودا کرتیں، اسے اٹھا کر لے آئیں۔ اتنی بڑی حویلی، جائیداد دیکھ کر رال ٹپک پڑی ہوگی تمہاری۔ اور تم نے سوچا ہوگا کہ اس کے توسط سے اتنی دولت کی مالک بن جاؤ گی۔''

''تو یہ راہ بھی تم نے دکھائی تھی۔ تم ہی نے کہا تھا، لے آؤ۔ بالغ ہونے پر وراثت کا دعویٰ کر دینا۔''

''میں نے تمہیں یہ بھی تو بتایا تھا کہ قانوناً تم دعویٰ کر کے کچھ حاصل نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ اسلام میں باپ کی زندگی میں بیٹا فوت ہو جائے تو وراثت ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے یوں ہی بات چیت اور سودے بازی سے حاصل کر لو کچھ۔ لیکن آٹھ سالوں بعد ممتا اُبل پڑی تھی تمہاری۔ دے دو اسے کسی یتیم خانے میں یا اس کے دادا سے اس کا خرچ مانگو۔''

یہ باتیں ہر تین چار دن کے وقفے سے دہرائی جاتیں۔ پھر فیروز پاؤں سے ٹھوکریں مارتا غصے سے باہر چلا جاتا۔ زریں کبھی کبھی فیروز کے غصے سے سہم جاتی۔ اسے چیزوں کے ٹوٹنے کا بہت دکھ ہوتا تھا جو فیروز کی ٹھوکروں کی زد میں آتی تھیں۔ اور پھر وہ بھی فیروز کی طرح غصہ کرنے لگے۔

کھانا پسند کا نہ ہوتا تو برتن پھینک دیتے۔ اسکول جانے کو جی نہ چاہتا تو بیگ کو ٹھوکر مار کر اپنے کمرے میں گھس جاتے۔ زریں کبھی کبھی حیران ہو جاتی۔

"سلجوق تو ایسا نہ تھا۔ تم کس پر چلے گئے؟ وہ تو بہت دھیمے مزاج کا تھا۔"
لیکن ان چار سالوں میں جو انہوں نے زریں کے ساتھ گزارے تھے، وہ بہت غصیلے اور چڑچڑے ہو گئے تھے۔
تین سال بعد زریں اور فیروز کا زبردست جھگڑا ہوا تھا۔ زریں نے فیروز کو گھر سے نکلنے کو کہہ دیا۔
"یہ میرا گھر ہے۔ تم جہاں چاہو، چلے جاؤ۔"
اُس روز زریں نے تین سال بعد ان کی دادا جان اور دادی جان سے بات کروائی تھی۔
دادی تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھیں۔
"یہ تم ہو نا مومی!..... میری جان! میرے بچے!...... تم ٹھیک ہو نا؟"
دادا جان سے بھی بات نہیں ہو رہی تھی۔ خود انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں۔ وہ بھی بس روئے جا رہے تھے۔
"میں ٹھیک ہوں دادا جان!"
کچھ دنوں بعد فیروز گھر آ گیا تھا لیکن زریں اُس سے کم کم بات کرتی تھی۔ پھر وہ کچھ بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ اکثر کام پر نہ جاتی۔ کئی دن اسے ہاسپٹل بھی رہنا پڑتا تھا۔ ایسے میں وہ اُنہیں اپنی سہیلی، لارا کے پاس چھوڑ جاتی۔ اب کبھی کبھی وہ ان کی دادا جان سے بھی بات کروانے لگی تھی۔
اور پھر ایک اور منظر......
وہ ایئرپورٹ پر اس عورت کو خدا حافظ کہہ رہے تھے، جو اُن کی ماں تھی لیکن کبھی بھی اُنہیں ماں کی طرح نہیں لگی تھی۔
لیکن اس وقت ایئرپورٹ پر اُسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہ اُداس تھے۔
"مجھے یقین ہے، تم وہاں بہت خوش رہو گے۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت ظلم کیا کہ تمہیں وہاں سے لے آئی۔ مجھے معاف کر دینا۔"
"آپ بھی پاکستان چلیں اور وہاں ہمارے ساتھ رہیں۔ دادا جان کبھی منع نہیں کریں گے۔" پہلی بار انہوں نے اس عورت کے لئے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ محسوس کیا تھا۔
"ہاں! مجھے علم ہے، وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ تمہارے پاپا بھی بہت اچھے تھے۔ میں دراصل بہت بیمار ہوں۔ اگر میں صحت یاب ہو گئی تو تم سے ملنے آؤں گی۔"
لیکن وہ ٹھیک نہیں ہوئی اور ان کے پاکستان آنے کے صرف چھ ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اپنی موت سے صرف دو دن پہلے اس نے ان سے بات کی تھی اور ان سے دعا کرنے کے لئے کہا تھا۔
"الریان" سے سب ہی انہیں ملنے آئے تھے۔ "مراد پیلس" میں ان کی واپسی پر جشن کا سماں تھا۔
بابا جان چار سالہ زارا کو بھی لائے تھے اور مصطفیٰ نے جو چار سالوں میں بہت بڑا بڑا لگ رہا تھا، ہنستے ہوئے اسی بے تکلفی سے کہا تھا۔
"زارو! یہ ہے تمہارا پکا والا بھائی۔ ہم تو سب کچے بھائی ہیں۔"
اور زارا شرما کر بابا جان کے پیچھے چھپ گئی تھی۔
وہ واپس آ کر خوش تھے۔ دادا جان نے انہیں سکول میں بھی داخل کروا دیا تھا۔ چھٹیوں میں وہ "الریان" جاتے اور دو ہفتے وہاں ٹھہرتے۔
اور کبھی "الریان" سے سب مراد پیلس آ جاتے تو رونق ہو جاتی۔ پھر بھی کبھی کبھی دل بے طرح اُداس ہو جاتا۔ زریں یاد آ جاتی جو ان کے لئے فیروز سے لڑتی تھی۔ اب بھی انہیں کبھی کسی معمولی بات پر بھی غصہ آ جاتا تو وہ کنٹرول نہ کر پاتے۔ دادا جان حیران ہوتے اور سمجھاتے۔
"بیٹا! اپنے غصے پر کنٹرول کیا کرو۔ یہ تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ لیکن باوجود کوشش کے وہ کنٹرول کر ہی نہ پاتے تھے۔

دادا جان انہیں دو تین بار ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر گئے تھے۔
''یہ اگریسو ہو جاتا ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔''
''وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر نے کہا تھا۔
لیکن وقت کے ساتھ یہ تو ہوا تھا، وہ غصہ کم کرنے لگے تھے۔ لیکن جب غصہ آ جاتا تو سنبھالا نہ جاتا۔
ایک گہری سانس لے کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ باہر سے عمارہ کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کسی سے بات کر رہی تھی۔ پھر ان کے کانوں میں انجم کی آواز آئی۔
تب ہی عمارہ اور انجم اندر داخل ہوئیں۔ انجم نے بڑی وارفتگی کے ساتھ ان کے ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لئے۔
''کیسے ہیں بابا؟''
''بالکل ٹھیک۔'' وہ مسکرائے اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔
''اور تم ٹھیک ہو نا؟...... جواد کیسا ہے؟''
''ہم دونوں ٹھیک ہیں۔ جواد مجھے گیٹ پر ہی چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ کھانے تک آ جائیں گے۔'' عمارہ نے مسکرا کر انجم کو دیکھا۔
''اگر تم نہ آتیں تو میں خود فون کرنے والی تھی۔ تمہارے بابا آج بہت اُداس ہو رہے تھے۔ اب تم دونوں باپ بیٹی باتیں کرو۔ میں ذرا رقیہ بی کو کھانے کا بتا دوں کہ کھانے پر جواد بھی ہوگا۔''
وہ جو کچھ دیر پہلے پریشان ہو رہی تھیں، اب مطمئن سی ہو کر باہر نکل گئیں اور فلک مراد شاہ، انجم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

❁○❁

برش کرتے ہوئے اس نے آئینے میں اپنا بغور جائزہ لیا اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ نیلی آنکھیں، براؤن بال۔ پہلی نظر میں تو وہ کوئی غیر ملکی لگتا تھا۔
''یہ آپوں آپ کیوں مسکرایا جا رہا ہے؟'' سمیرا نے برآمدے میں بچھی ٹیبل پر ٹرے رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
احمد رضا نے برش آئینے کے سامنے لگے ریک پر رکھتے ہوئے بغیر مڑے جواب دیا۔
''یونہی۔'' اور پھر مڑ کر ٹیبل کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
اس نے احمد کو مکھن لگا کر سلائس پکڑایا اور اپنے لئے سلائس کے اندر تھوڑا سا آملیٹ بھر کر رول سا بنا لیا۔ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے احمد نے سمیرا کی طرف دیکھا۔
''سمو! کیا تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو؟''
''ہاں۔ غیر مطمئن ہونے والی کون سی بات ہے؟'' سمیرا نے اپنے کپ میں چائے اُنڈیلی اور احمد کی طرف دیکھا۔
''کیا تم مطمئن ہو رضی؟''
احمد رضا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے سمیرا کی طرف دیکھا۔
''پتہ نہیں، میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں یا نہیں۔ لیکن میں ایک اور زندگی کے متعلق ضرور سوچتا ہوں۔ ایک ایسی زندگی جو اس زندگی سے مختلف ہو، جو میں جی رہا ہوں۔''
آج پتہ نہیں کیوں اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے احساسات کسی سے شیئر کرے اور سمیرا سے بہتر سامع اور کون ہو سکتا تھا؟
''کیسی زندگی رضی!''

''پتہ نہیں کیسی زندگی۔ ابھی میرے سامنے کوئی واضح خاکہ نہیں ہے۔ لیکن میرے اندر خاکے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ گڈمڈ ہوتے رہتے ہیں۔''

سمیرا نے حیران ہو کر اپنا کپ ٹیبل پر رکھا اور اُلجھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''اس زندگی میں کیا برائی ہے رضی؟''

وہ اس سے چار سال بڑا تھا لیکن دونوں میں اتنی دوستی تھی کہ وہ اسے اکثر اس کا نام لے کر ہی بلاتی تھی۔

''برائی؟'' اُس کے لبوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ یہ گھر ویسا ہی تھا جیسا ایک عام متوسط طبقے کا گھر ہوتا ہے۔

صاف ستھرا صحن اور برآمدہ۔ صحن اور برآمدے میں پچھلے سال ہی ٹائلیں لگوائی تھیں۔ برآمدے میں دائیں طرف دیوار پر آئینہ لگا تھا۔ آئینے کے سامنے بریکٹ تھی، جس پر کنگھی، برش، کریم وغیرہ پڑی تھی۔ سامنے کی طرف برآمدے میں دو تین کرسیاں اور ایک لکڑی کا تخت پڑا تھا۔ بائیں طرف دائیں کونے میں ڈائننگ ٹیبل تھی۔ سردیوں میں برآمدے میں ڈائریکٹ دھوپ آتی تھی اور گرمیوں میں وہ لوگ چقیں گرا دیتے تھے۔ برآمدے میں بائیں طرف ہی کچن تھا۔ عموماً سردیوں گرمیوں میں ناشتہ، کھانا یہاں ہی کھایا جاتا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر تین کمرے تھے۔ ایک کمرہ جس کا دروازہ گلی کی طرف بھی کھلتا تھا، ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہ گھر اس کے دادا کا بنایا ہوا تھا۔ ایک کمرہ اماں ابا کا تھا اور ایک کمرہ کافی عرصہ پہلے تک اس کا اور سمیرا کا مشترکہ تھا لیکن چند سال پہلے جب ابا نے اوپر کی منزل بنوائی تھی تو وہ اوپر منتقل ہو گیا تھا۔ اوپر جدید فیشن کے مطابق دو بیڈ روم مع اٹیچڈ باتھ تھے اور ایک ٹی وی لاؤنج تھا۔ اس کے ابا حسن رضا گریڈ سترہ کے افسر تھے اور وہ ٹھیک ٹھاک اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے بچوں کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔

سمیرا رضا اور احمد رضا دو ہی بچے تھے ان کے۔ انہوں نے اچھے اداروں میں انہیں تعلیم دلوائی تھی۔ وہ یو۔ای۔ٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا جبکہ سمیرا نے ابھی ابھی کنیئرڈ میں ایڈمیشن لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔

بچپن سے ہی دونوں بہن بھائی پوزیشن ہولڈر رہے تھے۔ گھر میں اگر ماں باپ کی محبت ملی تھی تو سکول کالج میں بھی وہ ہمیشہ نمایاں رہے تھے۔ ساتھی طلباء اور اساتذہ نے ہمیشہ انہیں سراہا اور محبت دی تھی۔ سمیرا کو اس زندگی سے کبھی کوئی گلہ نہیں رہا تھا بلکہ ایک طرح سے وہ اپنی زندگی کو شاندار کہہ سکتی تھی۔ پھر...... پھر بھلا یہ رضی اس طرح کیوں کہہ رہا ہے؟

وہ ابھی بھی اُلجھی اُلجھی سی اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُسے خاموش دیکھ کر اُس نے اپنی بات دہرائی۔

''بتاؤ نا، کیا برائی ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے چونک کر سر جھٹکا۔

''تم نہیں سمجھو گی سمو! جو میں سوچتا ہوں۔ تم نے بھلا زندگی کو دیکھا ہی کب ہے، جو تم جان سکو کہ اس زندگی میں کیا برائی ہے۔ تمہاری زندگی تو گھر اور کالج تک محدود ہے اور بس۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن تم مجھے بتاؤ تو سہی، تم کیسی زندگی کے خواب دیکھتے ہو؟''

''میں نے کہا نا، ابھی کچھ بھی واضح نہیں ہے میرے سامنے۔ لیکن میں ایسی گمنام زندگی بھی نہیں جینا چاہتا۔ اللہ نے مجھے خصوصی ذہانت سے نوازا ہے۔ مجھے ایک شاندار پرسنالٹی عطا کی ہے۔ جانتی ہو وہاں یونیورسٹی میں لڑکیاں تو لڑکیاں، لڑکے بھی مجھے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک جاتے ہیں۔''

سمیرا کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس کے دل میں خود بخود ہی اپنے بھائی کے لئے ایک فخر سا آ گیا تھا۔

''تمہیں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اللہ نے تمہیں یہ سب عطا کیا ہے تم خوش نصیب ہو رضی! کہ لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں، چاہتے ہیں۔''

''لیکن سمو!...... میں چاہتا ہوں صرف چند لوگ میری تعریف نہ کریں، بلکہ ایک دنیا مجھے جانے اور پہچانے اور میرے بعد بھی لوگ صدیوں تک میرا نام لیتے رہیں۔''

''ہو سکتا ہے رضی!'' سمیرا خالی برتن ٹرے میں رکھنے لگی۔''تم ایک بڑے انجینئر بن جاؤ اور اپنے شعبے میں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دو۔ کوئی اہم ایجاد کرلو، ایسی کہ تاریخ کے صفوں میں تمہارا نام ہمیشہ کے لئے امر ہو جائے۔''

سمیرا کی آنکھیں بھی چمکنے لگی تھیں۔ جیسے اس کا خواب اس کی آنکھوں میں اُتر آیا ہو۔ لیکن اسے ایجادات وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ کوئی چھڑی گھمائے اور راتوں رات اس کا نام پوری دنیا میں پھیل جائے۔ لیکن ایسا کیا ہو؟...... کیسے ہو؟...... یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

وہ صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ کا ہی نہیں، پوری یونیورسٹی کا پاپولر اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ تیسرے سال میں تھا لیکن اسے پوری یونیورسٹی کے طلباء و طالبات جانتے اور پہچانتے تھے۔ پروفیسرز اُسے سراہتے تھے۔ وہ پڑھائی کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی آگے آگے ہوتا تھا۔ اللہ نے اسے بے حساب صلاحیتوں سے نوازا تھا اور اب وہ ان صلاحیتوں کا استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کیسے؟...... یہ اسے ابھی تک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس نے کرسی دھکیلی اور کھڑا ہو گیا۔

''او کے سمو! میں اب چلتا ہوں۔ تم کب سے کالج جا رہی ہو؟''

''ابھی تو اسٹوڈنٹ ویک ہی چل رہا ہے۔ پڑھائی تو ہوتی نہیں۔ جب پڑھائی شروع ہو گی تو جاؤں گی۔''

اس نے سر ہلا کر اسی ڈائننگ ٹیبل پر پڑی اپنی فائل اُٹھائی اور اس کی طرف دیکھا۔

''یار! تم کیوں نہیں حصہ لیتیں ان ایکٹیوٹیز میں؟''

''مجھے نہیں پسند۔ خوامخواہ ٹائم ویسٹ ہوتا ہے۔'' سمیرا نے ٹرے اٹھائی۔

''پاگل ہو تم.... کوئی ٹائم وائم ویسٹ نہیں ہوتا بلکہ کونفیڈنس پیدا ہوتا ہے۔ خیر، اگلی دفعہ تم ضرور پارٹی سپیٹ کرنا۔''

''اچھا بھائی! اب جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔'' سمیرا نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا اور وہ صحن میں کھڑی اپنی بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

❁○❁

''وہ سڑک کے کنارے چلتے چلتے بھاگنے لگی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور بالکل غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ پتہ نہیں کون تھی؟ میں نہیں جانتا تھا۔ وہ کیوں بھاگ رہی تھی؟ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی پتہ نہیں کیوں، میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ شاید وہ کسی مشکل میں تھی۔ شاید کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا لیکن میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ تو کیا وہ مجھ سے خوف زدہ ہو کر بھاگ رہی تھی۔ لیکن میں تو اسے نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میں تو صرف اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس سنسان دوپہر میں تن تنہا اکیلی اس ویران سڑک پر کہاں جا رہی ہے۔

میں لمحہ بھر کے لئے ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ بھی بھاگتے بھاگتے شاید تھک گئی تھی۔ اس کی چٹیا کے بال بھاگنے سے کھل گئے تھے۔ وہ مجھے رُکتے دیکھ کر خود بھی رُک گئی اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ میں ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو دیکھا، اس کے لانبے سیاہ بالوں نے اسے پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ پشت پر، کندھوں پر، بازوؤں پر اس کے بالوں کا آبشار گرا ہوا تھا۔ میرا جی چاہا، میں ریشم کے ان لچھوں کو چھو کر ان کی نرماہٹ محسوس کروں لیکن میں یوں ہی کھڑا رہا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں...... کیا پوچھوں...... پھر مجھے اُس کی سسکیوں کی آواز سنائی دینے

لگی۔ وہ رو رہی تھی اور اس کی سسکیاں مجھے بے چین کر رہی تھیں۔

''تم کون ہو پیاری لڑکی! اور کیوں رو رہی ہو؟'' میں نے بے حد نرمی سے پوچھا تو اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کے رخسار اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سیاہ آنکھوں میں بلا کا حزن تھا۔

''حورِ عین!'' بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔ ''تم کیوں بھاگ رہی تھیں اور کس سے؟''

''پتہ نہیں...... شاید اپنے آپ سے۔ لیکن بھلا کوئی اپنے آپ سے بھی کہاں تک بھاگ سکتا ہے؟''

اس طرح روتے ہوئے مجھے وہ لطیفہ حدانیہ لگی...... جسے اپنے محبوب کی قبر پر بال بکھرائے روتے دیکھ کر ہارون الرشید اپنا دل ہار بیٹھا تھا لیکن وہ لطیفہ حدانیہ نہیں تھی اور نہ ہی میں ہارون الرشید تھا۔''

عمر احسان، کلپ بورڈ پر لگے کاغذوں کو پڑھنے میں اتنا منہمک تھا کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ کب ایبک شاہ، واش روم سے بال پونچھتے ہوئے باہر آ گیا ہے۔ ایبک نے بال پونچھ کر تولیہ صوفے پر پھینکا تو عمر احسان نے چونک کر کلپ بورڈ واپس رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور وہ بہت عقیدت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایبک اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''تم بور تو نہیں ہوئے عمر!''

''نہیں...... بالکل نہیں۔ بلکہ میں آپ کی کہانی پڑھ رہا تھا۔ ابھی یہ مکمل تو نہیں ہے۔''

''ہاں یار!'' اب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے بال سنوار رہا تھا۔

''دراصل میں نے تمہارے دیئے ہوئے عنوان پر رات لکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن بات نہیں بنی۔''

''میرے؟'' عمر احسان کو از حد حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں۔'' ایبک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ ''یاد ہے، کل شام تم نے کیا کہا تھا؟''

عمر احسان کو یاد آیا۔ ''وہ، جو آپ نے اپنا خواب سنایا تھا تو میں سمجھا کوئی نئی کہانی ہے۔''

اور تمہاری بات سے ایک نئی کہانی کا عنوان تشکیل پا گیا تھا۔ ''زمین کے آنسو'' ...... اور میں نے سوچا، میں اس پر ایک کہانی لکھوں گا۔ سو رات لکھنے کی کوشش کی لیکن پتہ ہے، پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میرا قلم رک گیا۔ ورنہ جب میں قلم اُٹھاتا ہوں تو پھر خود بخود ہی کہانی بنتی چلی جاتی ہے۔''

عمر احسان بہت اشتیاق سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ''پہلے تو آپ کے ذہن میں ایک پورا پلاٹ بنتا ہوگا نا۔ لیکن اس طرح عنوان پر لکھنا مشکل ہوتا ہوگا۔''

''تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں، جب میں چھوٹا تھا نا، تقریباً دس سال کا، تو میں نے عنوان پر ہی لکھنا اسٹارٹ کیا تھا۔ ہمارے ٹیچر ہمیں ایک عنوان دیتے تھے اور ہمیں اس پر کچھ لکھنا ہوتا۔ مثلاً ظلم، عدل، موت وغیرہ۔ سب بچے چند جملے لکھتے اور میں ایک پوری کہانی تخلیق کر دیتا۔''

عمر احسان جو ہمیشہ ہی اس سے مرعوب رہتا تھا، کچھ اور مرعوب ہو گیا تھا کہ اس نے کتنی کم عمری میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی آج وہ اتنے بلند مقام پر تھا۔

''کیا خیال ہے اب، چلیں؟''

''کہاں؟'' عمر احسان نے بے خیالی میں پوچھا۔

''کیا تم نے ابھی کچھ دیر پہلے یہاں آتے ہی یہ نہیں کہا تھا کہ بابا جان کو بہت افسوس ہے کہ کل میں ''الریان'' آیا اور ان سے ملے بنا ہی چلا گیا۔ اور یہ کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''اوہ ہاں......'' عمر احسان کو یاد آیا کہ اس نے کچھ ایسی ہی بات کہی تھی کہ رات ڈنر کرتے ہوئے جب منیبہ شاہ نے اس کی آمد کا بتایا تھا تو بابا جان نے اس کے ملے بغیر چلے جانے پر اچھے خاصے افسوس کا اظہار کیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ

افسوس کرنے کے بعد جو کچھ انہوں نے کہا، وہ ہرگز ایسا نہیں تھا کہ ایبک فلک شاہ کو بتایا جاتا۔ منیبہ سے بات کرتے کرتے وہ احسان کی طرف مڑے تھے اور بہت آہستگی سے کہا تھا۔

''اپنے باپ کی طرح ہی ظالم اور کٹھور ہے۔''

احسان نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تھے لیکن صرف ''بابا جان!'' کہہ کر پلیٹ پر جھک گئے تھے۔ اور عمر احسان جس کا ایبک فلک شاہ سے بات کر کے جی نہیں بھرا تھا اور جسے منیبہ شاہ کی طرح اس بات کا ازحد دکھ تھا کہ رابیل احسان کے ساتھ برتھ ڈے ڈنر میں شریک نہیں ہو سکا۔ سو کل رات کی تلافی کی خاطر آج وہ اپنے کالج سے دو پیریڈ لے کر ہی نکل آیا تھا اور پورے راستے دعا مانگتا آیا تھا کہ ایبک فلک شاہ کہیں چلا نہ گیا ہو اور واقعی ایبک کرنل شیر دل کی انیکسی میں اپنے بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس کے تکیے کے پاس کتابوں اور اخباروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایبک نے کتاب تکیے کے پاس اوندھی کر کے رکھ دی۔ اس کے لبوں پر بڑی پُرخلوص سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے عمر احسان نے ایک بار پھر دعا کی تھی کہ ایبک اس کی بات نہ ٹالے اور اس کے ساتھ ''الریان'' چلا آئے اور شاید یہ کوئی قبولیت کا دن تھا کہ ایبک بنا کچھ کہے بیڈ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اس نے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ کمرے میں حدت تھی۔ شاید کچھ دیر پہلے ہی ہیٹر بند کیا گیا تھا۔ وہ اس انیکسی میں پہلے بھی تین چار بار آ چکا تھا۔ کرنل شیر دل نے یہ کمرہ بہت پہلے سے ہی ایبک کے لئے مختص کر دیا تھا اور جب وہ بہاول پور ہوتا تھا تو تب یہ کمرا بند رہتا تھا۔ بیگم شیر دل اُس کی غیر موجودگی میں اس کی صفائی وغیرہ کروا دیتی تھیں۔ عموماً یہ انیکسی گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ کرنل شیر دل کے فرینڈز یہاں آ کر ٹھہرتے تھے۔ لیکن جب چند سال پہلے ایبک فلک شاہ، یونیورسٹی میں تھا اور ہاسٹل میں رہتا تھا تو ایک شام فلک مراد شاہ نے اُنہیں فون کیا تھا۔ اُن کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ جیسے ڈھیروں آنسوؤں نے اُن کے حلق کو بھر دیا ہو۔

''شیری! میرا ایبک، یونیورسٹی ہاسٹل کے کمرے میں زخمی پڑا ہے اور میں دُور ہوں۔''

نہ فلک مراد شاہ نے مزید کچھ کہا تھا اور نہ ہی کرنل شیر دل نے مزید کچھ پوچھا تھا۔ وہ اسی وقت ایبک کو لے آئے تھے اور پھر جب ایبک کے زخم بھر گئے اور وہ یونیورسٹی جانے لگا، تب بھی انہوں نے ایبک کو ہاسٹل میں واپس جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تب سے اب تک یہ انیکسی ایبک کے لئے مختص ہو گئی تھی۔ وہ وقت بے وقت جب بھی آئے، اسے وہیں ٹھہرنا ہے۔ یہ کرنل شیر دل کا حکم تھا۔ اور یہ بات سب ملازم بھی جانتے تھے۔ مگر پتہ نہیں، وہ اتنا بھلکڑ کیوں تھا۔

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا اور کھڑا ہو گیا۔ پتہ نہیں وہ سچ مچ بھلکڑ تھا یا ایبک فلک شاہ کے سامنے بہت سی باتیں بھول جاتا تھا۔ کئی کئی دن وہ سوچتا رہتا تھا کہ اب کے ایبک آیا تو وہ اس سے یہ باتیں کرے گا، لیکن جب بھی ایبک آتا، وہ اس کی شخصیت کے سحر میں ایسا گرفتار ہوتا کہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔

''یہ لطیفہ حدانیہ کون ہے؟'' بائیک کو کِک مارتے ہوئے اس نے ایبک فلک شاہ سے پوچھا۔

''حمیصی ایک مشہور شاعر تھا۔ لطیفہ حدانیہ اس کی محبوبہ تھی۔'' اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے ایبک فلک شاہ نے بتایا اور عمر احسان نے سوچا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، جیسا بھی تھا لیکن لطیفہ حدانیہ یقیناً بہت خوب صورت رہی ہو گی۔

''ایبک بھائی! آپ نے جب بھی یہ کہانی مکمل کی، سب سے پہلے مجھے پڑھنے کے لئے دیجئے گا۔'' بائیک روڈ پر لاتے ہوئے اس نے ایبک فلک شاہ سے یقین دہانی چاہی اور وہ کبھی بھی عمر احسان کی بات نہیں ٹالتا تھا۔ اسے اپنا یہ کزن جو عمر میں اس سے کافی چھوٹا تھا اور اے لیول کر رہا تھا، بے حد عزیز تھا۔ اس کی سب اونگی بونگی باتیں وہ بہت دھیان سے سنتا تھا مگر پتہ نہیں کیا بات تھی کہ اسی عمر احسان کی بڑی بہن رابیل احسان کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ پہلے روز ہی جب وہ ہمدان مصطفیٰ کے ساتھ ''الریان'' آیا تھا اور ہمدان مصطفیٰ نے اس کا تعارف کروایا تھا۔

''یہ ہیں ایک فلک شاہ۔ عمارہ پھپھو کے بیٹے۔''

اور رابیل احسان جو ٹی وی لاؤنج میں اسی وقت داخل ہوئی تھی، کسی قدر نخوت سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر ہمدان مصطفیٰ سے اسی نخوت بھرے انداز میں کہا تھا۔

''یہ اتنے سالوں بعد آج تمہیں عمارہ پھپھو کے بیٹے کو ''الریان'' میں لانے کا خیال کیونکر آ گیا، جبکہ آج سے پہلے تو کبھی کسی نے ''الریان'' میں ایک فلک شاہ کا ذکر کیا، نہ ہی عمارہ پھپھو کا۔'' منیبہ شاہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اُٹھی تھی اور اُس نے رابیل احسان کو غصے سے دیکھا تھا۔

''یہ ضروری تو نہیں ہے کہ ہر شخص تمہیں سنا سنا کر عمارہ پھپھو اور ایک فلک شاہ کا ذکر کرے۔ اور عمارہ پھپھو کا نام تو ''الریان'' کی اینٹ اینٹ پر لکھا ہے۔ اور اس گھر کے در و دیوار نے اتنی بار عمارہ پھپھو، فلک مراد شاہ، ایک فلک شاہ اور انجم فلک شاہ کا ذکر سنا ہے کہ تم انہیں اُنگلیوں پر گن بھی نہیں سکتیں۔''

ایک فلک شاہ، جو رابیل احسان کی بات پر خاصا بد دل ہو کر سوچ رہا تھا کہ اسے ''الریان'' نہیں آنا چاہئے تھا، مسکرا کر اپنی اس مخلص سی کزن کی طرف متوجہ ہو گیا، جو بہت نرمی اور محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ منیبہ شاہ اس کے سب سے بڑے ماموں، مصطفیٰ عبدالرحمٰن شاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی اور اس نے پہلے ہی روز اس کے دفاع میں بول کر گویا ہمیشہ کے لئے اس کے دفاع کی ذمہ داری سنبھال لی تھی اور ہر لمحہ اس کی وکالت پر کمربستہ رہتی تھی۔

کرنل شیر دل کی انیکسی سے لے کر ''ایران'' تک کے سفر میں عمر احسان نے کل شام کی ساری روداد اُس کے کانوں میں اُنڈیل دی تھی اور ''الریان'' کے اندر داخل ہوتے ہوئے ایک فلک شاہ کے لبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ اس نے دعا کی تھی کہ کم از کم آج کے دن اس کا رابیل احسان سے ہرگز سامنا نہ ہو۔ کیونکہ آج وہ بہت دیر بابا جان کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا اور اسے آج ان سے بہت کچھ کہنا بھی تھا۔ بہت ساری باتیں تھیں، جو پچھلے کئی ماہ سے ان سے کہنا چاہتا تھا لیکن ہر بار کہتے کہتے رہ جاتا تھا۔ کل شام بھی رابیل احسان کی واضح ناگواری محسوس کر کے وہ جلدی چلا آیا تھا۔ ورنہ اس کا ارادہ رات الریان میں ہی ٹھہرنے کا تھا۔

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اسے احساس ہوا تھا کہ کبھی کبھی دعائیں پوری نہیں ہوا کرتیں۔ رابیل احسان اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ لاؤنج میں چائے کا بڑا سا مگ لئے کھڑی تھی۔

''ارے آپی! آج آپ یونیورسٹی نہیں گئیں؟'' عمر احسان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ وہ اپنی سرخ ہوتی ناک کو ٹشو سے صاف کرتے ہوئے عمر احسان کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ عمر احسان خجالت سے سر کھجانے لگا۔

''ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا۔'' ایک مدھم مسکراہٹ کے ساتھ ایک نے ہولے سے اس کا کندھا دبایا تھا اور پھر یوں ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے وہ بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز اخبار دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی یک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں اور چہرے سے خوشی جھلکنے لگی تھی۔ ہونٹ بے اختیار کھل گئے تھے۔ عمر نے دیکھا تھا کہ رات والے غصے اور ناراضی کے ان کے چہرے پر کوئی بھی آثار نہ تھے۔

''آؤ، آؤ بیٹا! بیٹھو میرے پاس اِدھر۔''

انہوں نے ٹانگیں سمیٹ کر اس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ ایک نے بیٹھنے سے پہلے جھک کر ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بہت عقیدت سے بوسہ دیا تھا اور عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھیں یک دم گیلی ہو گئیں۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔

''کل تم آئے اور چلے بھی گئے۔ تم کم از کم ڈنر تک تو رک جاتے۔ رابی کے برتھ ڈے پر سب کو باہر جانا تھا۔'' اس

کے بیٹھتے ہی انہوں نے گلہ کیا تھا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر معذرت کر لی۔
''میں ضرور رک جاتا۔ کم از کم آپ سے تو مل کر ہی جاتا۔ لیکن مجھے ضروری کام سے جانا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں آپ سے ملے بغیر بہاول پور چلا جاتا۔ اگلے دو دن میں بہت مصروف ہوں اور پھر پرسوں واپس جانا تھا تو اس لئے آج آ گیا۔ حالانکہ اس وقت ماموں جان وغیرہ سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔''
''لیکن بیٹا! رابی کی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کر لیتے۔ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی۔''
''لیکن بابا جان! کوئی بن بلائے کیسے کسی فنکشن میں شرکت کر سکتا ہے؟'' عمر احسان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں سے یک دم غصہ اور ناراضی جھلکنے لگی تھی۔
''کل شام ایبک بھائی کو کسی نے بھی ڈنر میں شرکت کے لئے نہیں کہا۔ ہاں، انفارم ضرور کیا تو؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے بابا جان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی اور اندر کہیں کسی گہرے دکھ نے دل کو اپنی گرفت میں لیا۔
'کیا ''الریان'' کے مکینوں کے لئے ایبک فلک شاہ ہمیشہ اجنبی اور غیر رہے گا؟...... کیا الریان پر میری عمارہ کا کوئی حق نہیں رہا؟...... کیا چھبیس سال پہلے کی گئی غلطی کا خمیازہ ہمیں ساری عمر بھگتنا ہو گا؟...... کاش! ہم عمارہ کو یہاں لا سکنے پر قادر ہوتے۔ کاش!'
'شاید یہ سارا ہمارا ہی قصور ہے۔ ساری غلطی ہماری ہے کہ آج ہماری عمو کا بیٹا اس گھر میں اجنبیوں کی طرح آ کر چلا جاتا ہے اور اس گھر کے کسی فنکشن یا کسی خوشی میں بھی کسی نے اسے شرکت کے لئے نہیں کہا۔ کاش! اس رات ہم نے ہی صبر کر لیا ہوتا۔ ہمیں اتنا غصہ نہ آتا۔ ہم اس طرح اُسے گھر سے نکل جانے کو نہ کہتے۔ روزِ محشر ہم مراد شاہ کو کیا منہ دکھائیں گے؟...... اور اگر سلجوق نے ہم سے پوچھ لیا۔ ''عبدالرحمٰن! تم تو میرے بھائیوں جیسے دوست تھے۔ پھر تم نے میرے بیٹے کو یوں خود سے الگ کر کے کیوں پھینک دیا؟ اور وہ صرف میرا بیٹا ہی نہیں، تمہاری عمارہ، تمہاری پیاری عمو کا شوہر بھی تو تھا۔'' پھر ہم کیا جواب دیں گے؟ ہم سے غلطی ہوئی تھی تو وہ ہی اتنے غصے میں نہ آتا۔'
اُن کا جی چاہا، وہ دھاڑیں مار مار کر روئیں۔
ہر بار کی طرح اس بار بھی ان کا جی چاہا کہ وہ اپنی ساری انا اور مصلحتیں ایک طرف رکھ کر اُڑتے ہوئے مراد پیلس جا پہنچیں اور اپنی عمو کو سینے سے لگا کر اتنا روئیں کہ چھبیس سالوں کی جدائیاں ان آنسوؤں میں بہہ جائیں۔ لیکن بیچ میں چھبیس سالوں کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ پاٹنے کے لئے جس حوصلے کی ضرورت تھی، وہ خود میں یہ حوصلہ نہیں پا رہے تھے۔
کاش انہوں نے یہ رابطے ختم نہ کئے ہوتے۔ آخر رابطے توڑنے میں کون سی مصلحتیں تھیں۔ فلک مراد شاہ اور عمارہ شاہ بھلے ''الریان'' نہ آتے لیکن رابطے اس طرح تو نہ ٹوٹتے کہ آج ایبک فلک شاہ ان کا اکلوتا نواسا ''الریان'' کے لئے اجنبی ہوتا۔ ایسا کیا تھا جس نے انہیں مراد پیلس سے ہر رابطہ توڑ کر دُور کر دیا تھا۔
انہوں نے تنہائی میں کتنی ہی بار سوچا تھا اور ہر بار کئی حقیقتوں کا انکشاف ہوا تھا۔ لیکن انہوں نے ہر بار ہی اپنا وہم سمجھ کر انہیں جھٹک دیا تھا اور خود ہی کو قصوروار گردانا تھا۔
ایبک نے ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بغور دیکھا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہولے سے دبایا تھا۔
''کل ہومی سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی تمہاری؟'' انہوں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔
''ارے بابا جان! ہومی بھائی بھی تو وہیں تھے۔ ہومی بھائی اور منیبہ آپا کو ہمیشہ کی طرح ان کے جانے کے بعد یاد آیا تھا کہ انہیں ایبک بھائی کو ڈنر پر انوائٹ کرنا چاہئے تھا۔'' غصہ اب بھی عمر احسان کی آنکھوں میں بل کھا رہا تھا۔
''اب غصہ تھوک بھی دو یار!'' ایبک مسکرایا۔ ''تم اپنے برتھ ڈے پر مجھے انوائٹ کرنا۔ میں ضرور آؤں گا۔''
عمر مسکرا دیا تھا۔

ایبک، عبدالرحمٰن صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا جو بہت محبت اور شفقت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''بابا جان اور ماما جانی بالکل ٹھیک ہیں۔'' اس نے ان کی آنکھوں میں اُبھرتے اس سوال کو پڑھتے ہوئے کہا تھا، جسے وہ ہزار کوششوں کے باوجود بھی زبان سے ادا نہ کر پا رہے تھے۔ ''انجی بھی مزے میں ہے۔ خوش ہے۔''

انجی..... ان کی عمو کی بیٹی۔ جسے انہوں نے دیکھا تک نہ تھا۔ اور کیا اس کا حق نہیں بنتا تھا کہ اس گھر کے اتنے لڑکوں میں سے کوئی ایک لڑکا......

انہوں نے دل میں اُٹھنے والے درد کو بے اختیار ہونٹ بھینچ کر برداشت کرنے کی کوشش کی۔

''کبھی انجی آپا کو بھی لے کر آیئے نا یہاں۔'' عمر احسان نے جیسے ان کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

''ہاں ضرور۔ جواد سے کہوں گا۔ بھئی اب انجی پر ہمارا اختیار کہاں؟'' وہ مسکرایا تھا اور ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''انجی کے سسرال والے کیسے ہیں ایبک! اور جواد خود؟'' آج پہلی بار انہوں نے خود سے کوئی سوال کیا تھا۔

''سب بہت اچھے ہیں بابا جان!'' اور تب ہی دروازہ کھول کر ثنا مامی اندر داخل ہوئی تھیں۔

''السلام علیکم مامی!'' وہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''ارے ایبک! تم......'' ثنا مامی کو سچی خوشی ہوئی تھی اسے دیکھ کر۔ ''بیٹھو...... بیٹھو بیٹا! کیسے ہو؟''

''جی ممانی جان! اللہ کا شکر ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہوں۔''

''اور عمو کیسی ہے؟..... اور فلک بھائی؟'' وہ جب بھی آتا، ثنا مامی سب کے متعلق بہت محبت سے پوچھتی تھیں۔

''بہت یاد آتی ہے عمو۔ بہت جی چاہتا ہے اس سے ملنے کو۔''

انہوں نے کبھی اپنے جذبے چھپائے نہیں۔ ہمیشہ برملا ان کا اعتراف کرتی تھیں۔ انہوں نے ہی ہمدان مصطفیٰ کو بہاول پور بھیجا تھا اور بتایا تھا کہ بہاول پور میں تمہاری ایک بہت پیاری پھپھو رہتی ہیں۔

ثنا مامی، مصطفیٰ ماموں کی بیوی تھیں۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ عرفان اور ان سے چھوٹی رانیہ کی شادیاں مرتضٰی کے گھر ہوئی تھیں اور وہ دونوں ہی فرانس میں رہتے تھے۔ خود مرتضٰی اپنی فیملی کے ساتھ بہت سال پہلے فرانس چلے گئے تھے۔ سال دو سال بعد ان کا چکر لگتا تھا۔ مرتضٰی کے ار چار بچے تھے۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ جبکہ منیبہ شاہ سب سے چھوٹی تھی اور کئی سال پہلے دادی جان نے اسے الریان میں ہی رکھ لیا تھا۔ رانیہ سے چھوٹا ہمدان مصطفیٰ اور پھر حفصہ تھی۔

''کل مجھے پتہ ہی نہیں چلا اور تم آکر چلے بھی گئے۔ اب تو رُکو گے نا...... کھانا کھا کر جانا۔'' باتیں کرتے کرتے وہ عمر کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

''جی ابھی کچھ دیر بابا جان سے گپ شپ لگاؤں گا۔ کھانے کی خیر ہے۔''

''ہومی بتا رہا تھا کہ آج کل کرنل شیر دل اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ تمہیں کھانے وغیرہ کی تکلیف ہوتی ہو گی۔''

''یہ ہومی بھی بس۔'' ایبک فلک شاہ نے دل ہی دل میں کہا۔

''آخر تم اتنی غیریت کیوں برتتے ہو بیٹا! تمہیں سیدھا ادھر ہی آنا چاہئے تھا۔ اور اب جتنے دن ہو، اِدھر ہی رُکو۔'' پھر اس کا جواب سنے بغیر وہ بابا جان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ایبک فلک شاہ کے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں۔

''بابا جان! آج آپ کے لئے کیا پکواؤں؟''

''جو جی چاہے بیٹا! بنوا لو۔''

''کتنے دن ہو گئے ہیں آپ کو سبزیاں کھاتے ہوئے۔ اب تک تو یورک ایسڈ صحیح ہو گیا ہو گا۔ سبزی کے ساتھ تھوڑی سی یخنی نہ بنوا لوں؟'' وہ کھڑی ہو گئی تھیں اور پھر جیسے انہیں یاد آیا۔

''رات عثمان بھائی کا فون آیا تھا۔ شاید وہ اگلے مہینے تک چکر لگائیں۔ میرا خیال ہے، وہ عادل اور حفصہ کی منگنی یا نکاح کرنا چاہ رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے، آ کر بابا جان سے بات کروں گا۔''

''ہاں بات ہوئی تھی میری اُس سے۔'' بابا جان نے آہستگی سے کہا۔ ''اس نے عادل کے لئے وہاں جاب کا انتظام کر رہا ہے تو چاہ رہا تھا کہ یہ کام بھی ہو جائے۔''

عادل عثمان اور مرینہ عثمان...... عثمان عبدالرحمٰن کے دو ہی بچے تھے۔ خود عثمان تو دبئی میں بینک آف انگلینڈ میں جاب کرتے تھے اور دونوں بچے تعلیم کی غرض سے ''الریان'' میں تھے۔ جبکہ وہ خود ہر سال دو ماہ کی چھٹی پر گھر آتے تھے...۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں عادل اور مرینہ وزٹ ویزے پر دبئی چلے جاتے تھے۔ عادل نے اکنامکس میں ماسٹرز کیا تھا اور چھ ماہ سے یہاں ایک پرائیویٹ بینک میں جاب کر رہا تھا۔ مرینہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھی۔

''رابی نے ناشتہ کیا؟'' بابا جان نے ثنا مامی سے پوچھا تو ایک نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''اس نے صرف چائے پی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اُٹھی ہے۔ بھابی بتا رہی تھیں، اسے کچھ فلو کی شکایت ہے۔''

انہیں اپنی یہ پوتی بہت پیاری تھی۔ جب بھی وہ اسے دیکھتے تو انہیں ایک کا خیال آتا تھا۔ اس وقت بھی جب ایک 'الریان' نہیں آتا تھا، وہ اس کے متعلق سوچتے ضرور تھے۔

''بابا جان! مما بتاتی ہیں کہ میرے دادا جان آپ کے بہت گہرے دوست تھے۔'' ثنا مامی کے ساتھ ہی عمر احسان بھی چلا گیا تھا۔

انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ جب سے وہ الریان آ رہا تھا کہ آج پہلی بار اسے یوں بابا جان کے پاس اکیلے بیٹھنے کا موقع ملا تھا اور آج وہ ان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا، بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ اس کے پاس بہت سے سوال تھے، جنہیں وہ بابا اور ماما سے نہیں کر سکتا تھا یا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''سلجوق میرا دوست تھا۔ میرا بھائی تھا۔ بہت ہی پیارا، بہت ہی عزیز تھا مجھے۔ اس سے رشتہ داری تو بہت دُور کی تھی، لیکن دلی تعلق بہت قریبی تھا۔ بہت خوب صورت تھا وہ۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کیا کوئی مرد بھی اتنا خوب صورت ہو سکتا ہے؟ اتنا حسین۔ اس پر اس کے مزاج میں بلا کا تحمل۔ عجب دل موہ لینے والی عاجزی تھی۔ جو بھی اس سے ملتا تھا، اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ فلک تو اس کے پاسنگ بھی نہیں ہے۔''

بابا جان کا بھی بڑے دنوں بعد جی چاہا تھا کہ وہ کسی کو اپنا سینہ کھول کر دکھائیں۔ وہاں کیسی خوب صورت اور المناک یادیں رقم تھیں۔ اور ایک فلک شاہ سے بہتر سامع اور کون ہو سکتا تھا۔ کتنے سارے سال ہو گئے تھے، انہوں نے کسی سے سلجوق، عمارہ اور عموی کی باتیں نہیں کی تھیں۔

آج ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یادوں کا پٹارہ کھول کر ایک ایک یاد ایک فلک شاہ کے سامنے رکھتے جائیں اور پھر اس سے پوچھیں کہ بتاؤ کیا سب ہمارا قصور تھا؟ اگر تھا تو ہم کہاں اور کتنے قصوروار ہیں؟

کیا یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم نے اپنی لاڈلی بیٹی، عمو کا ہاتھ فلک شاہ کے ہاتھ میں دیا تھا، محض ایک پرانے عہد کو نبھاتے ہوئے؟

یا پھر یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم موی کو اپنا سمجھ بیٹھے تھے۔ اس لئے ہم نے اسے ان غلط سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روکا تھا، سمجھایا تھا؟

اور اگر یہ ہماری غلطی نہیں تھی تو پھر عمو کی ماں سے ہم ساری زندگی کیوں نظر ملا کر بات نہیں کر سکے؟ کیوں ہمیں لگتا رہا کہ ہم ان کے مجرم ہیں؟

ان کی آنکھوں میں یک دم ہی نمی اُتری تھی اور ایک فلک شاہ نے جو بہت گہری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا، ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اس کے فون کی بیل بج اُٹھی۔ اس نے فون نکال کر دیکھا۔ فلک شاہ کا نمبر تھا۔ لبوں پر

مدھم سی مسکراہٹ لئے اس نے بابا جان کی طرف دیکھا۔
''بہاول پور سے فون ہے۔شاید ماما کا۔'' اس نے جان بوجھ کر ان کا نام لیا تھا۔
عبدالرحمٰن شاہ کے چہرے پر سایہ سا آ کر گزر گیا۔
''جی بابا! کیسے ہیں آپ؟'' اس نے فون کان سے لگایا۔لیکن پھر یکایک ہی اس کا رنگ بدل گیا۔وہ ایک دم گھبرا کر کھڑا ہوا۔دوسری طرف فلک شاہ رو رہے تھے۔
''ایبک! جلدی آ جاؤ۔تمہاری ماما ہسپتال میں ہیں۔''
''کیا......کیا ہوا ماما کو؟......وہ ہسپتال میں کیوں ہیں؟'' اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا تو عبدالرحمٰن شاہ کا دل یک دم جیسے ڈوب کر اُبھرا۔وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے لیکن وہ اُنہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔''بابا!......بابا! پلیز بولیں نا۔''

دوسری طرف سے بمشکل تمام فلک شاہ نے کہا تھا۔
''بس تم آ جاؤ......جانتے ہو نا، میں بہت کمزور ہوں۔''
''لیکن ماما......''
مگر فلک شاہ نے فون بند کر دیا تھا۔وہ فون جیب میں ڈالتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔اس نے مڑ کر عبدالرحمٰن شاہ کی طرف نہیں دیکھا تھا جن کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں پر ان کے آنسو گر رہے تھے۔زارا کے بعد اب عمارہ.....نہیں میرے اللہ!
''یا اللہ! میری بچی کو صحت و زندگی دینا۔''
ایبک فلک شاہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر تیزی سے لاؤنج کا دروازہ کھول کر پورچ کی سیڑھیاں پھلانگتا گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔عمر احسان نے اُسے ماما کے بیڈ روم کے کھلے دروازے سے باہر جاتے دیکھا تو تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔اور جب وہ گیٹ تک پہنچا تو وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔
وہ سر جھکائے واپس پلٹا۔آج کتنا اچھا موقع تھا کہ وہ جی بھر کر ایبک فلک شاہ سے باتیں کرتا لیکن مما نے بلاوجہ ہی اسے روک لیا تھا۔پتہ نہیں مائرہ احسان کو اس کا ایبک شاہ کے ساتھ ملنا اتنا ناپسند کیوں تھا۔
'ثنا چچی تو کہہ رہی تھیں کہ ایبک، لنچ ہمارے ساتھ ہی کرے گا۔پھر ایسا کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر ہی نکل گیا تھا۔' یہی سوچتا ہوا عمر جب بابا جان کے کمرے میں آیا تو وہ اپنی آنکھیں پونچھ رہے تھے۔
''کیا ہوا بابا جان! اور یہ ایبک بھائی اس طرح اچانک کیوں چلے گئے؟''
انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو آنسو ایک بار پھر ان کی آنکھوں سے چھلک پڑے۔وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔
''عمر! تم مجھے لے چلو گے؟......پلیز مجھے لے چلو۔'' انہوں نے عمر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
''کہاں؟......کہاں بابا جان؟......میں آپ کو لے چلتا ہوں بابا جان! پلیز ریلیکس۔''
''میری بچی......!''
لفظ اُن کے ہونٹوں میں ہی رہ گئے اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوئے۔اٹھارہ سالہ عمر نے اُنہیں سہارا دینے کی کوشش کی لیکن وہ گرتے ہی چلے گئے۔عمر نے بمشکل اُنہیں سنبھالا۔اُن کی آنکھیں بند تھیں۔عمر کو اُن کا جسم بے جان ہوتا لگا تو وہ بری طرح چیخنے لگا۔
''مما......مما......چچی جان......رابی آپی......!''

❀○❀

وہیل چیئر کے ہتھے پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے انہوں نے ایبک فلک شاہ کی طرف بے چینی سے دیکھا جو اپنی آستین

کے کف لگاتے ہوئے اندر آیا تھا۔

''بابا! میں اب چلتا ہوں۔''

''یار! مجھے بھی لے چلو عمارہ کے پاس۔ وہ ٹھیک ہے نا؟''

وہ ان کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے تھوڑا سا جھکا۔

''ماما بالکل ٹھیک ہیں بابا!......ابھی ابھی جواد کا فون آیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ ہم اُنہیں لے جا سکتے ہیں۔''

اُن کے پژمردہ چہرے پر ہلکی سی رونق آ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پھر پریشان نظر آنے لگے۔

''لیکن پھر جواد اسے لے کر کیوں نہیں آیا؟ تم کیوں جا رہے ہو؟......انجی اور جواد وہاں تھے نا تمہاری ماما کے پاس۔ ڈاکٹر نے جب اجازت دے دی تھی تو پھر وہ وہاں کیوں رکے ہوئے ہیں؟''

''اوہ بابا! آپ بہت وہمی ہو گئے ہیں۔'' ان کے کندھے سے ہاتھ اٹھا کر سیدھا ہوتے ہوئے ایبک مسکرایا۔ ''دراصل ماما کے جو ڈاکٹر ہیں نا، انہوں نے کہا ہے، ڈاکٹر مہدی آ جائیں تو ایک بار ان سے بھی چیک کروا لیں اور کچھ انسٹرکشن وغیرہ لے لیں۔''

''ڈاکٹر مہدی وہی نا جو ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں؟'' انہوں نے ایبک فلک شاہ کی طرف دیکھا۔

''جی بالکل وہی۔ جواد کہہ رہا تھا، گیارہ بارہ بجے تک آ جائیں گے۔ ویسے بابا! ماما کو پہلے تو کبھی ہارٹ کی تکلیف نہیں ہوئی۔''

''گوشت کا ایک ننھا سا لوتھڑا ہی تو ہے نا۔ کتنا جبر برداشت کر سکتا ہے؟'' انہوں نے ایک گہری سانس لی اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ لیکن پھر محض سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔ ایبک نے ٹیبل پر سے گاڑی کی چابی اُٹھاتے ہوئے بغور اُنہیں دیکھا۔ وہ جانتا تھا، وہ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ تین دن سے ان کی نظروں میں کیا سوال چھپا ہوا ہے۔ لیکن وہ کیا کہتا۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں تھا۔ خود اس نے بھی کئی بار سوچا تھا کہ الریان سے کسی کا فون کیوں نہیں آیا؟ اور نہیں تو کم از کم ہمدان مصطفیٰ کو تو پوچھنا چاہئے تھا۔ آخر بابا جان نے بتایا تو ہوگا کہ میں اچانک وہاں سے کیوں چلا آیا تھا۔ اور عمر احسان......نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے تین دن ان کے فون کا انتظار کیا تھا۔ بلکہ ایک، دو بار اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ کیا خبر، بابا جان ہی ماما کی بیماری کی خبر سن کر اُنہیں دیکھنے آ جائیں۔ اتنے اتنے دنوں کی جمی برف پگھل جائے، لیکن.......

''بیٹا! تم نے کیا بتایا تھا اُنہیں؟......تم اس وقت بابا جان کے پاس تھے، جب میں نے فون کیا تھا۔''

اتنے دنوں سے دل میں اُٹھتے سوال کو آج اِذنِ گویائی مل ہی گیا تھا۔

ایبک چونکا تھا۔ ''جی میں الریان میں ہی تھا تب۔ لیکن بابا! اتنا کمزور دل ہے آپ کا......آپ نے تو مجھے بھی بوکھلا دیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا، وہ سب جو آپ نے اپنے متعلق بتایا ہے...... وہ شاہی قلعہ کی قید...... وہ کوٹ لکھپت کی اذیتیں......وہ سب آپ نے برداشت کی ہیں۔''

''دیمک ......اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتی ہے بیٹا! اور مجھے بھی دکھ کی دیمک ہولے ہولے اندر سے چاٹ رہی ہے۔ الریان سے جدائیوں کا دکھ، تمہاری ماما کے رشتے چھن جانے کا دکھ......'' ان کے چہرے سے کرب جھلکنے لگا تھا۔

''وہ بھی ایک دور تھا، جب فلک مراد شاہ، شیر کی طرح دھاڑتا تھا اور پولیس والے بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ایک بار سوچتے تھے۔ جب زمین اس کے قدموں کی دھمک سے کانپتی تھی، اور......''

''بابا! پلیز لیو اِٹ (چھوڑیں) وہ سب۔ جو گزر چکا، بھول جائیں اسے۔''

''بھولنا ہی تو مشکل ہوتا ہے جانِ پدر!......خدا نہ کرے کہ تمہیں کبھی کچھ بھولنا پڑے۔ وہ سب لوگ جن کے ساتھ آپ کھیل کُود کر بڑے ہوئے ہوں، جن کی محبتیں آپ کے لہو میں خون کے ساتھ گردش کر رہی ہوں، ان محبتوں کو جوانی

کے جوش میں جھٹک کر آپ آ تو جاتے ہیں۔ لیکن بھلا خون میں گردش کرتی محبتیں بھلائی جا سکتی ہیں؟...... میں تمہاری ماما کا مجرم ہوں۔"

"پلیز بابا! آپ خود کو سنبھالیں۔" اس نے ان کے بازو کو ہولے سے تھپتھپایا۔ "کوئی کسی کا مجرم نہیں ہے۔ یہ سب ایسا ہی ہونا تھا۔ یہی تقدیر میں لکھا تھا۔"

"دیکھو نا ایبک! یہ الریان والے کتنے ظالم ہیں۔ عمارہ کی اتنی بیماری کا سن کر کوئی آیا تک نہیں۔ فون بھی نہیں کیا۔ ہے نا...... ہمدان نے بھی نہیں پوچھا اپنی پھپھو کا حال۔"

انہوں نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"ہوسکتا ہے بابا جان کی سمجھ میں ہی نہ آیا ہو۔ میں تو آپ کا فون سنتے ہی باہر نکل آیا تھا۔ آپ کے رونے نے مجھے بالکل حواس باختہ کر دیا تھا۔ انہوں نے شاید کچھ پوچھا تو تھا لیکن میں نے ہی مڑ کر انہیں جواب نہیں دیا تھا۔

اس نے ان سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔ حالانکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے خاصی بلند آواز میں بات کی تھی۔ لیکن فلک مراد شاہ رنجیدہ ہو چکے تھے۔ اس کے یہ لفظ بالکل کھوکھلے لگے تھے۔ انہوں نے اس کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ایبک نے ان کے بازو کو تسلی دینے کے انداز میں ایک بار پھر تھپتھپایا۔

"بابا! میں جا رہا ہوں اور آپ نے کچھ نہیں سوچنا، پلیز۔"

لیکن سوچوں پر بھی کبھی کسی کا اختیار ہوا ہے جو اُن کا ہوتا؟...... ایبک چلا گیا تھا اور وہ سوچوں ہی سوچوں میں الریان جا پہنچے تھے۔

"الریان" میں زندگی تھی۔ رونق تھی۔ خوشیاں تھیں اور محبتیں تھیں۔ جبکہ مراد پیلس میں خاموشیاں راج کرتی تھیں۔ دادی جان اور دادا جان کی بے تحاشا محبتوں کے باوجود کبھی کبھی ان کا دل مراد پیلس میں بے حد گھبرا جاتا تھا اور وہ الریان میں جانے کے لئے مچل اُٹھتے تھے۔

زریں کے ساتھ قیام کے چار سالوں نے انہیں ضدی بھی بنا دیا تھا۔ دادا جان اُن کی ضد پر اُنہیں ساتھ لے کر الریان آ جاتے۔

"عبدالرحمٰن بیٹا! سنبھالو اپنے بیٹے کو۔ اسے یہ بوڑھا دادا اب اچھا نہیں لگتا۔" وہ عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیتے ہوئے ہنسے تھے۔

"ایسا کرو اسے اپنا بیٹا ہی بنا لو۔"

"یہ میرا بیٹا ہی ہے چچا جان!"

عبدالرحمٰن شاہ اُسے گلے سے لگا لیتے۔ پھر الریان میں دن کیسے پَر لگا کر اُڑ جاتے تھے۔

"تمہاری دادی جان بہت اُداس ہو رہی ہیں مومی! کہو تو لینے آ جاؤں؟ رات بھی وہ رو رہی تھیں تمہیں یاد کر کے۔" دادا جان اسے جذباتی طور پر بلیک میل کرتے۔ وہ دادی جان اور دادا جان سے ملنے کو بے تاب ہو جاتے۔

"آ جائیں دادا جان!...... ابھی آ جائیں۔" وہ واپس مراد پیلس جانے کو بے چین ہو جاتے۔

"مت جاؤ یار! تمہارے بغیر دل نہیں لگتا۔" احسان اسے روکتا۔

"تو اب تم آ جاؤ میرے ساتھ وہاں مراد پیلس۔"

عمارہ تو ان کے جانے کا سن کر جو رونا شروع کرتی تو پھر اس کے جانے تک روتی رہتی تھی۔ الریان میں ان کا زیادہ وقت احسان، عمارہ اور زارا کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ عثمان، مرتضیٰ، مصطفیٰ تو اپنی پڑھائی میں مصروف رہتے تھے لیکن وہ تینوں بھی اس سے محبت کرتے تھے۔ وقت ملتا تو اس سے گپ شپ لگاتے تھے۔ وہ سب گھومنے بھی جاتے تھے۔ غرض الریان میں مزے ہی مزے تھے۔ لیکن وہ دادا جان اور دادی جن کے بغیر بھی تو زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ دو

یادوں میں بٹ چکے تھے۔ اس کے لئے آدھی دنیا الریان تھا تو آدھی مراد پیلس۔
وقت گزرتا رہا۔ وہ ایف اے میں پہنچ گئے۔ لیکن الریان سے ان کی محبتیں کم نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی آدھی چھٹیاں یہاں میں گزارتے تھے اور باقی آدھی چھٹیوں میں احسان، عمارہ اور زارا کو اپنے ساتھ مراد پیلس لے آتے تھے۔
انہوں نے ایف ایس سی میں بہاول پور بورڈ میں ٹاپ کیا تھا اور عبدالرحمٰن شاہ نے الریان میں اس خوشی میں ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ بہاولپور سے دادا جان اور دادی جان بھی آئے ہوئے تھے۔ مروہ پھپھو اور عبداللہ چچا بھی آئے تھے۔ مروہ پھپھو کی شادی کے بعد عبداللہ چچا اور بینا چچی بھی بحرین چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے بینا چچی نے اپنی بہن کا بیٹا لے لیا۔
عبدالرحمٰن شاہ اُن کی شاندار کامیابی پر بے حد خوش تھے۔
''چچا جان! آپ بہت لکی ہیں۔ میرے چاروں نالائقوں میں سے کسی نے آج تک بورڈ میں پوزیشن نہیں لی۔ وہ کتابی کیڑا مرتضیٰ بھی دو، چار نمبروں سے رہ جاتا ہے۔ وہ سلجوق بھی اتنا ہی لکی تھا۔ میں پڑھ پڑھ کر مر جاتا، لیکن پوزیشن ہمیشہ وہ لے جاتا تھا۔''
عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھوں میں پرانی یادوں کے جگنو دمک اُٹھے تھے۔ لیکن مراد شاہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔
''کاش! وہ اتنا اچھا نہ ہوتا۔ کبھی کوئی پوزیشن نہ لیتا لیکن میری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ رہتا۔ میرے جنازے کو کندھا دینے والوں میں وہ بھی ہوتا۔'' عبدالرحمٰن شاہ از حد نادم ہو گئے تھے۔
''سوری چچا جان! میں نے آپ کو سلجوق کا ذکر کر کے اُداس کر دیا۔''
''اُداس ہونے کے لئے سلجوق کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی عبدالرحمٰن! وہ تو کبھی ہمارے دلوں سے نہیں نکلا۔ کاش! میرا سلو ہوتا تو آج اپنے بیٹے کی کامیابی پر کتنا خوش ہوتا۔''
عبدالرحمٰن شاہ، مراد شاہ کو تسلی دینے لگے تھے۔ لیکن ان کے پیچھے کھڑے فلک مراد شاہ کے لئے محفل کی ساری رونقیں ایک دم پھیکی پڑ گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے بابا کے ساتھ کتنا تھوڑا وقت گزارا تھا۔ ان کی یادوں میں اپنے بابا کے ساتھ گزارے صرف چند گنے چنے دن تھے۔ وہ بے طرح اُداس ہو گئے تھے۔
عبدالرحمٰن شاہ کہتے تھے۔ اس کے بابا ایک بہترین انسان تھے اور باقی سب بھی کتنی تعریفیں کرتے تھے ان کی۔ لیکن اس کی یادوں میں صرف بیمار اور کمزور بابا تھے۔
عمارہ نے اُنہیں لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھا تو چونک گئی۔ ایک کونے میں کھڑے وہ بے حد اُداس اور افسردہ لگ رہے تھے۔
''مومی! کیا ہوا؟'' عمارہ نے قریب آ کر پوچھا۔
''کچھ نہیں...... یوں ہی۔'' وہ افسردگی سے مسکرا دیئے۔ اور عمارہ جانتی تھی کہ اس وقت انہیں کون یاد آ رہا ہو گا۔
عمارہ ان کے پاس کھڑی ہو کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی تھی۔ فلک شاہ اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ عمارہ ان کے قریب ہو اور وہ زیادہ دیر تک اُداس رہ سکیں۔ اب ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ بہت دھیان سے عمارہ کو دیکھ رہے تھے۔ گلابی اور فیروزی رنگ کے امتزاج کے سوٹ میں وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی اور دلکش تو وہ تھی ہی۔
''اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟'' عمارہ مسکرائی تھی۔
''قدرت کی صناعی۔''
عمارہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ وہ دونوں جو ایک دوسرے کے لئے اپنے دل میں محسوس کرتے تھے، انہوں نے کبھی اس کا تجزیہ نہیں کیا تھا۔ فلک شاہ کے لئے احسان، عمارہ، زارا سب ایک جیسے تھے۔ عمارہ کے لئے شاید کہیں کوئی اور

جذبہ بھی ہو، لیکن ابھی وہ ان پر واضح نہیں تھا۔

احسان نے پیچھے سے آ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”موی! تم نے آج کی بیوٹی کوئین دیکھی؟“

”میرے پاس ہی تو کھڑی ہے۔“

اُن کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے اور نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبائے انہوں نے عمارہ کی طرف دیکھا تھا، جس کے رخسار لمحہ بھر کے لئے گلنار ہو گئے تھے۔

”ارے یار! یہ تو اپنی عمو ہے۔ میں بیوٹی کوئین کی بات کر رہا ہوں۔“

”کیا اس محفل میں کوئی اور بھی بیوٹی کوئین ہے؟...... ورنہ اپنا تو یہ حال ہے......

وہ آئے بزم میں، اتنا تو ہم نے دیکھا میر
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی“

اُن کا دل یکایک ہی شرارت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اور ایک بار پھر عمارہ کے رخساروں پر جیسے لالے کے پھول کھل اُٹھے تھے اور اسی وقت فلک مراد شاہ کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔

دھڑکن کا یہ انداز بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ اب کے انہوں نے نظر بھر کر عمارہ کو دیکھا تھا۔

بلاشبہ وہ یہاں موجود سب لڑکیوں سے زیادہ دلکش تھی اور اپنے دل میں اُٹھنے والے انوکھے احساسات سے گھبرا کر وہ احسان کی طرف مڑ گئے۔

”کیا کوئی اور بھی ہے جسے بیوٹی کوئین کا اعزاز دیا جا سکتا ہے؟“ احسان شاہ نے لاؤنج میں داخل ہوتی مائرہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھی، واقعی حسین تھی۔ عمارہ کے چہرے پر کم عمری کی معصومیت تھی، بھولپن تھا۔ جبکہ وہ اپنے حُسن سے آگاہ تھی۔ اُس کی چال میں عجیب طرح کا بانکپن تھا اور اس کی گردن غرور سے تنی ہوئی تھی۔

”یہ بابا جان نے کن کن لوگوں کو بلا لیا ہے؟ حالانکہ وہ تو کہہ رہے تھے، صرف فیملی کے لوگ ہوں گے۔“ فلک مراد شاہ نے ایک نظر اس پر ڈال کر احسان شاہ سے پوچھا۔

”یہ مائرہ ہے۔ مروہ پھپھو کی بڑی نند کی بیٹی۔“

”خیریت ہے نا؟“ وہ تھوڑا سا احسان شاہ کی طرف جھکے۔

”شاید نہیں۔“ احسان شاہ نے شرارت سے کہا تھا اور فلک شاہ نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا اور پاس کھڑی عمارہ کی بالکل سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بات پر ہنس رہے ہیں۔ مائرہ ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد سیدھی اُن کی طرف آئی تھی۔

”عمو! تم یہاں کھڑی ہو اور باہر زارا تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ بلکہ رو رہی ہے۔ اور آنٹی تمہیں بلا رہی تھیں۔“

”اچھا۔ زارا کو کیا ہوا؟“ عمارہ جانے کے لئے مڑی تھی اور پھر جیسے کچھ خیال آتے ہی ٹھہر گئی۔

”موی! یہ مائرہ ہے۔ مروہ پھپھو کی نند کی بیٹی اور یہ موی ہے۔ آج کی دعوت اسی کی کامیابی کی خوشی میں ہے۔“

مائرہ نے نخوت سے اسے دیکھا تھا۔ ”مبارک ہو۔“

”تھینکس۔“ فلک بھی مسکرایا تھا۔

”اور آپ کیا کرتی ہیں؟“

”گریجویشن کر رہی ہوں۔“

پھر بابا جان نے انہیں بلا لیا تھا اور وہ مائرہ اور احسان کو وہیں چھوڑ کر بابا جان کی طرف چلے گئے تھے۔ پھر رات اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے احسان شاہ نے شرارت سے کہا تھا۔

"یار! لگتا ہے، میرا دل وہیں کہیں مائرہ حسین کے آنچل میں ہی اٹک کر رہ گیا ہے۔"
اور کون جانتا تھا کہ اٹھارہ سالہ احسان نے اس رات جو بات شرارت سے کہی تھی، وہ ایک دن سچ ہو جائے گی۔ اور احسان شاہ کا دل سچ مچ مائرہ حسین کے آنچل میں اٹک جائے گا۔ عمر میں اپنے سے ڈیڑھ، دو سال بڑی مائرہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن جائے گی۔ فلک شاہ نے اسی رات دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ وقت آنے پر عمارہ عبدالرحمٰن کو اپنی زندگی میں شامل کریں گے۔ اور دادا جان نے جیسے ان کے دل میں جھانک کر دیکھ لیا تھا کہ رات کو جب وہ سونے کے لئے جا رہے تھے تو انہوں نے عبدالرحمٰن سے کہا تھا۔
"عبدالرحمٰن! اپنی عمارہ کو میری بیٹی بنا دو۔ مومی کو سچ مچ اپنا بیٹا بنا لو۔"
اور عبدالرحمٰن نے کسی قدر حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔
"چچا جان! ابھی تو وہ دونوں بہت چھوٹے ہیں۔"
"ہاں عبدالرحمٰن! ابھی دونوں بچے ہیں۔ لیکن چھ سات سال بعد پتہ نہیں میں ہوں گا یا نہیں۔ سوچتا ہوں، اپنی زندگی میں ہی اسے......"
"چچا جان! اللہ آپ کو لمبی زندگی دے اور آپ مومی کی خوشیوں کو دیکھیں۔ عمارہ آپ کی ہی بیٹی ہے۔ آج بھی اور کل بھی۔"
عبدالرحمٰن کو بھی اس وقت ایک بہت پرانی بات یاد آ گئی تھی۔ وہ اور سلجوق کبھی کبھی بہت دُور تک سوچتے تھے۔
"سنو عبدالرحمٰن! جب ہمارے بچے بڑے ہو جائیں گے تو ہم اپنے بچوں کے رشتے ایک دوسرے سے کریں گے۔"
"اور اگر دونوں کے صرف بیٹے یا صرف بیٹیاں ہوئیں تو؟"
"ایسا نہیں ہوگا۔" سلجوق کو یقین تھا۔ "وعدہ کرو۔"
"وعدہ۔" نہر کے کنارے چلتے چلتے عبدالرحمٰن نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔
اور یہ پرانی یاد کیا آئی، انہوں نے نہ مرتضٰی، مصطفٰی سے پوچھا، نہ ان کی ماں سے، نہ عبداللہ اور مردہ سے ذکر کیا اور مراد شاہ کو زبان دے دی۔
"لیکن ابھی بچوں کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ خوامخواہ ڈسٹرب ہوں گے۔"
یہ عبدالرحمٰن کی خواہش تھی اور مراد شاہ جو دھوم دھام سے فلک کی منگنی کرنا چاہتے تھے، عبدالرحمٰن کی خواہش کے سامنے چپ کر گئے۔
وقت کچھ اور آگے سرکا تھا۔ احسان شاہ نے ٹاؤن پلاننگ اور انہوں نے سول انجینئرنگ میں ایڈمیشن لیا تھا۔ دادا جان کی خواہش تھی کہ وہ ہاسٹل میں رہیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ لاہور میں ہوں اور "الریان" میں نہ رہیں۔ عبدالرحمٰن تو بہت ناراض ہوئے تھے۔
"اپنے گھر کے ہوتے ہوئے آپ نے یہ کیسے سوچا کہ مومی ہاسٹل میں رہے گا؟"
"یہ چند چھٹیاں گزارنے کی بات نہیں ہے، چار سال یہاں رہنا ہے اسے۔" عبدالرحمٰن نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔
"چار سال رہے یا دس سال، مومی "الریان" میں ہی رہے گا۔"
اور مراد شاہ اُن کے اس خلوص و محبت کے سامنے مجبور ہو گئے تھے۔ وہ جب بھی چھٹیاں گزارنے آتے، احسان کے کمرے میں ہی ٹھہرتے۔ اب بھی انہوں نے الگ کمرے کے بجائے احسان کے کمرے میں ہی ٹھہرنا پسند کیا تھا۔
لاہور آ کر اس کی زندگی میں کئی تبدیلیاں آئی تھیں۔ یکایک ہی انہیں ادب اور سیاست سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور وہ اکثر ایک سیاسی تنظیم کے طلباء کے ساتھ نظر آنے لگے تھے۔ اب تک انہوں نے احسان کے علاوہ کسی کو دوست بنانے کی

ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن اب تھرڈ ایئر کا حق نواز اکثر ان کے ساتھ نظر آتا تھا۔ دونوں گھنٹوں اکٹھے رہتے تھے اور حق نواز، ملک کی قسمت بدلنے کی باتیں کرتا۔

''ہمارا ملک چند ہاتھوں میں یرغمال بنا ہوا ہے مومی! اور ہمیں ان ہاتھوں سے اسے چھڑانا ہے۔''

وہ بڑی جذباتی باتیں کرتا تھا اور فلک مراد شاہ بہت متاثر ہو کر اس کی باتیں سنتے۔

ایک بار احسان نے اُنہیں سمجھایا تھا۔

''مومی! بابا جان نے کہا تھا کہ ہمیں کسی بھی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہئے اور تم آج کل حق نواز کے ساتھ بہت نظر آ رہے ہو۔ یہاں حق نواز کی مخالف تنظیم کافی زور آور ہے۔ تم بھی نظروں میں آ رہے ہو۔ اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔''

''پتہ نہیں کیا بات ہے شانی! میرا دل اُچاٹ ہو گیا ہے پڑھائی سے۔ کتابوں میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ شاید یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔''

اور پھر انہوں نے یو۔ ای۔ ٹی کو دو سال بعد خیر باد کہہ دیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے میں ایڈمیشن لیا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا بیٹا؟'' عبدالرحمٰن صاحب کو بے حد رنج ہوا۔

''بابا جان! مجھے لگتا ہے کہ تعلیم میرے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ میں لٹریچر میں ماسٹرز کروں گا۔''

عبدالرحمٰن صاحب کو سلجوق یاد آ گیا تھا۔

''مجھے لگتا ہے جیسے یہ بھاری بھرکم کتابیں مجھے ڈس رہی ہیں۔ میرے اختیار میں ہو تو اُردو ادب یا انگریزی ادب میں ماسٹرز کروں۔ لیکن یہ بابا جان کی خواہش ہے کہ میں انجینئر یا ڈاکٹر بنوں۔ حالانکہ......''

وہ خاموش ہو گئے تھے۔ لیکن دل میں انہیں اس کے اس طرح یو۔ ای۔ ٹی چھوڑنے پر بڑا دکھ تھا اور انہوں نے اس کا اظہار مراد شاہ سے بھی کیا تھا۔

''چچا جان! مجھے مومی کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اپنا کیریئر ختم کر دیا ہے اس نے۔ انگلش لٹریچر پڑھ کر وہ کیا بن جائے گا؟ زیادہ سے زیادہ لیکچرار، پروفیسر۔''

تب بڑے رسان سے مراد شاہ نے کہا تھا۔

''اسے کچھ بننے کی کیا ضرورت ہے عبدالرحمٰن! یہ اتنی زمینیں، جائیدادیں اسی کی تو ہیں۔ زمینوں سے اتنا آتا ہے کہ وہ ایک شاندار زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ اپنے باپ کی طرح انجینئر بننا چاہتا تھا۔ میں نے اسے منع نہیں کیا۔ حالانکہ اس کی دادی جان اسے لاہور بھیجنا نہیں چاہتی تھیں۔ اب وہ لٹریچر پڑھنا چاہتا ہے تو بھی میں اسے منع نہیں کر سکتا۔ میں اسے خفا اور ناراض نہیں کر سکتا۔''

''لیکن چچا جان! آپ اسے سمجھا تو سکتے تھے۔ وہ کون سا اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اپنے فیصلے خود کرتا رہے۔ اللہ نے اسے اتنا چھا ذہن دیا ہے۔ اپنی ذہانت ضائع کر دے گا۔''

''ذہانت کیسے ضائع ہو گی عبدالرحمٰن بچے! لٹریچر میں اور وہ بھی انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرنا کوئی اتنا آسان بھی نہیں ہے۔''

عبدالرحمٰن شاہ نے پھر کچھ نہیں کہا تھا۔ شاید یہ مراد شاہ کا احترام تھا یا پھر مومی کے مزاج سے تھوڑی بہت واقفیت انہیں بھی ہو گئی تھی کہ اس روز کے بعد انہوں نے اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں کی۔ لیکن ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ فلک شاہ نے یہ ایک غلط فیصلہ کیا ہے۔ بہت سارے دن انہوں نے فلک شاہ سے معمول کے مطابق بات چیت نہیں کی تھی۔ بس ڈنر پر یا صبح ناشتے پر رسمی سی بات ہوتی تھی۔

فلک شاہ ان دنوں اتنا مصروف رہنے لگے تھے کہ انہوں نے عبدالرحمٰن شاہ کی اس خفگی کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ اگر وہ

یہ خفگی محسوس کر لیتے تو شاید وہ اپنا فیصلہ بدل لیتے۔ شاید زندگی کا آج یہ رنگ نہ ہوتا۔ پھر ہولے ہولے عبدالرحمٰن کے دل سے وہ ہلکی سی خفگی بھی ختم ہو گئی اور سب کچھ معمول کے مطابق چلنے لگا۔ وہ سلجوق کی نسبت سے انہیں پیارے تو تھے ہی، لیکن اب عمو کے حوالے سے اور بھی عزیز ہو گئے تھے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ حق نواز کے ساتھ ان کی دوستی بڑھتی جا رہی تھی اور حق نواز کے کہنے پر ہی انہوں نے اس کی سیاسی پارٹی جوائن کر لی تھی لیکن اس کا ذکر انہوں نے کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ احسان شاہ سے بھی نہیں، جن سے وہ اپنی ہر بات کرتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں، فلک شاہ کو لگا تھا کہ احسان شاہ کو ان کی یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ بلکہ اسے تو حق نواز کے ساتھ بھی ان کا اتنا گہرا تعلق پسند نہیں آیا تھا۔ تب ہی تو اس رات جب وہ اپنے کمرے میں آئے تھے اور احسان نے اچانک پوچھ لیا تھا۔ ''آج تم کہاں گئے تھے؟'' تو وہ سٹپٹا گئے تھے۔

''میں آج تمہارے کالج گیا تھا۔ لیکن تم وہاں نہیں تھے۔ تمہارا وہ کلاس فیلو، کیا نام ہے اس کا، منیب بتا رہا تھا کہ تم کالج آئے ہی نہیں ہو۔''

''اوہ ہاں۔ میں آج ذرا شاپنگ کے لئے چلا گیا تھا۔ کالج جانے کا موڈ نہیں تھا۔''

جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت تو نہ تھی لیکن محض اس کی خفگی کے خیال سے وہ نہیں بتا سکا کہ آج ان کی پارٹی کی میٹنگ تھی اور وہ حق نواز کے ساتھ پارٹی میٹنگ میں چلے گئے تھے۔

''اچھا۔ تمہیں شاپنگ کرنا تھی تو دونوں شام کو چلے جاتے۔ مجھے بھی کچھ چیزیں لینا تھیں۔'' پھر یکایک اس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ''کہیں تمہارا دل کالج سے بھی تو نہیں اچاٹ ہو گیا؟ اور تم کہیں کسی اور سبجیکٹ میں ٹرائی کرنا چاہتے ہو؟''

''ارے نہیں۔'' وہ بے اختیار ہنس دیئے۔ ''مجھے تو اب پتہ چلا ہے کہ مجھے یہی پڑھنا ہے۔ خوامخواہ سائنس پڑھ کر دماغ تھکاتا رہا۔''

''خیر، یہ تمہاری ذاتی رائے ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو تم سے اتفاق ہو۔''

''چلو یار! تم میری رائے سے اتفاق نہ کرو۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم کالج کیوں گئے تھے؟ اب یہ نہ کہنا کہ تم مجھ سے ملنے گئے تھے کیونکہ صبح شام تو تم میرا دیدار کر ہی لیتے ہو۔''

''پہلے تصحیح کر لو کہ صبح شام نہیں، صرف رات کو۔ کیونکہ دن کے باقی حصے میں تو تم دستیاب ہی نہیں ہوتے۔ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں گورنمنٹ کالج کیوں گیا تھا۔''

فلک شاہ دل ہی دل میں نادم ہوئے۔ ''سوری یار! ان دنوں تھوڑا مصروف رہا۔''

''تھوڑا نہیں بلکہ تم بہت زیادہ مصروف ہو گئے ہو۔ اور تمہارا زیادہ وقت حق نواز کے ساتھ گزرتا ہے۔ مومی! تم جانتے ہو، وہ پچھلے دو سال سے حکومت کی نظر میں ہے۔''

''لیکن شانی! حق نواز اچھا لڑکا ہے۔ محبِ وطن، سچا اور کھرا۔ بہت خوب صورت دل ہے اس کا۔''

''ٹھیک ہے، حق نواز ایسا ہی ہوگا، جیسا تم کہہ رہے ہو۔ لیکن یار! احتیاط کیا کرو۔ کہیں تم بھی نظر میں نہ آ جاؤ۔ وہ تو ایک بار جیل کی ہوا بھی کھا چکا ہے۔ لیکن تمہارے دادا جان تو......''

''اوکے یار!'' فلک شاہ نے اس کی بات کاٹی تھی۔ ''آئندہ احتیاط کروں گا۔ تم بتاؤ، تم کیوں کالج گئے تھے؟''

احسان شاہ کی آنکھیں یک دم لو دینے لگی تھیں۔ ''میں مائرہ سے ملنے گیا تھا۔''

''مائرہ سے؟'' فلک نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں۔ تمہیں علم نہیں ہے، وہ یہاں گورنمنٹ کالج سے ہی ماسٹرز کر رہی ہے، سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ میں۔''

''اچھا، میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا۔''

''لیکن اس نے تو تمہیں کئی بار دیکھا ہے۔ وہ فائنل ایئر میں ہے۔'' احسان نے کسی قدر جھجکتے ہوئے فلک شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

''تمہارا دل سچ مچ باغی ہو گیا ہے یار! تمہیں یاد ہے، تمہاری کامیابی کی خوشی میں دی جانے والی دعوت میں، میں نے پوچھا تھا۔ خیریت ہے؟ اور تم نے کہا تھا، خیریت نہیں ہے۔''

''ہاں! تب وہ صرف مذاق تھا موی! لیکن کل رات مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ دل تو بری طرح مائرہ حسین کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے اور میں صبح صبح اسے بتانے کے لئے بھاگا تھا کہ میں احسان شاہ...... مائرہ حسین سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

''تو پھر تم نے اُسے بتایا؟'' فلک شاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''نہیں یار! ہمت ہی نہیں ہوئی۔ لوگ پتہ نہیں کیسے اتنے لمبے لمبے محبت کے ڈائیلاگ بول لیتے ہیں۔ میں تو ایک جملہ نہیں کہہ سکا۔''

''ایسا کرو، دو چار زبردست رومانٹک قسم کی موویز دیکھ لو۔'' فلک شاہ نے بہت سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا تھا۔ اور احسان نے اس کے بازو پر مُکا مارتے ہوئے کہا تھا۔

''اللہ کرے تمہیں بھی کسی سے محبت ہو جائے۔''

''تمہیں کیا خبر احسان شاہ! کہ یہ دل تو روزِ اوّل سے ہی کسی کا دیوانہ ہو چکا ہے اور ہر گزرتا دن اس محبت میں اضافہ کر رہا ہے۔''

انہوں نے سوچا تھا اور بڑے خلوص سے دعا کی تھی کہ احسان شاہ اپنی محبت کو پالے۔

یک دم ہی گیٹ کھلنے کی آواز آئی تھی اور رقیہ بی نے کچن سے باہر آتے ہوئے کہا۔

''وہ لوگ آ گئے۔''

فلک شاہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور پھر انجم، عمارہ کو سہارا دیتے ہوئے ان کے بیڈ روم میں آئی۔ تین دن میں ہی کیسے نچڑ کر رہ گئی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

''بابا! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ماما اب بالکل ٹھیک ہیں۔''

انجم نے عمارہ کو بیڈ پر سہارا دے کر بٹھایا۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئیں۔ وہ اپنی وہیل چیئر بیڈ کے قریب لے گئے تھے اور بے اختیار ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ''عمو!''

عمارہ مسکرائی تھیں۔ ''آپ یوں ہی اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔''

تب ہی ایبک شاہ فون پر بات کرتا ہوا اندر آیا۔

''اوہ ہاں...... ہومی! کیسے ہو؟''

''پھپھو جان کیسی ہیں ایبک؟'' اس کے لہجے میں بے چینی تھی۔

'مجھے ابھی پتہ چلا، چند لمحے پہلے۔ میں تو ابھی آ جاتا۔ لیکن ادھر بابا جان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' ہمدان مصطفیٰ بتا رہا تھا۔

''کیا؟'' اس نے عمارہ کی طرف دیکھا اور بات کرتے کرتے باہر نکل گیا۔

''بابا جان مسلسل تین دن کی بے ہوشی کے بعد آج ہوش میں آئے ہیں۔ لیکن ابھی بھی ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹرز بھی کچھ نہیں بتا رہے ہیں ایبک!'' ہمدان کی آواز بھرّا گئی تھی۔

''ہمیں تو اس اچانک بے ہوشی کی وجہ سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد عمر، بابا جان کے کمرے میں گیا تھا تو...... آج ہوش میں آتے ہی انہوں نے عمارہ پھپھو کا پوچھا تھا۔ وہ بہت بے چین ہیں ایبک! وہ کہہ رہے تھے،

پھپھو ہسپتال میں ہیں۔ وہ......"

"ماما اب گھر آ گئی ہیں۔ بہتر ہیں۔ بابا جان کیسے ہیں؟"

"بابا جان ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہیں ایبک!" وہ یکدم رو پڑا تھا۔

"ایبک! تم پھپھو کو یہاں لے آؤ ہسپتال میں۔"

فون بند کر کے ایبک نے پریشانی سے سوچا، وہ کیسے، کس طرح ماما کو بابا جان کی بیماری کے متعلق بتائے؟ ان کا کمزور دل کیسے برداشت کر پائے گا؟ وہ وہیں لاؤنج میں ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

✿○✿

"نو بج گئے ہیں اور احمد ابھی تک نہیں آیا۔" حسن رضا نے ٹی وی بند کرتے ہوئے زبیدہ بیگم کی طرف دیکھا۔

"کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ دیر سے آئے گا؟"

زبیدہ بیگم نے اپنے دوپٹے پر کروشیے کی بیل بناتے ہوئے حسن رضا کو دیکھا۔

"مجھ سے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اس نے۔ شاید سمیرا سے بات کی ہو۔"

"سمو!" انہوں نے آواز دی تو سمیرا پلٹ آئی۔

"بیٹا! احمد کچھ بتا کر گیا تھا کہ کب آئے گا؟"

"نہیں ابو! لیکن وہ کئی دنوں سے لیٹ آ رہا ہے۔ مجھے آپ سے بات کرنا تھی۔ کل بھی آپ کے سونے کے بعد وہ چلا گیا تھا اور کافی دیر سے واپس آیا۔"

حسن رضا کی پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں۔

"خیر، تم کھانا لگاؤ۔ اور جب وہ آئے تو اسے میرے پاس بھیجنا۔"

سمیرا سر ہلا کر باہر چلی گئی۔

حسن رضا کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پچھلے کئی دنوں سے ان کا بلڈ پریشر ہائی تھا اور ڈاکٹر نے بلڈ پریشر کی ٹیبلٹ کے ساتھ انہیں سکون کی گولی بھی دی تھی، جسے کھانے کے بعد انہیں نیند سی آ جاتی تھی۔ عموماً ان کے ہاں رات کا کھانا آٹھ بجے تک کھا لیا جاتا تھا۔ کھانا کھاتے ہی وہ اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ اس لئے انہیں پتہ نہیں چل سکا تھا کہ احمد رضا دیر سے گھر آ رہا ہے۔ ورنہ ان کی سخت تاکید تھی کہ مغرب کے بعد وہ گھر سے باہر نہ رہے۔ آج ان کی طبیعت کافی بہتر تھی اور ٹی وی پر خبریں سننے کے بعد انہیں احمد کا خیال آیا تھا کہ وہ ابھی تک گھر نہیں آیا۔

"جوان بچہ ہے۔ آرام سے بات کیجئے گا۔" زبیدہ بیگم نے دوپٹہ لپیٹ کر شاپر میں رکھا۔

"عموماً مائیں ہی بچوں کو بگاڑتی ہیں۔" حسن رضا بڑبڑائے۔

"یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، دوست احباب ہیں۔ کہیں بیٹھ جاتا ہوگا۔"

"تو زبیدہ بیگم! یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ کہاں بیٹھتا ہے وہ؟ کیسی صحبت ہے؟"

زبیدہ بیگم نے اس کے کوئی جواب نہ دیا اور شاپر اٹھا کر ٹی وی کے پاس پڑی میز پر رکھا اور باہر نکل گئیں۔ سمیرا ٹیبل پر کھانا لگا رہی تھی۔

کھانا لگا کر اس نے آواز دی تو وہ باہر آ کر بیٹھے ہی تھے کہ دروازے پر بیل ہوئی۔ سمیرا نے روٹیوں والا ہاٹ پاٹ ٹیبل پر رکھا اور جانے کے لئے مڑی۔

"ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔" حسن رضا گیٹ کھول کر آ گئے۔ احمد ہی تھا۔ بائیک صحن میں کھڑی کر کے وہ برآمدے میں آیا تو سمیرا نے آواز دی۔

''رضی! ہاتھ دھو کر جلدی سے آجاؤ۔ ابھی کھانا لگایا ہے۔''
زبیدہ بیگم کو سلام کر کے رضی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا تھا۔
''تم آج کل بہت دیر سے آنے لگے ہو۔ کہاں جاتے ہو؟'' خالی برتن کچن کی طرف لے جاتے ہوئے سمیرا نے سنا،
حسن رضا پوچھ رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے احمد رضا سٹپٹایا۔
''وہ ابو! میں ایک دوست کے پاس جاتا ہوں۔''
''کون دوست؟''
''وہ...... وہ محسن ابو!...... وہاں اور دوست بھی ہوتے ہیں تو بس پھر گپ شپ میں وقت کا پتہ نہیں چلتا۔''
انہوں نے ہنکارا بھرا تھا۔ ''تم جانتے ہو، تمہارے لئے یہ کتنا قیمتی وقت ہے۔ ابھی تمہارے گریجویشن میں ڈیڑھ سال
ہے اور میں تمہیں ایم ایس سی کے لئے یو۔ کے بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تم
شاندار کامیابی حاصل کرو اور تمہیں باہر کا اسکالرشپ مل جائے۔ آج کے اس مہنگائی کے دور میں میرے لئے تمہاری ہائر
ایجوکیشن کے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہیں ہے۔''
''جی ابو! میں پڑھائی کی طرف سے غافل تو نہیں ہوں۔''
''جانتا ہوں۔ لیکن یہ وقت کا زیاں بھی صحیح نہیں ہے۔ اس طرح اگر تمہیں ان محفلوں میں وقت ضائع کرنے کا چسکا پڑ
گیا نا تو تم ایک دن پڑھائی سے بھی غافل ہو جاؤ گے۔''
''سوری ابو! آئندہ جلدی آجایا کروں گا۔''
''ٹھیک ہے۔'' وہ اُٹھے اور اس کا کندھا تھپتھپا کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے سمیرا سے چائے کی
فرمائش کر دی۔
''اچھا۔'' سمیرا نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔
سمیرا کام سے فارغ ہو کر چائے لے آئی تو وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور لبوں پر
مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ سمیرا نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا تو وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
''سمو کی بچی! تُو نے شکایت کی ابو سے میری؟''
''کیوں، کیا اُنہیں نظر نہیں آتا؟ وہ کب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔''
''آج انتظار کر رہے تھے۔ پہلے تو ان کے سونے کے بعد ہی جاتا رہا ہوں۔''
''ہاں تو تم کہاں جاتے ہو؟ جھوٹ بول رہے تھے نا ابو سے؟''
''مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی؟''
''یہ تو تمہیں پتہ ہوگا رضی! لیکن کل تمہارے جانے کے بعد محسن کا فون آیا تھا۔ ان کے چچا کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور
انہوں نے بتایا تھا کہ وہ گاؤں جا رہے ہیں اور میں تمہیں بتا دوں گی۔'' وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''تم نے فون ریسیو کیا تھا؟''
''ہاں!''
''تھینک گاڈ۔''
اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ سمیرا مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''اوہ ڈیئر سسٹر! اس طرح مشکوک نظروں سے مت دیکھو۔ میں کہیں ڈاکے مارنے نہیں جاتا۔''
''پھر کہاں جاتے ہو رضی؟ ابو نے تم سے بہت اُمیدیں وابستہ کی ہوئی ہیں۔'' سمیرا نے پوچھا۔
یکدم اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے اور وہ آلتی پالتی مار کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''پتہ ہے، ایک شخص ہے۔ اسمٰعیل نام ہے اس کا۔ وہ اللہ کا بہت برگزیدہ بندہ ہے۔ مجھے ایک یونیورسٹی فیلو اُس کی محفل میں لے کر گیا تھا۔ کیا مسحور کُن گفتگو کرتا ہے وہ۔ جی چاہتا ہے بس سنتے رہو۔ اتنے سارے لوگ ہوتے ہیں وہاں۔ لیکن اُس کی نظریں صرف مجھ پر ہوتی ہیں۔ پتہ ہے سمو! اس نے مجھ سے کہا کہ ایک روز میرا نام تمام دنیا میں پھیلے گا۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے، جب میں تمام دنیا میں پہچانا جاؤں گا اور میرے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگے ہوں گے۔''

''اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ شہرت تمہیں کس شعبے میں ملے گی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''دنیا میں تو ہٹلر اور چنگیز خان بھی مشہور ہوئے ہیں۔''

''سو واٹ!'' اس نے ناک چڑھاتے ہوئے چائے کا مگ اُٹھالیا۔ ''شہرت تو ہوتی ہے۔ اور ہٹلر بھی محبِ وطن تھا۔ جبکہ چنگیز خان اور ہلاکو بہادر تھے۔ اگر ایسی شہرت بھی مل جائے تو کیا کہنے؟''

''رضی!'' سمیرا نے آنکھیں پھیلائیں۔ ''تم ظالموں کو بہادر کہہ رہے ہو اور تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم شہرت حاصل کرنے کے لئے ہٹلر یا چنگیز خان بھی بن سکتے ہو؟''

''کہہ سکتی ہو۔'' اس نے کندھے اچکائے اور چائے پینے لگا۔

''رضی!'' سمیرا ایک دم پریشان سی نظر آنے لگی۔ ''تم یہ کس طرح سوچنے لگے ہو؟ ایسے اندھے خواب تو آدمی کو دلدل میں لے جاتے ہیں۔ تم بھی کہیں کسی دلدل میں نہ گر جاؤ۔ پتہ نہیں یہ شخص کون ہے اور......''

''اوہ مائی گاڈ!'' احمد رضا نے اس کی بات کاٹی۔ ''میری دادی اماں بننے کی کوشش مت کرو۔ مجھ سے بہت چھوٹی ہو۔''

''عمر میں چھوٹی ہوں۔ عقل میں نہیں۔''

''ایک تو بندہ یہاں کسی سے اپنے خواب بھی شیئر نہیں کر سکتا۔'' اس نے کپ زور سے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ سمیرا نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

''بہرحال جو بھی کرنا رضی! سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔ پتہ نہیں کیوں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ایک تو تم لڑکیاں بھی نا، خوامخواہ کے ڈر پالے رکھتی ہو۔ ابو کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہیں ملواتا کسی روز اسمٰعیل صاحب سے۔''

''مجھے نہیں ملنا کسی اسمٰعیل صاحب سے۔ اور تم بھی کم ہی ملا کرو۔ اپنی تعلیم پر توجہ دو۔'' سمیرا کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور احمد رضا نے ایک بار پھر آنکھیں موند کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔

پہلی بار وہ ابراہیم کے ساتھ اسمٰعیل صاحب کے گھر گیا تھا۔ اس روز وہ یونیورسٹی سے نکلا تھا تو اسے ابراہیم مل گیا۔

''یار! آج اسٹرائیک ہے۔ تم مجھے اپنی بائیک پر ڈیفنس لے چلو گے؟''

''ہاں۔ لیکن ڈیفنس میں کیا کام ہے تمہارا؟ تم تو گلبرگ میں رہتے ہو۔''

''ہاں۔ مجھے اسمٰعیل صاحب کے گھر جانا ہے۔ ایسا کرو، تم بھی چلو۔ چند روز قبل ہی میری ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن بہت متاثر کیا ہے انہوں نے مجھے۔ بہت نالج ہے ان کے پاس۔ اسلام، قرآن ہر چیز پر دسترس ہے انہیں۔''

اسے مضطرب دیکھ کر ابراہیم نے کہا۔

''یار! ایک بار مل کر تو دیکھو ان سے۔ اور کچھ نہیں تو مستقبل کا حال ہی پوچھ لینا۔''

''کیا نجومی بھی ہیں؟'' رضی کو یکایک دلچسپی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

''نہیں۔ نجومی نہیں۔ لیکن اللہ کے جو ولی ہوتے ہیں، وہ بعض اوقات مستقبل میں بھی جھانک سکتے ہیں۔'' ابراہیم نے بتایا۔

"لیکن یار! مجھے ان ولیوں، بزرگوں، بابوں سے ڈر لگتا ہے۔" وہ کچھ متذبذب سا تھا۔

"لیکن اسمٰعیل صاحب اس طرح کے بزرگ نہیں ہیں وہ تو بڑے فرینڈلی ہیں۔"

وہ ابراہیم کے ساتھ یوں ہی بغیر کسی ارادے کے کوٹھی کے اندر چلا گیا تھا۔ کوٹھی کے پورچ میں چھ سات کاریں کھڑی تھیں۔

وہ پورچ کی سیڑھیاں چڑھ کر جوں ہی اندرونی گیٹ کے سامنے پہنچے، دروازہ خود بخود کھل گیا۔ دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھے جس لڑکی نے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا تھا، اس پر ایک لمحے کو تو احمد رضا کو کسی حور کا گمان ہوا تھا۔ آسمانی رنگ کی میکسی کسی بہت اعلیٰ ریشم سے بنی ہوئی تھی جس پر کہیں کہیں مشقیں دمک رہی تھیں۔ اگر ابراہیم اسے ٹہوکا نہ دیتا تو وہ وہیں مبہوت کھڑا رہتا۔

"آئیے۔" لڑکی نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور مڑی۔

سنہری بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ابراہیم کے ساتھ ہولے ہولے چلتا ہوا ایک بڑے ہال میں پہنچا تھا۔ ہال میں تین اطراف کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ چھ سات کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ وہ سب تقریباً جوان تھے۔ سامنے ایک بڑی شاندار کرسی تھی۔ ہال کی چھت پر بڑے بڑے فانوس روشن تھے۔ بڑی کرسی کے پیچھے ایک پردہ تھا۔ پردے کے پیچھے شاید کوئی دروازہ تھا۔ ورنہ وہاں پردے کی موجودگی کچھ عجیب لگ رہی تھی۔ وہ حیران حیران سا ابراہیم کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر پردہ ہٹا۔ دو تین لڑکیاں پردے کے پیچھے سے نکلیں۔ ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھیں اور وہ سب ویسی ہی آسمانی میکسیاں زیب تن کیے ہوئے تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین کہ نگاہ کسی پر ٹھہرتی ہی نہ تھی۔

"حضرت صاحب ابھی تشریف لاتے ہیں۔ آپ لوگ مشروب سے لطف اٹھائیں۔" ایک لڑکی نے ہال کے وسط میں آ کر کہا۔ مگر وہ تو اس کی آواز کی نغمگی میں کھو سا گیا۔ دوسری دونوں لڑکیاں ٹرے اٹھائے باری باری سب کے سامنے رُکتیں، ذرا سا سر خم کر کے کہتیں۔ "پلیز!" اور آگے بڑھ جاتیں۔ ابراہیم اور احمد رضا نے بھی مشروب کا گلاس اُٹھا لیا تھا۔ وہ لڑکیاں پھر پردے کے پیچھے غائب ہو گئیں۔

اس نے شربت پی کر خالی گلاس ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ پردہ پھر ہٹا اور پردے کے پیچھے سے وہی لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ اب ان کی تعداد چھ تھی۔ تین تین لڑکیاں کرسی کے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے ایک جیسی قامت اور ایک ہی جیسے لباس والی ان لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا کہ پردے کے پیچھے سے ایک شخص نمودار ہوا۔

شلوار قمیض کے اوپر اس نے سنہری کناروں والا کالا جبہ پہنا ہوا تھا۔ چھوٹی سی سیاہ داڑھی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ ہلکا سانولا رنگ۔ اُس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو متوجہ کرتی۔

"یہی حضرت صاحب اسمٰعیل خان ہیں۔" ابراہیم نے کھڑے ہوتے ہوئے سرگوشی کی تو وہ بھی سب کے ساتھ احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔ ان کے بیٹھنے کے بعد سب لوگ بھی بیٹھ گئے تھے اور بیٹھنے کے بعد جب احمد رضا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ اس شخص کی کرسی کے پیچھے تین لڑکیاں کھڑی تھیں۔ سفید ریشم کی میکسیوں میں ملبوس، جن پر سلور رنگ کے ستارے جھلملا رہے تھے۔ ان کے لمبے بال ان کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

'کیا یہ کوئی خواب ہے؟' اس نے اپنے بازو پر چٹکی لی تھی اور پھر ابراہیم کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا ہم ماضی کے کسی لمحے میں ہیں اور یہ حسن بن صباح کی جنت اور اس کی پریاں ہیں؟"

"خاموش!" ابراہیم نے آہستگی سے کہا تھا۔ حضرت صاحب ان ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر ان کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی اور وہ ابراہیم سے مخاطب ہوئے۔

"یہ تمہارا مہمان ہے؟"

"جی...... جی حضرت صاحب!" ابراہیم نے جواب دیا۔

"فارنر ہے؟......غیر مسلم؟"

"نو......نو۔ میں پاکستانی ہوں۔ مسلم ہوں۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"تمہاری پیشانی پر تمہارے عروج کی داستان لکھی ہے جوان!..... بہت عروج ملے گا تمہیں۔ بہت نام کماؤ گے۔"

اور احمد رضا کا دل اتنی تیزی سے دھڑکا تھا کہ اس کی دھڑکن کی آواز وہ خود سن رہا تھا۔

یہ اسمٰعیل خان سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔

کیسا سحر طاری کر دینے والا ماحول تھا۔ اسمٰعیل خان نے لیکچر دیا تھا کوئی۔ اُس نے دھیان سے نہیں سنا کہ کیا کہا تھا انہوں نے۔ وہ تو سحر زدہ سا بیٹھا تھا اور اس کی نظریں بار بار ان لڑکیوں کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ اتنا حُسن۔

"یہ لڑکیاں کون تھیں ابراہیم؟" واپس آتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"یہ حضرت صاحب کی مرید ہیں شاید۔" ابراہیم کے پاس خود بھی زیادہ معلومات نہیں تھیں۔

"اور تم......کیا تم بھی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے ہو؟"

"نہیں......لیکن سوچ رہا ہوں۔ ابھی میں ٹھیک طرح سے ان کے عقائد و نظریات سمجھ نہیں پا رہا۔"

"کہیں یہ شخص آج کی یعنی ہماری تاریخ کا حسن بن صباح تو نہیں ہے؟" بے اختیار ہی احمد رضا کے لبوں سے نکلا۔

"معلوم نہیں۔" ابراہیم نے کندھے اُچکائے۔ "یہ جو کوئی بھی ہے، لوگ بڑی تیزی کے ساتھ اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر میری، تمہاری عمر کے لوگ۔"

"ہوں۔ لیکن مجھے کوئی چیز کھٹک رہی ہے۔"

احمد رضا نے اس وقت ابراہیم سے کہا تھا لیکن بعد کے دنوں میں وہ خود باقاعدہ طور پر اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا تھا۔ بلکہ چند ہی دنوں میں اسمٰعیل خان کے بہت قریب ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کے بعد سیدھا اس کی طرف چلا جاتا تھا۔ ابراہیم نے یکدم جانا چھوڑ دیا تھا اور اس کے استفسار پر اس نے جواب دیا تھا کہ مجھے یہ شخص فراڈ لگتا ہے۔ بہروپیا ہے۔ اللہ جانے اس کا مقصد کیا ہے؟ لیکن جب میں نے اس کے لیکچر کی "سی ڈی" دیکھی اور اس کے لیکچر پر غور کیا تو مجھے لگا ہے کہ در پردہ یہ شخص نعوذ باللہ خدائی کا یا نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ عنقریب یہ صاف لفظوں میں ایسا ہی کوئی دعویٰ کر دے۔"

"نعوذ باللہ۔" بے اختیار احمد رضا کے لبوں سے نکلا اور پھر اس نے مسکراتے ہوئے ابراہیم کو دیکھا تھا۔

"میرا اتفاقاً وہاں جانا شاید اس لئے ہو کہ اس مسیلمہ کذاب نے میرے ہی ہاتھوں قتل ہونا ہو اور مجھے شہادت کا مرتبہ نصیب ہونا ہو۔"

لیکن اس وقت احمد رضا نہیں جانتا تھا کہ آنے والے دنوں میں کیا ہونے والا تھا۔ اُسے شہادت نصیب ہونی تھی یا دنیا بھر کی ملامت اس کی جھولی میں پڑنے والی تھی۔

یکدم ہی دروازے پر بیل ہوئی تھی اور پھر شاید کوئی بیل پر سے اُنگلی اُٹھانا ہی بھول گیا تھا۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

بے اختیار سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر پڑی۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ گو لاہور کے حساب سے بہت زیادہ دیر تو نہیں ہوئی تھی لیکن ان کے ہاں تو نو بجے تک سب سو جاتے تھے برسوں سے یہی اصول چلا آ رہا تھا۔

'اس وقت کون ہو سکتا ہے؟'

بیڈ سے اُتر کر چپل پہنتا ہوا وہ دروازہ کھول کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سیڑھیاں اُترتے ہی اس نے دیکھا، حسن رضا بھی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے تھے اور اب صحن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دونوں آگے پیچھے ہی گیٹ تک پہنچے تھے۔

"کون ہے؟" حسن رضا نے بلند آواز میں پوچھا۔

''پولیس۔'' باہر سے آواز آئی۔

''پولیس؟'' حسن رضا نے دہرایا اور مڑ کر احمد رضا کی طرف دیکھا، پھر گیٹ کھولنے لگے۔

❁○❁

ریسیپشن کاؤنٹر پر کہنی ٹکائے صبا احمد سے بات کرتے کرتے اچانک اریب فاطمہ کے اندر کوئی احساس جاگا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایبک فلک شاہ کو تیز تیز چلتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار ایک قدم آگے بڑھی۔ شاید وہ اسے پکارنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر دوسرے کوریڈور کی طرف مڑ گیا۔

ایک گہرا سانس لے کر واپس صبا احمد کی طرف مڑتے ہوئے اس نے دل میں اعتراف کیا کہ بلاشبہ ایبک فلک شاہ دنیا کے خوب صورت ترین مردوں میں سے ایک ہے اور اس میں ایسا کچھ خاص ہے کہ اسے دیکھنے اور سننے کو جی چاہتا ہے۔

عمر احسان نے کینٹین سے باہر آتے ہوئے ایبک شاہ کو دیکھا اور تقریباً دوڑ کر اس کے ہم قدم ہو گیا۔

''ایبک بھائی!'' اس نے اس کے قدم کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے پھولے سانسوں کے ساتھ کہا۔

ایبک فلک شاہ کے قدم مدھم پڑ گئے۔ اس نے عمر احسان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بابا جان کیسے ہیں؟''

''کچھ بہتر ہیں لیکن بالکل ٹھیک نہیں ہیں۔''

عمر احسان کی آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی۔ ایبک فلک شاہ نے چلتے چلتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا اسے تسلی دی۔

''ڈونٹ وری عمر! ان شاء اللہ بابا جان بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

عمر احسان کا جی چاہا تھا کہ وہ ایبک کے کندھے پر سر رکھ کر بہت سارا روئے اور وہ اپنے اسی نرم اور پُر اثر لہجے میں اسے تسلی دیتا رہے تاکہ کئی دن سے اس کا ڈوبا ڈوبا دل سنبھل جائے۔ وہ بابا جان کا بہت لاڈلا تھا۔

عاشی کے گھر آنے سے پہلے وہ ہی گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور بابا جان اس کے بہت لاڈ اٹھاتے تھے۔ لیکن زارا پھپھو کی وفات کے بعد جب بابا جان، عاشی کو لے کر آئے تو گھر میں سب سے چھوٹی وہ ہو گئی تھی۔ گو بابا جان اپنا بہت سا وقت اسے دینے لگے تھے اور اس کے بہت لاڈ اُٹھاتے تھے لیکن عمر احسان کی اہمیت اس کے آنے سے کم تو نہ ہوئی تھی۔

بابا جان کی مسلسل بے ہوشی کے دوران پتہ نہیں کیسے اس نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ ورنہ اس کا تو چیخیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ نازک دل، بچپن سے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنسو بہانے لگتا تھا۔ ''الریان'' کی ساری لڑکیاں اس کا مذاق اُڑاتی تھیں اور رابیل نے تو اس کا نام ہی ''روتے ہیں چھم چھم نین'' رکھ چھوڑا تھا۔

ایبک شاہ کے قدموں میں پھر تیزی آ گئی تھی اور پھر وہ کمرہ نمبر 9 کے سامنے جا کر ہی رکا تھا۔

''بابا جان کے پاس کون ہے عمر؟''

''اس وقت تو صرف میں اور ہومی بھائی ہی ہیں۔''

ایبک فلک شاہ نے ناب پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''میں چائے لینے کینٹین گیا تھا۔ ہومی بھائی اندر ہیں۔'' عمر نے فوراً وضاحت کی تھی۔ حالانکہ ایبک نے تو یونہی سرسری انداز میں اسے دیکھا تھا لیکن وہ پتہ نہیں کیوں ایبک کے سامنے نروس ہو جاتا تھا۔ ایبک، ناب گھما کر اندر داخل ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن شاہ کے بیڈ کے پاس کرسی پر بیٹھے ہمدان مصطفیٰ نے مڑ کر اندر آتے ایبک شاہ کو دیکھا تو بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''ایبک! تم؟''

اور عبدالرحمٰن شاہ نے جو آنکھیں موندے نیم دراز تھے، یکدم آنکھیں کھول دیں۔ ایبک شاہ بے تابی سے ان کی طرف بڑھا۔

''بابا جان!''

انہوں نے بھی بے اختیار اپنے بازو پھیلا دیئے اور وہ ان کے پھیلے بازوؤں میں سما گیا تھا اور شاید اس وقت اس کے پہلے مین عمارہ فلک شاہ کا دل دھڑکنے لگا تھا کہ ان کے سینے سے لگے لگے اس پر اس طرح رقت طاری ہو رہی تھی کہ اسے لگتا تھا جیسے اس کا دل پانی بن کر بہہ جائے گا۔

اور شاید اس وقت عبدالرحمٰن شاہ نے بھی اس کے لمس اور عمارہ کی خوشبو پائی تھی کہ جب وہ ان کے بازوؤں سے نکلا تو بے اختیار ہی انہوں نے اپنے بوڑھے ہاتھوں میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے اس کی روشن پیشانی چوم لی۔ ان کی آنکھوں میں نمی بھی پھیل گئی تھی۔ وہ کتنی ہی بار ان سے ملا تھا لیکن اتنے والہانہ انداز میں وہ پہلی بار اس سے ملے تھے اور اس لمحے اسے ایک دم ہی عمارہ کا خیال آ گیا تھا۔ لیکن اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے بہت محبت سے پوچھا۔

''آپ کیسے ہیں؟''

''میری بہو کیسی ہے؟...... کیا ہوا تھا اسے؟'' ان کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔

''ماما اب ٹھیک ہیں۔ معمولی سا انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔''

''یا اللہ! میری بچی کو لمبی زندگی دینا۔'' انہوں نے بہت آہستگی سے دعا کی تھی۔

اور عمر احسان کا جی چاہا کہ وہ شرم سے ڈوب مرے۔ ایبک کے ساتھ بابا جان کے کمرے تک آتے آتے اسے ایک بار بھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ایبک سے پھپھو جان کا احوال ہی پوچھ لے۔ وہ شرمندہ شرمندہ سا کمرے میں پڑے دوسرے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ جبکہ ایبک شاہ وہیں بابا جان کے بیڈ پر ہی بیٹھ گیا تھا اور ہمدان سے بابا جان کے متعلق تفصیل سے پوچھ رہا تھا۔ تفصیل بتانے کے بعد ہمدان مصطفٰی نے اس سے بے حد نرمی سے کہا تھا۔

''ایبک! تمہیں پھپھو جان کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہاں انکل کیسے اکیلے ہینڈل کریں گے؟ اگر طبیعت پھر خراب ہو گئی تو؟...... جبکہ یہاں تو ہم سب ہیں۔''

عبدالرحمٰن شاہ نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

''میں بابا جان کا سن کر نہ رہ سکا۔ کل صبح ہی واپس چلا جاؤں گا۔ یا ہو سکتا ہے آج ہی اگر بہاول پور کی کوئی فلائٹ مل جائے تو۔ ویسے وہاں جواد، انجی، صالحہ اور طاہر بھائی ہیں۔''

عبدالرحمٰن شاہ کی سوالیہ نظریں ایبک فلک شاہ کی طرف اُٹھی تھیں۔ ایبک فلک شاہ کو الریان آتے کتنے دن ہو گئے تھے لیکن انہوں نے کبھی اس سے اس کی فیملی کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ ہمدان کے ساتھ ایک روز اچانک الریان آ گیا تھا تو ہمدان نے اس کا اتنا ہی تعارف کروایا تھا۔

''یہ ایبک ہے، عمارہ پھپھو کا بیٹا۔''

اور بس...... اس سے زیادہ انہوں نے کبھی کچھ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ شاید انہیں خوف تھا کہ کہیں ان کا بھرم نہ ٹوٹ جائے۔ انہیں لگتا تھا جیسے انہوں نے عمارہ اور فلک شاہ کا نام لیا تو وہ بھربھری مٹی کی طرح ڈھے جائیں گے۔ پتہ نہیں کیسے انہوں نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ اور زارا کے بعد تو انہیں لگتا تھا جیسے کسی روز اچانک بھربھری مٹی کا یہ ڈھیر زمین بوس ہو جائے گا۔

ایبک فلک شاہ کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس نے شاید ان کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا تھا۔

''صالحہ، انجی کی نند ہے اور طاہر دیور۔ سب لوگ بہت مخلص ہیں۔ انجی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بالکل غیر ہیں لیکن

اپنوں سے بڑھ کر۔''

عبدالرحمٰن شاہ کے سامنے یک دم زارا آ گئی تھی۔ ان کا ہاتھ تھامے ان سے التجا کرتی ہوئی۔

''انجی بہت پیاری ہے بابا جان! بالکل عمو آپی کی کاپی۔ اگر ہم ہمدان مصطفیٰ......''

اور انہوں نے اس کی پوری بات سنی ہی نہ تھی اور اس کے معنی جان کر اسے منع کر دیا تھا۔

''نہیں۔ ایسا سوچنا بھی مت۔''

''لیکن بابا جان! ہومی......''

وہ جانتے تھے ہمدان، عمارہ کے گھر جاتا رہتا ہے۔ انہوں نے اسے کبھی وہاں جانے سے منع نہیں کیا تھا۔ لیکن اب انہوں نے سختی سے زارا سے کہا تھا۔

''اسے سمجھا دینا زارا! ناممکن خواب اپنی آنکھوں میں مت بسائے۔''

ان کی نگاہیں ہمدان مصطفیٰ کی طرف اُٹھی تھیں جس کے چہرے پر یکدم ایک پتھر سی سنجیدگی اُتر آئی تھی۔

انہیں یک دم دل میں ایک چبھن سی ہوئی اور پھر پورے وجود میں درد کی ایک لہر سی پھیلتی چلی گئی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوگئیں۔ ایبک نے گھبرا کر انہیں پکارا۔

''بابا جان! کیا ہوا؟''

پھر انہیں بازوؤں سے تھام کر آہستگی سے لٹا دیا۔ ہمدان مصطفیٰ کے چہرے پر بنی سنجیدگی کا خول یک دم چٹخا اور وہ بھی گھبرا کر ان کی طرف جھکا۔

''بابا جان! بابا جان! کیا ہوا؟''

''یک دم نقاہت سی محسوس ہوئی ہے۔ ٹھیک ہوں۔ اور ایبک بچے! ہومی صحیح کہہ رہا ہے۔ آپ کو اس طرح اپنی ماما کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہئے تھا۔ مومی تو بہت جلد ہمت چھوڑ دیتا ہے۔ یوں بڑا جی دار ہے لیکن جہاں رشتوں کی بات ہو، بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے، جب کبھی چچا جان یا چچی جان ذرا سے بھی بیمار ہوتے تھے تو ان کا سرہانہ پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا اور ان سے زیادہ اس کی حالت خراب ہو جاتی تھی۔''

آج کتنے سالوں بعد فلک شاہ کا نام ان کے ہونٹوں پر آیا تھا۔ ہمدان مصطفیٰ نے تو اپنے ہوش میں پہلی بار انہیں فلک شاہ کے حوالے سے کوئی بات کرتے سنا تھا۔ یہاں الریان میں احسان، عثمان، مصطفیٰ وغیرہ جب کبھی بھی فلک شاہ کا ذکر کرتے تو انہیں مومی ہی کہا کرتے تھے۔

''جی بابا جان! آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ بابا کا دل تو بہت کمزور ہے۔ بچپن سے ہی میں نے دیکھا ہے۔ مجھے، انجی یا ماما کو کچھ ہو جاتا تو ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ ہماری تکلیف خود لے لیں اور ہمیں منٹوں میں اچھا کر دیں۔ حتیٰ کہ فلو بھی ہوتا تو پوری پوری رات ہمارے سرہانے بیٹھے جاگتے رہتے ہیں۔''

''ہاں وہ ایسا ہی ہے بیٹا!''

عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھوں میں ماضی کے کئی مناظر نمایاں ہوئے تھے۔

''بچپن میں ماں باپ کو کھو دیا تو رشتوں کے معاملے میں بہت حساس ہو گیا تھا۔ مجھ سے کہتا تھا ''بابا جان! اگر رشتے بازار میں ملتے ہوتے تو میں اپنے ارد گرد رشتوں کا ڈھیر لگا لیتا تھا۔ سارے خوب صورت رشتے منڈی سے خرید کر لے آتا۔ چچا، ماموں، پھپھو، خالہ، نانی، نانا..... پھر میں اتنا تہی دست نہ ہوتا۔ مجھے یاد ہے، میں نے کہا تھا۔

''تم ابھی بھی تہی دست نہیں ہو میری جان! ہم سب ہیں تمہارے اپنے۔''

ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''ان دنوں وہ یو۔ ای۔ ٹی میں تھا۔ اور یو ای ٹی چھوڑ کر گورنمنٹ کالج لاہور میں جانا چاہتا تھا۔ جس پر میں نے تھوڑی

ی خفگی کا اظہار کیا تو اس نے کہا تھا۔
''میں سوچتا ہوں بابا جان! اگر کبھی یہ سارے رشتے مجھ سے بچھڑ گئے تو میں تو ایک دن بھی جی نہیں پاؤں گا۔ اس خیال سے ہی میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ تو اگر ایسا ہو گیا تو میں سچ کہتا ہوں، میں مر جاؤں گا بابا جان!''
اور میں نے اسے گورنمنٹ کالج جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ افسردہ ہو، یہ مجھے کب گوارا تھا؟''
ایبک اور ہمدان مصطفیٰ بہت خاموشی سے انہیں سن رہے تھے اور وہ جیسے بہت ساری یادوں کے ڈھیر میں سے ایک ایک یاد چن کر نکال رہے تھے۔
''وہ کہتا تھا، میں الریان سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔''
'اور وہ کبھی الریان سے جدا ہوئے ہی نہیں۔ الریان تو کبھی ان کے دل سے نکلا ہی نہیں۔ اب بھی ان کے دل میں ہی بستا ہے۔' ایبک نے سوچا۔
''مگر اس نے الریان کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا اور سب کے بغیر زندہ رہنا سیکھ لیا۔''
''نہیں۔'' ایبک نے یک دم تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔ ''بابا جان! آپ کو کیا خبر، وہ زندہ کب ہیں؟ پل پل مرتے ہیں وہ۔ ان کی صبحیں اور شامیں، ان کے دن اور رات سب ''الریان'' کے مکینوں کو یاد کرتے گزرتے ہیں۔''
عبدالرحمٰن شاہ نے شاید اس کی بات نہیں سنی تھی۔ یک دم ہی ان کا سانس اُکھڑنے لگا۔
ہمدان اور ایبک دونوں کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔
''بابا جان!'' اور عمر احسان جو کچھ فاصلے پر بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا، یکدم گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔
ہمدان مصطفیٰ نے ان کا سینہ ملتے ہوئے چیخ کر کہا۔
''عمر! ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ جلدی۔''
عمر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔
کچھ دیر بعد ان کی طبیعت سنبھل گئی اور دوائی کے زیر اثر وہ پُرسکون ہو کر سو گئے تو ایبک نے ہمدان مصطفیٰ سے جانے کی اجازت چاہی۔
''اگر میں آج کسی وجہ سے واپس بہاول پور نہ جا سکا تو رات کو پھر چکر لگاؤں گا۔''
اور پھر جب وہ باہر نکلا تو اریب فاطمہ ابھی تک وہیں کاؤنٹر پر کہنی رکھے کھڑی تھی۔ صبا احمد جب ذرا فارغ ہوتی تو وہ اس سے بات کرنے لگتی۔ صبا احمد کو اس نے ہمیشہ ہی سراہا تھا۔ گاؤں میں صبا احمد کا گھر اس کے گھر کے بالکل ساتھ تھا۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد صبا نے بڑی بہادری کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا تھا اور چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کے لئے گھر سے باہر نکلی تھی۔ وہ کالج سے سیدھی ہسپتال آئی تھی، بابا جان کو دیکھنے۔ اور یہاں صبا کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ صبا نے اسے بتایا تھا کہ تین چار روز قبل ہی وہ گاؤں گئی تھی اور اس کی اماں سے ملی تھی۔ وہ بہت اشتیاق سے اماں کے متعلق پوچھنے لگی تھی۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے اسے اماں سے ملے۔ اماں سے ملنے کو وہ ہمیشہ ہی بے تاب رہتی تھی۔
وہ مروہ کی رشتے کی نند کی بیٹی تھی۔ اس کی اماں کی شادی گاؤں میں ہوئی تھی۔ اس کے ابا لڑکیوں کی تعلیم کے بالکل حامی نہ تھے جبکہ اماں اسے پڑھانا چاہتی تھیں۔ اس سے بڑے دو بھائی تھے اور ایک اس سے چھوٹا تھا۔ اماں کی مروہ مامی سے کوئی بات ہوئی تھی اور مروہ بہت بچپن میں ہی اسے اپنے ساتھ رحیم یار خان لے گئی تھیں۔
مروہ مامی نے اسے کبھی اپنے بچوں سے الگ نہیں سمجھا تھا۔ بہت محبت کرتی تھیں وہ اس سے۔ پھر بھی جب وہ چھٹیوں میں گھر جاتی تھی تو ہر بار اس کے لئے اماں سے بچھڑنا بڑا اذیت ناک ہوتا تھا۔ ابا ہر بار ہی اماں سے کہتے کہ اسے واپس نہ بھیجو، بہت پڑھ لیا۔ لیکن ان کی ہر بات پر سر جھکا لینے والی اماں نے صرف اس ایک بات پر ان سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا تھا۔

پھر جب مروہ مامی، مسقط جانے لگیں تو انہوں نے اسے ''الریان'' میں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بی اے فائنل میں تھی اور پھر مامی کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم ادھوری نہ چھوڑے۔ اماں کو تو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن ابا اور بھائیوں نے خوب شور مچایا۔

''کیا ہم ایسے گئے گزرے ہیں کہ ہماری بچی اب غیروں کے گھر میں رہے گی؟''

''غیر کیوں ہیں؟ میرے بھائی کا گھر ہے۔ عبدالرحمٰن بھائی کے گھر میں اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

مروہ مامی کی بات کو ابا نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

''نہیں بھابی جی! آپ بس اسے گاؤں بھجوا دیں واپس۔ بہت پڑھ لیا ہے اس نے۔ زیادہ پڑھ کر کون سا اسے استانی لگنا ہے کہیں۔''

تب دبلی پتلی، کمزور سی اماں، ابا کے سامنے ڈٹ گئی تھیں۔ لیکن ابا تھے کہ مسلسل انکاری تھے اور اس محاذ پر ڈٹی اماں پر اس وقت اسے اتنا پیار اور ترس آیا تھا کہ اس کا جی چاہا، اماں سے کہہ دے کہ وہ اس کی خاطر جھگڑا نہ کریں۔ اس نے پڑھ لکھ کر کون سے پہاڑ ڈھا لینے ہیں۔ لیکن اماں بھی ابا کو راضی کرنا جانتی تھیں۔

''آپ کو عبدالرحمٰن بھائی کے گھر رہنے پر اعتراض ہے نا تو ٹھیک ہے ہم اسے ہاسٹل میں داخل کروا دیتے ہیں۔ لیکن یہ پڑھے گی ضرور۔''

پھر ابا خاموش ہو گئے تھے۔ یوں مروہ مامی جانے سے پہلے اسے الریان چھوڑ گئی تھیں۔

وہاں کاؤنٹر کے پاس کھڑے کھڑے اسے اپنی اماں اتنی یاد آئیں کہ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی اور بابا جان کے کمرے میں جانے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہاں ایبک فلک شاہ بھی تھا۔ پتہ نہیں وہ اس کی شخصیت کے سحر سے ڈرتی تھی یا پھر اپنے دل سے جو ایبک شاہ کو سامنے دیکھ کر کئی دھڑکنیں مِس کر جاتا تھا۔ شاید میں بھی عمر احسان کی طرح اس کی فین ہو گئی ہوں۔ لیکن مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ وہ ہے کیا۔

عمر احسان کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے اس کے پاس سے گزرتا ہوا ایبک ٹھٹک کر رکا تھا۔ اریب فاطمہ نے یکدم نظریں ملنے پر رخ موڑ لیا۔ ایبک شاہ کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

عمر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

''اوکے ڈیئر! اب جاؤ بابا جان کے پاس۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔''

اور عمر احسان کے لئے تو اس کی ہر بات گویا حکم کا درجہ رکھتی تھی، سو وہ وہیں سے ہی واپس مڑ گیا۔ اس نے کاؤنٹر کے پاس کھڑی اریب فاطمہ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ ہولے ہولے چلتا ہوا کاؤنٹر کے پاس آیا۔ عین اسی لمحے اریب فاطمہ نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی پلکیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ ایبک فلک شاہ کی نظروں نے اسے چھوا اور اُس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''حورعین! تم جب بھی ملتی ہو، خوابوں میں، خیالوں میں، حقیقت میں، تمہاری پلکوں پر اتنا نم کیوں ہوتا ہے؟''

اریب فاطمہ کو اتنی آہستگی سے کہی گئی بات ذرا سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے بے حد گھبرا کر کہا۔

''وہ میں بابا جان کو دیکھنے آئی ہوں۔''

ایبک شاہ کی آنکھوں میں یک دم جگنو سے چمکنے لگے تھے۔ اسے خیال آیا کہ جب وہ یہاں سے گزرا تھا تو اس نے اس کے کپڑوں کی جھلک دیکھی تھی لیکن وہ بابا جان کی پریشانی میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر آگے نکل گیا تھا۔ تو کیا تب سے اب تک وہ یہاں کھڑی ہے؟...... ایک خوشگوار سی حیرت کے ساتھ اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''یہاں کھڑے ہو کر کیا آپ میرا انتظار کر رہی تھیں؟''

''نہیں...... وہ میں صبا سے بات کرنے کے لئے رک گئی تھی۔ یہ میرے گاؤں کی ہیں۔''

''کون؟''

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ جانے کب صبا احمد وہاں سے چلی گئی تھی۔

ایبک شاہ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور اس کی آنکھوں کی بے تحاشا چمک سے گھبرا کر اریب فاطمہ نے آنکھیں جھکا لیں۔

''آپ مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہیں اریب فاطمہ؟''

''وہ......صبا ابھی تو یہاں تھی۔'' اس نے گھبرا کر پھر پیچھے دیکھا۔

''لیکن میں صبا کے متعلق تو نہیں پوچھ رہا۔'' اس کی نظریں اریب فاطمہ کے چہرے پر جمی تھیں اور اس کی نظروں کی حدت سے اس کے رخسار تمتما رہے تھے۔

''کیا آپ میری وجہ سے اندر بابا جان کے کمرے میں نہیں آئیں؟ حالانکہ.......''

اُس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی لرزتی کانپتی پلکوں کو دلچسپی سے دیکھا۔

''آپ آ جاتیں تو ہسپتال کے اس کمرے میں بن موسم کے بہار آ جاتی۔''

وہ اپنی بات کہہ کر چلا گیا۔ لیکن اریب فاطمہ کے دل کی دھڑکنوں کو اتھل پتھل کر گیا تھا اور وہ وہیں کھڑی اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کے درست ہونے کا انتظار کرنے لگی تھی، جب عمر احسان کچھ پریشان سا اسے آتا دکھائی دیا تھا۔

''عمر!'' اس نے بے اختیار ہی اسے آواز دی تھی اور عمر احسان نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

''تھینک گاڈ، ریبا آپی! کہ آپ یہیں مل گئیں۔ ورنہ پتہ نہیں کہاں کہاں خوار ہونا پڑتا مجھے۔'' اس کے قریب آ کر عمر نے کہا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ وہ جو ہم سب کی گاڈ فادر ہیں نا مونی آپا......اُن کے دو فون آ چکے ہیں کہ تم ابھی تک کالج سے گھر نہیں پہنچیں۔ لہٰذا میں خود جا کر کالج سے پتہ کروں کہ خدانخواستہ آپ کا کہیں کوئی حادثہ وغیرہ تو نہیں ہو گیا۔''

''مونی آپا کون؟'' اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔

''منیبہ شاہ۔ وہی تو ہیں الریان کے سب چھوٹے بڑے بچوں کی گاڈ فادر۔''

یہ بھی عمر احسان کی ایک عادت تھی کہ اس نے الریان کے سب لوگوں کے نام مختصر کر رکھے تھے سوائے ایبک فلک شاہ کے۔ ایبک فلک شاہ بھلا ''الریان'' کا کب تھا؟ وہ تو ''مراد پیلس'' کا باسی تھا۔ یہ الگ بات کہ ''الریان'' والوں کے ساتھ اس کا بہت قریبی رشتہ تھا اور اس قریبی رشتے کا علم عمر احسان کو چند ماہ قبل ہی ہوا تھا۔ جبکہ اس سے عقیدت کا رشتہ کافی پرانا تھا۔ جب وہ پہلی بار ان کے کالج آیا تھا، تب سے۔

''میں بابا جان کو دیکھنے آئی تھی۔ کیسے ہیں وہ؟''

''ٹھیک ہیں۔''

عمر احسان بتا کر منیبہ شاہ کو فون کرنے لگا۔ ورنہ منیبہ شاہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ چھوٹوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو بھی اس کی گمشدگی سے مطلع کر دیتی اور عین ممکن تھا، اب تک وہ ایسا کر بھی چکی ہو۔

عمر احسان کو فون پر مصروف دیکھ کر اریب فاطمہ نے بابا جان کے کمرے کی سمت قدم بڑھا دیئے۔

دھوپ کی کرنیں جب مراد پیلس کے جھروکوں سے تاک جھانک کرتی فلک مراد شاہ کے بیڈ روم کی کھڑکی کے شیشوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگیں تو فلک مراد شاہ نے بے اختیار ہی اپنی وہیل چیئر کو کھڑکی کے قریب لا کر کھڑکی کھول دی۔ یکدم تیز روشنی اندر در آئی تو ایک لمحہ کے لئے فلک شاہ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ انہوں نے چمکتی دھوپ کو دیکھ کر سوچا۔

آج کا دن کتنا روشن اور چمک دار ہے۔ اور یہ ایسے ہی دن تھے جب دھوپ کی حدت اچھی بھی لگتی تھی مگر زیادہ دیر دھوپ میں بیٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ انہوں نے مڑ کر عمارہ کی طرف دیکھا، جو سنبل کے نرم تکیے پر سر رکھے بہت پُرسکون نیند سو رہی تھیں۔ سورج کی ایک دو شرارتی کرنوں نے ان کے ماتھے کو بوسہ دیا تو انہوں نے کسمسا کر کروٹ بدل لی تھی۔ فلک شاہ نے کھڑکی کا وہ پٹ بھیڑ دیا، جس سے راستہ پا کر کرنیں عمارہ کو ڈسٹرب کرنے چلی آئی تھیں۔ اور ایک بار پھر سوچا، آج کا دن بہت روشن ہے۔

انہوں نے کھلے پٹ سے باہر جھانکا۔ مالی، گوڈی کر رہا تھا۔ وہاں سے نظریں ہٹا کر انہوں نے اپنے بیڈروم کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر معمول کے مطابق پڑی تھی۔ کچھ نیا نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت ساری گھٹن کے بعد کہیں کسی روزن سے ہوا کا کوئی ننھا سا جھونکا آ کر اس گھٹن کو کم کر گیا ہو یا پھر بہت گہری تاریکی اور اندھیرے کے بعد کہیں کوئی روشن صبح طلوع ہوئی ہو۔ حالانکہ ابھی تک کہیں کچھ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ پھر پتہ نہیں کیوں انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ آج کا دن بہت روشن اور چمک دار ہے۔

اس روز بھی تو ایسا ہی روشن اور چمک دار دن تھا اور فروری کے وسط میں بھی دھوپ کی حدت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں ڈاکٹر فاروق کے ساتھ ہونے والے میوزک کنسرٹ اور ڈراما فیسٹیول کے متعلق بات کر رہے تھے۔ نرم گرم دھوپ میں کھڑا ہونا اُنہیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ حالانکہ لاہور میں بہت زیادہ سردی نہیں پڑتی تھی لیکن پچھلے ایک ہفتے سے مسلسل چھائے رہنے والے بادلوں اور ہلکی بارش نے اچھی خاصی خنکی پیدا کر دی تھی۔ سو آج انہیں دھوپ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ ڈاکٹر فاروقی کے جانے کے بعد بھی ان کا کسی کلاس میں جانے کا موڈ نہیں بنا۔ وہ وہیں سنگی بینچ پر بیٹھ گئے جب مائرہ ان کے پاس آ کر رُکی تھی۔

"ہیلو......!"

انہوں نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ شولڈر بیگ دائیں کندھے پر لٹکائے، بے حد اشتیاق سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ مائرہ کو دیکھ کر انہیں رات احسان سے ہونے والی گفتگو کیا یاد آئی تھی کہ لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ وہ احتراماً کھڑے ہو گئے۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"فائن......" اس نے بے حد گہری نظر ان پر ڈالی تھی۔

"آپ ہمارے کالج میں آتے ہیں لیکن کبھی آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"میرا ابھی ادھر آپ کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جانا ہی نہیں ہوتا۔"

"اگر ملنا مقصود ہو تو کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"ایکچوئلی مجھے علم ہی نہیں تھا کہ آپ بھی یہاں ہیں۔" وہ شرمندہ ہوئے تھے۔

حالانکہ ان کی کامیابی کی خوشی میں دی جانے والی دعوت میں چند لمحوں کی ملاقات اور مختصر سی گفتگو کے بعد ایسا ضروری نہیں تھا کہ وہ اس سے ملنے ہی چلے جاتے۔ ان کے لئے تو وہ اجنبی ہی تھی۔

وہ محض اتنا ہی تو جانتا تھا کہ وہ مروہ پھپھو کی کسی نند کی بیٹی ہے۔

لیکن یہ شرمندگی شاید احسان عبدالرحمٰن کی وجہ سے تھی جو اس مائرہ حسین پر مر مٹا تھا اور جو اُن کا یار غار تھا۔ اس روز وہاں کھڑے کھڑے مائرہ حسین سے انہوں نے بہت ساری باتیں کر ڈالی تھیں۔ لیکن ان ساری باتوں میں اسی فیصد گفتگو احسان عبدالرحمٰن کے متعلق تھی۔

"احسان ذہین ہے۔ احسان بہت مخلص ہے۔ بہت محبت کرنے والا ہے۔ بہت کیئرنگ ہے بہت لونگ ہے۔"

اور وہ اس احسان نامے سے خاصی بیزار ہونے لگی تھی۔

تب فلک شاہ کو لگا تھا کہ کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے۔ یہ احسان عبدالرحمٰن کہاں دل لگا بیٹھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ مائرہ حسین کو احسان عبدالرحمٰن شاہ میں کوئی دلچسپی نہیں۔ غرور سے گردن اونچی کئے ایک عجیب سے تفاخر کے ساتھ فلک شاہ کی طرف دیکھتی اور فلک شاہ سے اس کی ذات کے حوالے سے سوال کرتی مائرہ حسین کو فلک شاہ نے یک دم ردّ کر دیا تھا۔ یہ لڑکی، مائرہ ہرگز بھی شانی کے قابل نہیں ہے۔

وہ اتنا مخلص، سچا، کھرا انسان۔

اور یہ......

اُن کا دل چاہا تھا کہ وہ احسان سے کہیں۔

''تمہیں محبت کرنے کے لئے کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی؟ اس میں ہے ہی کیا سوائے بے تحاشا حُسن کے؟''

لیکن وہ یہ بات احسان عبدالرحمٰن سے نہیں کہہ سکے۔ مائرہ کا نام سن کر ہی اس کے چہرے پر رنگوں کی برسات اُتر آئی تھی۔ وہ ایک دم ہی کتنا خوش ہو گیا تھا۔

''تم اس سے ملے تھے مومی! کیسی لگ رہی تھی؟ کس کلر کے کپڑے پہنے ہوئے تھے؟ اس پر تو ہر کلر ہی سوٹ کرتا ہے۔ ہے نا؟......لگتا ہے سارے رنگ اسی کے لئے تخلیق کئے گئے ہیں''

اس نے ایک ہی سانس میں کتنے ہی سوال کر ڈالے تھے۔ اُس کی یہ دیوانگی دیکھ کر فلک شاہ کچھ نہیں کہہ سکے البتہ دل میں دعا ضرور کی تھی، کہ اللہ، احسان شاہ کے دل کو ہر دکھ سے بچائے اور مائرہ حسین کے دل میں احسان شاہ کی محبت پیدا کر دے۔

لیکن اس وقت وہ ہرگز نہیں جانتے تھے کہ آنے والے دنوں میں مائرہ حسین ان کے لئے کتنی بڑی آزمائش بن جائے گی۔ وہ جو پورے خلوص کے ساتھ مائرہ کو احسان شاہ کی طرف متوجہ کرانے کی کوشش کر رہے تھے، اس وقت ششدر رہ گئے، جب مائرہ حسین نے کیفے ٹیریا میں ان کے سامنے بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے بڑی بے باکی سے کہہ ڈالا۔

''فلک شاہ! تم احسان عبدالرحمٰن کی اتنی وکالت کیوں کرتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری اس وکالت کی وجہ سے میں اس سے محبت کرنے لگوں گی؟''

''اور اگر آپ اس سے محبت کرنے بھی لگیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ احسان شاہ ایسا ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔''

اس وقت احسان شاہ کی محبت سے فلک شاہ کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ اس سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔

''ہے نا! وہ ایسا ہی ہو فلک شاہ! جیسا تم کہتے ہو۔'' اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے۔ ''لیکن جس دل میں محبت پہلے ہی بسیرا کر چکی ہو، اس دل میں کسی اور کی محبت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔''

فلک شاہ کا دل ڈوب سا گیا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ، ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ کیا احسان عبدالرحمٰن ایسا تھا کہ اسے اس کی محبت نہ ملتی؟

نہیں......وہ تو بہت نازک دل تھا۔ وہ محبت کو نہ پاسکنے کے دکھ کو سہہ نہ سکے گا۔ لیکن محبت کے معاملے میں تو کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سر جھکائے، ہاتھ گود میں دھرے اس دُکھ کو برداشت کرنے کی کوشش کرنے لگے جو ان کے جان سے زیادہ پیارے دوست کو ملنے والا تھا۔

''تم نے یہ نہیں پوچھا فلک شاہ! کہ میرے دل میں کس کی محبت نے بسیرا کر رکھا ہے۔''

وہ اس طرح تھوڑا سا آگے کو جھکی کہ فلک شاہ نے فوراً اپنی نظریں جھکا لیں۔ فلک شاہ کو لڑکیوں کے ایسے پہناوے ہرگز پسند نہیں تھے، جو اُنہیں اس طرح عیاں کر دیں۔ عورت تو ڈھکی چھپی ہی اچھی لگتی ہے۔

''فلک شاہ! کیا تم جاننا نہیں چاہو گے کہ میں مائرہ حسین......'' اس نے اپنے کندھوں پر جھک آنے والے بالوں کو اِک ادا سے جھٹکا۔ ''کس کی محبت میں اسیر ہو چکی ہوں؟''

''میں جان کر کیا کروں گا؟'' انہوں نے جھکا سر نہیں اٹھایا تھا۔ ''نہ تو میں آپ کے حلقۂ احباب کو جانتا ہوں اور نہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی ہے کہ وہ کون ہے۔ میرے لئے تو میرا دوست، میرا بھائی اہم ہے، جو آپ سے محبت کرتا ہے مجھے تو اس وقت صرف اس کا خیال آ رہا ہے۔''

انہوں نے بے حد دل گرفتگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''مائرہ حسین! میرا دوست آپ سے بے حد و بے حساب محبت کرتا ہے۔ اس کی صبح کا آغاز آپ کے ذکر سے اور رات کا اختتام آپ کے ذکر سے ہوتا ہے۔''

''مجھے تمہارے دوست کے لئے افسوس ہے فلک شاہ! مائرہ حسین کے دل نے تو تمہیں چنا ہے۔ تم نے اسیر کیا ہے مائرہ حسین کے دل کو۔ فلک شاہ! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

فلک شاہ لمحہ بھر کے لئے تو ششدر رہ گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اپنی طرف بے باکی سے دیکھتی مائرہ حسین کو دیکھ کر ان کے اندر غصے کا اُبال اُٹھا تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر انہوں نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔

''لیکن میں آپ سے محبت نہیں کرتا۔'' وہ یک دم کھڑے ہو گئے۔

''مجھے علم ہے۔'' وہ بڑی پُرسکون سی بیٹھی تھی۔

''ابھی ہم ملے ہی کتنی بار ہیں۔ شاید آج چوتھی مرتبہ۔ اور چاروں مرتبہ میں ہی تم تک آئی ہوں، تم نہیں آئے۔''

اس نے تفاخر سے گردن اونچی کی۔ اس کے تراشیدہ لبوں پر بڑی دلکش سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

''لیکن مجھے یقین ہے کہ اب تم میری طرف آؤ گے فلک شاہ! اور ایک دن میری محبت کے اسیر ہو جاؤ گے۔''

ان کی آنکھیں غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں خوں رنگ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بے حد حیرت سے مائرہ حسین کو دیکھا تھا۔ کیا اسے اپنے حسن پر اتنا ناز ہے؟ مگر فلک شاہ کا دل ایسا نہیں ہے کہ صرف ظاہری شکل وصورت کے اسیر ہو جائیں۔ اور پھر انہوں نے تو عمارہ عبدالرحمٰن شاہ کو دل کی مسند پر بٹھا کر دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے تھے۔

''ایسا نہیں ہو سکتا مائرہ حسین! کبھی نہیں۔ آپ دنیا کی حسین ترین لڑکی بھی ہوتیں تو فلک شاہ اتنا کمینہ ہرگز نہیں ہے کہ اپنے دوست کی محبت کو کسی غلط نظر سے دیکھے۔''

مائرہ حسین کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور آنکھوں میں ایک مغرورانہ سی چمک نظر آئی تو فلک شاہ نے چونک کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

''آج کے بعد میں نہ آپ سے ملنا چاہوں گا، نہ دیکھنا۔''

وہ اپنی بات مکمل کر کے تیز تیز چلتے ہوئے کیفے ٹیریا سے باہر نکل گئے۔

'یہ احسان عبدالرحمٰن کہاں دل لگا بیٹھا ہے؟' بے حد دل گرفتگی سے سوچتے ہوئے وہ کالج گیٹ سے باہر نکل گئے۔ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے خیال آیا تھا کہ انہیں تو ڈاکٹر فاروق سے اپنے ڈرامے کے اسکرپٹ پر ڈسکس کرنا تھا جو انہوں نے ڈراما فیسٹیول کے لئے لکھا تھا۔ لیکن پھر وہ واپس نہیں مڑے۔ ان کا دل یک دم ہی گھبراہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ بلا سے مائرہ حسین، احسان شاہ سے محبت نہ کرتی، وہ کسی بھی شخص سے محبت کر لیتی لیکن انہیں اس امتحان گاہ میں کھڑا نہ کرتی۔

وہ مائرہ حسین کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے پہلی ہی نظر میں اُسے ریجیکٹ کر دیا تھا۔

وہ صرف احسان کی خاطر اُس کا لحاظ کرتے تھے۔ پھر بھی اُنہیں لگ رہا تھا، جیسے وہ احسان عبدالرحمٰن سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہے۔

انہوں نے احسان شاہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ حق نواز کی پارٹی میں شامل نہیں ہوں گے۔ اور سیاست وغیرہ سے دُور رہیں گے۔ لیکن اس وقت وہ اتنے اپ سیٹ تھے کہ بغیر سوچے سمجھے گاڑی حق نواز کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر

اال دی۔ حق نواز اُنہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔
''یار! بہت موقع پر آئے ہو۔''
''کیسا موقع؟''
''یار! آج ہماری پارٹی ایک احتجاجی ریلی نکال رہی ہے۔''
''کیوں؟'' فلک شاہ خالی الذہن تھے۔
''یار! ہم لوگ بڑے بے وقوف ہیں۔ کم عقل۔ ہم نے اُن لوگوں کو حکمران بنا رکھا ہے اور اُن کے سامنے سجدے کر رہے ہیں، جنہوں نے اس ملک کو دولخت کیا۔ محض اقتدار کے لالچ میں اپنے ذاتی فائدے کے لئے پوری قوم کا گلا کاٹ دیا۔'' وہ ہمیشہ کی طرح جذباتی ہو رہا تھا۔ لیکن فلک شاہ کچھ نہیں سن رہے تھے۔ یا سمجھ نہیں پا رہے تھے۔
''تو تم چلو گے نا میرے ساتھ؟''
فلک شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے حق نواز! سر بھاری ہو رہا ہے۔ میں تو بس یونہی چلا آیا تھا تمہاری طرف۔ بہت دن ہو گئے تھے تم سے ملے۔''
''میں تو سمجھا تھا، تم ڈر گئے ہو۔ اُس روز لاٹھی چارج جو ہو گیا تھا، ہماری تنظیم کے کارکنوں پر۔''
فلک شاہ خاموش رہے۔
''ریلی تو عصر کے بعد ہے۔ تم کچھ دیر آرام کر لو۔ چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لے لو۔ میں چائے بنواتا ہوں۔'' حق نواز یونہی سب پر مہربان رہتا تھا۔ خصوصاً اپنی تنظیم کے کارکنوں کے ساتھ۔ اور تب ہی وہ اندر آ گیا تھا ڈرائنگ روم میں۔ اُس کی شخصیت میں کچھ ایسا تھا، جو متوجہ کرتا تھا۔
''یہ شیر دل ہے، میرا کزن۔ کاکول سے ابھی ابھی فارغ ہوا ہے۔ لیفٹیننٹ شیر دل۔''
شیر دل کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے فلک شاہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''یہ فلک شاہ ہے، میرا دوست۔''
''دوست؟ یا تمہاری پارٹی کا کارکن؟''
''فی الحال دوست۔'' حق نواز ہنسا۔ ''ممکن ہے، آنے والے دنوں میں اسے اپنی پارٹی میں شامل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ ایک محبِ وطن شخص ہے۔ اور ہر محبِ وطن آدمی ایک روز میری پارٹی کا کارکن ہو گا۔''
وہ بات کر کے گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ اور شیر دل ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔
''کیا حق نواز واقعی تمہارا دوست ہے؟''
فلک شاہ نے سر ہلا دیا۔
''تو پھر تم اُسے سمجھاتے کیوں نہیں؟ یہ سیاست کا کھیل اس جیسے متوسط طبقے کے لوگوں کو سوٹ نہیں کرتا۔ ماں باپ نے اس کے لئے کتنے خواب دیکھ رکھے ہیں۔ لیکن اسے ان خوابوں کو چکنا چور کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ جو بندہ ایک چھوٹے سے گھر کے چند افراد کو مطمئن نہ رکھ سکتا ہو، وہ بھلا پورے ملک اور قوم کو کیسے مطمئن کرے گا؟''
''آپ کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟''
''مجھے سیاست سے دلچسپی ہے فلک شاہ! جتنی ایک فوجی کو ہو سکتی ہے۔ ایک فوجی ہونے کے ناتے مجھے اپنے ملک سے بھی شدید محبت ہے۔ ایک سال پہلے کاکول میں جب مجھے پتہ چلا کہ میرا ملک دو ٹکڑے ہو گیا ہے تو میں ساری رات دھاڑیں مار مار کر رویا تھا اور وہاں رونے والا میں اکیلا نہ تھا۔ میرے بیچ میٹ، مجھ سے سینئر، مجھ سے جونیئر، میرے افسر سب رو رہے تھے۔ کوئی چھپ کر، کوئی سامنے۔ مجھے بھی اس کٹ جانے والے بازو کی اُتنی ہی اذیت اور تکلیف ہے، جتنی حق نواز کو ہے۔ مجھے بھی ترانوے ہزار فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کی اذیت راتوں کو جگا دیتی ہے۔ اور پھر میں سو نہیں

پاتا۔ لیکن میں حق نواز کی طرح سڑکوں اور شاہراہوں پر آ کر اپنی ہی املاک کو نقصان پہنچانے کے خلاف ہوں۔ میں سڑکوں پر نکل آنے والے اُن نوجوانوں کی خون بہاتی لاشوں کو دیکھ نہیں سکتا، جن کے والدین نے نہ جانے کیسے کیسے خواب ان کے لئے اپنی آنکھوں میں سجا رکھے ہوں گے۔ سانپ گزر گیا، لکیر پیٹنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ کس نے کیا، کیا؟......کون مجرم ہے؟......بغیر کسی ثبوت کے کسی کے خلاف نعرے لگانے سے ہو جانے والا نقصان پورا نہیں ہو سکتا۔ دُکھ کا یہ کانٹا ہمیشہ کے لئے ہمارے دل میں چبھ گیا ہے۔ ہمیں پچھلی باتیں بھلا کر اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہئے۔''

شیر دل بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ وہ حیران سے اُس کی باتیں سن رہے تھے۔

''تمہیں پتہ ہے، حق نواز میرے ماموں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ تین جوان ہوتی بہنوں کا بھائی۔ میرے ماموں سترہ گریڈ کے افسر ہیں۔ سفید پوش، حق حلال رزق کھانے والے۔ حق نواز جب پیدا ہوا تھا تو شاید تب ہی سے میری مامی نے اُس کے لئے خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ اکیلے میری مامی نے نہیں، میری ماموں زاد بہنوں نے بھی، ماموں نے بھی۔ حتیٰ کہ میری ماں بھی ان خوابوں میں حصے دار بن گئی تھی، اپنے اکلوتے بھتیجے کے لئے۔ لیکن حق نواز کو پتہ نہیں، کہاں سے اور کیسے یہ لوگ مل گئے ہیں کہ وہ کسی کی نہیں سنتا۔ ان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ صرف وہ ہی صحیح ہے۔ ہم سب غلط ہیں۔ صرف وہی ملک کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ صرف اسے ہی وطن سے محبت ہے۔ باقی سب صرف اس ملک کو لوٹ کر کھا رہے ہیں......تم جانتے ہو، آج صبح سے مامی نے کچھ کھایا نہیں۔ جب سے حق نواز نے بتایا ہے کہ آج اُسے ریلی میں شامل ہونا ہے، تب سے مامی جاء نماز بچھائے بیٹھی ہیں۔ اور اُس کی زندگی اور سلامتی کی دُعا مانگ رہی ہیں۔ وہ جوان بیٹے کو روکنے پر قادر نہیں ہیں۔ صرف آنسوؤں پر اور دعاؤں پر ان کا اختیار ہے۔ سو وہ آنسو بہائے جاتی ہیں اور دعائیں کئے جاتی ہیں۔ شہر میں دفعہ 144 لگی ہوئی ہے۔ حکومت نے ریلی کو روکنے کے لئے کئی شہروں سے پولیس منگوا لی ہے۔ سو گولی بھی چلے گی اور لاٹھی چارج بھی ہوگا۔ کون جانے، کون سی گولی، کس کے نصیب کی ہو گی۔''

اُس روز شیر دل بہت بولا تھا۔ اور اُس روز فلک شاہ اُس نوجوان فوجی سے از حد متاثر ہوئے تھے۔ دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ وہ اُس روز حق نواز کے ساتھ ریلی میں شامل نہیں ہوئے تھے، لیکن گھر بھی نہیں گئے تھے۔ اور جب تک حق نواز واپس نہیں آیا تھا، وہ شیر دل کے ساتھ اُس کے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے رہے تھے۔

حق نواز آیا تو اُس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ اور ان سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ اس کے کندھے میں شدید درد تھا۔

پولیس نے آنسو گیس اور لاٹھی چارج سے ہجوم کو منتشر کیا تھا۔ رات آٹھ بجے کے بعد وہ گھر آئے تو سب نے ہی اطمینان کا سانس لیا۔ تاہم کمرے میں آ کر خود ہی احسان شاہ کو بتا دیا تھا کہ وہ حق نواز کے گھر گئے تھے اور وہیں پھنس گئے تھے۔

''کیا تم......؟ آج اُن کی جماعت نے ایک ریلی نکالی تھی۔'' احسان پریشان سا پوچھ رہا تھا۔

''نہیں۔ میں اُس کے کزن، شیر دل کے ساتھ تھا۔'' وہ بے حد بے چین تھے۔ کتنی ہی دیر اپنے بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد اُٹھ بیٹھے۔ کتنی ہی دیر اپنے بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد اُٹھ بیٹھے۔

''شانی! کیا تمہیں محبت کے لئے مائرہ حسین کے علاوہ کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی؟''

''کیوں، مائرہ حسین میں کیا برائی ہے؟'' مائرہ کے ذکر پر اُس کی سنجیدگی یک دم مسکراہٹ میں ڈھل گئی تھی۔ اور اس نے کتاب اوندھی کر کے تکیے کے پاس رکھی۔ اور پوری فرصت سے فلک شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ فلک شاہ نے سٹپٹا کر اُسے دیکھا۔

''نہیں۔ بس ویسے ہی کہہ رہا تھا۔ تم ایک کام کیوں نہیں کرتے؟ اپنا رشتہ بھجوا دو اس کے لئے۔''

''کیوں؟'' احسان شاہ مشکوک ہوا۔ ''ابھی تو مجھ سے بڑے بھائی موجود ہیں۔ میں اماں جان سے کیسے کہہ سکتا ہوں،

یہ ارشتہ کر دیں؟ یہ نہیں ہوسکتا۔ تم مجھے اصل بات بتاؤ۔ تم نے یہ کیوں کہا؟ کیا مائرہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے؟''
فلک شاہ لحہ بھر کو ٹپٹائے۔
''میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں شانی؟ میرا ڈیپارٹمنٹ بالکل الگ ہے اُس سے۔ میں تو اس لئے کہہ رہا تھا کہ چند ماہ کی بات ہے، اُس کا ماسٹرز کمپلیٹ ہو جائے گا تو لازمی بات ہے، اُس کے پیرنٹس اُس کی شادی کے متعلق ہی سوچیں گے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ مروہ پھپھو کے کان میں بات ڈال دو۔ تاکہ وہاں گھر میں کوئی ایسا سلسلہ ہو تو وہ بروقت کچھ کر لیں۔ مروہ پھپھو کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''
''نہیں۔ ایک ہی اعتراض ہوگا اور جو سب کو ہوسکتا ہے۔ اور وہ عمر کا ہے۔ لیکن میں چند سال کی بڑائی، چھوٹائی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔''
''تو پھر تم مروہ پھپھو سے بات کر لینا۔''
''میں نہیں، تم.......تم یہ بات کرو گے پھپھو سے۔'' احسان شاہ سارا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال کر خود اطمینان سے سو گیا تھا۔ لیکن فلک شاہ کو ساری رات نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدل بدل کر انہوں نے صبح کی تھی۔ اور صبح جب احسان شاہ جاگا تھا تو وہ اپنے بیگ میں سامان رکھ رہے تھے۔
''کہیں جا رہے ہو کیا؟''
''بہاول پور۔'' انہوں نے مختصر جواب دیتے ہوئے اپنے بیگ کی زِپ بند کی تھی۔
''واپسی کب ہوگی؟''
''دو تین روز تک۔''
اور دوسرے دن وہ بہاول پور میں دادا جان کے پاس بیٹھے اُن کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے التجا کر رہے تھے۔
''دادا جان! میں نہیں چاہتا، میرا اور عمارہ کا رشتہ اناؤنس ہو جائے۔''
''وجہ؟'' انہوں نے بہت غور سے کارپٹ پر اپنے پاؤں کے پاس بیٹھے فلک شاہ کو دیکھا تھا۔ یہ ان کی عادت تھی۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی بیٹھا کرتے تھے۔
''کیا وجہ بتانا ضروری ہے دادا جان؟ اتنا کافی نہیں ہے کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔''
پھر انہوں نے اصرار نہیں کیا تھا۔ پھر وہ ان کے ساتھ ہی لاہور آئے اور عبدالرحمٰن سے درخواست کی کہ وہ عمارہ اور فلک کی منگنی کرنا چاہتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا فنکشن ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔
''لیکن ابھی بچے پڑھ رہے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ انہیں ڈسٹرب کیا جائے؟'' عبدالرحمٰن شاہ کو اعتراض ہوا تھا۔
''کیا آپ کو میری بات پر اعتبار نہیں ہے چچا جان؟ عمارہ آپ کی بیٹی ہے۔''
''یہ بات نہیں ہے بیٹا! تم میرے سلجوق کی جگہ ہو۔ بس زندگی میں مومی کی کوئی خوشی دیکھنا چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں، اس کی شادی تک ہم ہوں گے یا نہیں۔ تمہاری چچی کی بڑی خواہش ہے کہ مومی کے حوالے سے کوئی خوشی ہو۔''
''اللہ آپ کو لمبی زندگی دے چچا جان! آپ مومی کی ساری خوشیاں دیکھیں۔''
''بس ایک خواہش تھی۔ تم سے کہہ دی۔ اب تمہاری مرضی۔''
اور عبدالرحمٰن شاہ نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھام لئے تھے۔
''چچا جان! آپ کی خواہش میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔''
مراد شاہ کا دل یکدم بھر آیا تھا۔ ''کاش! آج میرا سلجوق ہوتا تو......''
پھر دونوں ہی سلجوق کی یاد میں کھو گئے۔
''ایک اور بات بھی ہے عبدالرحمٰن! اگر تم برا نہ مانو تو منگنی کے بعد مومی کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہوگا۔ میں چاہتا

ہوں کہ منگنی کے بعد مومی ہاسٹل منتقل ہو جائے۔''

''کیوں چچا جان! ایسی کیا برائی ہے مومی کے یہاں رہنے سے؟'' عبدالرحمٰن نے تڑپ کر کہا تھا۔ ''مصطفیٰ اور مرتضیٰ کے باہر جانے کے بعد مومی سے ہی تو میرے گھر کی رونق ہے۔ شانی اور عثمان تو کتابی کیڑے ہیں۔ مومی ہی تو ہے جو میرے پاس بیٹھتا ہے اور گھر میں رونق لگائے رکھتا ہے۔''

''عبدالرحمٰن بیٹا! بزرگ جو کہتے ہیں، وہ ان کی زندگی کے تجربوں کا حاصل ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے چچا جان!'' عبدالرحمٰن، مراد شاہ کی کسی بات سے انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔

بڑی دھوم دھام سے عمارہ اور فلک شاہ کی منگنی ہوئی تھی اور فلک شاہ بے حد مطمئن ہو کر ہاسٹل منتقل ہو گئے۔ جبکہ احسان شاہ نے ان کے ہاسٹل جانے پر بہت واویلا کیا تھا۔

''یار! تیرا کام تو کر دیا ہے۔ مروہ پھپھو کے کان میں بات ڈال دی ہے۔ مگر انہیں یہ بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔''

''زندگی میں نے گزارنی ہے، مروہ پھپھو نے نہیں۔''

احسان شاہ بہت مطمئن تھا۔ خوش اور مطمئن تو فلک شاہ بھی تھا لیکن اس کا سارا اطمینان اس وقت رخصت ہو گیا تھا جب مائرہ حسین کالج میں داخل ہوتے ہی ان سے ٹکرا گئی۔

''تم کیا سمجھتے ہو فلک شاہ! کہ تمہاری اس ایمرجنسی میں کی جانے والی منگنی کا مطلب میں نہیں سمجھتی؟ اپنے ماتھے پر منگنی کا لیبل لگا کر تم سمجھتے ہو کہ میں، احسان شاہ سے محبت کرنے لگوں گی۔ محبت زندگی میں ایک بار کسی ایک بندے سے ہی ہوتی ہے۔ اور مائرہ حسین نے صرف تم سے محبت کی ہے۔''

اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے فلک شاہ نے کہا۔

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ محبت، زندگی میں صرف ایک بار ہی ہوتی ہے۔''

''تمہارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم، عمارہ سے محبت کرتے ہو؟'' مائرہ حسین نے تیزی سے ان کی بات کاٹی تھی۔

''میں آپ کے سامنے کسی بھی قسم کی وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ پلیز میرے راستے سے ہٹ جائیں۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اپنے دوست کی خاطر۔''

اور فلک شاہ کا غصہ یکدم ہی عود کر آیا تھا۔ ''میں زندگی میں دوبارہ کبھی آپ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ آئندہ میرے سامنے مت آئیے گا۔''

انہوں نے مائرہ حسین کے یکدم سرخ ہو جانے والے چہرے اور آنسوؤں سے بھیگتے رخساروں کو نہیں دیکھا تھا۔

عمارہ کے لبوں سے سوتے میں کراہ نکلی تو وہ یکدم چونک کر عمارہ کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ سوتے میں بھی ان کے چہرے پر کسی اذیت کے آثار تھے، ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ کیا وہ کوئی اذیت ناک خواب دیکھ رہی تھی؟

تیزی سے وہیل چیئر گھماتے وہ بیڈ کے قریب آئے اور نرمی سے اپنا ہاتھ عمارہ کی پیشانی پر رکھا۔

''عمو......!''

یہ ان کے ہاتھ کے لمس کا اعجاز تھا یا ان کی آواز کا کہ عمارہ نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ اور پھر انہیں بیڈ کے قریب دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹی رہو عمو!''

فلک شاہ ان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ عمارہ نے کمرے میں پھیلی روشنی کو دیکھا۔

''بہت دیر ہو گئی ہے۔ آپ مجھے جگا دیتے۔'' وہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''آپ اتنے سکون سے سو رہی تھیں۔ کیوں جگاتا بھلا؟'' وہ مسکرائے تھے۔

''میں نے تو نماز پڑھ کے یونہی ٹیک لگائی تھی۔ سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ تسبیح پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ گئی۔ آپ نے

...تہ کرلیا؟"
"ہاں۔ انجی اور میں نے اکٹھے ناشتہ کیا ہے۔"
"انجی کہاں ہے؟"
"وہ گھر گئی ہے۔ دوپہر تک آجائے گی۔"
"میں تو اب بالکل ٹھیک ہوں۔ انجی کے یہاں رہنے سے جواد کو پریشانی ہوتی ہوگی۔ وہ چلی جاتی گھر۔"
"میں نے جواد سے کہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، ایبک آجائے لاہور سے تو چلا جاؤں گا۔"
"ایبک کا فون آیا؟"
"ہاں! آج شام تک پہنچ جائے گا۔"
"اس نے کچھ بتایا، وہاں الریان میں تو سب ٹھیک ہیں نا؟...... بابا جان اور......" بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

انہیں بغور دیکھتے ہوئے فلک شاہ نے پوچھا تھا۔ "آپ کچھ پریشان لگ رہی ہو عمو!"
"نہیں تو۔" پھیکی سی مسکراہٹ عمارہ کے لبوں تک آ کر معدوم ہوگئی تھی۔ لیکن فلک شاہ جانتے تھے کوئی بات تو ہے جو انہیں پریشان کر رہی ہے۔ ورنہ عمارہ نے کبھی ان کے سامنے الریان کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کہیں بابا جان کی بیماری کے متعلق تو کوئی سن گن نہیں مل گئی انہیں؟

ایبک شاہ نے جاتے ہوئے بڑی سختی سے منع کیا تھا کہ ماما کو بابا جان کے متعلق مت بتائیے گا۔
"وہ دراصل......" عمارہ نے انہیں سوچ میں ڈوبے دیکھ کر کہا۔ "ابھی ابھی میں نے خواب میں اماں جان کو دیکھا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اُنہیں پکارا بھی تھا، اُن کے پیچھے بھی بھاگی تھی لیکن انہوں نے نہ میری پکار سنی، نہ مجھے مڑ کر دیکھا۔" عمارہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔
"وہ...... میرے لئے کتنا تڑپی تھیں موی! زارا کہتی تھی، میرا دکھ اُنہیں اجاڑ کر گیا ہے۔ دیمک کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا ہے انہیں۔ اور میں کتنی بدنصیب بیٹی ہوں کہ اپنی ماں کے آخری لمحوں میں ان کے پاس نہ تھی۔"
وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھیں۔ فلک شاہ نے اُنہیں رونے دیا تھا۔ یہ چھبیس سالوں میں پہلی بار تھا کہ وہ ان کے سامنے اس طرح رو رہی تھیں۔ چھپ چھپ کر تو ہزاروں بار روئی ہوں گی لیکن...... چہرے سے ہاتھ ہٹا کر انہوں نے فلک شاہ کو دیکھا۔
"اماں جان میری راہ دیکھتی رہیں۔ ان کی نظریں دروازے کی طرف ہی لگی رہیں اور پھر میرا انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ کسی نے مجھے خبر تک نہ کی موی! کوئی مجھے بتاتا تو میں اُڑ کر ہسپتال پہنچ جاتی۔ ہسپتال کے دروازے تو مجھ پر بند نہیں ہوئے تھے نا۔ زارا یہاں ہوتی تو وہ مجھے ضرور خبر کرتی لیکن اُسے تو خود موت کے بعد اطلاع دی گئی تھی۔ صرف اس لئے کہ دیارِ غیر میں وہ پریشان نہ ہو۔"
"لیکن میں...... کیا وہ میری ماں نہ تھیں؟ کیا میرا......"
بے شمار آنسوؤں نے ان کا حلق بند کر دیا تھا۔ بے حساب احساسِ پشیمانی میں ڈوبے فلک شاہ ہولے ہولے ان کا بازو سہلا رہے تھے۔ کہنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ دو حرف تسلی بھی نہیں۔
"عمو! بس کرو۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔" عمارہ نے آنسو پونچھتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔
"سوری موی! میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔ پتہ نہیں کیوں، خواب دیکھنے کے بعد مجھے وہم سا ہونے لگا ہے کہ کہیں بابا جان......"
"عمو! کوئی فضول بات منہ سے مت نکالیے گا۔ اللہ، بابا جان کو بہت لمبی اور طویل زندگی دے۔ اور یہ اس وقت کے

خواب تو بس یونہی ہوتے ہیں۔ آپ ان دنوں بہت سوچتی رہی ہیں اماں جان اور بابا جان کے بارے میں۔"

"میں نے کب ان کے متعلق نہیں سوچا موی؟" عمارہ نے دل گرفتگی سے کہا تو بے اختیار فلک شاہ کے لبوں سے نکلا
"میں ایسا کیا کروں عمو! کہ گزرا ہوا وقت لوٹ آئے۔"

عمارہ نے اپنے بازو پر رکھے ان کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور نم آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"ہمارے ساتھ...... ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا موی!" فلک شاہ کے ہاتھوں سے اختیار کی لگامیں چھوٹ گئیں
وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر زور زور سے رونے لگے۔

عمارہ نے ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت سخت کر دی تھی لیکن خود ان کی آنکھوں سے دریا بہہ نکلے تھے۔
باہر دن ایسا ہی چمک دار اور روشن تھا اور اندر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے آنسو بہا رہے تھے۔

❀○❀

''پولیس؟''
حسن رضا کو لگا، جیسے انہوں نے غلط سنا ہو۔
''جی، پولیس۔ احمد رضا کا یہی گھر ہے نا؟'' باہر سے آواز آئی تھی۔
بے اختیار مڑ کر احمد رضا کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے دروازے کا لاک کھولا۔ احمد رضا خود حیران کھڑا پولیس کے ان تین بندوں کو دیکھ رہا تھا جو دروازے پر کھڑے تھے۔
'کہیں پولیس کی وردی میں یہ ڈاکو ہی نہ ہوں۔' سوچتے ہوئے غیر ارادی طور پر دو قدم آگے بڑھ کر وہ حسن رضا کے برابر اس طرح کھڑا ہو گیا تھا کہ دروازے سے اندر آنے کا راستہ مسدود ہو گیا۔
''آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ پولیس کے افراد ہیں؟'' احمد رضا نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
لیکن اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ حسن رضا سے مخاطب ہوا تھا۔
''میاں صاحب! یہاں کھڑے کھڑے ہی بات کریں یا......''
''آئیے......پلیز اندر آئیے۔'' حسن رضا نے انہیں راستہ دیا۔
متذبذب سا احمد رضا بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد احمد رضا بڑا چوکنا سا تھا۔
''جی فرمائیے؟'' حسن رضا بے حد پریشان سے کبھی ان تین پولیس والوں کو دیکھتے تھے اور کبھی احمد رضا کو۔
''احمد رضا آپ میں سے کون ہے؟'' ایک پولیس والے نے کچھ دیر ان کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔
''میں ہوں احمد رضا۔'' احمد رضا نے اپنا تعارف کروایا۔
''یہ میرا بیٹا ہے۔ اس نے کیا جرم کیا ہے جناب؟'' حسن رضا کی آواز کانپ گئی۔
''جرم تو کوئی نہیں جناب! لیکن ایک شخص ہے، اسمٰعیل خان۔ اس کے خلاف چند معزز لوگوں نے درخواست دی ہے کہ وہ خلافِ دین کاموں میں ملوث ہے۔''
''لیکن وہ تو بہت اچھے اور نیک انسان ہیں۔ بہت بڑے صوفی اور عالم ہیں۔'' بے اختیار ہی احمد رضا کے لبوں سے نکلا تھا۔
پوچھنے والے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی تھی۔
''آپ جانتے ہیں انہیں؟''
''کچھ دن پہلے اُن سے تعارف ہوا تھا۔ دو چار بار اُن کی محفل میں گیا ہوں۔'' احمد رضا اب قدرے مطمئن سا ہو کر اعتماد سے بات کر رہا تھا لیکن حسن رضا بے حد مضطرب تھے۔
''مجھے بھی بتائیے سر! کیا بات ہے؟''
''میاں صاحب! یہ شخص اسمٰعیل جو ہے، اس کے متعلق رپورٹ ہے کہ یہ لوگوں کو دین سے بھٹکا رہا ہے بلکہ خود کو اللہ کا بھیجا ہوا خلیفہ کہتا ہے۔ زیادہ تو نہیں لیکن کچھ لوگ اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو رہے ہیں۔ رپورٹ ہے کہ چند دن

قبل اپنے ہاں ہونے والی ایک مجلس میں اس نے خود کو اللہ کا نبی کہا ہے۔ نعوذ باللہ۔ رپورٹ ملنے پر آج رات ہم نے اس کے گھر چھاپہ مارا ہے لیکن وہاں صرف ایک چوکیدار تھا۔ وہاں سے تلاشی لینے پر ایک نام اور فون نمبر ملا۔ جب ہم اس بندے سے ملے جس کا وہ نمبر تھا تو اس نے بتایا کہ وہ تو اب وہاں نہیں جاتا۔ البتہ اس نے احمد رضا کے متعلق بتایا کہ وہ بھی اس کے عقیدت مندوں میں شامل ہے۔ تو میاں صاحب! ہم اسی سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں۔ ایس پی صاحب کا حکم ہے کہ احمد رضا کو لے آئیں۔ اسمٰعیل کے متعلق تفتیش کرنی ہے۔ شاید احمد رضا کو اس کے کسی اور ٹھکانے کا علم ہو۔ تو اگر آپ اجازت دیں تو ہم احمد رضا کو ساتھ لے جائیں؟“

حسن رضا نے اپنی زندگی میں ایسا سلجھا ہوا پولیس انسپکٹر نہیں دیکھا تھا۔

”جی......جی ضرور۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اندر بتا دوں ذرا۔“

تینوں پولیس مین اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

حسن رضا اور احمد رضا ان کے ساتھ پولیس وین میں بیٹھ گئے۔

جب وہ گھر واپس آئے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ سمیرا اور زبیدہ بیگم جاگ رہی تھیں۔ حسن رضا نے احمد رضا سے نہ کچھ پوچھا تھا، نہ بات کی تھی۔ البتہ اس کے بیان کو خاموشی سے سنا تھا۔ راستے میں بھی انہوں نے احمد رضا سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس نے دو تین بار کن اکھیوں سے انہیں دیکھا تھا لیکن وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

”کیا ہوا، خیریت تھی؟...... کیوں لے گئے تھے وہ آپ دونوں کو؟“ زبیدہ بیگم نے گیٹ کھولتے ہی بے چینی سے پوچھا اور وہ اُنہیں تسلی دیتے ہوئے اندر آ گئے۔

”تم جاؤ۔ آرام کرو زبیدہ! اور سمیرا کو بھی کہو، سو جائے۔ دو بج رہے ہیں۔“ لاؤنج میں بیٹھتے ہی انہوں نے زبیدہ بیگم سے کہا۔

”لیکن مجھے بھی تو پتہ چلے کہ بات کیا تھی؟“ زبیدہ بیگم پریشان سی کھڑی تھیں۔

”کہا نا، کچھ خاص نہیں تمہارے بیٹے کے کسی دوست کے متعلق معلومات چاہئیں تھیں پولیس کو۔“ ان کے لہجے میں ہلکا سا طنز محسوس کرتے ہوئے احمد رضا جز بز ہوا۔

”ابو! وہ میرے دوست نہیں ہیں۔“

”اوہ ہاں! تم ان کے عقیدت مند ہو۔“

”ابو پلیز! میری پوری بات تو سنیں۔ آپ ان سے مل کر تو دیکھیں۔“

”تمہاری بات میں نے وہاں سن لی تھی لیکن اس کے علاوہ بھی تمہارے پاس کچھ کہنے کو ہے تو صبح بات کرنا۔“ وہ جو اسے سمجھانے کے ارادے سے بیٹھے تھے، اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ”اب جا کر آرام کرو۔ صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے۔“

وہ زبیدہ بیگم اور اس کی طرف دیکھے بغیر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے انہوں نے مڑ کر سمیرا کو دیکھا تھا، جو ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر ازحد پریشان بیٹھی تھی۔

”بیٹا! جاؤ آرام کرو۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔“

بے حد نرمی سے کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ٹی وی لاؤنج میں اب زبیدہ بیگم اور احمد رضا کھڑے تھے۔ احمد رضا کچھ دیر یونہی کھڑا رہا، پھر یکدم مڑا اور برآمدے میں آ کر سمیرا کی طرف دیکھے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

کمرے میں آ کر اس نے لائٹ جلائی اور سوچا، ابھی اور اسی وقت ابراہیم کو فون کرے کہ آخر اس کا نمبر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ خواہ مخواہ اب ابو کا لیکچر سنو اور......

لیکن یہ پولیس والے کیا کہہ رہے تھے؟ اور وہ ایس پی۔

نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسمٰعیل صاحب اس طرح کے نہیں ہو سکتے۔ وہ تو اس قدر عالم شخص ہیں۔ اللہ اور رسول صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرنے والے ہیں۔ یہ الزام ہے ان پر۔' اُسے یقین تھا۔

اسمٰعیل خان نے اسے بتایا تھا کہ کچھ کٹر قسم کے مولوی ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں، دین پر صرف ان کی اجارہ داری ہے۔

اُسے یک دم یاد آیا تھا کہ یہ پرسوں شام کی ہی بات تھی، جب اسمٰعیل خان نے اسے بتایا تھا اور شاید وہ جانتے تھے کہ ایسا کچھ ہونے والا ہے، تب ہی انہوں نے گھر خالی کر دیا ہے......اور اب پتہ نہیں، پھر کبھی ان سے ملاقات ہو سکے گی یا نہیں۔ وہ افسردہ ہوا تھا۔

'قسمت کی دیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔'

اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے جوتوں کے تسمے کھولے اور ابھی سیدھا ہوا ہی تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے پہلی بیل پر ہی ریسیور اٹھا لیا تھا۔ نیچے لاؤنج میں اس کا ایکس ٹینشن سیٹ پڑا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ابو جو ابھی لیٹے ہی تھے، اُٹھ جائیں۔ اور ہو سکتا ہے، یہ فون تھانے سے آیا ہو۔ آتے ہوئے اس نے ان کے کہنے پر اپنا فون نمبر دیا تھا۔ کہیں اسمٰعیل خان گرفتار تو نہیں ہو گئے؟ اُس کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

''ہیلو!'' اس نے دھڑکتے دل سے کہا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی۔ ''احمد رضا؟''

''یس۔''

''ام......الوینا۔'' (میں الوینا ہوں)

''کون الوینا؟'' وہ اُلجھا۔ شاید رانگ نمبر......اس نے سوچا لیکن پھر چونکا۔ نہیں، ابھی اس نے اس کا نام لیا تھا۔

''کیا اس فون کا کوئی ایکس ٹینشن ہے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''ہاں، ہے تو۔''

''تو پلیز چیک کرو کہ کوئی ایکس ٹینشن پر موجود تو نہیں؟'' گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔

''او کے۔'' اُس نے ریسیور ٹیبل پر رکھا اور دروازہ کھول کر سیڑھیوں تک گیا۔ چند سیڑھیاں اُتر کر اُس نے ریلنگ سے جھانکا۔ نیچے اندھیرا تھا۔

وہ یونہی دبے قدموں اوپر آیا اور دوبارہ ریسیور اُٹھایا۔

''نیچے کوئی فون نہیں سن رہا۔''

''میں حضرت جی کے کہنے پر آپ کو فون کر رہی ہوں۔''

''حضرت جی۔'' وہ چونکا اور پھر یک دم خوش ہو کر بولا۔ ''کہاں ہیں؟ خیریت سے تو ہیں؟''

''سنو احمد رضا! تم اس وقت گھر سے باہر نکل سکتے ہو؟'' وہ جو اس دلکش آواز کی نغمگی میں کھویا ہوا تھا، چونکا۔

''اس وقت......؟'' وہ پریشان ہوا۔ ''بہت مشکل ہے۔''

''کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا احمد رضا! اگر ارادہ پختہ ہو۔ حضرت جی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اس وقت تمہارے گھر سے باہر مین روڈ پر سگنل کے قریب گاڑی میں ہوں۔ پندرہ منٹ تمہارا انتظار کروں گی۔ اگر آ سکو تو آ جاؤ۔ صبح ہونے سے پہلے تمہیں یہیں چھوڑ دیا جائے گا۔''

فون بند کر دیا گیا تھا۔ چند لمحے وہ یوں ہی متذبذب سا بیٹھا رہا۔

میرا اگر جاگ رہی ہوئی تو ضرور پوچھے گی کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کیوں......وہ ابو کو بتا دے گی۔ کم از کم یہ وہ ابو سے نہیں چھپائے گی اور پھر ممکن ہے، ابو بھی جاگ رہے ہوں۔

اس نے سامنے گھڑی کی طرف دیکھا۔

اڑھائی بج رہے تھے۔ ابھی صبح ہونے میں بہت دیر تھی۔ سردیوں کی راتیں طویل ہوتی ہیں اور......اس نے جھک کر
بیڈ کے نیچے سے اپنے جاگرز نکالے اور تھوڑی دیر بعد وہ ٹیرس کا دروازہ کھول رہا تھا۔ یک دم ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے
سے ٹکرائی تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔

اس نے ٹیرس پر قدم رکھا۔ یہ چھوٹی سی گیلری یا ٹیرس تھا جو گلی کے پچھلی طرف تھا۔ اس نے ٹیرس کا دروازہ بند کر کے
نیچے گلی میں جھانکا۔ پول پر مدقوق سا بلب جل رہا تھا۔ بچپن میں کئی بار وہ پتنگ لوٹنے کے لئے آس پاس گھروں کے ٹیرس پر
اُترا، چڑھا تھا۔ اس نے ایک بار پھر گلی میں جھانک کر دیکھا۔ گلی ویران تھی۔ رات کے اڑھائی بجے سب ہی سو رہے
تھے۔ اس نے ٹیرس کے جنگلے پر ہاتھ رکھ کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ جنگلے سے جھول رہا تھا۔ چند
لمحے جھولنے کے بعد ہی اس کے پاؤں نیچے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے شیڈ پر ٹِک گئے تھے۔

اس نے آہستہ آہستہ پہلے ایک ہاتھ چھوڑا اور پھر دوسرا۔ ہلکا سا جھٹکا لگا تھا، لیکن وہ سنبھل گیا تھا۔ پھر وہ پہلے شیڈ پر
بیٹھا اور پھر شیڈ کا کنارا پکڑ کر لٹک گیا۔ زمین اس کے قدموں سے ایک دو فٹ ہی نیچے تھی۔ پھر اللہ کا نام لے کر اس نے
شیڈ کا کنارا چھوڑ دیا۔ دھپ کی آواز آئی۔ گھٹنے ذرا سے مڑے تھے لیکن وہ گرا نہیں تھا۔ لمحہ بھر وہ یونہی کھڑا رہا۔ آس پاس
کوئی نہیں تھا۔ سارے گھر اندھیرے میں ڈوبے تھے لیکن کہیں کہیں کسی گھر سے نائٹ بلب کی مدھم روشنی کی لکیریں
درزوں سے جھانک رہی تھیں۔

وہ بہت احتیاط سے چلنے لگا۔ دس منٹ بعد وہ مین روڈ پر سگنل کے پاس سڑک سے نیچے کھڑی گاڑی کے پاس تھا۔
اسے آتے دیکھ کر ڈرائیور نے، جو گاڑی کا بونٹ اٹھائے جھکا ہوا تھا، جیسے گاڑی میں کوئی خرابی ہو اور وہ چیک کر رہا، سیدھا
ہو گیا اور گاڑی کا بونٹ گرا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ پچھلا دروازہ کھل گیا تھا۔

''آیئے احمد رضا!'' وہ دلکش نسوانی آواز سنائی دی تو وہ اندر بیٹھ گیا۔ گاڑی میں مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سفید
میکسی والی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ اس نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن لڑکی نے اپنا مومی اُنگلیوں والا ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر
دیا اور ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے گلابی لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''حضرت جی آپ کے منتظر ہیں۔ وہیں چل کر باتیں ہوں گی۔''

اس نے اپنا خوب صورت ہاتھ اس کے بازو پر رکھا اور احمد رضا کے اندر جیسے بجلیاں سی کوند گئی تھیں۔ اس نے بڑی
شدت سے تمنا کی۔ یہ ہاتھ کچھ دیر اور یونہی اس کے بازو پر رہا رہے اور وہ اس ہاتھ سے نکلنے والی حدت اپنے رگ و پے
میں دوڑتی محسوس کرتا رہے۔ لیکن چند لمحوں بعد ہی اس نے اپنا ہاتھ اٹھا لیا تھا اور اب اسے اپنی گود میں دھرے سامنے
دیکھ رہی تھی۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ ایک کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔ گاڑی پورچ میں رُکی تو ڈرائیور نے اُتر کر
دروازہ کھولا۔ دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے تھے۔ پورچ میں مدھم لائٹ جل رہی تھی۔

اس نے اب غور سے دیکھا۔ یہ ان تین لڑکیوں میں سے ایک تھی، جو حضرت جی کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہوتی تھیں۔
درمیان والی۔ اس وقت وہ ہلکے گلابی رنگ کا میکسی نما لبادہ پہنے ہوئے تھی، جس کے اوپر اس نے ایک قیمتی شال لے رکھی
تھی۔ سر کے بال کھلے تھے اور بالوں کا آبشار سا اس کے کندھوں پر بکھرا تھا۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا کہ اس نے مسکرا
کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مرکزی دروازے سے جانے کے بجائے پچھلے لان کی طرف جا رہی تھی۔

احمد رضا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور احمد رضا کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دل اس کے ہاتھ میں دھڑک رہا ہو۔ وہ
سحر زدہ سا اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ پچھلے لان میں وہ یونہی اس کا ہاتھ پکڑے سرونٹ کوارٹر کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ
گئی۔ یہ سرونٹ کوارٹر پچھلے لان میں تھا۔ لوہے کی سیڑھیاں چڑھ کر چھوٹا سا کوریڈور تھا، جس میں بمشکل ایک آدمی ایک
وقت میں کھڑا ہو سکتا تھا۔ اور سیڑھیوں کے بالکل سامنے کمرے کا دروازہ تھا۔ اس نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس کا

ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ آگے تھی اور احمد رضا اس کے پیچھے۔ اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر ایک لوہے کے پائیوں والا بیڈ تھا۔ بالکل سامنے دائیں طرف ایک لکڑی کی الماری تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر الماری کو ایک طرف دھکیلا۔ وہ سلائیڈنگ ڈور تھا، جو بظاہر الماری کی طرح دِکھتا تھا۔ وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔

یہ دروازہ ایک کمرے میں کھل رہا تھا۔ غالباً یہ اس کوٹھی کا فرسٹ فلور تھا۔ کمرے میں صوفے اور ٹی وی تھا اور ایک کم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس ٹی وی لاؤنج سے نکل کر اس نے بیڈروم کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے کچھ کہا تھا، پھر دروازے کو ہلکا سا دھکا دے کر کھولتے ہوئے اسے بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہو گئی۔

یہ ایک شاہانہ قسم کا بیڈروم تھا، جس میں موجود فرنیچر کی قیمت کا دل ہی دل میں اندازہ لگاتے ہوئے احمد رضا نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اسمٰعیل خان کو دیکھا۔ ان کے پاؤں کی طرف ان تین لڑکیوں میں سے ایک بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھی۔ اس نے بھی آج گلابی لبادہ پہن رکھا تھا۔ جو اتنا باریک تھا کہ اس کا خوب صورت جسم اس میں سے جھلکتا تھا۔ احمد رضا نے نظریں جھکا لیں۔

''اہلاً وسہلاً مرحبا!''

اسمٰعیل خان نے ہاتھ آگے بڑھایا، جسے احمد رضا نے عقیدت سے تھام لیا اور پھر آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔

اسمٰعیل خان نے ایک ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسرے ہاتھ کے اشارے سے لڑکی کو اُٹھنے کے لئے کہا تھا شاید۔ دونوں لڑکیاں سر خم کر کے کمرے سے نکل گئیں۔

سفید میکسی والی تینوں لڑکیاں خاص خادمائیں تھیں جو ہمہ وقت اسمٰعیل خان کے ساتھ رہتی تھیں جبکہ باقی چھ لڑکیاں اپنی ڈیوٹی ختم کر کے چلی جاتی تھیں۔ یہ بات اسمٰعیل خان کے ساتھ آخری ہونے والی میٹنگ میں ارباب حیدر نے اسے بتائی تھی، جو اسمٰعیل خان کا مقرب خاص تھا۔

احمد رضا نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھایا۔ اسمٰعیل خان اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر کانچ کی نازک صراحی تھی، جس میں ارغوانی رنگ کا کوئی مشروب تھا۔ کیا اسمٰعیل خان شراب پی رہے تھے؟ احمد رضا نے دل میں خیال آیا۔

''یہ شرابِ طہور ہے۔ خاص مشروب۔'' اسمٰعیل خان نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور مسکرائے۔

احمد رضا یک دم مرعوب ہوا۔ تو کیا وہ دلوں کا حال بھی جانتے ہیں؟

''دلوں کا حال تو صرف وہ جانتا ہے۔ ہم تو اُس کے ادنیٰ بندے ہیں۔'' وہ ایک بار پھر اسے حیران کر رہے تھے۔ ''یہ صرف مقربینِ خاص کے لئے ہے۔ ورنہ تم بھی اس کا ذائقہ چکھتے لیکن......''

وہ مسکرائے۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔

''بہت جلد تم بھی ہمارے مقربینِ خاص میں شامل ہونے والے ہو..... تمہارے سر پر ''ہما'' کو منڈلاتے دیکھ رہا ہوں۔ دولت، شہرت، عزت سب تمہارے قدموں میں ڈھیر ہونے والی ہے۔''

اُس کا دل جیسے خوشی سے اُڑانیں بھرنے لگا تھا۔ یہی سب تو وہ چاہتا تھا اور اس سب کی تو اسے خواہش تھی۔

''کب...... کب جناب؟'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''بہت جلد...... بہت جلد۔ لیکن ابھی کچھ امتحان ہیں۔ ان سے گزرنا ہوگا۔ پھر دولت تمہارے گھر کی لونڈی ہوگی اور شہرت تمہارے قدموں کے نیچے۔''

''کیسے امتحان؟'' وہ ذرا سا پریشان ہوا تھا۔

''وقت کے ساتھ خود ہی واضح ہو جائے گا۔ ابھی تو ہم تمہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تم پریشان نہ ہو۔ کوئی ہمارا بال بھی

بیکا نہیں کر سکتا۔ رات کے اس پہر ہم سے تمہاری پریشانی دیکھی نہیں گئی۔ اس تھانیدار نے کیا کہا تمہیں؟''
اور احمد رضا نے انہیں سب بتا ڈالا۔
ایک عجیب مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی تھی، جسے احمد رضا نے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے ذہن میں یہ آیا تھا کہ
دلوں کا حال جاننے والا کیا نہیں جان سکتا کہ اُس کی اس تھانیدار اور ایس پی سے کیا گفتگو ہوئی؟ وہ تو مرعوب سا بیٹھا تھا۔
''یہ تم نے اچھا کیا کہ اس مجلس کی تفصیل نہیں بتائی۔ دراصل یہ ہمارے دشمن ہیں احمد رضا! جو اُلٹا سیدھا ہمارے
خلاف اُڑاتے رہتے ہیں۔ ان میں کچھ صحافی بھی شامل ہیں۔ یہ سب خود ہی نابود ہو جائیں گے۔ تم دیکھنا، ایک روز اُن کا
انجام برا ہوگا۔ ہوسکتا ہے آئندہ بھی وہ تمہیں بلائیں لیکن تم اُنہیں اس ملاقات کے بارے میں ہرگز مت بتانا۔ یوں بھی ہم
صبح یہاں سے چلے جائیں گے۔''
''آپ چلے جائیں گے تو؟'' احمد رضا گھبرایا۔
''گھبراؤ نہیں۔ تم ہمیشہ ہمارے رابطے میں رہو گے۔ تمہیں منتخب کر لیا گیا ہے اور بہت جلد تمہیں ایک خوشخبری سنائی
جائے گی۔''

احمد رضا مرعوبیت اور ممنونیت سے جھک سا گیا۔
اسمٰعیل نے اپنا دایاں ہاتھ سائیڈ ٹیبل پر بنے ہوئے ایک بٹن پر رکھا تھا۔ دُور کہیں گھنٹی بجی تھی اور وہی لڑکی، جس نے
اپنا نام الوینا بتایا تھا، اندر آئی۔ اسمٰعیل خان نے ہاتھ ذرا سا اونچا کیا۔ لڑکی نے ان کے سامنے سر تھوڑا سا جھکایا اور پھر احمد
رضا سے مخاطب ہوئی۔
''آئیے جناب!''
احمد رضا اُٹھا تو اسمٰعیل نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ یہ یہاں کا دستور تھا کہ اسمٰعیل خان کے سب مرید جب
رخصت ہوتے تو ان کے ہاتھ پر بوسہ دیتے تھے۔ احمد رضا نے بھی اسمٰعیل کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور الوینا کے پیچھے بیڈ روم
سے باہر نکل گیا۔

الوینا گاڑی تک اسے چھوڑنے آئی تھی لیکن واپسی کے سفر میں وہ اس کے ساتھ نہ تھی۔ جب وہ اپنی گلی میں داخل ہوا،
پانچ بج رہے تھے۔ گلی میں ویسی ہی خاموشی تھی اور مکین گہری نیند سو رہے تھے۔ ابھی فجر کی اذان میں وقت تھا۔ وہ جس
طرح گیا تھا، اسی انداز میں ذرا سی کوشش سے وہ اپنے کمرے کے ٹیرس پر موجود تھا۔ جتنی پھرتی سے وہ بچپن میں شیڈز پر
پاؤں رکھ کر گڈیاں لُوٹنے چھتوں پر چڑھتا تھا، آج وہ پھرتی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے لبوں پر
مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے عنقریب خوشخبری ملنے والی تھی۔
وہ خوشخبری کیا تھی، وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن جب وہ اپنے بیڈ پر لیٹا تو اس کی آنکھیں خوش رنگ خوابوں سے بھری
ہوئی تھیں۔

دولت کے ڈھیر اور شہرت کی بلندی۔
وہ خواب میں بھی خود کو بلندیوں پر پرواز کرتے دیکھتا رہا تھا اور اس وقت بھی وہ بڑا حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک
شاندار گاڑی سے اُتر رہا تھا۔ ٹی وی کیمرے کھٹا کھٹ اُس کی تصویریں اُتار رہے تھے کہ سمیرا نے دروازہ بری طرح
دھڑ دھڑا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا تھا۔
''کیا ہے؟'' دروازہ کھول کر اس نے سمیرا کو گھورا۔
''یونیورسٹی نہیں جانا کیا؟''
اس نے مڑ کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔
''جلدی آؤ، ابو انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ سر ہلا کر واپس مڑ گیا۔
یقیناً جو بات ابو نے رات کو اس سے نہیں کہی تھی، اب اس سے کرنا تھی۔ ورنہ آٹھ بجے تک تو وہ آفس کے لئے نکل جاتے تھے۔
'خیر، دیکھا جائے گا۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ مجھے برے بھلے کی پہچان نہ ہو۔'
وہ سر جھٹک کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ جب کہ سمیرا کی نظریں اس کے گھٹنوں پر تھیں، جہاں اس کی پتلون پر مٹی لگی ہوئی تھی، جیسے رگڑ کھائی ہو۔ وہ حیران سی سیڑھیاں اُترنے لگی۔

❁○❁

''ہومی!''
عبدالرحمٰن شاہ نے کروٹ بدل کر ہمدان کی طرف دیکھا، جو بیڈ کے قریب ہی کرسی پر بیٹھا کوئی میگزین دیکھ رہا تھا۔
''جی بابا جان!'' اس نے میگزین بند کر کے ٹیبل پر رکھا۔
کہنیوں کے بل انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی تو تیزی سے اُٹھ کر ہمدان نے انہیں سہارا دیا اور ان کے پیچھے تکیے رکھے۔
''ہومی!'' تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔''ایبک نے بہاول پور جا کر کوئی فون نہیں کیا؟''
''جی بابا جان! کل رات اس کا فون آیا تھا۔ آپ کی خیریت پوچھ رہا تھا۔
''اور......اور عمو......تمہاری پھپھو کے متعلق کیا بتایا اس نے؟'' انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔
''بابا جان! وہ بہت بہتر ہیں اب۔''
''ہومی!'' وہ ذرا سا جھجکے۔''تم تو بہاول پور جاتے رہتے ہو۔ عمو نے کبھی ہمارے متعلق کوئی بات کی؟''
''بابا جان! اُن کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی بات ہوتی ہی نہیں......وہ تو سارا ٹائم آپ کی، پاپا کی، انکلز کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ ایک ایک کا احوال پوچھتی ہیں۔''
''اچھا کبھی کوئی گلہ، کوئی شکوہ کیا اس نے؟''
''نہیں بابا جان! انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔''
''ہاں......'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔''وہ تو بچپن سے ایسی ہی تھی۔ نہ کوئی گلہ، نہ شکوہ جو کہا، مان لیا۔ کبھی اس نے ضد نہیں کی۔ حالانکہ زارا ضد کر لیتی تھی لیکن عمو نے کبھی ضد نہیں کی۔ ماں اگر کبھی ڈانٹ بھی دیتی تو ہنس دیتی۔''
''اماں جان! آپ پر ڈانٹ بالکل بھی سوٹ نہیں کرتی۔'' وہ اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُنہیں منا لیتی۔ مجھے نہیں یاد کبھی اُس کی کسی بھائی یا بھابی سے معمولی سی بھی رنجش ہوئی ہو پھر......''
انہوں نے ایک نظر ہمدان پر ڈالی اور پھر بات نامکمل چھوڑ کر اندر آتے مرتضٰی کو دیکھنے لگے۔
''کیا کہا ڈاکٹر نے؟......کب گھر جانا ہے مجھے؟''
''بابا جان! فی الحال تو ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت نہیں دی۔ وہ کچھ روز مزید آپ کو انڈر آبزرویشن رکھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر بھٹی، انجیوگرافی کے لئے کہہ رہے ہیں۔''
''نہیں مرتضٰی! یہ انجیوگرافی نہیں کروانی مجھے۔ موت تو اپنے وقت پر ہی آنی ہے۔''
''ٹھیک ہے بابا جان! انجیوگرافی ضروری ہوئی تو تب ہی کروائیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ شانی، ڈاکٹر عامر اور

ڈاکٹر چودھری سے بھی مشورہ کر رہا ہے۔''

مرتضیٰ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئے۔

''بیٹا! زندگی میں سب کچھ دیکھ لیا۔ اپنی اولاد اور پھر ان کی اولادوں کو۔ اللہ تم سب کو ہنستا بستا رکھے اور اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔ اور کتنا جینا ہے مجھے۔ بس ایک ہی حسرت ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار عمو کو دیکھ لوں۔ تمہاری ماں بھی اسی حسرت کو دل میں لئے چلی گئی اور میں...... مرتضیٰ! مجھے عمو کے پاس لے چلو۔ ایک بار مجھے اس سے ملوا دو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ اب برداشت نہیں ہوتا۔''

''بابا جان! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' مرتضیٰ نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔

''جیسے ہی آپ کی طبیعت ٹھیک ہوتی ہے، میں آپ کو بہاول پور لے کر چلتا ہوں اور اگر ڈاکٹر نے سفر کی اجازت نہ دی تو میں خود جا کر لے آؤں گا، عمارہ اور مومی کو۔ آپ پلیز ٹینشن نہ لیں۔''

سارے بیٹوں میں سے مصطفیٰ ان کے زیادہ قریب تھے۔ اگرچہ مصطفیٰ بڑے تھے، پھر بھی وہ دل کی ہر بات مرتضیٰ سے ہی کہتے تھے۔ احسان چھوٹا ہونے کی وجہ سے ان کا لاڈلا تھا۔ بچپن میں قریب بھی تھا لیکن شادی کے بعد وہ قربت نہیں رہی تھی۔

ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''پتہ نہیں۔ شاید میں بھی تمہاری ماں کی طرح عمو سے ملنے کی حسرت لئے دنیا سے چلا جاؤں گا۔''

''نہیں بابا جان! میں...... میں کل ہی جا کر عمارہ اور مومی کو لے آتا ہوں۔'' مرتضیٰ نے پھر انہیں یقین دلایا لیکن اندر آتے احسان نے رائے دی۔

''جو چیپٹر کلوز ہو چکا، اسے اب کھولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' عبدالرحمٰن شاہ نے دُکھ اور حیرت سے اُسے دیکھا۔

''اور مجھے تو سچی بات ہے، ایبک کا بھی گھر آنا پسند نہیں ہے۔ اگر وہ ہمدان کے ساتھ نہ آتا اور آپ نے اسے اجازت نہ دی ہوتی تو میں کبھی بھی اسے الریان میں گھسنے نہ دیتا۔''

بے حد تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے عبدالرحمٰن شاہ نے سوچا۔ آخر ایسا کیا ہو گیا تھا جو احسان، فلک شاہ کا اتنا مخالف ہو گیا تھا۔ حالانکہ مومی تو الریان میں سب سے زیادہ احسان کے ہی قریب رہا تھا۔ اپنے ہاسٹل جانے سے پہلے تک وہ اور شانی ایک ہی کمرہ استعمال کرتے تھے۔ کسی ویک اینڈ پر اُسے آنے میں دیر ہو جاتی تھی تو سب سے زیادہ بے چین احسان شاہ ہی ہوتا۔ بہت ساری باتیں ان کے ذہن میں آ رہی تھیں جن پر پہلے انہوں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ انہوں نے احسان کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور مرتضیٰ سے درخواست کی تھی۔

''مجھے لٹا دو بیٹا!''

مرتضیٰ نے اُٹھ کر تکیے درست کئے اور انہیں سہارا دے کر لٹاتے ہوئے ایک سرزنش بھری نظر احسان پر ڈالی اور بے حد آہستگی سے اسے تنبیہ کی۔

''شانی! تمہیں بابا جان سے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔''

احسان بنا جواب دیئے کندھے اُچکا کر کھڑا ہو گیا۔

''ڈاکٹر عامر ابھی تک آئے نہیں۔ میں انہیں دیکھتا ہوں۔ اگر آ چکے ہوں تو......''

مرتضیٰ نے سر ہلا دیا۔ وہ تشویش سے عبدالرحمٰن شاہ کو دیکھ رہے تھے، جن کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن پپوٹوں کی لرزش بتا رہی تھی کہ وہ سوئے نہیں ہیں۔

''بابا جان!'' انہوں نے محبت سے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''عثمان آج شام کی فلائٹ سے آ رہا ہے۔''

''تم نے خوامخواہ انہیں اطلاع دی۔''

عبدالرحمٰن شاہ نے آنکھیں کھول کر مرتضٰی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ مرتضٰی کو تکلیف ہوئی اور انہوں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ کچھ بھی ہو، وہ کل جا کر مومی اور عمارہ کو لے آئیں گے۔

''انہیں آنا تو تھا ہی بابا جان! عادل کی منگنی کے سلسلے میں کچھ پہلے آ رہے ہیں۔''

''پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' عبدالرحمٰن شاہ نے آہستگی سے کہا۔

''نہ بتاتا اُنہیں تو اور ناراض ہوتے۔ دبئی میں تو ہیں۔ ان کا آنا کون سا مشکل ہے؟''

''چلو اچھا ہے، زندگی میں ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ مرتضٰی!'' اپنے بازو پر ہاتھ رکھے مرتضٰی کے ہاتھ پر انہوں نے اپنا ہاتھ رکھا۔ ''تمہیں کچھ علم ہے، یہ شانی عمو اور مومی کا اتنا مخالف کیوں ہے؟ اور ایک...... اس بچے سے اسے کیا دشمنی ہے؟''

''معلوم نہیں بابا جان!'' مرتضٰی نے نظریں چرائیں۔ ''اب مجھے اجازت دیں بابا جان! تین دن سے آفس نہیں گیا۔ بہت کام ہے۔ یہ ہومی ہے نا آپ کے پاس۔ میں اِن شاء اللہ! آفس کا کام نمٹا کر بہاول پور جا کر عمو کو لے آؤں گا۔'' انہوں نے انہیں تسلی دی۔

''وہ آ جائے گی تمہارے ساتھ؟'' انہوں نے بچوں کے سے اشتیاق سے پوچھا۔

''کیوں نہیں بابا جان! ہومی سے پوچھیں نا، کتنا تڑپتی ہے وہ آپ کے لئے۔''

وہ جانے کے لئے مڑے تو عبدالرحمٰن شاہ نے پھر آواز دی۔

''مرتضٰی! عاشی کو نہیں لائے تم؟..... رات کہا تھا تم سے۔''

''بابا جان! ابھی ملاقات کے ٹائم میں سب گھر سے آئیں گے تو اس کی مامی لے کر آئے گی عاشی کو۔ ابھی تو وہ سکول گئی ہوئی تھی۔''

''وہ ٹھیک تو ہے نا؟...... اُس کا بخار اُتر گیا تھا؟''

''جی بابا جان! بالکل ٹھیک ہے۔ اور آپ کے لئے نماز پڑھ کر روز دعا کرتی ہے۔''

عبدالرحمٰن شاہ کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ ہمدان کو بابا جان کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے چلے گئے تو عبدالرحمٰن شاہ نے پھر آنکھیں موند لیں عاشی انہیں بہت پیاری تھی۔ شاید یہ عاشی ہی تھی، جس کے لئے اللہ نے انہیں زندگی دے رکھی تھی۔ ورنہ انہوں نے اتنا لمبا جی کر کیا کرنا تھا۔

عاشی ...... اُن کی زارا کی نشانی۔

عمارہ تو بہت دعاؤں سے ملی تھی۔ چار بیٹوں کے بعد پہلی بیٹی۔ سو انہوں نے عمارہ کے بہت لاڈ اٹھائے تھے۔ لیکن زارا نے تو زبردستی اپنے حصے کی محبتیں وصول کی تھیں۔ وہ زبردستی ان کی گود میں بیٹھ جاتی۔ ضد کر کے اپنی بات منواتی۔ ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتی۔ رُوٹھ کر چلے جانے کی دھمکیاں دیتی۔

عمارہ کی شادی بیس سال کی عمر میں ہوئی تھی اور زارا کی شادی انہوں نے اُنیس سال کی عمر میں ہی کر دی تھی۔ حالانکہ مصطفٰی اور مرتضٰی نے مخالفت بھی کی تھی۔ لیکن رشتہ ہی اتنا اچھا تھا اور سیّد ارسلان شاہ سے اُن کی دوستی بھی اتنی گہری تھی کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ مجیب ہر لحاظ سے زارا کے قابل تھا۔ ایم بی بی ایس کر کے وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جا رہا تھا اور ارسلان شاہ اُنہیں اکیلے بھیجنا نہ چاہتے تھے۔ یوں زارا شادی کے بعد مجیب کے ساتھ امریکہ چلی گئی تھی اور ہر سال صرف پندرہ دنوں کے لئے وہ دونوں آتے تھے۔ یا کبھی کبھار مجیب، زارا کو چھوڑ جاتا تو وہ تین چار ماہ رہ کر چلی جاتی۔ یہ زارا ہی تو تھی جس نے عمارہ سے قطع تعلق کرنے پر واویلا مچایا تھا۔

وہ جب بھی آتی، سب سے جھگڑتی۔ ان کا دل تو خود عمارہ سے ملنے کو ہمکتا تھا۔ اور ماں تو خیر ماں تھی۔ اسے یاد کرتیں تو آنسو روکنا مشکل ہو جاتے۔

ایک احسان تھا اور ایک مائرہ تھی۔ اب انہیں خیال آ رہا تھا۔ جو ہر بار کسی نہ کسی بہانے زارا کی ہر کوشش پر پانی پھیر دیتے تھے۔ وہ ناراض ہوتی...... رُوٹھتی اور پھر چلی جاتی۔

اللہ نے شادی کے سولہ سال بعد اسے اولاد کی نعمت عطا کی۔ عاشی میں اُس کی جان تھی۔ عاشی کی خاطر ہی تو اس نے پاکستان سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن موت نے اسے مہلت ہی نہ دی۔ عاشی صرف دو سال کی تھی، وہ ڈاکٹروں کی غفلت کا شکار ہوگئی۔ معمولی پیٹ کے درد پر ڈاکٹر نے جو انجکشن لگایا، وہ موت کا باعث بن گیا۔ اس کے انتقال کے صرف ایک سال بعد مجیب نے اپنی ساتھی ڈاکٹر سے دوسری شادی کر لی۔ ڈاکٹر زویا کو عاشی کا وجود گوارا نہ ہوا۔ سو جب عبدالرحمٰن شاہ کو پتہ چلا تو وہ عاشی کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ مجیب نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ شرمندہ تھا کہ زویا، عاشی کو اپنے ساتھ رکھنے پر تیار نہیں۔ یوں زارا کو تو موت نے ان سے جدا کر دیا تھا، جبکہ عمارہ جیتے جی ان سے جدا ہوگئی تھی۔

کاش! وہ وقت پلٹنے پر قادر ہوتے تو شاید وہ حالات کو صحیح طریقے سے ہینڈل کر سکتے۔ لیکن تب...... تب تو اُنہیں سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اچانک کیسے اور کیوں ہوگیا۔

مومی تو الریان کے ہر فرد کے دل میں ہوتا تھا پھر یہ اچانک اتنی دُوریاں، اتنی طویل جدائیاں۔

وہ تو ہاسٹل جانے کے بعد بھی گویا ''الریان'' میں ہی رہتا تھا۔

انہوں نے کروٹ بدلتے ہوئے آنکھوں کے کونوں پر اٹکے ہوئے آنسو کو اُنگلی سے صاف کیا۔

مومی نے تو کبھی کسی بات پر غصہ نہیں کیا تھا مگر مرتضٰی کی شادی پر پہلی بار انہوں نے اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ اور پہلی بار انہوں نے سوچا تھا، عمارہ کا رشتہ مومی کو دے کر انہوں نے غلط تو نہیں کر دیا؟ ان کی عمارہ تو بڑی نازک دل ہے، وہ بھلا مومی کا اتنا غصہ برداشت کر پائے گی؟

وہ لوگ مرتضٰی کے سسرال سے واپس آ رہے تھے۔ چند بلاک چھوڑ کر ہی مرتضٰی کی سسرال تھی۔ لڑکیاں، مایوں کی رسم کرنے گئی تھیں۔ اگلے روز ہال میں مہندی کا فنکشن تھا۔ عمارہ اور زارا کی سہیلیاں، رشتہ دار لڑکیاں سب ہی پیدل جا رہی تھیں۔ ہنستی گاتی، ہنسی مذاق کرتی۔

مومی اور مصطفٰی ان کے ساتھ تھے۔ عبدالرحمٰن شاہ اور مراد شاہ پیچھے تھے کہ اچانک انہوں نے دیکھا، مومی نے ایک سفید کار کا دروازہ کھول کر کسی کو کھینچ کر باہر گھسیٹا تھا اور پھر مومی کے مکے، لاتیں، گھونسے اس پر پڑ رہے تھے۔ مراد شاہ دل پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔

''عبدالرحمٰن! اسے روکو۔ منع کرو۔ غصے میں اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔''

عبدالرحمٰن شاہ نے پیچھے سے جا کر اُنہیں اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا تھا مگر وہ......

''چھوڑ دیں مجھے بابا جان!...... زندہ نہیں چھوڑوں گا اس خبیث کو۔''

بہت مشکلوں سے انہوں نے قابو کیا تھا۔

یہ تو بعد میں مصطفٰی نے انہیں بتایا تھا کہ وہ نشے میں تھا اور گاڑی ساتھ ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ ایک دو بار اس نے کھڑکی کھول کر کوئی فقرہ بھی اُچھالا تھا۔ پھر جب ساری لڑکیاں، مرتضٰی کے سسرال والی گلی میں داخل ہو رہی تھیں تو اس نے گاڑی روک کر دروازہ کھولا اور عمارہ پر کوئی فقرہ اُچھالا جو پھر مومی بے قابو ہوگیا تھا۔

اس رات انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

''بیٹا! اپنے اندر صبر اور حوصلہ پیدا کرو۔ خدانخواستہ وہ بندہ مر مرا جاتا تو کیا کرتے ہم؟''

''جو بھی ہوتا بابا جان! لیکن میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی ہمارے گھر کی خواتین پر بری نظر ڈالے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو میں اسے مار ہی ڈالتا۔''

''اس شخص کی حرکت ہی ایسی تھی۔ کوئی بھی غیرت مند شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا۔'' عمارہ نے کہا تھا۔
مصطفیٰ، مرتضیٰ، عثمان، احسان سب ہی جوان خون تھے اور سب ہی کا خیال تھا کہ موی نے صحیح کیا۔ بلکہ مرتضیٰ نے تو اس کی پیٹھ بھی ٹھونکی تھی کہ صرف وہی جی دار ہے۔
اور پھر یہی غصہ ہمیشہ کے لئے جدائیاں دے گیا تھا۔
احسان نے اپنا گریجویشن مکمل کیا تو اس کے چند روز بعد موی نے بھی بی اے کی ڈگری لے لی تھی۔ تب ایک بار پھر وہ بے حد دُکھی ہوئے تھے۔
آج احسان کے ساتھ وہ بھی انجینئر بن کر یو ای ٹی سے فارغ ہوتا تو وہ دونوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیج دیتے۔
ان کا خیال تھا کہ پہلے وہ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرے گا، پھر وہ عمارہ کی شادی کا سوچیں گے۔ لیکن مراد شاہ نے ان سے شادی کی درخواست کر دی تھی۔
''چچا جان! ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے۔ ماسٹرز تو کر لے۔''
''ماسٹرز بھی کرتا رہے گا بیٹا! تمہاری چاچی دن رات بس ایک ہی راگ الاپتی ہے کہ اس کے سر پر سہرا سجا دیکھنا ہے۔ میں نے اپنی خواہش بیان کر دی۔ آگے تمہاری مرضی۔'' وہ متذبذب تھے۔
تب مروہ نے زور دیا تھا کہ انہیں فلک شاہ اور عمارہ کی شادی جلد از جلد کر دینا چاہئے۔ کیونکہ مروہ کے سسرال میں کچھ لوگ انٹرسٹڈ ہیں موی میں۔
کتنی عجیب بات تھی کہ انہوں نے کبھی مروہ سے اس کے متعلق وضاحت نہیں چاہی مگر اس کے اصرار پر انہوں نے عمارہ اور موی کا نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ البتہ رخصتی عمارہ کے ایگزام کے بعد ہی طے پائی تھی۔
''بابا جان!'' ہمدان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ماضی سے پلٹ آئے۔
''آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔''
انہوں نے کروٹ بدل کر ہمدان کی طرف دیکھا اور کہنیوں پر زور دیتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔
دوا کے بعد ہمدان نے اُنہیں لیٹنے میں مدد دی۔ وہ بہت دیر سے ان کا اضطراب اور بے چینی دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ آج پاپا سے ضرور پوچھے گا کہ آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ عمارہ پھپھو کے ساتھ سب نے تعلق ختم کر لیا۔
بہت عرصہ پہلے ماما نے اسے بتایا تھا کہ موی نے غصے میں قسم کھا لی تھی کہ وہ اور عمارہ آج کے بعد اس گھر میں قدم نہیں رکھیں گے۔ بس اتنی سی بات۔
لیکن بات اتنی سی تو ہرگز نہیں رہی ہوگی۔ جب وہ اپنے کالج کے ساتھ تعلیمی ٹرپ پر بہاول پور گیا تھا اور مما نے اسے عمارہ پھپھو سے ملنے کی تاکید کی تھی، تب وہ عمارہ پھپھو، ایبک اور موی انکل کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ البتہ مما پاپا سے بہت بار ان کا ذکر سنا تھا اور یہی پتہ چلا تھا کہ موی انکل سے ناراضی کی وجہ سے وہ لوگ اپنی پھپھو سے بھی نہیں مل پاتے اور وہاں پہلی بار وہ ایبک سے ملا تھا۔
ایبک فلک شاہ اس کا سگا پھوپھی زاد تھا...... وہ نوجوان شاعر، جس کی شاعری کی پہلی ہی کتاب نے دھومیں مچا دی تھیں اور تقریباً کالج کے ہر لڑکے اور ہر لڑکی کے پاس اُس کی کتاب تھی۔
شاعری کی کتاب کے فوراً بعد ہی اس کا افسانوی مجموعہ بھی آ گیا تھا اور اس کی سیل نے بھی ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ وہ خود بھی اس کے متاثرین میں سے تھا۔ اور یہ جان کر تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی کہ اس کا یہ کزن چند دنوں بعد لاہور پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے والا ہے۔
اور یہ عمارہ پھپھو کی خواہش تھی کہ وہ لاہور سے اپنی تعلیم مکمل کرے اور وہ بھی پنجاب یونیورسٹی سے۔
یوں ایبک سے اُس کی قربت بڑھی تھی۔ اگرچہ وہ خود لمز سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ جبکہ ایبک، ماس کمیونی کیشن میں

ماسٹرز کر رہا تھا۔

وہ اکثر اس کے ہاسٹل چلا جاتا تھا۔ بہت سا وقت اس کے ساتھ گزارتا۔ کئی بار وہ چھٹیوں میں بہاول پور بھی چلا جاتا تھا۔ وہاں عمارہ پھپھو کے علاوہ انجی بھی تھی۔ نرم و نازک، خاموش طبع۔ پتہ نہیں کب اس کے دل میں انجی کا خیال آیا تھا اور کب اس نے انجی کے لئے سوچنا شروع کیا تھا۔ اسے تو احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ تو زارا پھپھو تھیں، جنہوں نے اس کے دل کا چور پکڑا تھا۔ وہ ان دنوں بہاول پور میں تھیں اور وہ ایبک کے ساتھ دو دن کے لئے عمارہ پھپھو سے ملنے آیا تھا۔ عمارہ پھپھو ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں اور مومی انکل نے زارا کو بتایا تھا۔

''جب سے ہومی نے آنا شروع کیا ہے، عمارہ کے چہرے پر بھی سرخی نظر آنے لگی ہے۔ زارا! کچھ ایسا کرو کہ عمارہ کے سارے رُوٹھے رشتے ایک دن مراد پیلس میں زندگی کی لہریں دوڑا دیں۔'' اور اسی رات جب وہ زارا پھپھو کے ساتھ واپس لاہور آ رہا تھا، انہوں نے پوچھ لیا۔

''ہومی! تمہیں انجی پسند ہے نا؟''

اور اُس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ وہ زارا پھپھو کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ لیکن پھر...... وہ یکدم بے حد افسردہ ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، بابا جان سو گئے تھے۔

اور کتنی عجیب بات تھی کہ وہ دو سال لاہور میں رہا اور اس نے ایک بار بھی اسے الریان چلنے کو نہیں کہا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں تھا کہ بابا جان اسے پسند نہ کریں اور احسان چاچو تو مومی انکل کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ انجی کے ذکر پر جس طرح بابا جان اور احسان انکل نے ردِعمل ظاہر کیا تھا، اس کے بعد وہ ایبک کو ''الریان'' لانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن جب وہ اپنی تعلیم ختم کر کے واپس بہاول پور جا رہا تھا تو ماما نے بے حد افسردگی سے گلہ کیا تھا۔

''دو سال سے ایبک یہاں ہے۔ تم کسی روز اسے الریان ہی لے آتے۔ آخر یہ اس کے نانا کا گھر ہے۔ اور ایبک پر تو الریان کے دروازے بند نہیں ہیں۔''

اور تب وہ بھاگا بھاگا کرنل شیر دل کی انیکسی میں پہنچا تھا، جہاں ایبک اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ اور پھر ''الریان'' میں سب نے ہی اس کا بہت گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا تھا۔ سوائے رابیل احسان کے۔ مگر عمر احسان تو باقاعدہ اس سے لڑا تھا کہ اس نے اب تک ایبک کو ان سے چھپائے کیوں رکھا؟ اور منیبہ شاہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اس روز ''الریان'' میں موجود سب کچھ اس کے سامنے رکھ دے۔ بھری ہوئی ٹرالی بھی اسے کم لگ رہی تھی اور وہ بار بار اشارے کر کے حفصہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے حفصہ کو سمجھ میں آیا تھا کہ اس کا اشارہ اس گجریلے کی طرف ہے جو مائرہ چچی نے بنایا تھا اور اس کے اشاروں کے جواب میں حفصہ نے بلند آواز میں بتایا تھا کہ وہ تو صبح ناشتے پر ہی ختم ہو گیا تھا۔ اور منیبہ بس حفصہ کو گھور کر رہ گئی تھی۔

اس روز کا تصور کرتے ہی ہمدان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر جھک کر بابا جان کو دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے اور ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اُس کا جی چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔ کینٹین میں کاؤنٹر پر چائے کا کہہ کر وہ ایک خالی ٹیبل کی طرف بڑھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ کونے والی ٹیبل پر اریب فاطمہ کو بیٹھے دیکھ کر چونکا۔ وہ کونے والی ٹیبل پر تنہا بیٹھی تھی اور اس کے سامنے چائے کا کپ رکھا تھا لیکن وہ چائے نہیں پی رہی تھی۔

'کیا وہ بابا جان کی مزاج پرسی کو آئی ہے؟ لیکن پھر یہاں کیوں بیٹھی ہے؟' ہمدان نے سوچا اور اس کی طرف بڑھ گیا۔

''فاطمہ! آپ یہاں؟'' اریب فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''آج بھی آپ کالج سے یہاں آ گئیں۔ اور ادھر مونی نے پورے ''الریان'' کو ہلا کر رکھ دینا ہے کہ فاطمہ گم ہو گئی۔''

اریب فاطمہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

'نہیں۔ آج میں اُنہیں بتا کر آئی تھی۔ مجھے دراصل صبا سے ملنا تھا۔ اس نے کل گاؤں جانا ہے نا۔ اماں کی طرف سے ں نے کچھ چیزیں اور خط بھجوانا تھا۔"

"اوہ اچھا!" ہمدان دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"صبا کچھ مصروف تھی، اس لئے میں یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہوگئی ہوگی۔"

"میں نے منع بھی کیا تھا صبا کو لیکن وہ پھر بھی کہہ گئی چائے کا۔ مگر میرا بالکل جی نہیں چاہ رہا۔"

تب ہی کینٹین والے لڑکے نے ہمدان کی چائے لا کر رکھی۔ ہمدان نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔ گندمی رنگت اور بے حد خوب صورت آنکھوں والی یہ لڑکی جسے الریان میں آئے ہوئے بہت زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور جو ابھی الریان کے لڑکوں میں سے کسی سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں تھی بلکہ وہ تو لڑکیوں سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں ہوتی۔ یہ تو مونی تھی جو کھینچ کھینچ کر اسے سب کی محفلوں میں لاتی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدان مصطفیٰ نے اعتراف کیا کہ اس لڑکی میں بلا کی کشش اور معصومیت ہے۔ اسے لگا، جیسے وہ اس کی موجودگی میں کچھ گھبرا رہی ہے۔ اس لئے چائے پیتے ہی وہ فوراً کھڑا ہوگیا تھا۔

"او کے فاطمہ! میں چلتا ہوں۔ بابا جان کو سوتا چھوڑ کر آیا تھا۔ کہیں جاگ نہ گئے ہوں۔ آپ اپنی صبا کا انتظار کریں۔"

اور اریب فاطمہ نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ یہ نہیں کہ ہمدان مصطفیٰ سے آج سے پہلے اس کی کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، لیکن یوں اکیلے بیٹھنا نہ صرف یہ کہ اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا بلکہ اسے خوف بھی آ رہا تھا کہ کہیں کوئی یوں اسے ہمدان مصطفیٰ کے ساتھ اکیلے بیٹھے نہ دیکھ لے۔ کہیں ابا یا بھائی ادھر نہ آنکلیں۔

حالانکہ ابا اور بھائی تو رحیم یار خان سے بھی آگے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ جتنا عرصہ وہ مردہ مامی کے گھر رہی تھی، ابا صرف ایک یا دو بار اس سے ملنے آئے تھے اور دونوں بڑے بھائی تو ایک بار بھی نہیں۔

مردہ مامی نے اسے بیٹی بنا رکھا تھا اور یہ تب کی بات تھی، جب وہ صرف نو یا دس سال کی تھی اور گاؤں کے پرائمری سکول میں چوتھی جماعت کی طالبہ تھی۔ جبکہ اسفند یار اور عظمت یار نے جو دونوں اس سے بڑے تھے، صرف آٹھ آٹھ جماعتیں پڑھی تھیں اور ابا کے ساتھ زمینداری سنبھالتے تھے۔ ابا کی خاصی بڑی زمین تھی۔ گھر میں روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ بڑی سی حویلی، مال، ڈنگر سب کچھ تھا۔ لیکن ابا اور بھائیوں کے دل بہت چھوٹے تھے کہ وہ اس پر روپیہ خرچ کرنا غیر ضروری سمجھتے تھے۔ تعلیم یوں تو مفت تھی لیکن کسی کاپی، کتاب، قلم، دوات پر معمولی رقم خرچ کرنا بھی اُنہیں گراں گزرتا تھا۔

دو روپے کی پنسل خریدنے پر بھی ابا گھنٹوں بڑبڑاتے رہتے اور اماں کو پیسے کی افادیت پر لیکچر دیتے ہوئے لڑکیوں کی تعلیم کو غیر ضروری قرار دیتے۔ پھر اماں دوپٹے کے پلو سے بندھے دو میلے کچیلے نوٹ چپکے سے کھول کر اسے پکڑا دیتی تھیں۔ وہ تو نوٹ لے کر بھاگ جاتی تھی اور اماں کو ان دو چار روپوں کا حساب دینا پڑتا تھا، جو نہ جانے کن دقتوں سے انہوں نے ایسے ہی کسی موقع کے لئے سنبھال رکھے تھے۔ ایک بار اس نے سنا، ابا پوچھ رہے تھے۔

"ہاں، تو یہ چار روپے کہاں سے آئے؟...... میرے کرتے سے تو نہیں نکالے تھے؟...... دودھ کے حساب میں تو ڈنڈی نہیں ماری؟...... اچھا، چینی منگوائی تھی، اس میں سے بچے تھے۔ تو پھر مجھے کیوں نہیں دیئے واپس؟"

اور وہ دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے یوں ہی ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔ نو سال کی عمر میں بھی اسے ابا کا اس طرح اماں سے پوچھ گچھ کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ اور شاید اس روز اماں نے بھی اسے باہر کھڑا دیکھ کر ہر روز سے زیادہ اپنی تذلیل محسوس کی تھی۔ اس روز کے بعد اس نے اماں کو فارغ وقت میں بستر کی چادروں اور تکیوں پر کڑھائی کرتے دیکھا تھا۔ اماں ابا، عظمت اور اسفند کے گھر آنے تک مدھم روشنی میں کڑھائی کرتی رہتی تھیں۔ بیٹھک کے سوا باقی سب کمروں میں

بہت مدھم روشنی کے بلب تھے۔ کیونکہ ابا کو بجلی کا بل دیتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ جب ان کے گاؤں میں بجلی آئی تھی تو وہ چند ماہ کی تھی۔ اماں نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ ابا نے سب سے آخر میں بجلی کا کنکشن لیا تھا۔
اسے بھی کھل کر استعمال کرنے کی جازت نہیں تھی کہ بل آئے گا۔
اماں کے ہاتھ میں بہت صفائی تھی۔ ان کے پاس اکثر گھروں سے کام آنے لگا تھا۔ اماں سب سے کہتی تھیں۔ کڑھا میرا شوق ہے۔ فارغ بیٹھا نہیں جاتا۔
ابا کا بھرم بھی تو رکھنا تھا۔
یوں اماں کے ہاتھ میں چار پیسے آنے لگے تو اماں کو ابا سے پیسے مانگنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ اب تو اماں اسے اور شہریار کو کبھی کبھی دو روپے بریک میں خرچ کرنے کے لئے بھی دے دیتی تھیں۔ دو روپے مٹھی میں دابے وہ سکول کینٹین کی طرف جاتے ہوئے خود کو کوئی ملکہ یا شہزادی سمجھتی تھی۔
گاؤں میں لڑکیوں کا سکول صرف پرائمری تک تھا۔
''تجھے پڑھنے کا شوق ہے ریبا؟'' ایک بار اماں نے پوچھا تو اُس نے سر ہلا دیا تھا۔
''ہاں اماں! بہت زیادہ۔ میں بہت زیادہ پڑھنا چاہتی ہوں۔''
تب اماں کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔
''میں تمہیں ضرور پڑھاؤں گی۔''
پھر اس نے اماں کو اکثر سوچ میں ڈوبے دیکھا تھا۔ پتہ نہیں، اماں کیا سوچتی تھیں۔
وہ چھٹیوں میں اماں کے ساتھ کبھی کبھار رحیم یار خان آتی تھی، چند دنوں کے لئے۔ پھر ابا اُنہیں واپس بلا لیتے۔ حالانکہ اس کا دل نانو کے گھر میں بہت لگتا تھا۔ نانو گھر میں اکیلی ہوتی تھیں۔ ان کا گھر اتنا بڑا بھی نہیں تھا۔ لیکن وہاں زندگی کی ہر سہولت تھی۔ نانو ان کے لئے مزے مزے کے کھانے پکاتی تھیں۔ اماں بھی نانو کے ساتھ کچن میں گھسی رہتی تھیں اور وہ سوچتی تھی، یہاں تو اماں بریانی، فرائیڈ رائس اور چکن روسٹ بناتی ہیں اور وہاں صرف پتلے شوربے والا آلو گوشت یا کوئی بھی سبزی ڈال لیتی تھیں۔
شہریار نے ایک بار اسے بتایا تھا۔ ڈیرے پر ابا، عظمت بھائی اور اسفند شہر سے کڑاہی گوشت اور تکے منگواتے ہیں۔
ان دنوں بھی وہ، شہریار اور اماں رحیم یار خان آئے ہوئے تھے۔ نانو بہت بیمار تھیں اور ابا نے ازراہ مہربانی اماں کو اُن کی صحت یابی تک وہاں ٹھہرنے کی اجازت دی تھی۔ سکول میں چھٹیاں تھیں اور وہ سوچتی تھی، کاش! یہ ساری گرمیاں یہاں ان ٹھنڈے کمروں میں سوتے گزریں۔
شہریار کہتا تھا۔ ''میں واپس جا کر ابا سے کہوں گا کہ وہ بھی بڑے کمرے میں اے سی لگوا لیں۔''
اور اُسے ہنسی آ جاتی تھی۔ لیکن شہریار کو یقین تھا کہ ابا اُس کی بات مان لیں گے۔ کیونکہ وہ اسفند سے کہے گا اور ابا، اسفند کی بات نہیں ٹالتے تھے۔
اور اگر ابا اس کی بات مان بھی لیتے، اے سی لگ بھی جاتا تو کیا ابا، اے سی استعمال بھی کرنے دیتے؟ ہر کمرے میں پنکھا ہونے کے باوجود پوری گرمیاں ہاتھ کا پنکھا جھلتے جھلتے ان کے ہاتھ تھک جاتے تھے۔
اس نے یہ سوچا تو ضرور تھا لیکن شہریار سے نہیں کہا تھا۔ شہریار جو ابھی صرف چھ سال کا تھا، وہ اس کے چہرے پر مایوسی کے رنگ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی اُمید کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ وہ ابا کو اتنا نہیں جان سکا تھا، جتنا اس نے دس سال کی عمر میں جان لیا تھا۔
نانو کے گھر میں ہی پہلی بار وہ مردہ سے ملی تھی۔ وہ نانو کی بیماری کا سن کر آئی تھیں اور انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں۔

''اللہ......زینب! یہ تمہاری بیٹی ہے؟ بالکل تمہارے جیسی ہے۔ مجھے یاد ہے، جب میں بیاہ کر رحیم یار خان آئی تھی تو
اتنی ہی تھیں۔ اپنی اماں کے ساتھ تم مجھے دیکھنے آئی تھیں اور کیسے پٹ پٹ آنکھیں جھپکاتے ہوئے فرفر انگریزی بول
رہی تھیں۔ میں تو تمہارے ایکسنٹ پر حیران تھی۔ تم اتنی سی عمر میں کتنی پُراعتماد تھیں۔ کتنے کونفیڈنس سے تم نے مجھ سے
باتیں کی تھیں۔ مگر تمہاری بیٹی...... یہ تو بڑی جھینپوسی لگ رہی ہے۔''
اور وہ جو اماں کے پیچھے چھپی ہوئی چپکے چپکے اُنہیں دیکھ رہی تھی، اور بھی شرما گئی تھی۔ انہوں نے اسے اماں کے پیچھے
سے کھینچ کر اپنی بانہوں میں بھر کر بہت سا پیار کیا تھا اور وہ لال چقندر ہو گئی تھی۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔
''سنو! تمہیں پتہ ہے، میرے تین بیٹے ہیں۔ بیٹی کوئی نہیں۔ تمہاری بیٹی کو دیکھ کر دل میں بیٹی کی حسرت پھر سے
جاگ اُٹھی ہے۔''
''تو بھابی جان! اسے آپ ہی لے لیں۔''
اماں کی بات سن کر وہ حیران سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ اماں کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ تو کیا اماں سچ مچ اسے دے
دیں گی؟......اس نے سوچا مگر پھر خود ہی جواب دے دیا تھا۔
'نہیں، اماں مذاق کر رہی ہوں گی۔'
پھر وہ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر شہریار کو دیکھنے چھت پر چلی گئی تھی۔ پھر پتہ نہیں، ان دونوں میں کیا عہد و پیمان
ہوئے تھے، اسے کچھ علم نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ رات کو جب وہ اماں کے پاس لیٹی ہوئی منتظر تھی کہ اماں کہانی سنائیں تو اسے
خادم مروہ پھپھو کی بات یاد آئی۔ اس نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔
''اماں! آپ جب چھوٹی تھیں تو انگریزی بولتی تھیں۔ مروہ مامی کہہ رہی تھیں نا۔ فرفر انگریزی بولتی تھیں۔ اماں! کیا
آپ لندن سے آئی تھیں؟''
اماں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا مگر ان کی آنکھیں جھلملا گئی تھی۔ اکثر اُس کے کسی سوال پر اماں کی آنکھیں
یوں ہی جھلملا جاتی تھیں اور اس کا سوال ان جھلملاہٹوں میں کہیں گم ہو جاتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اماں اس کے
بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں کھو گئی تھیں۔ تب نانو نے جو آنکھیں موندے لیٹی تھیں، آنکھیں کھول کر
انہیں دیکھا تھا۔
''زینب! یہ تُو نے مروہ سے کیا کہا اور کیوں؟ ...... میں ہوں نا ادھر۔ تو اریب کو اپنے پاس رکھوں گی۔ یہ پانچویں
پاس کر لے نا، میں خود اسے لے آؤں گی۔ تُو کیوں فکر کرتی ہے؟ یہ ضرور پڑھے گی، جتنا پڑھنا ہے۔''
''ہاں اماں! میں نے اسفند کے ابا سے بات کر لی تھی کہ اسے میں پانچویں کے بعد رحیم یار خان بھیج دوں گی، اماں
کے پاس۔''
اور اُس کا دل جیسے بلّیوں اُچھلنے لگا تھا۔ وہ یہاں رہے گی، نانو کے پاس۔ اس کے کتنے مزے ہوں گے۔ اس نے
چاہا، وہ شہری کو بتائے لیکن شہری، اماں کے دائیں طرف لیٹا آنکھیں بند کیے گہری نیند سو رہا تھا۔
'میں نے تو کتنا کہا تھا تجھ سے، اسفی اور عظمت کو میرے پاس بھجوا دے۔ یہاں رہ کر پڑھ لیں گے۔''
''اماں! ان کا رجحان ہی نہیں تھا پڑھنے کا۔ اسفی کے وقت تو خیر سکول ہی مڈل تک تھا، لیکن عظمت کے وقت تو ہائی ہو
گیا تھا۔ وہ دونوں تو بالکل اپنے باپ پر گئے ہیں۔''
''ہاں!'' نانو نے بھی گہری سانس لی تھی۔ ''وہی اُٹھان، وہی قد بت، وہی سوچ فکر۔''
نانو اور اماں باتیں کرنے لگی تھیں۔ وہ کہانی سننے کی اُمید چھوڑ کر اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اُس روز خواب میں بھی وہ
خود کو نانو کے گھر دیکھتی رہی تھی۔ نانو کے پاس رہنے کے خیال سے وہ بہت خوش تھی اور اس نے دعا مانگی تھی۔ یا اللہ! وہ
جلدی جلدی پانچویں پاس کر لے۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس بار وہ نانو کے گھر آخری بار آئی ہے۔ اور آخری بار اپنی نانو

کو دیکھ رہی ہے۔ آج کے بعد وہ نانو کے ہاتھ کے پکے مزے دار کھانے کبھی نہیں کھا سکے گی اور کبھی چھٹیوں میں آ کر اور شہری ٹھنڈے کمرے میں سخت گرمی میں اے سی لگائے ٹھنڈک کے مزے نہیں لوٹ سکیں گے۔

لیکن اماں شاید جانتی تھیں۔ شاید ڈاکٹر نے اماں سے کچھ کہا تھا، اس لئے تو انہوں نے مروہ مامی سے بات کر لی تھی صرف تین دن بعد جب اسفند انہیں لینے آیا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''ابا کہہ رہے ہیں بہت رہ لیا۔ اب گھر چلیں۔ رحیم دودھ دوہتے ہوئے چالاکیاں کرتا ہے۔ ماسی زیناں لسی بلوتے ہوئے آدھا مکھن چٹ کر جاتی ہے۔ وہ ہر وقت گھر پر رہ کر نگرانی نہیں کر سکتے۔''

''ذرا صبر کر لے اسفی! اماں جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''مجھے تو ٹھیک ہی لگتی ہے۔'' اسفند جز بز ہو رہا تھا۔

''اچھا ایک دن رک جا۔ میں نے مروہ کو بلایا ہے، وہ کچھ دن اماں کے پاس رہ لے گی۔''

اس نے کبھی مروہ کو نہیں دیکھا تھا۔

اسفند کو رحیم یار خان رہنا کبھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ مجبوراً رک گیا تھا۔ اسی رات نانو کا انتقال ہو گیا تھا۔ اماں بہت روئی تھیں۔ گھر آ کر بھی اماں کے آنسو مہینوں نہیں تھمے تھے۔ اماں روتیں تو وہ بھی ان کے پاس بیٹھ کر رونے لگتی تھی۔ ہولے ہولے اماں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اماں کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ نہ کوئی بہن، نہ بھائی۔

ابا، اسفند اور عظمت جا کر نانو کے گھر سے سارا سامان لے آئے تھے اور گھر کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ فریج، ٹی وی، اے سی سب۔ فریج صرف گرمیوں میں استعمال کیا جاتا تھا اور وہ بھی صرف رات کو۔ صبح اٹھتے ہی ابا سب سے پہلے سوئچ آف کرتے تھے۔ سردیوں میں فریج کپڑے رکھنے کے کام آتا تھا۔ ٹی وی بیٹھک میں رکھ دیا گیا تھا۔ ڈیرے سے آ کر رات بارہ بجے تک اسفند اور عظمت ٹی وی دیکھتے تھے۔ کبھی کبھی ابا بھی دیکھ لیتے تھے۔

وہ جب پانچویں کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تو بہت اُداس تھی۔ اب نانو نہیں تھیں اور اسے یہاں رہنا تھا۔ اسی گھر میں۔ وہ اماں کو بھری دوپہروں میں گرمی میں باہر برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھے کڑھائی کرتے دیکھتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اماں منتظر نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتی تھیں، جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو اور ایسے ہی اُداس دنوں میں ایک روز مروہ مامی آ گئیں۔ ہنستی مسکراتی۔

اماں کے چہرے پر جو اتنے دنوں سے اضطراب چھایا ہوا تھا اور ایک انتظار کی سی کیفیت آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی، یکدم ختم ہو گئی تھی۔ تو کیا اماں کو مروہ مامی کا انتظار تھا؟ اس نے سوچا تھا۔

اور پھر جتنے دن مروہ مامی وہاں رہی تھیں، اسفند، عظمت اور ابا ڈیرے سے جلد ہی گھر آ جاتے تھے اور پھر بیٹھک سے اسفند اور عظمت کی ہنسی اور ابا کے قہقہوں کی آوازیں سن کر اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

مروہ مامی کی شخصیت میں جانے کیا سحر تھا کہ ان دنوں ابا نے بھی اپنی جیب ڈھیلی کر دی تھی اور گھر میں فروٹ، چکن اور دوسری اشیاء سب فراوانی سے آ رہی تھیں۔

''آپ کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے بھابی!'' بریانی کھاتے ہوئے اس روز ابا نے تعریف کی تھی۔

''زینب کے ہاتھ میں مجھ سے زیادہ ذائقہ ہے بھائی جان! اور بریانی پکانا تو میں نے زینب کی اماں جان سے ہی سیکھی ہے۔ لیکن آپ نے کبھی آزمایا ہی نہیں۔''

اور ابا صرف کھانس کر رہ گئے تھے۔ اس روز اماں نے اسے بتایا تھا کہ کل صبح اُسے مروہ کے ساتھ جانا ہے اور وہیں رہ کر پڑھنا ہے۔ وہ اُداس ہو گئی تھی۔

''نہیں۔ میں آپ کو اور شہری کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہیں رہنا ہے آپ کے پاس۔ مجھے نہیں پڑھنا۔''

''رابو! یہ میری خواہش ہے کہ تم پڑھو۔ بہت سارا۔ میری تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ لیکن تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔'' ان کی

لا انھیں جھلملا رہی تھیں۔
اور وہ ہمیشہ کی طرح اماں کی آنکھوں کی جھلملاہٹوں میں ڈوب کر ہار گئی تھی۔ اس روز پہلی بار اس نے اماں سے پوچھا
لما، انھوں نے کتنا پڑھا ہے؟
''جتنا نصیب تھا، پڑھ لیا۔''
پتہ نہیں، مروہ مامی اور ابا میں کیا باتیں ہوئیں لیکن اتنا ہوا کہ مروہ مامی کے ساتھ رحیم یار خان آ گئی تھی۔ مروہ مامی کے
گھر میں ملازمین کے علاوہ صرف وہی تھی۔ ان کے شوہر، ان کی ساس اور ان کے دو بڑے بیٹے ملک سے باہر تھے۔ ایک
کی شادی ہو چکی تھی اور دوسرے نے ابھی دو سال پہلے اپنی تعلیم مکمل کر کے جاب شروع کی تھی۔ جبکہ تیسرا لاہور میں پڑھ
رہا تھا کسی کالج یا یونیورسٹی میں۔
شروع کے کچھ ہفتے وہ بے حد اُداس رہی تھی۔ لیکن پھر مروہ مامی اور اماں جان کی محبت سے وہ بہل گئی تھی۔ انکل بھی
اس کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ اکثر اس کے لئے کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے لے آتے تھے۔ کبھی برگر، کبھی چاکلیٹ، کبھی
آئس کریم۔ یہاں وہ بہت خوش تھی۔ وہ چھٹیاں ہونے سے ایک دن پہلے ہی سامان باندھ کر گاؤں جانے کو تیار ہو جاتی
تھی۔ کبھی انکل اسے چھوڑ آتے اور کبھی اسفند اور عظمت میں سے کوئی اسے لینے آ جاتا تھا۔ یوں اسی آنے جانے میں اتنے
سال بیت گئے اور وہ بی اے میں آ گئی۔ پھر اسے یہاں ''الریان'' میں آنا پڑا تھا۔ لیکن مروہ پھپھو جاتے ہوئے اس کو کافی
سارے پیسے دے گئی تھیں کہ اگر کبھی وہاں سے بھجوانے میں دیر سویر ہو جائے اور اسے ضرورت ہو تو وہ خرچ کر سکے۔ وہاں
جا کر بھی انہوں نے ان چھ ماہ میں دو تین بار اس کے اکاؤنٹ میں رقم بھیجی تھی۔
اس کے اخراجات ہی کیا تھے۔ کھانا پینا سب الریان میں تھا۔ حتیٰ کہ منیبہ اور حفصہ سردیوں کی شاپنگ کرنے گئیں تو
اس کے لئے بھی سوٹ، جرسی اور شال لے آئی تھیں۔ سب ہی بہت مخلص اور محبت کرنے والے تھے۔ بالکل مروہ مامی
کی طرح۔
اس نے اماں کے لئے گرم سوٹ اور شال خریدی تھی اور شہری کے لئے بھی کافی چیزیں لی تھیں۔ شہری اب میٹرک
میں تھا۔ اسے شہری سے بہت پیار تھا جبکہ عظمت یار اور اسفند یار سے وہ بہت ڈرتی تھی۔
صبا کے یوں اچانک ملنے پر وہ بہت خوش تھی۔ پتہ نہیں، صبا کہاں رہ گئی تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو صبا کو آتے
دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور سب چیزیں صبا کے حوالے کر کے فوراً ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''اوکے صبا! میں اب چلتی ہوں...... اور سنو! اماں سے کہنا، میں کسی ویک اینڈ پر آؤں گی تمہارے ساتھ ان سے ملنے۔''
ہسپتال کے گیٹ سے نکلتے ہوئے اسے مائرہ آنٹی اور رابیل مل گئیں۔
''فاطمہ!'' مائرہ آنٹی نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ رک گئی تھی۔
''السلام علیکم آنٹی!'' اس نے انہیں سلام کیا۔
''ارے تم نے بابا جان کو دیکھنے آنا تھا تو گھر سے ہمارے ساتھ آ جاتیں۔ کالج سے اکیلی کیوں چلی آئیں؟'' مائرہ اس
کے دائیں کندھے پر لٹکے اس کے کالج بیگ کو دیکھ رہی تھی۔
''یہ رحیم یار خان نہیں ہے، لاہور ہے۔ اور ابھی تمہیں لاہور کے راستوں کا بھی ٹھیک سے پتہ نہیں۔ کہیں خدانخواستہ
کچھ ہو جاتا تو ہم مروہ کو کیا جواب دیتے؟''
''نہیں...... وہ میں بابا جان سے کل بھی ملی تھی۔ آج تو میں صبا کے پاس آئی تھی۔'' وہ گھبرا گئی تھی۔ ''صبا ہمارے
گاؤں کی ہے۔ بالکل ہمارے گھر کے ساتھ اس کا گھر ہے وہاں۔ یہاں ملازمت کرتی ہے۔''
اس نے وضاحت کی تو مائرہ نے بے حد معنی خیز نظروں سے رابیل کی طرف دیکھا جو ناگواری سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی
تھی۔ اسے یوں مائرہ کا گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر اریب فاطمہ سے باتیں کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"لو! ہم خوامخواہ ہی اس کے لئے فکرمند رہتے تھے کہ لاہور کے راستے اس کے لئے نئے ہیں لیکن یہ تو......"

"یہاں سے میرا کالج نزدیک ہے۔ دو بار میں عمر کے ساتھ کالج سے یہاں آئی تو مجھے عمر نے بتا دیا تھا کہ کون سے نمبر کی وین یہاں آتی ہے اور یہاں سے کون سے نمبر کی ماڈل ٹاؤن جاتی ہے۔"

گھبرا کر وہ مزید وضاحت کرنے لگی تھی۔

"اور میں نے مونی کو بھی بتا دیا تھا کہ میں کالج کے بعد کچھ دیر کے لئے صبا کی طرف جاؤں گی۔"

تب رابیل احسان نے نخوت سے کہا تھا۔

"ماما! اب چلیں بھی۔ مجھے بابا جان سے مل کر پھر ایک دوست کی طرف بھی جانا ہے۔"

"اب تم گھر جاؤ گی یا......" مائرہ کی انکوائری جاری تھی۔

"جی......" اس نے جلدی سے کہا تھا۔ "گھر ہی جانا ہے مجھے۔"

پھر رابیل کو اندر کی طرف بڑھتے دیکھ کر مائرہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی تو ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اریب فاطمہ نے گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔ الریان میں مائرہ آنٹی وہ واحد ہستی تھیں، جن سے اس کی دُور پار کی رشتہ داری بھی بنتی تھی۔ لیکن مائرہ ہی وہ واحد ہستی بھی تھی، جسے اریب فاطمہ کا "الریان" میں رہنا پسند نہیں آیا تھا۔

مائرہ اُس کی ماں کی رشتے کی خالہ زاد بہن لگتی تھی اور شادی سے پہلے اماں اور ان کی بہت دوستی تھی۔

اماں نے ایک بار بتایا تھا، اماں کو اس بات سے بڑی تسلی تھی کہ مائرہ وہاں ہے، کوئی مسئلہ ہوا تو اسے بتانا۔ اور اریب فاطمہ نے پہلے ہی دن جان لیا تھا کہ وہ اپنا مسئلہ "الریان" کے ہر فرد سے ڈسکس کر سکتی تھی لیکن مائرہ سے نہیں۔ لیکن یہ بات اس نے اماں سے نہیں کہی تھی۔ وہ تو اس بات پر مطمئن تھیں کہ مروہ نہیں ہے تو مائرہ ہے نا وہاں۔ اور وہ کوئی غیر تو نہیں۔ اس کا خیال رکھے گی۔

اور تب شہریار بہت ہنسا تھا۔

"ارے اماں! اتنے دُور کی رشتہ داری۔ یہاں سگے چچا اور پھپھو نے کبھی حال احوال نہیں پوچھا تو وہ کیا آپی کا خیال رکھیں گی؟"

"کیوں، کیا مروہ خیال نہیں رکھتی؟"

"مروہ مامی کی تو بات ہی اور ہے۔"

"مائرہ بھی تو مروہ کے خاندان میں گئی ہے۔ اُس کی خُو بُو ہو گی اس میں۔ اور رہے تمہارے چچا اور پھوپھی تو وہ تو تمہارا سارا ددھیال ہی بے مہرا ہے۔"

"تو آپ کو بے مہر اور خودغرض خاندان میں شادی ہی نہیں کرنا تھی۔"

"تو کیا شادی میری مرضی سے ہونا تھی؟ جھلّا نہ ہو تو۔ جہاں اماں نے کر دی، کر لی۔"

اماں کو بھی شہریار سے بہت پیار تھا، اسفند اور عظمت کی نسبت۔ ایک تو وہ سب سے چھوٹا تھا اور دوسرا پڑھائی میں بہت تیز۔

"لیکن اماں! آپ کو احتجاج تو کرنا چاہئے تھا نا۔" وہ یونہی شرارت کر رہا تھا لیکن اماں کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں اور ان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے تھے۔ اس روز اتنے سالوں میں اس نے پہلی بار سوچا تھا کہ اماں کا ابا کے ساتھ واقعی کوئی میچ نہ تھا۔ پھر یہ شادی کیسے ہوئی تھی بھلا؟ وہی سیّد گھرانوں کا مسئلہ ہو گا۔ اس نے خود ہی تصور کر لیا تھا۔ ابا شکل و صورت اور پیسے کے لحاظ سے تو اچھے بھلے تھے۔ بس مزاج کے رنگ مختلف تھے۔ ابا کے تیز، شوخ، چیختے چلاتے، آنکھوں میں چبھتے ہوئے۔ اور اماں کے نرم، ہلکے، دھیمے، دل میں ٹھنڈک پہنچانے والے۔

وہ اماں اور شہریار کے متعلق سوچتے ہوئے گیٹ سے نکل گئی تھی۔ مائرہ نے ایک نظر مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ جا چکی تھی۔

تیز تیز چلتے ہوئے وہ رابیل کے قریب آگئی۔
''تمھیں کیا جلدی تھی رابی! دومنٹ رُک جاتیں۔''
''کیوں، کیا آپ کی انکوائری مکمل نہیں ہوئی؟ جو باتیں رہ گئی ہیں، وہ گھر جا کر پوچھ لیجئے گا۔''
''توبہ ہے رابی! تم بھی نا..... میں تو حیران ہو رہی ہوں۔ شکل سے کیسی بے وقوف لگتی ہے اور تن تنہا ہاسپٹل چلی آئی۔''
''بے وقوف تو خیر وہ بالکل نہیں مما! اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار ہے۔''
عین اسی وقت رابیل نے کمرہ نمبر 9 کا دروازہ ہلکا سا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی ہمدان صوفے پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مائرہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔
''تم یہاں ہو مومی؟''
''ہاں جی..... آپ بیٹھیں۔ بابا جان تو سو رہے ہیں۔''
''لیکن احسان تو کہہ رہے تھے، تمھیں آج آفس بھیج کر وہ یا مصطفیٰ بھائی رہیں گے ہسپتال۔'' مائرہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ جبکہ رابیل ابھی تک کھڑی تھی۔
''جی۔ لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔ میں نے پہلے ہی چھٹی لے رکھی تھی۔''
''اچھا..... اور بابا جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟''
مائرہ اب ان کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کے ذہن میں مسلسل اریب فاطمہ کا خیال آ رہا تھا۔ یہ لڑکی جتنی معصوم دکھتی ہے، اتنی ہے نہیں۔ گھنّی ہے، مروہ پھپھو کی طرح۔ آخر انہی کی تربیت ہے نا۔ یکایک اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا تھا۔
''اریب فاطمہ ملی تھی گیٹ پر۔ بابا جان سے ملنے آئی ہو گی۔''
''نہیں تو۔ وہ یہاں اپنے گاؤں کی ایک لڑکی سے ملنے آئی تھی۔''
''تو تمھیں کیسے پتہ چلا، جب وہ بابا جان کو دیکھنے آئی ہی نہیں؟''
''اوہ مما!'' رابیل بے زار ہوئی۔ ''اتنی انکوائری تو آپ نے اس سے کر لی تھی۔ اب ہمدان سے پوچھنا ضروری ہے کیا؟''
ہمدان نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔
''نہیں۔ میں کینٹین چائے پینے گیا تھا۔ وہاں ملی تھی۔'' ہمدان سادگی سے کہہ کر بابا جان کی طرف متوجہ ہو گیا جو غالباً ان کی آوازیں سن کر جاگ گئے تھے اور اب آنکھیں کھولے مائرہ کی طرف دیکھ رہے تھے؛ جو بابا جان کا حال پوچھنے کے بجائے یہ سوچ رہی تھی کہ اریب فاطمہ یقیناً ہمدان سے ملنے آئی تھی۔
کمال ہے، انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ گھر میں کب سے یہ چکر چل رہا ہے۔ رابیل اور ہمدان کے لئے تو بہت پہلے سے انھوں نے سوچ رکھا تھا۔ اب یہ لڑکی کہیں اسے پھانس ہی نہ لے۔
''ارے رابیل بیٹا! بیٹھ جاؤ۔ کھڑی کیوں ہو؟'' بابا جان نے مائرہ کو گم صم دیکھ کر رابیل کو خود ہی مخاطب کیا تھا جو پیشانی پر بل ڈالے مائرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بابا جان کے بلانے پر وہ نادم سی ہو کر ان کا حال احوال پوچھنے لگی تھی۔
''السلام علیکم بابا جان! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''
''اللہ کا شکر ہے۔ بہت بہتر ہوں۔ یہ تمہارے پاپا اور تایا جان جو ہیں نا، یہ ابھی مجھے بیمار بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔'' انھوں نے ہمدان کے سہارے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا اور تب ہی دروازہ کھلا تھا۔
ہمدان نے اور انہوں نے ایک ساتھ ہی دروازے کی طرف دیکھا تھا۔
کھلے دروازے میں ایبک اور اس کے ساتھ عمارہ کھڑی تھیں۔

''پھپھو جان!'' ہمدان کے منہ سے نکلا۔
اور عبدالرحمٰن شاہ بے اختیار بانہیں پھیلاتے بیڈ سے اُترے اور لڑکھڑا گئے۔ ہمدان نے انہیں سہارا دیا۔
''میری عمو......''
اور اس سے پہلے کہ عمارہ جو دروازے پر ایبک کا ہاتھ تھامے ساکت کھڑی تھیں، بھاگ کر ان کے بازوؤں میں سماتیں، وہ بھربھری مٹی کے ڈھیر کی طرح ہمدان کے بازوؤں میں ڈھیتے چلے گئے۔
انہیں بیڈ پر لٹا کر ہمدان پاگلوں کی طرح ان کی نبض ٹٹولنے لگا تھا اور پھر ان کے تیزی سے ٹھنڈے ہوتے جسم نے اسے ایسا حواس باختہ کیا کہ وہ ان کی کلائی چھوڑ کر ان کے سینے پر سر رکھ کر چیخ چیخ کر رونے لگا۔ تب دروازے میں ساکت کھڑے ایبک کے جسم میں جنبش ہوئی تھی اور وہ عمارہ کا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے ان کی طرف لپکا اور ہمدان کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اس نے پہلے ان کی کلائی پر نبض ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر لحہ بہ لحہ پھیلتی مایوسی نے ہمدان کو اندر تک ہلا دیا۔ وہ تیزی سے عمارہ کو ایک ہاتھ سے پیچھے ہٹاتا ڈاکٹر کو بلانے باہر لپکا۔
جبکہ گہری مایوسی تلے ڈوبے دل کو بمشکل سنبھالتے ہوئے ایبک انہیں مصنوعی سانس دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

❁○❁

فلک شاہ نے اپنی وہیل چیئر کھڑکی کے قریب کر کے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ یک دم ہی کمرے میں خنکی کی لہر سی آئی اور ٹھنڈی ہوا ان کے چہرے سے ٹکرائی۔ لیکن یہ خنکی اور ٹھنڈک انہیں بری نہیں لگ رہی تھی۔ انہوں نے کھڑکی کے سامنے نظر آتے آسمان کو دیکھا۔ آسمان بالکل شفاف تھا اور ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ سیاہ آسمان پر جگمگاتے ستارے دیکھتے رہے۔ یہ منظر انہیں بہت حسین اور خوب صورت لگ رہا تھا۔
سینکڑوں بار انہوں نے اس کھڑکی سے آسمان پر جگمگاتے تاروں اور چاند کو دیکھا تھا۔ لیکن آج آسمان پر یہ جگمگ جگمگ تارے جتنے اچھے لگ رہے تھے، اس سے قبل اتنے اچھے کبھی نہیں لگے تھے۔ آج ان کی عمو چھبیس سال بعد اپنے بابا جان سے ملی ہوگی۔ وہ منظر کتنا حسین ہوگا، جب چھبیس سال بعد بابا جان نے اپنی عمو کو سینے سے لگایا ہوگا۔ کاش وہ بھی اس حسین منظر کا حصہ بن سکتے۔ ایبک نے تو کہا بھی تھا۔ ''بابا جان! آپ بھی چلیں۔''
لیکن وہ خود میں اُن سب کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے کہ کہیں ان کی وجہ سے کوئی بدمزگی نہ ہو جائے۔ کہیں چھبیس سال بعد عمارہ کو محض ان کی وجہ سے مایوسی نہ ہو۔ وہ تو ان کی اپنی ہے۔ اپنا خون۔
'نہیں! مجھے نہیں جانا چاہئے۔' انہوں نے فیصلہ کیا تھا۔
عمارہ حیران تھیں۔
''یہ اچانک کیوں؟...... بابا جان تو ٹھیک ہیں نا؟'' عمارہ نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔
''وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ پلیز ایسا کچھ مت سوچیں۔ بس وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس عمر میں ان کے لئے سفر کرنا آسان نہیں ہے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں، آپ کو لے آؤں۔''
''تم سچ کہہ رہے ہو نا ایبک! بابا جان نے ایسا کہا؟ انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی؟'' عمارہ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایبک نے نظریں چرا لیں۔
عمارہ کی خوشی ان کے چہرے، ان کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔ فلک شاہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ کتنے سالوں بعد انہوں نے عمارہ کی آنکھوں میں خوشی کی یہ چمک دیکھی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی۔
''لیکن آپی! میں ''الریان'' تو نہیں جا سکتی۔ پھر......''
''تو کیا ہوا ماما جان!'' ایبک نے بہت محبت سے ان کے ہاتھ تھامے۔ ''اس ناچیز کا بھی تو ایک ٹھکانا ہے وہاں۔ بابا جان وہاں آ جائیں گے۔''

اور عمارہ کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی تھی۔ ایبک کا خیال تھا کہ وہ راستے میں آرام سے انہیں بابا جان کی بیماری کا بتائے گا۔ ابھی تو وہ خود ایک اذیت بھگت چکی تھیں۔

''آپ بھی ساتھ چلتے تو......'' عمارہ کے اُٹھتے قدم رک سے گئے تھے۔

''تم جاؤ عمو! بابا جان سے میری طرف سے معافی مانگنا۔ میری سفارش کرنا۔ میں پھر آ جاؤں گا۔ اور تمہارا جتنے دن دل چاہے، وہاں رہنا ایبک کے پاس۔ روز بابا جان سے ملنا بلکہ بابا جان کو اتنے دن وہاں ہی رکھ لینا۔ اور اگر وہ مان جائیں تو انہیں ساتھ لے آنا یہاں۔ میری بالکل فکر نہ کرنا۔ انجی ہے نا میرے پاس۔''

بہت سارے خواب عمارہ کے آنچل میں باندھ کر انہوں نے انہیں روانہ کر دیا تھا۔ باہر آسمان پر نظر جماتے ہوئے ایک بار پھر ان کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ گیا تھا۔

عمارہ کے جانے کے بعد ہسپتال کا وہ کمرہ ''الریان'' کے باسیوں سے بھر گیا ہوگا۔ عمو، بابا جان سے جڑی بیٹھی ہو گی اور اس کی آنکھیں نیر بہا رہی ہوں گی۔ اور وہاں سب ہوں گے۔

مصطفیٰ بھائی، ثنا بھابی، ان کے بچے، احسان شاہ، مائرہ۔

اور مائرہ کا تصور آتے ہی وہ چونکے۔ کئی تلخ یادوں نے ان پر یلغار کر دی تھی۔

'کیسی عورت تھی یہ مائرہ بھی۔' اُن کے اندر تلخی بھر گئی۔ ''جسے نہ اپنی عزت نفس عزیز تھی، نہ دوسروں کی۔ عمارہ کے ساتھ منگنی کے بعد وہ بابا جان کی ہدایت پر ہاسٹل منتقل ہو گئے تھے۔ لیکن ان کا دل تو ''الریان'' میں دھڑکتا تھا اور وہ خود ''الریان'' کے سب باسیوں کے دلوں میں دھڑکتے تھے۔ ہفتے میں تین بار وہاں جانے کے باوجود انہیں لگتا تھا جیسے ان میں اور ''الریان'' میں بڑی دُوریاں ہو گئی ہیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ پورے ''الریان'' کو اُٹھا کر ہاسٹل کے کمرے میں لے جاتے۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ بابا جان نے اگر اُنہیں ہاسٹل میں رہنے کو کہا تھا تو یقیناً کوئی مصلحت ہو گی۔ احسان ان سے زیادہ بے تاب رہتا تھا، ان سے ملنے کو۔ اور وہ نہ جاتے تو وہ آ جاتا ہاسٹل۔ اور اکثر تو وہ ان کے پاس ہی سو جاتا تھا۔

''یار! میں مائرہ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس رات وہ ہاسٹل میں ہی تھا اور ان کا روم میٹ جو گھر گیا ہوا تھا، اس کے بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

''تو مل لو نا کسی روز کالج آ کر۔'' انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

''لیکن وہاں کالج میں اس سے حالِ دل کیسے کہوں؟ کہیں باہر ملنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن کہاں؟'' وہ پریشان ہوئے۔ ''اور کیا یہ مناسب ہے شانی؟ پھر وہ مروہ پھپھو کی نند کی بیٹی ہے۔''

''تو کیا کروں؟ کیسے اس تک حالِ دل پہنچاؤں؟''

''تو پہنچا تو دیا تھا تمہارا حالِ دل اُس تک۔''

''لیکن اس نے کوئی رسپانس بھی تو نہیں دیا۔''

''کیسا رسپانس یار! کیا اب وہ تمہیں لو لیٹر لکھے؟'' وہ جھنجلائے۔ ''تمہاری خواہش اس نے جان لی۔ اب سیدھے بھاؤ اسے رشتہ بھجوا دو۔''

''لیکن موی یار! وہ پہلے مصطفیٰ بھائی اور عثمان بھائی سے......''

''دیکھو شانی! تم اماں جان سے بات کرو۔ مروہ پھپھو کا ووٹ اپنے حق میں کرو اور فی الحال صرف بات طے ہو جائے۔ شادی وغیرہ عثمان بھائی اور مصطفیٰ بھائی کی شادی کے بعد سہی۔

''ٹھیک ہے۔ میں اس ویک اینڈ پر رحیم یار خان جا کر پھپھو سے بات کرتا ہوں۔ وہی اماں جان سے بھی بات کریں گی۔

احسان مطمئن ہوا تھا لیکن وہ مطمئن نہیں تھے۔ مائرہ اُن کے ڈیپارٹمنٹ میں آ جاتی تھی۔ انہیں مجبوراً بات کرنا

پڑتی۔ وہاں وہ تماشا نہیں بنانا چاہتے تھے۔ کھردرے انداز میں رسمی سی بات کرتے۔ پھر بھی چہ مگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔

ایم اے فائنل ایئر کی مائرہ اور تھرڈ ایئر کا فلک شاہ۔

نہیں! یہ بہت غلط ہو رہا تھا۔ یہ افواہیں کون پھیلا رہا تھا؟...... یقیناً مائرہ ہی تھی جو جان بوجھ کر ایسا کر رہی تھی۔ ان کے ادھر صرف چند ماہ رہ گئے تھے لیکن ان چند ماہ میں اس نے انہیں زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ اگر وہ مروہ پھپھو کی نند کی بیٹی نہ ہوتی اور اگر احسان شاہ بیچ میں نہ ہوتے تو وہ اس کو سبق سکھا سکتے تھے۔ لیکن اب وہ تنگ آ گئے تھے۔ تب ایک روز انہوں نے اسے روک لیا۔

''سنیے مائرہ!......آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟''

''کیا تم نہیں جانتے مومی! کہ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں؟'' الریان کے باسیوں کی طرح وہ بھی اسے مومی کہہ کر بلانے لگی تھی۔

''اس میں آپ کی ہی بدنامی ہے مائرہ! میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

''تمہارا کیسے کچھ نہیں بگڑے گا؟'' وہ پُراسرار انداز میں مسکرائی تھی۔ ''جب ''الریان'' میں تمہارے اور میرے ''افیئر'' کی اطلاع پہنچے گی تو تمہاری وہ نام نہاد منگنی خود بخود ٹوٹ جائے گی۔''

''تو آپ کیا سمجھتی ہیں کہ پھر میں آپ سے شادی کر لوں گا؟......لعنت بھیجتا ہوں میں آپ پر اور آپ جیسی لڑکیوں پر۔''

''میں تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دوں گی فلک شاہ!'' وہ زیرلب بڑبڑائی تھی۔ انہوں نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پالیا تھا اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے کالج سے باہر نکل آئے۔ ان کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس کے منہ پر ایک تھپڑ ماریں اور اسے گھسیٹتے ہوئے اس کے ماں باپ کے سامنے لے جائیں۔ لیکن......

انہوں نے مٹھیاں بھینچیں اور اپنے غصے پر قابو پانے کی شعوری کوشش کی تھی۔ ان کی اچھی بھلی زندگی میں یہ لڑکی کہاں سے آ گئی تھی فساد پھیلانے۔ اور کیا یہ احسان شاہ جیسے لڑکے کے لائق تھی؟ ہرگز نہیں۔ چاہے احسان کچھ بھی کہے، وہ ایک بار تو احسان کو ضرور مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے دل کو سمجھا لے اور اس لڑکی کی محبت سے دستبردار ہو جائے۔ ایسے کھوٹے دل اور سازشی ذہن کی لڑکی ''الریان'' کے سچے کھرے اور سادہ دل باسیوں میں رہنے کے قابل ہرگز نہیں ہے۔

وہ پتہ نہیں کب سے سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔ اس وقت چونکے جب ایک گاڑی کے بریک اُن کے قریب چرچرائے تھے اور شیر دل نے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''اینی پرابلم (کوئی مسئلہ) فلک شاہ!''

''نہیں۔'' شیر دل کو دیکھ کر انہوں نے خود کو کمپوز کیا۔

''تو کیا یہاں خودکشی کے ارادے سے کھڑے ہو؟'' شیر دل نے خوشگوار لہجے میں کہتے ہوئے فرنٹ ڈور کھولا۔ وہ یونہی بے دھیانی میں پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئے کہ ایک ساتھ پیچھے کئی گاڑیوں کے ہارن بجے تھے۔ ان کا ذہن اس وقت کام نہیں کر رہا تھا۔

''آج کالج نہیں گئے؟'' شیر دل نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''گیا تو تھا لیکن راستے سے ہی پلٹ آیا۔''

''تم نے حق نواز کے متعلق سنا؟'' شیر دل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''نہیں تو۔ کیا ہوا؟''

''حق نواز کا کل مخالف جماعت کے ایک گروہ سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ جھگڑے میں اگرچہ حق نواز بھی زخمی ہوا ہے۔ لیکن

ان لوگوں نے حق نواز کے خلاف پرچہ کٹوا دیا تھا اور پولیس، حق نواز کو پکڑ کر لے گئی۔"
"اوہ نو!" فلک شاہ پریشان ہوئے۔ "آنٹی اور انکل تو بہت اپ سیٹ ہوں گے۔"
"ہاں! بہت زیادہ۔ کل سے ضمانت کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ خیر! تمہیں کہاں جانا تھا؟"
"جانا تو مجھے ہاسٹل ہی تھا، لیکن اب میں حق نواز کے گھر جاؤں گا، آنٹی اور انکل کے پاس۔ آپ مجھے کہیں نزدیک اراپ کر دیجئے گا۔"
"میں بھی ماموں جان کی طرف ہی جا رہا ہوں۔" شیر دل نے بتایا۔
"تم کچھ پریشان لگ رہے ہو فلک شاہ؟" شیر دل نے کچھ آگے جا کر پوچھا۔ "کچھ حرج نہ ہو تو تم مجھ سے اپنا مسئلہ ڈسکس کر سکتے ہو۔ تم مجھے اچھا دوست پاؤ گے۔"
وہ دل ہی دل میں شیر دل کے خلوص کے قائل ہوئے تھے۔ لیکن وہ اپنی کم از کم یہ پریشانی اس سے شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ شیر دل انہیں پہلی ہی ملاقات میں پسند آیا تھا۔ اور دوسری ملاقات میں تو وہ انہیں اور بھی دل کے قریب محسوس ہوا تھا۔ یہ ان کی اس سے تیسری ملاقات تھی، لیکن وہ شیر دل کو نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ ایک لڑکی کے ہاتھوں پریشان ہو رہے ہیں۔
"نہیں ایسی کوئی پریشانی نیں ہے شیر دل!" اور شیر دل نے ان سے پھر اصرار نہیں کیا تھا۔
"تمہارے پاس تو تمہاری اپنی گاڑی بھی تھی۔" شیر دل کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔
"ہاں! وہ "الریان" میں کھڑی ہے۔ اور میں آج کل ہاسٹل میں رہ رہا ہوں۔ دراصل میں عام لڑکوں کی طرح ہاسٹل میں رہ کر زندگی انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ بس میں ڈنڈا پکڑ کر دروازے میں ذرا سا پاؤں اٹکا کر یونہی لٹک کر جانے میں اپنا ہی لطف ہے۔"
حق نواز کے ابا اُس کی ضمانت کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور اماں کا برا حال تھا۔ وہ اُنہیں تسلی دے کر ہاسٹل آ گئے۔ دو دن بعد کہیں جا کر اس کی ضمانت ہوئی تھی۔ دوسری جماعت کا تعلق برسر اقتدار پارٹی سے تھا۔ سو ضمانت میں مشکل ہوئی تھی۔ وہ اگلے دو تین دن تک مسلسل حق نواز کے پاس جاتے رہے اور وہاں اس کی پارٹی کے کئی کارکنوں سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سب انہیں محبِ وطن اور دل میں قوم کا درد رکھنے والے لوگ لگے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں ان کے جذبوں کو سراہا تھا۔
"ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں شاید جو قوموں اور ملکوں کی تاریخ بدلتے ہیں۔"
حق نواز کے پاس آنے والوں میں سے سب سے زیادہ وہ سر الطاف سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ کسی مقامی کالج میں پروفیسر تھے۔ گفتگو کرتے تو جی چاہتا، بندہ سنتا ہی رہے۔ وطن کے حوالے سے بات کرتے تو رقت طاری ہو جاتی تھی۔
"یہ پاکستان یوں ہی نہیں بنا تھا۔ لاکھوں انسانوں کا لہو ہے اس کی بنیادوں میں۔ تم جیسے جوان ہی تھے، جنہوں نے اسے بنانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ اور اب تم جیسے جوانوں نے ہی اس کٹے پھٹے پاکستان کو بچانا ہے........ ابھی تو ہمارے زخم ہرے ہیں...... ابھی تو ان سے خون رستا ہے...... ابھی تو ترانوے ہزار فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کا دکھ چھوکے لگاتا ہے ہمیں۔ لیکن ہم بھول گئے۔ ہم نے صرف دو سال میں سب بھلا دیا...... اور اپنی رنگ رلیوں میں پڑ گئے۔"
بات مشرقی پاکستان کے حوالے سے شروع ہوئی تھی اور سر الطاف جذباتی ہو گئے تھے۔
وہ مبہوت سے ان کی گفتگو سنے گئے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا دکھ کسے نہیں ہوا تھا۔
وہ ان دنوں یو۔ ای۔ ٹی میں تھے اور "الریان" میں کتنے ہی دن تک سوگ کی فضا طاری رہی تھی۔ عبدالرحمٰن شاہ کو تو

انہوں نے دھاڑیں مار مار کر آنسوؤں سے روتے دیکھا تھا۔ لیکن اب زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ صحیح تو کہہ رہے تھے سر الطاف کہ ہم بڑی بھلکڑ قوم ہیں۔ بڑی جلدی بھول جانے کا مرض ہے ہمیں۔

حق نواز کی وجہ سے انہیں سیاست سے دلچسپی تو تھوڑی بہت تھی ہی، لیکن آج جب وہ حق نواز کے پاس سے اُٹھے تو ان کی جیب میں اس کی پارٹی کی رکنیت کا فارم تھا۔

اور یہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ آج چھ دنوں بعد وہ ''الریان'' جا رہے تھے۔

انہیں دیکھتے ہی ''الریان'' میں شور مچ گیا تھا۔

''کہاں غائب ہو گئے تھے؟...... کدھر تھے؟....... نہ کالج جا رہے تھے اور نہ ہی ہاسٹل میں ملتے تھے۔ دو دفعہ شانی گیا تمہارے ہاسٹل، ایک بار مصطفیٰ۔'' مختلف آوازیں ایک ساتھ ان کے کانوں میں پڑی تھیں۔

''میں کالج نہیں گیا۔ کیونکہ موڈ نہیں تھا۔'' انہوں نے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ ''اور ہاسٹل میں اس لئے نہیں ملتا تھا کہ میں حق نواز کے پاس چلا جاتا تھا، ہسپتال۔''

''حق نواز وہی نا، جو ایک پارٹی کا رُکن ہے؟'' مصطفیٰ نے پوچھا۔

''جی۔ لیکن وہ ایک حادثے میں زخمی ہو گیا تھا۔ سو میں اُس کی مزاج پرسی کے لئے جاتا رہا۔ پہلے ہسپتال اور پھر گھر۔''

انہوں نے عمارہ کو دیکھنے کے لئے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور اُس کی خفگی محسوس کر کے مسکرا دیئے۔

''موی!'' مصطفیٰ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم جانتے ہو نا، یہ سیاست وغیرہ میں پڑ کر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ تم اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔''

''لیکن مصطفیٰ بھائی! میں تو محض اس کی مزاج پرسی کے لئے جاتا تھا۔''

وہ مصطفیٰ کو یہ نہیں کہہ سکے تھے کہ اگر 1947ء میں نوجوانوں نے مسلم لیگ میں شامل ہو کر تحریک پاکستان کے لئے کام نہ کیا ہوتا تو آج ہم آزاد ملک کے باسی نہ ہوتے۔

''ہمارے ہاں مثبت سیاست نہیں ہے موی! یہاں ہر پارٹی لیڈر اپنے مفاد کے لئے کام کرتا اور حق نواز جیسے نوجوانوں کو استعمال کرتا ہے۔'' مصطفیٰ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور انہوں نے سر ہلا دیا تھا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی بینا چچی نے مروہ پھپھو کی آمد کی خوش خبری دی تھی اور عمارہ کو ساتھ لے کر کچن میں گھس گئیں اور وہاں کچن ہی سے آواز دی تھی۔

''موی! تم بھاگ مت جانا۔ کھانا کھا کر جانا۔ ارے! پتہ نہیں ہاسٹل میں کیسا کھانا ملتا ہوگا۔''

''کیا کچھ خاص پک رہا ہے بینا چچی؟'' کچھ دیر بعد وہ کچن کے دروازے کے باہر کھڑے پوچھ رہے تھے۔

''پلاؤ، بروسٹ، تمہاری پسندیدہ بادام کی کھیر اور بہت کچھ ہے۔ لیکن موی! کم از کم فون تو کر دیتے کہیں سے۔ بھائی جان تو صبح کافی پریشان ہو گئے تھے۔ وہ تو شانی نے انہیں تسلی دی کہ تم خیریت سے ہو۔ ورنہ وہ تو مراد چچا کو فون کرنے والے تھے۔''

''اوہ!'' انہوں نے کان کھجائے۔ ''دراصل چچی جان! وہ جو حق نواز ہے نا، اس کا کوئی بھائی وغیرہ تو ہے نہیں۔ اور اس کے والد بے چارے بہت اپ سیٹ تھے، اکیلے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔'' انہوں نے کن اکھیوں سے عمارہ کو دیکھا۔

''خیر! کسی کی مدد کرنا اچھی بات ہے۔'' بینا چچی نے انہیں سراہا۔ ''بہرحال تمہیں فون کر دینا چاہئے تھا۔''

''سوری چچی جان!'' انہوں نے کان پکڑے۔

بینا چچی ہنستی ہوئی کچن سے باہر نکلیں تو انہوں نے عمارہ کو مخاطب کیا۔

''ناراض ہو؟''

''نہیں تو۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

''اور ناراض ہونا بھی مت۔ فلک شاہ تمہاری ناراضگی برداشت نہیں کر سکے گا۔'' وہ یک دم سنجیدہ ہو گئے۔ انہیں مائرہ کا خیال آیا۔ اس کی دھمکیاں یاد آئیں۔ اتنے سارے دنوں سے وہ حق نواز کے معاملے میں اُلجھ کر اُسے بھولے ہوئے تھے۔ لیکن اب یکایک انہیں خیال آیا تھا کہ کہیں......

''اور کبھی مجھ سے بدگمان بھی مت ہونا عمارہ! دنیا کی کوئی لڑکی فلک مراد شاہ کے لئے عمارہ عبدالرحمٰن نہیں ہوسکتی۔ اور یاد رکھنا عمو! کہ اگر کبھی اسے لگا کہ عمارہ اس سے ناراض یا بدگمان ہے تو وہ دوسرا سانس بھی نہیں لے سکے گا۔'' عمارہ کی ناراضگی کا خول یکدم چٹخا تھا۔

''آپ بھی مومی! ہم بس اُداس تھے، پریشان تھے کہ آپ اتنے دنوں سے ''الریان'' کیوں نہیں آ رہے۔''

تب ہی بینا چچی ہنستی ہوئی اندر آئیں۔

''اتنا شور، اتنا ہنگامہ ہوا ''الریان'' میں اور وہ تمہارا سایہ گھوڑے، گدھے بیچ کر سو رہا ہے۔ اب اُٹھا کر آئی ہوں اسے۔''

اور تب احساس ہوا تھا اُنہیں کہ شانی تو ان سب میں تھا ہی نہیں۔

''کہاں غائب تھے مومی؟'' آنکھیں ملتا ہوا احسان، بینا چچی کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

''تمہیں پتہ تو ہے یار! وہ حق نواز.......''

''ہاں! تمہارے روم میٹ نے بتایا تھا۔ میں دو بار تمہارے ہاسٹل گیا۔ یار! یہ حق نواز جیسے بندوں سے دُور ہی رہا کرو۔''

''ہاں! بس وہ زخمی تھا تو چلا گیا تھا۔ ایکچوئیلی مجھے اتفاقاً ہی شیر دل مل گیا تھا تو اس نے بتایا۔''

''اچھا! وہ اس کا کزن، جو آرمی میں ہے؟''

فلک نے احسان کو اس کے متعلق بتا رکھا تھا۔ آج سے پہلے انہوں نے احسان سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی، لیکن اب چھپا رہے تھے۔ مائرہ کی بات اور حق نواز کی پارٹی میں شمولیت کی بات۔

وہ احسان کے ساتھ چلتے ہوئے پھر لاؤنج میں آ گئے جہاں اب صرف زارا تھی جو ٹی وی دیکھ رہی تھی اور عثمان تھا جو ایک صوفے پر نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا۔ عثمان اپنی پڑھائی میں اس قدر مصروف رہتا تھا کہ شام کا وقت ہوتا تھا، جب وہ ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے یا چائے پیتے ہوئے اخبار پڑھتا تھا۔ پڑھتا کیا، بلکہ سرسری سا دیکھتا تھا۔ وہ احسان کے ساتھ کونے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''میں کالج گیا تھا اور مائرہ سے ملا تھا۔''

''پھر.....؟'' فلک شاہ کا دل زور سے دھڑکا۔

''کچھ نہیں۔ وہ جلدی میں تھی۔ اسے رحیم یار خان جانا تھا۔ وہ ہاسٹل جا رہی تھی واپس۔ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گھر جا رہی تھی۔''

فلک شاہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ کم از کم یہ ہفتہ وہ سکون سے کالج جا سکتے تھے۔ اور پھر اگلے مہینے تو فائنل والے فری ہو رہے تھے۔

''میں نے اسے ہاسٹل تک چھوڑنے کی آفر کی تھی، لیکن اس نے منع کر دیا۔ میں نے سوچا تھا، راستے میں بات کرلوں گا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، اس کا موڈ آف تھا۔ تم سے تو کوئی بات نہیں ہوئی اس کی؟'' احسان اچھا خاصا اپ سیٹ تھا۔

''نہیں یار! مجھ سے تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ تمہیں پتہ تو ہے، میں کچھ دنوں سے کالج نہیں جا رہا تھا۔''

تب ہی مروہ پھپھو کی آمد کا غلغلہ مچا تھا۔ زارا، ٹی وی بند کر کے باہر بھاگی۔ مروہ پھپھو کے بچوں سے اُس کی بہت بنتی تھی۔

یہ پہلی بار تھا کہ ان کا دل ''الریان'' میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی۔ وہ سب کے درمیان بیٹھے ہوئے بھی بار بار کھو جاتے تھے۔ کہیں کچھ غلط ہونے والا تھا۔ اور وہ اس غلط ہونے کو روک نہیں سکتے تھے۔ یا اگر روک سکتے تو کیسے؟

مائرہ کیا کرسکتی تھی؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ انہیں بدنام کرسکتی تھی۔ جیسا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ اس کے اور فلک شاہ کے افیئر کے قصے ''الریان'' تک پہنچیں اور......

'نہیں......!' فلک شاہ کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

مروہ پھپھو کی ہنگامی آمد...... مائرہ کا رحیم یار خان جانا...... جبکہ یہ آخری دن بہت اہم تھے۔ کالج میں لڑکیاں ہر وقت نوٹس بناتی اور کتابیں رٹتی دکھائی دیتی تھیں۔

چند لمحوں میں فلک شاہ کے سامنے سب کچھ واضح ہوگیا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اُنہیں کیا کرنا ہے۔ فیصلہ کرکے وہ بے حد مطمئن سے ہوکر سب کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے اور تب انہوں نے غور کیا تھا کہ باتیں کرتے کرتے مروہ پھپھو نے کئی بار ان کی طرف بغور دیکھا تھا اور وہ مسکرا دیئے تھے اور پھر موقع پا کر باہر جاتے ہوئے انہوں نے مروہ پھپھو کے پاس رک کر کہا۔

''پھپھو! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔ اچھا ہوا، آپ آگئیں۔ ورنہ شاید میں خود آپ کے پاس آتا۔''

مروہ پھپھو کے ہاتھ سے وہ ٹیڈی بیئر گر گیا تھا، جو وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو پکڑا رہی تھیں۔ بیٹا اپنا ٹیڈی بیئر لے کر بھاگ گیا تو وہ بھی اُٹھ کر لان میں آگئے۔ لان میں ٹہلنا اور بیٹھنا فلک شاہ کو بہت پسند تھا۔ اور سب ہی جانتے تھے۔ سو کسی نے ان کے باہر جانے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ سب ہی آٹھ بجے والا ڈراما شوق سے دیکھ رہے تھے، اماں جان سمیت۔

''مومی بیٹا! کیا بات ہے؟'' وہ لان میں آ کر چیئر پر بیٹھا ہی تھا کہ مروہ پھپھو آ گئی تھیں۔

تب اس نے ساری بات مروہ پھپھو سے کہہ دی تھی۔ احسان شاہ کی پسندیدگی سے لے کر مائرہ کی حماقت تک۔

''وہ ایسی ہی ہے مومی!...... جنونی سی۔ جس چیز کا اسے جنون ہو جائے، جب تک اسے حاصل نہ کرلے، چین سے نہیں بیٹھتی۔''

''لیکن میں چیز نہیں ہوں پھپھو! انسان ہوں۔''

اور تب مروہ پھپھو نے انہیں وہ بتایا تھا، جس کا انہیں ڈر تھا۔

''مجھے اس کی بات کا یقین تو نہیں آیا تھا مومی! لیکن میں اپ سیٹ ضرور ہوگئی تھی۔ اس لئے میں نے فوراً ''الریان'' آنے کا پروگرام بنالیا۔ مجھے عمارہ کی فکر تھی۔ کل شام وہ میرے پاس آئی تھی اور اس نے مجھ اپنے اور تمہارے متعلق بتایا تھا اور کہا کہ تمہارے ساتھ شادی کی صورت میں عمارہ کی زندگی تباہ ہوجائے گی۔ کیونکہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔''

''ربش......'' انہوں نے غصے سے ہاتھ کرسی کے ہتھے پر مارا تھا۔ ''میں اسے قتل کردوں گا۔ جھوٹی، مکار۔''

''ریلیکس مومی!'' مروہ نے اُنہیں تسلی دی تھی۔ ''تم بالکل بھی پریشان نہ ہو اور بھول جاؤ۔ میں سب ہینڈل کرلوں گی۔ فی الحال تو میں اسے بہلائے رکھتی ہوں اور اس کا بہتر حل تمہاری اور عمارہ کی فوراً شادی ہے۔ جتنی جلد ہوسکے۔''

اور اتنے دنوں بعد وہ پہلی رات تھی، جب وہ سکون سے سوئے تھے۔ رات دیر ہو جانے پر وہ ''الریان'' میں ہی رک گئے تھے۔ جب تک احسان شاہ کمرے میں آئے، وہ گہری نیند سو چکے تھے۔''

❁○❁

زندگی بے حد مصروف ہوگئی تھی۔

وہ کالج سے اکثر پارٹی کے کسی نہ کسی اجلاس میں شرکت کرنے چلے جاتے۔ پارٹی کے ایجنڈے اور مقاصد نے اُنہیں بہت متاثر کیا تھا۔

''انسان پر اس کے وطن کا بھی حق ہوتا ہے۔ یہ کیا کہ وہ صرف اپنے لئے جیے اور مر جائے۔'' یہ پروفیسر الطاف کا قول تھا۔
وہ اب پارٹی کے ایک سرگرم رکن تھے۔ لیکن وہ ''الریان'' جانا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ کالج میں دوبار اُن کی ملاقات مائرہ سے ہوئی تھی۔ لیکن وہ اس کے پاس سے کترا کر گزر گئے۔ مائرہ کے لبوں پر ایک پُر غرور سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اس دن غالباً ان کا کالج میں آخری دن تھا۔ وہ گیٹ کی طرف جا رہے تھے کہ اس نے آواز دے کر انہیں روکا۔ وہ رُکنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن آس پاس سے کچھ طلباء گزر رہے تھے۔ وہ رُک گئے۔
''کیا بات ہے؟'' انہوں نے بے حد ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔
وہ تیز تیز چلتے ہوئے ان کے قریب آئی۔ انہوں نے چلنا شروع کر دیا۔ اب وہ بھی اُن کے ہم قدم ہو کر چل رہی تھی۔
''میں آج صرف تم سے ملنے آئی ہوں کالج۔ کل ہمارا لاسٹ پیپر تھا اور آج مجھے واپس رحیم یار خان جانا ہے۔''
انہوں نے مائرہ کی بات کا جواب نہیں دیا اور یوں ہی چلتے رہے۔
''یوں تمہارے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلنا مائرہ حسین کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔''
''اور میں......'' ان کا غصہ عود کر آیا۔ ''میں تمہارے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلنا تو درکنار، تمہیں دیکھنا، بلکہ تم پر ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔''
وہ بڑی نخوت سے مسکرائی تھی۔
مائرہ حسین کو کبھی زندگی میں شکست نہیں ہوئی موسیٰ فلک شاہ! اور وہ اب بھی نہیں ہارے گی۔ ایک روز تم اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے فخر محسوس کرو گے۔''
وہ ایک دم ہی رخ موڑ کر دائیں طرف چلی گئی اور وہ حیران کھڑے سوچتے رہ گئے۔
'یہ کیسی لڑکی ہے؟ اتنی بے باک، اتنی ڈھیٹ۔' ستر اسی کی دہائی میں لڑکیاں اتنی بے باک کب ہوتی تھیں؟ وہ اُس کی جرأت پر حیران اور ششدر تھے۔
اگلی صبح وہ بہاول پور جا رہے تھے۔
مروہ پھپھو صحیح کہتی تھیں، اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا، ان کی اور عمارہ کی شادی۔
بی اے کے ایگزام ہونے والے تھے۔ وہ بابا جان سے کہیں گے کہ ان کے بی اے کے بعد ان کی شادی کر دی جائے۔ بابا جان نے کبھی ان کی بات نہیں ٹالی تھی۔ اور پھر اگر ضروری ہوا تو وہ سب کچھ بابا جان کو بتا دیں گے۔
نہیں! وہ اُس کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ وہ اُس کی آنکھوں کی چمک سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ وہ چمک جو جیتنے والے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔
''بابا جان!'' ابھی کچن کا کام کروا کے کمرے میں آئی تو کمرا یخ ہو رہا تھا۔ کھڑکی سے ٹھنڈی اور خنک ہوا اندر آ رہی تھی اور فلک شاہ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے باہر اندھیرے میں جانے کیا دیکھ رہے تھے۔
''بابا جان! کمرا کتنا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' انجم نے ان کے قریب آ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ انجم کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔
''پتا نہیں کیوں، آج یہ ٹھنڈی اور خنک ہوائیں اچھی لگ رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ یہ ٹھنڈی ہوا جسم سے ٹکراتی رہے اور اندر سکون سا اُترتا رہے۔''
''لیکن بابا جان! ٹھنڈ کہیں نقصان نہ پہنچا دے۔ ابھی تو آپ کا چیسٹ انفیکشن دُور ہوا ہے۔ میں کھڑکی بند کرنے لگی ہوں۔''

''لیکن مجھے ابھی سونا نہیں ہے۔'' وہ مسکرائے۔ انجم نے کھڑکی بند کر کے ان کی ویل چیئر کھڑکی کے پاس سے ہٹائی اور بیڈ پر پڑی شال اٹھا کر ان کے کندھوں پر ڈالی اور خود ان کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ٹھیک ہے بابا جان! آج ہم باتیں کریں گے۔ جب آپ کا سونے کا موڈ بنا تو پھر بتا دیجئے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ پھر مسکرا دیئے تھے۔ آج برسوں بعد ان کے دل پر پڑا بوجھ کم ہوا تھا۔ آج عموا اپنے بابا جان سے مل رہی ہوگی۔ یہ احساس بڑا ہی خوش کن تھا۔

''بابا جان! آپ مجھے الریان کے متعلق بتائیں۔ نانا جان کے متعلق اور ان سب کے متعلق جو وہاں رہتے ہیں۔'' وہ بے حد اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ الریان اور اس کے باسیوں کے متعلق بات کرتے ہوئے تو وہ کبھی نہ تھکتے تھے۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور انجی بے حد شوق اور اشتیاق سے سن رہی تھی۔

❁○❁

وہ ابھی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ سمیرا ہاتھ میں چائے کا کپ لئے آ گئی۔

''چائے پئیں گے آپ؟''

''اب اگر بنا لی ہے تو پی لیتا ہوں۔'' اس نے مسکرا کر سمیرا کی طرف دیکھا۔

سمیرا چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیا رات کو گیٹ پر چڑھ کر باہر کُودے تھے؟...... کہاں گئے تھے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکا۔

''صبح تمہارے گھٹنوں پر رگڑ کے نشان تھے، جبکہ رات جب آئے تھے تو جینز پر کوئی نشان نہیں تھا۔''

''زیادہ جاسوسِ اعظم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے اپنی گھبراہٹ کو غصے میں چھپایا۔ ''مجھے گیٹ پر سے کُودنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''مجھے کیا معلوم؟ یہ تو آپ کو پتہ ہوگا۔'' سمیرا نے کندھے اُچکائے۔

''سمو......!'' اُس نے اُسے گھورا۔ ''عمران سیریز کے ناول پڑھنا چھوڑ دو۔'' اس کی نظر سامنے واش روم کے اوپر بنی دوچھتی پر گئی، جہاں فالتو سامان پڑا رہتا تھا۔ ''میں دوچھتی پر چڑھا تھا۔ اپنے پرانے جوگرز ڈھونڈنے۔''

''تو ایسی کیا ایمرجنسی تھی؟ نیچے سے سیڑھی لے آتے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

اب پتہ نہیں، اُس نے اُس کی بات کا یقین کیا بھی تھا یا نہیں، لیکن اُسے بروقت سوجھ گئی۔ یہ پرانے جوگرز اس نے دو دن پہلے ہی نکالے تھے دوچھتی سے۔ کُوڑا اُٹھانے والا لڑکا کئی دن سے جوتے مانگ رہا تھا۔

''سنو۔ یہ جوگرز لے جاؤ۔ اور جب کُوڑا اُٹھانے والا آئے تو اُسے دے دینا۔ کب سے جوتے مانگ رہا ہے۔ ننگے پاؤں آتا ہے بے چارہ۔'' اس نے سمیرا کی ہمدردی بیدار کرنے کی کوشش کی اور پھر بلاوجہ ہنسا۔

''اور اب جوگرز کا پوسٹ مارٹم کرنے نہ بیٹھ جانا، عمران کی جانشین۔''

سمیرا نے برا سا منہ بنایا اور پھر جوگرز اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

''رضی! تمہیں پتہ ہے، ابو بہت پریشان ہیں۔''

''بلاوجہ ہی پریشان ہیں۔ میں نے کوئی چوری ڈاکا تو نہیں ڈالا۔'' وہ چڑا۔

''ابو نے دو تین لوگوں سے پتہ کیا ہے۔ وہ شخص واقعی غلط ہے۔ اس کے ارادے......''

''بس کرو سمو! معاف کر دو مجھے۔ میں اس وقت نصیحت سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔ ابو نے دو گھنٹے جو لیکچر دیا ہے، پہلے اسے ہضم کر لوں، پھر تم اپنا نصیحت نامہ پلانا مجھے۔''

اس نے چائے کا کپ اُٹھایا اور ایک ہی سانس میں کپ خالی کر کے اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ بھی لے جاؤ۔"

"رضی......" سمیرا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ اور پلیز! تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے، شام کو کہہ لینا۔ اس وقت مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔" وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ سمیرا اپنا کچھ کہے کمرے سے چلی گئی تو اس نے چھوٹا تکیہ اٹھا کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ سامنے شیشوں سے آنے والی روشنی اُسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو گیا۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو چھ بج رہے تھے۔ تین گھنٹے کی نیند نے اُسے بہت فریش کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تو یوں ہی بیڈ پر لمارات کی باتیں سوچتا رہا۔ الوینا کا تصور آتے ہی اُسے گدگدی ہونے لگی تھی۔

اُس کے ہاتھ کا لمس......

اُس کے وجود سے اُٹھنے والی مسحور کُن خوشبو۔

اور.......

'یہ کیسا اسرار ہے؟......وہ سرونٹ کوارٹر سے جاتا راستہ.......وہ اس صراحی میں پڑا مشروب۔ کیا واقعی وہ شرابِ طہور تھی؟ اور پتہ نہیں، اُس کا ذائقہ کیسا تھا۔ جب میں مقربین میں شامل ہو جاؤں گا تو مجھے بھی وہ پینے کو ملے گی۔'

اُس کے دل میں بڑی شدت سے اس مشروب کو پینے کی چاہ بیدار ہوئی۔

'اور ہے بی، وہ کوئی اور مشروب ہو۔ اللہ کے نیک بندے اور مقرب تو وہ مشروب نہیں پی سکتے۔ کیا پتہ یہ شخص واقعی فراڈ ہو اور ابو صحیح کہتے ہوں کہ یہ شخص مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے آیا ہے۔ شیطان کا چیلا۔ لیکن ابھی تک تو اس نے اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ اور میں کوئی بے وقوف، ان پڑھ، جاہل نہیں ہوں کہ اس کے چنگل میں پھنس جاؤں گا۔ لیکن اُس کی حقیقت تو معلوم ہونی چاہئے مجھے۔ اور وہ لڑکیاں......وہ تو سچ مچ جنت کی حوریں ہیں۔ پتہ نہیں، یہ اتنی خوب صورت لڑکیاں کہاں سے آتی ہیں۔ ایک ہی جیسے قد، ایک ہی جیسے جسم۔ بس نقوش مختلف تھے۔ جنت کی حوریں کیا ان سے زیادہ خوب صورت ہوں گی؟'

ایک بار پھر الوینا کے ہاتھوں کا لمس اُس کے بازو پر جاگ اُٹھا۔

نیچے سے چلنے پھرنے اور کھٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب باتھ لے کر، فریش ہو کر وہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا تو اس وقت بھی اس کے تصور میں الوینا کا نازک سراپا تھا اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ۔ اس نے اب تک کی زندگی بہت محتاط گزاری تھی۔ کبھی لڑکیوں کے ساتھ اُس کا ربط ضبط نہیں رہا تھا۔ حالانکہ یونیورٹی میں اس کے ساتھ لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ بلکہ اس کی شان دار پرسنالٹی اور خوب صورتی کی وجہ سے کئی لڑکیوں نے اس سے دوستی بھی کرنا چاہی تھی۔ لیکن اس نے انہیں کبھی لفٹ نہیں کروائی تھی۔ بلکہ اِن کی بے چینیوں سے محظوظ ہوتا تھا۔

بچپن سے ہی ابو نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے اور پڑھ لکھ کر معاشرے میں اپنا مقام بنانا ہے۔ ہم متوسط طبقے کے لوگوں کے پاس صرف تعلیم ایک ایسا ہتھیار ہے، جس کے سہارے ہم معاشرے میں بہتر مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ پڑھائی میں اوپر رہا۔ اُس کی دوستی بھی ایسے ہی لڑکوں سے تھی، جو بہت پڑھاکو سے تھے اور اسی کی طرح ان کے سامنے صرف ایک ٹارگٹ تھا، پڑھائی۔

چند ماہ پہلے جو اس کے اندر تبدیلی آئی تھی، اس کی وجہ غالباً جنید تھا۔ کسی برگر فیملی کا بے حد دولت مند لڑکا۔ عام سی شکل و صورت اور درمیانی ذہانت کا لڑکا۔ لیکن لڑکے، لڑکیاں اس کے گرد پروانوں کی طرح چکراتے تھے۔ اس نے احمد رضا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ جس طرح وہ پیسہ خرچ کرتا تھا، جس طرح وہ قیمتی گاڑیوں میں گھومتا تھا، اس سے اس کے دل میں دولت کی خواہش پیدا ہوئی تھی اور دولت کے ساتھ شہرت کی بھی۔ لیکن اُس کے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھی پڑھائی۔ چنانچہ وہ اور زیادہ محنت کرنے لگا تھا۔

باہر برآمدے میں صرف سمیرا تھی، جو ڈائننگ ٹیبل صاف کر رہی تھی۔ اس نے آہٹ پر مڑ کر اسے دیکھا اور پھر رخ موڑ کر اپنا کام کرنے لگی۔

"لگتا ہے، آپا جان ناراض ہیں سخت۔" اس کے قریب پہنچ کر اس نے شرارت سے کہا۔

اگرچہ سمیرا اس سے تقریباً چار ساڑھے چار سال چھوٹی تھی، لیکن دونوں میں دوستوں جیسی بے تکلفی تھی۔ اور کبھی کبھی شرارت سے وہ اسے آپا جان کہہ دیتا تھا، جب کبھی وہ اسے اپنے کمرے میں کپڑے اِدھر اُدھر پھیلانے پر ٹوکتی تھی۔

سمیرا نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور ہاتھ میں پکڑی صافی سمیت کچن کا رخ کیا تو اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں سمو! اب جو لیکچر دینا ہے، لے لو۔ میں ذرا جو ہل جاؤں تو کان پکڑ کر کھڑا کر دینا دھوپ میں۔ دو، تین جتنے گھنٹے کہو گی، تمہارے سامنے بیٹھا تمہارے گولڈن ورڈز دل و دماغ میں بٹھانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

"رضی! ہاتھ چھوڑو، میں نے چائے کا پانی رکھا ہوا ہے۔ زیادہ اُبل جائے گا۔"

اُس نے سمیرا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور مسکرایا۔

"تو پھر کب اسٹارٹ کرو گی اپنا لیکچر؟ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"رضی.....!" وہ زیادہ دیر بھلا کب اس سے خفا رہ سکتی تھی؟ اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی نظر آئی۔

"تم ہم سب کی آنکھوں کا خواب ہو رضی! پتہ ہے، ابو کل رات بھر نہیں سوئے۔"

"میں نے ابو کی باتیں سن لی ہیں اور سمجھ بھی لی ہیں۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"میرے لئے بھی میری تعلیم سب سے اہم ہے اور باقی باتیں ثانوی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہماری آپا جان تو بن جائیں مشہور و معروف ڈاکٹر اور ہم انجینئر بھی نہ بن سکیں۔" سمیرا کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اچھا! اب اندر ابو، امی کے ساتھ جا کر بیٹھو۔ میں چائے وہیں لے کر آتی ہوں۔ ابھی باہر تو تپش ہے۔" اس نے صحن کی طرف دیکھا، جہاں دھوپ ابھی صحن کی دیواروں سے لپٹی کھڑی تھی۔

"میرے لئے میری تعلیم، میرے والدین اور تم دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہم ہو۔" اس کے لہجے میں محبت تھی۔

"اور وہ جو تم پر شہرت اور دولت حاصل کرنے کا بھوت سوار ہے آج کل؟" سمیرا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"وہ ان سب کے بعد۔" وہ بھی مسکرایا۔ ابو، امی کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے کچن کی طرف جاتی سمیرا کی طرف دیکھا۔

"تمہارا پانی تو اب تک سوکھ چکا ہو گا۔ اب مزید پانی بوائل ہونے تک کچھ کباب اور پاپڑ تل لینا۔ دن کو ٹھیک سے کھایا ہی نہیں گیا۔"

"پیٹ ابو کے لیکچر سے ہی جو بھر گیا تھا۔" سمیرا ہنستی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی اور وہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ابو کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہوئے چائے پی گئی۔ حسن رضا کی عادت تھی کہ انہوں نے بات کبھی دہرائی نہیں تھی۔ اب بھی انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ بلکہ گفتگو صرف ملکی حالات اور ان کے آفس کے معاملات تک ہی محدود رہی۔ سات بجنے والے تھے، جب وہ اُٹھ کر باہر آیا تھا۔ سمیرا تخت پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔

"کیا پک رہا ہے رات کے لئے؟"

"مکس سبزیوں والی بھجیا۔" سمیرا نے چھلکوں والی ٹوکری اٹھائی اور کھڑی ہو گئی۔ وہ وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ دھوپ اب صحن کی دیوار کے آخری کناروں پر تھی اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ سمیرا چھلکے ڈسٹ بن میں پھینک کر آئی اور سبزی والا باؤل اُٹھانے ہی لگی تھی کہ فون کی بیل ہوئی۔ فون تخت کے پاس ہی دیوار میں لگے فون اسٹینڈ پر پڑا تھا۔ سمیرا نے فون اٹھا لیا۔ اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور وہ سمیرا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن سمیرا کی "ہیلو، ہیلو" کے

ا ے میں دوسری طرف سے کوئی نہیں بولا تھا۔ سمیرا، ریسیور کریڈل پر ڈال کر باؤل اُٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ سمیرا
۸) آٹھویں جماعت میں ہی تھی تو اس نے کچن کے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ اور اب تو شام کی چائے
۔۔ات کا کھانا روزانہ ہی تقریباً وہ پکاتی تھی۔ اس نے بے حد محبت اور پیار سے کچن کی طرف جاتی سمیرا کی طرف دیکھا۔
"بہنیں بھی کتنی پیاری شے ہوتی ہیں۔" اس کی ساری ذمہ داریاں تقریباً سمیرا نے اُٹھا رکھی تھیں۔ اُس کے
ے استری کرنا، اُس کے کمرے کی صفائی کروانا وغیرہ۔ سمیرا کچن میں جا چکی تھی۔ وہ وہیں تخت پر بیٹھ کر وہاں پڑا ایک
ٹ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ گھر کا کام، کالج کی پڑھائی اور پھر یہ میگزین پڑھنے کا وقت بھی پتہ نہیں کیسے نکال لیتی تھی سمیرا۔
اس نے کن اکھیوں سے فون کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں اُسے گمان ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے آنے والے فون کا
ل کہیں اُس سے تو نہیں تھا؟ سو وہ اوپر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ اسے خواتین کے ڈائجسٹوں
ے الی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اس وقت وہ بہت انہماک سے ایک کہانی پڑھ رہا تھا۔ سمیرا نے کچن کے دروازے سے جھانک
ا سے دیکھا اور مسکرا دی۔

"بھئی! یہ کہانیاں اتنی بھی بری نہیں ہوتیں۔" ابھی اس نے چند صفحات ہی پڑھے تھے کہ فون کی بیل پھر ہوئی۔ اس
ے فوراً ہی ریسیور اُٹھا لیا۔

"ہیلو" دوسری طرف الوینا تھی، جو اُس کی آواز پہچان کر کہہ رہی تھی۔

"کل صبح تمہاری یونیورسٹی کے نزدیکی پٹرول پمپ کے سامنے والی بیکری کے پاس تمہارا انتظار کروں گی۔"

ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ گھنٹی کی آواز پر کچن سے باہر آتی سمیرا کو دیکھ کر اُس نے دو، تین بار قدرے بلند آواز میں
ہیلو، ہیلو" کیا اور پھر ریسیور رکھ کر ڈائجسٹ اٹھا لیا۔ لیکن اب وہ ڈائجسٹ نہیں پڑھ رہا تھا۔ وہ الوینا کے متعلق سوچ رہا
ا امی جان باہر نکلیں تو انہوں نے لائٹ جلا کر اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ یہ رسالہ رکھ دو۔"

"جی!" اس نے فوراً ہی ڈائجسٹ بند کر کے تخت پر رکھ دیا۔ "میں بس یوں ہی دیکھ رہا تھا۔" وہ کھڑا ہو گیا تو انہوں
ے پیار سے دیکھا۔

"بیٹا! تمہارے ابو تمہارے بھلے کے لئے ہی سمجھاتے ہیں۔"

"جی امی! جانتا ہوں۔" وہ مسکرایا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"کبھی غلطی سے نماز بھی پڑھ لیا کرو۔" سمیرا شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"نماز ہی پڑھنے جا رہا ہوں، آپا جان!" شرارت سے کہتا ہوا وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

❁○❁

صبح خلاف معمول وہ سمیرا کے جگانے سے پہلے ہی تیار ہو کر نیچے اُترا تو کچن کی طرف جاتی سمیرا نے آنکھیں
ملتے ہوئے پہلے اسے اور پھر کلاک کو دیکھا۔

"رضی! کیا آج سورج مغرب سے طلوع ہوا تھا؟"

اس نے بھی سمیرا کی نظروں کے تعاقب میں برآمدے میں ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ والی دیوار پر لٹکے کلاک کی طرف
دیکھا۔ ابھی سات بھی نہیں بجے تھے۔ دل ہی دل میں اپنی بے تابی پر شرمندہ ہوتے ہوئے وہ مسکرایا۔

"میں نے سوچا، آج اپنی بہنا کو سیڑھیاں چڑھنے کی تکلیف سے بچا لوں۔"

"مہربانی بھیا! ورنہ کل تو محلے والے ڈر کر گھروں سے باہر نکل آئے تھے کہ کہیں زلزلہ تو نہیں آ گیا۔"

"اتنے زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا تھا تم نے۔" اس نے آنکھیں پھاڑیں اور ہاتھ میں پکڑی فائل، ٹیبل پر رکھتے
ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں تو تم بھی تو گھوڑے گدھے بیچ کر سوتے ہو۔'' سمیرا نے فریج سے ڈبل روٹی اور انڈے نکالے۔''فرائی یا آملیٹ؟''

''فرائی۔'' اس نے ڈائننگ ٹیبل پر پڑا اخبار اُٹھا لیا تھا اور اب سرسری نظروں سے ہیڈ لائن دیکھ رہا تھا کہ اچانک کونے میں ایک چھوٹی سی خبر پر ٹھٹک گیا۔

''کل پولیس نے اسمٰعیل خان کے تین مختلف ٹھکانوں پر چھاپے مارے، لیکن وہ شخص نہیں ملا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پچھلے تین سال سے وہ لوگوں میں گمراہ کن عقائد پھیلا رہا ہے۔ خیال ہے کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔''

'ربش.....' اُس نے اخبار ٹیبل پر رکھ دیا۔'اُس نے کبھی دین کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ یہ صحافی بھی بس یوں ہی چھوڑتے رہتے ہیں۔''

ابو بھی تیار ہو کر باہر آ گئے تھے۔ اس نے سلام کر کے اخبار ان کی طرف بڑھایا۔

ابو اخبار پڑھنے لگے تھے۔ سمیرا نے ناشتہ ٹیبل پر لگا دیا تھا۔ وہ ناشتہ کر کے ابو سے پہلے ہی گھر سے باہر آ گیا۔ ابو نے بھی حیرت سے اسے جاتے دیکھا اور پھر مسکرا کر ناشتہ کرنے لگے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے بچوں پر فخر کیا تھا۔ انہوں نے کبھی انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ چاہے تعلیمی میدان ہو، چاہے غیر نصابی سرگرمیاں۔ وہ دونوں ہمیشہ ٹاپ پر رہتے تھے۔

وہ آگے یونیورسٹی تک جانے کے بجائے پٹرول پمپ کے پاس ہی اُتر گیا۔ آج اُس نے اپنے اسٹاپ پر کھڑے ہو کر اپنی وین یا بس کا انتظار نہیں کیا تھا، بلکہ پہلے خالی ملنے والے رکشہ میں بیٹھ گیا تھا۔ پٹرول پمپ کے پاس اُتر کر وہ بیکری کی طرف بڑھا تھا۔ اُس نے بیکری سے باہر آتی الوینا کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں شاپر تھا۔ جس میں ڈبل روٹی، انڈے اور ناشتے کا دوسرا سامان تھا۔ اس نے آج شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور سر پر دوپٹے کو اس نے چادر کی طرح لیا ہوا تھا۔ اس کا پورا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اسے ہرگز نہ پہچانتا، اگر وہ قریب سے گزرتے ہوئے اس کا نام نہ لیتی۔ اپنا نام سن کر وہ چونکا اور پھر مسکرا کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے قریب پہنچ کر اس نے غیر ارادی طور پر شاپر لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ یہ بھی عورت کے احترام کا ایک طریقہ تھا کہ مرد ساتھ ہو تو وہ عورت کو کوئی بوجھ نہیں اُٹھانے دیتا۔ کچھ عادتیں انسان کے خون میں رچی ہوتی ہیں۔

الوینا نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر مسکرا کر شاپر اُسے پکڑا دیا۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پٹرول پمپ کی پارکنگ میں اُس کی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ وہ والی گاڑی نہ تھی بلکہ یہ ایک چھوٹی اور خاصے پرانے ماڈل کی تھی۔ الوینا نے گاڑی کا لاک کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پسنجر سیٹ والا دروازہ کھولا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ آج الوینا خود گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے چادر پیچھے کھسکا دی اور مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ اس کی دلکش مسکراہٹ میں کھو سا گیا۔ گاڑی میں مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی، جو یقیناً اُس کے ملبوس سے اُٹھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی اندرونِ شہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' جب وہ بانس بازار کے رش میں پھنسے تو اس نے پوچھا۔ الوینا اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''حضرت جی نے بلایا ہے تمہیں۔ آج ایک خاص اجتماع ہے۔''

''لیکن اخبار میں لکھا تھا، شاید وہ ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔''

''اخبار والوں نے اپنے اخبار کا پیٹ بھی تو بھرنا ہوتا ہے۔ وہ بے پَر کی اُڑاتے ہیں۔'' وہ پھر مسکرائی۔

باقی کا راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔ کافی آگے جا کر اُس نے گاڑی ایک جگہ کھڑی کی اور پھر وہ پیدل ہی مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک مکان میں داخل ہوئے۔ عمارت باہر سے بوسیدہ نظر آتی تھی۔ سال خوردہ سا لکڑی کا رنگ اُڑا دروازہ، دو بار ایک مخصوص انداز میں دستک دینے پر کھل گیا تھا۔ وہ الوینا کے پیچھے چلتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دروازے پر موجود شخص نے اس کی فائل اس سے لے لی تھی۔

کمرے میں دیواروں کے ساتھ کرسیاں لگی تھیں اور ان پر پچیس تیس کے قریب لوگ بیٹھے تھے۔ وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں موجود لوگوں میں وہ صرف ایک شخص کو پہچانتا تھا اور وہ تھا، ارباب حیدر، جسے مقربِ خاص کا درجہ حاصل تھا۔ باقی لوگوں میں سے ہو سکتا ہے کوئی پہلے بھی محفل میں موجود رہا ہو، لیکن وہ اُنہیں نہیں پہچانتا تھا۔ اُس کا دھیان بھی ان لوگوں کی طرف نہیں رہا تھا۔ اُس کی توجہ ہمیشہ اسمٰعیل خان پر ہوتی تھی۔ آج بھی وہ اسمٰعیل خان کی خالی کرسی کو دیکھ رہا تھا۔ آج اُس کی کرسی اتنی شان دار نہ تھی، لیکن بہرحال وہ ان کرسیوں سے قدرے مختلف تھی، جس پر وہ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ آج اُس کی کرسی کے دائیں بائیں دو اور کرسیاں بھی خالی پڑی تھیں۔ لیکن ان کی پشت کی اونچائی درمیان والی کرسی سے کم تھی۔

ہمیشہ کی طرح سفید میکسی والی لڑکیاں کچھ دیر بعد ٹرے میں مشروب کے گلاس اُٹھائے سرو کر رہی تھیں۔ مشروب ٹھنڈا اور خوش ذائقہ تھا۔ اس میں سے الائچی اور کیوڑے کی خوشبو آتی تھی۔ ہر بار پہلے سے مختلف مشروب پیش کیا جاتا تھا۔ پہلی محفل میں صندل کا مشروب تھا اور گلاسوں میں نقرئی ذرّے تیرتے تھے۔ ہولے ہولے سب کرسیاں بھر گئی تھیں۔ لڑکیاں خالی گلاس لے کر چلی گئیں تو اسمٰعیل خان کمرے میں داخل ہوا۔ سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ آج وہ اسی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا، جس سے باقی لوگ آئے تھے۔ اس کے پیچھے وہ تینوں تھیں، آسمانی میکسی والی لڑکیاں۔ آج بھی اُنہوں نے آسمانی میکسیاں پہن رکھی تھیں۔ اُن کے کھلے سنہری اور بھورے بال اُن کے شانوں اور پشت پر بکھرے تھے۔ خوب صورتی سے لگا مسکارا اور کاجل کی لکیریں ان کی آنکھوں کو خمار آلود اور خوب صورت بناتی تھیں۔ اسمٰعیل خان کے بیٹھنے کے بعد سب لوگ بیٹھ گئے۔ تینوں لڑکیاں اسمٰعیل خان کی پشت پر کھڑی تھیں۔ یوں کہ ہر لڑکی ایک کرسی کے پیچھے تھی۔ اسمٰعیل خان کے سیاہ چغے کے کناروں پر سلور ایمبرائیڈری تھی اور ان میں سفید نگینے دمکتے تھے۔

''شروع اُس کے نام سے جو سب جہانوں کا آقا اور مالک ہے۔''

اسمٰعیل خان نے اپنی بات کا آغاز کیا۔ لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔

''آج اس ورلڈ سوسائٹی آف مسلم یونٹی کا یہ ایک خصوصی اجلاس ہے۔ اس میں صرف خاص لوگوں کو بلایا گیا ہے، کیونکہ آج کے اجلاس میں مجھے کچھ اہم اعلانات کرنے ہیں اور یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ کچھ لوگ مسلسل ہمارے خلاف منفی پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں، جو کبھی ہماری محفلوں میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ اللہ کے حکم سے، یہ سب لوگ بہت جلد منہ کے بل گریں گے۔ اور ان کا کیا ان کے آگے آئے گا۔ ہم اللہ کے حقیر بندے ہیں، جو مسلمانوں کی اصلاح کا ارادہ کر کے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس ورلڈ سوسائٹی کے قیام کا مقصد ہی مسلمانوں کو، جو گمراہ ہو چکے ہیں، راہِ راست پر لانا ہے۔ آپ سب حضرات اچھی طرح جانتے ہیں، آج پوری دنیا میں مسلمان کیسے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

اے اس کائنات کے خوش قسمت ترین لوگو!.....اے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والو! اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دیوانو!......اُن پر تن من دھن قربان کرنے والے خوش نصیب انسانو!''

احمد رضا بہت دھیان سے اسمٰعیل خان کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی گفتگو سن رہا تھا۔

''اے نیک دل لوگو! آج ہم اپنے مقربینِ خاص میں ایک نوجوان کا اضافہ کرنے والے ہیں اور یہ اعزاز اللہ تعالیٰ نے جسے بخشا ہے، وہ نوجوان ہے، احمد رضا۔ جس کی پیشانی پر عروج کی داستان رقم ہے۔''

تمام لوگوں کی نظریں احمد رضا کی طرف اُٹھی تھیں۔ وہ ایک دم پزل ہوا اور اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اسمٰعیل خان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر دائیں ہاتھ سے اس نے ارباب حیدر کو اشارہ کیا۔ ارباب حیدر اُٹھ کر اس کے قریب آیا اور اسے اُٹھنے کے لئے کہا۔ وہ حیران سا اس کی معیت میں آگے بڑھا۔ ارباب حیدر نے دائیں ہاتھ والی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بائیں ہاتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب بیچ میں اسمٰعیل خان تھا اور دائیں بائیں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ اس کی پشت پر الوینا اس طرح کھڑی تھی کہ اس کی کرسی کی پشت پر رکھا ہاتھ اس کے کندھے کو چھو رہا

تھا۔ اس ہاتھ کا حرارت بھرا لمس پورے وجود میں سنسنی دوڑاتا تھا اور اس کے ریشمی بال جب ہوا کے جھونکوں سے اُڑ کر اس کے رخساروں سے ٹکراتے تو اس کے اندر گدگدی پیدا کرتے تھے۔ وہ سحر زدہ سا بیٹھا تھا اور اسمٰعیل خان کہہ رہے تھے۔

''آپ سب بھی ہمارے خاص مقرب ہیں، ہمیں پیارے ہیں۔ لیکن یہ دونوں جوان جو ہمارے آس پاس بیٹھے ہیں ان کا مرتبہ آپ سے تھوڑا اس لئے بلند ہے کہ جس روز ہمیں نیابتِ مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نصیب ہوئی تھی، اُس رات یہ دونوں نوجوان ہمارے نزدیک، ہمارے پاس تھے۔ سو انہیں یہ قرب حاصل ہوا۔ ہم اللہ کے پیغمبر ہیں، آپ لوگوں کے لئے۔''

حاضرین میں تھوڑی سی بے چینی پیدا ہوئی تھی۔ اور تب ہی حاضرین میں ایک شخص نے ہاتھ کھڑا کیا۔

''جناب! آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ نبوت میرے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہے۔ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔''

اُس نے ہاتھ اونچا کر کے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہم نے خود کو نبی نہیں کہا، پیغمبر کہا ہے۔''

''لیکن جناب......'' اب بیٹھے بیٹھے اس نے کہا۔ ''تمام نبیوں اور پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے بعد ختم ہو گیا۔''

''بجا فرمایا آپ نے محترم! میری جان آقائے نامدار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہو۔ آپ میری بات سمجھے نہیں اس محفل کے اختتام پر آپ جتنے دل چاہے سوال کیجئے گا۔ میں آپ کے سارے ابہام دُور کر دوں گا۔ اب دوبارہ گفتگو سے پہلے ایک بار درود پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وِرد کر لیں۔''

محفل میں موجود سب لوگوں نے درود پاک کا وِرد کیا۔ احمد رضا نے غور سے سوال کرنے والے جوان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی سیاہ داڑھی خوب سجی ہوئی تھی اور اس کی شخصیت کے حُسن میں اضافہ کرتی تھی۔ اس کے ماتھے پر سجدوں کا نشان دمکتا تھا۔ احمد رضا دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ الوینا کی اُنگلیوں کا دباؤ اس کے کندھوں پر بڑھ گیا۔ اسمٰعیل خان کہہ رہا تھا۔

''مدتوں سے اس آرزو میں جیتا تھا کہ آقا سیّدنا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار نصیب ہو، لیکن پھر سوچتا، کہاں میں گلیوں کی دھول اور خاک...... اور کہاں دو جہاں کے سردار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت۔ آرزو تو صرف زیارت و دیدار کی تھی۔ لیکن سبحان اللہ! ایسا دیدار، ایسی زیارت نصیب ہوئی کہ صرف اس جہاں میں نہیں، صرف آخرت میں نہیں، صرف لامکاں میں نہیں، ثم الوریٰ، ثم الوریٰ، ثم الوریٰ وصل قائم رہے۔''

کمرے میں ایک دم نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ لیکن سیاہ داڑھی والا جوان اُٹھ کر باہر جا رہا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر، جس پر سجدوں کا نشان دمکتا تھا، ناگواری شکنیں تھیں۔

''اور ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں کہ جن کے پاس حق پہنچتا ہے اور وہ حق کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اندھے، گونگے اور بہرے کہا ہے۔''

نوجوان دروازے کے پاس جا کر رکا تھا۔

''نعوذ باللہ! یہ شیاطین کی محفل ہے اور ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ فتنہ بپا کرتے رہیں گے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کو گمراہ کرتے رہیں گے۔''

احمد رضا نے اس کی پوری بات نہیں سنی تھی۔ الوینا کا دباؤ اس کے کندھوں پر بڑھ گیا تھا اور اس نے اپنا چہرہ کچھ اس طرح آگے جھکایا تھا کہ اس کی ٹھوڑی اس کے سر کو چھو رہی تھی۔ وہ ایک دم مدہوش سا ہو گیا۔ اس کے بعد اسمٰعیل خان

نے کیا کہا، اس نے نہیں سنا۔

الوینا کے وجود سے اُٹھنے والی خوشبو اس پر سحر طاری کر رہی تھی۔ کب اسمٰعیل خان نے اپنی بات ختم کی، اس نے کیا کیا کہا؟ احمد رضا نے نہیں سنا تھا۔ وہ سن بھی کیسے سکتا تھا؟ اس کا پورا وجود تو الوینا کی طرف متوجہ تھا۔ اسمٰعیل خان نے بات ختم کر دی تھی۔ اب وہ سب لوگ اُٹھ اُٹھ کر جا رہے تھے۔ باری باری سب اسمٰعیل خان کے قریب آ کر اس کا ہاتھ چومتے اور چلے جاتے۔ احمد رضا نے بھی اُٹھنا چاہا، لیکن الوینا نے دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے دباتے ہوئے اسے اٹھنے سے روکا۔ پھر تقریباً اس کے کان کے قریب منہ لگاتے ہوئے سرگوشی کی۔

''آپ ابھی رُکیے احمد رضا! حضرت جی نے آپ کو کچھ عطا کرنا ہے۔''

وہ اُٹھتے اُٹھتے بیٹھ گیا۔ کان کے قریب اس کا رخسار ایک انجانی حدت سے تپ اٹھا۔ کمرہ خالی ہو گیا تو اسمٰعیل خان بھی دونوں خادماؤں کے ساتھ چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف الوینا اور احمد رضا تھے۔ الوینا اب پیچھے سے ہٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے لبوں پر بڑی دلکش سی مسکراہٹ تھی۔

''بہت مبارک ہو۔'' اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھایا۔ خواب کی سی کیفیت میں احمد رضا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہولے سے دبا کر چھوڑ دیا۔

''تھینک یُو۔''

''آپ کو بہت جلد بڑا مقام ملا۔ اتنی جلدی آج تک کوئی اس مقام پر نہیں پہنچا۔'' وہ اُسے سراہ رہی تھی۔

''اس خوشی میں آپ سے ٹریٹ لینی ہے۔''

''ضرور۔'' وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''کب اور کہاں؟ اس کا فیصلہ آپ کر دیں گی۔'' وہ مسکرایا۔

تب ہی دوسری لڑکی نے آ کر الوینا کے کان میں کچھ کہا۔ الوینا معذرت طلب نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ اب دوسری لڑکی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ لڑکی الوینا سے بھی زیادہ حسین اور ہوشربا تھی۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا کہ احمد رضا کے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑتی تھی۔ وہ مسحور سا اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک وہ سیدھی ہو گئی۔

''حضرت جی اس وقت اپنے رب کے حضور کھڑے پوری اُمت کے لئے دعا گو ہیں، سو اب وہ آپ سے نہیں مل سکیں گے۔ لیکن کچھ اور لوگ ہیں، جو آپ سے ملنے کے شائق ہیں اور حضرت جی نے مراقبے میں جانے سے پہلے حکم دیا تھا کہ آپ کو ان سے ملوا دیں۔''

وہ کھڑا ہو گیا اور سحر زدہ سا چلتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں ایک گول میز کے گرد چار افراد بیٹھے تھے۔ پانچویں کرسی خالی تھی۔ لڑکی نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چاروں افراد نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا۔

''یہ معتقد خاص ہیں۔'' لڑکی نے تعارف کرایا۔ ''یہ چاروں افراد مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اور اسلام سے متاثر ہیں۔ ابھی یہ باقاعدہ طور پر حلقۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے، تاہم......'' وہ مسکرائی۔ ''حضرت جی چاہتے ہیں کہ آپ ان کے سوالوں کے تسلی بخش جواب دیں۔''

''میں......'' احمد رضا گھبرایا۔ ''میرا علم تو خود ناقص ہے۔ میں اسلام کے متعلق بہت زیادہ نہیں جانتا۔ میں اتنا ہی جانتا ہوں، جتنا کہ ایک عام مسلمان جانتا ہے۔ نماز، روزہ، حج......''

لڑکی نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''حضرت صاحب اس سلسلے میں خود بھی آپ کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔''

چاروں افراد نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا اور پھر سر ہلایا۔ لڑکی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''مجھے اونیل رچی کہتے ہیں۔'' ایک نے تعارف کروایا۔ وہ بے حد صاف اُردو میں بات کر رہا تھا۔ ''یہ جان ہے، یہ کشن داس اور یہ داؤد ہے۔''

چاروں نے اپنے اپنے نام پر ہلکا سا سر خم کر کے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔

''ہم ابھی 'ہاں' اور 'نہ' کے درمیان میں لٹک رہے ہیں۔ اور اس کے لئے ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''میں بھلا آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میں تو طفلِ مکتب ہوں۔''

''چلیں، یہ بھی ہم کبھی آپ کو بتا دیں گے۔'' رچی مسکرا دیا۔ ''ابھی تو آپ اپنا تعارف کرائیں۔''

پھر وہ اس سے مختلف سوال کرتے رہے۔ اس کا تعلیمی پس منظر، اس کا خاندان، اس کے ابو کی جاب۔ غرض بے شمار سوالات تھے۔ زیادہ سوال رچی کر رہا تھا۔ باقی تینوں افراد سن رہے تھے۔ احمد رضا حیران سا تھا کہ وہ اس سے اس قسم کے سوال کیوں کر رہے ہیں۔ اگر وہ اسلام سے متاثر ہو کر اس دین میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو انہیں دین کے متعلق سوالات کرنے چاہئیں تھے، نہ کہ اس کے متعلق۔ ابھی وہ یہ بات اونیل رچی سے کرنے ہی والا تھا کہ الوینا ہولے سے دروازہ کھول کر اندر آئی اور پھر مسکرا کر ان چاروں افراد سے معذرت طلب انداز میں کہا۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو حضرت جی اس وقت احمد رضا سے کچھ خاص گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے آرام کا وقت ہے۔ آپ حضرات پھر کبھی تشریف لے آیئے گا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد آپ کی تشفی ہو جائے گی اور آپ ہمارے دین کو سارے مذاہب سے بہترین پائیں گے۔''

چاروں کھڑے ہو گئے تھے۔

''ہم مطمئن ہیں میڈم! بہت حد تک ہماری تشفی ہو گئی ہے۔'' اونیل رچی نے کہا تھا۔

احمد رضا حیران ہوا کہ انہوں نے اس طرح کا تو کوئی سوال کیا ہی نہیں تھا جو ''دینِ اسلام'' کے متعلق ان کے ابہام دور کرتا۔ پھر تشفی کیسے ہو گئی؟ لیکن اس نے الوینا سے کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ کمرے سے نکل کر وہ فوراً ہی ایک اور کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ اس کمرے میں ایک دروازہ تھا جو دوسرے کمرے میں کھل رہا تھا۔ یہ مکان باہر سے جتنا بوسیدہ نظر آ رہا تھا، اندر سے ایسا نہیں تھا۔

الوینا نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''اندر تشریف لے جائیں۔ حضرت جی آپ کے منتظر ہیں۔ مراقبے کے بعد وہ اکثر بہت کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے زیادہ دیر گفتگو نہیں کریں گے۔''

اسمٰعیل خان نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔

''پہلے تو ہماری طرف سے مبارکباد قبول کریں کہ اللہ نے آپ کو یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے۔ پھر ہماری طرف سے یہ قبول کریں۔ یہ آج سے پہلے ہمارے صرف دو مقربین کے پاس ہے۔ آپ تیسرے خوش نصیب ہیں۔'' اس نے ایک سبز اور سیاہ رنگ کا عمامہ اسے عطا کیا۔

احمد رضا کھڑا تھا۔

''بیٹھ جاؤ احمد رضا! ہمیں ابھی ابھی حکم ملا ہے کہ ہم کچھ دنوں کے لئے پردہ کر لیں۔ اس لئے ہماری، آپ کی ملاقاتیں کچھ عرصہ شاید نہ ہو سکیں گی۔ لیکن رابطہ بہر حال رہے گا۔ ہم نے سوچا تھا کہ کچھ دنوں تک ہمیں ایک غیر ملک میں جانا ہے اور آپ ہمارے ہمراہ چلیں گے۔''

''میں؟'' احمد رضا گھبرایا۔ ''میری پڑھائی کا حرج ہو گا۔ اور پھر میرے ابو اس کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔''

''جانتے ہیں۔ جانتے ہیں۔ ہم سے کون سی بات چھپی ہے؟ اسی لئے تو ہم نے آپ کو ساتھ لے جانے کا ارادہ موقوف کر دیا ہے۔ لیکن ایسے دن آنے والے ہیں جب ہر سفر میں آپ ہمارے ہمراہ ہوں گے۔''

پھر اس نے آہستہ سے تالی بجائی۔ الوینا جیسے دروازے کے باہر ہی کھڑی تھی۔ دوسرے لمحے وہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک قیمتی موبائل تھا۔ اسمٰعیل خان کے اشارے پر اس نے وہ موبائل فون اس کی طرف بڑھا دیا

''یہ آپ کی نذر...... اس سے رابطے میں آسانی رہے گی۔''

اسمٰعیل خان اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جھجک گیا۔ اس نے فون لینے کے لئے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا

''لے لیں۔ حضرت جی کا دیا تحفہ ٹھکرانا نہیں چاہئے۔'' الوینا نے سرگوشی کی۔

اس نے موبائل فون لے لیا۔ اسمٰعیل خان نے ہاتھ اونچا کیا۔ مطلب کہ ملاقات ختم۔ وہ الوینا کے ساتھ باہر آ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا داخلی دروازے تک آیا۔ الوینا نے اس کی کالج فائل کے ساتھ ایک چھوٹا سا جدید بریف کیس بھی اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟'' وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔

''یہ رچی نے آپ کو گفٹ دیا ہے۔'' الوینا کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کے ہونٹوں کے دلکش کٹاؤ میں لمحہ بھر کے لئے کھو سا گیا۔

''یہ لے لو احمد رضا! دوستوں کے تحفے ٹھکرایا نہیں کرتے۔''

''لیکن اس میں کیا ہے؟'' وہ جھجک رہا تھا۔

''معلوم نہیں۔'' الوینا تھوڑا سا آگے بڑھی۔ یوں کہ اس کا بازو اب اس کے بازو سے مس کر رہا تھا۔ وہ پزل سا اس لمحہ رہا تھا۔ ''رچی کہہ رہا تھا، آپ کے اور اس کے درمیان آج جس دوستی کا آغاز ہوا ہے، یہ اس دوستی کے نام حقیر سا تحفہ ہے۔''

وہ خاموش اور اُلجھا ہوا تھا۔ الوینا نے داخلی دروازہ کھولا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر آئے۔ الوینا پھر شلوار قمیص اور چادر نما دوپٹے میں ملبوس تھی۔ اسی گاڑی میں واپسی کا سفر شروع ہوا۔

''کہاں جانا ہے آپ کو، یونیورسٹی یا گھر؟''

''گھر۔'' احمد رضا کا جواب مختصر تھا۔

''آپ کو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا احمد رضا!'' جب بانس بازار کے رش سے نکل کر وہ قدرے کم رش والے علاقے میں آئے تو الوینا نے کہا۔

خوش قسمتی...... وہ تو ایک عام سا لڑکا تھا۔ کوئی بہت زیادہ مذہبی بھی نہ تھا۔ پھر...... اُس نے گود میں پڑے عمامے کو دیکھا۔ اسمٰعیل خان کون تھا؟ کیا وہ واقعی اللہ کا برگزیدہ بندہ تھا؟ اور مسلمانوں کی اصلاح کے لئے آیا تھا؟...... اور کیا اللہ نے اُسے بھی اس نیک مقصد میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے منتخب کیا تھا؟

مختلف اوقات میں ہونے والی اسمٰعیل خان کی گفتگو اس کے ذہن میں آ رہی تھی۔ پھر اس کے ذہن میں اس سیاہ داڑھی والے نوجوان کی آواز آئی۔

''یہ شیاطین کی محفل ہے۔''

الوینا نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دو تین بار اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھا، لیکن اس نے پھر اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس کے گھر کے قریب روڈ پر اس نے گاڑی روک لی۔

''اندر گھر تک گاڑی چلی جائے گی؟''

''چلی تو جائے گی، لیکن آپ ادھر ہی اُتار دیں مجھے۔'' وہ گاڑی سے اُترا تو الوینا نے کہا۔

''یہ عمامہ آپ ادھر ہی چھوڑ دیں۔ اس کی ضرورت آپ کو وہاں اجلاس میں ہی ہو گی۔ آج کے بعد آپ اجلاس میں عمامہ پہن کر حضرت جی کے برابر والی کرسی پر بیٹھیں گے۔'' وہ مسکرائی اور پھر جھک کر پسنجر سیٹ کے سامنے پڑا بریف

کیس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔
وہ کہنا چاہتا تھا کہ اسے بھی آپ لے جائیں۔ میں اسے کہاں لے کر جاؤں گا؟ لیکن وہ گاڑی زن سے آگے بڑھ لے گئی۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑا رہا۔ پھر وہ بریف کیس اٹھائے گھر کی طرف چل پڑا۔ اگر کسی نے پوچھا تو کہہ دوں گا، جنید کا ہے۔ یا کوئی بھی بہانہ بنالوں گا۔ لیکن اتفاق سے دروازہ صفائی والی نے کھولا تھا۔ سمیرا ابھی تک کالج سے نہیں آئی تھی اور امی کچن میں تھیں۔ وہ سیدھا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔
''کون ہے شمو؟'' کچن سے امی نے پوچھا۔
''بھائی آئے ہیں اور اوپر چلے گئے ہیں۔'' شمو نے کھڑکی جھاڑتے ہوئے اطلاع دی۔
''اچھا!'' وہ مطمئن سی ہو کر اپنا کام کرنے لگیں۔
کمرے میں آکر اس نے بریف کیس بیڈ پر پھینکا۔
''شکر ہے! وہ جاسوسِ اعظم، عمران کی سیکرٹری گھر پر نہیں تھی۔ ورنہ......''
اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے جیب سے موبائل فون نکالا اور کچھ دیر تک حیرت وخوشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے یونیورسٹی فیلوز میں سے صرف جنید کے پاس اس طرح کا موبائل تھا، جو اس نے حال ہی میں لیا تھا۔ اس سے پہلے اس کے پاس بھی عام سا موبائل تھا۔ اُس نے فون کے مختلف فنکشنز چیک کئے اور اسے تکیے کے نیچے رکھ کر بریف کیس اٹھا کر گود میں رکھا۔ بریف کیس کے نمبرز سیٹ تھے۔ جونہی اس نے دبایا، وہ کھٹاک سے کھل گیا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بریف کیس میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں پڑی تھیں۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے انہیں گنا۔ وہ پچاس گڈیاں تھیں۔
''پچاس لاکھ......'' اس نے خوف زدہ ہو کر بریف کیس بند کر دیا۔ ''میں یہ نہیں لے سکتا۔ یہ میں کل ہی واپس کر دوں گا۔ لیکن فی الحال اسے چھپانا ہے۔ کہاں چھپاؤں؟''
سمیرا کا کچھ نہیں پتہ تھا۔ کب، کس وقت، کہاں چھاپہ مار دے۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی بھی ایسی جگہ نہ تھی، جو سمیرا کی دسترس سے باہر ہوتی۔ کپڑوں کی الماری میں وہ اکثر اس کے کپڑے سنبھال کر رکھتی تھی۔
'ایک ہی دن کی تو بات ہے۔' اس نے بالآخر اسے اپنے بیڈ کے نیچے دھکیل دیا۔ موبائل کو ایک شرٹ میں لپیٹ کر کپڑوں میں سب سے نیچے رکھ دیا اور قدرے مطمئن سا ہو کر بیڈ پر بیٹھ کر ان چاروں کے متعلق سوچنے لگا۔
حسن رضا نے کئی دن تک احمد رضا کی مصروفیات کو چیک کیا تھا۔ وہ یونیورسٹی سے سیدھا گھر آتا تھا۔ عموماً وہ ان کے آفس سے آنے سے پہلے آچکا ہوتا تھا۔ رات کا کھانا وہ سب اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ کھانا کھا کر احمد رضا کبھی تو سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا، کبھی ٹی وی دیکھتے ہوئے سمیرا سے کچھ گپ شپ لگا لیتا۔ بے حد مطمئن ہو کر انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ احمد رضا نے ان کی بات سمجھ لی تھی اور اس جھوٹے فراڈی انسان کے چنگل سے بچ گیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ شخص جو دوسروں کے لئے انڈر گراؤنڈ ہو گیا تھا، احمد رضا کی اس سے ہر دوسرے تیسرے دن ملاقات ہو جاتی تھی۔ لیکن اب یہ ملاقاتیں صبح صبح ہوتی تھیں۔ جب وہ یونیورسٹی جاتا تھا، الوینا اسے کبھی بیکری کے پاس سے اور کبھی پٹرول پمپ سے پک کرتی تھی۔
''ورلڈ سوسائٹی آف اسلام'' کے دو تین اجلاس بھی ہوئے تھے، جن میں اسمٰعیل خان نے اسے اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھایا تھا اور اس کے سر پر وہ عمامہ بندھا تھا، جو اسمٰعیل خان نے اسے عطا کیا تھا۔ ان مجالس میں زیادہ تر اسلام کے بارے میں باتیں کی گئی تھیں اور دنیائے اسلام میں جو مسئلے درپیش تھے، انہیں زیر بحث لایا گیا تھا۔ احمد رضا کے دل میں جو شکوک پیدا ہوئے تھے، خود بخود ختم ہو گئے تھے۔ وہ اسمٰعیل خان کے لئے اپنے دل میں بے حد عقیدت محسوس کرنے لگا تھا۔
رچی نے گفٹ والے پیسے واپس لینے سے انکار کر دیا تھا۔

''میں تمہاری پسند کا علم نہیں تھا، اس لئے اب تم اپنی پسند سے گفٹ خرید لو۔ رچی دوستوں کو گفٹ دے کر واپس نہیں ...لکی فون پر ہوئی تھی۔ اس کی دوبارہ ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن الوینا نے اسے مشورہ دیا تھا کہ یہ رقم وہ ...ٹ میں جمع کروا دے۔ اس نے الوینا کے کہنے پر اپنا اکاؤنٹ کھلوا لیا تھا اور کم از کم اسے اب یہ پریشانی نہیں ...ی روز سمیرا پر اس کے کمرے کی صفائی کا بھوت سوار ہوا تو کیا ہوگا۔ وہ اسے اتنی رقم کے متعلق کیا کہے گا؟ وہ ...ے معاملے میں کسی سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے آپ کو خود ہی دلیلیں دے کر مطمئن کر لیتا تھا۔ وہ اب ...ں کو ابھوائے کرتا تھا۔

اس روز وہ یونیورسٹی سے آ کر الوینا سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ پہلی بار تھا، جب وہ خود الوینا کو فون کر رہا تھا، ...وہ فون کرتی تھی۔ تین دن سے اس نے فون نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ کسی اجلاس میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ الوینا ...ں ریسیو نہیں کیا تھا۔ شاید مصروف ہوگی۔ اس کا خیال تھا، فارغ ہو کر وہ خود ہی رابطہ کرے گی۔ اس نے کہا تھا کہ ...ی اس کی بات نہ ہو سکے تو اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اس سے خود رابطہ کرے گی۔

...ام کو وہ سو کر اٹھا تو بہت فریش تھا۔ چائے کے بعد وہ دیر تک نیچے بیٹھا سب کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اس بات ...بھر کہ آج آخری بار ان سے باتیں کر رہا ہے۔ آج کے بعد وہ یوں ان کے درمیان بیٹھ کر کبھی بات نہیں کر سکے ...اور آج کے بعد پھر کبھی سمیرا کے ہاتھ کی بنی چائے نہیں مل سکے گی۔ آج کے بعد وہ سب کے ساتھ آخری بار بیٹھ کر ...کھانا کھائے گا۔

...ح سویرے سب رحیم یار خان جا رہے تھے، کسی شادی میں شرکت کے لئے۔ سمیرا نے اصرار کیا تھا کہ وہ بھی پروگرام ...لے۔ دو تین دن کی تو بات ہے، کل یوں بھی سنڈے ہے۔

...ن رضا نے بھی کہا تھا۔

''چلے چلو یار! بارات اٹینڈ کر کے آ جانا۔ سب رشتہ داروں سے مل ملا بھی لینا۔''

...لن اس کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔

''نہیں بھئی! میرے آج کل بہت ضروری لیکچرز ہیں۔ میں ایک لیکچر بھی مس نہیں کر سکتا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا! پڑھائی پہلے ہے۔''

رات کو وہ ابو سے بائیک لے کر سمیرا کو آئس کریم کھلانے لے گیا تھا۔ آج کتنے دن بعد وہ دونوں آئس کریم کھانے ...گئے۔

''دیکھنا سمو! ایک دن میں تمہیں ابو کی بائیک کے بجائے اپنی گاڑی میں آئس کریم کھلانے لے جاؤں گا۔''

''اس وقت خواب مت دیکھیں۔ خواب دیکھتے دیکھتے عالم بالا میں ہی نہ پہنچ جائیں۔'' سمیرا کے پاس حسب معمول اس کی بات کا جواب موجود تھا۔

''یہ خواب نہیں سمو! بہت جلد واقعی میں تمہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر لایا کروں گا، آئس کریم کھلانے۔''

''چلو! میں اس وقت کا انتظار کروں گی۔''

اور وہ وقت کبھی نہیں آنا تھا۔ سمیرا کو آج کے بعد کبھی اس کے ساتھ آئس کریم کھانے نہیں آنا تھا۔ نہ بائیک پر بیٹھ کر، ...گاڑی میں۔

صبح سب لوگ بہت سویرے رحیم یار خان کے لئے نکل گئے۔ اس نے سوتی جاگتی کیفیت میں سمیرا کی ہدایات سنی ...یں۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ اس نے کیا کیا بنا کر فریج میں رکھ دیا ہے اور اس کو بس گرم کرنا ہے۔ روٹی تندر سے لانی ...ہے۔ ناشتہ صبح شمو بنا دے گی۔

''اچھا، ٹھیک ہے۔''

وہ دروازہ لاک کر کے اپنے کمرے میں آیا اور پھر گہری نیند سو گیا۔ اتوار کو یوں بھی وہ دیر تک سوتا تھا۔ اس کی آنکھ شمو کے آنے پر کھلی تھی، جو بیل بجانے کے ساتھ ساتھ دونوں ہاتھوں سے دروازہ بھی پیٹ رہی تھی۔

وہ باتھ لے کر تیار ہو کر نیچے آیا تو شمو نے ناشتہ ٹیبل پر لگا دیا تھا اور خود مزے سے فرائی انڈے کے ساتھ پراٹھا کھا رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ شمو کے کام کرنے تک وہ نیچے ہی تخت پر بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ شمو کے جانے کے بعد وہ اوپر آیا تو اس کا موبائل بج رہا تھا۔ دوسری طرف الوینا تھی۔

''ایک ایمرجنسی اجلاس ہے۔ تم اپنے اسٹاپ پر پہنچو۔ لارا تمہیں پک کر لے گی۔''

وہ فوراً ہی گھر لاک کر کے نکل کھڑا ہوا۔ وہی اندرونِ شہر والا گھر تھا۔ بڑے کمرے میں کرسیاں دیوار کے ساتھ لگی تھیں۔ اسمٰعیل خان پہلے سے ہی اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بائیں طرف والی کرسی پر جو شخص بیٹھا تھا، وہ اس کے لئے نیا تھا۔ اس کی داڑھی خاصی لمبی تھی۔ سر پر پگڑی پہنے تھا اور گھیر دار شلوار قمیض پر سبز رنگ کی افغانی جیکٹ تھی۔

''یہ طیب خان ہے۔ اس نے مسلم ایڈ کے لئے بہت کام کیا ہے اور جہادِ افغانستان کا ایک جری مجاہد ہے۔'' اُس نے بائیں طرف والی کرسی پر بیٹھے شخص کا تعارف کروایا۔

''جہاد چونکہ ختم ہو چکا ہے، آج سے یہ ہمارے لئے کام کرے گا۔ عزیز دوستو! بڑے بڑے نبیوں اور پیغمبروں پر مشکل وقت آتے رہتے ہیں۔ سو آج ہم پر بھی مشکل وقت آ گیا ہے۔ جب تک ممکن ہو سکا، ہم یہاں رہے۔ آج کسی وقت ہم یہاں سے ہجرت کر جائیں گے۔ کہاں؟ یہ ابھی بتانے کا حکم نہیں ہے۔ ہم نے احمد رضا اور طیب خان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ یہ ہمارے نائب ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ پہلے کی طرح ''ورلڈ سوسائٹی آف اسلام'' کے ماہانہ اجلاس میں شرکت کرتے رہیں۔ ہم نے احمد رضا کو خلافت عطا کر دی ہے۔''

اسمٰعیل خان نے ایک لمبی تقریر کی تھی۔ پھر لوگ اُٹھ اُٹھ کر اس سے ملنے لگے۔ اس سے دعا کرنے کے لئے کہہ رہے تھے اور جلد واپسی کی درخواست کر رہے تھے۔ آج افراد کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔ یہ سب مریدانِ خاص تھے۔ احمد رضا کو الوینا اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہاں وہی چاروں اسی طرح گول میز کے گرد بیٹھے تھے۔ رچی نے اُٹھ کر گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور گفٹ قبول کر لینے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ آج ان کے درمیان چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رچی نے کاغذوں کا ایک پلندہ الوینا کو دیا تھا۔

''یہ پمفلٹ تقسیم کروانے ہیں۔''

الوینا نے پمفلٹ لے لئے اور وہ حضرت جی سے ملاقات کرنے چلے گئے۔ الوینا اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ الوینا نے ہی اسے بتایا تھا کہ آج رات اگر وہ ٹھہر جائے تو مقربینِ خاص کو شرابِ طہور پلائی جائے گی۔ اسے شرابِ طہور کے متعلق تجسس تھا۔ اس نے وہاں ٹھہرنے پر ہامی بھر لی تھی۔ آج گھر میں کوئی نہیں تھا۔

باقی کا سارا دن اس نے الوینا کے ساتھ گزارا تھا۔ ایک دو بار اس نے لارا اور مرینہ کو بھی دیکھا تھا۔ الوینا کا کمرہ چھوٹا سا تھا، لیکن صاف ستھرا تھا۔ فرنیچر قیمتی تھا اور کمرے میں بہت مدھم لیکن سحر انگیز فریشنر کی خوشبو پھیلی تھی۔

الوینا نے اسے شرابِ طہور پیش کی تھی۔ یہ شراب نہیں تھی، لیکن اس میں ہلکا سرور تھا۔ الوینا آج اس پر بہت مہربان تھی۔

وہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے، جانے کن جہانوں کی سیر کر رہا تھا۔ ہلکے سرور سے اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اس رات اس نے اپنے ایمان، ضمیر، کردار سب کا سودا کر لیا تھا۔ اس نے الوینا کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر اعتراف کیا تھا کہ اسمٰعیل شاہ سچا نبی ہے (نعوذ باللہ) اور اسے اللہ نے گمراہ انسانوں کی اصلاح کے لئے بھیجا ہے۔ اس صبح اسے ایک گاڑی اور نیو گارڈن ٹاؤن میں ایک گھر کی چابی عطا کی گئی۔

''یہ گھر تمہارا ہے اور مستقبل میں تمہیں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''
اگلی رات بھی ایسے ہی گزری تھی۔ وہ سرور طاری کرتا مشروب بار بار پینے کو جی چاہتا تھا۔لیکن الوینا نے تیسرے گلاس کے بعد صراحی اٹھالی تھی۔
دوسری رات گزار کر صبح وہ گھر جانے کے لئے تیار ہوا۔الوینا اس کے ساتھ ہی تھی۔ کیونکہ اس نے رحیم یار خان فون کر کے پتہ کیا تھا۔سمیرا نے اسے بتایا تھا کہ وہ مزید دو دن رُکیں گے۔ گو شادی آج ولیمہ کے فنکشن کے بعد ختم ہو جانی تھی۔ لیکن وہ لوگ اتنے عرصہ بعد رحیم یار خان آئے تھے اور امی سب رشتہ داروں سے ملنا چاہتی تھیں۔
''جتنے دن دل چاہے رہو اور میری فکر مت کرو۔ میں مزے میں ہوں۔''
سمیرا کا نصیحت نامہ سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا اور اب الوینا کے ساتھ گھر سے کچھ کپڑے لینے آیا تھا۔الوینا کو گاڑی میں ہی چھوڑ کر وہ گھر آیا تھا۔ گھر لاکڈ نہیں تھا۔ وہ ٹھٹکا۔
'کیا وہ آ گئے ہیں؟' اس نے سوچا۔'ان کے پاس چابیوں کا دوسرا سیٹ تھا۔ ہوسکتا ہے، سمیرا نے مذاق کیا ہو۔لیکن آج تو ولیمہ تھا۔آج اس وقت تو وہ کسی صورت بھی نہیں آ سکتے تھے۔ ہاں! شام تک ممکن تھا، آ جاتے۔'
اس نے دروازے کو دھکا دیا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے برآمدے میں حسن رضا بیٹھے تھے۔
''ابو! آپ آ گئے......اور......'' اس نے سمیرا اور امی کی تلاش میں نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔
حسن رضا کا چہرہ سپاٹ تھا۔ جب وہ بولے تو ان کے لہجے میں پتھروں کی سی سنگینی تھی۔ وہ کب آئے تھے اور کب سے یہاں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے؟ وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔
''یہ......'' انہوں نے دائیں طرف پڑا اخبار اٹھا کر ایک خبر پر انگلی رکھی۔ ''احمد رضا! یہ تم ہی ہو؟''
وہ ابو سے ڈرتا تھا۔ حالانکہ آج تک انہوں نے کبھی اسے اُنگلی تک نہ لگائی تھی۔ وہ بچوں کو مارنے کے خلاف تھے۔ وہ ابو سے ڈر کر انکار کر دیتا، یہ ممکن تھا۔ لیکن اس وقت رات کے سرور کا اثر ابھی باقی تھا۔ آنکھوں میں ہلکا سا خمار تھا اور دماغ بہت گہرائی تک سوچنے سے قاصر تھا۔
خبر میں لکھا تھا۔
''نبوت کا جھوٹا دعوے دار، اسمٰعیل کذاب فرار ہو گیا۔ لیکن اپنا خلیفہ، احمد رضا نامی لڑکے کو بنا گیا۔ جو یو۔ ای۔ ٹی کا اسٹوڈنٹ ہے۔ احمد رضا نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ......''
احمد رضا نے خبر پڑھ لی تھی اور سر جھکائے کھڑا تھا۔
''ابو! میں......''
''ہاں یا نہ میں جواب دو۔'' ان کے لہجے میں پتھروں کی سی سنگینی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ لمحہ بھر وہ اسے دیکھتے رہے پھر انہوں نے کسی شکستہ خوردہ شخص کی طرح سر جھکا لیا۔ ان کے کندھے جھک گئے۔ کل شام انہوں نے رحیم یار خان کے بازار میں ایک دکاندار کے پاس کھڑے کھڑے اخبار دیکھا تھا۔
'نہیں......!' انہیں یقین نہیں آیا تھا۔ یہ ان کا احمد رضا نہیں ہوسکتا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے یونیورسٹی سے آ کر وہ کہیں نہیں گیا تھا۔
'یو۔ ای۔ ٹی میں صرف ایک ہی تو احمد رضا نہیں ہے۔' انہوں نے سینکڑوں بار دل کو سمجھایا تھا۔ 'لیکن پھر اس رات پولیس کی آمد......اسمٰعیل خان کا نام؟'
انہوں نے ایک ضروری کام کا بہانہ کیا اور ولیمہ کی دعوت چھوڑ کر واپس آ گئے تھے۔ سارا راستہ وہ دعائیں مانگتے آئے تھے کہ یہ کوئی اور احمد رضا ہو۔
سارے راستہ انہوں نے اللہ سے التجائیں کی تھیں کہ یہ جھوٹ ہو۔ لیکن یہ جھوٹ نہیں تھا۔ احمد رضا ان کے سامنے سر

جھکائے کھڑا تھا۔

'یا اللہ! مجھے ہمت عطا کر۔ میں بہت کمزور انسان ہوں۔ ہر انسان کی طرح اولاد کی محبت کے معاملے میں مجبور اور بے بس۔ یا اللہ! جو فیصلہ میں نے رحیم یار خان کے بازار میں کھڑے کھڑے کیا تھا، مجھے اس پر قائم رہنے کی ہمت عطا فرما۔'

احمد رضا نے کھڑے کھڑے اپنی جیب کو ٹٹولا، جس میں نیو گارڈن ٹاؤن والے گھر کے مین گیٹ کی چابی تھی اور اس گھر کے پورچ میں کھڑی زیرو میٹر گاڑی اس کی تھی۔ وہ حسن رضا کو یہ بتا کر خوش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر اس نے اپنا ہاتھ جیب پر سے ہٹا لیا۔ جس حسن رضا کو وہ جانتا تھا، وہ ایسی باتوں سے خوش ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے ساری زندگی رزق حلال کمایا تھا اور اُنہیں حلال رزق ہی کھلایا تھا۔ پھر وہ ابو کو کیسے راضی کرے؟ کیسے ان کا غصہ کم کرے؟

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ حسن رضا نے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں ایک دم ہارے ہوئے سپاہی کا حوصلہ تھا، جو اپنی آخری پونجی بھی داؤ پر لگا کر جیتنے کی سعی کرے۔

''اوپر تمہارے کمرے میں......'' وہ بولے تو ان کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ ''میں نے تمہارا سارا سامان پیک کر دیا ہے ایک اٹیچی کیس میں۔ اور بیگ میں تمہاری کتابیں ہیں، جو بیڈ پر پڑا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی تمہاری چیز ہو تو لے کر نیچے آ جاؤ۔''

اس نے حیرت سے حسن رضا کو دیکھا۔ وہ ان کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

''اوپر جاؤ اور اپنا سامان لے کر اس گھر سے ہمیشہ کے لئے نکل جاؤ۔'' اُن کے لہجے میں یکایک وہی پتھروں کی سی سنگینی در آئی تھی۔

احمد رضا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ انہوں نے آخری سیڑھی سے اسے گم ہوتے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ فیصلہ تو وہ کر کے آئے تھے۔ سمیرا اور زبیدہ کے آنے سے پہلے انہیں اس پر عمل کرنا تھا۔ وہ ان کے آنسوؤں اور اپنی کمزوری سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ اولاد کی محبت کے سامنے کمزور نہ پڑ جائیں۔ بس ایک آس تھی کہ شاید جس احمد رضا کو اسمٰعیل ملعون نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، وہ یہ احمد رضا نہ ہو۔ لیکن احمد رضا نے یہ آس توڑ دی تھی۔

وہ احمد رضا کو اٹیچی کیس اور بیگ سیڑھیوں سے گھسیٹ کر لاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا ان کے پاس آیا۔

''ابو!'' اس نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

وہ کوئی بہت زیادہ مذہبی نہیں تھے۔ لیکن وہ ایسے بھی نہیں تھے کہ ایک مرتد شخص کو، ایک جھوٹے نبی کے کارندے کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دیتے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے آخری نبی ہیں۔ کوئی نبی ان کے بعد نہیں آئے گا۔ ہر مسلمان، چاہے وہ بہت زیادہ مذہبی ہو یا نہیں، اس بات پر ایسے ہی یقین رکھتا تھا، جیسے اپنے ہونے پر۔ احمد رضا ان کی نظروں میں مرتد ہو چکا تھا۔ جس نے کسی اور کو نبی مان لیا۔

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''ابو!'' احمد رضا نے پھر کہا تو اس کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ احمد رضا نے اٹیچی کیس وہیں برآمدے میں رکھ دیا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔

''آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟'' وہ روہانسا ہوا۔

''تم مرتد ہو گئے ہو۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے کہا تھا اور پھر جھک کر اٹیچی کیس کا ہینڈل پکڑا اور اسے اٹھا کر صحن کی طرف بڑھے۔ وہ جو سوچ رہا تھا کہ وہ ہرگز سامان لے کر نہیں جائے گا، ان کے پاؤں پکڑ لے گا، معافی مانگ لے گا۔ ایک دم کھڑا ہوا اور تیز تیز چلتے ہوئے ان کے قریب جا کر عادتاً ان کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے لیا۔ انہوں نے ڑک کر بیگ اٹھایا اور وہ بھی اسے پکڑا دیا۔ اب وہ اس کے آگے چل رہے تھے۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر انہوں نے گیٹ کھول

احمد رضا متذبذب سا گیٹ سے باہر نکلا اور گیٹ کے پاس اٹیچی کیس اور بیگ رکھ کر اس نے حسن رضا کو دیکھنا چاہا۔ ان وہ گیٹ بند کر چکے تھے۔ اور اب گیٹ سے ٹیک لگائے رو رہے تھے۔ انہوں نے احمد رضا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ مبادا اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ کمزور نہ پڑ جائیں۔

اس چہرے کو انہوں نے سینکڑوں بار چوما تھا، سینکڑوں بار آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کی بلائیں لی تھیں اور سینکڑوں بار نظر لگ جانے کے خوف سے انہوں نے جی بھر کر دیکھنے کی خواہش کے باوجود اس خوب صورت چہرے سے نظریں ہٹا لی تھیں۔

اس بیٹے کے لئے انہوں نے بہت سے خواب دیکھے تھے، اس کے پیدا ہونے سے لے کر اب تک۔ اس کا اتنا خوب صورت نام رکھا تھا۔

''احمد۔''

اُن کے رونے کی آواز بلند ہوئی تھی۔ باہر گیٹ پر ہاتھ رکھے احمد رضا اپنے باپ کے رونے کی آواز سن رہا تھا۔ وہ باپ، جس نے اس سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ جس نے بچپن سے لے کر اب تک اپنی حیثیت سے بڑھ کر آسائشیں دی تھیں۔ جو اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھجوانا چاہتا تھا، جس کو اس نے کبھی قیمتی کپڑا پہنے نہیں دیکھا۔ سال میں ایک جوڑا، وہ بھی معمولی سا وہ اپنے لئے بنواتا تھا۔ لیکن جس نے اپنے بچوں کو ہمیشہ بہترین لباس پہنایا تھا تا کہ اپنے ادارے میں پڑھنے والے دوسرے بچوں کے مقابلے میں وہ احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں۔

ایک دم بہت زیادہ پشیمانی نے اسے گھیر لیا۔

یہ اس نے کیا کر دیا تھا؟ اور کیا کرنے چلا تھا؟...... اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

''ابو......!'' اس نے گیٹ پر دباؤ ڈالتے ہوئے آواز دی۔ اور بے تحاشا روتے ہوئے حسن رضا سوچ رہے تھے۔ انہوں نے اس کا بے حد خوب صورت نام رکھا تھا۔ یہ ان کی پہلی اولاد تھا۔

''ابو......!'' موبائل کی بیل ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا، الوینا تھی اور پوچھ رہی تھی کہ اس نے اتنی دیر کیوں کر دی تھی۔ پشیمانی کی جگہ ایک دم غصے نے لے لی تھی۔

''یہ ابو بھی بس......'' اس نے جھک کر اٹیچی کیس اور بیگ اٹھایا۔

'امی اور سمیرا آ جائیں تو پھر آؤں گا اور منا لوں گا ابو کو بھی۔' اس نے قدم آگے بڑھائے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اب اس گھر کے دروازے اس کے لئے کبھی نہیں کھلیں گے۔ اب وہ کبھی اپنے باپ کا شفیق چہرہ نہیں دیکھ سکے گا۔

وہ اٹیچی کیس اٹھائے الوینا کی گاڑی کی طرف جا رہا تھا اور اندر گیٹ سے ٹیک لگائے حسن رضا دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ یوں جیسے ابھی جوان بیٹے کی میت دفنا کر آ رہے ہوں۔ وہ رو رہے تھے، اس بیٹے کی موت پر جو جون 1977ء میں پیدا ہوا تھا اور آج اگست 1999ء میں صرف بائیس سال کی عمر میں مر گیا تھا۔

❀○❀

ایبک انہیں مصنوعی سانس دینے کی کوشش کر رہا تھا، جب ہمدان مصطفیٰ، ڈاکٹر کے ساتھ تقریباً بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے ایبک کو پیچھے ہٹا کر ان کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی اور پھر دایاں ہاتھ اٹھا کر ایبک اور حواس باختہ کھڑے ہمدان کو گویا تسلی کا اشارہ کیا تھا۔ پھر فوری طور پر اُنہیں ایمرجنسی لے جایا گیا تھا۔ ایبک اور مصطفیٰ ساتھ ہی گئے تھے۔

پھر جب ایمرجنسی کے باہر کھڑے کھڑے ہمدان، مصطفیٰ شاہ کو فون کر کے بابا جان کے متعلق بتا رہا تھا، تب ایبک کو عمارہ کا خیال آیا تھا۔ وہ تیزی سے واپس کمرے کی طرف لپکا تھا، جہاں عمارہ بیڈ سے ٹیک لگائے ابھی تک حواس باختہ سی کھڑی تھیں۔ ان کی خوب صورت آنکھوں میں وحشت سی تھی اور آنسو جیسے ان کی آنکھوں میں ہی ٹھہر گئے تھے۔

''آپی!'' اسے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح اس کی طرف لپکیں اور ایبک فلک شاہ نے انہیں اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

''ریلیکس مما!......وہ بہتر ہیں ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر دیکھ رہے ہیں۔'' اس کے تسلی آمیز لفظوں نے جیسے آنکھوں میں منجمد آنسوؤں کو پگھلا دیا اور آنکھوں میں ٹھہرے آنسو رخساروں پر پھسل آئے۔

''بابا جان ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟'' انہوں نے بچوں کے سے انداز میں پوچھا۔ ایبک نے بھی انہیں ایسے ہی تسلی دی تھی، جیسے بچوں کو دیتے ہیں۔

''ہاں، ہاں! کیوں نہیں؟ بابا جان بالکل ٹھیک ہیں۔ ہم ابھی کچھ دیر تک انہیں روم میں لے آتے ہیں۔''

پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے اور انہیں یوں ہی بازوؤں کے حلقے میں لئے لئے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ عمارہ کی وحشت ذرا کم ہوئی تو انہوں نے مائرہ کی طرف دیکھا، جو عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے مائرہ کیا کہہ رہی تھیں۔

''عمارہ شاہ! تمہیں یہاں آتے ہوئے شرم نہ آئی اور وہ تمہارا شوہر......اس نے تو کہا تھا کہ وہ کبھی مر کر بھی ''الریان'' میں قدم نہیں رکھے گا۔ اگر رکھا تو......''

''اس نے اور بھی تو کچھ کہا تھا۔'' انہوں نے یاد کرنے کی کوشش کی تو انہیں یاد نہیں آیا۔ تب انہوں نے بے بسی سے ایبک کی طرف دیکھا۔ ایبک نے آہستہ سے ان کے ہاتھ تھپتھپائے اور کھڑا ہو گیا۔

''مما! آپ ایزی ہو کر بیٹھ جائیں۔ ان شاء اللہ! کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ اتنا نامہربان نہیں ہے۔ دیکھئے گا، کچھ دیر بعد ابھی آپ بابا جان سے باتیں کر رہی ہوں گی۔ میں ہمدان کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ وہاں اکیلا ہے۔ گھبرا رہا ہوگا۔''

وہ ایک بار پھر ان کا بازو تھپتھپا کر باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے ایک سرسری نظر رابیل احسان پر ڈالی جو صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ وہ اس سارے عرصے میں مسلسل اس پر اور عمارہ پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

عمارہ فلک شاہ نے ایبک کو باہر جاتے دیکھا تو ایک لمحہ کو جیسے ان کا دل ڈوب سا گیا۔ ان کا جی چاہا، وہ ایبک کو آواز دے کر روک لیں۔ انہیں مائرہ کی نظروں سے خوف آ رہا تھا۔ مائرہ جو اُن کی سب سے چھوٹی بھابی اور ان کے بے حد پیارے دوستوں جیسے بھائی کی بیوی تھیں۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی، پہلے روز سے ہی انہوں نے مائرہ کی آنکھوں میں اپنے لئے نفرت محسوس کی تھی۔ حالانکہ احسان شاہ کے حوالے سے وہ اُنہیں بے حد عزیز تھیں۔ اُنہیں اچھی طرح یاد تھا، جب وہ اسٹیج پر دُلہن بنی احسان شاہ کے پہلو میں بیٹھی تھیں، وہ فلک شاہ کے ساتھ اسٹیج پر آئی تھیں۔ اور فلک شاہ جھک کر احسان کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے تو انہوں نے بہت محبت سے مائرہ کا ہاتھ تھام کر مبارکباد دی تھی۔

''مائرہ بھابی! آپ کو زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔''

اور مائرہ نے جس طرح نفرت سے ان کا ہاتھ جھٹکا تھا اور جن نظروں سے اُنہیں دیکھا تھا، وہ ششدر سی کھڑی رہ گئی تھیں۔ فلک شاہ نے سیدھا ہوتے ہوئے شاید مائرہ کو ان کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ہولے سے دبا کر شاید اس احساس کو زائل کرنے کی کوشش کی تھی، جو اس وقت ان کے دل کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔ اور پھر مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

''آیئے عمو! بابا جان ہمیں بلا رہے ہیں۔'' اور وہ جو اسٹیج پر تصویریں بنوانے کے لئے آئی تھیں، فلک شاہ کے ساتھ اسٹیج سے نیچے اُتر آئیں۔ احسان شاہ اُنہیں آواز ہی دیتے رہ گئے تھے۔

انہوں نے سر اٹھا کر مائرہ اور رابیل کی طرف دیکھا۔ مائرہ ویسی ہی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور رابیل کی نظریں بھی ان پر تھیں۔ رابیل کی آنکھیں، ان کے ہونٹوں کی بناوٹ بالکل مائرہ جیسی تھی۔

'تو کیا یہ احسان شاہ اور مائرہ کی بیٹی ہے......رابیل احسان؟' انہوں نے بے حد اشتیاق سے اسے دیکھا۔

طور پر ایبک نے سب سے ہی ان کا تعارف کروا رکھا تھا۔
اور ان کا اتنی دیر سے بغور جائزہ لیتی ہوئی رابیل نے سوچا۔
تو یہ ہیں عمارہ پھپھو' وہ اسے بہت نرم اور دھیمے مزاج کی لگ رہی تھیں۔ جبکہ مما نے جس طرح ان کا تعارف کروا تھا۔ اس سے اس کے ذہن میں عمارہ پھپھو کا جو خاکہ بنا تھا، وہ تو ایک انتہائی بدمزاج اور چالاک سی عورت کا تھا، جبکہ ان کے چہرے پر جو نرمی اور جو شفقت تھی، وہ کسی بدمزاج عورت کے چہرے پر تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ اور مما نے اسے بتایا تھا کہ عمارہ اور موحی نے ان کی زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ اگر موحی ''الریان'' میں قدم نہ رکھنے کی قسم نہ کھاتے تو شاید ان کا گھر اجڑ جاتا۔ ایسے ہی فتنہ باز تھے دونوں۔
یہ بات انہوں نے اس روز رابیل سے کہی تھی جب ایبک پہلی بار ہمدان مصطفیٰ کے ساتھ ''الریان'' آیا تھا۔
''دیکھو اب یہ شخص کیا گل کھلاتا ہے۔''
اور انہوں نے رابیل کو سختی سے ایبک کے ساتھ بے تکلف ہونے سے منع کیا تھا۔
اس نے اپنی طرف دیکھتی عمارہ کی طرف دیکھا، جو اسی اشتیاق سے اسے دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں وہی نرم سی بہت تھی، جس سے محبت کا اظہار ہو رہا تھا اور پھر مائرہ کی طرف دیکھا۔ وہ عمارہ کی طرف متوجہ تھیں۔
''عمارہ......!'' انہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''عمارہ! تمہاری طلاق تو ''الریان'' میں قدم رکھنے سے مشروط تھی۔ اگر اتنے سالوں بعد تم نے موحی سے طلاق لینے کا فیصلہ کرنا ہی تھا تو بہت پہلے کر لیا ہوتا۔ اماں جان بھی تمہاری یاد میں نہ تڑپتیں۔ اور الریان......''
''لیکن......'' عمارہ نے رابیل کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بے حد حیرانی سے مائرہ کو دیکھا۔ ''میں نے تو ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔''
''اچھا تو کیا موحی نے تمہیں چھوڑ......''
''نہیں۔'' عمارہ نے تڑپ کر مائرہ کی طرف دیکھا۔ ''مائرہ بھابی! میں ''الریان'' میں نہیں آئی ہوں۔ یہاں ہاسپٹل میں آئی ہوں اور یہیں پر بابا جان سے ملاقات کر کے ایبک کے ساتھ واپس چلی جاؤں گی۔''
''اوہ اچھا!'' مائرہ نے ہونٹ سکوڑے اور تب ہی رابیل نے از حد ناگواری سے مائرہ کی طرف دیکھا۔
''مما! پلیز۔'' اسے مائرہ کا اس وقت عمارہ سے اس طرح کی طنزیہ گفتگو کرنا قطعی پسند نہیں آیا تھا۔ جبکہ عمارہ، بابا جان کی حالت کی وجہ سے پہلے ہی پریشان بیٹھی تھیں۔
''کیا ہے؟'' مائرہ نے اس کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ رابیل کچھ کہتی، ایبک ایک بار پھر کمرے میں آیا۔ مائرہ اور رابیل کی طرف دیکھے بغیر وہ سیدھا عمارہ کے پاس آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کھڑا کرتے ہوئے کہا۔
''آیئے...... بابا جان کو آئی۔ سی۔ یو میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ آپ انہیں دیکھ لیں۔ ایک دو گھنٹے وہ انہیں آئی۔ سی۔ یو میں ہی رکھیں گے۔ پھر کمرے میں منتقل کر دیں گے۔ ویسے وہ کافی بہتر ہیں۔''
''اور اگر پھر ان کی طبیعت خراب ہو گئی تو؟'' عمارہ نے خوف زدہ نظروں سے ایبک کی طرف دیکھا۔
''نہیں...... وہ خود آپ کے لئے بہت بے قرار ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں، آپ کو لے آؤں۔''
ایبک اور عمارہ کے باہر نکلتے ہی رابیل نے مائرہ کی طرف دیکھا۔
''مما! آپ بھی بس...... یہ کیا موقع تھا عمارہ پھپھو سے ایسی باتیں کرنے کا؟''
''اچھا! اب تم مجھے بتاؤ گی کہ مجھے کسی سے کس طرح بات کرنی ہے۔ بہت ہمدردی ہو رہی ہے تمہیں پھپھو سے، کیا بات ہے؟ آج سے پہلے جس کی شکل دیکھی نہ......''
''مما......!'' رابیل نے بے حد ناراضی سے مائرہ کی طرف دیکھا۔

''سن لو رابی! تمہارے دل میں اگر ایبک کا کوئی خیال ہے تو اسے ابھی اس وقت دل سے نکال دو۔ نفرت ہے مجھے مومی، عمارہ اور اس کی اولاد سے۔''

اور دوسری طرف بھی رابیل احسان شاہ تھی، جس نے آج تک کسی کی نہیں سنی تھی اور مائرہ کی اس اتنی غلط بات پر وہ احتجاجاً کمرے سے باہر نکل گئی تھی اور مائرہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں۔

''سنو.....سنو رابی! رُکو۔ ابھی بابا جان آئی۔سی۔یو میں ہیں۔ اور تمہارے پاپا آتے ہوں گے، کیا کہیں گے وہ؟''

لیکن رابیل نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور تیزی سے ہاسپٹل کے کوریڈورز اور لاؤنج سے گزرتی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔

''مما نے یہ کتنی غلط بات کہی تھی۔ میرے دل میں ایبک کا خیال۔ میں نے تو ایک بار بھی اسے دھیان سے دیکھا تک نہیں اور نہ ہی ڈھنگ سے کبھی اس سے بات کی ہے پھر۔''

اُس کی گلابی رنگت دہک رہی تھی اور نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کاٹتی تیزی سے سیڑھیاں اُتر رہی تھی اور بیسمنٹ میں موجود اسٹور سے دوائیاں لے کر آتے ایبک نے بے حد حیرت سے اسے اور پھر اس کے پیچھے آتی مائرہ کو دیکھا۔ اور بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''رابیل۔''

رابیل ٹھٹک کر ایک لمحہ کے لئے رک گئی۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر، ایبک پر ڈالی۔

''وہ ابھی دس پندرہ منٹ میں بابا جان کو روم میں منتقل کیا جا رہا ہے۔''

لیکن رابیل اُس کی بات کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئی تھی اور وہ حیران سا کھڑا، مائرہ مامی کو اس کے پیچھے سیڑھیاں اُترتا دیکھ رہا تھا جنہوں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے بے حد غصیلی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ایبک نے کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں سر کو ہولے سے جھٹکا تھا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ فرسٹ فلور پر آیا تو اس نے کوریڈور میں پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے مصطفیٰ شاہ کو دیکھا تھا جو اس پر نظر پڑتے ہی تیزی سے اس کی طرف لپکے تھے اور بے تابی سے پوچھا تھا۔

''بابا جان کہاں ہیں؟.....کیسے ہیں؟.....ایمرجنسی میں تو نہیں ہیں۔ ہمدان نے فون کیا تھا کہ بابا جان.....''

''بابا جان ٹھیک ہیں اب۔'' ان کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایبک نے نرمی سے کہا۔ ''انہیں پہلے آئی۔سی۔یو میں منتقل کر دیا گیا تھا لیکن پھر ڈاکٹر نے انہیں روم میں جانے کی اجازت دے دی ہے۔''

''لیکن نہیں ہیں وہ روم میں بھی۔ دیکھ آیا ہوں میں۔ تم کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو ایبک بیٹا؟''

''نہیں ماموں جان!...... بابا جان بالکل ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر نے بہت تسلی دی ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک دم ہیجان سے وقتی طور پر طبیعت خراب ہو گئی تھی۔''

اور اُس کی بات پر غور کئے بغیر وہ آئی۔سی۔یو کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ایبک بھی ان کے ساتھ تھا۔ کبھی وہ آئی۔سی۔یو میں نہیں تھے۔ مصطفیٰ شاہ ایک بار پھر پریشان ہو گئے۔ تب ایبک نے پھر انہیں تسلی دی۔

''وہ لفٹ سے گئے ہوں گے۔'' اور مصطفیٰ شاہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ راستے میں تو کسی کمرے کی طرف ہمدان اور بابا جان اسے نظر نہیں آئے تھے۔

تسلی آمیز انداز میں ان کی طرف دیکھتا ایبک اس وقت انہیں بالکل مومی کی طرح لگا۔ مومی ان سب کو کتنا پیارا تھا۔ کتنا عزیز تھا۔ لیکن وقت نے کیسے اسے ان سے دور کر دیا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ ایبک کے ساتھ پھر سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔

ایبک نیچے آ کر ڈاکٹر کے روم کی طرف چلا گیا تھا دوائیاں چیک کروانے۔ اور وہ روم نمبر 9 کی طرف بے تابی سے

مے تھے اور دروازہ کھولتے ہی جو منظر ان کی آنکھوں نے دیکھا، اس نے انہیں ایک لمحے کے لئے دروازے میں ہی مالت کر دیا تھا۔

وہ یقیناً عمارہ تھیں، جو بابا جان کے بیڈ پر ان کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔ وقت نے انہیں بہت بدل دیا تھا۔ ان کی گلابی رنگت میں زردیاں گھلی تھیں اور آنکھوں میں ایک حزن کی سی کیفیت ٹھہری ہوئی لگتی تھی۔ وہ انہیں بے حد کمزور اور کچھ بیمار سی لگی تھیں۔ یہ ان کی بے حد لاڈلی بہن تھیں اور وہ کتنے سالوں بعد انہیں دیکھ رہے تھے۔

وہ دروازے پر ہاتھ رکھے یونہی ساکت کھڑے تھے جب عمارہ نے انہیں دیکھا تھا۔ عمارہ یک دم بابا جان کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے بے اختیار ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ لیکن پھر وہاں ہی رک گئی تھیں۔ پتہ نہیں مصطفیٰ بھائی ان سے ملنا پسند بھی کریں گے یا نہیں...... پتہ نہیں، انہیں بھی مائرہ کی طرح میرا یہاں آنا اچھا نہ لگا ہو۔

اور انہیں ٹھٹک کر رکتے دیکھ کر جیسے مصطفیٰ شاہ چونکے تھے۔

''عمو!'' ان کے لبوں سے نکلا تھا اور وہ تیزی سے ان کی طرف لپکے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ انہیں لپٹائے کھڑے تھے۔ عمارہ کے آنسو ان کے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور وہ بھرائی آواز میں کہہ رہے تھے۔

''کیسی ہو عمو؟...... بہت کمزور لگ رہی ہو۔ ہمدان نے بتایا تھا کہ تمہیں انجائنا کا اٹیک ہوا ہے۔ اب ٹھیک ہو نا؟ لگتا ہے صدیوں بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔''

''مصطفیٰ بھائی!...... آپ...... آپ سب نے مجھے چھوڑ دیا...... یوں الگ کر کے پھینک دیا، جیسے میں نے کوئی جرم کیا تھا۔ جیسے بہت بڑی خطا کی تھی میں نے۔ سالوں میں نے انتظار کیا کہ شاید آپ میں سے کسی کو میرا خیال آئے...... اور کوئی نہیں تو آپ اور ثنا بھابی تو ضرور آئیں گی مجھ سے ملنے۔ لیکن میری آنکھیں پتھرا گئیں۔''

وہ رو رہی تھیں اور ہولے ہولے گلہ بھی کر رہی تھیں۔

''عمو......!'' مصطفیٰ شاہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہیں۔ عمارہ صحیح کہہ رہی تھیں۔ وہ جا سکتے تھے۔ اکیلے، ثنا کو لے کر۔ لیکن ایسا کچھ تو تھا کہ وہ نہ جا سکے۔ کیا زارا نے اسے کچھ نہیں بتایا ہو گا کہ کس بات نے انہیں زنجیر کر دیا تھا۔

انہیں مراد پیلس کے راستے بھی پتہ تھے اور بہاولپور بھی کبھی ان کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا۔ پھر کیوں ان کے قدم مراد پیلس کی طرف نہیں اُٹھے تھے؟ کیوں انہوں نے خود کو روکے رکھا؟ اور اس روکنے روکنے میں اتنے سال گزر گئے۔ ان کے بالوں میں سفید بال نظر آنے لگے۔ روتے روتے عمارہ کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ہمدان نے اُنہیں آہستہ سے الگ کیا۔

''پھپھو جان! پلیز ریلیکس۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

وہ آنسو پونچھتے ہوئے پھر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ کر ان کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

''بابا جان پلیز...... روئیں نہیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' عمارہ نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے ان کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے تھے۔ تب عبدالرحمٰن شاہ نے ان کے ہاتھ، ہاتھوں میں لے کر چومتے ہوئے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔

''عمو! میرا مومی کیسا ہے؟'' ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

''مومی......'' عمارہ کی سسکی نکل گئی۔ ''ٹھیک ہیں۔''

''کبھی اس نے ہمیں بھی یاد کیا؟''

''بابا جان! یہ پوچھیں، مومی نے کب، کس کو یاد نہیں کیا۔ وہ تو دن رات تڑپتے ہیں، روتے ہیں آپ سب تو ان کے دل میں بستے ہیں۔ وہ تو ''الریان'' کی اینٹ اینٹ کو یاد کرتے ہیں۔''

''آہ۔'' عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھیں پھر برس پڑی تھیں۔

تب ہمدان شاہ، بیڈ کی دوسری طرف سے آ کر ان کے پاس بیٹھ گیا تھا اور اس نے اپنا ایک بازو ان کے گرد حمائل کرتے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔

''بابا جان پلیز! حوصلہ کریں۔ نہیں تو پھر طبیعت خراب ہو جائے گی۔ جو گزر گیا، سو گزر گیا۔ اب اس وقت عمارہ پھپھو آپ کے پاس ہیں۔ آپ ان سے باتیں کریں۔ بیتے برسوں کا حال احوال پوچھیں۔''

ایک ہاتھ ان کے گرد حمائل کئے اور ایک ہاتھ سے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ ہولے ہولے ان سے باتیں کر رہا تھا۔

ایسے میں مصطفیٰ شاہ نے ہمدان مصطفیٰ کی طرف تشکر سے دیکھا۔ وہ خود میں اس وقت بالکل بھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے۔ بیتے ہوئے سالوں کے سارے منظر ان کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ مومی انہیں بہت پیارا تھا، بہت عزیز تھا۔ پھر بھی جب عبدالرحمٰن شاہ نے بتایا تھا کہ مراد شاہ، عمارہ کی رخصتی چاہتے ہیں تو انہوں نے صاف منع کر دیا تھا۔

''نہیں بابا جان! ابھی نہیں...... ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے اور مومی بھی دو سال ضائع کر چکا ہے۔ اب کم از کم وہ ماسٹرز تو کر لے۔''

لیکن مروہ پھپھو کا بھی اصرار تھا کہ مومی اور عمارہ کی شادی جلد کر دی جائے۔ اب پتہ نہیں، اس میں ان کی کیا مصلحت تھی۔ لیکن عبدالرحمٰن شاہ نے مراد شاہ کی بات مان لی تھی اور فی الحال نکاح کی ہامی بھر لی تھی اور رخصتی عمارہ کے بی۔اے کرنے کے بعد طے پائی تھی۔ اور پھر عمارہ کے نکاح کے ساتھ ساتھ گھر میں ایک دم سے رونق اُتر آئی تھی۔ عمارہ کا مومی سے پردہ کرا دیا گیا تھا۔

اس روز مومی ہاسٹل سے آیا تھا۔ گھر میں ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ بینا چچی، مروہ پھپھو، مرتضیٰ کی بیوی تینوں رات کے کھانے کے بعد ڈھولکی لے کر لاؤنج میں بیٹھ گئی تھیں۔ چھوٹی زارا سب سے زیادہ پُر جوش تھی۔ احسان اور عثمان بھی نیچے کارپٹ پر بیٹھے سب کے ساتھ تالیاں بجاتے ہوئے گا رہے تھے۔ اور وہ مومی کے پاس بیٹھے ان سب کو گاتے ہوئے سن رہے تھے اور احسان بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ دونوں بھی گانوں میں ان کا ساتھ دیں ورنہ یہ خواتین بازی لے جائیں گی۔ مرتضیٰ پتہ نہیں کہاں تھے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر کھوجتی نظروں سے دیکھا تھا اور یہ سوچ کر اُٹھنے ہی لگے تھے کہ شاید وہ بابا جان کے پاس ہوں، تب ہی مومی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے پوچھا تھا۔

''مصطفیٰ بھائی! عمارہ کہاں ہے؟''

اور ابھی انہوں نے کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا کہ مروہ پھپھو نے گانا گاتے گاتے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ شاید انہوں نے مومی کی بات مان لی تھی۔

''عمارہ کا تم سے پردہ ہے، نکاح تک۔''

''لیکن کیوں؟'' وہ ازحد حیران ہوا تھا۔

اور اس کی حیرانی کو بے حد انجوائے کرتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''مومی! میں ذرا بابا جان کی طرف جا رہا ہوں، انہوں نے مہمانوں کی لسٹ بنانے اور کچھ مشورے وغیرہ کے لئے بلایا تھا۔ مرتضیٰ بھی شاید بابا جان کے پاس ہیں۔ میرے آنے تک تم جانا نہیں۔''

اور جب وہ لاؤنج سے نکل کر بابا جان کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو لابی میں پڑے فون کی بیل بج اُٹھی تھی۔ انہوں نے رک کر فون ریسیو کیا تھا۔

''ہیلو...... کون؟''

''میں......'' دوسری طرف کوئی نسوانی آواز تھی۔

''مجھے مرتضیٰ یا مصطفیٰ سے بات کرنا ہے۔''
''جی میں مصطفیٰ بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں پلیز۔''
''میں جو کوئی بھی ہوں، اسے آپ رہنے دیں۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ جس شخص سے اپنی بہن کا نکاح کرنے والے ہیں، وہ شخص آپ کی بہن کے قابل نہیں ہے...... حد درجے کا فلرٹ ہے۔ کالج میں کتنی ہی لڑکیوں کے ساتھ اس کی دوستی ہے اور کتنی ہی لڑکیوں کے ساتھ اس نے شادی کے وعدے کر رکھے ہیں۔ خود میرے ساتھ بھی دو سال سے افیئر چلا رکھا ہے اور اب جبکہ میں......'' لڑکی کی آواز بھرّا گئی تھی۔
مصطفیٰ ہاتھ میں ریسیور تھامے ساکت کھڑے تھے۔
''پلیز، اپنی بہن کی زندگی تباہ مت کریں۔'' لڑکی نے روتے ہوئے کہا تھا اور فون بند کر دیا تھا۔ وہ یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ وہ کون تھی اور اس نے ان کے گھر کا فون نمبر کہاں سے لیا تھا۔
ریسیور ہاتھ میں لئے وہ یونہی خالی خالی نظروں سے ریسیور کو دیکھتے رہے تھے اور پھر ریسیور کریڈل پر ڈال کر وہ وہاں لابی میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ انہیں یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ وہ بابا جان کے پاس جانے کے لئے نکلے تھے۔
''نہیں...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مومی ایسا نہیں ہو سکتا۔'' انہیں لڑکی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس کی وہ روتی آواز۔ کیا مومی نے اس کے ساتھ کچھ غلط کیا ہے؟ لیکن پھر اپنی ہی سوچ پر وہ شرمندہ سے ہو گئے تھے۔ مومی انہیں بے حد عزیز تھا لیکن عمارہ ان کی بہن تھی۔ انہیں اس کے متعلق تحقیق تو کرنا چاہئے۔ ابھی تو نکاح میں کچھ دن ہیں۔ کیا وہ ڈائریکٹ مومی سے بات کریں؟ بابا جان سے کہیں، مرتضیٰ سے بات کریں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے لابی میں بیٹھے تھے جب مروہ پھپھو، لاؤنج سے کسی کام کے لئے باہر نکلی تھیں اور انہیں یوں کرسی پر دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے دیکھ کر پریشان سی ہو کر ان کے پاس آ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھنے لگی تھیں۔
''مصطفیٰ! کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''
اور انہوں نے سر اٹھا کر مروہ پھپھو کی طرف دیکھا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ بے حد خوش خوش لاؤنج سے باہر آئے تھے اور پھر اتنی سی دیر میں ایسا کیا ہو گیا تھا؟ مروہ پھپھو بے حد گھبرا گئی تھیں۔
''مصطفیٰ! بولو نا، خیر تو ہے نا؟ ایسے کیوں بیٹھے ہو؟''
''مروہ پھپھو!'' انہوں نے ایک دم ہی مروہ پھپھو سے سب کچھ کہنے کا فیصلہ کیا تھا اور کھڑے ہو کر ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تھا۔
''پھپھو پلیز! ذرا میرے ساتھ میرے کمرے میں چلیں۔''
اور پھر انہوں نے وہ سب مروہ پھپھو کو بتا دیا تھا جو اس لڑکی نے فون پر کہا تھا۔ اور مروہ پھپھو نے ان کی ساری بات سننے کے بعد کہا تھا۔
''میرے خدا!...... وہ لڑکی اس حد تک آ جائے گی، مجھے اندازہ نہیں تھا۔''
''کون لڑکی پھپھو؟'' وہ اُلجھ سے گئے تھے۔
''دیکھو مصطفیٰ! جو فون تم نے سنا ہے، اسے بھول جاؤ۔ مومی ایسا نہیں ہے۔ حیرت ہے، تم نے اس لڑکی کی بات پر یقین کیسے کر لیا؟ کیا تم مومی کو نہیں جانتے ؟''
''یقین تو نہیں کیا تھا پھپھو! لیکن اپ سیٹ ضرور ہو گیا تھا۔'' وہ شرمندہ سے ہوئے تھے۔
''تم اطمینان رکھو مصطفیٰ! ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں اس لڑکی کو بھی جانتی ہوں اور اس فون کے پس منظر کو بھی۔''
''کون ہے وہ لڑکی؟ اور اسے مومی پر یہ الزام لگانے کی جرأت کیسے ہوئی؟...... بتائیں مجھے۔ میں اسے زندہ نہیں

چھوڑوں گا۔'' وہ یک دم ہی غصے میں آ گئے تھے۔

''یہ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے مصطفیٰ! کہ وہ کون ہے۔ وہ میرے سسرالی عزیزوں میں سے ہے اور موی کے لئے پاگل ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں مجھ پر بھی دباؤ تھا کہ میں اس کی شادی، موی سے کروا دوں۔ تب ہی میں نے بھائی جان سے کہا تھا کہ فی الحال موی اور عمارہ کے نکاح کے متعلق کسی کو نہ بتایا جائے۔ لیکن بھلا ہو عبداللہ بھائی کا، وہ شادی کا کارڈ دینے گئے تو عمارہ کے نکاح کا ذکر بھی کر آئے۔ خیر تم ریلیکس ہو جاؤ۔''

''آپ مجھے بتائیں تو سہی۔ میں اُس کا پاگل پن دور کروں گا۔'' وہ بضد ہوئے تھے۔

''رہنے دو مصطفیٰ! جب موی کا نکاح ہو جائے گا تو وہ خود ہی مایوس ہو جائے گی۔''

اور انہوں نے شکر کیا تھا کہ انہوں نے مروہ پھپھو سے اس کا ذکر کیا تھا۔ کسی اور سے کر دیتے تو موی کس قدر ہرٹ ہوتا۔ وہ تو یوں بھی بہت کھڑ دلا اور حساس تھا۔ اور پھر کتنے دن گزر گئے، کوئی فون نہیں آیا تھا...... جب بھی بیل ہوتی تو ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ فون اُٹھائیں۔ احسان اور عثمان نے ان کا ریکارڈ بھی لگایا تھا۔

''کہیں سسرال سے کسی خاص بندے کا فون تو نہیں آنا؟'' اور وہ ہنس دیئے۔

''کیا خبر؟ ایسی باتیں بتائی تھوڑی جاتی ہیں؟''

اور پھر نکاح کا دن بھی آ گیا تھا۔ اگرچہ پہلے یہ پروگرام تھا کہ عمارہ کا نکاح سب سے آخری فنکشن ہوگا۔ عثمان اور مصطفیٰ کے ولیمہ والے دن نکاح کا فنکشن بھی ہو جائے گا۔ لیکن پھر موی نے شور مچایا تھا۔

''نہیں بھئی، سب سے پہلا فنکشن نکاح کا ہوگا۔ یہ سخت نا انصافی ہے کہ شادی کے سارے فنکشنز میں عمارہ مجھ سے چھپتی رہے اور میں اور وہ دونوں شادی انجوائے بھی نہ کر سکیں۔''

تب مائرہ پھپھو اور بینا چچی نے پورا پورا موی کا ساتھ دیا تھا۔

''تو اور کیا۔ موی صحیح کہتا ہے۔''

اور یوں پہلا فنکشن موی اور عمارہ کے نکاح کا تھا۔ مراد شاہ، بہاول پور سے ایک دن پہلے ہی آ گئے تھے اور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دو تین قریبی عزیز تھے۔ ان کے دو کزن اور ایک پھوپھی زاد بہن۔ اور نکاح والے دن عمارہ اور موی دونوں اتنے پیارے لگ رہے تھے کہ انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی تھی۔

''یا اللہ! انہیں نظرِ بد سے بچانا۔''

لیکن نظر تو لگ گئی تھی۔ لیکن تب وہ نہیں جانتے تھے۔

''ارے یہاں ابھی تک رونے دھونے کا سین چل رہا ہے؟'' ایبک نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو انہوں نے چونک کر بابا جان کے بیڈ کی طرف دیکھا۔ بابا جان کے بیڈ پر عمارہ نم آنکھوں کے ساتھ بیٹھی تھیں اور موی اسی طرح بابا جان کے گلے میں بازو حمائل کئے ہولے ہولے کچھ کہہ رہا تھا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے ایبک؟'' بابا جان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کی میڈیسن لینے گیا تھا۔''

''ہمدان!'' وہ ایک طرف صوفے پر بیٹھتے ہوئے ہمدان سے مخاطب ہوا تھا۔ ''یہ دوائیں تم دیکھ لینا کہ کب کب دینی ہیں۔ ویسے تو سسٹر خود ہی آ کر دیتی ہیں۔'' ہمدان نے سر ہلا دیا تھا۔ مصطفیٰ نے اس کی طرف دیکھا اور سوچا۔

''ایبک بالکل موی جیسا ہے۔ ویسا ہی لونگ اور کیئرنگ۔''

''تم نے اتنی دیر کیوں کر دی ایبک؟'' بابا جان اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ ''پہلے عمارہ کو کیوں نہیں لے آئے؟ اگر مجھے کچھ ہو جاتا، میں زندہ نہ رہتا تو اپنی عمو کو دیکھنے کی حسرت لئے دنیا سے چلا جاتا اس کی ماں کی طرح۔

پھر وہ عمارہ کی طرف دیکھنے لگے۔

''وہ تمہارے لئے بہت تڑپتی تھی عمو! بہت روتی تھی۔ بس ایک بار تمہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ تمہیں سینے سے لگانا چاہتی تھی۔ لیکن تم نے کیسا دل پتھر کرلیا تھا۔''

بہت سارے دنوں سے دل پر رکھے شکوے کا بوجھ جیسے اب عبدالرحمٰن شاہ سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔

''میں نے بابا جان!'' عمارہ نے بے حد شاکی نظروں سے دیکھا۔ ''یا آپ نے...... آپ سب نے اپنے دل پر پتھر رکھ لئے تھے۔ ٹھیک ہے ''الریان'' کے دروازے مجھ پر بند ہوئے تھے لیکن ''مراد پیلس'' کے دروازے تو آپ سب کے لئے کھلے تھے۔ لیکن آپ کے لئے تو میں اور مومی مر گئے تھے۔ پھر ان کھلے دروازوں کی طرف آپ کیوں دیکھتے۔ جب اماں ہوئی تھی اور جب ڈاکٹرز نے میری زندگی خطرے میں بتائی تھی اور میرے بچنے کے چانسز بہت کم تھے، تب بھی آپ کا دل نہ پسیجا۔ مومی نے کیسے رو رو کر ''الریان'' فون کیا تھا۔ صرف میرے لئے، میری خاطر۔ میں اپنے آخری لمحوں میں سب پیاروں کو دیکھنا چاہتی تھی لیکن میری نظریں منتظر ہی رہیں۔ میں آپریشن تھیٹر تک جاتے جاتے بھی مڑ مڑ کر دیکھتی رہی کہ شاید ابھی کوئی آتا ہو۔ کوئی میرا ماں جایا...... اور کوئی نہیں تو میرا باپ، میری ماں...... مومی نے تو فون پر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ آپ لوگوں کے سامنے نہیں آئیں گے، اگر آپ کو ان سے نفرت ہے۔''

''نہیں۔'' بابا جان نے تڑپ کر انہیں دیکھا اور ایک حیرت سے عمارہ کو پہلی بار اتنا بولتے اور شکوہ کرتے دیکھ رہا تھا۔

''اماں بیمار ہوئیں تو مجھے کسی نے اطلاع نہ دی۔ مجھے تو ان کی وفات کی خبر بھی زارا کے آنے پر ان کی وفات کے تین سال بعد ملی۔ اور میں اس کے لئے ''الریان'' کے کسی بھی شخص کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔''

آنسوؤں نے ان کا حلق بند کر دیا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی تھیں۔

''نہیں......'' بابا جان کمزور آواز میں کہہ رہے تھے۔ ''نہیں عمو! ایسا نہیں ہے بیٹا!...... میں نے خود کہا تھا مائرہ سے کہ تمہیں اطلاع کر دے کہ تمہاری ماں ہسپتال میں ہے...... اور ڈاکٹر اس کی زندگی سے متعلق پُر امید نہیں ہیں۔ ایک نہیں، دو تین بار مائرہ نے تمہیں فون کیا تھا۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ تم نے کہا تھا، مومی نے تمہیں آنے کی اجازت نہیں دی پھر بھی...... پھر بھی میں نے تمہاری ماں کی وفات کے بعد ایک بار پھر کسی سے کہا تھا۔ یاد نہیں، شاید مائرہ سے، ثنا یا شانی سے کہ تمہیں اطلاع دے دیں۔ اپنی ماں کا آخری دیدار تو کر لو۔''

''نہیں، مجھے کسی نے کوئی فون نہیں کیا تھا۔ نہ مائرہ بھابی نے، نہ کسی اور نے۔ مجھے پتہ چلتا، میری ماں بیمار ہے۔ بسترِ مرگ پر ہے تو میں اُڑ کر آتی۔ اور مومی...... مومی بھلا مجھے کیوں روکتے؟ وہ تو مجھ سے پہلے اُڑ کر پہنچتے۔ وہ تو مجھ سے زیادہ ''الریان'' کے باسیوں سے محبت کرتے ہیں۔''

ان کے آنسوؤں میں مزید روانی آ گئی اور پھر وہ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ جیسے اختیار کی لگامیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھیں۔ ایبک اور مصطفیٰ ایک ساتھ ہی ان کی طرف بڑھے تھے اور پھر ایبک نے انہیں اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا اور ہولے ہولے انہیں تھپک رہا تھا۔

''پلیز مما! بس اب اور نہیں۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں پاپا سے کیا کہوں گا۔ وہ تو...... نہیں پلیز۔ اپنے آپ کو سنبھالیے۔'' مصطفیٰ عبدالرحمٰن شاہ کو اپنے ساتھ لگائے ہولے ہولے کہہ رہے تھے۔

''بابا جان! پلیز اپنے آپ کو سنبھالئے۔ گلے شکوے تو ہوتے رہیں گے۔ یہ سب تو تقدیر میں لکھا تھا۔ شاید ایسا ہی ہونا تھا۔ کچھ باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی ہیں بابا جان!''

''لیکن یہ سب تو......؟'' انہوں نے مصطفیٰ شاہ کو دیکھا۔ ''یہ سب تو انسانوں نے ہی کیا ہے۔ مائرہ نے آخر ایسا کیوں کیا شانی......؟ اس نے عمو کو بتایا کیوں نہیں؟...... تمہاری ماں کی وہ آخری نظریں...... وہ حسرت بھری نظریں تو میرے دل میں گڑ گئی ہیں۔ مرتے دم تک گڑی رہیں گی۔ اور عمو!...... اس کے سینے میں دکھ کا جو یہ تیر پیوست ہے کہ وہ اپنی ماں سے مل سکی۔ نہ جیتے جی، نہ مرنے کے بعد چہرہ دیکھ سکی...... کہاں ہے مائرہ، پوچھو تو اس سے۔''

انہوں نے کمرے میں دیکھنے کے لئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ابھی عمارہ کے آنے سے پہلے تو وہ یہیں تھی۔ پھر کہاں چلی گئی۔

''بابا جان! وہ شاید گھر چلی گئیں۔''

مصطفیٰ شاہ نے آہستگی سے کہا اور یک دم ان کے دل میں خیل آیا۔ وہ لڑکی، جس نے اس رات فون کر کے مومی کے متعلق اُلٹی سیدھی باتیں کی تھیں، وہ مائرہ تو نہیں تھی کہیں؟ مروہ پھپھو کی سسرالی عزیز؟ ......لیکن نہیں۔ بھلا مائرہ کیسے وہ لڑکی ہوسکتی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو بھلا مروہ پھپھو، احسان اور مائرہ کی شادی پر اتنا اصرار کیوں کرتیں؟'' انہوں نے خود ہی اپنی بات کو جھٹلا دیا۔

اور عین اس لمحے ہمدان مصطفیٰ نے بھی سوچا۔ کمال ہے۔ یہ مائرہ چچی اور رابیل اس حالت میں بابا جان کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ جب کہ اس نے تو بابا جان کے ٹھنڈے پڑتے جسم کو دیکھ کر سوچ لیا تھا کہ شاید بابا جان۔

''بابا جان! پلیز سنبھالئے خود کو۔ یہ باتیں ابھی سوچنے اور کرنے کی نہیں ہیں۔'' انہوں نے خود سے الگ کرتے ہوئے انہیں آہستگی سے لٹا دیا اور پھر ہمدان کو اشارہ کیا کہ وہ عمارہ اور بابا جان کو پانی پلائے۔ ایبک بھی عمارہ کو لئے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ اور ہمدان کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر عمارہ کی طرف بڑھا رہا تھا۔ بابا جان نے پانی کے دو گھونٹ بھر کر گلاس ہمدان کو پکڑا دیا تھا۔ وہ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

''عمو! ......ادھر میرے پاس آؤ۔ ادھر آ کر بیٹھو۔''

اور عمارہ ایک بار پھر اُٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھی تھیں اور ایک بار پھر انہوں نے بابا جان کا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑے دل گیر لہجے میں کہا تھا۔

''الریان تو ہمارے لئے شجرِ ممنونہ بن گیا تھا۔ لیکن آپ نے مراد پیلس کو کیوں اپنے لئے حرام کرلیا تھا؟''

تب عبدالرحمٰن شاہ نے بے بسی سے مصطفیٰ شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ کیا کہتے عمارہ سے کہ زنجیریں تو ان کے پاؤں میں بھی پڑ گئی تھیں۔ وہ بھی اتنے ہی بے بس تھے جتنی وہ۔ اگر مومی نے اس رات غصے میں اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ وہ ''الریان'' میں قدم نہیں رکھیں گے تو احسان شاہ نے بھی ان سب کے لئے مراد پیلس کے راستے بند کر دیئے تھے۔

عمارہ اور فلک شاہ کو الریان سے گئے تب چھ دن ہو گئے تھے اور الریان کے در و دیوار پر ویرانی بسیرا کئے ہوئے تھی۔ اماں جان ہر وقت روتی رہتی تھیں۔ عبدالرحمٰن شاہ کو کسی پل چین نہ تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا اور کیوں؟ انہوں نے ایسا تو نہ چاہا تھا۔ وہ چچا جان کو کیا منہ دکھائیں گے؟ ......وہ روزِ محشر سلجوق سے کیا کہیں گے؟

ایسے میں زارا پہلی بار سسرال سے میکے آئی تو عمارہ کو نہ پا کر حیران رہ گئی۔

''عمو آپا کہاں چلی گئیں؟ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، وہ میرے آنے تک بہاول پور نہیں جائیں گی۔'' زارا کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے ہی تو وہ رخصت ہو کر گئی تھی اور اماں جان سے ساری حقیقت جان کر وہ مچل اُٹھی تھی بہاول پور جانے کے لئے۔ اس نے عمارہ سے بات بھی کی تھی۔

''عماہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے بابا جان کو بتایا تھا۔

اور جب عبدالرحمٰن شاہ، اماں جان، مصطفیٰ اور زارا بہاول پور جانے کے لئے تیار ہوئے تھے تو احسان شاہ نے کہا تھا۔

''اس گھر سے کوئی بھی مراد پیلس نہیں جائے گا۔ اور میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر یہاں سے کوئی مراد پیلس گیا یا کسی نے عمارہ یا مومی کو فون کیا تو میں اسی وقت خود کو گولی مار لوں گا۔''

تب مصطفیٰ شاہ نے نرمی سے کہا تھا۔

''ایسا کیا ہے شانی! جو تم مومی اور عمارہ سے اتنے متنفر ہو گئے ہو؟ ہو سکتا ہے، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔''

''نہیں مصطفیٰ بھائی! مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ جو دبا ہے، اسے دبا ہی رہنے دیں۔''

''عمارہ بیٹی ہے ہماری۔ ہم کیسے اسے اس طرح چھوڑ سکتے ہیں؟ وہ یہاں نہیں آسکتی لیکن ہم تو جا سکتے ہیں۔''

''وہ اب آپ کی بیٹی نہیں، مومی کی بیوی ہے۔ میں نے کہا تھا اس سے کہ وہ ''الریان'' میں آجائے مومی کو چھوڑ کر۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ''الریان'' کے دروازے عمارہ کے لئے ہر وقت کھلے ہیں لیکن وہ نہیں آئے گی اور آپ سمجھیں کہ وہ مرگئی ہے آپ سب کے لئے۔'' احسان شاہ بے حد سفا کی سے کہتا ہوا چلا گیا تھا اور عبدالرحمٰن شاہ حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ عمارہ کے لئے اتنا سفاک بھی ہوسکتا ہے۔

''ٹھیک ہے، مومی نے غصے میں الٹا سیدھا کچھ کہہ دیا ہے۔ لیکن ہم عمارہ کو تو نہیں چھوڑ سکتے نا۔''

مصطفیٰ اور عثمان نے، پھر مرتضیٰ نے بھی سمجھایا تھا۔ لیکن احسان شاہ کو جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ اور بھی سخت ہوا تھا اور اس نے کہا تھا، وہ صرف خود کو ہی نہیں، مائرہ کو بھی گولی مار دے گا اور یہ بات اس نے قسم کھا کر کہی تھی اور تب سب ساکت ہو گئے تھے۔

''قسم کا کفارہ بھی ہو سکتا ہے۔'' مصطفیٰ شاہ نے عبدالرحمٰن شاہ کو سمجھایا تھا۔ ''ابھی نہ جانے کیوں وہ غصے میں ہے۔ بعد میں کبھی آرام سے بات کی جا سکتی ہے اس سے۔'' لیکن وہ بعد کبھی نہیں آیا تھا۔

وہ نہ تو قسم کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوا تھا اور نہ اس نے وہ بتائی تھی۔ ہاں اس کا ایک ہی مطالبہ تھا۔

''عمارہ، مومی کو چھوڑ کر الریان آجائے۔''

لیکن عمارہ یہ بات سننے کے لئے تیار ہی نہ تھیں۔ خود دو بار مصطفیٰ نے احسان کے کہنے پر اسے فون کیا تھا۔

''عمو! ہم سب تمہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ مومی نے کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ تم مومی کو چھوڑ کر آجاؤ۔'' انہوں نے یہ بات بہت مشکل سے کہی تھی اور عمارہ رو پڑی تھیں۔

''نہیں مصطفیٰ بھائی! مومی مر جائے گا۔ وہ تو ایک دن بھی میرے اور ایبک کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسا مت کہیں۔''

اور یوں چھبیس طویل برس گزر گئے تھے۔ انہوں نے شرمندہ سا ہو کر سر جھکا لیا۔ چھبیس برس پہلے عمارہ سے کہی اپنی بات پر وہ خود ہی شرمندہ ہو گئے تھے۔ عبدالرحمٰن شاہ نے انہیں سر جھکاتے دیکھا تو ان کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ اور عمارہ کی طرف دیکھا جو ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

''کچھ سوالوں کے جواب نہیں ہوتے بیٹا! میرے پاس بھی تمہارے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔'' اور ایبک نے موضوع بدلنے کے لئے ہمدان کو مخاطب کیا تھا۔

''سنو ہمدان! ہم ایئر پورٹ سے سیدھے ہسپتال آرہے ہیں اور تمہیں اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ کینٹین سے ایک کپ چائے ہی پلوا دو۔''

''اوہ ہاں......!'' ہمیشہ کی طرح ہمدان بوکھلا گیا تھا اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکا تھا اور پھر کچھ خیال آتے ہی واپس مڑ کر اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر کمرہ نمبر 9 میں چائے اور سینڈوچ بھجوانے کا آرڈر دیا تھا۔

''یہاں بس سینڈوچ ہی ملیں گے۔''

''کافی ہیں۔'' ایبک مسکرایا تھا۔ وہ موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''انجی کو بھی ساتھ لے آتیں عمو!'' عبدالرحمٰن شاہ محبت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ''زارا بہت ذکر کرتی تھی انجی کا۔ کیسی ہے وہ؟ تمہارے جیسی؟'' وہ بے حد اشتیاق سے پوچھ رہے تھے۔

''شکل وصورت میں میرے جیسی لیکن مزاج میں مختلف۔ میں اس کی عمر میں بہت شوخ اور باتونی تھی لیکن وہ بہت کم گو اور سنجیدہ ہے۔ اس نے شاید پیدا ہوتے ہی ماں باپ کا دکھ اپنے اندر اتار لیا تھا۔ تب ہی تو......''

وہ ایک گہری سانس لے کر چپ ہو گئیں تو ایبک نے عبدالرحمٰن شاہ کی طرف دیکھا۔

''کسی روز لاؤں گا اسے آپ سے ملانے۔ اسے خود بھی بہت اشتیاق ہے آپ سے ملنے کا۔''

''ابھی ہی ساتھ لے آتے۔ پتہ نہیں......'' عبدالرحمٰن شاہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''پھر پاپا کے پاس کون ہوتا؟ مما کے واپس جانے تک وہ وہیں رہیں گی پاپا کے پاس۔ انہیں اکیلا تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔''

''کیوں، کیا ہوا موی کو؟......کیا بیمار ہے کچھ؟'' عبدالرحمٰن شاہ اور مصطفیٰ شاہ کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا تھا۔

''نہیں وہ......''

اور تب ہی دروازہ کھول کر احسان شاہ اندر داخل ہوئے تھے۔ بے حد گھبرائے ہوئے سے۔ اندر قدم رکھتے ہی ان کی پہلی نظر مصطفیٰ پر پڑی تھی۔

''کیا ہوا بابا جان کو؟''

اور پھر دوسری نظر عمارہ پر پڑی تو انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے ان کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ جس تیزی سے اندر آئے تھے، اسی تیزی سے واپس پلٹ پڑے۔

''احسان!......شانی!......'' مصطفیٰ نے انہیں پکارا تھا۔

ہمدان کا فون ملنے کے بعد وہ شانی کی طرف ہی گئے۔ وہ آفس میں نہیں تھا۔ تب وہ اس کے آفس میں اس کے لئے پیغام چھوڑ آئے تھے۔

احسان شاہ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ تب وہ تیزی سے ان کے پیچھے لپکے تھے اور لابی میں تیز تیز چلتے احسان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔

''رُکو......رُکو احسان!......کیا ہوا ہے؟'' احسان شاہ نے مڑ کر اُنہیں دیکھا۔

''پہلے ایک، پھر اب عمارہ اور کل کو موی......نو......نیور۔ ناٹ ایٹ آل۔''

وہ مصطفیٰ شاہ کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گئے اور مصطفیٰ شاہ وہاں ہی لابی میں حیران سے کھڑے اسے جاتے دیکھ رہے تھے۔

لبوں پر مدھم مسکراہٹ، آنکھوں میں گہری چمک لئے وہ الریان کے ایک ایک فرد کے متعلق انجی کو بتا رہے تھے جب بیڈ پہ پڑا ان کا فون بج اٹھا تھا۔ انہوں نے چونک کر بیڈ کی طرف دیکھا تو انجی نے اٹھ کر فون اٹھایا اور پھر مڑ کر فلک شاہ کی طرف دیکھا۔

''بھائی کا ہے۔''

انہوں نے بے حد مضطرب سا ہو کر ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور پھر آن کر کے بے چینی سے پوچھا۔

''ایبک بیٹا! عمو ٹھیک ہے نا؟...... بابا جان کیسے ہیں؟ اور وہاں پر ان سب نے......'' پھر کسی انجانے خوف سے سہم کر وہ چپ ہو گئے تھے۔

''سب ٹھیک ہے بابا جان!'' دوسری طرف بھی ایبک تھا۔ جو اتنی دور سے بھی ان کے دل میں چھپے خوف کو جان گیا تھا۔ ''بابا جان ٹھیک ہیں اور اس وقت دونوں باپ بیٹی مزے سے باتیں کر رہے ہیں۔''

وہ ہولے سے ہنسا تھا اور فلک شاہ کے مضطرب دل کو ذرا سا قرار آیا تھا لیکن وہ اسی بے چینی اور اضطراب سے پوچھ رہے تھے۔

''وہاں ہسپتال میں اس وقت اور کون کون ہے؟''

''مصطفیٰ انکل ہیں، ہمدان ہے اور میں ہوں۔ آپ سے بات کرنے کے لئے لان میں آیا تھا اور اب واپس روم میں جا رہا ہوں۔ رات کو تفصیل سے بات ہو گی۔ اوکے۔ اپنا خیال رکھئے گا بہت۔''

''ایبک!'' انہوں نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''شانی...... شانی نہیں آیا عمو سے ملنے؟''

''کون، احسان انکل؟'' ایبک نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ تو اس وقت آفس میں ہوں گے۔ بابا جان کے پاس تو صرف ہمدان تھا۔ مصطفیٰ انکل بھی ابھی آئے نہیں۔ اور احسان انکل کو تو ماما کے آنے کا پتہ بھی نہیں ہے۔''

اس نے ایک بار پھر انہیں اپنا خیال رکھنے کی تاکید کی اور انجی کو فون دینے کو کہا۔

اور انجی کو فون دے کر وہ کسی گہری سوچ میں کھو گئے تھے۔ یک دم دل پر اُداسی کا غبار سا چھا گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کتنے خوش تھے۔ ان کی عمو چھبیس سال بعد اپنے بابا جان سے ملی ہو گی۔ یہ احساس کتنا خوش کن تھا۔ اور ایبک نے تو ایسی کوئی بات بھی نہیں کی تھی جس سے وہ اُداس ہو جاتے۔ لیکن پھر بھی یکایک جیسے وہ ہر شے سے بیزار ہو گئے تھے۔

انجی نے فون آف کر کے ان کی طرف دیکھا۔ ''بابا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

انہوں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہوں چندا! کچھ تھکن سی ہو رہی ہے۔ اب آرام کروں گا۔''

''ٹھیک ہے بابا جان! آپ کے لئے دودھ لے آؤں؟''

''نہیں بیٹا! تم بھی اب آرام کرو۔ میں دودھ نہیں پیوں گا۔''

''آپ نے کھانا بھی تو ٹھیک سے نہیں کھایا بابا!''

''آج بھوک پیاس سب مرگئی ہے۔'' انہوں نے سوچا اور مسکرا دیئے۔ ''کھا تو لیا تھا۔''
''کہاں؟ دو لقمے لئے تھے۔'' انجی نے کسی قدر ناراضی سے کہا تو وہ پھر مسکرا دیئے۔
''آج دل ویسے ہی بھرا ہوا ہے خوشی سے۔ اور تم اب کہاں جا رہی ہو؟ آرام کرو۔''
''بابا! وہ جواد نے ذرا دیر سے آنے کو کہا تھا۔ میں ان کے آنے تک ٹی وی دیکھوں گی۔'' انجی اُٹھتے ہوئے بولی۔
''آپ سوئیں گے اب؟'' پھر وہ جاتے جاتے پلٹی تھی۔ ''میں آپ کی ہیلپ کروں؟''
''نہیں، میں ابھی سوؤں گا نہیں۔ جواد آ جائے تو پھر......'' انہوں نے وہیل چیئر کو کھڑکی کی طرف بڑھایا۔
''بابا!......کھڑکی مت کھولئے گا۔ آج کچھ خنکی ہے باہر۔''
انہوں نے سر ہلا دیا تھا۔ لیکن انجی کے باہر جانے کے بعد انہوں نے شیشہ سرکایا۔ آسمان پر اب بھی ستارے پوری آب وتاب سے چمک رہے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی آسمان کی طرف دیکھتے رہے۔ کھڑکی کھلتے ہی ہلکی سی خنکی اندر در آئی تھی اور ہوا کے جھونکے ان کے چہرے سے ٹکرائے تو انہیں اچھا لگا۔ ان کا جی چاہا، وہ یونہی کھڑکی کھولے بیٹھے رہیں اور باہر سے آتی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ان کے چہرے سے ٹکراتے رہیں۔ عجیب سی آگ تھی جو جسم و جان کو جلائے جاتی تھی۔
اس روز بھی اُن کے اندر ایسی ہی آگ دہک اُٹھی تھی جب مروہ پھپھو نے مختصراً انہیں مائرہ کے فون کا بتایا تھا۔ ان کے نکاح کی تقریب ہو چکی تھی۔

وہ سب سے مبارکبادیں وصول کرتے ہوئے گاہے گاہے ایک نظر عمارہ پر بھی ڈال لیتے تھے جو دُلہن نہیں بنی تھی۔ سادہ سے میک اپ میں سادہ سے جوڑے میں بھی اس کا روپ قیامت ڈھا رہا تھا اور یہ اماں جان کا حکم تھا، چونکہ رُخصتی چند ماہ بعد ہے تو نکاح میں عمارہ کو مکمل دُلہن نہ بنایا جائے بلکہ ان کا تو اصرار تھا کہ عام گھریلو لباس میں نکاح کر دیا جائے۔ جبکہ باقی سب کا خیال تھا کہ اصل تقریب تو نکاح ہی ہے۔ باقی سب تو ثانوی باتیں ہیں۔ تاہم اماں جان کی بات کسی حد تک مان لی گئی تھی کہ دادی جان بھی ان کی ہم نوا تھیں۔
''دراصل اماں جان نے یہ شرط اس لئے لگائی ہے کہ کہیں تم دُلہن دیکھ کر مچل ہی نہ اُٹھو کہ ابھی رُخصتی کر دیں۔'' راحت بھابی نے مذاق کیا تھا۔
''ہاں بھئی! اس کا کیا اعتبار؟ بڑا گھنا ہے۔'' مصطفیٰ بھی بولے تھے۔
''پہلی بار چپکے سے بہاول پور گیا تو آ نے پر منگنی کا شوشہ چھوڑا۔ اور اب پھر اچانک وہاں گیا تو نکاح کی خبر لایا۔'' فلک شاہ مسکرا دیئے تھے۔ منگنی کے لئے تو دادا جان اور دادی جان نے زیادہ کچھ نہیں کہا تھا۔ فوراً ہی تیار ہو گئے تھے۔ لیکن شادی کے لئے وہ قطعی تیار نہیں تھے۔ ان کی بات سن کر وہ یکدم چپ ہو گئے تھے۔
''عبدالرحمٰن نہیں مانے گا بیٹا! اور میں بھی سمجھتا ہوں، پہلے تم اپنی تعلیم مکمل کر لو۔ عمارہ بھی اپنی تعلیم مکمل کر لے۔ عبدالرحمٰن کے خاندان میں پڑھائی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے بیٹا! اسے اب تک تمہارے یو۔ ای۔ ٹی کو چھوڑنے کا دکھ ہے۔''
اور تب انہیں دادا جان کو سب کچھ بتانا پڑا تھا۔
''یہ بہت ضروری ہے دادا جان! ورنہ میں...... ورنہ اس لڑکی نے کچھ ایسا ویسا بدگمان کر دیا بابا جان کو تو میں تو انہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہوں گا۔ میں سچ کہتا ہوں دادا جان! بابا جان نے اگر ایک بدگمانی کی نظر بھی مجھ پر ڈالی تو میں تو اسی وقت مر جاؤں گا۔''
اور دادا جان نے ساری بات سن کر ایک لفظ بھی مزید نہیں کہا تھا اور اسی روز لاہور کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ انہیں الریان چھوڑ کر وہ ہاسٹل آ گئے تھے اور پھر وہ دادا جان کے فون کے انتظار میں بے چینی سے اپنے ہاسٹل کے کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلتے رہے تھے۔ کبھی بیٹھ جاتے، کبھی کھڑے ہو جاتے۔

''کتنی عجیب بات ہے۔ میں فلک مراد شاہ ایک چھوٹی سی لڑکی سے خوف زدہ ہو گیا ہوں۔'' انہیں خود پر ہنسی آئی تھی اور ایسے میں حق نواز کے فون نے انہیں مزید بے چین اور مضطرب کر دیا تھا۔ وہ انہیں کسی فوری نوعیت کی ہنگامی میٹنگ میں شرکت کے لئے کہہ رہا تھا۔

''سوری یار! میرا آج آنا مشکل ہے۔''

''کیوں؟'' حق نواز کے لہجے میں طنز کی جھلک صاف محسوس ہوتی تھی۔ ''کیا ایک بار پھر ہماری پارٹی چھوڑنے کا ارادہ تو نہیں کر لیا؟ جب تم نے رکنیت کا فارم لیا تھا تو میں نے تم سے کہا تھا، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ اس سے پہلے بھی تم ایک بار غیر رسمی طور پر ہی سہی، میری پارٹی جوائن کر کے چھوڑ چکے ہو۔''

''ہاں!'' انہوں نے بے دھیانی سے اس کی بات سنی تھی اور سادگی سے جواب دیا تھا۔

''تب اور بات تھی حق نواز! میں تم سے متاثر ہو کر تمہاری پارٹی میں شامل ہوا تھا۔ لیکن میرے خاندان والے اس کے خلاف تھے اور......''

''تو کیا اب وہ خلاف نہیں ہیں تمہارے سیاست میں آنے کے؟'' حق نواز کو پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ ورنہ وہ اس طرح جرح نہیں کرتا تھا۔

''وہ اب بھی پسند نہیں کرتے میرا سیاست میں آنا۔ لیکن میں نے اس بار انہیں مکمل بے خبر رکھا ہے۔ پہلے شانی کچھ نہ کچھ جانتا تھا، اس لئے مجبوراً مجھے پارٹی چھوڑنا پڑی تھی۔ لیکن اب تو میں نے فارم بھرا ہے رکنیت کا۔ بس کچھ پرابلم ہے۔ آج نہیں آ سکتا۔''

''اوکے!'' حق نواز نے فون بند کر دیا تھا اور وہ مزید پریشان ہوئے تھے۔ اس نے کچھ کہا تو نہیں تھا ایسا۔ پھر بھی انہیں لگا تھا کہ ان کے شرکت نہ کرنے پر حق نواز کچھ ناراض سا ہو گیا ہے۔ وہ بے حد اُلجھے اُلجھے سے بیٹھے تھے جب دادا جان خود ہی چلے آئے تھے اور وہ تقریباً بھاگتے ہوئے باہر آئے تھے۔ اور جب وہ دادا جان کا ہاتھ تھام کر انہیں اندر کمرے میں چلنے کو کہہ رہے تھے تو دادا جان نے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھا تھا اور پھر یکدم ہی گلے سے لگا لیا تھا۔

''تُو بہت لکی ہے یار!...... عبدالرحمٰن مان گیا ہے۔ فی الحال نکاح ہو گا اور عمارہ کے ایگزام کے بعد رخصتی۔''

اور بے حد سکون محسوس کرتے ہوئے وہ انہیں اپنے کمرے میں لے آئے تھے لیکن دادا جان زیادہ دیر نہیں ٹھہرے تھے۔ وہ الریان سے ڈرائیور کو ساتھ لے کر مٹھائی لینے نکلے تھے اور انہوں نے سوچا تھا، وہ انہیں بھی بتاتے چلیں۔

''کیا خیال ہے فلک! سات کلو مٹھائی لے جاؤں؟''

''دادا جان! مجھے کیا پتہ؟'' وہ ہولے سے ہنس دیئے تھے۔

''یار! خوشی کا موقع ہے۔ تم بھی چلو، وہاں الریان میں اس وقت بڑی رونق ہے۔ تمہارے نکاح کے ساتھ ساتھ مصطفیٰ اور عشان کی شادی کی تاریخ بھی طے کی جا رہی ہے۔''

اور انہیں یکدم حق نواز کی ناراضگی کا خیال آ گیا تھا۔

''مجھے ایک ضروری کام ہے دادا جان! میں کچھ دیر تک آتا ہوں۔ آپ جائیں۔''

اور پھر دادا جان کو رخصت کر کے وہ بے حد مطمئن ہو کر پارٹی کے دفتر آ گئے تھے۔

انہیں دیکھ کر حق نواز کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ اُٹھی تھی۔

بنگلہ دیش نامنظور کی تحریک تو دم توڑ چکی تھی۔ اس وقت نہ جانے کیا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ چپکے سے جا کر حق نواز کے نزدیک ہی خالی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

''جمہوریت۔''

''انتخابات۔''

''مخلص سربراہ۔''

نہ جانے کن کن موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں لیکن ان کا ذہن بار بار ''الریان'' کی طرف جاتا تھا جہاں اس وقت رونق لگی ہوگی۔ وہ ''الریان'' سے ہاسٹل چلے آتے تھے تو بہت ساری باتوں کا انہیں علم نہیں ہو پاتا تھا۔ مصطفیٰ اور عثمان کی شادیاں تو طے تھیں۔ ثنا بھابی سے اس کی ملاقات بھی ہو چکی تھی اور راحت بھابی کی یہ کزن انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ لیکن اتنی جلدی ان کی شادی ہو رہی تھی، اس کا انہیں علم نہیں تھا اور قصور ان کا ہی تھا۔ حق نواز کی پارٹی میں شامل ہونے کے بعد وہ اس طرح اتنی باقاعدگی سے الریان جا نہیں پاتے تھے۔

اور جب وہ دفتر سے نکلے تو بہت رات ہو گئی تھی اور اس وقت انہیں الریان جانا مناسب نہیں لگا تھا۔

''ارے کہیں سچ مچ تو رخصتی کے متعلق نہیں سوچنے لگے تم؟''

مصطفیٰ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھا تھا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے تھے۔

''اگر سوچوں بھی تو بابا جان بھلا کہاں رخصت کریں گے عمارہ کو؟''

''بابا جان تمہاری کوئی بات ٹالتے بھی تو نہیں ہیں۔'' مصطفیٰ نے کہا تھا اور اس وقت انہوں نے بابا جان کے لئے اپنے دل میں بڑا مان اور یقین محسوس کیا تھا۔

''اور میں، بابا جان کو کسی آزمائش میں ڈالوں ہی کیوں؟''

انہوں نے ایک بار کن اکھیوں سے عمارہ کی طرف دیکھا تھا جو جانے زارا سے کیا کہہ رہی تھی۔ مصطفیٰ کسی کے بلانے پر وہاں سے چلے گئے تھے اور وہ دادی جان کو دیکھنے کے لئے لان کے اس حصے کی طرف آئے تھے جہاں کچھ دیر پہلے دادی جان بیٹھی تھیں۔

گھر کے وسیع لان میں ہی تقریب کا انتظام کیا گیا تھا۔ صرف گھر کے افراد اور عبدالرحمٰن شاہ کے قریبی رشتہ دار اور احباب وغیرہ تھے۔

لان کے اس حصے میں انہیں دادی جان تو نظر نہ آئی تھیں، ہاں مروہ پھپھو ایک کرسی پر بیٹھی نظر آ گئی تھیں جو جھک کر اپنے پاؤں کو دبا رہی تھیں۔

''کیا ہوا پھپھو؟'' ان کے قریب آ کر انہوں نے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں۔ اتنی ہائی ہیل تھی۔ پاؤں میں درد ہونے لگا تھا۔ زارا کو فلیٹ جوتا لانے کے لئے بھیجا ہے اندر۔''

''دادی جان کہاں ہیں؟''

''وہ زارا کے ساتھ ہی اندر چلی گئی ہیں۔''

''طبیعت تو ٹھیک تھی نا؟'' وہ پریشان ہوئے۔

''ہاں، شاید تھک گئی تھیں۔'' مروہ نے ان کی طرف دیکھا۔

''تھینک گاڈ، مومی! سب کچھ خیر خیریت سے ہو گیا۔ ورنہ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔''

''کس بات کا ڈر پھپھو؟'' وہ حیران ہوئے تھے۔

''مائرہ کا...... بہت جنونی ہو رہی ہے وہ لڑکی۔ پتہ ہے اس روز اس نے یہاں الریان میں فون کیا تھا۔'' وہ انہیں مصطفیٰ کے پاس آنے والے فون کے متعلق بتانے لگی تھیں اور انہیں لگا تھا جیسے ان کے پورے وجود میں آگ دہک اُٹھی تھی۔

''اب نہیں پھپھو!...... اب میں نہیں چھوڑوں گا اس لڑکی کو۔''

''پاگل ہو گئے ہو مومی! خوامخواہ بات بڑھانے سے فائدہ؟...... اب تمہارا نکاح ہو گیا ہے۔ اب بھلا کیا ہو سکتا ہے؟

اور کیا کرنا ہے اس نے؟''

''کچھ بھی کر سکتی ہے وہ۔ پھپھو! پلیز، مت روکیں مجھے۔ میں ابھی اسی وقت رحیم یار خان جا رہا ہوں۔ میں اُسے سبق سکھاؤں گا۔ دوسروں کی عزت اُچھالنے والی کی جب اپنی عزت پر بات آئے گی تو.......''

''بیٹھ جاؤ مومی!'' مروہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا تھا۔

''ریلیکس ہو جاؤ۔ بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ میرے سسرال کا معاملہ ہے۔''

اور پھر مروہ پھپھو بہت دیر تک اُنہیں سمجھاتی رہی تھیں۔ لیکن اُن کے اندر دہکتی آگ کو ٹھنڈا ہونے میں کئی دن لگ گئے تھے اور وہ مصطفیٰ اور عثمان کی شادی کو بھی صحیح طرح سے انجوائے نہیں کر پائے تھے۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ دادا جان اور دادی جان واپس بہاول پور چلے گئے۔ مصطفیٰ اور عثمان کی شادیاں بخیر و خوبی ہو گئی تھیں۔ وہ ہاسٹل واپس آ گئے تھے۔ لیکن غیر ارادی طور پر وہ کئی دن تک منتظر رہے کسی انہونی کے۔

پتہ نہیں کیوں، اُنہیں لگتا تھا کہ مائرہ کسی روز اُن کے ہاسٹل آ دھمکے گی اور پھر وہ کیا کرے گی؟ وہ اس کے متعلق کچھ بھی اندازہ نہیں کر پا رہے تھے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ البتہ احسان آ گیا تھا۔ بے حد خوش اور مطمئن۔

''بہت پڑھاکو ہو گئے ہو۔'' آتے ہی پہلے اس نے ان کے ہاتھ سے کتاب چھین کر پھینکی تھی۔

''کہاں غائب ہو؟ ویک اینڈ پر سب ہی تمہارا انتظار کرتے رہے۔''

''کہیں بھی نہیں۔ ہاسٹل میں ہی رہا۔ فلو ہو رہا تھا۔'' اندر کے خوف کو چھپا کر انہوں نے چپکے سے احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

''فلو ہو گیا تھا اور یہاں پڑے رہے اکیلے۔ تم کچھ اجنبی نہیں ہوتے جا رہے ہو مومی؟'' احسان نے گلہ کیا تھا۔

اور وہ چپ رہے تھے۔ جب سے مروہ پھپھو نے مائرہ کے فون کے متعلق بتایا تھا، اندر سے وہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اس بات کا تو اُنہیں یقین تھا کہ وہ فون مائرہ کا ہی تھا۔ شک و شبے کی تو اس میں کوئی گنجائش تھی ہی نہیں۔ اور انہوں نے مروہ پھپھو کے سمجھانے کے باوجود سوچ رکھا تھا کہ اگر مائرہ شادی میں شرکت کے لئے آئی تو وہ ضرور اس سے بات کریں گے۔ لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ احسان اس کے نہ آنے پر بے حد مایوس ہوا تھا لیکن مروہ پھپھو مطمئن تھیں۔

''اچھا ہے نہیں آئی۔ ورنہ خوامخواہ مجھے ٹینشن رہتی۔ تم نہیں جانتے ہو مومی! وہ بڑی انتقامی فطرت کی لڑکی ہے۔ یہاں آ کر پتہ نہیں کیا کرتی۔''

''پتہ ہے۔'' اُنہیں اُسے خاموش دیکھ کر احسان نے بتایا۔ ''مائرہ نے مجھے فون کیا تھا۔''

''کیا.....کیا کہا اس نے؟'' وہ یکدم اُچھل پڑے تھے۔

''کچھ خاص نہیں۔'' احسان ان کے بیڈ پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ خوشی اُس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔

''لیکن مجھے لگتا ہے مومی! تمہاری سفارش کام آ گئی۔ پتہ ہے وہ کہہ رہی تھی، مومی تمہاری بہت تعریف کرتا تھا۔''

''اچھا.....ایسا کہا اس نے؟'' وہ زبردستی مسکرائے تھے۔

''ہاں!'' احسان بے حد مطمئن تھا۔ ''بہت دیر تک باتیں کرتی رہی۔ آج میں اسے فون کروں گا۔''

''اچھا.....'' وہ اُلجھے ہوئے تھے لیکن احسان بہت خوش تھا اور اس خوشی میں وہ بہت دیر تک مال پر گھومتے رہے اور واپسی میں انہوں نے عمارہ اور زارا کی پسندیدہ آئس کریم لی تھی اور ''الریان'' آ گئے تھے۔ پھر مصطفیٰ، ثنا بھابی، عثمان بھائی اور امیرہ کے ساتھ وہ ایک شاندار شام گزار کر ہاسٹل واپس آئے تھے تو حق نواز کا پیغام ان کا منتظر تھا۔

اور پھر اگلے کئی دن وہ حق نواز کے ساتھ مصروف رہے۔ پارٹی کی میٹنگز، اجلاس وغیرہ اور جب وہ فارغ ہو کر الریان گئے تو احسان شاہ نے انہیں خوشخبری سنائی تھی۔

''مومی یار! میں نے بالآخر مائرہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔'' وہ بے حد خوش تھا۔

''اور مائرہ نے کیا کہا؟'' انہوں نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔

''اس نے میرے جذبوں کی پذیرائی بڑے خوب صورت انداز میں کی، مومی! اس نے کہا کہ میں اپنے والدین کو اس کے گھر بھجواؤں۔''

اور ان کے دل میں دور تک اطمینان پھیلتا چلا گیا تھا۔ اللہ نے شاید اُن کی دعائیں قبول کر لی تھیں جو انہوں نے احسان کے لئے کی تھیں۔ اور یہ لڑکیاں بھی کتنی بے وقوف ہوتی ہیں۔ لیکن شکر ہے، مائرہ کو عقل آ گئی ہے۔ بھلا شانی جیسا لڑکا جو اسے اتنا چاہتا ہے، کہیں مل سکتا ہے؟

اور اس روز بڑے دنوں بعد انہیں اپنے دل سے بوجھ سرکتا ہوا سا محسوس ہوا تھا اور اس روز بڑے دنوں بعد ان کا دل چاہا تھا کہ وہ آج الریان میں ہی رک جائیں اور اس روز وہ بابا جان سے اجازت لے کر زارا، عمارہ اور احسان شاہ کے ساتھ فلم دیکھنے گئے تھے اور زارا کو مخاطب کر کے ذومعنی باتیں کرنا اور عمارہ کے رخسار پر پھیلتے رنگوں کو دیکھنا انہیں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

اور اس رات جب وہ اپنے بیڈ پر لیٹے تھے تو انہیں لگا تھا جیسے آج نہ جانے کتنے دن بعد وہ سکون سے سوئیں گے۔

اور پھر کئی دن گزر گئے۔ وہ بے حد مطمئن ہو کر اپنی پڑھائی اور پارٹی کے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ وہ بہت کم ''الریان'' جا پاتے تھے۔ لیکن جس روز ''الریان'' جاتے، وہاں جیسے عید کا سا سماں ہو جاتا۔ سب لاؤنج میں اکٹھے ہو جاتے۔ بابا جان اور اماں جان بھی کچھ دیر کو ان کی محفل میں بیٹھتے تھے۔

ان دنوں احسان شاہ کی شوخیاں عروج پر تھیں۔ احسان شاہ اور مائرہ کے درمیان اکثر فون پر بات چیت ہو جاتی اور احسان شاہ ہر بات انہیں بتاتے اور ہر بار احسان شاہ سے مل کر وہ مزید مطمئن ہو جاتے۔ اس روز تو احسان شاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ وہ ہاسٹل کے کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے جب احسان شاہ نے آ کر ان کا کمبل کھینچا تھا۔

چھٹی ہونے کی وجہ سے ان کا بہت دیر تک اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ کیونکہ رات کافی دیر تک وہ پروفیسر الطاف کے ساتھ رہے تھے۔

انہوں نے کمبل کو خود پر لپیٹ کر کروٹ بدل لی تھی۔ تب احسان شاہ نے بازو سے پکڑ کر اُنہیں جھنجوڑا تھا۔

''اُٹھو یار! گیارہ بج رہے ہیں۔''

اور جب انہوں نے بیڈ کے پاس کھڑے احسان شاہ کو دیکھا تو یک دم گھبرا گئے تھے اور اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر تقریباً چیختے ہوئے پوچھا تھا۔

''کیا ہوا شانی! سب ٹھیک تو ہیں نا؟...... بابا جان، دادا جان اور سب؟'' اُن کی آواز گھٹ گئی تھی۔

''یار! سب ٹھیک ہے۔ سب خیریت ہے۔'' احسان نے ہولے سے ان کا بازو تھپتھپایا تھا۔ ''آج بھی پہلے کی طرح نیند سے اچانک اُٹھانے پر گھبرا جاتے ہو۔''

اور انہوں نے اپنے تیزی سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

اور انہیں وہ شام یاد آ گئی تھی، جب وہ پہلی بار ''الریان'' میں آئے تھے اور دادا جان، بابا کو لے کر چلے گئے تھے اور اس دوپہر وہ بہت گہری نیند سو رہے تھے جب احسان شاہ نے اُنہیں جھنجوڑ کر جگا دیا تھا اور وہ وحشت بھری آنکھوں سے اسے اور اس کے قریب کھڑی عمارہ کو دیکھنے لگے تھے۔ انہیں لگا تھا جیسے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ لیکن ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

''بابا!'' ان کے کانپتے لبوں سے نکلا تھا۔ ''بابا تو ٹھیک ہیں نا؟''

اور عمارہ نے چمکتی آنکھوں اور سرخ چہرے کے ساتھ بتایا تھا۔

''وہ...... مومی! باہر لان میں امرود کے درخت پر طوطا بیٹھا ہوا ہے، سرخ کنٹھے والا۔''

تیز تیز بولتے ہوئے عمارہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا تھا لیکن وہ کتنی ہی دیر تک وحشت زدہ سے اس کی بات سمجھے بغیر اسے دیکھتے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بابا آ رہے تھے۔
بابا...... جن سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ اور ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان سے بہت ساری باتیں کریں۔ لیکن وہ بیمار تھے اور ابھی کچھ دیر پہلے ہی بابا نے ان سے بات کی تھی۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہے تھے اور انہوں نے کہا تھا۔
''مومل بیٹا! آپ کو ہمیشہ بہادری کے ساتھ مشکلات اور غموں کو برداشت کرنا ہے۔''
ان کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ وہ بمشکل ان کی بات سمجھ رہے تھے۔
''تو کیا......؟''
وہ خوف زدہ نظروں سے شانی اور عمارہ کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں عمارہ کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ تب احسان شاہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اور جوش سے بولے تھے۔
''مومی یار! اُٹھو نا...... وہ طوطے اُڑ جائیں گے...... دو...... دو طوطے ہیں، سرخ کنٹھوں والے۔ پکڑتے ہیں جا کر۔ مالی بابا کہتے ہیں، سرخ کنٹھوں والے طوطے بولنا جلدی سیکھ جاتے ہیں۔''
اور تب کہیں جا کر ان کی وحشت ختم ہوئی تھی۔
''کیا ہو گیا ہے مومی! سب ٹھیک ہے، سب خیریت ہے۔'' احسان شاہ نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ بولے تھے۔
''پھر اتنی صبح تم کیسے آ گئے شانی؟''
''صبح کہاں...... گیارہ بج رہے ہیں یار!''
''لیکن اتوار کو تو تمہاری صبح اتنی جلدی نہیں ہوتی۔ پھر آج......'' انہوں نے جیسے حواس میں آتے ہوئے اسے بغور دیکھا تھا۔
اس کی چمکتی آنکھوں کو اور اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ کو۔
''آج بہت خاص بات ہے یار!...... آج مائرہ نے مجھ سے اظہار محبت کیا ہے۔ یار مومی! وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ بہت محبت کرنے لگی ہے مجھ سے۔ پتہ ہے، اس نے کہا ہے، وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی اب۔''
''تو......؟'' انہوں نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔ ''تم نے اماں جان اور بابا جان سے بات کی؟''
''نہیں۔'' احسان شاہ نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ''ثنا بھابی سے کچھ دن پہلے بات ہوئی تھی اور انہوں نے سرسری سا ذکر کیا تھا اماں جان سے۔ لیکن اماں جان نے کہا، مروہ کے سسرال میں وہ رشتہ نہیں کریں گی۔ اس طرح وٹہ سٹہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو دو خاندان متاثر ہوتے ہیں۔ اور پھر مائرہ، شانی سے عمر میں بڑی ہے۔''
''تو پھر تم کیا کرو گے شانی؟'' وہ پریشان سے ہو گئے تھے۔
''میں مروہ پھپھو سے بات کروں گا۔ وہی کچھ کر سکتی ہیں۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ تم بات کرنا پھپھو سے۔''
''کیا پھپھو آئی ہوئی ہیں؟''
''نہیں تو۔ ہم رحیم یار خان جائیں گے۔''
''ابھی......؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا تھا۔
''ہاں ابھی۔ اور تم فٹافٹ تیار ہو جاؤ، دس منٹ میں۔ ناشتہ ہم کہیں باہر کر لیں گے راستے میں۔''
وہ اُٹھے تھے اور احسان شاہ ان کے بیڈ پر نیم دراز ہو کر انہیں تیار ہوتے دیکھنے لگا تھا۔ اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ ان کے ساتھ رحیم یار خان جا رہے تھے۔
''بابا جان! آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟'' جواد نے اندر قدم رکھا تھا اور انہوں نے چونک کر مڑتے ہوئے اسے

دیکھا اور کھڑکی بند کر دی تھی۔
''تمہارا انتظار کر رہا تھا بیٹا!''
''سوری بابا! کچھ دیر ہو گئی۔ جن لوگوں سے ملنا تھا، وہ بہت دیر سے آئے تھے۔''
''کوئی بات نہیں یار! مجھے تو آج ویسے ہی نیند نہیں آ رہی تھی۔ تم نے کھانا کھا لیا؟''
''ہوں ابھی کھانا لگانے لگی تھی۔ میں آپ کی طرف آ گیا۔''
''جاؤ، کھانا کھا لو۔'' انہوں نے محبت سے اسے دیکھا۔
''آپ تھک گئے ہوں گے، لیٹ جائیں اب۔''
انہوں نے سر ہلا دیا۔
تب جواد نے ان کی مدد کی اور لیٹنے کے بعد ان پر کمبل پھیلا دیا۔
''شکریہ بیٹا!'' ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''کس بات کا بابا جان؟'' جواد نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''کیا باپ کو اتنی سی بات پر بیٹے کا شکریہ ادا کرنا چاہئے؟''
''سوری بیٹا! ایسے ہی عادتاً کہہ دیا۔ تم اب جاؤ۔ میں بھی سونے لگا ہوں۔''
جواد چلا گیا تو انہوں نے آنکھیں موند لیں اور بہت سارے منظر آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔
ان کا رحیم یار خان جانا، مروہ پھپھو کا ان سے وعدہ کرنا کہ وہ شانی اور مائرہ کے رشتے کے لئے بابا جان اور اماں جان کو قائل کرنے کی پوری کوشش کریں گی اگرچہ وہ خود اس کے حق میں ہرگز نہیں تھیں اور انہوں نے احسان شاہ کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن احسان شاہ نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔
''مروہ پھپھو! مجھے شادی کرنا ہے تو صرف مائرہ سے......ورنہ نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں پھپھو!''
''تم یقیناً اس سے محبت کرتے ہو گے شانی! لیکن وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ مجھے اس کا یقین نہیں۔''
احسان شاہ نے چونک کر مروہ پھپھو کو دیکھا تھا اور پھر لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔
''سو واٹ......مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔''
تب مروہ پھپھو نے بے بسی سے انہیں دیکھا تھا۔
''مومی! تم نے اسے سمجھایا نہیں، یہ مناسب نہیں ہے۔''
''محبت میں آدمی بے اختیار ہو جاتا ہے پھپھو! اس میں مناسب، نامناسب کا جوش نہیں رہتا۔ یہ یونہی جکڑ لیتی ہے آدمی کو اپنے شکنجے میں۔ بس آپ بابا جان کو راضی کریں کسی طرح۔''
پھپھو سے جلد لاہور آنے کا وعدہ لے کر وہ اُٹھے تھے اور گیٹ سے نکلتے نکلتے ایک دم احسان شاہ کو پھپھو سے کوئی اہم بات کرنا یاد آ گیا تھا اور وہ انہیں گیٹ کے پاس کھڑا ہونے کا کہہ کر واپس اندر چلا گیا تھا۔ اور جب وہ گیٹ کے پاس کھڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے تو گیٹ کھول کر مائرہ اندر داخل ہوئی تھی اور وہ بلاوجہ ہی گھبرا گئے تھے۔ لیکن وہ بہت اعتماد سے چلتی ہوئی ان کے قریب آئی تھی۔
''السلام علیکم!''
''کیسی ہیں آپ؟'' اس کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے پوچھا تھا لیکن ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔
''تمہارے خیال میں کیسا ہونا چاہئے مجھے؟'' اس نے تیکھے لہجے میں کہا تھا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے انہوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔

''ایک بات یاد رکھنا مومی شاہ! تم نے مائرہ حسین کی محبت ٹھکرا کر اس کی توہین کی ہے اور مائرہ اپنی توہین نہیں بھولتی..... کبھی بھی نہیں۔'' وہ بات مکمل کر کے تیزی سے اندرونی گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''مائرہ! پلیز سنیں۔ ایک منٹ رکیں۔''

وہ اُسے بتانا چاہتے تھے کہ انہوں نے اس کی محبت کی توہین نہیں کی۔ بلکہ وہ تو پہلے ہی کسی کی محبت کے اسیر ہو چکے تھے اور جو دل پہلے ہی اسیر ہو چکا ہو، اس میں بھلا کسی اور دل کی محبت کیسے سما سکتی ہے؟

وہ رُکی نہیں تھی۔ اور تب ہی اندر سے احسان شاہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا اور پورچ کی سیڑھیاں چڑھتی مائرہ کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اُٹھا تھا اور اس نے آواز دے کر کہا تھا۔

''مومی! تم جا کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

اور وہ بے حد پریشان سے، بیرونی گیٹ کھول کر باہر آئے تھے اور گیٹ کے ساتھ ہی کھڑی احسان شاہ کی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ جو مائرہ کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گئے تھے، ایک بار پھر بے چین ہو گئے تھے۔ یہ لڑکی پتہ نہیں کیا کرے گی ان کے ساتھ۔ عمارہ کے ساتھ۔ ان کے کانوں میں مائرہ کی آواز گونجی۔

''مائرہ حسین اپنی توہین نہیں بھولتی۔''

بے حد مضطرب سا ہو کر انہوں نے سامنے سے آتے احسان شاہ کو دیکھا اور یونہی نظریں اٹھائے اسے قریب آتا دیکھتے رہے۔

''ارے گاڑی کی چابی تمہارے پاس نہیں تھی کیا؟'' قریب آکر احسان شاہ نے پوچھا تھا۔

''ہاں، میرے پاس ہی تھی۔'' وہ مڑ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگے تھے۔

احسان شاہ کی آنکھیں محبوب کے دیدار کی خوشی سے دمک رہی تھیں۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''یار اتم خود ڈرائیو کرلو۔'' گاڑی کی چابی احسان شاہ کو دیتے ہوئے وہ چکر کاٹ کر پسنجر سیٹ پر آکر بیٹھ گئے تھے۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا مومی؟''

''ہاں۔ بس ہلکا سا سر میں درد ہے اور نیند آرہی ہے۔ میں نے سوچا، کہیں سو نہ جاؤں اور.....'' وہ زبردستی مسکرائے تھے۔

''اوکے۔ تم ایزی ہو کے بیٹھ جاؤ اور سو جاؤ کچھ دیر۔''

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے سیٹ کی پشت پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں اور احسان شاہ ڈرائیو کرتے ہوئے ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔

کتنی بار ان کا جی چاہا، وہ احسان شاہ سے سب کہہ دیں۔ وہ سب جو اُن کے اور مائرہ کے درمیان تھا۔ اور جسے صرف وہ دو جانتی تھیں۔ لیکن پھر اُن کی ہمت نہ ہوئی۔ احسان شاہ اتنا خوش تھا۔ وہ کیسے..... کیسے اُس کی خوشی چھین لیتے؟ ''نہیں، وہ کیا سوچتا..... وہ اب صرف اس کے دوست نہیں تھے، اس کی بے حد لاڈلی بہن کے شوہر بھی تھے۔

کاش! وہ اس وقت احسان شاہ کو سب کچھ بتا دیتے۔ ایک ایک حرف تو شاید آج وہ ان سب سے اور ''الریان'' سے دور نہ ہوتے۔

ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور انہیں اس وقت ''الریان'' کی بے تحاشا یاد آئی تھی۔ ''الریان'' اور اس کے باسی ان کی محبت تو ان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتی تھی۔ انہوں نے کروٹ بدلی۔ اب ان کا رخ دیوار کی طرف تھا وہ بے آواز رو رہے تھے۔ آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

✲○✲

حسن رضا تخت پر دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ہوئے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھے تھے۔ ان کا چہرہ سُتا ہوا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ وہ کل صبح سے یونہی تخت پر بیٹھے تھے اسی کیفیت میں۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر وہ خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ لیتے تھے اور پھر کبھی گھٹنوں پر سر رکھ لیتے۔ کبھی آنکھیں بہنے لگتیں۔ اور جب آنسو خشک ہو جاتے تو وہ گھٹنوں پر سر رکھ لیتے۔

کل صبح وہ دروازے سے ٹیک لگائے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور دروازے کے باہر احمد رضا بار بار انہیں پکار رہا تھا۔

''ابو......ابو پلیز۔'' وہ دستک دے رہا تھا۔

اور وہ جیسے اس کی آواز نہیں سن رہے تھے۔ ان کا دل تو کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔ روتے روتے یکایک اُنہیں لگا تھا جیسے ان کے اردگرد آوازیں مر گئی ہوں انہوں نے چونک کر بند دروازے کو دیکھا تھا اور پھر ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بے یقینی سے بند دروازے کو دیکھنے لگے تھے۔

کیا وہ چلا گیا؟...... یہ کیا، کیا انہوں نے؟......اسے، اپنے اکلوتے بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے خوابوں کو اپنی آنکھوں سے نوچ کر پھینک دیا۔ وہ اسے سمجھا بھی تو سکتے تھے۔ توبہ کا در تو ہر لحہ کھلا ہے، وہ توبہ کر لیتا تو اللہ ضرور اسے معاف کر دیتا۔ وہ تو نادان ہے، بچہ ہے۔ جانے کس مرتد، کافر نے اسے ورغلا دیا ہے۔ اولاد کی محبت ہر جذبے پر غالب آ گئی تھی۔ انہوں نے بے چینی سے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے اور ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

''رضی!''

ان کی نظروں نے پوری گلی کا جائزہ لے ڈالا تھا۔ گلی دُور دُور تک سنسان پڑی تھی۔

'نہیں......وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ اس طرح ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔'

وہ یونہی دروازہ کھلا چھوڑ کر گلی میں نکل آئے تھے۔ احمد رضا کہیں نہ تھا۔ لحہ بھر وہ یونہی سڑک کے کنارے کھڑے رہے، پھر مایوسی سے سر جھکائے واپس پلٹ آئے اور تھکے تھکے سے آ کر تخت پر بیٹھ گئے تھے۔ اور تب سے اب تک وہ یہاں ہی بیٹھے تھے۔ یونہی، اسی طرح۔ اُنہیں یاد نہیں تھا کہ انہوں نے ساری نمازیں پڑھی تھیں یا نہیں۔ صبح سے رات ہو گئی تھی۔ وہ یونہی تخت پر بیٹھے رہے تھے۔ انہوں نے اس کی زندگی کے ایک ایک لمحے کے متعلق سوچ ڈالا تھا۔

وہ جب پیدا ہوا تھا......اس نے جب پہلی بار اُنہیں ابو کہہ کر بلایا تھا...... جب پہلی بار اپنی توتلی زبان سے اس نے بسم اللہ اور کلمہ طیبہ سنایا تھا۔

''پہلا کلمہ طیب۔ طیب معنی پاک۔''

جب وہ رک رک کر پڑھتا تو اُن کا رواں رواں خوشی سے سرشار ہو جاتا تھا۔

جب اُس نے انہیں پہلی بار سورۂ کوثر سنائی تھی تو وہ صرف اڑھائی سال کا تھا۔ انہوں نے حیرت اور خوشی سے اسے کتنی بار چوما تھا اور فخر سے اس کی طرف دیکھتی زبیدہ سے پوچھا تھا۔

''یہ...... یہ تم نے یاد کروائی ہے اسے؟''

اور پھر جب وہ پہلی بار اس کے ساتھ سکول گئے تھے...... کتنے سارے لمحے تھے جو بہت یادگار اور حیران کُن تھے۔

وہ اتنا ذہین تھا۔ اتنا حسین تھا۔ پھر کس چیز نے اُسے گمراہ کر دیا؟ کیسے یقین کر لیا اس نے اُس کذاب کی باتوں پر؟...... کیونکر اخبار والوں کے سامنے اُس کی پارسائی کی گواہی دی؟

وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر حجت کرتا تھا۔ ہر ایک کی تہہ تک پہنچتا تھا۔ پھر کیسے؟...... کیوں؟...... اور اس سوال کا جواب وہ پوری رات ڈھونڈتے رہے تھے لیکن انہیں سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ یہاں تک کہ مسجد سے صبح کی اذان سنائی دی تھی۔ پتہ نہیں کیسے وہ اُٹھے تھے۔ کیسے انہوں نے نماز پڑھی تھی۔ اور پھر نماز کے بعد بنا دعا مانگے وہ پھر تخت پر آ کر بیٹھ

ے۔ پوری رات دروازہ کھلا رہا تھا۔ انہوں نے گیٹ کو بند کر کے کنڈی نہیں لگائی تھی۔ صبح شمو دروازہ کھول کر اندر آ
ئی تھی۔ اس نے صفائی کی تھی، ان کے لئے ناشتہ بنایا تھا۔ ناشتے کی ٹرے اب بھی تخت پر یونہی پڑی تھی۔ انہوں نے
نہیں کیا تھا۔ کل سے اب تک سوائے چند گھونٹ پانی کے کچھ بھی ان کے حلق سے نہیں اُترا تھا۔ شمو نے صفائی کرتے،
ک کرتے کئی بار بہت غور سے اُنہیں دیکھا تھا اور ان کے قریب آ کر کچھ پوچھا بھی تھا۔ شاید ان کی طبیعت کے
ق۔ انہوں نے یونہی سر ہلا دیا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کے اندر سے سب کچھ خالی ہو گیا ہو۔ فون کی گھنٹی بھی بجی
ی۔ شمو نے فون اٹھا کر بات کی تھی۔ وہ یونہی اُسے دیکھتے رہے تھے، اُمید بھری نظروں سے شاید..... شاید۔

''سمیرا آپی کا فون ہے رحیم یار خان سے۔ میں نے آپ کی طبیعت کا بتایا ہے۔''

انہوں نے آدھی بات سنی تھی۔ ''سمیرا آپی کا فون ہے۔'' اس کے بعد اس نے کیا کہا تھا، انہوں نے نہیں سنا تھا۔
ن نے ان کے دل میں پنجے گاڑ دیئے تھے۔ پوری رات گزر گئی تھی، اس نے فون نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے کیے پر شرمندہ
ں تھا۔ نادم نہیں تھا۔ ذرا بھی نہیں۔

پھر شمو چلی گئی تھی۔

''میاں صاحب! دروازہ بند کر لیں اور کنڈی لگا لیں۔'' جاتے جاتے اس نے تاکید کی تھی۔ لیکن وہ یونہی بیٹھے رہے
ے۔ اور اب عصر ہونے والی تھی، دھوپ برآمدے سے سمٹ کر صحن میں آ گئی تھی۔

''آہ.....!'' انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کون سی چیز اسے وہاں تک لے گئی؟ کاش میں جان پاتا۔ زبیدہ نے تو
ں کی تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی...... چھوٹی سی عمر میں اسے بہت ساری دعائیں زبانی یاد تھیں۔

وہ اُسے رات کو جب سلانے کے لئے لٹاتی تو سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کچھ نہ کچھ بتاتی۔ خلفائے
دین کے متعلق بتاتی۔ اسلامی کہانیاں سننے کا اسے کتنا چسکا تھا۔

بچپن میں وہ محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور صلاح الدین ایوبی بننے کی خواہش کرتا تھا۔ لیکن اب کیا بن گیا تھا؟
ار میں کیا لکھا تھا۔ انہوں نے نظر گھما کر اخبار کا وہ مڑا تڑا ٹکڑا اُٹھایا جو ٹرے کے پاس پڑا تھا۔
ٹرے میں صبح کے ناشتے کے سلائس سوکھے پڑے تھے۔ آملیٹ بھی جیسے عجیب سا ہو گیا تھا۔ انہوں نے ٹرے اٹھا کر
رکھ دی اور اخبار کو سیدھا کیا۔

''احمد رضا کو اسمٰعیل نے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔'' وہ نہ تو محمد بن قاسم بنا تھا، نہ طارق بن زیاد۔ وہ تو ایک مرتد شخص کا
مرید تھا۔

ایک بار پھر اخبار کو موڑ توڑ کر انہوں نے پھینک دیا اور ایک بار پھر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔
انہوں نے اپنے آنسو پونچھنے کے لئے ہاتھ اونچے کیے تو انہیں لگا جیسے آنکھوں کی نیچے کی جگہ چھل گئی ہو۔ انہوں نے ہاتھ
گر لئے۔ تب ہی گیٹ پر بیل ہوئی اور پھر ساتھ ہی کسی نے دروازہ دھکیلا۔ وہ اُٹھتے اُٹھتے بیٹھ گئے تھے۔ گیٹ کھلا،
اور زبیدہ اندر داخل ہوئیں۔ زبیدہ نے ہاتھ میں بیگ اٹھا رکھا تھا۔ زبیدہ کے ہاتھ میں بھی بیگ تھا۔ وہ سپاٹ
ں سے انہیں صحن پار کرتے اور پھر برآمدے کی طرف آتے دیکھتے رہے۔ سمیرا نے برآمدے میں قدم رکھتے ہی بیگ
رکھا اور تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

''ابو!...... ابو! کیا ہوا ہے؟..... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟....... شمو نے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

وہ جیسے کچھ نہیں سن رہے تھے۔ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہوا احمد کے ابو! آپ بولتے کیوں نہیں؟...... رضی کہاں ہے؟...... وہ ٹھیک تو ہے نا؟'' زبیدہ نے ان کی سوجی
ہوئی آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

وہ جیسے کچھ نہیں سن رہے تھے۔ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

احمد کے نام پر ان کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی تھی۔ شدتِ گریہ سے سوجی ہوئی آنکھیں بمشکل کھل رہی تھیں۔

''احمد......!''

انہوں نے نظریں اُٹھا کر زبیدہ کی طرف دیکھا۔

''احمد رضا......!'' ان کے لبوں سے پھر نکلا۔

''ہم لٹ گئے زبیدہ!...... ہماری پونجی چھن گئی۔ ہمارا سرمایہ، ہمارا خزانہ مٹی میں مل گیا۔'' پھر آنسوؤں نے ان کا حلق بند کر دیا۔

''رضی!......رضی! کیا ہوا ہے؟......کہاں ہو تم؟''

سمیرا تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکی اور ابھی اس نے تیسری سیڑھی پر قدم رکھا تھا جب حسن رضا کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''زبیدہ! تمہارا احمد رضا...... ہمارا رضی مر گیا۔''

''نہیں......'' ایک چیخ کے ساتھ سمیرا وہاں ہی، اسی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

''مرتد ہو گیا......وہ کافر ہو گیا زبیدہ!......نکال دیا میں نے اسے گھر سے۔ چلا گیا وہ۔''

''نہیں......میرا بیٹا ایسا نہیں ہے احمد کے ابا!'' زبیدہ ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئی تھیں اور اب ان کا ہاتھ پکڑ بار بار ایک ہی بات کی تکرار کئے جا رہی تھیں۔ ''ضرور آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے احمد کے ابا! وہ کہاں ہے؟...... بلائیں اسے۔ میں پوچھتی ہوں خود اس سے......رضی!......رضی! نیچے آؤ۔'' انہوں نے آواز دی اور سیڑھی پر بیٹھی سمیرا کی طرف دیکھا جو وحشت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''سمو! دیکھو جا کر۔ جگا کر لاؤ اسے نیچے۔''

سمیرا اُٹھی۔ لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان باقی نہیں رہی ہے۔

''اللہ اکبر......اللہ اکبر......'' مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔

حسن رضا تخت سے اُٹھے اور جھک کر تخت کے نیچے سے سلیپر نکالے اور پہن کر باتھ روم کی طرف بڑھے۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ 'پتہ نہیں کل سے اب تک کتنی نمازیں چھوٹی ہیں؟ اور ادا پڑھی ہیں، وہ بھی پتہ نہیں۔' واش روم کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

زبیدہ نے سیڑھیوں کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے کھڑی سمیرا کی طرف دیکھا اور تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''تم نے سنا نہیں سمو!....اوپر جا کر رضی کو بلا لاؤ۔ گہری نیند سوتا ہے۔ ہمارے آنے کا اسے پتہ ہی نہیں چلا ہو گا۔''

غسل خانے کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے حسن رضا نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

''وہ اوپر نہیں ہے زبیدہ!'' اور تیزی سے دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ لمحہ بھر تک زبیدہ اور سمیرا ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ پھر سمیرا بھاگ کر زبیدہ سے لپٹ گئی۔

''امی!......امی......!'' اُس کی آواز گھٹی ہوئی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''سمو! اپنے ابو سے کہو، اُسے لے کر آئیں، جہاں بھی ہے۔ میں اُس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں مر جاؤں گی۔ میں اُسے سمجھاؤں گی۔ میں اُس کے لئے اللہ سے توبہ کروں گی۔ گڑگڑا کر، رو رو کر۔''

وہ سمیرا کو گلے سے لگاتے روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ اور واش روم میں بیسن کے سامنے کھڑے حسن رضا ان کا ایک ایک لفظ سن رہے تھے۔

'کیا اللہ اسے معاف کر دے گا؟......نعوذ باللہ اس نے ایک کذاب کو اللہ کا برگزیدہ بندہ کہا اور اس کا خلیفہ بننا قبول کیا۔' انہوں نے خود سے پوچھا تھا۔

پانی کے چھینٹے منہ پر مارتے ہوئے، کُلی کرتے ہوئے، مسح کرتے ہوئے وہ زبیدہ کی آہ وزاری سن رہے تھے۔ وضو کر کے وہ باہر نکلے تو زبیدہ نے دوڑ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''آپ کو اللہ کا واسطہ۔ اسے ڈھونڈ کر لائیں۔ وہ نادان ہے۔ کون سا بڑا ہو گیا ہے وہ...... بچہ ہی تو ہے۔ ترغیب میں آ گیا ہوگا۔ اُسے سمجھائیں۔ توبہ کر لے گا تو اللہ اسے معاف کر دے گا۔''

انہوں نے بنا کچھ کہے اثبات میں سر ہلایا اور صحن کی طرف بڑھ گئے۔ صحن میں ایک لمحہ کے لئے وہ ٹھٹک کر رکے تھے۔ کل یہاں اس نے بھاگ کر ان کے ہاتھ سے اپنا بیگ لے لیا تھا۔ وہ کتنا فرماں بردار تھا۔ وہ آج کل کے بچوں کی طرح نہیں تھا۔ اس نے کبھی گستاخی نہیں کی تھی۔ کبھی پلٹ کر انہیں جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ان سے بہت ڈرتا تھا۔ پھر...... پھر کیوں؟

ایک بڑا سا سوالیہ نشان پھر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور انہیں اس کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ وہ گیٹ کھولتے ہوئے رکے اور پھر مڑ کر سمیرا کی طرف دیکھا جو ابھی تک برآمدے میں زبیدہ کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔

''تمہیں کچھ پتہ ہے، یہ اس کا دوست ابراہیم کہاں رہتا ہے؟''

سمیرا نے نفی میں سر ہلایا۔

''لیکن یہاں ڈائری میں اس کے سب دوستوں کے نمبر ہیں۔''

زبیدہ کا ہاتھ چھوڑ کر وہ فون اسٹینڈ کی طرف لپکی اور ڈائری اٹھا کر جلدی جلدی ورق اُلٹنے لگی۔ اور ڈائری سے ورق پھاڑ کر اس پر ابراہیم کا نمبر لکھا۔

''کیا وہ ابراہیم کے گھر ہے؟'' نمبر حسن رضا کو دیتے ہوئے اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔'' نمبر والا ورق انہوں نے جیب میں رکھا۔ ''نماز پڑھ کر میں ابراہیم کی طرف جاؤں گا۔''

اور پھر سمیرا کی طرف دیکھے بغیر وہ تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے چند لوگوں نے ان کی خیریت پوچھی تھی۔ مسجد میں کل سے نظر نہ آنے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ وہ ہوں، ہاں کرتے ہوئے مسجد کے کونے میں آخری صف میں بیٹھ گئے تھے۔

نماز پڑھ کر انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ان کے آنسو ان کے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر گرنے لگے۔

''یا اللہ! اسے توبہ کا راستہ دکھا۔ اسے واپس لے آ...... اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ زبیدہ صحیح کہتی ہے، وہ ترغیب میں آ گیا ہوگا۔''

یک دم دعا مانگتے مانگتے وہ سجدے میں گر گئے اور تڑپ تڑپ کر اس کے لئے دعا مانگی اور پھر اُٹھے۔

''حسن صاحب! گھر میں سب ٹھیک ہے؟...... خیریت ہے نا؟'' ایک دو افراد نے پوچھا تھا۔

لیکن انہیں یاد نہیں تھا کہ انہوں نے کیا جواب دیا تھا۔ پھر وہ تیزی سے مسجد سے باہر نکل آئے تھے اور ایک پی سی او سے انہوں نے ابراہیم کو فون کر کے اس کا ایڈریس پوچھا تھا۔

''بیٹا! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے، جو فون پر نہیں کر سکتا۔''

اور پھر کچھ دیر بعد ہی وہ ابراہیم کے سامنے بیٹھے تھے۔

''بیٹا! مجھے بتاؤ، اس اسمٰعیل کے متعلق۔ تم ہی اسے پہلی بار وہاں لے کر گئے تھے نا؟''

ابراہیم کی نظریں جھک گئیں۔ وہ بے حد شرمندہ تھا۔

''تب میں نہیں جانتا تھا کہ وہ شخص کیا ہے۔ بظاہر وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں کرتا تھا۔ اسلام کے فروغ کے لئے بے چین دکھائی دیتا تھا۔ میں ابتدا میں متاثر ہوا لیکن پھر جلد ہی مجھے لگا کہ کہیں کچھ غلط ہے۔''

''اُسے...... اُس کم بخت کو کیوں نہیں لگا کچھ غلط؟ وہ تو اتنا ذہین ہے ابراہیم! پھر کیوں نہیں جانا اس نے؟'' وہ

رو دیئے۔

ابراہیم کا سر مزید جھک گیا۔

انہوں نے خود ہی اپنے آنسو پونچھے اور ابراہیم سے التجا کی۔

''ابراہیم بیٹا! مجھے لے چلو وہاں، جہاں وہ ملعون رہتا ہے۔ضرور احمد رضا بھی وہاں ہوگا۔''

''کیا وہ گھر پہ نہیں ہے؟'' اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ حسن رضا صاحب کیوں اس کے گھر تک چلے آئے ہیں۔''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ یکدم کھڑا ہو گیا۔

''چلیں۔''

اور کچھ دیر بعد وہ ابراہیم کے ساتھ اسمٰعیل خان کے ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔

مغرب ہوئی، پھر عشاء ہوئی۔حسن رضا واپس نہیں آئے تھے۔سمیرا بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔زبیدہ مسلسل تسبیح پڑھ رہی تھیں۔تخت پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے سمیرا کی طرف دیکھا۔

''سمو! تمہارے ابا اور بھائی آتے ہوں گے۔تم نے کچھ پکایا ہی نہیں۔کیا کھائیں گے؟..... تمہیں پتہ ہے نا، رضی بھوک کا کتنا کچا ہے۔''

سمیرا نے آنسو بھری نظروں سے زبیدہ کو دیکھا۔

''رضی آ گیا تو باہر سے کھانا لے آئے گا۔''

وہ ان کے پاس ہی بیٹھ کر آس بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''رضی آ جائے گا نا امی؟''

''تمہارے ابو لینے گئے ہیں تو آ جائے گا۔میرے بچے سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو سوہنا رب اُسے ضرور معاف کر دے گا سمو!''

وہ پھر تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

''اماں! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ابو کو اب تک آ جانا چاہئے تھا۔اتنی دیر ہوگئی۔دس بجنے والے ہیں۔''

''ہاں...... دیر تو ہوگئی ہے۔تُو ایسا کر، ابراہیم کے گھر فون کر۔ڈائری میں نمبر ہے نا؟ تیرے ابا اُسی کے گھر گئے تھے نا؟''

اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے انہوں نے سمیرا سے کہا تو وہ اٹھ کر نمبر ملانے لگی۔ابھی اس نے دو تین نمبر ہی ڈائل کئے تھے کہ گیٹ پر بیل ہوئی۔

''ابو آ گئے۔'' وہ ریسیور پھینک کر صحن کی طرف بھاگی۔

حسن رضا سر جھکائے اندر داخل ہوئے۔اس نے رضی کو دیکھنے کے لئے باہر جھانکا۔گلی خالی تھی۔حسن رضا اکیلے تھے۔گیٹ بند کر کے وہ مڑی۔حسن رضا سر جھکائے تھکے تھکے سے برآمدے کی طرف بڑھ رہے تھے۔زبیدہ نے انہیں تنہا آتے دیکھا تو اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئیں۔

''نہیں ملا۔''

وہ خاموشی سے تخت کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔لائٹ کی روشنی میں سمیرا کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ ستا ہوا اور پیلا پیلا لگ رہا تھا۔

''وہ کسی دوست کے گھر میں ہے اور نہ ہی......''

انہوں نے سر نہیں اٹھایا تھا اور تفصیل بتا رہے تھے۔ابراہیم کے ساتھ وہ اس کے ٹھکانے پر گئے تھے۔وہاں تالا لگا تھا۔چوکیدار نے بتایا تھا کہ حضرت صاحب تو امریکہ چلے گئے ہیں تین ماہ کے لئے۔

''اور......اور وہ احمد رضا......وہ کہاں ہے؟'' انہوں نے بے اختیار پوچھا تھا۔
''کون احمد رضا؟'' چوکیدار اُسے نہیں جانتا تھا۔
''وہ تمہارے حضرت صاحب کا خلیفہ دوم۔'' خلیفہ دوم کہتے ہوئے اس کے لب کانپے تھے۔
چوکیدار لحہ بھر اُنہیں تذبذب سے دیکھتا رہا۔
''احمد رضا کو میں نہیں جانتا۔ لیکن وہ اُدھر......وہ جی گارڈن ٹاؤن میں طیب خان رہتا ہے۔ وہ حضرت جی کا قریبی ساتھی ہے۔''
اور پھر طیب خان کا ایڈریس لے کر وہ گارڈن ٹاؤن پہنچے تھے۔
سرخ وسفید رنگت والے طیب خان نے بے حد غور سے انہیں دیکھا تھا۔
''میں آپ حضرات کو نہیں جانتا۔''
حسن رضا نے اس شخص کو دیکھا۔ سر پر پگڑی اور گھیردار شلوار پر افغانی جیکٹ پہنے بڑی سی داڑھی والا یہ شخص جو دیکھنے میں عجیب سا لگتا تھا، بہت روانی سے اُردو بول رہا تھا۔ جب کہ چوکیدار نے انہیں بتایا تھا کہ وہ افغانی ہے۔
''میں ابراہیم ہوں۔ حضرت صاحب کی مجالس میں شرکت کرتا رہا ہوں۔''
یکدم اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی تھی۔
''یہاں......میرا پتہ کس نے دیا تمہیں؟''
''ایکچوئیلی ہمیں احمد رضا کی تلاش تھی۔ وہ حضرت صاحب کا مرید ہے۔ یہ احمد رضا کے والد ہیں۔ دو تین دن سے وہ گھر نہیں آیا تو سب پریشان ہو رہے ہیں۔''
''اوہ......'' اُس نے ہونٹ سکیڑے۔ ''لیکن میں تو کسی احمد رضا کو نہیں جانتا۔''
''سر! وہ ہمیں پتہ چلا تھا کہ آپ حضرت صاحب کے خاص بندے ہیں۔ آپ کو کچھ پتہ ہو ان کے ٹھکانے کا تو پلیز رہنمائی کر دیجئے۔ احمد رضا ضرور ان کے ساتھ ہو گا۔''
''میں تو صرف ایک بار ان سے ملا ہوں جناب! اور مجھے ان کے کسی ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔'' اس نے گویا بات ختم کر کے انہیں جانے کا اشارہ کیا تھا۔
وہ مایوس سے ہو کر اس کے گھر سے نکلے تھے۔ انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان کے باہر نکلتے ہی تیزی سے کوئی نمبر ملا رہا تھا۔
پھر ابراہیم کے ساتھ وہ تقریباً اس کے ہر دوست کے گھر گئے تھے۔ کسی کو اس کے متعلق علم نہیں تھا۔ وہ کسی کے گھر نہیں گیا تھا۔ تو اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ اسمٰعیل خان کے ساتھ تھا۔
شاید ان سے غلطی ہو گئی تھی۔ وہ جذبات میں آ گئے تھے۔ انہیں پہلے اسے سمجھانا چاہئے تھا۔ اتمام حجت تو ضروری تھا۔ ہاں، وہ پھر بھی نہ مانتا تو......لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔
وہ سر جھکائے بیٹھے تھے اور زبیدہ رو رہی تھیں۔
''زبیدہ! اللہ سے دعا کرو۔ وہی اسے سیدھا راستہ دکھا سکتا ہے۔''
وہ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی سمیرا نے اُنہیں دیکھا۔ دو ہی دنوں میں وہ کتنے بوڑھے اور کمزور لگنے لگے تھے۔ اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔
''سو جاؤ۔ سو جاؤ بیٹا جا کر۔ صبح یونیورسٹی جاؤں گا۔ وہ یونیورسٹی تو ضرور جاتا ہو گا۔ پڑھائی کا حرج تو نہیں کر سکتا وہ۔''
''ہاں......!'' سمیرا کے دل میں ایک اُمید جاگ اُٹھی۔
''ہاں۔ وہ جہاں کہیں بھی ہو گا، یونیورسٹی تو جاتا ہو گا۔'' اُس نے زبیدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''امی! اُٹھ جائیں۔

سفر کر کے آئی ہیں۔ کچھ دیر اندر جا کر لیٹ جائیں۔ میں روٹیاں پکاتی ہوں۔ ساتھ میں آملیٹ بنا لیتی ہوں۔''

''مجھے تو بھوک نہیں ہے سمو! اپنے ابا کے لئے بنا لے کچھ۔'' وہ اُٹھیں اور پھر بیٹھ گئیں۔

''پتہ نہیں کہاں ہوگا وہ۔ اس نے کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں۔ اسے تو اپنے کمرے بنا نیند ہی نہیں آتی سمو!''

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھیں۔ سمیرا ان کے پاس ہی بیٹھ کر بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔

صبح سمیرا بہت جلدی جاگی تھی لیکن حسن رضا اس سے پہلے ہی جاگ کر برآمدے میں تخت پر بیٹھے تھے۔ مدھم روشنی میں اس نے دیکھا، ان کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ تخت کے پاس ہی زمین پر جاء نماز بچھی تھی۔ شاید وہ تہجد پڑھ کر اُٹھے تھے۔

''فجر کی اذان ہوگئی ابو؟'' اُن کے قریب آ کر اس نے آہستگی سے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ابو! کیا رضی نے خود بتایا تھا آپ کو کہ وہ......''

''اس نے اعتراف کیا تھا۔'' انہوں نے ایک نظر سمیرا کو دیکھا۔ ''ابھی اذان ہونے والی ہے۔ نماز پڑھ کر مجھے ایک کپ چائے بنا دینا۔ میں چائے پی کر یونیورسٹی کے لئے نکلوں گا۔''

''اتنی جلدی ابو؟''

''ہاں، جلدی جاؤں گا۔ دیر سویر ہو جاتی ہے راستے میں۔ کہیں وہ آ کر چلا ہی نہ جائے۔ اور ہاں، اپنی اماں کو مت جگانا۔ کچھ دیر پہلے ہی سوئی ہے۔''

وہ افسردگی سے انہیں دیکھتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئی

اور پھر وہ چھ بجے سے پہلے ہی گھر سے نکل گئے تھے۔ لیکن بے سود...... وہ یونیورسٹی نہیں آ رہا تھا پچھلے کئی دنوں سے۔ اور انہیں یاد آیا، یہ بات تو رات اُنہیں ابراہیم، حسن اور دوسرے دوستوں نے بھی بتائی تھی۔ پھر وہ یہاں کس آس میں چلے آئے تھے؟ اور اگلے کئی دن لگا تار وہ یونیورسٹی آتے رہے۔ لیکن احمد رضا انہیں نہیں ملا تھا۔

''غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ میرے بیٹے سے بھی غلطی ہوگئی ہے۔ اللہ اسے معاف کرے گا۔''

زبیدہ دن میں کئی بار کہتیں تو وہ نظریں چرا لیتے۔ انہیں لگتا جیسے زبیدہ ان سے کہہ رہی ہیں۔

وہ آفس سے آتے تو بیٹھتے بیٹھتے اُٹھ کھڑے ہوتے اور پھر اُس کی تلاش میں چل پڑتے۔ بیٹے کی محبت ہر جذبے پر غالب آ چکی تھی۔ دل نے اس بات پر یقین کر لیا تھا کہ وہ بھٹک گیا تھا۔ لیکن وہ سمجھائیں گے تو سمجھ جائے گا۔

اُس روز بڑے دنوں بعد اخبار میں خبر آئی تھی۔

''اسمٰعیل خان ملک سے فرار ہوگیا ہے یا انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہے۔''

''تو کیا وہ اپنے ساتھ احمد رضا کو بھی لے گیا ہے۔ ان کا دل ڈوب گیا۔ وہ ناشتہ کئے بنا ہی اُٹھ گئے۔ زبیدہ کمرے میں چپ چاپ لیٹی رہتیں۔ ان کی نظریں سوال کرتی تھیں لیکن اب وہ زبان سے کچھ نہ کہتی تھیں۔

پورے گھر میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ کوئی برتن بھی کھڑکتا تو سب چونک جاتے تھے۔

''ابو! ناشتہ کر لیں۔'' سمیرا نے انہیں اُٹھتے دیکھ کر کہا۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''ابو......!'' اس نے ذرا سر آگے کر کے کمرے میں جھانکا۔ زبیدہ بیگم یونہی بیڈ پر لیٹی تھیں اور آنکھوں کے کناروں سے آنسو نکل نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

''ابو!'' اُس کی آواز آہستہ تھی۔ ''کل جب میں اسٹاپ پر کھڑی تھی تو مجھے لگا تھا جیسے......''

''جیسے کیا؟'' وہ یک دم اُس کی طرف مڑے تھے۔

''وہ ایک بہت بڑی شان دار گاڑی تھی، جسے ایک لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔ اور اس کی پسنجر سیٹ پر بیٹھا شخص مجھے رضی لگا تھا۔ بس ایک جھلک ہی دیکھ پائی تھی میں......اور گاڑی نکل گئی۔''

حسن رضا نے ایک گہری سانس لی تھی۔ ''تمہیں یقین ہے، وہ رضی تھا؟''

اور اب کے وہ انکار نہ کر سکی۔

وہ رضی ہی تھا۔ اُس کی نظریں اس سے ملی تھیں۔ گاڑی اسٹاپ پر ذرا سا آہستہ ہوئی تھی۔ وہ اسی طرف کھڑی تھی۔ رضی نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور پھر نظر ملنے پر اس نے ہاتھ اٹھالیا۔ اسے رضی کے لب ہلتے دکھائی دیئے تھے۔ شاید رضی نے اسے پکارا تھا کیونکہ شیشہ بہت تیزی سے نیچے ہوا تھا لیکن گاڑی زن سے گزر گئی تھی اور وہ حیران سی اسٹاپ پر کھڑی رہ گئی تھی۔

''رضی یہیں ہے، لاہور میں۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے پھر کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

وہ سوال جو کتنی ہی بار انہوں نے خود سے کیا تھا، اس کا جواب انہیں مل گیا تھا۔

دولت کی طمع اور ہوس۔

لیکن یہ دولت کی ہوس کب اس کے دل میں پیدا ہوئی؟ انہیں پتہ ہی نہ چلا۔ کب اس طلب نے اس کے اندر سر اٹھایا؟ کون سی خواہش تھی جو وہ پوری نہ کر سکے تھے؟ سب کچھ میسر تھا اسے، پھر۔

'سب کچھ؟' وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے۔

اس سب کچھ میں وہ سب کچھ تو نہیں تھا، جس کی چاہ میں وہ گمراہ ہو گیا تھا اور وہ سمجھ رہے تھے، دین کی طلب میں بھٹکا بیٹھا ہے اور......تو کیا صرف دولت؟

''اسے دولت اور شہرت کی بہت خواہش تھی ابو!'' سمیرا سر جھکائے انہیں بتا رہی تھی اور ان کے اندر مایوسی گہری ہوتی جارہی تھی۔ پھر بھی اس روز وہ آفس سے اٹھ کر اسی تھانے جا پہنچے تھے۔ اس ایس ایچ او نے انہیں پہچان لیا تھا، جس نے اس رات پوچھ گچھ کی تھی۔

''ارے صاحب! آپ یہاں کیسے؟''

''یونہی ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا ایک خبر کی تصدیق کر لوں۔ اخبار میں آیا تھا، وہ ملعون فرار ہو گیا ہے ملک سے۔''

''ہاں شاید۔'' وہ بھی کچھ زیادہ باخبر نہ تھا۔

وہ مایوس سے گھر آگئے تھے۔ سمیرا کالج سے آچکی تھی اور زبیدہ یونہی چپ بیٹھی تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔ ان کا دل چاہا وہ ان سے کہہ دیں کہ وہ اس کی واپسی کی آس نہ رکھے۔ اسے دولت کے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ وہ شہرت حاصل کرنے کی تمنا میں دلدل میں گر گیا ہے۔ لیکن انہوں نے زبیدہ سے کچھ نہیں کہا۔

کئی دن گزر گئے۔ وہ اس دوران کئی بار ابراہیم کی طرف گئے۔ کئی بار محسن کو فون کر کے پوچھا۔ کئی بار یونیورسٹی گئے۔ لیکن وہ نہ جانے کہاں تھا۔ پاس سے گزرنے والی ہر سیاہ رنگ کی گاڑی کو وہ غور سے دیکھتے تھے۔ وہ یہیں، اسی شہر کے ایک گھر میں الوینا کے ساتھ رہ رہا تھا۔ کتنی بار اس نے الوینا سے کہا تھا، اسے گھر جانا ہے۔

''میری امی اور سمیرا میری بہن بہت پریشان ہوں گی۔ رحیم یار خان سے آکر جب امی نے مجھے نہیں دیکھا ہو گا اور ابو نے انہیں بتایا ہو گا کہ میں......پلیز الوینا! مجھے گھر جانے دو۔ مجھے ان کی غلط فہمی دور کرنے دو۔''

''تمہیں تمہارے باپ نے گھر سے نکال دیا ہے احمد رضا!''

''وہ غصے میں تھے......وہ ایک سچے مسلمان ہیں الوینا!......وہ برداشت نہیں کر سکے۔ جب میں وضاحت کر دوں گا تو......اور اب تک ان کا غصہ اُتر چکا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے۔ چلے جانا۔ مگر ابھی حضرت صاحب کا حکم نہیں ہے۔''

''کیوں......کیوں حکم نہیں ہے؟''

اُس نے جب سے اسٹاپ پر سمیرا کو دیکھا تھا، وہ بہت بے چین تھا۔ اس نے سمیرا کے لئے بہت سی شاپنگ کر رکھی تھی۔ اس کی پسندیدہ کتابیں، پرفیومز اور ایک بہت خوب صورت گھڑی۔ اور پھر اس کی اپنی پڑھائی کا بھی حرج ہو رہا تھا۔

''الوینا! مجھے حضرت جی سے ملوا دو۔''

''فی الحال انہوں نے پردہ کر لیا ہے۔ جب پردے سے باہر آنے کا حکم ہوا تو سب سے پہلے تمہاری ملاقات ہو گی۔ کیا تم بور ہو رہے ہو احمد رضا؟''

''بور!''

وہ بور نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے دل بہلانے کا بہت سامان تھا یہاں۔ الوینا کی قربت تھی، اُس کی ادائیں تھیں۔ لارا تھی، جو الوینا کی عدم موجودگی میں پوری جان سے اس پر فدا ہوتی تھی۔ اور ماریا تھی، جس کی خوب صورت گفتگو کے سحر میں وہ گھنٹوں مسحور بیٹھا اسے سنتا رہتا تھا۔

سب سے بڑھ کر شراب طہور تھی، جو پی کر وہ سرور میں آ جاتا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا گھر تھا، ماں باپ تھے۔ بہن تھی۔ وہ بھلا انہیں چھوڑ سکتا تھا؟

''اور کیا تم ہمیں چھوڑ دو گے؟'' الوینا اس کے کندھے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔

''امپاسبل۔ میں بھلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں تمہیں؟''

''تو پھر بار بار کیوں گھر جانے کی بات کرتے ہو؟''

''اس لئے کہ وہ میرا گھر ہے۔'' اس نے حیرت سے الوینا کو دیکھا جو اس کے کندھے پر سر رکھے مخمور نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جب رچی اچانک ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ ہڑبڑا کر اس نے الوینا کا سر اپنے کندھے سے ہٹایا تھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ الوینا اسی طرح بے جھجک بیٹھی مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیسے ہو فرینڈ؟''

رچی بیڈ کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ الوینا کا کمرہ تھا۔

''فائن۔ اور آپ؟''

''می......آئی ایم آلسو۔''

''تمہارا پاسپورٹ بنوانا ہے احمد رضا!......اپنا شناختی کارڈ الوینا کو دے دینا۔''

''کس لئے؟'' وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''حضرت صاحب ملک سے باہر جا رہے ہیں اور جو مریدانِ خاص ان کے ساتھ جا رہے ہیں، ان میں تم بھی شامل ہو۔''

''نہیں......میں نہیں جا سکتا۔''

رچی کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''اوکے، میں چلتا ہوں۔''

اور اس کے باہر نکلتے ہی وہ بے چینی سے الوینا کی طرف مڑا۔

''وینا پلیز! کسی طرح میری ملاقات حضرت جی سے کروا دو۔ میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔ بلکہ میں نے ان سے بات کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا، ٹھیک ہے تم اپنی پڑھائی مکمل کرو۔ پھر کسی ٹور میں تم چلنا ہمارے ساتھ۔''

الوینا خاموشی سے لمحہ بھر اُسے دیکھتی رہی۔

''سوری احمد! یہ ممکن نہیں ہے۔ اللہ کا حکم نہیں ہے۔ حکم ہو گا، تب ہی وہ پردے سے نکلیں گے۔''

''لیکن اللہ کا حکم کیسے ملتا ہے انہیں؟ کیا ان کے پاس جبرائیل علیہ السلام آتے ہیں؟'' اس کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔ ابو صبیح کہہ رہے تھے۔ میں کسی شیطانی چکر میں پھنس گیا ہوں۔' اُس نے سوچا اور یکدم کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔ پھر میں چلتا ہوں۔''

''تم نہیں جا سکتے۔ کم از کم آج کے دن تو ہرگز نہیں۔ کل صبح تم چلے جانا۔''

''آج کیوں نہیں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے الوینا کو دیکھا۔

''اگر میں کہوں، میرے لئے؟'' فدا ہوتی نظروں سے اسے دیکھتی وہ اس کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ تھام لیا اور بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''بیٹھو اور ریلیکس ہو جاؤ پلیز۔ ایک دن سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کل چلے جانا۔''

''پتہ نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے الوینا!'' اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے جانے دو پلیز۔''

''ٹھیک ہے۔ میں رچی سے بات کرتی ہوں۔ ورنہ میں نے تو سوچا تھا، آج جی بھر کے باتیں کریں گے۔ پھر تو میں حضرت جی کے ساتھ باہر چلی جاؤں گی اور جانے کب ملاقات ہو پھر۔''

''کیا تم...... تم بھی جا رہی ہو؟'' احمد رضا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں، مجھے تو جانا ہی ہے۔ تم بھی چلتے تو۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔

''میں تم سے بہت محبت کرنے لگی ہوں۔ مجھے تمہارے بغیر جانا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی احمد!''

اس نے آنکھیں موندتے ہوئے سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ احمد رضا کو لگا تھا جیسے اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور اس نے اس نمی کو چھپانے کے لئے آنکھیں موندی ہیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ایک بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''میں کب تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں الوینا!...... لیکن مجبوری ہے۔ میں اس طرح اپنی تعلیم ادھوری نہیں چھوڑ سکتا۔ امی ابو کو بہت دکھ ہو گا۔ اب تک ابو کا غصہ ختم ہو چکا ہو گا۔ میں جلد از جلد ان کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم آج کے دن تو رک سکتے ہو نا۔''

''ٹھیک ہے وینا! میں آج نہیں جاؤں گا۔ آج ہم دونوں سارا دن باتیں کریں گے۔ تم مجھے اپنے متعلق بتانا۔ ابھی تک تم نے مجھے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا۔''

الوینا نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مسکرا کر سر پھر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس کے ریشمی بال اس کے کندھوں پر بکھر کر اس کے مشامِ جاں کو معطر کرنے لگے۔

''وینا!'' اس کے نرم، ملائم، ریشمی بالوں کو اپنے ہاتھوں پر لپیٹتے ہوئے اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں سرگوشی کی تھی۔ ''میں کب تمہارے بغیر رہ سکتا ہوں؟ تم مت جاؤ۔ کیا تم میری خاطر رک نہیں سکتیں؟''

''میں بات کروں گی رچی سے۔'' اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''رچی کون ہے الوینا؟'' وہ یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ کئی دنوں سے یہ سوال اسے الجھا رہا تھا۔ ''میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ تم نے اور لارا نے کہا تھا، وہ اسلام سے متاثر ہے اور اسلام میں داخل ہونے سے پہلے اس کے متعلق جاننا چاہتا ہے اچھی طرح۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ یہاں اسے بہت اہمیت حاصل ہے۔ کیا وہ مسلمان ہو گیا ہے؟''

''اوہ ہاں......'' وہ سٹپٹائی۔ ''اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔''

''لیکن یہاں سب اب بھی اسے رچی یا اونیل کہتے ہیں۔'' وہ اُلجھا ہوا تھا۔

''ہاں ابھی باضابطہ طور پر اس کا اعلان نہیں کیا گیا۔ حضرت جی پردے سے باہر آئیں گے تو وہ اس کا اعلان کر کے نام

تبدیل کریں گے۔"

"اور اس کے تینوں ساتھی؟......کیا وہ بھی اسلام قبول کریں گے؟"

الوینا نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ پتہ نہیں آج وہ اتنے سوالات کیوں کر رہا تھا۔ وہ کھڑی ہوگئی۔

"کچھ پیو گے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ لہراتی ہوئی سی باہر نکل گئی اور کچھ ہی دیر بعد نازک سی صراحی میں سنہری مشروب لے کر یونہی لہراتی ہوئی اندر آئی۔ مشروب میں نقرئی ذرّے تیر رہے تھے۔

"یہ خالص صندل اور چاندی کے اوراق سے تیار کیا گیا ہے۔ اور اس میں شرابِ طہور کی آمیزش بھی ہے۔"

اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے جام اس کی طرف بڑھایا تو احمد رضا پر بن پیئے ہی خمار طاری ہونے لگا تھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے جام منہ سے لگا لیا۔ پھر نہ جانے اس نے کتنے جام پیئے تھے۔ نہ جانے اس سادہ سے صندل کے مشروب میں کیا تھا کہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ اور پھر اسے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کب الوینا کا ہاتھ تھامے تھامے سو گیا۔

جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں نیلی روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ یہ مدھم مدھم روشنی ٹھنڈک اور خنکی کا احساس دے رہی تھی۔ اے سی بند تھا لیکن کمرے میں خنکی موجود تھی۔ جیسے ابھی ابھی کسی نے اے سی بند کیا ہو۔ اس نے مُندی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ الوینا کہیں نہیں تھی۔ لیکن اس کے وجود کی خوشبو پورے کمرے میں رچی تھی اور اسے اپنے بازوؤں پر اب بھی اس کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ تب ہی کوئی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ یوں لگا جیسے آس پاس ہی کہیں کوئی اس کے جاگنے کا منتظر تھا۔

"الوینا......" اس نے آہٹ پر آنکھیں بند کیئے کیئے آہستگی سے کہا۔ "کہاں چلی گئی تھیں تم؟"

"میں لارا ہوں۔ آپ پلیز اُٹھ جائیں اور فریش ہو کر باہر آ جائیں۔"

اس نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں۔ لارا بات مکمل کر کے واپس جا رہی تھی۔ اس نے پشت پر بکھرے اس کے سنہری بالوں کو دیکھا اور پھر وال کلاک کی طرف جہاں ساڑھے چار بج رہے تھے۔

"لارا!" وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں یہ دن کے چار بجے تھے یا صبح کے۔ کمرے میں مدھم روشنی کے بلب کی وجہ سے وہ کچھ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔

لارا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی لیکن اس سنجیدگی میں بھی اس کا حُسن دل گرماتا تھا۔

"یہ کون سا وقت ہے؟" وہ کچھ جھجکا۔ "میں بے وقت سو گیا تھا۔ پتہ نہیں، کتنی دیر سویا۔ شاید رات بھر۔"

"نہیں۔ آپ صرف چند گھنٹے سوئے ہیں۔ باہر دن ہے۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔"

"باہر کون ہے؟"

"کچھ لوگ۔" لارا تیزی سے باہر نکل گئی۔

'کچھ لوگ کون؟......شاید اجنبی......شاید میرے لئے اجنبی۔'

وہ کسل مندی سے اُٹھا اور واش روم میں جا کر پانی کے چھینٹے منہ پر مارے اور بالوں میں گیلے ہاتھ پھیرتا باہر نکل آیا۔ باہر والے کمرے میں طیب خان اور ارباب حیدر بیٹھے تھے۔

طیب خان اپنے مخصوص لباس میں تھا۔ سر پر پکول اور افغانی جیکٹ۔ اس نے بلند آواز میں انہیں سلام کیا اور متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ارباب حیدر کھڑا ہو گیا۔

"تم تیار ہو احمد رضا؟"

"کیا مجھے کہیں جانا ہے؟" اس نے اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ وہ اس وقت شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔

''ہاں۔''

''کہاں؟''

''پتہ چل جائے گا۔تم اگر لباس چینج کرنا چاہو تو کرلو۔''

''کیا کسی خاص جگہ جانا ہے؟''

''کچھ ایسی خاص بھی نہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔''

اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے اور ابھی بھی ہلکا خمار سا محسوس ہو رہا تھا۔

''چلیں پھر......'' طیب خان بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بیرونی گیٹ تک آئے تھے۔ گیٹ کے پاس رک کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ الوینا آس پاس کہیں نہیں تھی۔ آج کا دن اور رات اسے الوینا کے ساتھ گزارنا تھا۔ اسے پھر چلے جانا تھا اور پتہ نہیں پھر کب واپس آنا تھا۔

''کیا میرا جانا ضروری ہے؟''

رباب حیدر نے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ہاں......لیکن گھنٹے تک واپس آجائیں گے۔''

قدرے مطمئن ہو کر وہ ان کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل آیا۔ باہر وہی سیاہ گاڑی کھڑی تھی۔ طیب خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ ارباب حیدر اور وہ پیچھے بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے سیٹ کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اس کا ذہن ابھی تک خمار آلود سا ہو رہا تھا۔ کچھ دیر مزید سو جانے کی خواہش کو وہ بمشکل ذہن و دل سے جھٹک پایا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بلڈنگ کے دفتر نما کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کافی بڑا ہال تھا، جس میں چاروں طرف کرسیاں دیواروں کے ساتھ لگی تھیں، جن پر کچھ افراد بیٹھے تھے جن کے ہاتھوں میں قلم اور ڈائریاں تھیں۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' ایک طرف بیٹھتے ہوئے اس نے طیب خان سے پوچھا تھا۔

''یہ صحافی ہیں۔ ارباب نے حضرت صاحب کے حکم پر پریس کانفرنس بلائی ہے۔''

وہ سر ہلا کر ان صحافیوں کی طرف دیکھنے لگا، جو کاغذ قلم ہاتھ میں لئے منتظر نظروں سے ان تینوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چند افراد اور آ گئے تھے۔ یوں ان کی تعداد پندرہ کے قریب ہو گئی تھی۔ تب ارباب حیدر اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر کچھ کہنے لگا تھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ذہن سویا سویا سا تھا۔ ایک دو بار اس نے سر جھٹک کر اس کی بات سننے کی کوشش کی تھی۔

''حضرت صاحب ایک نیک نیت انسان ہیں۔'' ارباب حیدر کہہ رہا تھا۔ ''ان کے دل میں مسلمانوں کا درد ہے۔''

''آپ کے حضرت صاحب آج خود کیوں اس کانفرنس میں نہیں آئے؟'' ایک صاحب پوچھ رہے تھے۔ ''ہمیں ان سے سوال کرنے ہیں۔''

''آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے، ہم سے پوچھ لیں۔ حضرت صاحب یہاں نہیں ہیں۔''

''مطلب ملک میں نہیں ہیں؟'' ایک صحافی نے پوچھا۔

رباب حیدر نے اثبات میں سر ہلایا اور طیب خان کا تعارف کروانے لگا۔

''یہ طیب خان ہیں...... مجاہد آزادی۔ انہوں نے افغان جنگ میں حصہ لیا اور اب حضرت صاحب کے پاس چلے آئے ہیں۔''

صحافی اس سے مختلف سوالات کر رہے تھے اور اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔
''اور یہ احمد رضا ہیں۔ حضرت صاحب کے مقرب۔ بہت قریبی۔ آپ کو بتائیں گے حضرت صاحب کے متعلق۔''
اب صحافی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل خان، اللہ کا برگزیدہ ہے؟'' ایک صحافی نے پوچھا۔
''ہاں!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ بہت نیک بزرگ ہیں۔''
''لیکن ہم نے تو سنا ہے کہ وہ شخص ہمیشہ عورتوں میں گھرا رہتا ہے اور اس میں چاروں شرعی عیب ہیں اور اس کی ان نام نہاد مذہبی مجالس میں شراب و شباب کا سامان ہوتا ہے؟'' ایک صحافی کے لہجے میں تلخی تھی۔
''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا نہیں ہے۔ یہ پروپیگنڈہ ہے ان کے خلاف۔ وہ......''
اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ نیند یکدم اس پر حاوی ہونے لگی تھی۔ اُس نے سر جھٹک کر نیند کو بھگانے کی کوشش کی۔
''اللہ نے انہیں پیغام دے کر بھیجا ہے۔'' (نعوذ باللہ) طیب خان نے سرگوشی کے انداز میں اس کے کندھے پر جھکتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔ وہ اللہ کا پیام لائے ہیں۔''
''یہ کیا بکواس ہے؟'' صحافی نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔ ''کیا آپ نہیں جانتے کہ نبوت ہمارے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ آلہ وسلم پر ختم ہو گئی۔ وہ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ حجتہ الوداع کے موقع پر انہوں نے فرمایا تھا۔ آج دین مکمل ہو گیا۔''
''ہاں، یہ تو ہے...... یہ صحافی صحیح کہہ رہا تھا۔ خود اس نے اپنی اسلامیات کی کتاب میں بہت چھوٹی کلاس میں پڑھا تھا لیکن اگر نہ بھی پڑھا ہوتا تب بھی وہ جانتا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اور یہ بات تو اس کے خون میں شامل تھی۔ گھٹی میں پڑی تھی...... کسی بھی مسلمان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔
اس نے بے بسی سے ارباب حیدر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔ بے شک ایسا ہی ہے اور نبوت کا سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کر دیا گیا۔ لیکن اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔
رباب حیدر نے ہولے سے اس کا کندھا دبایا۔
وہ مڑ کر اس سے پوچھنے لگا تھا اور وہ شعوری کوشش سے آنکھیں کھولے اسے اور صحافیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک سوال و جواب ہوتے رہے۔ پھر ہائی ٹی کے بعد صحافی رخصت ہو گئے تو وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی اب بھی طیب خان ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ دونوں پیچھے بیٹھے تھے۔ اب بھی اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور پھر اس وقت ہی کھولی تھیں، جب ارباب حیدر نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔
''احمد رضا! منزل آ گئی۔''
''اچھا......!'' اس کا ذہن پتہ نہیں کیوں اتنا سویا سویا سا تھا۔ کل رات تو اس نے بھرپور نیند لی تھی۔ پھر دن میں بھی دو تین گھنٹے سویا تھا۔
وہ اپنی اس کیفیت کے متعلق زیادہ نہیں سوچ سکا تھا۔ ارباب حیدر نے اسے الوینا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
''لو بھئی، سنبھالو اپنے مریض کو۔''
اس نے پوری آنکھیں کھول کر الوینا کی طرف دیکھا۔ آج تو وہ اسے ہر دن سے زیادہ خوب صورت لگی تھی۔ اس کی تیاری اور اس کا سنگھار غضب کا تھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ الوینا نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ اس کے ہاتھوں کی نرماہٹ اور حرارت کو شدت سے محسوس کرتا ہولے ہولے اس کے ساتھ چلتا ہوا اس کے کمرے کی

طرف بڑھ گیا۔ اتنے دنوں سے وہ اس کے ساتھ اسی کے کمرے میں مقیم تھا۔ آج ہر دن سے زیادہ اس پر مہربان تھی وہ اس سے باتیں کرتا اپنی محبتوں کا اظہار کرتا جانے کب سو گیا تھا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ بالکل فریش تھا۔ کل کا بوجھل پن اور کسل مندی غائب ہو چکی تھی۔ وہ باتھ لے کر اور کپڑے بدل کر باہر آیا تو سٹنگ میں ٹیبل پر اخبار دیکھ کر وہیں رک گیا۔

آج وہ ضرور گھر چلا جائے گا اور ابو کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لے گا۔ امی اور سمیرا ضرور اس کی سفارش کریں گی۔ وہ سمیرا کو الوینا کے متعلق بھی بتائے گا اور جب الوینا باہر سے آئے گی تو وہ سمیرا کو اس سے ملوائے گا۔ سمیرا ضرور اس کی پسند کو سراہے گی اور وہ الوینا سے کہے گا کہ وہ اس کا انتظار کرے۔ وہ اپنی تعلیم ختم کرتے ہی اسے اپنی زندگی میں شامل کرلے گا۔ اتنے سارے دنوں سے وہ یہاں تھا۔ شب و روز الوینا کی سنگت میں یوں گزر رہے تھے کہ اسے دنوں کی گنتی کا شمار ہی نہیں تھا۔

جانے کتنے دن گزر گئے۔ پڑھائی کا کتنا حرج ہوا تھا اور سمیرا اور امی کتنی پریشان ہوں گی۔ سمیرا تو چھپ چھپ کر روتی ہوگی۔ اس نے ضرور میرے سب دوستوں کو فون کئے ہوں گے۔ خیر! آج میں چلا جاؤں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی اور چونک گیا۔

'نہیں...... نہیں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟' اُس نے دوبارہ خبر پر نظر دوڑائی۔

''جھوٹے نبی کے کارندوں کی پریس کانفرنس میں اس کے ایک خلیفہ احمد رضا کا بیان...... اسمٰعیل خان، اللہ کا سچا پیامبر اور......''

'نہیں......' اس نے یک دم اخبار پھینک دیا۔ 'نہیں...... میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی آخر الزمان ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔' اس نے سوچا۔

''نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ میں نے ایسی کوئی گواہی نہیں دی۔ اور میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔'' وہ یک دم کھڑا ہو گیا اور اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اس کی آواز قدرے بلند تھی۔ ''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔'' اس نے دہرایا۔

''تم نے ایسا ہی کہا تھا، احمد رضا!'' دروازے میں رچی کھڑا تھا۔ اس کے لبوں پر بڑی زہریلی سی مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھیں کسی سانپ سے مشابہ تھیں۔ احمد رضا کو خوف محسوس ہوا اور اس نے کمزور آواز میں کہا۔

''میں...... میں بھلا ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں؟...... میں مسلمان ہوں اور کوئی بھی مسلمان......''

''لیکن تم نے ایسا ہی کہا اور گواہی دی کہ اسمٰعیل خان......''

''نہیں۔'' وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے حلق سے آواز نکل رہی تھی۔ اسے گھورتا ہوا مضبوطی سے قدم زمین پر جماتا رچی ہولے ہولے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور صوفے پر گرنے کے سے انداز میں ڈھے گیا۔ وہ رچی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پورے وجود میں خوف کی سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔

❁○❁

''اے زمین! تیرا خوب صورت چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔ ایسے، جیسے سنہری لیموں پر جگہ جگہ مستے اُبھر آئے ہوں...... یا...... یا پھر چیچک کے نشان۔''

''نہیں۔'' وہ چونکا۔ ''سنہری لیموں اور مستے۔''

یہ جملہ اس نے پہلے بھی کہیں پڑھا تھا۔ لیکن کہاں؟...... ''ژل لافورگ (Zhill Laforg)'' اُس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔

''ژل لافورگ'' فرانس کا وہ علامتی شاعر جو اس کی فرنچ ٹیچر پاؤلن لیکولی کا پسندیدہ شاعر تھا۔ لیکولی ان کی فرنچ زبان

کی کلاس کا ایک پیریڈ لیتی تھی اور اس ایک گھنٹے کی کلاس میں اس نے ژل لافورگ کی ساری علامتی نظمیں اُنہیں سنا ڈالی تھیں اور اس کی اکثر نظمیں سناتے ہوئے وہ بے حد جذباتی ہو جاتی تھی اور وہ اس بات پر بہت فخر محسوس کرتی تھی کہ اس کا نام پاؤلن لیکولی ہے ...... جو ژل لافورگ کی ماں کا نام تھا اور جو اپنے بارہویں بچے کی پیدائش پر اڑتیس سال کی عمر میں مر گئی تھی۔

''آہ، پاؤلن لیکولی...... بدقسمت ماں۔'' وہ اپنی بات کے اختتام پر ہمیشہ آہ بھرتے ہوئے کہتی تھی۔ ''لے سنگ لاتے ویلاتر۔'' یہ اس کی اٹھارہ سال کی عمر سے لے کر اکیس سال تک کی شاعری تھی۔ ''لے سنگ لاتے ویلاتر'' (یعنی زمین کی سسکیاں) شاید یہ جملہ ''زمین کی سسکیاں'' کی کسی نظم میں تھا یا شاید پھر......اب وہ نظم تھی۔

''Another for the sun'' (سورج کے لئے کچھ مزید) اور ''ژل'' نے لکھا تھا۔

''ایک بڑے پیلے کفگیر جیسا سورج، جس کے چہرے پر دھبے تھے، یوں سنہری لیموں پر مستے اُبھر آئے ہوں۔''

'تو ثابت ہوا کہ یہ جملہ میرا نہیں ہے۔'

اُس نے کلپ بورڈ سے کاغذ نکالا اور مروڑ کر شیلف کے پاس پڑی ہوئی باسکٹ میں ڈال دیا تھا، جو اوپر تک ایسے ہی مڑے تڑے کاغذوں سے بھری ہوئی تھی۔ آج بڑے دنوں بعد اس کے دل میں لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس کے پبلشر کے کم و بیش دن میں دو تین فون آ جاتے تھے۔

''ایک بھائی! کچھ لکھیں۔ بہت دنوں سے آپ کی کوئی کتاب مارکیٹ میں نہیں آئی۔''

ایڈیٹروں کے تقاضوں نے الگ ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن اس سے کچھ بھی لکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ کوئی عام سی تحریر نہیں لکھنا چاہتا تھا۔ وہ کوئی ایسا شاہکار تخلیق کرنا چاہتا تھا جو اس کی پچھلی تمام تحریروں پر سبقت لے جائے۔ جسے پڑھ کر لوگ پچھلی کتابوں کو بھول جائیں۔ نام تو تشکیل پا چکا تھا اور یہ طے تھا کہ اس کی نئی کتاب کا نام ''زمین کے آنسو'' ہوگا۔ لیکن وہ چند لائنیں، چند صفحے لکھتا اور پھاڑ کر پھینک دیتا۔ وہ اپنے لکھے سے خود ہی مطمئن نہیں ہو رہا تھا پھر قاری کو کیسے مطمئن کر سکتا تھا؟

اس نے کلپ بورڈ میں کاغذ صحیح کر کے لگائے اور لکھا۔

''زمین کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ یوں جیسے...... جیسے کسی بے حد گوری میم کا تلوں بھرا چہرہ یا......''

'نہیں۔' اُس نے پھر کاغذ کلپ بورڈ سے کھینچ کر گول مول کر کے باسکٹ میں پھینکا۔

''زمین صدیوں سے رو رہی ہے۔'' اُس نے نئے صفحے پر لکھا۔ ''پہلا آنسو اس وقت اس کی آنکھ میں آیا تھا، جب حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو جنت سے زمین پر پھینکا گیا تھا۔ اس نے مہربان ماں کی طرح اُنہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ روتے تھے، گڑگڑاتے تھے۔ تڑپ تڑپ کر اپنے رب سے اپنے گناہ کی معافی مانگتے تھے۔

ربنا ظلمنا انفسنا......

(اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تُو ہم کو معاف نہیں فرمائے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم خسارہ کھانے والے ہوں گے)

اور زمین، آنکھ میں آنسو لئے، بے آواز اُن کی دعا میں شامل ہو جاتی تھی۔

اے میرے رب! ان پر رحم کر، انہیں معاف کر دے۔

اور اس روز اس کی آنکھ میں ٹھہرا آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آیا تھا، جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا اور اس کے پاکیزہ وجود اور شفاف لباس پر خون کا پہلا قطرہ گرا تھا۔

آنکھ میں ٹھہرا آنسو پگھل کر مٹی میں جذب ہو گیا تھا اور دوسرے آنسوؤں کو راہ مل گئی تھی۔ زمین روتی تھی اور اپنے وجود پر اُبھرتے مٹی کے ڈھیر کو دیکھتی تھی۔ قابیل کے ہاتھ تیزی سے زمین میں گڑھا کھودتے تھے اور زمین کے چہرے پر

وہ پہلا نشان تھا...... جسے دیکھ دیکھ کر اس کی آنکھیں روتی تھیں۔
جب بھی اس کی نظر اپنے چہرے پر لگے اس بدنما داغ پر پڑتی تو وہ بلک اُٹھتی...... روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ اس کے شفاف لباس پر خون کے دھبے اور اس کے سینے پر اُبھرا مٹی کا ڈھیر اور اس کے وجود میں کھودا گیا گڑھا، جس میں ہابیل کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی، اسے مدتوں رُلاتی رہی تھی۔ مدتوں اس نے آنسو بہائے تھے لیکن پھر اسے صبر آ گیا لیکن......"
اس نے اپنی بند مٹھیوں سے آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھے۔ آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ بھیگی پلکیں میرے دل میں ہلچل مچا گئیں۔ میں جو بہت دھیان سے اُس کی کہانی سن رہا تھا، میرا ارتکاز ٹوٹ گیا۔ میں اس ہرنی جیسی آنکھوں والی لڑکی کی آنکھوں کے سحر میں جکڑ سا گیا۔ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا چاہتا تھا لیکن جیسے مسمرائز ہو گیا تھا...... اس کے گلاب کی پنکھڑیوں ایسے لب کپکپا رہے تھے۔ ان گلاب لبوں کی نرماہٹ کو محسوس کرنے کی خواہش دل میں دبائے میں نے اس کی آنکھوں کے سحر سے بچنے کے لئے بمشکل نظریں اس کے چہرے سے ہٹائیں۔
'تم آج تیسری بار مجھے ملی ہو حورعین! لیکن آج بھی اپنے بارے میں کچھ بتانے کے بجائے مجھے زمین کی کہانی سنا رہی ہو۔ یہ زمین...... یہ صدیوں پرانی زمین، اس سنگدل مٹی میں کیسے کیسے ڈرامے اور کیسی کیسی کہانیاں دفن ہیں...... تم ایک کہانی نگار کو بتا رہی ہو۔ حورعین! میں تو تمہیں جاننا چاہتا ہوں...... لفظ لفظ، ورق ورق...... میں تمہیں پڑھنا چاہتا ہوں۔"
"تو میں تمہیں اپنے متعلق ہی تو بتا رہی ہوں۔" اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا اور مڑ گئی۔
"حورعین! رُکو۔" میں نے تیزی سے بڑھ کر اس کی اوڑھنی کے پلّو کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ "سنو تم......"
"ایبک!"
وہ جو بے حد انہماک سے لکھ رہا تھا۔ عمارہ کے پکارنے پر اس بری طرح چونکا کہ قلم اس کے ہاتھ سے گر گیا۔
"جی ماما!" وہ تیزی سے ان کی طرف مڑا۔ عمارہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
"پانی۔" عمارہ کہنی کے بل اُٹھیں۔
ایبک نے جھک کر، قلم اٹھا کر میز پر رکھا اور کمرے میں موجود روم فریج کی طرف بڑھ گیا۔ پانی کا گلاس عمارہ کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے بیڈ کے پاس ہی بیٹھ گیا۔
"تم کچھ کام کر رہے تھے۔ میں نے شاید تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔"
"نہیں۔ کچھ خاص کام نہیں۔ یوں ہی، ایک کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔"
"کوشش، کیا مطلب؟"
"ابھی اسے کوشش ہی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ میں نہیں جانتا کہ جب یہ مکمل ہو گی تو اس کی کیا شکل ہو گی۔ آیا یہ کہانی کہلائی بھی جا سکے گی یا نہیں۔ ہمارے نقاد تو بعض اوقات اچھی خاصی تحریر کو رد کر دیتے ہیں اور میں تو ابھی طفلِ مکتب ہوں۔"
اس نے بے حد تفصیل سے بات کی تھی۔ شاید اپنے لکھے ہوئے سے وہ اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ لیکن اس نے کلپ بورڈ سے کاغذ نکال کر پھینکا نہیں تھا۔
"بابا جان نہیں آئے کیا؟" پانی پی کر خالی گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔
"انہوں نے وعدہ کیا تھا نا کہ وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر میرے پاس آ کر رہیں گے یہاں۔"
"ڈاکٹر نے ابھی ان کو ڈسچارج نہیں کیا۔ آپ کو لے چلوں ہسپتال؟"
"صبح تو ہو گئی تھی۔"

''تو کیا ہوا؟''
''وہاں اگر مائرہ ہوئی تو۔ایبک! اسے میرا بابا جان کے پاس جانا ان سے ملنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ دو بار مجھے ہسپتال میں ملی اور دونوں بار ہی مجھے لگا کہ وہ......اسے برا لگ رہا ہے۔ وہ غصے میں ہے۔''
''ہے بی ماما! ایسا ہو۔لیکن ہمیں کسی دوسرے کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔''
''وہ کوئی دوسری نہیں، احسان کی بیوی ہے۔ میرے بھائی کی......اور شانی'' وہ یک دم چپ کر گئی تھیں۔ احسان پتہ نہیں ان سے اتنا خفا کیوں ہے۔ الریان سے سب ہی تو انہیں ملنے آئے تھے باری باری۔ ثنا، بھائی، منیبہ، حفصہ، عادل، مرینہ حتیٰ کہ گلزار بابا اور رحمت بوا بھی۔ رحمت بوا کتنی بوڑھی ہو گئی تھیں۔ انہیں گلے لگا کر یوں دھاڑیں مار مار کر روئی تھیں کہ کرنل شیر دل گھر کے اندر سے ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے انیکسی میں آ گئے تھے۔
بس نہیں آیا تھا تو احسان نہیں آیا تھا۔
چار دن ہو گئے تھے انہیں یہاں آئے ہوئے اور ان چار دنوں کا بیشتر وقت انہوں نے بابا جان کے پاس ہسپتال میں گزارا تھا۔
''تو پھر چلیں؟'' ایبک نے انہیں خاموش دیکھ کر پوچھا اور کلائی اُلٹ کر وقت دیکھا۔ ''چھ بجنے والے ہیں۔''
''کیا پتہ آج بابا جان ''الریان'' چلے گئے ہوں۔ آج ہومی کہہ رہا تھا کہ شام تک شاید وہ بابا جان کو ڈسچارج کر دیں گے۔''
''ہاں۔لیکن بابا جان نے کہا تھا وہ ہسپتال سے سیدھے ادھر آئیں گے۔'' ایبک مسکرایا۔
''کیا پتہ، شانی نے انہیں منع کر دیا ہو۔'' عمارہ افسردہ ہو گئیں۔
''نہیں۔ ہومی نے وعدہ کیا تھا۔ اور پھر بابا جان اگر آنا چاہیں تو انکل احسان بھلا انہیں کیسے روک سکتے ہیں؟'' عمارہ نے سر ہلاتے ہوئے پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکائے۔
''ایبک! تمہارے بابا......وہ تو وہاں بہت اکیلے ہیں۔ بہت اُداس ہوں گے۔ تمہاری بات ہوئی تھی صبح ان سے۔ تم نے کیا کہا، ہم کب بہاول پور جائیں گے؟''
''ہاں، وہ اُداس تو ضرور ہیں۔ لیکن انہوں نے کہا ہے کہ آپ کا جب تک جی چاہے، یہاں رہیں۔''
''نہیں ایبک! تمہارے بابا اس طرح اکیلے کبھی نہیں رہے۔ بے شک انجی اور جواد ہیں ان کے پاس، لیکن بہت گھبراتے ہوں گے وہ۔ میں بھی بابا جان کے پاس زیادہ سے زیادہ رہنے کی چاہ میں انہیں بھلائے بیٹھی ہوں۔ تم کل کی سیٹ بک کروا دو۔'' وہ چپل پہن کر کھڑی ہو گئیں۔
''ٹھیک ہے ماما! کل چلتے ہیں۔ آپ فریش ہو جائیں تو بابا جان سے ملنے چلتے ہیں۔''
عمارہ واش روم کی طرف بڑھ گئیں تو ایبک نے رائٹنگ ٹیبل سے کاغذات اٹھا کر فائل میں رکھے اور فائل دراز میں رکھ دی۔
'پتہ نہیں، میں یہ کہانی کبھی مکمل کر بھی سکوں گا یا نہیں؟' اُس نے سوچا اور تب ہی دروازہ زور سے کھلا اور کھلے دروازے سے منیبہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے دروازے میں کھڑے کھڑے چاروں طرف نظر دوڑائی۔
''بابا جان کہاں ہیں؟''
''وہ ہسپتال میں ہیں مونی!......تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟'' ایبک نے حیرت سے کہا۔
''نہیں۔ وہ ہسپتال سے سیدھے ادھر ہی آ رہے ہیں۔ ہمدان نے فون کر کے مجھے بتایا تھا۔''
''اچھا!'' ایبک کا چہرہ چمک اٹھا۔
منیبہ کے کندھے پر سے زبیر احسان نے اندر جھانکا۔ 'ہمیں بھی راستہ دو۔ دروازے میں جم کر کھڑی ہو گئی ہو۔''
''اوہ، ہاں۔'' منیبہ دروازے سے ہٹ کر اندر آئی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا کیک ٹیبل پر رکھا اور اس کے پیچھے پہلے زبیر

امان، پھر عمر احسان اور حفصہ، مرینہ سب ہی یکے بعد دیگرے اندر چلے آئے تھے۔
''ایک کے بعد ایک لپکا۔ قطرہ قطرہ زمین پہ ٹپکا۔'' عمر احسان ٹیبل سے ٹیک لگا کر گنگنایا۔
حفصہ اور مرینہ نے بھی خوب صورت بکے اُٹھا رکھے تھے۔ چھوٹی سی سینٹر ٹیبل پھولوں سے بھر گئی تھی اور کمرا اُن کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔
منیبہ نے تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور آرڈر جاری کیا۔
''سب لڑکیاں کارپٹ پر بیٹھ جائیں اور لڑکے باہر سے ڈائننگ چیئرز اُٹھا کر اندر لے آئیں اور اس دیوار کے ساتھ لگا دیں اور ان پر تشریف رکھیں۔''
اندر آتے ہی اس نے سٹنگ روم میں کونے میں چھوٹی سی گول ڈائننگ ٹیبل کے گرد پڑی کرسیوں کو دیکھا تھا۔ تب ہی ... وال روم کا دروازہ کھول کر عمارہ باہر آئیں۔ سب لڑکیاں باری باری ان سے ملیں۔ عمارہ کا چہرہ ان سب کو دیکھ کر خوشی سے کھل اُٹھا تھا۔
منیبہ تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ کمرے میں دو سنگل بیڈ تھے۔ اس نے فوراً ہی ایک بیڈ پر بکھری ... اُٹھا کر رائٹنگ ٹیبل پر رکھیں۔ بیڈ شیٹ کی سلوٹیں ٹھیک کیں اور ایبک کی طرف دیکھا، جو دیوار سے ٹیک لگائے ... سے اسے یہ سب کرتے دیکھ رہا تھا۔
''یہ بیڈ، بابا جان کے لئے ٹھیک رہے گا۔''
''بابا جان......؟'' اپنے بیڈ پر بیٹھتے بیٹھتے عمارہ چونکیں۔
''ہاں۔ بابا جان، ہومی کے ساتھ ادھر ہی تو آ رہے ہیں پھپھو!''
منیبہ نے ان کے خوشی سے کھلتے چہرے کو دیکھا اور بے اختیار بڑھ کر ان کے رخسار پر بوسہ دیا اور خود بھی بیڈ پر ایک ... ان کے گرد حمائل کر کے بیٹھ گئیں۔
''ہمیں کارپٹ پر بٹھا کر خود بیڈ پر بیٹھ گئی ہو، پھپھو کے ساتھ۔''
مرینہ نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے اسے دیکھا اور اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے منیبہ نے ایبک سے کہا۔
''ایبک فلک شاہ! تم کوئی ایسا کمرہ نہیں لے سکتے تھے جو اتنا بڑا ہوتا، جس میں ہم سب سما سکتے؟''
''میرا خیال ہے، تب سب لوگ فٹ ہو گئے ہو اِدھر۔ بلکہ چار کرسیاں ابھی خالی ہیں۔''
''اور وہ جو ایک اور قافلہ افتاں و خیزاں ہمارے پیچھے چلا آ رہا ہے، انہیں کہاں فٹ کرو گے؟''
''شاعر و ادیب آدمی ہیں۔ پلکوں پہ بٹھا گے، آنکھوں پر جگہ دیں گے اور......''
عمر احسان پتہ نہیں آج اتنا شوخ کیوں ہو رہا تھا۔
''اور آگے تمہاری Vocabulary (ذخیرۂ الفاظ) ختم ہو گئی۔'' عمر احسان ہنسا تو زبیر کا مُکا اُس کے کندھے پر پڑا۔
''تمہاری Vocabulary کا بھی مجھے علم ہے۔'' عمارہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ بے حد مسرت اور خوشی سے ... دیکھ رہی تھیں۔ ان سب سے ملنے اور اُنہیں دیکھنے کو وہ کتنا ترسی تھیں اور ان سب کی وجہ سے الریان میں خوب ... ہوتی ہو گی۔ ایسی ہی رونق، جیسی پہلے ہوا کرتی تھی، جب سب تھے۔ اماں جان، زارا، مرتضیٰ، مصطفیٰ، عثمان، احسان، ... اللہ ... ، مروہ پھپھو، دادی جان...... کتنے اچھے تھے وہ دن۔ تب ''الریان'' پر کسی غم کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی۔ ... اللہ ... ، بینا چچی، مرتضیٰ بھائی، مروہ پھپھو چلی گئی تھیں پھر بھی ''الریان'' میں زندگی ہنستی تھی۔ ثنا بھابی آ گئی تھیں۔ ... بھابی تھیں۔ عثمان بھائی کی بیوی تھیں اسما...... اور پھر ''الریان'' کی ہنسی کو نظر لگ گئی تھی۔
''کون کون آ رہا ہے؟'' ایبک پوچھ رہا تھا، وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔
''سب۔'' منیبہ نے خوشی سے جھومتے ہوئے بتایا۔ ''ثنا چچی، اسما چچی، عثمان، عادل اور ......''

عمارہ کا دل چاہا، وہ پوچھیں کیا احسان بھی آ رہا ہے؟ اور ابھی انہوں نے منیبہ کی طرف دیکھا ہی تھا کہ باہر شور سنائی دیا۔ سب آ گئے تھے۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے سب اندر آئے تھے اور ان کے جلو میں بابا جان تھے۔ ہمدان کے بازو کا سہارا لئے وہ اندر آئے تھے۔ ایبک نے بڑھ کر انہیں سہارا دے کر بیڈ پر بٹھایا تھا۔

''بابا جان پلیز۔ آپ ایزی ہو کر بیٹھ جائیں۔'' اس نے فوراً تکیے ان کے پیچھے رکھے تھے۔

نیم دراز ہوتے ہوئے انہوں نے عمارہ کی طرف دیکھا۔

''عمو میری بچی!......ادھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔'' عمارہ کی آنکھوں سے بہت آہستگی سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ایبک کی نظر اُن پر پڑی تو وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے اور ان کے گرد بازو حمائل کئے کئے انہیں بابا جان کے پاس لے کر آیا۔

کمرہ بھر گیا تھا اور منیبہ سب کو بٹھا رہی تھی۔

''عثمان انکل! آپ ادھر کرسی پر بیٹھ جائیں اور اسما چچی! آپ بھی۔'' منیبہ کی ہدایات جاری تھیں۔

''عمو! میرا مومی......ایبک سے کہو، مومی کو لے آئے۔ یہاں تو وہ آ سکتا ہے نا۔ ایک بار مجھے آ کر مل جائے۔ اب تو چراغ سحری ہیں۔ بس کسی لمحے ٹمٹما کر بجھ جائیں گے۔''

''بابا جان!'' عمارہ نے ان کا ہاتھ، ہاتھوں میں لیتے ہوئے ہونٹوں سے لگایا۔ ''ایسا نہ کہیں۔ آپ کو ابھی بہت جینا ہے۔ اتنے سال، جتنے سال آپ مجھ سے جدا رہے۔''

''جھلّی نہ ہو تو۔'' وہ ہولے سے ہنسے اور پھر یکدم ہی ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''چھبیس سالوں کی جدائیاں کتنے گہرے گھاؤ لگا گئی ہیں۔ اور یہ گھاؤ بھر نہیں سکتے اور ان کی تلافی نہیں ہو سکتی۔''

''بابا جان! رونا نہیں...... بالکل بھی نہیں۔ آج تو خوشی کا دن ہے۔'' عمارہ نے اپنی انگلی سے ان کے رخساروں پر ڈھلک آنے والے آنسوؤں کے قطروں کو پونچھا۔

''تو کیا میری گنجائش ہے؟'' عادل ہاتھ میں کی رنگ گھماتا دروازے میں کھڑا تھا۔

''گنجائش دل میں ہونی چاہئے۔'' عمر احسان نے جوتے اُتار لئے اور بیڈ پر چڑھ گیا۔

''تم اِدھر آ جاؤ۔'' ایبک نے جو عثمان شاہ کی کرسی کے قریب والی کرسی پر بیٹھا ان سے کوئی بات کر رہا تھا، کھڑا ہو گیا۔

''ارے نہیں، تم بیٹھو۔ میں ادھر بیٹھ رہا ہوں۔'' عادل بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

''اور ابھی کس کس نے آنا ہے؟'' مرینہ شاہ نے حفصہ کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے پوچھا تو منیبہ نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

''مصطفیٰ انکل اور ثنا چچی۔''

''وہ دونوں گھر پر نہیں تھے۔'' عمر احسان نے اعلان کیا۔

''رابیل احسان اور مائرہ چچی۔''

''ان کے آنے کی اُمید نہ رکھیں۔ وہ والد محترم اور شہزادی رابیل کے ساتھ رحیم یار خان روانہ ہو چکی ہیں۔''

''کب؟......کس وقت؟......ہمیں کیوں نہیں پتہ؟'' منیبہ، حفصہ اور مرینہ ایک ساتھ چیخی تھیں۔

''یہ تو مجھے بھی علم نہیں۔'' عمر احسان نے کان کھجائے۔ ''لیکن صبح گیارہ بجے ان کا فون رحیم یار خان سے آیا تھا۔''

''او کے، اب کون رہ گیا؟''

''عاشی اور......اریب فاطمہ۔''

''عاشی۔ ارے میری بچی۔ اسے کیوں نہیں لائے؟'' بابا جان کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''وہ سو رہی تھی۔'' عادل نے بتایا۔
''میں مصطفیٰ انکل کو فون کر دیتا ہوں کہ وہ اور ثنا چچی جہاں کہیں ہیں، آجائیں اور عاشی کو بھی لے آئیں۔'' زبیر احسان نے جیب سے موبائل نکالا۔
''ایبک بھائی! یہ اتنے سارے لوگوں کی خاطر تواضع کا کچھ انتظام بھی تو ہونا چاہیئے۔''
حفصہ، الریان کے کچن کی نگران تھی اور ''الریان'' میں آنے والے ہر فرد کی خاطر تواضع اس کی ذمہ داری تھی۔
''ایبک بھائی! آپ کا کچن کہاں ہے؟ حفصہ آپی کو بتا دیں۔ منٹوں میں چائے تیار کر لیتی ہیں۔''
عمر احسان نے عادل اور زبیر کے بیچ میں سے سر نکال کر مشورہ دیا۔ تب ہی کرنل شیر دل نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔
''چائے تیار ہو رہی ہے۔ بلکہ آپ سب لوگ ادھر، ہمارے لونگ روم میں ہی آجائیں۔''
''نہیں انکل شیر دل! یہاں بہت مزا آ رہا ہے۔ محبت کی گرمی ہے اور دلوں میں گنجائش ہے۔ آپ بھی کہیں فٹ ہو جائیں۔'' زبیر احسان چہکا تھا۔ اور کرنل شیر دل نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ تب ہی ان کی نظر بابا جان پر پڑی۔
''ارے بابا جان! آپ؟'' وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھے تھے۔
اور پھر بابا جان سے ملتے ہوئے انہیں بھی جانے کیا کچھ یاد آ گیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی۔ انہیں فلک شاہ کا رونا اور بلکنا یاد آیا تھا۔ کیسے کیسے تڑپے تھے وہ جب الریان کے دروازے خود انہوں نے اپنے اوپر بند کر لئے تھے۔
''شیر دل! اس ظالم کو لے آؤ میرے پاس۔ اس سے کہو، مجھے معاف کر دے۔ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ تم تو جانتے ہو نا، میں پسند نہیں کرتا تھا اس کا سیاست میں انوالو ہونا۔''
''بابا جان!'' عمارہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ ''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ مومی تو خود آپ سے شرمندہ ہیں۔ انہوں نے کل رات بھی مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے ان کے لئے معافی مانگوں۔ آپ انہیں معاف کر دیں بابا جان! انہوں نے آپ کا دل دُکھایا۔''
''ارے میں کب ناراض ہوں اس سے؟ بھلا ماں باپ بھی بچوں سے خفا ہو سکتے ہیں؟ اور مومی سے تو میں کبھی خفا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔''
پتہ نہیں کیا بات تھی، وہ انہیں سلجوق سے بھی زیادہ پیارا تھا۔ ان کی عمو کا شوہر جو تھا۔ وہ ان کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا تھا۔ عمارہ کے امتحان کے بعد انہوں نے وعدہ کے مطابق عمارہ کی رخصتی کر دی تھی۔ بہت دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ مراد شاہ کا بس چلتا تو وہ اس شادی میں پورے لاہور کو مدعو کر لیتے۔ انہوں نے ایک ماہ پہلے ہی ماڈل ٹاؤن میں ایک شاندار کوٹھی کرائے پر لے لی تھی۔ عمارہ کی بری اتنی شاندار تھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ انہوں نے رونمائی میں عمارہ کو اقبال ٹاؤن میں ہی دو کنال کی ایک کوٹھی گفٹ کی تھی۔ آٹھ گھوڑوں والی بگھی پر فلک شاہ کی بارات آئی تھی۔
اور پھر اُس کا ولیمہ بھی اتنا ہی شاندار تھا اور اس وقت جب دُلہن کا جوڑا زیادہ سے زیادہ چھ سات ہزار میں بن جاتا تھا۔ لوگوں کے پاس نہ تو اتنا پیسہ تھا اور نہ ہی اتنی مہنگائی۔ انہوں نے عمارہ کا ولیمہ کا ڈریس پچاس ہزار کا بنوایا تھا۔ آج کل ساٹھ ہزار کا عروسی لباس عام خوش حال گھرانوں میں بھی بنا لیا جاتا ہے لیکن 73، 74 میں ایسا نہیں تھا۔
فلک شاہ، بہاول پور سے واپس آئے تو انہوں نے عبدالرحمٰن سے درخواست کی تھی کہ وہ عمارہ کے ساتھ اپنے گھر میں شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔
ابھی ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے انہیں کچھ عرصہ لاہور میں ہی رہنا تھا۔
''کیوں؟'' انہیں حیرت ہوئی تھی۔ ''کیا عمارہ اور تم اب الریان میں نہیں رہ سکتے؟ کیا عمارہ پرائی ہو گئی ہے؟ الریان

تمہارا نہیں رہا؟''

''نہیں بابا جان!'' وہ مسکرائے تھے۔''نہ الریان پرایا ہوا ہے اور نہ عمارہ پرائی ہوئی ہے۔ لیکن بیٹیاں شادی کے بعد اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں۔''

انہیں قائل کرنے اور اپنی بات منوانے کا ہنر آتا تھا۔

''تم کالج چلے جایا کرو گے اور یہ گھر پر اکیلی۔ بہتر ہے کہ تم اسے بہاول پور چھوڑ آؤ۔'' وہ ناراض ہوئے تھے۔

''کیوں، بہاول پور کیوں؟...... جب میں کالج جاؤں گا تو اسے ''الریان'' میں چھوڑ جایا کروں گا۔ یہ الریان کے ساتھ والے ''ملک ہاؤس'' کا ہی تو ایک پورشن لیا ہے میں نے کرائے پہ۔''

وہ ان کی بات نہیں ٹال سکتے تھے۔ حالانکہ ان کا دل بالکل نہیں مانتا تھا کہ وہ اور عمارہ ''الریان'' کے علاوہ کہیں اور رہیں لاہور میں رہتے ہوئے۔ یوں عمارہ اور وہ ملک ہاؤس میں رہنے لگے تھے۔ عمارہ صبح ان کے کالج جاتے ہی ''الریان'' آجاتی تھی اور ان ہی دنوں انہیں ان کی سیاسی سرگرمیوں کا علم ہوا تھا۔ ان دنوں وہ ''الریان'' آتے تو عثمان، احسان اور مصطفیٰ کے ساتھ سیاسی بحثیں کرتے۔ لمبی لمبی بحثیں ہوتیں اور کبھی جو وہ اُلجھتے تو اسے ضرور منع کرتے۔

''مومی بیٹا! سیاست میں مت اُلجھنا۔ یہاں سیاست میں بہت خرابیاں ہیں۔''

وہ سر جھکا لیتے تھے۔ لیکن مصطفیٰ نے انہیں بتایا تھا کہ وہ کسی سیاسی پارٹی کے سرگرم رکن بن چکے ہیں۔ انہوں نے اپنا ماسٹرز مکمل کر لیا تھا۔ مراد شاہ چاہتے تھے کہ اب وہ واپس بہاول پور آجائیں۔ لیکن وہ مستقل بہاول پور نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں پارٹی کے بہت سارے کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔

سو مہینے میں پندرہ دن بہاول پور اور پندرہ دن لاہور میں گزرنے لگے تھے۔ پھر ایک پیدا ہوا اور ایک کی پیدائش کے بعد احسان شاہ کی منگنی مائرہ سے ہو گئی تھی۔ حالانکہ وہ مروہ کے سسرال میں رشتہ کرنے کے حق میں نہ تھے لیکن بات احسان شاہ کی خواہش کی تھی۔ مروہ نے اُنہیں قائل کیا تھا۔

''شانی، مائرہ کے لئے بہت سنجیدہ ہے بابا جان!''

اور پھر فوراً ہی شادی کی تاریخ بھی طے پا گئی کہ احسان شاہ کو ایم ایس سی کے لئے اسکالرشپ مل رہا تھا۔ یوں مائرہ، احسان شاہ کی دُلہن بن کر رحیم یار خان سے ''الریان'' میں آگئی تھی۔

اس روز عمارہ ان کے کمرے میں بیٹھی ایبک کے کپڑے تبدیل کر رہی تھیں جب انہوں نے عمارہ سے مومی کا پوچھا تھا۔

''مومی آج کل بہت دیر سے آتا ہے تمہیں لینے۔ کیا کوئی کام شروع کیا ہے؟''

اور عمارہ نے بے حد سادگی سے بتایا تھا۔

''نہیں تو۔ وہ تو پارٹی کے دفتر میں جاتے ہیں۔ دراصل انہوں نے پارٹی تبدیل کر لی ہے۔''

''پارٹی تبدیل کر لی ہے...... کیا مطلب؟'' وہ ششدر سے رہ گئے تھے۔''یہ مومی کتنا خودسر ہو گیا ہے۔ میں نے کتنا سمجھایا تھا اسے کہ سیاست سے باز رہے لیکن۔ میں چچا جان سے بات کروں گا عمارہ!...... اب تک جو کچھ وہ کرتا رہا، ٹھیک ہے۔ لیکن اب وہ شادی شدہ ہے۔ بچے کا باپ ہے۔ اب اسے ایسی حماقتوں سے گریز کرنا چاہئے۔''

وہ ناراض سے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

اور باہر لاؤنج میں مصطفیٰ کو بیٹھے دیکھ کر وہ اس سے شکوہ کر بیٹھے تھے۔

''یہ مومی کیا کرتا پھر رہا ہے طفی بیٹا؟''

''وہ بہت سمجھ دار ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔'' مصطفیٰ نے ہاتھ پکڑ کر انہیں پاس بٹھا لیا تھا۔

''وہ کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں ہے۔ یہ ایک ویلفیئر تنظیم ہے۔ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتی ہے۔''

اور تب ہی مائرہ جو نہ جانے پہلے سے ہی لاؤنج میں موجود تھی اور انہوں نے اپنی پریشانی میں دیکھا نہیں تھا یا پھر اسی

الت آئی تھی، طنزیہ انداز میں بولی۔
''چھوڑیں مصطفیٰ بھائی! خوامخواہ میں مومی کے کارناموں پر پردہ مت ڈالیں۔ میں تھی نا گورنمنٹ کالج میں۔ سب جانتی ہوں۔ بابا جان نے بھی جانے کیا دیکھ کر ہماری عمو کو اس کے پلّے باندھ دیا۔''
وہ بات مکمل کر کے وہاں رُکی نہیں تھی اور تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔
''یہ مائرہ کیا کہہ رہی تھی مصطفیٰ بیٹا؟'' وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔
''کچھ نہیں بابا جان!'' مصطفیٰ نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ ''مائرہ بھابی کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''
مصطفیٰ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ مائرہ سے ضرور بات کریں گے۔ آخر کچھ تو ہو گا وہ اتنی بڑی بات کر گئی ہے۔
''خواتین وحضرات! آپ سب لوگ کھانا ہماری طرف کھائیں گے۔'' کرنل شیر دل کہہ رہے تھے۔
بابا جان چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔
''اور میں دراصل یہی کہنے آیا تھا۔ اور ہاں، ہماری بچیوں کو ایبک کا کچن تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ چائے بھی آ رہی ہے ادھر ہی۔''
''چائے۔'' مرینہ نے دہرایا اور ناک پر پھسل آنے والی عینک کو درست کیا۔
''ہاں، چائے کی تو بہت ضرورت ہے اس وقت۔ مستقبل کی ڈاکٹر صاحبہ نے ٹھیک ایک گھنٹہ دس منٹ پہلے چائے نوش فرمائی تھی۔ اور اب دس منٹ اوپر ہو گئے ہیں۔ یہ ہر گھنٹے بعد چائے پینے کی عادی ہیں۔''
''بکومت۔''
مرینہ کا ذہن، ایبک کے کچن میں اُلجھا ہوا تھا۔ ''ایبک سلطان کا کچن۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ 'اے کاش کوئی ایبک سلطان کا نام تبدیل کر دے۔ عمر صحیح کہتا ہے۔'
اس نے باہر جاتے ایبک کو دیکھا۔ ''ایبک فلک شاہ۔ اور لڑکیاں یوں ہی تو نہیں مرتیں ایبک فلک شاہ پر۔ کتنے شاندار ہیں نا ایبک بھائی۔'' اس نے حفصہ کے کان میں سرگوشی کی جسے سب نے سنا اور بیڈ سے چھلانگ لگا کر ایبک کے پیچھے جاتے عمر نے برا سا منہ بنایا۔
''یہ الریان کی لڑکیاں بھی نا، دل میں کوئی بات رکھ ہی نہیں سکتیں اور سرگوشی کرنے کا ہنر تو انہیں آتا ہی نہیں ہے۔''
وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اور جب انیکسی کا صحن عبور کر کے وہ لان میں آیا تو لان خالی تھا۔ ایبک جا چکا تھا۔ لیکن کہاں؟...... وہ سوچتا ہوا واپس اندر جا رہا تھا اور ایبک جو کولڈ ڈرنک لینے کے لئے باہر نکلا تھا، ابھی گیٹ سے چند قدم دور ہی گیا تھا کہ ٹھٹک گیا۔
عاشی کا ہاتھ تھامے اِدھر اُدھر پریشانی سے دیکھتی وہ اریب فاطمہ ہی تو تھی۔ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے اندر دور تک خوشی پھیلتی چلی گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے سب کو دیکھتے ہوئے اس کے دل نے خواہش کی تھی۔ اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ بھی ان سب کے ساتھ ہوتی۔ وہ ہرنی جیسی آنکھوں والی خوش خصال لڑکی۔ اور کبھی کبھی خواہشیں کیسے، کس طرح مکمل پوری ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی عمریں گزر جاتی ہیں، آرزو کا کشکول اٹھائے اور کوئی کھوٹا سکہ بھی اس کشکول کا مقدر نہیں بنتا۔ لبوں پر مسکراہٹ لئے وہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ مڑی تھی۔ اس کی سیاہ چادر کا ایک پلّو زمین پر لگ رہا تھا۔
''عاشی!'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔
عاشی نے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر اس سے ہاتھ چھڑا کر اس کی طرف بھاگی تھی۔ ''ایبک بھائی۔''
اس نے بھی مڑ کر دیکھا اور عاشی کا گال تھپتھپاتا، اس کا ہاتھ پکڑتا وہ چند قدم آگے بڑھا۔ وہ ابھی تک ہاں ہی اداس سی کھڑی تھی۔

''حورعین!'' اس نے دل میں دہرایا اور اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
''آپ اکیلی یہاں کیسے؟'' وہ حیران سا تھا۔
''وہ......'' اُس نے تھوک نگلا۔ اس قدر خنک دن میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ چادر کے پلو سے اس نے چہرہ صاف کیا۔
''ہم کرنل شیر دل کا گھر ڈھونڈ رہے تھے۔'' عاشی نے بتایا تو اس نے مسکرا کر عاشی کی طرف دیکھا۔
''یہ پیچھے وہ کالا گیٹ، کرنل شیر دل کے گھر کا ہی ہے نا؟......اور یہاں اتنے سارے گھروں کے کالے گیٹ ہیں۔ ہم کنفیوژ ہو گئے تھے۔'' اب بھی عاشی ہی بولی تھی۔
''آپ کرنل شیر دل سے کہیں، وہ اپنے گھر کے گیٹ پر گلابی یا بلیو پینٹ کروالیں۔ ادھر کسی گھر میں پنک یا بلیو گیٹ نہیں ہے۔'' عاشی نے مشورہ دیا تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔
''ضرور۔ میں کرنل شیر دل کو مشورہ دوں گا۔ تاکہ آئندہ آپ کو گھر ڈھونڈنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ لیکن یہ گھر ڈھونڈنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ سب کے ساتھ کیوں نہیں آئیں آپ؟''
اب وہ اریب فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔
''وہ، مجھے تو نہیں آنا تھا۔ یہ عاشی جاگ کر رونے لگی تھی۔ بہت رو رہی تھی۔ میں نے عمر کو فون کیا تو اس نے کہا، میں عاشی کو لے کر آ جاؤں۔''
''اور آپ عاشی کو لے کر آ گئیں۔ جبکہ لاہور ابھی آپ کے لئے اجنبی ہی ہے۔''
''وہ عمر نے پتہ اچھی طرح سمجھایا تھا۔''
''یہ عمر بھی بس......خود جا کر لے آتا عاشی کو۔''
''میں نے تو کہا تھا، میں نہیں آؤں گی۔ لیکن عمر نے......''
''اور آپ انکار نہیں کر سکیں۔'' وہ سنجیدہ ہوا۔ ''You have to strong enough to say no'' (آپ کو اتنا مضبوط ہونا چاہئے کہ آپ ''نہیں'' کہہ سکیں)
''جی......'' وہ کچھ سمجھ نہیں سکی تھی۔
''میں چلتی ہوں۔ آپ عاشی کو لے جائیں۔''
''احمق لڑکی۔'' وہ بڑبڑایا اور اس کی طرف دیکھا۔
''میں آپ کو جانے کے لئے نہیں کہہ رہا۔ میں آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ انسان کو غلط بات ماننے سے انکار کر دینا چاہئے۔''
''لیکن یہ غلط بات تو نہیں تھی نا۔'' اریب فاطمہ نے معصومیت سے کہا۔ ''عاشی اتنا رو رہی تھی۔''
''اوکے۔'' وہ مسکرایا۔ ''اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔ چلیں، آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔''
''آپ عاشی کو لے جائیں۔ میں اب گھر جاتی ہوں۔'' وہ روڈ پر کھڑے رکشے کی طرف بڑھی۔
ایبک نے غیر ارادی طور پر آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہ کیا حماقت ہے؟''
وہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچا۔ ایبک نے یکدم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
''سوری۔''
''میں تو صرف عاشی کو چھوڑنے آئی تھی۔''
''تو چھوڑ آئیں۔ وہ سامنے گیٹ ہے۔ گیٹ میں داخل ہو کر دائیں طرف مڑ جائیں۔ لان عبور کریں۔ سامنے ہی انیکسی کا دروازہ ہے۔''

وہ ذرا سامنہ کھولے ایبک کی طرف دیکھتی ہونق سی لگ رہی تھی۔ ایبک نے رخ موڑ کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔
''آپ کہاں جا رہے ہیں ایبک بھائی؟'' عاشی نے پوچھا تو اسے دیکھتی اریب بھی چونکی۔
''میں کام سے جا رہا ہوں گڑیا! آپ جائیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔''
''وہ......عمر نے کہا تھا، گیٹ پر پہنچ کر اسے فون کر دوں۔ وہ گیٹ سے لے جائے گا۔''
''تو کر دیں فون۔''
''فون نہیں ہے میرے پاس۔'' وہ جھجکی۔ ''عاشی اتنا رو رہی تھی، جلدی میں بیڈ سے فون اٹھایا ہی نہیں۔ وہ مونی کا فون تھا۔ عمر نے کہا تھا، اس کے بیڈ پر پڑا ہے۔''
ایبک لحہ بھر اسے دیکھتا رہا۔ وہ اب بھی ہراساں سی تھی۔
''آپ یہاں تک آگئی ہیں تو اب کیوں خوف زدہ ہیں؟''
''وہ مائرہ مامی کو شاید اچھا نہ لگے میرا آنا۔ بس عاشی کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہوا تھا اور میں سوچے سمجھے بغیر.....''
''ہمیشہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے اریب فاطمہ!'' اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایبک نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور مائرہ مامی وہاں نہیں ہیں۔''
''اچھا!'' اس کے لبوں سے نکلا۔
ایبک کو لگا جیسے وہ ایک دم پرسکون ہو گئی ہو۔ اس نے عاشی کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اعتماد سے قدم اٹھا رہی تھی۔
''سچی بات تو یہ ہے کہ میرا بھی جی چاہ رہا تھا عمارہ پھپھو سے ملنے کا۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کر کے مجھے یوں لگا جیسے وہ مردہ مامی جیسی ہیں۔ حلیم، نرم خو۔ لیکن میں نے صرف مائرہ مامی کی وجہ سے مونی آپا کو منع کر دیا تھا۔'' وہ تیز تیز بول رہی تھی۔
'کیا اسے مائرہ مامی کے وہاں نہ ہونے کی اتنی خوشی ہوئی ہے؟ اور اس سے پہلے تو اس نے کبھی ایبک سے اتنی باتیں نہیں کی تھیں۔'
ایبک نے حیرانی سے سوچا۔
'اور کیا مائرہ مامی اسے پسند نہیں کرتیں؟......اور کیا انہوں نے اس سے کچھ کہا ہے؟ اور ان سے اور رابیل سے بعید بھی نہیں کچھ۔'
ایبک نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ روانی سے بولتے بولتے رک گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک رہے تھے۔ عاشی ہاتھ چھڑا کر کھلے گیٹ کے اندر چلی گئی تھی۔ سامنے لان میں عمر کھڑا کرنل شیر دل سے باتیں کر رہا تھا۔ اپنے پیچھے گیٹ کو بند کرتے ہوئے ایبک نے اریب سے کہا۔
''آپ بے فکر ہو جائیں اریب فاطمہ! مائرہ مامی وغیرہ تو آج صبح چار بجے ہی رحیم یار خان چلے گئے تھے۔ بقول عمر احسان کے۔''
''کیا؟'' اریب فاطمہ کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ ''وہ رحیم یار خان گئے ہیں؟......کیوں؟''
''مجھے تو معلوم نہیں۔ شاید عمر کو پتہ ہو۔''
ایبک نے کندھے اچکائے اور مڑ کر عمر کو دیکھا جو عاشی کا ہاتھ پکڑے انیکسی کی طرف جا رہا تھا۔ اور پھر اریب فاطمہ کی طرف دیکھنے لگا جس نے گیٹ سے ٹیک لگا لی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔
''کیا ہوا؟'' ایبک نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ لیکن اریب فاطمہ کے آنسو اسی روانی سے بہہ رہے تھے۔
''پلیز مت روئیں اس طرح۔ مجھے آپ کے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔''

اریب فاطمہ نے ہاتھ میں پکڑا چادر کا پلو چھوڑ کر ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

وہ آنسو پونچھتی جا رہی تھی اور وہ مزید بہتے چلے آ رہے تھے، جیسے آنکھوں میں دریا سما گیا ہو۔ سیاہ چادر کے ہالے میں لپٹا اس کا چاند چہرہ اور غزال آنکھوں سے بہتے آنسو۔ ایک بے اختیار ایک قدم آگے بڑھا اور غیر ارادی طور پر ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے بہتے آنسوؤں کو پونچھنا چاہا اور پھر ہاتھ نیچے کر لئے۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ وہ اس کے اتنے قریب کھڑا تھا کہ اسے لگا جیسے وہ اس کے قرب کی حدت سے جل اٹھے گا۔

وہ یکدم پیچھے ہٹا تھا۔ اریب فاطمہ نگاہیں اٹھائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے بہتے آنسو رک گئے تھے اور اس کی آنکھوں میں سہم اور ڈر سمٹ آیا تھا۔

''آپ کا رونا مجھ سے نہیں سہا جا رہا اریب فاطمہ! آپ نہیں جانتیں آپ مجھے کتنی عزیز ہو گئی ہیں۔ اور میں شاید آپ سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں تھا اور تیزی سے لان کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اریب فاطمہ کی خوف زدہ آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ وہ یوں ہی گیٹ سے ٹیک لگائے ایبک کی پشت پر نگاہیں جمائے اسے جاتے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ یہ ایبک فلک شاہ ابھی ابھی کیا کہہ گیا تھا۔

نہیں...... شاید اس کے کانوں نے غلط سنا تھا۔ بھلا یہ کیسے......؟

اور اس کی خشک آنکھیں ایک بار پھر بہنے لگی تھیں۔

❁○❁

''سب ٹھیک ہے نا؟''

وہیل چیئر کی پشت پر ہاتھ رکھے تھوڑا سا جھکتے ہوئے انجی نے پوچھا تو انہوں نے مڑ کر اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا اور پھر تنقیدی نظروں سے اس ماسٹر بیڈروم کا جائزہ لینے لگے، جس کے عین وسط میں انجی ان کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

عبدالرحمٰن شاہ جب بھی بہاول پور آتے، اسی ماسٹر بیڈروم میں ٹھہرا کرتے تھے۔ دادا جان نے کبھی انہیں گیسٹ روم میں نہیں ٹھہرایا تھا۔

''پتہ ہے انجی!'' انہوں نے پھر ذرا سا مڑ کر انجی کی طرف دیکھا۔ ''بابا جان جب بھی یہاں آتے، دادا جان بھی یہیں منتقل ہو جاتے تھے کہ لو، عبدالرحمٰن اتنی دور سے آیا ہے تو میں اسے اکیلے کمرے میں اجنبیوں کی طرح چھوڑ دوں؟...... اُن کی اپنی منطق تھی۔ وہ ادھر سوتے تو میں بھی ادھر ہی آ جاتا اور مزے سے نیچے میٹرس بچھا کر سو جاتا۔ پہلے جب سلجوق بابا تھے تو یہاں صرف ایک ڈبل بیڈ ہوتا تھا۔ پھر دادا جان نے ادھر سنگل بیڈ ڈلوا لیا۔ تمہیں پتہ ہے انجی! یہ سلجوق بابا کا بیڈ روم تھا۔''

ایک گہری سانس لے کر وہ ایک بار پھر تنقیدی نظروں سے بیڈروم کا جائزہ لینے لگے۔

''یہ والا بیڈ تو بابا جان کے لئے صحیح رہے گا۔ واش روم بھی ادھر ہی ہے۔ اور عمو...... وہ بھلا کہاں الگ روم میں سوئے گی؟ اتنے عرصے بعد تو اپنے بابا جان سے ملی ہے۔ ایبک بتا رہا تھا، عمو اور بابا جان رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چھبیس سالوں کے دُکھ سُکھ بھلا ایک رات میں کیسے کہے ہوں گے انہوں نے۔ اس بیڈ پر تمہاری ماما سوئیں گی۔ میں اور آبی...... ہم بھلا اکیلے اپنے بیڈروم میں کیا کریں گے؟ ایسا کرو، گیسٹ روم میں وہ جو ایک سنگل بیڈ ہے نا، وہ ادھر لگوا دو۔ آبی تو نیچے میٹرس پر سو جائے گا۔''

''جی بابا!'' انجم مسکرائی۔

''اور ہاں سنو! اسٹور سے سنبل والے تکیے نکلوا دیئے ہیں نا؟ بابا جان تو صرف سنبل کا تکیہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ وہاں ''الریان'' میں تو صرف سنبل کے تکیے ہی استعمال ہوتے ہیں۔''

''جی بابا جان! میں نے تکیے دھوپ میں رکھوا دیئے ہیں۔''

''اچھا۔'' وہ پھر سے کمرے کو دیکھنے لگے تھے۔ ''بابا جان کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ بے چینی نہ ہو، وہ اجنبیت محسوس نہ کریں۔ چھبیس سال کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا۔'' وہ چھبیس سالوں بعد بابا جان سے ملیں گے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بابا جان کے لئے کیا کریں۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ پورے ''مراد پیلس'' کو پھولوں سے سجا دیتے۔ صبح سے وہ پورے گھر میں اپنی وہیل چیئر بھگاتے پھر رہے تھے اور ہدایات دے رہے تھے۔

ٹی وی لاؤنج اور سٹنگ کی ترتیب بدلی تھی۔ مالی کو لان کی صفائی کے لئے کہا تھا۔ لیکن پھر بھی جیسے دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

رات جو ایبک نے بتایا کہ وہ ماما اور بابا جان کے ساتھ کل بہاول پور آ رہا ہے تو کتنی ہی دیر تک انہیں یقین نہ آیا۔ وہ فون ہاتھ میں لئے ساکت بیٹھے تھے۔

''بابا!...... بابا!'' ایبک نے بے چین ہو کر بلایا تو وہ چونکے۔

''ایبک! ابھی تم نے کیا کہا تھا، بابا جان بہاول پور آ رہے ہیں؟...... کہیں میرے کانوں نے غلط تو نہیں سنا؟...... کبھی کبھی ہوتا ہے نا ایسا کہ آدمی وہی دیکھنے اور سننے لگتا ہے جو اس کے دل کی چاہ ہوتی ہے۔'' وہ ہولے سے ہنسے تھے۔

''جی بابا! کل ہمارے ساتھ بابا جان بھی آ رہے ہیں۔''

''اچھا...... بابا جان آ رہے ہیں۔ وہ مجھ سے خفا تو نہیں ہے، ناراض تو نہیں ہیں نا؟'' وہ بچوں کی طرح پوچھ رہے تھے۔

''نہیں بابا! وہ آپ سے ناراض نہیں ہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ ابھی سو رہے ہیں۔ جاگیں گے تو میں آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔''

''نہیں آبی! نہیں۔ میں کیا بات کروں گا؟...... مجھ سے کوئی بات نہیں ہو پائے گی۔ وہ آئیں گے تو میں ہاتھ جوڑ لوں گا۔ پاؤں پکڑ لوں گا۔'' ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

''بابا! پلیز ریلیکس۔'' دوسری طرف ایبک پریشان ہو گیا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔

''تم پریشان مت ہونا ایبک!...... بس اس خیال سے رونا آ گیا کہ اتنے سالوں بعد بابا جان سے ملوں گا۔'' انہیں ایبک کی آواز سے محسوس ہوا تھا کہ وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔

''تمہاری ماما کیسی ہیں؟...... بات کرواؤ نا۔''

''ماما تو انکل شیر دل کی بیگم کے پاس ہیں۔ ابھی آ جاتی ہیں تو......''

اور ایبک کو خدا حافظ کہہ کر وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے تیزی سے اپنی کرسی کا ہینڈل گھماتے ہوئے باہر آئے تھے۔

''انجی!...... انجی! سنو بیٹا۔''

وہ کچن میں ملازمہ کے ساتھ تھی۔ یکدم باہر نکل آئی۔

''انجی!...... بابا جان آ رہے ہیں عمو کے ساتھ۔''

انجم بھی یک دم خوش ہو گئی تھی۔ وہ پہلی بار بابا جان کو دیکھے گی۔ یہ احساس ہی خوش کر دینے والا تھا۔

''کل صبح کسی وقت کی فلائٹ ہے۔ سن انجی! ذرا ایبک کو فون تو کرو۔ کل ہی کہا تھا نا اس نے۔'' وہ پھر بے یقین سے ہونے لگے تھے۔

''جی!...... جی بابا! میں فون کر کے ساری تفصیل پوچھ لیتی ہوں۔'' وہ بھی پُرجوش ہو رہی تھی۔

اور جب ایبک سے بات کر کے وہ انہیں فلائٹ کا ٹائم بتا رہی تھی تو ایک بار پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ انہوں نے انجی کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا انجی! کہ بابا جان آ رہے ہیں۔ جب میں ان سے ملوں گا، انہیں دیکھوں گا تو میں کیسے......"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے بابا!" انجی نے ہولے سے ان کا بازو تھپتھپایا تھا۔

انجی ان کے ساتھ ہی کمرے میں آ گئی تھی اور پھر بہت دیر تک وہ ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی تھی تا کہ ان کا دھیان بٹ سکے۔ اور واقعی ان کا دھیان بٹ گیا تھا۔ لیکن پوری رات وہ بے چین ہی رہے تھے۔ ان کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ بیتے ہوئے ماہ و سال واپس لے آئیں۔ اور ان سالوں میں سے اس ظالم دن کو مہینوں اور سالوں کے اس گوشوارے سے نکال دیں۔

رات یونہی بے چینی سے سوتے جاگتے گزری تھی اور صبح فجر کی نماز کے بعد ہی وہ باہر آ گئے تھے اور نوکروں کو ہدایات دینے لگے تھے۔

"بابا! آپ کی چائے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ بنا لاؤں؟" انجی نے پوچھا۔

"ہاں۔" ان کی نظریں سامنے دیوار پر لگے کلاک کی طرف اُٹھیں۔ دس بج رہے تھے۔ آج وقت کتنی آہستگی سے گزر رہا تھا۔

"آپ اپنے بیڈ روم میں جائیں گے یا ابھی ادھر لاؤنج میں ہی بیٹھیں گے؟"

"میں ابھی ادھر ہی ہوں۔" وہ جانے کے لئے پلٹی تو انہوں نے اسے آواز دی۔

"سنو بیٹا! بابا جان کے لئے پرہیزی کھانا بنے گا۔ ایبک سے پوچھ لونا، ڈاکٹر نے کیا کہا ہے کھانے کو۔ وہ مرچیں کم کھاتے ہیں۔ "الریان" میں سب ہی زیادہ مرچیں نہیں کھاتے تھے۔ لیکن جب میں اور شانی باہر جاتے تو خوب کرارے کھانے کھاتے۔ زبردست مرچ مسالے والے۔ شانی کہتا تھا کہ کچھ ڈشز ایسی ہوتی ہیں کہ جب تک تیکھی نہ ہوں، مزا نہیں آتا۔ اور گھر میں بھی جب کڑاہی وغیرہ بنتی تو وہ خاص طور پر کچن میں جا کر یاد دہانی کرواتا کہ مرچ ذرا تیز ہی ہونی چاہئے۔"

وہ ذرا سا مسکرائے تھے۔ انجی کچن کی طرف بڑھ گئی تھی اور انہوں نے کرسی کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا۔ تب ہی ان کی نظر ماسٹر بیڈ روم کی کھلی کھڑکی پر پڑی تھی۔ شاید انجی نے کمرہ سیٹ کرتے ہوئے کھولی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک بے دھیانی سے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھتے رہے۔ بیڈ روم کے اندر کا کچھ حصہ کھلی کھڑکی سے نظر آ رہا تھا اور جو حصہ نظر آ رہا تھا، وہاں ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ کئی بار انہوں نے کھلی کھڑکی سے سلجوق بابا کو کرسی پر بیٹھے موٹی موٹی کتابیں پڑھاتے دیکھا تھا۔

سلجوق بابا بہت کم بات کرتے تھے، بہت کم بولتے تھے۔ اور جب کبھی یہ کھڑکی کھلی ہوتی تو وہ چپکے چپکے کھڑکی سے انہیں دیکھتے تھے۔ وہ انہیں بہت اچھے لگتے تھے۔ بہت مہربان، بہت شفیق۔ کہانیوں کے رحم دل شہزادوں جیسے۔

اس روز وہ آنکھیں موندے آرام کرسی کی پشت پر سر رکھے لیٹے تھے جب وہ کھڑکی کے بالکل قریب چلے گئے تھے۔ وہ بہت غور سے انہیں دیکھ رہے تھے، جب اچانک انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹے تھے۔ دادا جان نے انہیں سمجھایا تھا کہ سلجوق بابا کو بالکل تنگ نہیں کرنا ہے۔ تنگ کرو گے تو وہ زیادہ بیمار ہو جائیں گے۔

اور انہیں یاد تھا، ڈیڑھ سال پہلے کی ہی تو بات تھی، جب وہ ان کے پاس سونے کی ضد کرنے لگے تھے۔ تب سلجوق بابا ان کے ضد کرنے پر انہیں پاس سلانے لگے تھے اور سونے سے پہلے وہ اسے ضرور کوئی چھوٹی سی کہانی سناتے تھے۔ کہانیاں تو دادی جان بھی سناتی تھیں، لیکن انہیں اپنے بابا سے کہانی سننا زیادہ اچھا لگتا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یا کبھی اپنے اوپر رکھ کر سونا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ اور ایک روز بابا سے کہانی سنتے سنتے انہوں نے پوچھ لیا تھا۔

''بابا! میری مما کہاں ہیں؟ کیا وہ اسد کی مما کی طرح فوت ہو گئی ہیں؟''
اور سلجوق حیرت سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔
انہیں خاموش دیکھ کر انہوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کی مما فوت ہو گئی ہیں، تب انہوں نے بابا کا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔
''تو آپ ایک اور مما لے آئیں نا میرے لئے۔ پتہ ہے، اسد کے پپا اس کے لئے نئی مما لے آئے ہیں، بہت پیاری ہی...... جب میری مما آ جائیں گی نا تو میں ان سے کہانیاں سنوں گا اور وہ مجھ سے بہت پیار کریں گی۔''
''کیا دادی جان کہانی نہیں سناتیں؟'' سلجوق بہت سنجیدہ تھے۔
''سناتی ہیں۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''اور وہ آپ سے پیار بھی کرتی ہیں۔ آپ کی مما سے بہت زیادہ...... اگر آپ کی مما ہوتیں تو وہ آپ سے اتنا پیار نہیں کرتیں جتنا دادی جان کرتی ہیں۔''
''ہاں، دادی جان پیار تو بہت کرتی ہیں۔'' وہ الجھ کر انہیں دیکھنے لگے تھے۔ ''لیکن وہ تو دادی جان ہیں نا۔ اور مما تو مما ہوتی ہیں۔''
اور تب سلجوق بالکل چپ ہو گئے تھے اور وہ ان کے بولنے کا انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔ صبح سلجوق بابا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ دادا جان انہیں ہسپتال لے گئے تھے۔ پھر کئی دن ہسپتال رہنے کے بعد دادا جان انہیں انگلینڈ لے گئے تھے اور کتنے تھوڑے دن وہ ان کے پاس سوئے تھے۔
دادا جان کی بات یاد کر کے وہ کھڑکی کے قریب سے ہٹ گئے تھے۔ لیکن سلجوق بابا نے انہیں بلا لیا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ پھر اس روز سلجوق بابا نے ان سے بہت ساری باتیں کی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا۔
''شاید میں بہت سارے دن آپ کے ساتھ نہ رہوں۔ آپ میری باتوں کو یاد رکھنا بیٹا! ابھی شاید آپ میری باتوں کو نہ سمجھ سکیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب آپ ان کو سمجھ سکیں گے۔ اپنی مما کو معاف کر دینا بیٹا! ہو سکتا ہے کبھی آپ کو لگے کہ انہوں نے آپ کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ تب بھی...... وہ آپ کی ماں ہیں۔ انہوں نے آپ کو جنم دیا۔ تکلیف اٹھائی۔ اس تکلیف کا حق تو آپ کبھی ادا نہیں کر سکتے۔''
اور وہ یونہی ناسمجھی سے انہیں دیکھتے رہے تھے۔ جو بات وہ سمجھ سکے تھے، وہ یہ تھی کہ بابا جان کہیں جا رہے ہیں۔ وہ خوف زدہ سے ہو گئے تھے۔
''بابا! چائے۔'' انجی نے اندر آ کر کہا تو انہوں نے چونک کر انجی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ وہ بھی عمارہ کی طرح کبھی نہیں بھولتی تھی کہ وہ اس وقت چائے پیتے ہیں۔
''تھینک یو بیٹا!'' چائے کا کپ تھامتے ہوئے وہ مسکرا دیئے۔
''بابا! میں کچن میں ہوں۔ بلا لیجئے گا جب کمرے میں جانا ہو۔''
انہوں نے سر ہلا دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ اور سنو، اپنی نگرانی میں سب تیار کروانا۔ اور ہاں، جواد کو تم نے فلائٹ کا ٹائم وغیرہ بتا دیا تھا نا؟''
''جی بابا۔''
''اسے ایک بار پھر یاد کروا دینا، کہیں کام کی مصروفیت میں بھول ہی نہ جائے۔'' انہوں نے ایک بار پھر تاکید کی۔ انجی سر ہلا کر باہر چلی گئی۔ چائے پیتے ہوئے وہ ایک بار پھر ماضی میں کھو گئے تھے۔

❁○❁

زندگی بہت مہربان تھی۔ دادا جان اور دادی جان کی شفقتیں، بابا جان اور ''الریان'' کے باسیوں کی محبتیں، چاہتیں اور پھر عمارہ کی ہمراہی میں کٹتا زندگی کا سفر۔

ان سے زیادہ بھلا آدمی کیا چاہ سکتا ہے؟ اور انہیں اس سے زیادہ کی چاہ تھی بھی نہیں۔ وہ بہت خوش، بہت مطمئن تھے۔ ہاں کبھی کبھی انہیں مائرہ کا خیال آتا تو وہ لمحہ بھر کے لئے اُلجھ ضرور جاتے تھے۔ اس نے کہا تھا، وہ اپنی توہین نہیں بھولتی۔ کبھی بھی نہیں۔ تو وہ کیا کرے گی؟ کیا اپنی توہین کا بدلہ لے گی؟...... لیکن کس طرح؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے اور عمارہ کی خوش کن رفاقت زیادہ دیر کے لئے انہیں کچھ سوچنے بھی نہیں دیتی تھی۔

اس رات جب وہ رحیم یار خان سے واپس آئے تھے تو ان کے دل سے ہزاروں وسوسے لپٹے ہوئے تھے۔ مائرہ کی وہ گفتگو، اس کا لب ولہجہ، اس کا انداز...... آخر وہ کیا کر سکتی ہے؟ رحیم یار خان سے لاہور تک وہ صرف یہی سوچتے رہے تھے اور کچھ سمجھ نہیں پائے تھے۔ تب وہ شیر دل کے پاس آ گئے تھے۔

شیر دل کے علاوہ الریان میں انہیں کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا جس سے وہ دل کی بات کہہ سکتے۔

شانی ان کے بہت قریب تھا، لیکن وہ شانی سے یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ ہرٹ ہو سکتا تھا۔ وہ مائرہ سے اتنی محبت کرتا تھا کہ شاید وہ ان کی بات کا یقین ہی نہ کرتا۔ پھر مصطفیٰ بھائی تھے۔ لیکن مصطفیٰ سے کچھ بھی کہنے میں انہیں جھجک محسوس ہوتی تھی۔ کیا پتہ، وہ سوچیں کہ ضرور ان کی طرف سے ہی کچھ حوصلہ افزائی ہوئی ہوگی۔ تب ہی مائرہ اس طرح کر رہی ہے۔

حق نواز تھا ان کا دوست، لیکن وہ بہت جذباتی تھا۔ وہ ساری بات سن کر یقیناً مائرہ کے گھر جا پہنچتا اور اس کے والدین سے کہتا کہ بیٹی کو سنبھال کر رکھیں۔ لے دے کے ان کی نظر شیر دل پر ہی ٹھہری تھی۔ وہ بہت سمجھ دار، بہت بردبار تھے۔ ان بیتے دنوں میں شیر دل کے ساتھ ان کی دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ سو انہوں نے شیر دل سے ہر بات کہہ دی۔ پہلی ملاقات سے لے کر اس آخری رحیم یار خان والی ملاقات تک۔

اور شیر دل ہنس دیا تھا۔

''تم یونہی ڈر رہے ہو یار! یہ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ فضول ڈائیلاگ بازی...... وہ بھلا تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ چند ماہ بعد رخصتی ہو جائے گی اور پھر...... سب محبت وحبت ختم۔''

شیر دل نے اس ساری بات کو بہت معمولی لیا تھا اور وہ جو ساری رات جاگتے رہے تھے، مطمئن سے ہو گئے تھے۔ اور پھر واقعی کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ عمارہ کو رخصت کروا کے گھر لے آئے تھے۔ اس روز کے بعد ان کی مائرہ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہاں، احسان شاہ سے وہ اس کے متعلق سنتے رہتے تھے۔

''مائرہ ایسی ہے...... مائرہ ویسی ہے۔ یار! مجھے لگتا ہے، جس روز میری مائرہ سے بات نہیں ہوگی، وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

اور وہ حیرت سے احسان شاہ کو دیکھتے رہ جاتے تھے۔

''شانی! تم اتنا زیادہ چاہتے ہو مائرہ کو؟''

''اس سے بھی زیادہ، جتنا تم سوچ سکتے ہو۔''

''اللہ کرے، وہ بھی تمہیں اتنا ہی چاہے، جتنا تم چاہتے ہو اسے۔'' بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

''وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہے یار! تم خوامخواہ اس کے متعلق مشکوک نہ ہوا کرو۔''

''نہیں۔ میں مشکوک تو نہیں ہوا۔ بس تمہیں دعا دے رہا تھا۔''

''ہاں بس دعائیں دیتے رہا کرو۔'' احسان نے تھوڑا سا سر خم کیا تھا۔

ان دنوں وہ بے حد شوخ ہو رہا تھا۔ اس نے رحیم یار خان کے بھی دو تین چکر لگائے تھے لیکن ہر بار ہی انہوں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ وہاں نہیں جانا چاہتے تھے اور نہ ہی مائرہ کا سامنا کرنا چاہتے تھے۔ سو بہانہ بنا

اور پھر احسان شاہ اور مائرہ کی منگنی کے بعد وہ اور بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ اور احسان شاہ جو دو سال کے لئے باہر جا رہا تھا، منگنی کے بعد اس نے باہر جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ بابا جان کو قائل کرنے کے لئے اس کے پاس بہت سے دلائل تھے۔

''مرتضیٰ بھائی اور عثمان بھائی باہر ہی سیٹل ہو گئے ہیں...... مصطفیٰ بھائی باہر جانے کے لئے پَر تول رہے ہیں۔ عمارہ کی شادی ہو گئی ہے۔ کچھ دنوں تک زارا بھی رخصت ہو جائے گی۔ میں بھی چلا گیا تو ''الریان'' تو ویران ہو جائے گا۔''

''اللہ نہ کرے احسان شاہ! کیسی باتیں کرتے ہو؟'' اماں جان لرز گئی تھیں۔ ''اللہ ہمارے ''الریان'' کو آباد رکھے۔ تم سب ہنستے بستے رہو۔''

''لیکن اماں جان! میں آپ کو اور بابا جان کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ مجھے یہاں بہت اچھی جاب مل رہی ہے۔ آپ بابا جان سے کہہ کر میرا جانا منسوخ کر دیں۔ میں پڑھائی سے نہیں بھاگ رہا اماں جان! بس مصطفیٰ بھائی یا عثمان بھائی یہاں آ کر رہیں گے تو میں چلا جاؤں گا پڑھنے۔ لیکن فی الحال نہیں۔''

احسان بھائیوں میں سے سب سے چھوٹا تھا اور اماں جان کا لاڈلا بھی۔ اماں جان نے بابا جان کو قائل کر لیا کہ فی الحال وہ احسان کو باہر نہ بھیجیں۔ انہیں پتہ چلا تو حیرت ہوئی۔

''یار! تمہیں اسکالرشپ مل رہا تھا۔ ایم ایس سی کی ڈگری کی تو اور ہی بات ہوتی ہے۔ زیادہ اچھی جاب مل جاتی۔''

''ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں دو سال کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ دو سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ دو سالوں میں جانے کیا ہو جائے مائرہ!''

''کیوں، کیا تمہیں مائرہ پر اعتبار نہیں ہے؟ کیا وہ تمہارا انتظار نہیں کرے گی؟''

''مائرہ پر تو مجھے خود سے زیادہ اعتبار ہے ایبک! لیکن اس کے والدین...... انہیں بہت جلدی ہے۔ وہ کہتے ہیں، پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ اس کی عمر کی لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بن چکی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں شادی کر کے اسے ساتھ ہی لے جاؤں۔ اوّل تو ایسا اتنی جلدی ممکن نہیں ہے اور پھر بابا جان بھی اس کے حق میں نہیں ہیں۔ اور نہ ہی بابا جان یہ چاہتے ہیں کہ میں شادی کر کے اسے چھوڑ جاؤں۔ سو میں نے یہیں جاب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

اور وہ جو بابا جان کے کہنے پر اُسے سمجھانا چاہتے تھے، خاموش ہو گئے تھے۔ عمارہ کو بھی اس کا اسکالرشپ چھوڑ دینے کا افسوس تھا۔ مصطفیٰ نے بھی اپنے طور پر سمجھایا تھا، لیکن احسان نے جاب شروع کر دی تھی۔ یوں وہ پہلے جیسی ملاقات تو نہیں ہوتی تھی...... لیکن پھر بھی وہ ہر شام ''الریان'' باقاعدگی سے جاتے تھے اور پھر عمارہ کو لے کر گھر آ جاتے تھے۔

انہوں نے بابا جان کے کہنے پر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کیا تھا۔ لیکن وہ خود کم ہی آفس جاتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت تو پارٹی کے دفتر میں گزرتا تھا۔ بیتے سالوں میں انہوں نے اپنی پارٹی میں جگہ بنا لی تھی اور وہ کافی مقبول اسٹوڈنٹ لیڈر کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن ''الریان'' میں کوئی بھی ان کی سیاسی سرگرمیوں سے واقف نہیں تھا۔ جب ای ٹی میں تھے تو احسان انہیں روکتا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں آئے تو احسان سے انہوں نے سب کچھ چھپایا۔ اس لئے کہ بابا جان کو یہ پسند نہ تھا۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ نوجوانوں کو ملک کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔ ملک جو سیاست دانوں کی وجہ سے دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔

''اقتدار کے لالچ نے ملک کو دو ٹکڑے کیا تھا۔'' یہ بات سر الطاف نے سینکڑوں بار کہی تھی۔

جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ لیکن اب بھی کسی نے کچھ نہیں سیکھا تھا۔ اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والے سارے وعدے بھول گئے تھے۔ ملک میں عجیب افراتفری مچی تھی۔

حق نواز ان دنوں بہت چڑچڑا ہو رہا تھا اور اس کی وجہ اس کی ایک صحافی دوست کا اغوا تھا۔ الفلاح بلڈنگ کے سامنے وہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھی کہ ایک سفید کرولا وہاں آ کر رکی۔ اس میں سے دو تین بندے نکلے اور اسے ہاتھ

سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ وہ چیختی چلاتی رہی۔ آس پاس کھڑے لوگوں میں سے کوئی بھی اسے چھڑانے کے لئے نہیں بڑھا تھا۔ سب کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔

حق نواز نے بتایا تھا کہ اہم شخصیت نے اسے شادی کی پیش کش کی تھی۔ انکار کا یہ نتیجہ نکلا تھا۔ لاہور میں عجیب صورت حال تھی۔ بھیڑیے، گڈریے کا لباس پہنے تھے اور زندگیاں اور عزتیں محفوظ نہ تھیں۔

حق نواز اپنی پارٹی کے ایک ایک کارکن کے پاس گیا تھا۔ پارٹی لیڈر سے بات کی تھی۔ وہ اس اغوا کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ پارٹی لیڈر ساتھ دیں، ریلی نکالیں اور اسے اس صاحبِ اقتدار شخص کے پنجے سے چھڑا لیں۔ لیکن پارٹی لیڈروں نے انکار کر دیا تھا۔

''اس وقت اور بہت سے مسائل ہیں جن پر ہمیں توجہ دینی ہے۔ ایک معمولی بات کے لئے ہم ہنگامے نہیں کر سکتے۔''

''وہ ایک معمولی لڑکی تھی؟......تین یتیم بہنوں اور بیوہ ماں کا واحد سہارا۔''

حق نواز بہت مایوس اور اپ سیٹ تھا اور اسے پارٹی سے بہت سی شکایتیں تھیں۔

''ہم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ ہمارے ساتھی، سڑکوں پر لہولہان ہوئے......اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں، لیکن یہ ہمیں اتنا سا تحفظ بھی نہیں دے سکتے۔ ہم تو اپنے وطن کے لئے، اپنی قوم کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ لے کر آئے تھے فلک لیکن لگتا ہے کہ یہ سب صرف اپنے فائدے کے لئے ہمیں چارہ بنا رہے ہیں۔''

''ہم کچھ نہ کچھ تو کر رہے ہیں حق نواز! جو کچھ ہمارے اختیار میں ہے۔''

''ہم کچھ بھی نہیں کر رہے فلک شاہ! ہم صرف اُلّو بن رہے ہیں۔ دوسروں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ بنگلہ دیش بنے کتنا وقت گزر گیا، لیکن ہم نے سوائے لکیر پیٹنے کے کچھ نہیں کیا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ ہماری پارٹی کوئی مثبت کام نہیں کر رہی؟''

''پتہ نہیں یار!'' اس روز حق نواز کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ پارٹی چھوڑنے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی ایک پارٹی ممبر سے تلخ کلامی بھی ہو گئی تھی۔ اپنی صحافی دوست کا دکھ اس کے دل میں گڑ گیا تھا۔

''اس سے تو اچھا تھا ہم برسرِ اقتدار پارٹی میں ہوتے تو کم از کم عابدہ کے لئے کچھ کر سکتے تھے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے اس کی چھوٹی بہنوں اور ماں کی کیا حالت ہے۔ اس پر رشتہ داروں کا رویہ اُنہیں مار رہا ہے۔ وہ تو پہلے ہی زندہ درگور ہو گئے ہیں۔ کاش! میں ان کے لئے کچھ کر سکتا۔''

وہ اُسے بہت ساری تسلیاں دے کر آ گئے تھے کہ انہیں عمارہ کو لے کر بہاول پور جانا تھا۔ دادی جان کی خواہش تھی کہ عمارہ کا بچہ، بہاول پور میں ہی جنم لے۔

وہاں جاتے ہی عمارہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور انہیں ہسپتال میں فوری طور پر ایڈمٹ کروانا پڑا تھا۔ وہ بہت سارے دن حق نواز سے رابطہ نہیں کر سکے تھے۔ پہلے عمارہ کی پریشانی، پھر ایبک کی آمد۔ ''الریان'' سے سب ''مراد پیلس'' آئے تھے۔

اور ان بے پناہ مصروف دنوں میں انہیں حق نواز کا فون ملا تھا۔

''میں نے پارٹی رکنیت چھوڑ دی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ٹھیک ہے، جیسے تم کہو گے حق نواز! میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے تو ملک وقوم کے لئے کچھ کرنا ہے۔ پارٹی کوئی سی بھی ہو۔''

''سوچ لو یار! لوگ ایسے بندوں کو ''لوٹا'' کہتے ہیں۔''

اور وہ ہنس دیئے تھے۔ انہوں نے حق نواز سے زیادہ بات نہیں کی تھی کہ مصروفیت ہی بے پناہ تھی۔ ''الریان'' والوں کی آمد نے ''مراد پیلس'' میں رونقیں بکھرا دی تھیں۔ دادا جان اُڑے اُڑے پھرتے تھے۔ دادی جان ہر وقت ایبک کو

لئے بیٹھی رہتی تھیں۔
''ارے یہ تو پورا کا پورا سلجوق ہے۔ شاہ صاحب! دیکھیں نا، اس کی آنکھیں، اس کے ہونٹ، ناک...... ہے نا بنا سلجوق۔ یاد ہے نا جب سلجوق اتنا سا تھا تو......''
دادی جان دن میں نہ جانے کتنی بار اس بات کو دہراتی تھیں۔
سب کو ہی ایک بہت پیارا تھا۔ زارا تو اس کے پاس سے ہٹنے کو تیار ہی نہ ہوتی تھی۔ اس نے تو واپس لاہور جانے سے انکار ہی کر دیا تھا۔
''تمہاری پڑھائی کا حرج ہو گا بیٹا!'' بابا جان نے اسے سمجھایا تھا۔
''کوئی حرج ورج نہیں ہوتا۔ میں کور کرلوں گی۔ اور جب تک اماں جان ہیں، میں بھی یہاں ہی رہوں گی۔''
اور یوں زارا کو چھوڑ کر سب واپس لاہور چلے گئے تھے۔ دادی جان نے انہیں بھی روک لیا تھا۔ حق نواز سے پھر ان کی بات نہ ہو سکی تھی۔ البتہ اخبار میں انہوں نے اپنے اور حق نواز کے پارٹی چھوڑنے کی چھوٹی سی خبر دیکھی تھی۔
زارا اور اماں جان کو وہ لاہور چھوڑنے آئے تو ان کا ارادہ حق نواز کی طرف جانے کا تھا۔ لیکن بہاول پور سے دادا جان کا فون آ گیا تھا۔ دادی جان کی طبیعت خراب تھی اور وہ انہیں واپس بلا رہے تھے۔ اور پھر دادی جان پندرہ دن بیمار رہنے کے بعد وفات پا گئیں۔
یہ ایسا حادثہ تھا کہ وہ سب کچھ بھول بیٹھے تھے۔ دادی جان صرف دادی جان تو نہ تھیں۔ وہ تو ان کے لئے مما سے بڑھ کر تھیں۔ ابھی ایک ایک ماہ کا بھی نہ ہوا تھا اور وہ چل دی تھیں۔ لاہور سے شانی بہت دن آ کر ان کے پاس رہا تھا۔ انہیں سنبھلنے میں وقت لگا تھا، لیکن وہ سنبھل گئے تھے۔ دادا جان تھے انہیں تسلی دینے اور سنبھالنے کو۔
''سب کو ایک دن جانا ہے۔ ہمارا وقت تو پورا ہو چکا فلک! کون جانے، کب میرا بھی بلاوا آ جائے۔ تمہیں سمجھ داری سے کام لینا ہے۔''
''لیکن کچھ دن تو دادا جان!...... کچھ دن تو دادی جان زندہ رہتیں، ایبک کے لئے۔ وہ کتنی خوش تھیں نا ایبک کی پیدائش پر۔''
وہ ان کی گود میں سر رکھے لیٹے تھے اور ان کے آنسو دادا جان کے گھٹنوں پر گر رہے تھے۔
''وقت پورا ہو گیا تھا بیٹا! جانا تو تھا ہی۔''
دادا جان نے اس روز ان سے بہت باتیں کی تھیں اور بہاول پور میں ان کے قیام کے دوران بہت سارے معاملات سے باخبر کیا تھا جن سے وہ پہلے بے خبر تھے۔ زمینوں کے معاملات، بینک کے معاملات۔ وہ سب کچھ ان کے نام کر رہے تھے۔
''آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں دادا جان!'' وہ اُلجھتے تھے۔ لیکن بہاول پور ٹھہر کر انہوں نے وہ سب جانا، سمجھا اور کیا، جو دادا جان چاہتے تھے۔
ایبک جب تین ماہ کا ہوا، تب وہ لاہور آئے تھے۔ نئی پارٹی میں ان کا پُرجوش خیر مقدم ہوا تھا۔ حق نواز انہیں کچھ خاموش اور کمزور سا لگا تھا۔
''حق نواز! تم ٹھیک تو ہو نا؟...... گھر میں سب ٹھیک ہیں؟''
''ہاں سب ٹھیک ہیں۔ سوری یار! شیر دل نے تمہاری دادی جان کا بتایا تھا، آ نہیں سکا۔ اس روز بہن کی بارات تھی۔''
''کوئی بات نہیں یار! تم بتاؤ، عابدہ کا کچھ پتہ چلا؟''
''ہوں۔''
''چلو پارٹی چھوڑنے کا کچھ فائدہ تو ہوا۔''

''پتہ نہیں، فائدہ ہوا یا نقصان۔ لیکن جس روز میں نے پارٹی جوائن کی، اس سے اگلے روز صبح اس کی لاش مل گئی۔ ا
کے گھر کی عقبی گلی سے۔''
اور ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ حق نواز سے کیا کہیں۔ حق نواز نے اس موضوع پر پھر کوئی بات نہیں کی تھی اور ا
وہ بھی خاموش ہو گئے تھے۔
لیکن رات جب وہ سر الطاف کے پاس گئے تھے تو وہ خود کو اس موضوع پر بات کرنے سے نہ روک سکے تھے۔ انہ
عابدہ کی موت کا از حد دکھ ہوا تھا۔
عابدہ اور حق نواز کے درمیان کوئی محبت کا رشتہ نہ تھا، لیکن حق نواز نے اس کے اغوا اور پھر اس کی موت کا بہت اثر
تھا۔ اس نے کتنی ہی بار ایک سے کہا تھا کہ اگر عابدہ مل گئی تو وہ فوراً اس سے شادی کر لے گا۔
''اکیلی عورت کو ہڑپ کرنے کے لئے بہت سے بھیڑیے منہ پھاڑے منتظر ہوتے ہیں کہ کب موقع ملے اور وہ کم
اسے اپنے خونی پنجوں میں دبا لیں۔ اگر عابدہ کی پشت پر کوئی مرد ہوتا تو اسے اتنی آسانی سے اغوا نہ کیا جا سکتا تھا اور ا
اس واقعہ کے بعد تو اسے کوئی بھی قبول نہیں کرے گا...... ہمارا معاشرہ ایسا ہی تو ہے۔ عورت کو ہم اکثر بغیر قصور کے ا
مجرم گردان لیتے ہیں اور پھر ساری زندگی اسے سزا دیتے رہتے ہیں۔
ان کے دل پر بہت بوجھ تھا اور انہوں نے سر الطاف سے دل کی ہر بات کہہ دی تھی۔ انہیں پارٹی چھوڑنے کا افسو
تھا۔ وہ اپوزیشن میں رہ کر ہی کچھ کرنا چاہتے تھے۔
''حکمران پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد ان کی کمزوریوں اور خامیوں پر انگلی اٹھانا مشکل ہو جائے گا اور ا
لوگ بھی انہیں ان کی غلطیوں اور کمزوریوں میں شریک سمجھیں گے۔''
''تم کس بات سے ڈرتے ہو فلک شاہ!'' سر الطاف مسکرائے تھے۔ ''ان پر انگلی اٹھانے سے یا خود پر انگلی اُٹھنے سے؟''
''شاید دونوں باتوں سے۔'' ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
اور سر الطاف کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ جلسوں اور جلوسوں میں وہ جس گھن گرج کے ساتھ ان کی کمزوریوں ا
کرپشن پر بولتے تھے، کیا اب ان میں شامل ہو کر وہ اس طرح اتنے ہی جوش و جذبے کے ساتھ بول سکیں گے؟
انہوں نے سوچتے ہوئے سر الطاف کی طرف دیکھا تھا۔
''انسان کو نڈر اور بے باک ہونا چاہئے فلک شاہ! میں سمجھتا ہوں اگر تمہاری نیت نیک ہے اور تم مخلص ہو تو تم ا
کے اندر رہ کر زیادہ قریب سے انہیں جان سکو گے۔ اگر تمہیں کچھ غلط لگتا ہے تو روک سکو گے، سمجھا سکو گے۔ اس طر
تمہارا کردار زیادہ مؤثر ہو جائے گا۔'' سر الطاف نے سمجھایا تھا۔
''شاید آپ صحیح کہتے ہیں سر! لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہم نے کچھ غلط کیا ہے۔ مجھے پارٹی کی کئی باتوں سے اختلاف
لازمی بات ہے، حق نواز کو بھی ہو گا۔ حق نواز نے صرف عابدہ کے لئے......''
''جانتا ہوں۔ لیکن اب اپنی بات نبھاؤ۔ روز روز پارٹیاں بدلنا صحیح نہیں ہے۔'' سر الطاف خود کسی پارٹی کے رکن
تھے لیکن نوجوان طلباء میں بے حد مقبول تھے۔ حق بات کہتے ہوئے ذرا نہ جھجکتے تھے۔ کئی احتجاجی جلوسوں میں وہ ا
کے ساتھ تھے۔ وہ سر الطاف کے پاس سے اٹھے تو کچھ مطمئن تھے۔ لیکن لاہور میں اس بار ان کا دل نہیں لگ رہا تھا
عمارہ کو وہ بہاول پور ہی چھوڑ آئے تھے۔ دادا جان اس کے ساتھ آنے کو تیار نہ تھے اور دادی جان کے بعد وہ انہ
اکیلا چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ سو عمارہ، بہاول پور میں ہی تھیں۔ ان کا کچھ وقت تو ''الریان'' میں اور کچھ اپنے دفتر ا
گزر جاتا تھا۔
ان دنوں انہوں نے بہت سارے چھوڑے ہوئے کام نمٹائے تھے۔
کبھی کبھار وہ حق نواز کے ساتھ پارٹی کے دفتر یا سر الطاف کی طرف چلے جاتے تھے۔ حق نواز ایسا ہی تھا۔ خاموش ا

...ا۔ جانے کن سوچوں میں گم رہتا تھا۔

''الریان'' کی خاموشی سے گھبرا کر اماں جان نے احسان شاہ کی شادی کا پروگرام ترتیب دے ڈالا تھا۔ وہ عمارہ کو ...ال پور سے لے آئے تھے۔ دادا جان کو بھی زبردستی ساتھ لے آئے تھے۔ تنا بھابی اور راحت بھابی بھی آ گئی تھیں۔ ...ان شاہ، رحیم یار خان جا کر مروہ پھپھو کو بھی لے آئے تھے۔ الریان میں ایک بار پھر رونقیں اُتر آئی تھیں۔ رات گئے ...ڈھولک بجائی جاتی۔ مصطفیٰ، مرتضیٰ اور عثمان کو شادی سے چند دن پہلے آنا تھا اور بے حد مطمئن سے وہ حق نواز کے ...پارٹی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن حق نواز کو حکمرانوں کے بہت سے کاموں پر اعتراض ہونے لگا تھا۔ ...وہ چاہتا تھا کہ قوم سے جو وعدے کئے گئے تھے، وہ پورے کئے جائیں۔ نہ کہ خود بھی کرپشن اور عیش وعشرت میں ...مال ہو جائیں۔ اس نے جاب بھی چھوڑ دی تھی۔

''یہ جاب مجھے کسی اور کا حق مار کر دی گئی تھی۔ ایسی جاب سے بہتر ہے کہ میں بھوکا مر جاؤں۔''

پارٹی کے جن افراد سے ان کا واسطہ پڑتا تھا، وہ اس پر ہنستے تھے اور اس کے خیالات کا مذاق اُڑاتے تھے۔

''مجھے لگتا ہے کہ کسی روز میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔'' وہ اکثر کہتا تھا۔

''انسان جب بے بس ہو اور کچھ نہ کر سکے تو اسے کیا کرنا چاہئے فلک شاہ!''

''سمجھوتا۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''نہیں۔ اسے مر جانا چاہئے۔''

''فضول باتیں مت کرو حق نواز!'' اس کی باتوں سے اپ سیٹ ہو کر وہ گھر آئے تھے۔ احسان، رحیم یار خان جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

''خیریت؟'' زارا کی گود سے ایبک کو لیتے ہوئے انہوں نے ایبک کی پیشانی پر ہونٹ رکھے تھے۔

''رحیم یار خان جانے کے لئے۔''

''کیا میرا جانا ضروری ہے احسان؟'' وہ ایک دم سنجیدہ ہوئے تھے۔

''ہاں۔'' احسان شاہ بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''یار اب ایک بار ہی جانا دُولہا بن کے۔''

''خیال تو میرا بھی یہی تھا، لیکن اب بابا جان کا حکم ہے کہ مروہ پھپھو کے ساتھ جاؤں۔''

''کیوں، مروہ پھپھو واپس جا رہی ہیں؟''

''ہاں۔ انکل کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے تو بابا جان نے مناسب سمجھا کہ انہیں بھجوا دیں۔ ابھی شادی میں تو دن ہیں، ...آ جائیں گے۔''

''اور تمہارے دل میں لڈو پھوٹ پڑے ہوں گے کہ اسی بہانے ملاقات ہو جائے گی۔''

ایبک کو زارا کے حوالے کرتے ہوئے وہ مسکرائے تھے۔

''ہاں یار! جب سے شادی کی ڈیٹ طے ہوئی ہے، محترمہ بات بھی نہیں کر رہی ہیں۔ بقول ان کے وہ ان دنوں اپنی ...امی جان کے کمرے میں ہوتی ہیں، اسی لئے فون نہیں کر سکتیں۔ سو تم ساتھ ہو گے تو کسی بہانے ملاقات ہو جائے گی۔''

''یہ کام تو مروہ پھپھو بھی کر سکتی ہیں۔'' وہ جھک کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگے تھے۔

''ارے مروہ پھپھو نے تو وہاں جاتے ہی آنکھیں پھیر لینی ہیں۔ پکی سسرالی بن گئی ہیں۔ گیا تو تھا منگنی کے بعد ایک ...بارا جو جھلک بھی دیکھنے دی ہو مائرہ کی۔ اور تم فوراً اُٹھ جاؤ۔ لیسز بند کرو، عمارہ کو بتاؤ اور چلو۔ پھپھو تیار ہوں گی۔ ...ور تم نے حق نواز اور حواریوں کے درشن نہ کئے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

انہوں نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''تم کیا سمجھتے ہو ایبک! کہ مجھے تمہاری سرگرمیوں کا علم نہیں ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ تم سے کبھی ڈسکس نہیں کیا ورنہ سب جانتا ہوں۔ حالانکہ مجھے اب بھی پسند نہیں ہے تمہارا ان سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا اور حق نواز جیسے لوگوں سے دوستی رکھنا۔''
''حق نواز بہت پیارا بندہ ہے شانی! اس جیسے لوگ نایاب ہیں۔ اس کا دل اتنا خوب صورت ہے، اتنا شفاف کہ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں وہ اتنی ظالم دنیا میں اب تک زندہ کیسے ہے؟''
وہ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
وہ احسان شاہ کو انکار نہیں کر سکتے تھے حالانکہ ان کا رحیم یار خان جانے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ مائرہ کا ہرگز سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آج بہت سارے دنوں بعد مائرہ کے خیال سے وہ مضطرب اور بے چین ہو گئے تھے۔ لیکن پھر شیردل کی بات یاد کر کے وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے احسان شاہ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔
''اب تک تو مائرہ کے دل سے ان کا خیال نکل بھی چکا ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ احسان شاہ کو اپنی محبتوں کا یقین نہ دلاتی۔''
پھپھو انہیں دیکھ کر مطمئن ہوئی تھیں۔
''یہ اچھا ہوا کہ تم بھی ساتھ چل رہے ہو۔ میں بہت پریشان تھی۔''
''آپ پریشان نہ ہوں پھپھو!...... اِن شاء اللہ! انکل ٹھیک ہو جائیں گے۔'' احسان شاہ نے انہیں تسلی دی تھی۔
وہ پھپھو کی بات پر حیران تو ہوئے تھے کہ آخر ان کے ساتھ جانے سے پھپھو کی پریشانی کیسے دور ہو گئی۔ لیکن پھر انہوں نے زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ لیکن جب راستے میں ایک جگہ احسان شاہ گاڑی روک کر کچھ کھانے پینے کے لئے لینے ایک ہوٹل میں گئے تو پھپھو کی بات سن کر وہ ششدر رہ گئے تھے۔
''میں بہت پریشان ہوں موی! اس لڑکی نے تو مصیبت کھڑی کر دی ہے میرے لئے۔ اس لئے میں احسان اور مائرہ کی شادی کی مخالفت کر رہی تھی۔''
''کیا ہوا پھپھو؟'' وہ بے حد گھبرا گئے تھے۔
''مائرہ نے شادی سے انکار کر دیا۔''
''لیکن اس وقت، جب شادی میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے تو کیوں......؟'' اپنی عادت کے مطابق وہ غصے میں آ گئے تھے۔ ''پہلے ہی انکار کر دیتی تو احسان رو پیٹ کر اب تک سنبھل چکا ہوتا۔''
''پتہ نہیں کیوں فلک! عامر کا فون آیا تھا۔ میں نے تو بھائی جان سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ عامر کو بھی منع کر دیا کہ ابھی کسی سے بات نہ کرے اور ان کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا۔''
''لیکن آپ کیا کریں گی وہاں جا کر؟...... منتیں کریں گی اس کی؟...... اچھا ہے، جان چھوٹ جائے گی احسان کی۔ وہ لڑکی، احسان کے قابل ہرگز نہیں ہے۔''
''اس وقت جب سب شادی کے لئے آئے ہیں، کارڈ تقسیم ہو چکے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔
''تم جانتے ہو نا فلک! میں نے بھائی جان کو مجبور کیا تھا مائرہ کے لئے۔ ورنہ وہ تو راضی ہی نہیں تھے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے پھپھو! احسان شاہ کے لئے کوئی لڑکیوں کی کمی ہے کیا؟...... مائرہ سے ہزار درجے اچھی لڑکیاں ہیں۔ ہم اسی تاریخ پر شانی کی شادی کر دیں گے۔''
''اور احسان...... وہ کرے گا کسی اور لڑکی سے شادی؟...... وہ بہت محبت کرتا ہے مائرہ سے۔ اس کی محبت میں جنونی ہے وہ۔''

اور یہاں اس بات پر وہ ہار مان گئے تھے۔
''تو آپ منالیں گی اسے؟''
''کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے موی!''
شانی جوسز اور سینڈوچ لے آیا تھا لیکن وہ اتنے اپ سیٹ ہو گئے تھے کہ نہ تو انہوں نے سینڈوچ ہی کھایا تھا اور نہ جوس پیا تھا۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔ احسان شاہ نے دو تین بار پوچھا بھی تھا۔
''کیا بات ہے فلک! تم کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہو۔''
''نہیں۔ اپ سیٹ نہیں ہوں۔ سر میں کچھ درد ہے اور بس۔''
''سوری یار! میں تمہیں زبردستی لے آیا۔ تم وہیں بتا دیتے سر درد کا تو میں......'' وہ شرمندہ ہوا تھا۔
''ارے یار! چھوڑو۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ''اب ایسا بھی درد نہیں ہے۔''
لیکن رحیم یار خان پہنچتے پہنچتے ان کا سر درد شدت اختیار کر گیا تھا۔ بچپن میں انہیں اکثر میگرین کا درد ہو جاتا تھا، لیکن اب تو بہت عرصہ سے انہیں اتنا شدید درد نہیں ہوا تھا۔ پھپھو نے فوراً ہی گیسٹ روم کھلوا کر انہیں آرام کرنے کو کہا تھا۔
''تم لیٹ جاؤ فلک! میں چائے کے ساتھ ٹیبلٹ بھجواتی ہوں۔''
وہ احسان شاہ کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی تھیں۔ اور ان کے جانے کے بعد وہ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ 'کیا ہوگا اگر مائرہ نے پھپھو کی بات نہ مانی تو شانی تو...... پھپھو سچ ہی تو کہتی ہیں کہ وہ تو مائرہ سے بہت شدید محبت کرتا ہے۔'
وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے جب احسان شاہ، پھپھو کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اندر آیا تھا۔
''مان لیں پھپھو! انکل نے آپ کو بلانے کے لئے بیماری کا ناٹک کیا ہے۔ ورنہ اچھے بھلے تو ہیں۔''
''بکو مت۔ ان کی طبیعت خراب تھی۔ میں خود ہی چلی آئی۔ انہوں نے تو نہیں بلوایا تھا۔''
''یوں کہیں، آپ خود بھی اُداس ہو رہی تھیں ان کے بغیر۔'' کس قدر شوخ ہو رہا تھا وہ۔
انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ خوشی اس کے پورے وجود سے پھوٹتی نظر آتی تھی۔
''ابھی کچھ دیر کی بات ہے اور۔'' انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔
''فلک!'' احسان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔ ''میرا خیال ہے تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ کسی ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں۔ میں انکل سے پتہ کرتا ہوں ڈاکٹر کا۔''
انہوں نے سر اٹھا کر احسان شاہ کی طرف دیکھا اور ان کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔
''نہیں۔ ابھی یہ ٹیبلٹ لے کر چائے پیوں گا اور کچھ دیر آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم پریشان نہ ہو۔''
''ہاں! تم چائے پی کر کچھ دیر سو جانا۔ مجھے یاد ہے، بچپن میں تم جب سو کر اُٹھتے تھے تو تمہارا درد ٹھیک ہو جاتا تھا۔''
پھپھو نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور سر درد کی گولی ان کی طرف بڑھائی۔
''تھینک یو پھپھو!'' انہوں نے گولی لے لی تھی۔ تب پھپھو نے احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔
''اور تم احسان! اندر اپنے انکل کے پاس جا کر بیٹھو۔ بلکہ تم بھی آرام کرو کچھ دیر۔ میں ذرا آپا کی طرف جا رہی ہوں۔ آ کر کھانا لگواتی ہوں۔''
ان کی نظریں پھپھو سے ملی تھیں اور پھر مضطرب سے ہو کر وہ سر جھکا کر گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔ پھپھو، احسان شاہ کو ساتھ لے کر باہر چلی گئی تھیں اور جاتے ہوئے دروازہ بھیڑ دیا۔ وہ چائے پی کر لیٹ گئے تھے۔ بہت دیر آنکھیں موندے رہے لیکن نیند نہیں آئی۔ پتہ نہیں کتنی دیر گزر گئی، جب دروازہ ہولے سے کھلا تھا اور پھر کسی نے کمرے کی لائٹ جلائی تھی۔ انہوں نے جو آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹے تھے، ہاتھ ہٹا کر دیکھا تو دروازے کے پاس مائرہ کھڑی تھی۔
''آپ......'' ان کے لبوں سے حیرت سے نکلا تھا اور یک دم اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

''مامی کہہ رہی تھیں، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو میں......''
''پھپھو کہاں ہیں؟'' انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی؟
''کچن میں ہیں شاید۔''
''اور احسان؟'' وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر جھک کر بیڈ کے پاس پڑے اپنے جوتے پہننے لگے تھے۔
''مجھے علم نہیں ہے۔ میں اندر نہیں گئی۔ مامی کہہ رہی تھیں، تمہیں مجھ سے کوئی بات کرنا ہے۔'' اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔
''مجھے......'' وہ چونکے تھے۔ اور پھر اس سے پہلے کہ ان کے لبوں سے ''نہیں'' نکلتا، انہیں خیال آیا کہ شاید پھپھو نے اس خیال سے یہ کہا ہو کہ میں اسے سمجھاؤں۔
''ہاں......وہ آپ نے شادی سے انکار کیوں کیا؟''
''اس لئے کہ میرا دل نہیں مانتا کہ دل میں کوئی اور ہو۔ شادی کسی اور سے کروں۔''
''تو کیا پہلے آپ کے دل نے آپ کو منع نہیں کیا؟ اب جبکہ شادی سر پہ ہے، کارڈ تقسیم ہو چکے ہیں۔ اب آپ کا دل کہہ رہا ہے کہ شادی سے انکار کریں۔''
''پہلے میں نے سوچا تھا کہ احسان شاہ سے شادی کر کے میں تمہیں دیکھ سکوں گی۔ زیادہ قریب ہو جاؤں گی۔ لیکن جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے ہیں، مجھے لگ رہا ہے کہ یہ اذیت ناک ہو گا۔ تمہیں کسی اور کے ساتھ دیکھنا۔''
وہ بمشکل ضبط کئے بیٹھے تھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر دیں۔
''مائرہ حسین......!'' ضبط کی کوشش میں ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''آپ نے زندگی کو ایک کھیل سمجھا ہوا ہے۔ کیا حق پہنچتا تھا آپ کو ایک شخص کے جذبات اور دل سے کھیلنے کا؟ آپ نے تو شانی کو اپنی محبتوں کا یقین دلایا ہے، جھوٹ بولا ہے اس کے ساتھ......آپ کے نزدیک خاندان اور افراد کا وقار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ نہ آپ کو اپنے والدین کا خیال ہے، نہ دوسروں کا۔''
ان کی آواز دھیمی ہوگئی تھی۔
''فار گاڈ سیک مائرہ! آپ ایک سمجھ دار لڑکی ہیں۔ اگر آپ کو شادی نہیں کرنا تھی تو پہلے ہی نہ کرتیں۔ لیکن اب اس مرحلے پر......'' وہ کھڑے ہو گئے تھے۔
''مائرہ پلیز! اس طرح مت کریں۔''
وہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''خاندان کی عزت اور وقار کے لئے اگر میں اس وقت شادی کر لوں تو تم وعدہ کرتے ہو کہ میں اگر اپنے دل کو احسان شاہ کے ساتھ رہنے پر راضی نہ کر پاؤں اور طلاق لے لوں تو اس صورت میں تم عمارہ کو طلاق دے کر مجھ سے شادی کر لو گے؟''
اور وہ یکدم بھڑک اٹھے تھے۔
''میں اس طرح کا بے ہودہ وعدہ ہرگز نہیں کروں گا۔ میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ اور میں نے تمہیں ہرگز نہیں بلوایا تھا۔ میں تو تمہاری شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔''
اس کی آنکھوں میں یک دم غصہ لہرایا تھا اور چہرے پر سرخی چھا گئی تھی۔ اور جب وہ بولی تو انہیں اس کی آواز کسی سانپ کی پھنکار کی طرح لگی تھی۔
''زندگی تو تمہاری میں جہنم بنا دوں گی فلک شاہ! تم ہو کس زعم میں؟''
وہ یک دم تیزی سے پلٹ کر دروازہ زور سے بند کرتی چلی گئی تھی۔ وہ بے دم سے ہو کر بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔ وہ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ مائرہ نے کیا کہا تھا۔ وہ صرف احسان شاہ کے متعلق سوچ رہے تھے۔

اس پر کیا گزرے گی؟ وہ کیسے سہے گا اس غم کو؟ کتنا چاہتا ہے وہ اس بے وفا اور فریبی لڑکی کو......
پتہ نہیں، کتنی ہی دیر وہ یونہی سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھے رہے تھے۔ درد شدت اختیار کر گیا تھا، لیکن سوچوں پر انہیں اختیار نہ تھا۔
''الریان'' میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ زارا، عمارہ، ثنا بھابی، راحت بھابی رات گئے تک ڈھولک لئے بیٹھی رہیں۔ ایسے میں جب ''الریان'' میں خبر پہنچے گی کہ......
''نہیں...... یا اللہ! اس لڑکی کا دل پھیر دے۔ تُو چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔''
انہوں نے نم آنکھوں کے ساتھ سچے دل سے دعا کی تھی۔ اور پتہ نہیں وہ کوئی لمحۂ قبولیت تھا کہ پھپھو دروازہ کھول کر اندر آئیں اور انہیں بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔
''تم جاگ گئے ہو فلک؟...... کیسی طبیعت ہے اب؟'' ان کے لہجے میں وہی نرمی اور شفقت تھی جو ''الریان'' کے لوگوں کا خاصا تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔
''میں سویا ہی کب تھا؟''
انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
''تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی فلک! احسان اور تمہارے انکل آتے ہیں تو تم ڈاکٹر کی طرف چلے جاؤ۔''
''وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟''
انہوں نے پھپھو کے چہرے سے اس پریشانی کو کھوجنا چاہا جو وہ راستے بھر ان کے چہرے پر دیکھتے آئے تھے۔
''میرے سسرالی عزیزوں میں شادی کے کارڈ دینے گئے ہیں دونوں۔''
''کس کی شادی کے؟'' ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
''اپنے احسان کی شادی کے۔'' پھپھو کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
''لیکن وہ مائرہ......'' وہ متذبذب سے ہو کر انہیں دیکھ رہے تھے۔
''سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بالکل اُمید نہیں تھی کہ وہ مان جائے گی۔ آپا اور بھائی جان بہت پریشان تھے۔ میں عامر کو لا کر سیدھی ادھر ہی گئی تھی۔ یہ ساتھ والا ہی تو گھر ہے۔ وہ تو کسی صورت مان ہی نہیں رہی تھی۔ صاف انکار۔ میرے ساتھ ہی ادھر آئی تھی کہ آپ میں ہمت نہیں ہے تو میں خود احسان شاہ کو بتا دیتی ہوں کہ اس سے شادی نہیں کروں گی۔ میں کچن میں چلی گئی۔ بڑی دیر بعد میں ہمت کر کے کچن سے باہر آئی تو وہ لونگ روم میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو کھڑی ہو گئی، کہنے لگی۔ مامی! میں گھر جا رہی ہوں......اور میں نے احسان شاہ سے بات نہیں کی...... میں آپ کی اور اماں ابا کی خاطر شادی کے لئے تیار ہوں...... شکر ہے اللہ نے اس کا دل پلٹ دیا۔''
انہوں نے یکدم اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ تاہم انہوں نے تشویش سے پھپھو کو دیکھا تھا۔
''پھپھو! وہ احسان سے محبت نہیں کرتی۔ بعد میں اگر......'' پھپھو مسکرا دی تھیں۔
''بعد میں کچھ نہیں ہو گا۔ میاں بیوی جب نکاح کے بندھن میں بندھتے ہیں، ساتھ رہتے ہیں تو خود بخود محبت ہو جاتی ہے۔''
پھپھو مطمئن تھیں، لیکن ان کے دل پر ابھی بھی بوجھ سا تھا۔
اور پھر نیند کی گولی کھا کر وہ جلد ہی سو گئے تھے۔ ان کی آنکھ فجر کے وقت کھلی تھی۔ طبیعت کافی بہتر تھی۔ سر ہلکا سا بوجھل تھا، لیکن درد نہیں تھا۔ وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور پھر نماز پڑھ کر انہوں نے احسان شاہ کو بھی اُٹھا دیا تھا۔
''اُٹھو یار! ناشتہ کر کے نکل جائیں گے۔''
''تھوڑی دیر سے نہیں جا سکتے؟'' احسان شاہ نے مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔

''نہیں...... پورے چھ گھنٹے کا سفر ہے، یہاں سے لاہور تک کا۔ میں چاہتا ہوں، ہم ٹائم سے لاہور پہنچ جائیں۔''
''لیکن مائرہ تو گیارہ بجے سے پہلے نہیں اُٹھتی۔'' احسان شاہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
''کیوں، کیا رات ملاقات نہیں ہوئی تھی؟''
''ہوئی تھی۔ لیکن مختصر سی، تشنہ تشنہ سی۔ پتہ ہے، پھپھو کہہ رہی تھیں، رات وہ آئی تھی ادھر۔ ہم لوگ ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ وہ پھپھو کے پاس کچن میں ہی بیٹھ کر چلی گئی۔''
''ویری سیڈ۔'' فلک شاہ نے اظہار افسوس کیا۔ ''ویسے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی؟''
''انکل کے ساتھ جب ان کی طرف ملنے گیا تھا، تب۔'' احسان شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔
''فی الحال مختصر ملاقات پر ہی اکتفا کرو۔ تفصیلی ملاقات اب ایک بار ہی کرنا۔''
''ظالم انسان! تم چند گھنٹے رک جاؤ تو...... ہم سات آٹھ بجے تک تو پہنچ ہی جائیں گے۔''
''ہاں! لیکن سات آٹھ بجے مجھے میرا ڈاکٹر نہیں ملے گا۔'' فلک شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔
''اوہ ہاں۔ اب تمہارے سر درد کا کیا حال ہے؟''
''کچھ بہتر ہے۔ لیکن آنکھوں کے سامنے روشنی کے جھماکے سے آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ عام درد میگرین میں ڈھل جائے، ہم لاہور پہنچ جائیں تو بہتر ہے۔''
اور پھر احسان شاہ فوراً ہی اُٹھ کر کھڑا ہوا تھا اور وہ ناشتہ کر کے گھر سے نکل پڑے تھے۔ پھپھو ان کے ساتھ واپس نہیں جا رہی تھیں۔ ان کا ارادہ دو روز بعد انکل عامر کے ساتھ آنے کا تھا۔
''یہ پھپھو کا سسرال بھی یہاں ہونا تھا، اتنی دُور، پنجاب کی سرحد پر۔'' روڈ پر آ کر احسان شاہ نے تبصرہ کیا تھا۔
''اب تو تمہارا سسرال بھی یہیں ہی ہے میری جان!''
''مجبوری ہے۔'' احسان شاہ نے کندھے اچکائے تھے اور انہوں نے سر سیٹ کی پشت پر ٹکیتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔
'تھینک گاڈ! مائرہ مان گئی۔ لیکن کیسے؟ دو منٹ پہلے میرے سامنے انکار کرنے کے بعد۔ پتہ نہیں، اس لڑکی کے ذہن میں کیا ہے۔ پھپھو کہتی ہیں، شادی کے بعد میاں بیوی کے درمیان خود بخود محبت کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ شیر دل کہتا ہے کہ یہ لڑکیاں یوں ہی ڈائیلاگ مارتی ہیں۔ اور مائرہ کہتی ہے، وہ ان کی زندگی جہنم بنا دے گی۔' وہ سارا راستہ یہی ایک بات سوچتے آئے تھے۔ احسان شاہ نے کوئی بات بھی کی تو انہوں نے مختصر جواب ہی دیا تھا۔
گھر آ کر ان کا دل چاہا تھا کہ وہ دادی جان سے یہ ساری بات کہہ ڈالیں۔ لیکن پھر ان کی پریشانی کے خیال سے وہ ان سے کچھ نہ کہہ سکے تھے۔ تاہم انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ ''الریان'' کم کم ہی جایا کریں گے مبادا کوئی بات ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ مائرہ ایسی لڑکی نہیں ہے کہ ان کے یا عمارہ کے ساتھ کچھ غلط کرے۔ وہ جذباتی ضرور ہے اور اس نے شاید پہلی نظر میں انہیں پسند کر لیا تھا اور ابھی تک دل سے نہیں نکال سکی۔ زندگی میں ہمیشہ ہی اسے سراہا گیا ہوگا...... وہ تھی ہی اتنی خوب صورت۔ پہلی بار انہوں نے اسے نظر انداز کیا تو وہ ناراضی اور غصے کا اظہار کر رہی ہے۔
انہوں نے خود کو تسلی دی تھی اور کسی حد تک مطمئن بھی ہو گئے تھے۔ لیکن پھر اسٹیج پر جس طرح اس نے عمارہ کا ہاتھ جھٹکا تھا اور جن نظروں سے اس نے عمارہ کو دیکھا تھا، انہیں لگا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے نکلتی چنگاریاں اسے بھسم کر دیں گی۔
اتنی نفرت تھی اس کی آنکھوں میں کہ وہ بنا کچھ کہے عمارہ کا ہاتھ تھامے اسٹیج سے اُتر آئے تھے۔ عمارہ کی آنکھوں میں حیرت تھی، وہ شاید کچھ کہنا بھی چاہتی تھیں لیکن انہوں نے وہاں کھڑے کھڑے ہی بہاول پور جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
احسان شاہ کی شادی کے بعد دادا جان بھی بہاول پور جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

''دادا جان! آپ وہاں اکیلے کیا کریں گے؟ یہاں رہیں نا ہمارے پاس۔ ایبک تو آپ کے بغیر بہت روئے گا۔'' احسان نے کہا تھا۔

''میں پھر آ جاؤں گا۔ لیکن میرا دل گھبرا گیا ہے۔ جہاں ساری زندگی گزاری ہو، وہاں سے دور رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس عمر میں بندے کا دل اپنے ٹھکانے پر ہی لگتا ہے۔''

''دادا جان! آپ کچھ دن رک جائیں تو...... ہم آپ کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔ میں نے وہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ لیکن بزنس وائنڈ اپ کرنے میں کچھ دن تو لگیں گے۔'' اور دادا جان بے حد خوش ہوئے تھے۔

''یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے فلک شاہ! میں بھی چاہتا تھا کہ زندگی کے جو باقی ماندہ دن بچے ہیں، تم میری آنکھوں کے سامنے رہو۔ میرے پاس۔''

''آپ کو کچھ نہیں ہوگا دادا جان! ان شاء اللہ آپ اپنے ہاتھوں سے میرے ایبک کی شادی کریں گے۔''

اور وہ ان کی بات پر مسکرا دیئے تھے۔

مگر بہاول پور جانے کے تین دن بعد ہی انہوں نے چپکے سے آنکھیں موند لی تھیں۔ رات کو سوئے تو صبح اٹھے ہی نہیں۔

مراد پیلس سے گلزار کا فون آیا تو کتنی ہی دیر تک انہیں یقین نہیں آیا۔ ''الریان'' سے سب ہی ان کے ساتھ ''مراد پیلس'' گئے تھے۔ سوائے مائرہ کے۔ دادا جان کو دفنا کر آئے تو وہ کتنی ہی دیر تک عبدالرحمٰن شاہ کے گلے لگ کر روتے رہے۔

بابا جان بہت دیر تک انہیں تسلیاں دیتے رہے تھے۔

''ہم سب ہیں نا تمہارے اپنے۔ تم تنہا نہیں ہو۔ چچا جان کی جگہ تو کوئی بھی نہیں لے سکتا۔ لیکن ''الریان'' کے ہر فرد کے دل میں تم دھڑکتے ہو۔ تمہیں کبھی پریشانی آئی تو تم تک تو وہ بعد میں پہنچے گی پہلے ''الریان'' کا ہر فرد اس پریشانی کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو جائے گا۔''

یہ احسان شاہ تھا، جو بابا جان کے بالکل پاس کھڑا تھا۔ لیکن کتنے دکھ کی بات تھی کہ پھر جب ان پر مصیبت اور پریشانی آئی تو وہ بالکل تنہا کھڑے تھے۔ ''الریان'' کا ایک فرد بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔

وہ مہینہ بھر بہاول پور رہ کر واپس لاہور آ گئے تھے۔ ''مراد پیلس'' دادا جان اور دادی جان کے بغیر کتنا ویران لگتا تھا۔ ان کا دل گھبرا جاتا تھا۔ گلزار کو سارے معاملات سمجھا کر وہ لاہور آ گئے تھے۔

بابا جان نے ایک بار پھر انہیں ''الریان'' میں آنے کا کہا تھا۔

''اتنا بڑا گھر ہے مومی! کیا تمہارے اور عمو کے لئے جگہ نہیں ہے؟''

ایک لمحہ کے لئے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ بابا جان کی بات مان لیں۔ لیکن پھر انہوں نے سوچا تھا کہ اگر دادا جان ہوتے تو وہ انہیں کبھی بھی ''الریان'' میں رہنے کا مشورہ نہ دیتے۔ اس صورت میں جب کہ مائرہ بھی وہاں تھیں اور یہ کہ وہ ان سے اور عمارہ سے نفرت کرتی تھیں۔ تب انہوں نے بڑے رسان سے کہا تھا۔

''بابا جان! یہ مناسب نہیں ہے۔''

''اب تم ہی مجھے سمجھاؤ گے فلک شاہ! کہ کیا مناسب ہے، کیا نہیں۔'' وہ بڑبڑائے تھے۔

''میں یہ گستاخی کیسے کرسکتا ہوں بابا جان!...... لیکن دادا جان کہتے تھے، بیاہی بیٹیاں اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ میکے جا بیٹھیں تو ہلکی ہو جاتی ہیں۔''

انہوں نے بابا جان کا ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے آنکھوں سے لگایا تھا اور انہوں نے پھر مزید کچھ نہ کہا تھا۔

ان دنوں وہ بہت مصروف ہو گئے تھے۔ اور اس روز بھی رات وہ بہت دیر سے گھر آئے تھے اور عمارہ نے انہیں بتایا تھا کہ بابا جان ان کا دیر تک انتظار کرتے رہے۔ اور وہ اس پر بہت ناراض ہو رہے تھے کہ آپ کسی سیاسی پارٹی کے رکن ہیں۔

''اچھا......'' وہ پریشان ہوئے تھے۔ ''انہیں کس نے بتایا؟......شاید احسان شاہ نے۔''

''پتہ نہیں۔'' عمارہ، ایبک کے رونے پر اُٹھ کر چلی گئی تھیں اور انہوں نے سوچا تھا، وہ کل ''الریان'' جا کر بابا جان کی ناراضگی دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور صبح جب وہ ناشتہ کر رہے تھے تو مصطفیٰ آ گئے۔ انہوں نے اور ثنا بھابی نے آج واپس جانا تھا۔

''مصطفیٰ بھائی! آپ کیوں جا رہے ہیں؟ مرتضیٰ بھائی اور عثمان بھائی تو وہاں سیٹ ہو گئے ہیں۔ آپ تو نہ جائیں پلیز۔ اجنبی ملکوں میں آپ لوگ کیسے دل لگا لیتے ہیں؟''

''سال ڈیڑھ سال کی بات ہے یار! پھر ہمیشہ کے لئے آ جاؤں گا۔''

''یہ اچھی بات ہے۔'' وہ خوش ہو گئے تھے۔

''فلک! مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔ دیکھو میں نے پہلے بھی تمہیں سمجھایا تھا، یہ سیاست وغیرہ کے چکر میں مت پڑو۔ وقت پڑنے پر یہ لوگ تمہاری طرف دیکھیں گے بھی نہیں جن کے لئے آج تم جانیں دینے کو تیار رہتے ہو۔ کل بابا جان کو شاید کسی نے بھڑکا دیا تھا۔ وہ تو میں نے انہیں کہا کہ تم کسی ویلفیئر تنظیم کے لئے کام کرتے ہو۔ کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہیں ہو۔''

وہ سر جھکائے سنتے رہے تھے اور انہوں نے مصطفیٰ سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ اب وہ کوشش کریں گے کہ وہ ان سیاسی سرگرمیوں میں زیادہ ملوث نہ ہوں۔ لیکن وہ حق نواز کو انکار نہیں کر سکتے تھے۔ جب بھی حق نواز انہیں کسی میٹنگ کے لئے بلاتا تو انہیں جانا پڑتا تھا۔ پھر وہ کون سا اپوزیشن میں تھے۔ ان کی پارٹی تو برسر اقتدار تھی، سو وہ لاپروا تھے کہ بھلا ڈر اور خوف والی کیا بات ہے۔ بابا جان اور مصطفیٰ بھائی تو یوں ہی ڈرتے ہیں۔

مصطفیٰ چلے گئے تھے اور وہ اپنی زندگی میں بے حد مصروف ہو گئے تھے۔ اس دوران الیکشن ہوئے۔ ان کی پارٹی کامیاب رہی تھی۔

یہ جنوری 1977ء کی بات تھی۔ حق نواز نے پارٹی کے لئے بہت کام کیا تھا۔ وہ بھی اکثر اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ حق نواز کو ایک فائدہ ہوا تھا کہ اسے اس کی اہلیت کے مطابق جاب مل گئی تھی۔

وہ جب بھی ''الریان'' جاتے تو شعوری طور پر کوشش کرتے کہ مائرہ سے ان کا سامنا نہ ہو۔ اگر سامنا ہو جاتا تو وہ رسماً حال چال پوچھ لیا کرتے تھے اور کبھی دھیان سے انہوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ لیکن انہیں کئی مرتبہ مائرہ کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس ہوتی تھیں اور وہ دانستہ نظریں چرا جاتے تھے۔ ان دنوں اپوزیشن کی طرف سے الزام لگائے جا رہے تھے کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے۔ وہ حق نواز کی طرف گئے تو وہ کچھ پریشان سا بیٹھا تھا۔

''یار! ایسا تو ہوتا ہے۔ ہر الیکشن میں پارٹیاں ایک دوسرے پر الزام لگاتی ہیں کہ دھاندلی ہوئی ہے۔''

''لیکن اگر میں کہوں اس میں بہت حد تک سچ ہے تو......؟''

حق نواز نے نظریں چرا لی تھیں۔

''ایسا تو ہوتا ہے فلک شاہ! جب اختیار آپ کے پاس ہو تو مرضی کے نتائج حاصل کرنا کون سا مشکل کام ہے؟''

''یہ انصاف تو نہ ہوا حق نواز!......ہم تو انصاف اور سچ کے داعی ہیں۔'' حق نواز نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ تاہم چائے پیتے ہوئے اس نے ایک ایسی بات کہی تھی کہ وہ چونک پڑے تھے۔

''دن گنے جا چکے فلک شاہ!...... میں نے کئی لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن کسی نے میری بات پر دھیان نہیں دیا۔ عجیب عجیب خبریں سننے میں آ رہی ہیں۔ کچھ صحافی دوست تو صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ وقت پورا ہو چکا ہے۔ دیکھ کیا ہوتا ہے۔ فلک شاہ! بس تم یہ دعا کرو کہ ملک و قوم کے حق میں بہتر ہو۔ سر الطاف کہتے ہیں نا کہ ملک و قوم کے لئے کام کرنے والے ہر حالت میں اور ہر جگہ کام کر لیتے ہیں۔ اس کے لئے اقتدار کی کرسی ضروری نہیں ہے۔''

وہ حق نواز کے پاس سے اٹھے تو بہت افسردہ سے تھے۔ ہم لوگ اس طرح کیوں ہیں؟ کیوں نہیں مل جل کر اتحاد سے ملک کی ترقی کے لئے کام کرتے۔ ہر ایک، دوسرے کو دھکا دینے کے لئے تیار کھڑا ہے۔

وہ گھر آئے تو عمارہ نے بتایا کہ زارا کی شادی کی تاریخ طے پائی گئی ہے۔

''اوہ وہ تو بہت چھوٹی سی ہے۔'' انہیں حیرت ہوئی تھی۔

''بس اچانک ہی رشتہ آیا اور بابا جان نے فیصلہ کرلیا۔'' عمارہ نے انہیں بتایا۔ وہ الریان' جانے کے لئے تیار بیٹھی تھیں۔ اس روز بڑے دنوں بعد وہ اتنی دیر تک ''الریان'' میں رہے تھے۔ زارا کو چھیڑتے، بابا جان سے سنجیدہ باتیں کرتے ہوئے وہ یکدم ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔

احسان شاہ اور وہ بہت دیر تک بابا جان کے پاس بیٹھے تفصیلات طے کرتے رہے تھے اور جب وہ اور عمارہ اپس آ رہے تھے تو انہوں نے مائرہ کو دیکھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ عمارہ نے اسے خدا حافظ کہا تو اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تمہارا حوصلہ ہے بھئی! جو تم ہر روز میکے چلی آتی ہو میاں اور بچے سمیت۔ ورنہ شادی کے بعد تو گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے عورت کے لئے۔ شاید تمہارا اپنے گھر میں دل نہیں لگتا۔''

وہ جو ایک کو اٹھائے ہوئے دو قدم آگے نکل گئے تھے، ٹھٹک کر رک گئے۔ عمارہ حیرت سے مائرہ کو دیکھ رہی تھیں۔ اور مائرہ کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی اور نظریں جو عمارہ کے چہرے پر جمی تھیں، ان میں اتنی نفرت تھی کہ غیر ارادی طور پر وہ دو قدم آگے ہو کر عمارہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہوئے تھے کہ عمارہ ان کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ شاید وہ اسے مائرہ کی نظروں میں چھپی نفرت سے بچانا چاہتے تھے۔ ان کی نظریں مائرہ کی نظروں سے ملی تھیں۔ مائرہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی جیسے وہ ان کی کیفیت سے محظوظ ہو رہی ہو۔ اور پھر فوراً ہی وہ رخ موڑ کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور وہ بنا کچھ کہے ضبط کی حدوں سے گزرتے عمارہ کا ہاتھ تھامے لاؤنج سے باہر نکل آئے تھے۔ اس روز انہوں نے سوچا تھا کہ بابا جان کے اصرار پر بھی انہوں نے ''الریان'' نہ رہنے کا بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا اور اسی روز انہوں نے بہاول پور جانے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا۔ حالانکہ دادا جان کے بعد وہ کچھ متذبذب سے ہو گئے تھے اور انہوں نے لاہور ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن اب ایک بار پھر وہ عمارہ سے کہہ رہے تھے۔

''عمو! ہم زارا کی شادی کے بعد بہاول پور چلے جائیں گے۔ دادا جان اور دادی جان کی خواہش تھی نا کہ ہم وہاں رہیں، ''مراد پیلس'' میں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں بہاول پور میں ہی رہنا چاہئے۔'' آنسوان کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

''آپ نے سنا نہیں تھا، مائرہ بھابی کیا کہہ رہی تھیں؟ شاید انہیں ہمارا ''الریان'' میں جانا پسند نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے ذرا دیر ہو جائے تو بابا جان خود فون کر لیتے ہیں۔''

انہوں نے عمارہ کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

''یار! یہ نند بھابی کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم دل پر مت لو۔''

عمارہ کو تو انہوں نے سمجھا لیا تھا، لیکن وہ خود سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ مائرہ ایسا کیوں کر رہی ہے، اب جبکہ وہ احسان شاہ کے ساتھ ایک بہت خوشگوار زندگی گزار رہی ہے۔

یہ زارا کی شادی کے تین دن بعد کی بات تھی۔ زارا رخصت ہو کر جا چکی تھی۔ اور یہ جولائی 1977ء تھا، جب حق نواز کا فون آیا تھا۔ فوجی حکومت آ گئی۔ وزیر اعظم گرفتار ہو گئے۔

''نہیں......'' انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

''تم نے ٹی وی نہیں لگایا اور خبریں نہیں سنیں؟''

''زارا کا ولیمہ اٹینڈ کر کے رات دیر سے آئے تھے۔ میں ابھی تک سو رہا تھا۔ تم کہاں ہو؟ اور عوامی ردِعمل کیا ہے؟''

''میں گھر پر ہوں۔ اور فی الحال تو کوئی ردِعمل دیکھنے میں نہیں آ رہا۔ شاید شام تک ہم لوگ اکٹھے ہوں۔''

''میں آ رہا ہوں۔ تم گھر پر ہی رہنا۔''

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ کاش ہم یہ کچھ برا ہونے سے پہلے خود کو سنبھال لیتے۔ لیکن جب آدمی بااختیار ہوتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔'' حق نواز جذباتی ہو رہا تھا۔

وہ اسے خدا حافظ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جب وہ تیار ہو کر باہر نکلے تو لوگ گلیوں میں ٹولیاں بنائے کھڑے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ بات کر کے وہ خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔

وہ میڈیکل سٹور سے ایبک کی دوا لے کر گھر آئے تو انہوں نے عمارہ کو بتایا کہ وہ کچھ دیر کے لئے حق نواز کی طرف جا رہے ہیں۔ اس لئے اگر وہ چاہیں تو انہیں ''الریان'' چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن عمارہ نے منع کر دیا۔

''زارا آ جائے سسرال سے تو پھر ہم بہاول پور چلے جائیں گے۔''

وہ چونکے تھے۔

''کیا مائرہ بھابی نے پھر کچھ کہا؟''

''نہیں۔'' عمارہ نے نظریں چرا لی تھیں۔ وہ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتے رہے تھے۔ پھر ایک گہری سانس لے کر انہوں نے آہستگی سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم چند روز تک چلے جائیں گے۔'' اور پھر وہ حق نواز کی طرف آ گئے تھے۔ حق نواز بہت افسردہ سا تھا۔ کل کیا ہو گا، اس کے متعلق وہ کچھ اندازہ نہیں کر پا رہے تھے۔

''کیا مارشل لاء ہی ہر مسئلے کا حل ہے؟ کیا ہمارے پاس ان مسائل سے نمٹنے کا کوئی اور حل نہیں ہے؟ کوئی منصفانہ حل...... یہ تو جبر ہے یار! زیادتی ہے۔''

وہ چپ چاپ حق نواز کی باتیں سنتے رہے تھے۔ اس دوران حق نواز کے پاس دو تین فون بھی آئے تھے۔ آخر طے یہ پایا تھا کہ کل کسی وقت وہ سب پارٹی کے دفتر میں اکٹھے ہو کر صورتِ حال پر غور کریں گے۔ پارٹی لیڈر تو جیل میں تھے۔

وہ کل ملنے کا وعدہ کر کے جلد ہی اٹھ آئے تھے۔ گھر آئے تو عمارہ بے حد پریشان بیٹھی تھیں۔ ایبک کا بخار تیز ہو گیا تھا۔ وہ اسی وقت ایبک کو ہسپتال لے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے داخل کر لیا تھا۔ ٹمپریچر بہت ہائی تھا۔ دو دن بعد وہ ایبک کو لے کر گھر آئے تو شیر دل کا فون آ گیا تھا۔

''کہاں تھے فلک تم...... میں نے کتنے ہی فون کئے۔'' شیر دل بے حد پریشان تھا۔

''کیا ہوا، خیریت ہے؟''

''خیریت نہیں ہے۔ حق نواز دو دن سے غائب ہے۔ وہ گھر سے یہ کہہ کر نکلا تھا کہ پارٹی کے دفتر جا رہا ہے۔ کچھ دیر تک آ جائے گا۔ لیکن واپس نہیں آیا ماموں کا رات کو فون آیا تھا۔ تب سے سارے سورسز استعمال کر رہا ہوں، کچھ پتہ نہیں چل رہا۔''

وہ خود بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ شکر ہے شیر دل کی پوسٹنگ ان دنوں لاہور ہی میں تھی۔ ورنہ حق نواز کے والد بے چارے کیا کرتے۔

''تم کہاں ہو شیر دل؟'' انہوں نے پوچھا تھا۔

''میں اس وقت ماموں کی طرف ہی ہوں۔''

''اوکے۔ میں آتا ہوں ابھی۔''

''لیکن تمہارا بیٹا بیمار ہے۔''

''اب تو ٹھیک ہے۔ ایک دو دوستوں کو جانتا ہوں جو حق ناز کے بہت قریب ہیں۔ ان سے پتہ کرتے ہیں۔''

وہ عمارہ کو بتا کر حق نواز کے گھر آ گئے تھے۔ اس کے والد اور والدہ کی حالت بہت خراب تھی۔ رو رو کر سب کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ شیر دل کے ساتھ ان سب جگہوں پر گئے تھے، جہاں سے کچھ معلوم ہونے کی توقع تھی۔ لیکن کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ سوائے اس کے کہ حق نواز پارٹی کے دفتر گیا تھا۔ لیکن وہاں سوائے محسن اور افضال کے اور کوئی نہیں آیا تھا اور وہ جلدی چلے گئے تھے۔ سب سے آخر میں حق نواز ہی گیا تھا۔

مزید ایک دن گزر گیا تھا۔ حق نواز کے متعلق کوئی خبر نہ تھی۔ وہ بے حد افسردہ سے بیڈ پر لیٹے تھے جب عمارہ نے بتایا تھا۔

''بابا جان صبح سے کئی بار فون کر چکے ہیں۔ ایک چکر بھی لگایا ہے ادھر کا۔ اماں جان بھی بہت اُداس ہو رہی ہیں ذرا رات کے لئے۔ کچھ دیر کے لئے چلیں اُدھر؟''

''تم چلی جاؤ عمو! میں تھوڑی دیر تک شیر دل کی طرف جاؤں گا۔ شاید حق نواز کا کچھ پتہ چلا ہو۔''

پھر عمارہ کے جانے کے بعد وہ شیر دل کی طرف چلے گئے تھے۔ اس کے ساتھ وہ مختلف جگہ انہیں ڈھونڈتے پھرے تھے۔ کئی تھانوں سے بھی پتہ کیا۔ شیر دل وردی میں تھا، اس لئے ہر جگہ اچھی طرح لوگوں نے گائیڈ کیا۔

''آخر کہاں چلا گیا وہ؟'' انہوں نے شیر دل سے پوچھا تھا۔

''مجھے ڈر ہے کہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اسی دن سے سب ڈرتے تھے۔''

''اگر گرفتار کر لیا گیا ہے، تب بھی پتہ تو چلے کہاں ہے؟ کس جیل میں رکھا گیا ہے اسے؟ ملاقات تو ہو کسی صورت۔'' انہوں نے شیر دل سے کہا۔

''یہی تو پتہ نہیں چل رہا فلک شاہ!...... اور سنو! تم بھی محتاط رہنا۔ اِدھر اُدھر تبصرہ مت کرتے رہنا۔''

شیر دل کے ساتھ کافی دیر تک اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد وہ بہت دیر تک حق نواز کے گھر بیٹھے رہے تھے۔ اور جب وہ وہاں سے نکلے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ انہیں وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ ''الریان'' پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے تھے۔ گو کہ گرمیاں تھیں اور لاہور میں ابھی بارہ بجے لوگ جاگ رہے تھے۔ سڑکوں اور مارکیٹوں میں بھی آمد و رفت تھی۔ پھر بھی ''الریان'' کے حساب سے بہت دیر ہو گئی تھی اور انہیں ابھی عمارہ کو ادھر سے لینا تھا اور بابا جان کا حکم تھا کہ آٹھ بجے تک سب گھر میں موجود ہوں۔ جس میں نو بجے تک کی رعایت تھی۔ اور اب تو بارہ بج رہے تھے۔ بابا جان ضرور ناراض ہوں گے۔ گھر جا کر عمارہ کو فون کر دیتا ہوں کہ شانی کے ساتھ آ جائے۔ صبح تک بابا جان کا غصہ کم ہو جائے گا۔ سو وہ اپنے گھر چلے گئے تھے اور ابھی انہوں نے اپنے لاؤنج میں قدم ہی رکھا تھا کہ فون کی بیل سنائی دی۔

'عمارہ کا فون ہو گا۔' وہ مسکرائے اور ریسیور اٹھایا۔ لیکن دوسری طرف شیر دل تھا۔ گھبرایا ہوا سا۔

''فلک شاہ! فوراً میو ہسپتال پہنچو۔ حق نواز آئی سی یو میں ہے۔''

''کیا ہوا اُسے؟''

''کچھ مت پوچھو۔ ابھی آ جاؤ۔ وہ مر رہا ہے اور اس نے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔'' شیر دل رو پڑا تھا۔ ''پتہ نہیں کب...... وقت کم ہے۔ دیر مت کرنا۔''

اور وہ ریسیور کریڈل پر ڈال کر اُلٹے قدموں باہر نکلے تھے اور تیزی سے اپنے گیٹ سے نکل کر ''الریان'' آئے تھے۔

''عمارہ کہاں ہے؟'' دروازہ کھلتے ہی انہوں نے عنایت بی بی سے پوچھا تھا۔

وہ عمارہ کو حق نواز کے متعلق بتانے آئے تھے اور یہ کہ آج رات وہ ''الریان'' میں ہی ٹھہر جائے۔ کیا پتہ ہسپتال میں ہی رُکنا پڑے انہیں۔ وہ حق نواز کو اس حالت میں چھوڑ کر آ تو نہیں سکتے تھے۔

''جی پہلے تو وہ بڑے صاحب کے کمرے میں تھیں لیکن ابھی میں نے دیکھا تھا، وہ چھوٹے شاہ جی کے کمرے میں جا رہی تھیں۔''

احسان شاہ کو سب ملازم چھوٹے شاہ جی کہتے تھے۔ وہ تیزی سے احسان شاہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھے تھے۔ شیر دل نے کہا تھا، وقت کم ہے۔

دل ہی دل میں حق نواز کی زندگی کی دعا مانگتے ہوئے انہوں نے دروازے کو ہلکا سا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی بیڈ پر مائرہ بیٹھی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئی تھی۔ عمارہ کو دیکھنے کے لئے انہوں نے کمرے میں نظر دوڑائی تھی۔

''عمارہ......!'' ابھی لفظ ان کے ہونٹوں پر ہی تھے کہ مائرہ بیڈ سے اُترتے ہوئے تیز لہجے میں بولی تھی۔

''تم یہاں.....تمہاری جرأت کیسے ہوئی اس وقت میرے کمرے میں آنے کی؟''

''سوری......'' وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے تھے۔ ''میں.......وہ.......عمارہ......''

لیکن اس نے انہیں بات مکمل نہیں کرنے دی۔

''فلک شاہ! تم کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو، یہ کہ تم کبھی مجھے زیر کر لو گے، جھکا لو گے؟ لیکن محبت زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ پہلے جب تم میرے دل میں اپنی محبت پیدا نہیں کر سکے تو اب تو میں احسان شاہ کی بیوی ہوں۔ میں پہلے بھی اس سے محبت کرتی تھی، اب بھی کرتی ہوں۔ تمہیں شرم آنی چاہئے فلک شاہ! اب تو کم از کم......''

یہ کیا کہہ رہی تھی مائرہ؟ وہ ششدر سے ہو کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

''میں اس شخص کی بیوی ہوں جو تم پر جان چھڑکتا ہے۔ اور تم اس کی بیوی پر اب بھی بری نظر رکھتے ہو۔''

تب ہی واش روم کا دروازہ کھلا تھا اور احسان شاہ باہر نکلے تھے۔ مائرہ تیزی سے احسان شاہ کے قریب گئی۔

''یہ...... یہ فلک شاہ، تمہارا دوست، تمہارا بھائی...... یہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں تم سے......اور اب......میں نے سمجھا تھا، اب یہ تمہارا خیال کرے گا لیکن......''

وہ رک رک کر بول رہی تھی اور احسان شاہ ساکت کھڑا شعلے برساتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم جیسے ٹرانس سے باہر آئے تھے۔

''نہیں شانی!...... میں......خدا کے لئے مجھے ایسی نظروں سے مت دیکھو...... یہ لڑکی......'' وہ ٹھٹکے تھے۔ ''مائرہ بھابی جھوٹ بول رہی ہیں۔ تم جانتے ہو......''

''نہیں شانی! میں نے سچ کہا ہے۔'' اس نے اپنا ہاتھ احسان شاہ کے بازو پر رکھا تھا۔ ''بہت بار اس نے مجھ سے اظہار محبت کیا اور......''

''یہ جھوٹ ہے۔'' وہ چلاّئے تھے۔

''آہستہ بولو فلک شاہ!'' مائرہ کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور وہ ایسی نظروں سے فلک شاہ کو دیکھ رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو۔ تم سمجھ رہے تھے کہ میں بھول چکی ہوں اپنی توہین۔ اپنے ٹھکرائے جانے کی بے عزتی۔

''احسان شاہ!'' انہوں نے بے بسی سے احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ ''پلیز میری بات سنو۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ مائرہ بھابی نے کہا ہے اس میں ایک لفظ بھی سچ نہیں ہے۔ ہم آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ آج میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ شروع سے لے کر آخر تک۔ اس وقت میں جلدی میں ہوں۔ حق نواز مر رہا ہے۔ مجھے اس کی طرف جانا ہے۔ لیکن پلیز تم میرا یقین رکھو! فلک شاہ مر تو سکتا ہے لیکن......''

''مجھے کچھ نہیں سننا فلک شاہ!...... نہ اب، نہ پھر کبھی۔'' احسان شاہ کے لہجے میں اتنی ٹھنڈک تھی کہ وہ کانپ گئے۔

''بہتر ہے کہ آج کے بعد تم اس گھر میں قدم بھی نہ رکھو۔''

احسان شاہ نے رخ موڑ لیا تھا۔ مائرہ انہیں تمسخر بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ باہر لاؤنج میں کھڑی عنایت بی بی بلند آواز میں انہیں بلا رہی تھی۔

''موی صاحب! آپ کا فون ہے۔ کسی شیر دل کا۔'' اور وہ جو احسان کی طرف بڑھنے لگے تھے، وہیں رک گئے۔

صبح وہ احسان شاہ سے بات کر لیں گے۔ وہ احسان شاہ ہے۔ ان کا دوست، ان کا یار، ان کا دل...... وہ صبح اس سے بات کر لیں گے۔ ایک ایک بات بتائیں گے تو وہ ضرور ان کی بات سنے گا بھی اور سمجھے گا بھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے تھے اور تیزی سے لاؤنج میں رکھے فون کی طرف بڑھے تھے۔ انہوں نے سائیڈ پر پڑا ریسیور اٹھایا۔ اس نے ٹوں ٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ انہوں نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھا اور عنایت بی بی کی طرف دیکھا جو وہاں لاؤنج میں ایک طرف بیٹھی نہ جانے کیا کر رہی تھیں۔

''کچھ کہا تھا شیر دل نے؟''

''بس آپ کا پوچھا تھا کہ آپ ادھر تو نہیں ہیں۔ اور کہا تھا، وہ جا رہا ہے۔ جلدی پہنچو۔''

تب ہی ان کی نظر بابا جان پر پڑی تھی۔ غالباً جب عنایت بی بی نے بلند آواز میں انہیں بلایا تھا تو وہ آواز سن کر اپنے روم سے باہر نکلے تھے اور دروازے میں کھڑے تھے اور انہوں نے پہلے انہیں نہیں دیکھا تھا۔

''یہ تم آدھی آدھی رات تک کہاں آوارہ گردیاں کرتے رہتے ہو؟'' اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر عبدالرحمٰن شاہ کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ ''یہ گھر ہے، کوئی سرائے نہیں ہے۔ اور نہ ہی ''الریان'' کی روایت ہے آدھی رات کو گھر میں گھسنے کی۔''

وہ حیران ہوئے تھے۔ بابا جان کو انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار یوں غصے سے بولتے دیکھا تھا۔

''بابا جان!'' وہ معذرت کرنا چاہتے تھے اور انہیں بتانا چاہتے تھے کہ حق نواز کی وجہ سے انہیں دیر ہوئی لیکن عبدالرحمٰن شاہ نے ان کی بات سنے بغیر پھر کہا تھا۔

''ہزار دفعہ سمجھایا ہے، منع کیا ہے، سیاست سے باز آ جاؤ۔ یہ کچھ نہیں دے گی تمہیں۔ لیکن اب کل کو پولیس کھڑی ہو گی دروازے پر گرفتار کرنے۔ تمہارا دوست گرفتار ہوا ہے تو تمہاری باری بھی آئے گی۔ اگر تم نے یہی کچھ کرنا ہے تو بہتر ہے کہ ''الریان'' مت آؤ۔''

''بابا جان!'' ان کے پیچھے کھڑی عمارہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

''بابا جان صحیح کہہ رہے ہیں۔'' احسان شاہ بھی اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔ ''آج کے بعد الریان میں قدم مت رکھنا، فلک شاہ!''

انہوں نے مڑ کر احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ اگر انہیں حق نواز کی طرف جانے کی جلدی نہ ہوتی تو وہ سب کچھ واضح کر کے ہی احسان شاہ کے کمرے سے نکلتے۔ لیکن تقدیر میں ایسا ہونا نہیں لکھا تھا۔

لاؤنج میں رکھے فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ عنایت بی بی کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے گھنٹی بند ہو چکی تھی۔

'شاید شیر دل کا فون...... حق نواز......' ان کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔

''سن لیا ہے نا تم نے فلک شاہ! کہ آج کے بعد یہاں مت آنا۔ قدم بھی نہ رکھنا یہاں۔''

حق نواز مر رہا تھا اور یہاں یہ سب شروع ہو گیا تھا۔ وہ یکدم بھڑک گئے تھے۔

''ٹھیک ہے...... آج کے بعد اگر میں نے یا میری بیوی نے ''الریان'' میں قدم رکھا تو میری بیوی مجھ پر تین طلاق حرام ہے۔''

انہیں بابا جان کی بات پر غصہ نہیں آیا تھا۔ انہیں احسان شاہ کے شک نے مار دیا تھا۔

وہ تیر کی طرح بابا جان کے ساتھ کھڑی عمارہ کی طرف بڑھے تھے، جو ایبک کو کندھے سے لگائے کھڑی کانپ رہی

تھیں۔ اور پھر عمارہ کو پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے وہ لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھے تھے اور لکڑی کا بھاری دروازہ ایک ہاتھ سے کھولتے اور ایک ہاتھ سے عمارہ کا ہاتھ تھامتے وہ باہر نکل گئے تھے۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے عمارہ کی طرف نہیں دیکھا تھا جو فرنٹ سیٹ پر ایبک کو گود میں لئے بیٹھی مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ گاڑی مین روڈ پر ڈالتے ہوئے انہوں نے ایک نظر عمارہ کی طرف دیکھا تھا۔

''ہم ہسپتال جا رہے ہیں۔''

انہوں نے بس اتنا ہی کہا تھا اور ہونٹ بھینچے گاڑی چلانے لگے تھے۔ ان کے ماتھے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ انہیں کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کر آئے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ عمارہ رو رہی ہے لیکن ہسپتال تک انہوں نے پھر عمارہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ ہسپتال کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ اترے اور عمارہ کو وہیں بیٹھنے کی تاکید کر کے وہ تیزی سے ہسپتال کی عمارت کی طرف بڑھے تھے۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی شیر دل نظر آیا تھا۔

''شیر دل!'' وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے تھے۔

''تم نے اتنی دیر کر دی فلک!......وہ چلا گیا۔'' شیر دل ان کے گلے لگ گیا تھا۔

چلا گیا......ان کا انتظار کئے بغیر؟

''اس نے دوبارہ آنکھ کھولی تھی اور دونوں بار تمہیں بلانے کی استدعا کی تھی۔ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔'' شیر دل کہہ رہا تھا اور ان کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سارا راستہ وہ سوچتے آئے تھے کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ شاید حق نواز اور ان کے خدشے صحیح نکلے تھے۔

شیر دل انہیں وہیں چھوڑ کر ایمبولینس کا پتہ کرنے چلا گیا۔ وہ مرے مرے قدموں سے اندر کاریڈور میں آئے تھے۔ وہاں حق نواز کے والد تھے۔ ان کی بہن اور ماں تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی جیسے ایک کہرام سا اٹھا تھا۔ وہ حق نواز کے والد کے گلے لگ کر بہنوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر اندر حق نواز کو دیکھنے چلے گئے تھے۔ اس کے پاس اس کا کوئی دوست تھا۔ انہوں نے اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ آنکھیں موندے وہ بہت سکون سے سو رہا تھا۔

حق نواز......جس نے پاکستان بنتے نہیں دیکھا تھا لیکن جو کہتا تھا کہ ''یہ ملک اتنی آسانی سے نہیں بنا تھا اور یہ لوگ جو اس ملک کو لوٹ کر کھا رہے ہیں، یہ وہ لوگ نہیں جو الگ ملک چاہتے تھے۔ ورنہ یہ ہندو ذہنیت ترک کر دیتے۔ علیحدہ ملک چاہنے والے گزر گئے۔ اللہ انہیں اپنی رحمت میں چھپائے۔ یہ لوگ ان شہیدوں کو فراموش کر چکے ہیں جنہوں نے اپنا آج اس قوم کے کل کے لئے قربان کر دیا تھا۔ ان شہیدوں کے مقبروں پر خاک اُڑتی ہے۔ ان کے بچے بھوکے اور بے آسرا ہیں۔ ان کی بیوائیں اس معاشرے کا زہر جرعہ جرعہ پی رہی ہیں۔ اس قوم نے بے حیا اور بے غیرت طبقے کو پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ ایسا طبقہ جس کی عفت و عصمت کورے کاغذ پر لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ جہاں جو چاہے، دستخط کر دے۔ مجھے پاکستانی قوم سے گلہ نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اوروں کی طرح ان پر بھی کوئی دوسری قوم مسلط نہ کر دی جائے۔ ان کی اجتماعی قبریں دریافت نہ ہوتی پھریں۔''

ابھی چند دن پہلے کی ہی تو بات تھی، جب وہ کہہ رہا تھا۔

''فلک شاہ! میں سوچ رہا ہوں، کہیں اور چلا جاؤں۔ کسی اور ملک میں۔''

''کیوں.....اتنے مایوس ہو گئے ہو؟''

''پتہ نہیں۔''

''مت جاؤ اپنے پاکستان کو چھوڑ کر۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''یہ پاکستان میرا ہے۔ اس میں بسنے والے ان بچھوؤں اور سانپوں کا نہیں۔ میں اگر پاکستان میں نہ رہوں تو بھی میری ملکیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں پاکستان سے بہت محبت کرتا ہوں فلک شاہ! لیکن میں یہاں رہ کر یہ اذیتیں بھی

برداشت نہیں کر سکتا۔“
اور وہ چلا گیا تھا۔
وہ اُلٹے قدموں باہر نکل آئے تھے۔ ان میں اس کا چہرہ دیکھنے کی تاب نہ تھی۔
”بیٹا! بچیوں کو اور اس کی والدہ کو گھر لے جاؤ۔ ہم اسے لے کر کچھ دیر میں آتے ہیں۔“
وہ سب کو لے کر گاڑی تک آئے تھے تو عمارہ اب بھی رو رہی تھیں۔ انہوں نے خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔
”عمو! حق نواز چلا گیا۔“
عمارہ نے نظریں اٹھائیں۔ سرخ انگارہ آنکھیں، بھیگی پلکیں۔ وہ نظریں چرا کر پیچھے دیکھنے لگے تھے۔
حق نواز کی والدہ اور بہنوں کی آنکھیں اب بھی آنسو بہا رہی تھیں۔ انہوں نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے عمارہ کی طرف دیکھا۔
”ہم حق نواز کے گھر جا رہے ہیں۔“
عمارہ مڑ کر پیچھے دیکھنے لگیں اور حق نواز کی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہے تھے۔ ان کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے ”الریان“ میں کیا ہوا تھا؟ وہ بھول چکے تھے یا یاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ فجر کی اذانوں تک ان کی ذہنی کیفیت یہی رہی تھی۔ حق نواز کے گھر کے ڈرائنگ روم میں کارپٹ پر بیٹھے لوگوں کو آتے اور حق ناز کے والد سے افسوس کرتے دیکھتے رہے۔ شیردل کبھی کبھی اندر آ کر ماموں کو تسلی دیتا۔ ان کے گلے لگ کر روتا اور پھر چلا جاتا۔ وہ رشتہ داروں کو اطلاع دینے اور دوسرے انتظامات میں مصروف تھا۔ گھر کے اندرونی حصے سے کبھی کبھی آہ و بکا کی آواز آتی تو وہ چونکتے۔ انہیں اس وقت شیردل کے ساتھ ہونا چاہئے تھا لیکن وہ یوں بیٹھے تھے جیسے ان کے جسم سے کسی نے جان نکال دی ہو۔ آتے جاتے شیردل نے دو تین بار انہیں دیکھا تھا۔ پھر ایک بار وہ حق نواز کے والد سے کچھ پوچھ کر اس کے قریب آیا تھا۔
”فلک!“ اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے تھے۔ ”تم ٹھیک تو ہو نا؟“
”ہاں۔“
تب شیردل نے یکدم دونوں بازو پھیلا دیئے تھے اور وہ اس کے سینے سے لگے رو رہے تھے۔ رات سے اب تک وہ اس طرح کھل کر نہیں روئے تھے۔ بہت دیر تک وہ یونہی شیردل کے گلے سے لگے روتے رہے پھر شیردل نے ان کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے انہیں الگ کیا۔
”فلک شاہ! بھابی کچھ دیر کے لئے گھر جانا چاہتی ہیں۔ بچے کے کچھ کپڑے اور ضرورت کا کچھ دوسرا سامان لانا ہے۔“
وہ بنا کچھ کہے آنسو پونچھتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد عمارہ بھی ایبک کو اٹھائے آ گئی تھیں۔ وہ بے حد تھکی تھکی اور نڈھال لگ رہی تھیں۔ خاموشی سے انہوں نے ایبک کو ان کی گود سے لیا تھا۔ گھر تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ گھر کے باہر ہی گاڑی کھڑی کر کے وہ اُترے تھے اور ان کی نظریں بے اختیار ”الریان“ کی طرف اُٹھی تھیں۔
”الریان“ کے گیٹ کے دونوں اطراف لیمپ جل رہے تھے۔ پیتل کے یہ لیمپ انہیں بچپن سے ہی بہت پسند تھے۔ یکدم انہوں نے نظریں ہٹا کر عمارہ کی طرف دیکھا تھا، جو نگاہیں جھکائے کھڑی تھیں۔ ان کے دل میں جیسے کسی نے سوئی چبھوئی تھی لیکن پھر بھی وہ اندازہ نہیں کر پائے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔
”تم اگر گھر ٹھہرنا چاہو تو رک جاؤ۔ میں جنازے کے بعد چکر لگاتا ہوں۔“ انہوں نے عمارہ سے کہا تھا۔ عمارہ خوفزدہ سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھیں اور انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔
”مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔“

''الریان چھوڑ دیتا ہوں......'' وہ کہتے کہتے رک گئے تھے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ پھر چلتے ہیں۔''

وہ ایک بار پھر حق نواز کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ گاڑی باہر نکالتے ہوئے ان کی نظریں ''الریان'' کے گیٹ کی طرف اُٹھی تھیں۔ اس وقت بابا جان فجر کی نماز کے لئے مسجد جاتے تھے لیکن آج گیٹ بند تھا۔ شاید وہ چلے گئے تھے یا شاید ابھی نہیں گئے تھے۔ انہوں نے بے دھیانی سے سوچا تھا اور پھر حق نواز کے متعلق سوچنے لگے تھے، اس کے جنازے کے متعلق ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ کب اٹھایا جائے گا۔

کیونکہ اس کی جس بہن کی شادی ہوئی تھی، وہ دبئی میں تھی اور رات سے ہی وہ ایئرپورٹ پر بیٹھی تھی اور پتہ نہیں اسے کب فلائٹ ملی تھی۔ ملی بھی تھی یا نہیں۔

کچھ دیر بعد وہ پھر حق نواز کے گھر کے سامنے تھے۔ پچھلی گلی میں گاڑی پارک کر کے وہ عمارہ کے ساتھ اندر آئے تھے۔ عمارہ اندر چلی گئی تھیں اور وہ ایک بار پھر حق نواز کے والد کے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔ محلے کے چند لڑکے وہاں موجود لوگوں میں چائے تقسیم کرنے لگے تھے۔ ان کا سر درد سے پھٹ رہا تھا لیکن انہوں نے چائے نہیں لی۔ کچھ دیر بعد اور لوگ آنا شروع ہو گئے۔ جنازہ عصر کے بعد مونا کے آنے کے بعد رکھا گیا تھا۔ حق نواز کو اپنی اس بہن سے بڑی محبت تھی جو عمر میں اس سے صرف دو سال چھوٹی تھی اور اس کے متعلق بات کرتے ہوئے وہ اکثر جذباتی ہو جاتا تھا۔ آنے والوں میں کچھ اجنبی چہرے بھی تھے۔

انجانے سے لوگ اِدھر اُدھر متجسس نظروں سے تکتے ہوئے۔ ایک دو نے ان سے بھی بات کرنے کی کوشش کی تھی اور حق نواز کی موت کے متعلق پوچھا تھا کہ کیسے ہوئی۔ وہ خود نہیں جانتے تھے تو کیا کہتے۔ جنازے میں بھی کچھ اجنبی چہرے تھے۔ شیر دل نے بھی پوچھا تھا کہ کیا وہ انہیں جانتے ہیں؟ اور کیا وہ حق نواز کے دوست ہیں؟ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''حق نواز! مجھے اس خارزار میں اکیلا چھوڑ کر کیوں چل دیئے دوست؟''

قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے انہوں نے سرگوشی کی تھی اور پھر انہیں اپنے اوپر کئی چبھتی نظروں کا احساس ہوا تھا اور وہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اور یہ نظریں پورے جنازے میں انہیں اپنے اوپر اُٹھتی محسوس ہوتی رہی تھیں۔ اور پھر حق نواز کے گھر سے فارغ ہوتے گیارہ بج گئے تھے۔ اور جب وہ گھر آ کر اپنے بیڈ پر لیٹے اور عمارہ، ایبک کو چینج کروا کے بیڈ روم میں آئیں تو بارہ بج رہے تھے۔ ایبک کو اس کی کاٹ میں لٹا کر عمارہ کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ دونوں ہاتھ گود میں دھرے وہ ساکت بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''عمو! بہت تھک گئی ہو گی۔ سو جاؤ۔'' انہوں نے بوجھل پلکیں اٹھا کر عمارہ کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر یونہی انہیں دیکھتے رہے تھے اور وہ جو کل رات سے حق نواز کے دُکھ میں سب کچھ بھولے ہوئے تھے، یک دم سب کچھ پوری جزئیات کے ساتھ انہیں یاد آ گیا تھا۔

احسان شاہ نے کیا کیا کہا تھا۔ ایک ایک لفظ دل کو کاٹنے لگا تھا۔

''عمو! یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا؟ بابا جان اور شانی نے ایسا کیوں کیا ہمارے ساتھ؟''

بہت سارے آنسوؤں نے ان کے حلق میں اکٹھے ہو کر ان کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

''انہوں نے تو جو کچھ کہا، کہا۔ لیکن آپ نے جو کچھ کہا، وہ...... آپ نے ایسا کیوں کہا؟ کیوں آپ نے اپنے لئے اور میرے لئے ''الریان'' کو شجرِ ممنوعہ بنا دیا۔''

عمارہ کے آنسو ان کے رخساروں پر پھیل رہے تھے اور انہیں پہلی بار اپنے الفاظ کی سنگینی کا ادراک ہوا تھا۔

''نہیں......''

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمارہ کو دیکھنے لگے تھے۔ وہ اتنے غصے میں کیوں آ گئے تھے۔
انہوں نے بلا سوچے سمجھے یہ کیا منہ سے نکال دیا تھا؟ بڑا دکھ تھا۔ غم بھی شدید تھا۔ جان سے زیادہ عزیز دوست نے ان پر شک کیا تھا۔ انہیں الریان میں آئندہ قدم نہ رکھنے کو کہا تھا۔ لیکن انہوں نے ایسے الفاظ...... بچپن میں ان کا خانساماں اکثر بیوی سے لڑتے جھگڑتے ہوئے ایسے الفاظ بولتا تھا۔ تم وہاں گئیں تو تم مجھ پر تین طلاق سے حرام...... تم نے کیا تو......
دادا جان انہیں ایسا کہنے پر کتنا ڈانٹتے اور سمجھاتے تھے اور شاید بچپن میں سنے جانے والے یہ الفاظ ان کے دماغ کے کسی کونے کھدرے میں چھپے ہوئے تھے جو غصے کی حالت میں منہ سے پھسل گئے تھے۔ اس لئے تو کہا جاتا ہے کہ بچوں کے سامنے گالی نہ دی جائے۔ نہ کوئی غلط بات کہی جائے۔''
''اب......اب کیا ہوگا عمو؟'' وہ عمارہ کا ہاتھ پکڑے بے بسی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ عمارہ کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔
''کیا اب ہم کبھی ''الریان'' میں قدم نہیں رکھ سکیں گے؟''
یہ احساس اتنا تکلیف دہ تھا کہ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگے۔ پتہ نہیں کتنی دیر وہ دونوں روئے تھے۔ روتے ہوئے، ایک دوسرے کو تسلی دی، پھر رونے لگے تھے۔ رات کے دو بجے وہ اٹھے تھے اور عمارہ سے کہا تھا۔
''ایبک کا سامان رکھ لو بیگ میں۔''
عمارہ خاموشی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں، بنا کچھ پوچھے۔ دادی جان نہیں تھیں۔ دادا جان بھی نہیں تھے۔ وہ کس سے اپنا دکھ کہتے؟ کون انہیں اس دکھ سے نکلنے کی راہ دکھاتا؟...... انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تب وہ عمارہ کو لے کر رات کے دو بجے شیر دل کے گھر پہنچ گئے تھے۔ شیر دل بھی رات دیر سے ہی گھر آیا تھا اور ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی ادھر اُدھر کی ہی باتیں کر رہے تھے جب بیل ہوئی تھی۔ رات کے دو بجے عمارہ اور فلک شاہ کو دیکھ کر وہ حیران تو ہوا تھا لیکن اس نے کچھ پوچھا نہیں تھا۔ عمارہ اور فلک کی آنکھیں اور چہرہ شدتِ گریہ سے سوجا ہوا تھا۔ ایک نظر ان پر ڈال کر وہ انہیں گیسٹ روم میں لے آیا تھا۔ اگر رات کے اس پہر وہ آئے تھے تو ضرور کوئی اہم بات ہوگی۔ یہ بات شیر دل سمجھ سکتا تھا لیکن اس نے کچھ پوچھا نہیں تھا۔
''تم اور بھابی آرام کرو۔ میں گرم دودھ اور سکون کی گولی بھجواتا ہوں۔ صبح بات کریں گے۔''
''نہیں شیر دل!'' انہوں نے شیر دل کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ پلیز۔'' وہ سسکے تھے۔ ''یہاں رہو میرے پاس۔ ورنہ یہ دیواریں مجھے پیس ڈالیں گی۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔''
''کیا ہو گیا ہے فلک شاہ؟'' شیر دل نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لئے تھے۔ ''میں نے تو اس لئے کہا تھا کہ تم ڈسٹرب لگ رہے ہو۔ ایک پُرسکون نیند لے کر اُٹھو گے تو آرام سے بات کریں گے لیکن خیر......''
انہوں نے اپنی بیگم سے کہا کہ وہ عمارہ اور ایبک کو اندر لے جائیں اور گرم دودھ کے ساتھ انہیں سکون کی کوئی ٹیبلٹ دے دیں۔
عمارہ اندر چلی گئیں تو ایک بار پھر شیر دل نے ان سے کہا تھا۔
''فلک! تم آرام کرتے۔ صبح تک کچھ سنبھل جاتے تو ہم بات کر لیتے۔''
''صبح۔'' انہوں نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر شیر دل کو دیکھا۔ ''میری زندگی میں اب کیا کوئی صبح ہوگی؟ میں نے سب کچھ برباد کر دیا۔ میرے غصے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ دادا جان کہتے تھے، غصہ نہ کیا کرو موی! یہ غصہ تجھے کہیں نقصان نہ پہنچائے۔ اور ابھی دادا جان کو اس دنیا سے گئے چند ماہ بھی نہیں ہوئے اور میں نے اپنا کتنا بڑا نقصان کر لیا۔''
شیر دل خاموشی سے ان کی بات سن رہا تھا۔

''میں بچپن میں ایسا نہیں تھا شیر دل!......لیکن جب مما مجھے اپنے ساتھ زبردستی لے گئیں تو میرے اندر بہت سارا غصہ جمع ہو گیا۔ میں کچھ کر نہیں سکتا تھا، اس لئے فیروز کی طرح، اس کی دیکھا دیکھی چیزیں توڑ توڑ کر اور چیخ چیخ کر بول کے غصہ نکالنے لگا۔ پھر جب میں واپس دادا جان کے پاس آیا تو تب بھی چھوٹی سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ تب بابا جان مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے۔ بہاول پور میں نیوروسرجن تھے، ڈاکٹر فرام۔ انہوں نے مجھے میڈیسن بھی دی تھیں۔''

شیر دل نے انہیں ٹوکا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کسی بڑے دکھ سے گزر رہے ہیں۔

''مائرہ نے اپنی محبت کے ٹھکرانے کا بدلہ لے لیا شیر دل! اس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ الریان کو......اور احسان شاہ کو۔''

شیر دل نے بہت تحمل سے ان کی ساری باتیں سنی تھیں۔

''میں بہت خود غرض ہوں نا شیر دل! تم آج رات اپنے ماموں زاد بھائی کو دفنا کر آئے ہو اور میں اپنا دکھ لے کر تمہارے پاس آ گیا۔ لیکن میں بھی کہاں جاتا؟ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے شیر دل!......میرے تو دادا جان کے بعد سارے رشتے الریان سے ہی تھے۔''

''اِٹس او کے یار!' شیر دل نے ان کا ہاتھ تھپتھپا کر انہیں تسلی دی تھی۔ ''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، اِن شاء اللہ۔ صبح دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں، ہمیں کیا کرنا ہے۔''

''تم گواہی دو گے نا شیر دل! احسان کے سامنے؟ میں نے تمہیں سب کچھ بتایا تھا نا مائرہ کے متعلق۔ وہ مجھ سے بہت بدگمان ہو گیا ہے۔''

اور شیر دل نے بمشکل انہیں نیند کی گولی دی تھی اور پھر اگلے تین دن تک وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے تھے۔ وہیں گیسٹ روم میں انہوں نے جیسے خود کو مقید کر لیا تھا۔ عمارہ کیسی تھی، ایبک کا کیا حال تھا، انہوں نے پوچھا تک نہیں تھا۔ وہ عمارہ سے نظریں نہیں ملا سکتے تھے۔ انہوں نے عمارہ سے ''الریان'' چھین لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ حق نواز کے قُل میں بھی نہیں گئے تھے۔ شیر دل نے واپس آ کر بتایا تھا، کئی راوین ساتھی جنہیں حق نواز کے متعلق اب پتہ چلا تھا، قُل والے دن مسجد میں آئے تھے۔ ان میں کچھ نامانوس اور اجنبی چہرے بھی تھے۔ لیکن یہ وہ لوگ نہیں تھے جو جنازے میں شامل ہوئے تھے۔ ایک نے تمہارے متعلق پوچھا بھی تھا۔ اچھا ہی ہوا، تم نہیں گئے۔''

شیر دل کچھ اُلجھا ہوا تھا۔ تب پہلی بار انہوں نے حق نواز کے متعلق پوچھا تھا۔ کہاں تھا وہ، کیسے ملا، کس نے اسے اس حال تک پہنچایا۔

''معلوم نہیں۔'' شیر دل کو علم نہ تھا۔ ''کچھ لوگ اسے ہسپتال میں چھوڑ گئے تھے۔ وہاں ایک وارڈ بوائے اسے پہچانتا تھا۔ اسی کے محلے کا تھا۔ اس نے ماموں کو فون کر کے بتایا تھا۔''

''اور حق نواز نے کچھ نہیں بتایا؟'' انہوں نے پوچھا تھا۔

''نہیں۔ اس نے صرف تمہارا پوچھا تھا اور تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مجھے لگتا ہے، وہ تمہیں کوئی خاص بات بتانا چاہتا تھا۔ یا کسی سے خبردار کرنا چاہتا تھا۔''

''اور آج تک یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ کن لوگوں نے اُسے اس حال تک پہنچایا تھا۔ بس کچھ شکوک تھے، وہم تھے جن کا اظہار کرنے سے سب ہی ڈرتے تھے۔

کاش! اس رات وہ سب نہ ہوتا اور وہ حق نواز سے مل سکتے۔ پھر وہ اس کے قاتلوں کو کبھی معاف نہ کرتے۔

''وقت بدل چکا ہے فلک! سرِعام کوئی تبصرہ مت کرنا۔ بہتر ہے کہ احتیاط کرو۔''

انہوں نے سر ہلا دیا تھا۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

''اپنے آپ کو سنبھالو فلک شاہ! تم نے تین دن سے بھابی کی بھی خبر نہیں لی۔''

''کیسے اس کا سامنا کروں شیر دل! کوئی حل، کوئی ترکیب بتاؤ تو میں جا کر بابا جان کے پاؤں پکڑ کر ان سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ انہیں سب بتا دوں گا۔ شانی میری بات کا یقین نہ کرے لیکن وہ میری بات کا یقین کر لیں گے۔ مروہ بھی میری گواہی دیں گی۔ وہ تو سب جانتی ہیں۔ میں کیوں انہیں بھول گیا تھا؟ میں ابھی فون کرتا ہوں انہیں۔''

''وہ مسئلہ تو حل ہو ہی جائے گا فلک شاہ! لیکن جو غضب تم ڈھا چکے ہو، اس کا کیا ہوگا؟...... میرے علم کے مطابق تم اور عمارہ بھابی اب کبھی ''الریان'' میں نہیں جا سکتے ورنہ......''

اور وہ جیسے یک دم ڈھے گئے تھے اور شیر دل کا ہاتھ تھامے وہ کسی ننھے بچے کی طرح رو رہے تھے۔ تب شیر دل انہیں ساتھ لے کر کئی علماء کے پاس گیا۔ ان دنوں شاہی مسجد میں مفتی اعظم مولانا قاسم ہاشمی آئے ہوئے تھے۔ وہ شیر دل کے ساتھ ان سے بھی ملے تھے اور ساری صورت حال بتائی تھی۔ ہاشمی صاحب نے بہت توجہ سے ان کی بات سنی تھی اور کہا تھا۔

''جو کچھ آپ نے کہا ہے، اس صورت میں اگر آپ دونوں ''الریان'' میں قدم رکھیں گے تو ہمارے حنفی فقہ کی رو سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ شرعی اصطلاح میں اس مشروط طلاق کو طلاق مغلظہ کہا جاتا ہے جو کہ واقع ہو جاتی ہے۔ نہ رجوع کر سکتے ہیں، نہ نکاح دوبارہ ہو سکتا ہے۔''

''مفتی صاحب پلیز! کسی فقہ میں کوئی گنجائش، کوئی رعایت۔'' وہ گڑگڑائے تھے۔

''آپ معلوم کر سکتے ہیں۔ حیرت ہے، آپ نے اتنے ایجوکیٹڈ اور سمجھ دار ہو کر اس طرح بات کی ہے۔''

''بس غصے میں پتہ ہی نہیں چلا۔''

''اس لئے تو غصے کو حرام کیا گیا ہے۔ یہ جو مسئلہ آپ لے کر آئے ہیں، ہمارے نچلے طبقے اور بعض اوقات نچلے متوسط طبقے میں اس طرح کی باتیں عام معمولی سمجھی جاتی ہیں۔ لوگ نتائج کی پروا نہیں کرتے۔ اکثر مرد بیویوں سے کہہ دیتے ہیں تم بہن کے گھر گئیں تو طلاق۔ تم نے فلاں سے بات کی تو طلاق۔ کئی گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا تو اس طرح کی باتیں سننے میں آئیں کہ میرے بھائی نے طلاقیں ڈالی ہوئی ہیں، بھابی میکے نہیں جا سکتی۔ اور پھر صلح ہو جاتی ہے، گھروں میں آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس نے تو طلاقیں ڈالی ہوئی تھیں۔ یہ سب کم علمی، جہالت اور مذہب سے نا آشنائی ہے۔ بلکہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ میں نے کچھ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی بات بات پر ''رن طلاق'' کہتے سنا ہے۔''

مفتی اعظم افسردگی سے کہہ رہے تھے اور وہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ شرمندہ اور دل گرفتہ۔

وہ بھاری دل کے ساتھ شیر دل کے گھر آئے تو تین دن کے بعد عماہ کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے۔

''عمو! مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت ظلم کیا تم پر، خود پر۔ لیکن اگر تم چاہو تو ''الریان'' چلی جاؤ۔ ایبک کو بھی لے جانا۔ میں سمجھوں گا، یہ میری غلطی کی سزا ہے۔ میں تمہارے اور ایبک کے بغیر جینے کی کوشش کروں گا۔ جی سکا تو۔''

وہ دونوں ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے اور ان کے آنسو ان کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ عمارہ وحشت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''یہ...... یہ کیسی باتیں آپ کر رہے ہیں؟''

''اور کیسی باتیں کروں عمو؟...... میری وجہ سے ''الریان'' تم سے چھوٹ جائے، یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔''

''کوئی کفارہ نہ ہوگا؟''

''نہیں۔ کوئی کفارہ نہیں...... کوئی رجوع نہیں۔''

''تو......؟''

عمارہ نے ان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔

''غلطی ہوئی ہے آپ سے مانا۔ ''الریان'' کے دروازے ہم پر بند ہوئے ہیں۔ ''الریان'' کیا ہے موی! اینٹوں اور پتھروں کی ایک چاردیواری ہی ہے نا۔ ہمارے گھر کے دروازے تو کھلے ہیں۔ بابا جان، اماں جان سب ہمارے گھر تو آ سکتے ہیں نا۔ آپ نے ایسا تو کچھ نہیں کہا تھا نا کہ......''

''عمو! وہ آئیں گے ہمارے گھر؟'' انہوں نے بچوں کی طرح پوچھا تھا۔

''کیوں نہیں آئیں گے۔ میں فون کروں گی بابا جان کو۔ وہ جانتے ہیں، آپ کے غصے کو بھی اور......''

''وہ مجھ سے بہت ناراض تھے عمو!...... پتہ نہیں کیوں۔''

''ہاں، پتہ نہیں مائرہ بھابی نے ایسا کیا کہا تھا کہ وہ پریشان ہو گئے تھے آپ کے لئے۔ وہ سمجھے تھے کہ آپ کوئی جلوس وغیرہ نکال رہے ہیں۔ کہیں گرفتار نہ ہو گئے ہوں۔ اور مائرہ بھابی نے خوامخواہ انہیں غصہ دلایا تھا۔ وہ پریشانی میں ناراضی کا اظہار کر گئے تھے لیکن احسان بھائی...... مجھے ان کی سمجھ نہیں آئی، وہ اس طرح آپ سے کیوں ناراض ہو رہے تھے۔ وہ کیوں کہہ رہے تھے آپ کو کہ آپ ''الریان'' سے نکل جائیں۔''

''عمو!'' اُن کا سر جھک گیا تھا۔ وہ عمارہ کو نہیں بتا سکتے تھے کہ احسان شاہ ان پر شک کر رہا تھا۔ وہ یہ بتا کر پھر عمارہ سے نظریں نہیں ملا سکتے تھے۔

عمارہ نے خود ہی اندازہ لگایا تھا۔

''ضرور مائرہ بھابی نے بھڑکایا ہوگا انہیں۔ پتہ نہیں انہیں مجھ سے اور آپ سے اتنی چڑ کیوں ہے؟''

''چڑ نہیں عمو! نفرت۔'' ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

''ہاں شاید۔'' عمارہ نے کہا تھا اور اس روز اتنے دنوں بعد وہ ذرا سا پُرسکون ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک ''الریان'' محض اینٹوں کی چاردیواری نہیں تھا۔ عمارہ کے نزدیک بھی نہیں تھا لیکن اگر ''الریان'' کے باسی ان سے نہ بچھڑتے تو وہ ''الریان'' کی جدائی برداشت کر لیتے۔ لیکن ''الریان'' کے باسیوں نے ان سے ناتہ توڑ لیا تھا...... یہ دکھ انہیں اور عمارہ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ عمارہ نے شیردل کے گھر سے دو تین بار فون کیا تھا لیکن بابا جان، اماں جان کسی سے ان کی بات نہیں ہو سکی تھی۔

انہوں نے خود بھی ایک فون کیا تھا احسان کے آفس میں۔ احسان نے ان کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ وہ اس کے آفس گئے تھے۔ اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ کاش مصطفیٰ بھائی یہاں ہوتے یا مروہ پھپھو ہی ہوتیں۔ وہ ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ سعودیہ میں تھیں۔ تب بے حد دل گرفتہ سا ہو کر انہوں نے بہاول پور جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ شیردل کی پوسٹنگ راولپنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے دس پندرہ دن تک چلے جانا تھا۔ یوں بھی وہ اس کے گھر نہیں رہ سکتے تھے۔ اپنے گھر جانا ہی تھا اور اپنے گھر جانا اور وہاں رہنا بہت تکلیف دہ تھا۔

''عمو! اس شہر میں رہ کر ''الریان'' سے دور رہنے کا عذاب جھیلنا بہت مشکل ہے۔ وہاں اس گھر میں آتے جاتے ''الریان'' پر نظر پڑے گی تو دل پھٹے گا۔ کیسے الریان کو اپنے لئے اجنبی ہوتا دیکھو گی عمارہ؟...... چلو بہاول پور واپس چلتے ہیں۔''

اور یوں ایک رات وہ شیردل کے ساتھ جا کر سارا سامان لے آئے اور ملک صاحب کے گھر کی چابی دی اور آخری بار الریان کے گیٹ پر نظر ڈال کر بہاول پور آ گئے تھے۔

❁○❁

''بابا! آپ ابھی تک یہیں ہیں؟'' انجی کی آواز پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ ''آپ نے چائے بھی نہیں پی۔ ٹھنڈی یخ ہو گئی ہے۔''

''ہاں۔ کچھ سوچنے لگا تھا۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی تھی۔

''ضرور بابا جان کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔'' انجی نے اندازہ لگایا تو ان کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''جواد کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہے تھے، آپ چلیں گے ایئرپورٹ؟ وہ لے چلیں گے آپ کو اگر آپ کا دل چاہتا ہے تو۔''

''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ وہ وہاں ایئرپورٹ پر بابا جان کو دیکھ کر کیسے خود پر قابو پا سکیں گے؟ کیسے ضبط رکھیں گے۔

''انجی بیٹا! میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔'' وہ بے حد تھکن محسوس کر رہے تھے۔ ماضی کی گلیوں میں چکراتے بہت سی تکلیف دہ یادوں نے انہیں نڈھال سا کر دیا تھا۔

''جی بابا!'' انجی نے ان کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''آپ کے لئے اور چائے بنواؤں بابا؟''

انہیں اپنے کمرے میں لے جاتے ہوئے انجم نے پوچھا تھا لیکن انہوں نے منع کر دیا اور اپنے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موندتے ہوئے وہ ایک بار پھر ماضی میں کھو گئے تھے۔

حسن رضا نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔
''یا اللہ! وہ جہاں بھی ہے، جس جگہ بھی ہے، اسے خیریت سے رکھ۔ اور اگر وہ مرتد ہو گیا ہے تو اسے توبہ کی توفیق عطا کر اور اس کا دل پھیر دے مولا!''
ایک آنسو ان کے پھیلے ہاتھوں پر گرا۔
''یا اللہ! تجھے تو اپنے بندے کے آنسوؤں سے پیار ہے۔ میرے آنسوؤں کی لاج رکھ لے۔ اسے مرتد ہونے سے بچا لے۔ اسے ان آنسوؤں سے آشنا کر جو تیرے ڈر اور خوف سے بہتے ہیں۔''
اب آنسو تواتر سے ان کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔
''یا اللہ! تُو تو میرے شب و روز کا گواہ ہے۔ تُو جانتا ہے، میں ایک دنیا دار آدمی ہوں۔ لیکن پھر بھی میرا دل تو ہر مسلمان کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت سے بھرا ہے۔ سمیرا کہتی ہے، مجھے اسے صفائی کا موقع دینا چاہیے تھا، اسے سمجھانا چاہئے تھا۔ وہ نہ سمجھتا پھر جو چاہے کرتا۔
زبیدہ زبان سے کچھ نہیں کہتی لیکن اس کی آنکھیں ہی سب کہتی ہیں۔ بلکہ اس کی آنکھیں تو گلہ بھی کرتی ہیں۔ ناراضی بھی دکھاتی ہیں۔ لیکن میں کیا کرتا؟ مجھے لگا تھا، جیسے وہ مسیلمہ کذاب کا ساتھی ہے اور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فوج کا ایک ادنیٰ سپاہی، جو مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لئے نکلی تھی اور اس ادنیٰ سپاہی کے سامنے صرف مسیلمہ کذاب نہیں تھا، اس کے ساتھی بھی تھے۔ اور وہ بھی سرخروئی کا تاج سر پر پہن کر عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اے اللہ! میں ایک کمزور انسان ہوں۔ اولاد کی محبت سے مجبور باپ۔ تُو نے خود ہی تو سورۃ انفال میں فرمایا ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد سب فتنہ ہیں۔ یا اللہ! مجھے اس طرح نہ آزما۔ اسے سیدھا راستہ دکھا۔ توبہ کا راستہ۔ میں کسی آزمائش کے قابل نہیں ہوں میرے اللہ!''
وہ کچھ دیر یونہی گڑگڑا کر دعا مانگتے رہے۔ پھر چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا چہرہ ابھی تک گیلا تھا۔ انہوں نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ صاف کیا۔ جاء نماز تہہ کر کے تخت پوش پر رکھی اور وہاں تخت پوش والی دیوار پر بنے طاق سے قرآن مجید نکال کر وہیں بیٹھ کر پڑھنے لگے۔ وہ اس وقت چند سورتیں اور ایک دو رکوع ہی پڑھا کرتے تھے کیونکہ انہیں دفتر جانا ہوتا تھا۔ روزانہ کی طرح پڑھ کر انہوں نے قرآن مجید بند کیا، تب ہی سمیرا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ان کے قریب آئی۔
''السلام علیکم ابو!''
''وعلیکم السلام بیٹا! جیتی رہو۔''
''آپ کے لئے چائے بنا دوں؟'' اس نے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور قرآن مجید کو جزدان میں لپیٹنے لگے۔
سمیرا کچن کی طرف بڑھی۔ وہ صبح فجر کے بعد چائے پینے کے عادی تھے، لیکن جب سے احمد رضا گیا تھا، وہ اکثر

چائے نہیں پیتے تھے۔ سارے معمولات متاثر ہو گئے تھے۔ صرف ان کے ہی نہیں، اس گھر کے تینوں افراد کے۔
گیٹ پر سے اخبار والے لڑکے نے اخبار اندر پھینکا تو انہوں نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ سمیرا کچن میں جاتے جاتے صحن کی طرف مڑ گئی اور اخبار اٹھا کر انہیں دیا۔ انہوں نے اخبار کھولا۔ پہلے صفحے پر بالکل وسط میں خبر چھپی تھی۔
''اسمٰعیل کذاب کے ساتھیوں کی پریس کانفرنس۔''
انہوں نے یک دم آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے وہ یہ خبر نہ پڑھنا چاہتے ہوں۔ پھر ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور خبر پر نظر دوڑائی۔
''اسمٰعیل کے دو ساتھیوں نے پریس کانفرنس کی۔ وہ دونوں خود کو اس کا خلیفہ کہتے ہیں۔ جن میں سے ایک طیب خان ہے جس کا تعلق افغانستان سے ہے۔ جبکہ ارباب حیدر پاکستانی ہے۔ کانفرنس میں ان کا ایک اور ساتھی احمد رضا بھی تھا۔''
انہوں نے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جمالئے۔
''پتہ چلا ہے کہ وہ اسمٰعیل خان کا خاص بندہ ہے اور صحافیوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ (نعوذ باللہ) اسمٰعیل، اللہ کا پیامبر اور نبی ہے۔''
انہوں نے اخبار کو اپنی مٹھیوں میں بھینچ لیا اور دانت پر دانت جمائے اسے رسّی کی طرح بل دے رہے تھے۔ پھر یک دم انہوں نے چونکتے ہوئے اخبار یوں پرے پھینکا جیسے وہ کوئی زہریلا سانپ ہو۔
لمحہ بھر وہ تخت کے کنارے پر پڑے مڑے تڑے اخبار کو دیکھتے رہے۔ پھر تیزی سے اُٹھ کر کچن کی طرف آئے۔ سمیرا دروازے کی طرف پیٹھ کئے کیتلی میں اُبلتے پانی کو دیکھتے ہوئے پتہ نہیں کیا سوچ رہی تھی۔
وہ چائے بناتے ہوئے، ناشتہ تیار کرتے ہوئے وقفے وقفے سے کچن کے دروازے سے سر باہر نکال کر آوازیں دیتی رہتی تھی۔
''احمد!......رضی!......جلدی کرو۔ دیر ہو جائے گی۔''
اور کبھی کبھی وہ سیڑھیاں اُتر کر لمحہ بھر سیڑھیوں کے قریب بنے بیسن کے پاس کھڑے ہو کر ایک نظر آئینے میں اپنا جائزہ لیتا۔ یوں ہی بلاوجہ سنورے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتا ہوا کچن کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو جاتا۔ ایک ہاتھ چوکھٹ پر رکھے وہ سمیرا کے ساتھ باتیں کرنے لگتا۔ پھر دونوں میں نوک جھوک، ہنسی مذاق چلتا رہتا۔
سمیرا کو شاید اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا کہ اس نے مڑ کر دیکھا۔
''ابو! آپ......''
وہ دروازے پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر پتھروں کی سی سختی تھی اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔ وہ جیسے کہیں خلا میں دیکھ رہے تھے۔
''ابو! کیا ہوا؟'' سمیرا نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں نا؟''
''ہاں!'' وہ جیسے گہری نیند سے چونکے تھے۔ ''اخبار والے کو کہلوا دینا، آئندہ اخبار نہ لائے۔ بل کلیئر کر دینا۔''
''جی!'' سمیرا حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی بات کر کے تیزی سے مڑے اور کمرے میں چلے گئے تھے۔
زبیدہ کمرے میں نہیں تھیں۔ جب سے احمد رضا گیا تھا، وہ اکثر دل گھبراتا تو اُٹھ کر سمیرا کے کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ آج بھی وہ کسی ٹائم اُٹھ کر سمیرا کے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئے۔
'یا اللہ! میں اس آزمائش کے قابل نہیں تھا۔ یا اللہ! مجھے حوصلہ دے۔ ہمت دے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ نہ تو جسمانی قوت ہے نہ ایمانی کہ میں اس ملعون شخص کا خاتمہ کر سکوں اس نے جھوٹا دعویٰ کیا۔ اور مجھ میں یہ طاقت بھی نہیں ہے کہ میں اسے بھلا سکوں۔ وہ...... جو میرے گھر کا چراغ تھا۔' انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

'وہ یہاں، میرے سینے پر سر رکھ کر سوتا تھا۔ اس کے ننھے سے سر کا بوجھ آج بھی مجھے اپنے سینے پر محسوس ہو رہا ہے۔'
'یہاں وہ مجھے پیار دیتا تھا۔' انہوں نے ایک انگلی سے اپنا رخسار چھوا۔ 'اس کے ہونٹوں کی نمی ابھی تک میرے رخسار پر موجود ہے۔'
'وہ یوں اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میری عینک اتار کر اپنی آنکھوں پر لگاتا تھا...... اور پھر قل قل کر کے ہنستا تھا۔ اُس کی ہنسی ابھی بھی اس کمرے میں گونج رہی ہے۔ میرے اللہ! میری مدد فرما کہ میں اسے بھول سکوں۔ اسے یاد نہ کروں۔ میں اسے اس طرح بھولنا چاہتا ہوں کہ کبھی آج کے بعد میرے لبوں پر اس کا نام نہ آئے۔ آج کے بعد میں کبھی اسے دیکھنے کی خواہش نہ کروں اور وہ مجھے کبھی نظر نہ آئے۔'
سمیرا اُن کے پیچھے دروازے تک آئی تھی اور پھر ذرا سا جھانک کر اُنہیں خاموش بیٹھے دیکھ کر واپس برآمدے میں آئی تھی اور تخت پر پڑے مڑے تڑے اخبار کو ہاتھوں سے سیدھا کرتے ہوئے تخت پوش پر پھیلایا تھا۔
دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اخبار پر نظر ڈالی۔
اُس کی نظریں پریس کانفرنس کی تفصیل پر تھیں۔
'احمد رضا! تم نے ایسا کیوں کیا؟...... تم تو بہت سمجھ دار تھے۔ بہت عقل مند تھے۔ پھر کیسے یقین کر لیا؟' اُس نے اخبار کو اٹھا لیا تھا اور اب اسی طرح بل دے رہی تھی۔ پھر اخبار کو وہیں پھینک کر آنسو روکتی ہوئی وہ ابو کے کمرے کی طرف بڑھی اور ذرا سے کھلے دروازے سے اس نے دیکھا، حسن رضا اسی طرح بیڈ پر بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ان کے لبوں سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ پلٹ کر کچن میں آ گئی۔
'اچھی طرح رو لیں۔ شاید رونے سے دل کا بوجھ کم ہو جائے۔ رونا تو ہے۔ جب تھک جائیں گے تو چپ کر جائیں گے۔ اور جب...... رضی! یہ تم نے کیا کر دیا؟'
وہ کچن میں آ کر بیٹھ گئی۔ چائے کا پانی اُبل اُبل کر سوکھ گیا تھا۔ سفید ہوتا پانی اس نے سنک میں پھینک کر نیا پانی رکھا۔ اور جب اس نے چائے دم دی تو اس نے دیکھا، حسن رضا اپنے کمرے سے نکل کر تخت کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے چائے کپ میں ڈالی اور کچن سے باہر قدم رکھا۔ حسن رضا ہولے ہولے اخبار کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ مڑا تڑا اخبار جو تخت کے کونے پر بل دی ہوئی رسّی کی طرح پڑا تھا، اُٹھا کر تخت پر پڑے گول تکیے کے نیچے چھپا دیا۔ سمیرا نگاہیں جھکائے تخت پر بیٹھے حسن رضا کے قریب آئی اور چھوٹی سی ٹرے تخت پر رکھی۔
''ابو! چائے۔'' اس نے ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اسے لگا تھا، وہ اگر ان کی طرف دیکھے گی تو اس کا ضبط جواب دے جائے گا۔ وہ ان کے اس شکست خوردہ اور مایوس اور بے بس چہرے کو نہیں دیکھ سکے گی۔ سو وہ ان کی طرف دیکھے بغیر ٹرے رکھ کر واپس مڑ گئی تھی۔
بہت دیر وہ یونہی کچن میں بیٹھی رہی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ زبیدہ کب سے جاگ رہی تھیں۔ اس نے انہیں چائے نہیں دی اور نہ ہی ناشتہ بنایا ہے۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن رو نہیں پا رہی تھی۔ اس نے فریج سے ڈبل روٹی اور انڈے نکالے۔ تب ہی حسن رضا نے اسے آواز دی۔
''سمیرا بیٹا! دروازہ بند کر لو۔''
''ابو!'' وہ تیزی سے کچن سے باہر نکلی۔ ''میں ابھی ناشتہ لا رہی ہوں۔''
''میرا جی نہیں چاہ رہا۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے قدم صحن میں رکھ دیئے تھے۔
''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی گیٹ تک آئی تھی۔
''دفتر جا رہا ہوں۔''
''لیکن ابھی تو صرف سات بجے ہیں۔''

''ہاں۔آج کچھ جلدی جانا ہے۔''
اس نے ان کے کوٹ کی جیب سے جھانکتے اخبار کو دیکھا۔ وہ باہر نکل گئے۔ وہ کچھ دیر یونہی گیٹ کے پاس کھڑی رہی۔ پھر سر جھٹک کر پلٹی۔ تخت پوش کے پاس آ کر اس نے ٹرے کی طرف دیکھا۔ چائے کا کپ ایسے ہی پڑا تھا۔ حسن رضا نے چائے نہیں پی تھی۔ اسے ان پر بے حد ترس آیا۔ میرا سیدھا سادہ شفیق باپ......رضی! تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ بالکل اچھا نہیں کیا رضی! ہمارے ساتھ، اپنے ساتھ۔
اُس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں نمی پھیل گئی اور وہ رونے لگی۔

❁○❁

رونے سے زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ اور اگر حل ہو سکتے تو احمد رضا اس وقت دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہوتا۔ لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے صوفے پر بیٹھا تھا۔ رچی جا چکا تھا مگر اس کی اُنگلیوں کی چبھن اب بھی اسے اپنے کندھوں پر محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کی وہ سرد، بے مہر آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اُس کے بالکل قریب آ کر اور اپنی سخت انگلیاں تقریباً اس کے کندھوں میں چبھوتے ہوئے اس نے اپنی بات دہرائی تھی۔
''یہ سب تم نے ہی کہا تھا احمد رضا!...... پندرہ سولہ صحافیوں کی موجودگی میں۔ اور اب تم اس سے مُکر نہیں سکتے۔''
''لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ سب بکواس جو اس اخبار میں لکھی ہے، میں وہ نہیں کہہ سکتا۔ میں ایک سچا مسلمان ہوں۔''
''اچھا!'' رچی یونہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے تمسخر سے مسکرایا تھا۔ ''کیا تم مجھے ایک سچے مسلمان کی تعریف بتاؤ گے؟''
اور اُس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ وہ یہاں اپنے شب و روز بغیر کسی رشتے کے الوینا کے ساتھ بسر کر رہا تھا۔ اس نے ان سارے دنوں میں ایک بار بھی خدا کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔
''ہاں، بولو نا۔'' اس نے اپنی انگلیاں اس کے کندھوں میں چبھوئیں۔
''میں اس تعریف پر پورا نہیں اُترتا۔ میں جانتا ہوں۔'' وہ بولا تو اس کی آواز کمزور تھی۔ ''لیکن میں نے کلمہ طیبہ پڑھا ہے اور میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے آخری نبی ہیں۔''
''چلو مان لیا، ایسا ہی ہے۔'' رچی نے اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا لئے اور اسے لگا جیسے اس کے کندھوں پر سے ملوں بوجھ ہٹ گیا ہو۔ ''لیکن تم نے تو اپنی زبان سے ان اتنے صحافیوں کے سامنے جو کچھ کہا، وہ یہاں اس اخبار میں موجود ہے۔ اور اس ایک اخبار میں نہیں، کئی اخباروں میں۔''
اس نے اپنے حلق کو خشک ہوتے محسوس کیا اور بے بسی سے رچی کی طرف دیکھا۔
''تم یقین کرو رچی! میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اور میں ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں، جب میں ایسا سمجھتا ہی نہیں۔ میں حضرت صاحب کو اللہ کا ایک نیک بندہ سمجھتا ہوں اور...... ہاں یہ بات تو شاید ارباب حیدر نے کہی تھی یا پھر طیب خان نے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔''
''اور انہوں نے کیا کچھ غلط کہا تھا؟......نہیں نا۔ تب ہی تم نے ان کی تائید میں ان کی بات دہرائی تھی۔''
وہ اُلجھی اُلجھی نظروں سے رچی کو دیکھنے لگا تھا۔
''ہو سکتا ہے، تم ایسا نہ سمجھتے ہو۔ ایسا نہ کہنا چاہتے ہو۔'' رچی نے آواز میں نرمی پیدا کی تھی۔ ''لیکن تم شاید نشے میں تھے۔''
''لیکن وہ تو شرابِ طہور تھی۔'' وہ ہکلایا۔

''کبھی کبھی شراب طہور بھی نشہ کر دیتی ہے۔'' رچی نے قہقہہ لگایا۔ ''بہر حال، میں ایک کرسچین ہوں۔ لیکن میں بھی سمجھتا ہوں کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ......'' اس نے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں جو کچھ لکھا ہے، تم اسے جھٹلا نہیں سکتے۔''

''میں ابھی اس اخبار کے آفس میں فون کر کے تردید چھپواتا ہوں۔ میں اعتراف کرلوں گا کہ خمار کی حالت میں میرے منہ سے کچھ غلط نکل گیا تھا لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں......'' رچی نے پہلو بدلا تھا۔

''احمق آدمی! تم اپنے ملک کے لوگوں کو نہیں جانتے۔ ایسے معاملوں میں وہ پاگل ہو جاتے ہیں۔ مرنے مارنے پر تیار۔ وہ تمہاری اور اسمٰعیل خان کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ ایک اخبار میں معمولی سی ایک تردید چھپ بھی گئی تو کتنے لوگوں نے اسے پڑھنا ہے۔ وہ ہزاروں لوگ جو اس خبر کو پڑھ چکے ہیں۔''

اسے ہزاروں لوگوں کی پروا نہیں تھی۔ بھلے کروڑوں لوگ پڑھ لیتے لیکن ایک شخص وہ خبر نہ پڑھتا۔

اُسے صرف ایک شخص کی پروا تھی، جو اُس کا باپ تھا۔

اُسے صرف ان دو عورتوں کی پروا تھی، جن میں سے ایک اُس کی ماں اور ایک بہن تھی۔ بھلے ساری دنیا پڑھ لیتی، بس یہ تین لوگ نہ پڑھتے۔

رچی اُٹھ کر چلا گیا تھا۔

رچی کیوں آیا تھا؟..... کیا صرف یہی بتانے؟.....وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا جب الوینا اندر آئی تھی۔

''احمد!'' الوینا نے اسے بلایا تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر آج اس کی آنکھوں میں کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو نا احمد؟'' الوینا نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''الوینا! مجھے گھر جانا ہے۔''

''ہاں تو چلے جانا لیکن......'' وہ یکدم پریشان نظر آنے لگی تھی۔

''لیکن کیا؟'' اس نے بے چینی سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹایا۔

''وہ......'' وہ کچھ جھجکی۔ ''آج باہر جانے میں خطرہ ہے۔ لوگ بہت غصے میں ہیں۔ وہ تمہیں......''

''وینا! مجھے یہاں ہر شخص نہیں پہچانتا۔ کسی کو کیا خبر میں کون ہوں؟ میں کوئی ایسی وی آئی پی شخصیت نہیں ہوں۔ مجھے تو میرے سارے محلے والے بھی شکلاً نہیں جانتے ہوں گے۔ کسی کو کیا خبر کہ یہ شخص جو جا رہا ہے، احمد رضا ہے، جس نے وہ بکواس کی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن......''

''لیکن کیا وینا؟'' اس نے بے چینی سے اس کی بات کاٹی۔

''وہ، شاید حضرت صاحب اجازت نہ دیں۔ انہوں نے منع کیا ہے باہر جانے سے۔''

''لیکن مجھے جانا ہے وینا!...... میرے باپ نے یہ خبر پڑھ لی تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ مر جائے گا اس غم سے کہ اس کا بیٹا......''

''اچھا تم چلو اُٹھو۔ اپنے...... میرا مطلب ہے میرے کمرے میں چلو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ پھر کچھ کرتے ہیں۔ تم اتنے میں اپنے کپڑے وغیرہ بیگ میں رکھ لو۔''

''اچھا!'' وہ اُٹھ کر الوینا کے کمرے میں آیا تھا۔ اس نے الماری میں سے اپنے کپڑے نکال کر بیڈ پر ڈھیر کر دیئے اور الماری کے نچلے خانے سے بیگ نکالتے ہوئے اس کی نظر اپنے اٹیچی کیس پر پڑی۔ حسن رضا نے اس کی ہر چیز اس میں رکھ دی تھی۔ ہر وہ چیز، جس کی اسے ضرورت ہو سکتی تھی۔

'کیا ابو مجھے معاف کر دیں گے؟...... کیا وہ میری بات کا یقین کر لیں گے کہ یہ سب کچھ میں نے نہیں کہا؟'
وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک وہ یونہی بیٹھا سوچتا رہا۔
'اُس روز ابو نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اور میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔'
پتہ نہیں، کتنی دیر گزر گئی۔ الوینا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ اُٹھا۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر جانا چاہا لیکن وہ دروازہ باہر سے لاک تھا۔ وہ دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے ششدر سا کھڑا تھا۔ ایک بار پھر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ ناب کو اِدھر اُدھر گھمایا اور پھر اُلجھا اُلجھا سا واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ بیڈ پر بکھرے کپڑے ایک طرف کر کے بیگ کو بیڈ کے پاس رکھ کر وہ لیٹ گیا۔ بیٹھے بیٹھے وہ تھک گیا تھا۔
کیا کہیں اس سے کچھ غلط ہو گیا تھا؟
اور یہ غلطی کہاں تھی؟
وہ آنکھیں مُوندے سوچنے لگا۔
اس دن سے جب وہ پہلی بار ابراہیم کے ساتھ اسمٰعیل خان کے پاس آیا تھا، آج تک اس نے ہر بات سوچ لی تھی لیکن اسے کہیں کچھ غلط نظر نہیں آیا تھا۔ بس یہ ایک بیان جو اس سے غلط منسوب کر دیا گیا تھا۔
اسمٰعیل خان اچھا آدمی تھا۔
شاید کوئی بزرگ۔
کوئی ولی۔
لیکن نعوذ باللہ وہ پیغمبر کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اس نے تو ایسا کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا۔
اُس نے کروٹ بدلی اور ایک بار پھر اسمٰعیل خان سے اب تک ہونے والی گفتگو دل ہی دل میں دہرانے لگا۔ اور یوں ہی سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔
دوبارہ اس کی آنکھ بھُنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے کھلی تھی۔
اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بڑی میز پر دو ڈونگے اور پلیٹیں رکھی تھیں۔ الوینا ایک ڈونگے کا ڈھکن اُٹھائے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُسے اُٹھتا دیکھ کر وہ مسکرائی۔
''منہ ہاتھ دھو کر فٹافٹ آ جاؤ۔''
وہ خاموشی سے اُٹھ کر واش روم چلا گیا۔ واپس آیا تو میز پر کچھ اور بھی لوازمات رکھے تھے۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ الوینا نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔
''تم بغیر کچھ کھائے پیئے سو گئے تھے۔ میں آئی تھی تمہیں بلانے۔ تم سو رہے تھے۔ میں نے جگایا نہیں۔ بہت سوئے تم۔ چھ بج رہے ہیں شام کے۔''
''اس زندان میں دن رات کا پتہ ہی نہیں چلتا۔'' لہجے میں ہلکی سی تلخی در آئی تھی۔
الوینا نے اس کی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
''تم خود کو یہاں قید سمجھتے ہو احمد؟'' وہ بے حد سنجیدہ تھی۔
''کیا ایسا نہیں ہے؟''
''نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔'' الوینا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ''اگر آج تمہیں حضرت جی نے باہر جانے سے منع کروایا تھا تو صرف تمہارے بھلے کے لئے۔ ایک دو روز میں لوگوں کا جوش و خروش ختم ہو جائے گا تو چلے جانا۔''
اس نے کھانا کھاتے کھاتے الوینا کی طرف دیکھا۔
''پھر کمرہ باہر سے لاک کیوں تھا؟''

''ہرگز نہیں۔تم سے کس نے کہا کہ کمرہ باہر سے لاک تھا؟'' الوینا نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''میں نے کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بند تھا۔''
''اوہ مائی گاڈ!......تم غلط فہمی کا شکار ہو۔اس کمرے کا لاک خراب ہے۔بعض اوقات خود بخود لاک ہو جاتا ہے اور پھر اندر سے نہیں کھلتا۔ جب سے ہم ادھر منتقل ہوئے ہیں، تب ہی سے ایسا ہے۔تم جانتے ہو، حضرت جی کی سکیورٹی کے خیال سے ہم کسی لاک ٹھیک کرنے والے کو ادھر نہیں لا سکتے ابھی۔''
احمد رضا نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس نے سوچا ضرور تھا کہ اتنے دنوں سے وہ یہاں ہے۔ پہلے تو کبھی کمرہ خود بخود لاک نہیں ہوا تھا۔
''تم بدگمان ہو رہے ہو ہم سے نا، تو ٹھیک ہے۔تم کھانا کھا لو۔ میں تمہیں خود گیٹ تک چھوڑ آتی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیلی تھی۔
''ایسا نہیں ہے الوینا!......میں بدگمان نہیں ہوں۔'' وہ پگھلا۔ ''لیکن میں گھر جانا چاہتا ہوں۔تم جانتی ہو، ابو مجھ سے پہلے ہی خفا ہیں۔اس بیان کے بعد تو وہ مزید ناراض ہو جائیں گے اور مجھے گھر میں کبھی گھسنے نہیں دیں گے۔لیکن اب کی بار میں بھی وہاں دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں گا۔امی اور سمیرا ہیں نا میری سفارش کرنے کو۔'' اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
''کہو تو میں بھی چلوں تمہارے ساتھ، تمہاری سفارش کرنے کو؟''
''نہیں......نہیں۔ابھی نہیں۔'' وہ گھبرایا۔
الوینا بے اختیار ہنس دی اور وہ دم بخود سا ہو کر اس کے ہموار دانتوں کو دیکھنے لگا۔اس وقت وہ ساڑھی میں ملبوس تھی اور اس کے نازک سراپے پر گرے اور میرون شیڈ والی ساڑھی بے حد جچ رہی تھی۔
''تو ٹھیک ہے۔پھر کل چلے جانا۔''
''کل؟'' اس نے الوینا کی طرف دیکھا۔
''ہاں۔آج حضرت صاحب پردے سے نکل آئے ہیں۔کل شام یہاں ایک بڑی تقریب ہے۔دوسری بلڈنگ کے ہال میں کچھ لوگ حضرت جی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور اسلام قبول کرلیں گے۔''
''کون......رچی وغیرہ؟''
''شاید وہ بھی۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔اس تقریب میں شرکت کر کے چلے جانا۔ پرسوں صبح کی کسی فلائٹ سے حضرت جی بھی چلے جائیں گے، یہاں سے دبئی اور وہاں سے شکاگو۔''
''اور تم بھی ان کے ساتھ جاؤ گی؟''
''ہاں!'' الوینا نے کبابوں کی ڈش اس کی طرف بڑھائی۔ ''یہ لو نا۔''
''نہیں، تھینک یو۔'' وہ افسردہ سا ہو گیا تھا۔ بھوک ایک دم مر گئی تھی۔ یہ افسردگی گھر نہ جا سکنے کی تھی یا الوینا سے بچھڑنے کی، وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔
''ابھی ڈنر میں تو بہت دیر ہے۔ میں نے تمہارے لئے اسپیشل کہہ کر بنوائے ہیں۔تم نے صبح سے کچھ کھایا جو نہیں تھا۔'' وہ بہت محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔
اُس نے بے دلی سے ایک کباب اٹھا کر پلیٹ میں رکھ لیا۔
''تو پھر کل تقریب کے فوراً بعد میں چلا جاؤں گا۔''
''ٹھیک ہے۔'' الوینا مسکرائی تو اس کی نظریں الوینا کی طرف اُٹھیں اور وہ مسحور سا اسے دیکھتا رہا۔ایک رات اور الوینا کے سنگ۔

اندر کہیں خوشی کا جلترنگ سا بجا تھا اور افسردگی کا غبار چھٹنے لگا تھا...... کل...... صرف ایک دن کی تو بات ہے۔ اُس نے خود کو مطمئن کر لیا تھا۔

اب وہ پوری طرح الوینا کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور اس کی نظریں بار بار اس کا طواف کر رہی تھیں۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ مسلسل اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''جلدی آنا وینا!'' جب وہ برتن سمیٹ رہی تھی تو اس نے کہا تو الوینا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چلی گئی۔ اب وہ صرف الوینا کے متعلق سوچ رہا تھا۔

❁○❁

شام کے چھ بجے حسن رضا بے حد تھکے اور نڈھال سے سر جھکائے اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ دور دور تک بس کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد پیچھے ہٹ کر بینچ پر بیٹھ گئے۔ وہ صبح سات بجے گھر سے نکلے تھے لیکن دفتر نہیں گئے تھے۔ بہت دیر تک وہ ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھے رہے۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کا دماغ خالی ہو گیا ہو اور وہ کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔

انہوں نے دوبارہ کوٹ کی جیب سے وہ مڑا تڑا اخبار نکال کر دیکھا اور پھر یونہی واپس جیب میں رکھ لیا۔ گلی میں چہل پہل شروع ہوئی تو وہ اُٹھ کر اسٹاپ کی طرف چل دیئے تھے۔ پھر بس آئی تو وہ بس میں بیٹھ گئے۔ سر نیچے کیے، پیشانی پر ہاتھ کا چھجا سا بنائے۔ جیسے انہیں ڈر ہو کہ لوگ انہیں دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ احمد رضا کا باپ ہے۔ پھر یونہی ان کا اسٹاپ گزر گیا اور انہیں پتہ ہی نہ چلا۔ آخری اسٹاپ پر کنڈیکٹر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''صاحب! اُترنا نہیں ہے؟''

''ہاں۔'' انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

''ارے آپ...... میاں صاحب! آپ کا دفتر تو پچھلے اسٹاپ پر تھا۔'' ہر روز آنے جانے کی وجہ سے کنڈیکٹر انہیں جانتا تھا۔

''ہاں بس وہ آج ادھر ہی آنا تھا۔'' وہ تیزی سے اُتر گئے۔ کچھ دیر فٹ پاتھ پر بے دھیانی سے کھڑے، پھر ایک رکشہ روکا، اس سے اخبار کے دفتر میں چلنے کو کہا۔

اخبار کے دفتر میں پہلے تو کسی نے ان کی بات نہ سنی۔ بڑی مشکل سے ان کی ایڈیٹر تک رسائی ہوئی۔ وہ صحافیوں کی دل سے عزت کرتے تھے اور اپنے دل میں انہیں بڑا اعلیٰ مقام دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے ہاتھ میں قلم تھا۔ اور ہر قلم تھامنے والا ان کے نزدیک بہت قابل احترام تھا۔ لیکن یہاں آ کر ان کے روّیے سے ان کے احساسات کو بہت ٹھیس پہنچی تھی، اس لیے جب وہ ایڈیٹر کے سامنے آئے تو ان کی آنکھیں ان کے روّیے سے بھی نم ہو رہی تھیں۔

''یہ کانفرنس کہاں ہوئی تھی؟'' انہوں نے مڑا تڑا اخبار کھول کر ایڈیٹر کے سامنے رکھا تو ایڈیٹر نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔

''کیا آپ اس جھوٹے نبی کو قتل کرنا چاہتے ہیں؟''

''میں ایک کمزور ایمان رکھنے والا آدمی ہوں۔ کچھ بھی سوچنے سے پہلے میرے سامنے میری بچی اور بیوی آ جاتی ہے، میرے بعد بے سہارا، اکیلی رہ جائیں گی..... وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو بے خطر آتشِ نمرود میں کود جاتے ہیں۔''

ان کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے جنہیں اپنے ہاتھوں کی پشت سے پونچھا۔

''تو پھر آپ اس جگہ کا پتہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں؟'' وہ اب بھی مشکوک نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''میرا بیٹا۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ اس کے مریدوں میں شامل ہو گیا ہے۔ میں اُسے ڈھونڈنا چاہتا

ہوں۔'' ان کی نظریں جھک گئیں۔ ان کے چہرے پر چھائی بے بسی، ان کی آنکھوں میں پھیلی نمی نے ایڈیٹر کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔ اس نے ترحم بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور گھنٹی بجا کر اس صحافی کو بلایا جو اس پریس کانفرنس کی رپورٹنگ کرنے گیا تھا۔ اس نے انہیں اس بلڈنگ کا اتا پتہ سمجھا دیا تھا۔

''آپ تو بڑے معقول آدمی لگتے ہیں۔ آپ کا بیٹا کیا اتنا ناسمجھ تھا کہ جھوٹ اور سچ میں فرق نہیں جان سکا؟''

''میرا بیٹا، یو۔ ای۔ ٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اسکالرشپ ہولڈر۔''

وہ بات کر کے رُکے نہیں تھے اور تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔ ایڈیٹر حیرت اور دُکھ سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

اُس بلڈنگ کے جس ہال میں کانفرنس ہوئی تھی، وہ صرف ایک دن کے لئے کرائے پر لیا گیا تھا۔ یہ ہال اسی مقصد کے لئے تھا۔ اکثر سیمینار وغیرہ کے لئے این جی اوز یا کوئی ادارہ کرائے پر لے لیتا تھا۔ وہ دل گرفتہ سے بلڈنگ سے باہر نکل آئے تھے اور ایک بار پھر طیب خان کی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے......شاید......

چوکیدار نے بتایا کہ طیب خان تو پشاور گیا ہوا ہے۔ پھر اُنہیں پہچان کر بولا۔

''آپ وہی ہیں نا، ایک بار پہلے بھی آئے تھے ایک لڑکے کے ساتھ۔''

''ہاں۔'' وہ کوٹھی کے باہر بنے چبوترے پر بیٹھ گئے۔

''آپ کو کیا کام ہے طیب خان سے؟'' چوکیدار نے پوچھا تو کچھ سوچ کر انہوں نے وہی بات دہرا دی جو اخبار کے دفتر میں کہی تھی۔ چوکیدار لمحہ بھر کچھ سوچتا رہا، پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

''آپ کل تین بجے آئیے گا۔ مجھے چھٹی پر جانا ہے۔ میں آپ کو لے چلوں گا وہاں، جہاں وہ خبیث رہتا ہے۔ بس اب جائیں۔''

وہ کچھ کہنا چاہتے تھے، پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ زبانی پتہ سمجھا دے، وہ ڈھونڈ لیں گے۔ لیکن چوکیدار نے اندر جا کر گیٹ بند کر لیا تھا۔ وہاں سے وہ واپس گھر جانے کے لئے اُٹھے تھے لیکن پھر تھوڑا آگے جا کر اسٹاپ پر موجود بینچ پر بیٹھ گئے تھے اور ابھی تک وہیں بیٹھے تھے۔ آس پاس موجود ایک دو پھل بیچنے والے خوانچہ فروشوں نے دو تین بار انہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔ دو نوجوان ان کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اسمٰعیل خان کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ایک بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

''میرا دل چاہتا ہے، وہ کم بخت مجھے مل جائے تو اسے جہنم رسید کر دوں اپنے ہاتھوں سے۔''

انہوں نے بڑی حسرت سے ان لڑکوں کو دیکھا۔

'کیسے خوش نصیب باپ کی اولاد ہیں۔'

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بس آ گئی تھی۔ اُن کا جی چاہا، وہ اس لڑکے کی پیشانی چوم لیں، جو اب بھی جوش و خروش سے اسے جہنم رسید کرنے کی باتیں کر رہا تھا۔ لیکن وہ اسے حسرت سے دیکھتے بس کی طرف بڑھ گئے۔ جب وہ اپنی گلی میں داخل ہوئے تو انہوں نے سمیرا کو گیٹ کھول کر گلی میں پریشانی سے تکتے پایا۔ پھر سمیرا کی نظر ان پر پڑی اور اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ وہ یکدم ہی گیٹ سے باہر نکل آئی۔

''ابو! آپ آ گئے۔ بہت دیر کر دی آپ نے؟''

''ہاں۔ کام زیادہ تھا۔'' وہ اس کے ساتھ اندر چلے آئے۔

اگلی صبح وہ دفتر نہیں گئے تھے۔ سارا دن کمرے میں لیٹے رہے۔ زبیدہ نے انہیں لیٹے دیکھا لیکن کچھ پوچھا نہیں۔ سمیرا کالج جا چکی تھی۔

ایک بجے کے قریب وہ اُٹھے تھے۔ زبیدہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔

''زبیدہ......!'' انہوں نے کچن کے دروازے کے قریب جا کر کہا۔ زبیدہ نے آلو چھیلتے ہوئے مڑ کر انہیں دیکھا۔

''زبیدہ! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے شاید تمہارے بیٹے کے ساتھ زیادتی کی۔''
''وہ صرف میرا بیٹا نہیں تھا۔''
''ہاں!'' ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ ''میرا بھی تھا۔ پھر بھی تم ماں ہو۔ مجھ سے زیادہ اس سے محبت کرتی ہو گی۔ اس لئے مجھے معاف کر دینا کہ.....'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''شاید آپ نے اپنی طرف سے جو بہتر سمجھا، وہ کیا۔'' پہلی بار زبیدہ نے اس طرح بات کی تھی۔ شاید سمیرا انہیں اظہار کی خبر کے متعلق بتا چکی تھی۔ مزید کوئی بات کئے بغیر وہ کچن کے پاس سے ہٹ آئے تھے۔ کچھ دیر تخت پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے وضو کر کے نماز پڑھی۔ جب وہ نماز پڑھ رہے تھے، سمیرا بھی آ گئی تھی اور تخت پر بیٹھی انہیں تسبیح پڑھتے دیکھ رہی تھی۔

''ابو! آپ دفتر نہیں گئے؟'' وہ نماز پڑھ چکے تو اس نے پوچھا۔
''ہاں، اپنی ماں کا خیال رکھنا۔ میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔''
''کیا ہوا امی کو؟'' وہ گھبرا گئی۔
''کچھ نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔
''لیکن.....'' پھر بات ادھوری چھوڑ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ طیب خان کی کوٹھی کے باہر کھڑے تھے۔ چوکیدار نے باہر نکل کر انہیں دیکھا تھا۔
''صاحب! آپ اسٹاپ پر میرا انتظار کرو۔''
چوکیدار کے ساتھ وہ دو بسیں بدل کر یہاں پہنچے تھے۔ وہاں سے پیدل وہ بانس بازار کے رش میں سے گزر کر ایک گلی میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے دُور سے ایک طرف اشارہ کیا۔
''وہ اُس گلی میں دوسرا مکان ہے۔ آج کل وہ یہاں چھپا ہوا ہے۔ آپ کا بیٹا بھی اُدھر ہی ہو گا۔ آج یہاں سے اُنہیں نکل جانا ہے۔ ادھر کوئی بڑی تقریب ہے۔ آپ یہاں بیٹھ جاؤ۔ آپ کا بیٹا باہر نکلا تو بات کر لینا۔ مان گیا تو ساتھ لے جانا۔ لیکن مکان کے اندر نہیں جا سکو گے۔ اندر گن مین ہوں گے..... خیر میں چلتا ہوں۔ کسی کو میرے متعلق مت بتانا۔ اپنے بیٹے کو بھی نہیں۔ یوں ظاہر کرنا جیسے اتفاق سے ادھر آ نکلے ہو۔ یہاں پیچھے تھوڑی سی کھلی جگہ ہے۔ وہاں ان کی گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ کسی چائے وغیرہ کے ہوٹل میں بیٹھ جاؤ۔ وہ ٹھیک پانچ بجے یہاں سے نکل کر جائیں گے۔ وہ جگہ بھی نزدیک ہی ہے۔''
انہوں نے چوکیدار کی ساری باتیں دھیان سے سنی تھیں اور اس کا شکریہ ادا کر کے وہ کھلی جگہ پر بنے ہوئے کوڑے دان کے پیچھے زمین پر پڑے ایک پتھر پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جب بھی آہٹ ہوتی، وہ ذرا سا جھانک کر دیکھ لیتے۔ اس جگہ لوگوں کی آمد و رفت کم ہی تھی۔ ایک بار ایک لڑکا کوڑا پھینکنے آیا تھا۔ ایک بار سائیکل پر کوئی گزرا تھا۔
اور پھر انہوں نے اُسے دیکھا۔
اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ وہ کتنے دنوں بعد احمد رضا کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے پیچھے دو یا تین افراد اور تھے، پھر ایک لڑکی تھی۔
وہ کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ لمحہ بھر کے لئے رک کر پیچھے دیکھنے لگا تھا۔ انہوں نے اپنا سر پیچھے کر لیا تھا۔ وہ تقریباً کوڑے دان کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنی جیب کو تھپتھپا کر اپنے پسٹل کی موجودگی کو محسوس کیا اور پھر ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ وہ اب پھر ساتھ والی لڑکی سے کچھ کہتا وہاں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بڑا سنجیدہ لگا تھا۔ انہوں نے فوراً اس کے

چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں اور اب جیب سے اپنا پسٹل نکال کر انہوں نے مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے تھے۔ صرف چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس نے گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھا تھا اور انہوں نے مضبوطی سے دانت، دانتوں پر جمائے۔ انہوں نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

✿○✿

ایبک، اریب فاطمہ سے بات کر کے وہاں رکا نہیں تھا اور ٹیکسی کے لکڑی کے منقش دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے خیال آیا تھا کہ وہ تو سب کے لئے کولڈ ڈرنکس لینے نکلا تھا۔

اپنے سر پر ہولے سے ہاتھ مارتا ہوا وہ پلٹا تھا اریب فاطمہ ابھی تک وہیں گیٹ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

'اوہ مائی گاڈ! اس لڑکی کی آنکھیں ہیں یا سمندر۔'

''آپ آخر اس طرح اور اس قدر کیوں رو رہی ہیں؟......اب کم از کم یہاں اس گھر میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور اگر آپ واپس جانا چاہتی ہیں تو میں عمر سے کہتا ہوں۔ وہ آپ کو چھوڑ آتا ہے۔ لیکن بخدا! روئیں تو مت۔''

اریب فاطمہ نے بے حد شاکی نظروں سے اسے دیکھا اور ہاتھوں کی پشت سے رخسار رگڑ ڈالے۔

''اگر میری کوئی بات آپ کو بری لگتی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ یقین کریں مس اریب فاطمہ! میرے لئے آپ اتنی ہی محترم اور عزیز ہیں جتنی منیبہ، مرینہ، حفصہ۔ اور میں آپ سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی ''الریان'' کے لوگوں سے کرتا ہوں۔ میں آپ کے لئے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ ڈر گیا تھا۔ آپ یوں اکیلی چل پڑیں گھر سے۔ میں کسی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ اور ''الریان'' سے وابستہ لوگوں کی آنکھوں میں تو بالکل بھی نہیں۔ ''الریان'' سے میرے بابا کو عشق ہے۔ اور مجھے اپنے بابا سے عشق ہے۔''

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور اریب فاطمہ کی آنکھوں میں پھر نمی پھیلتی چلی گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے کیا سمجھا تھا۔ وہ بھی نری احمق اور بے وقوف ہے۔ بھلا کہاں ایبک فلک شاہ اور کہاں وہ۔ اس نے اتنی سی دیر میں جانے کیا کیا سوچ ڈالا تھا۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔ لیکن اس نے زبردستی اپنی آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا اور ایک بار پھر شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

کیا تھا اگر وہ کچھ دن اپنی بات کی وضاحت نہ کرتا تو وہ اس خوش فہمی میں رہتی کہ وہ اتنا دلکش انسان......

''آپ اس طرح مجھے دیکھیں گی تو مجھے اپنا آپ مجرم لگنے لگے گا۔'' ایبک کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے فوراً گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

''نہیں، نہیں......میں نے آپ کی تو کسی بات کا برا نہیں مانا۔ مجھے تو بس ڈر لگ رہا تھا۔''

''کس سے، مجھ سے؟''

''نہیں بھلا آپ سے کیوں ڈر لگے گا؟'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

''تو پھر کس سے ڈر لگ رہا تھا آپ کو؟'' وہ جیسے فرصت سے کھڑا تھا۔

''مائرہ آنٹی سے۔''

''لیکن میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ یہاں نہیں ہیں، رحیم یار خان گئی ہیں۔''

''تو اسی لئے تو ڈر لگ رہا ہے کہ وہ وہاں......'' اس وقت اُس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ ایبک ایک ٹک اسے دیکھے گیا اور وہ بات کرتے کرتے اٹک گئی۔ ایبک نے فوراً نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔

''وہ وہاں کیا کریں گی ایسا جو آپ کو خوف زدہ کر رہا ہے؟'' ایبک نے اسے اٹکتے دیکھ کر پوچھا۔

''وہ وہاں سے ہمارے گاؤں جا سکتی ہیں۔''

''تو کیا آپ کے گاؤں میں کرفیو لگا ہوا ہے؟......آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں جا سکتا؟''
''نہیں، نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ میرے ابا اور اماں سے شکایت لگائیں گی کہ میں یہاں پڑھنے نہیں آئی بلکہ......'' اور آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔
''میں نے مروہ آنٹی سے کہا بھی تھا کہ مجھے ہاسٹل میں داخل کروا دیں۔ لیکن وہ کہتی تھیں۔ ''الریان'' میں سب میرا خیال رکھیں گے۔ بہت محبتیں ملیں گی۔ اعتماد پیدا ہوگا۔''
''تو کیا ''الریان'' میں سب آپ کا خیال نہیں رکھتے؟'' ایبک نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''رکھتے ہیں۔ بہت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ مائرہ آنٹی۔'' اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کئے جو بہتے ہی چلے آ رہے تھے۔
اس روز مائرہ آنٹی نے کتنی بے عزتی کی تھی اس کی۔ وہ ہسپتال سے گھر آئی تھی اور منیبہ کے کمرے میں کتابیں کھولے بیٹھی تھی جب مائرہ اندر آئی تھیں۔
''فاطمہ......!'' ان کی آنکھوں میں غصہ اور ناراضی تھی۔
''جی!'' وہ یک دم گھبرا کر کھڑی ہوگئی تھی۔
''بیٹھ جاؤ اور میری بات دھیان سے سنو۔ تم یہاں پڑھنے آئی ہو۔ مروہ مامی نے تمہیں یہاں بھیجا ہے تو صرف پڑھائی سے مطلب رکھو۔ کوئی اور گل نہ کھلا بیٹھنا۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے خاندان کی بے عزتی ہو ''الریان'' میں۔ کسی سے تمہارا تعلق میرے خاندان سے ہے۔''
''لیکن میں نے تو کچھ ایسا نہیں کیا۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔
''نہیں کیا تو کرلوگی۔ یہ ہمدان سے ملنے ہاسپٹل کیوں گئی تھیں تم؟''
''ہمدان سے؟'' وہ سٹپٹا گئی تھی۔ ''نہیں تو۔ میں تو......آپ کو بتایا تھا نا میں نے۔''
''مجھے کیا خبر سچ کہہ رہی تھیں یا جھوٹ۔'' انہوں نے کندھے اچکائے۔ ''بہرحال آئندہ میں تمہیں ہمدان یا کسی لڑکے سے لڑی ہوکر بات کرتے نہ دیکھوں۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ ہمدان کو پھنسا لوگی اپنی معصومیت سے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ ہمدان اور رابیل کی بات تقریباً طے ہے۔ بڑوں میں بات طے ہوچکی ہے۔ بچوں تک ابھی نہیں پہنچی۔ اور مجھے ذرا سی بھی تمہاری شکایت ملی تو میں تمہارے ماں باپ سے بات کروں گی کہ وہ بلالیں تمہیں یہاں سے۔''
''نہیں۔'' وہ خوف زدہ سی ہوکر انہیں دیکھنے لگی تھی۔
اور وہ اس پر خونخوار سی نظر ڈالتی باہر چلی گئی تھیں۔ وہ بہت ڈر گئی تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا صرف اس کا ہی نہیں، اماں کا خواب بھی تھا۔ اور وہ اپنے خوابوں کی موت تو برداشت کرسکتی تھی لیکن اماں کے خواب۔
ایبک بہت غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ یقیناً مائرہ ممانی نے کوئی غلط بات ہی کی ہوگی۔ وہ سمجھ سکتا تھا۔
''آپ پریشان نہ ہوں۔ مائرہ مامی نے یوں ہی کہہ دیا ہوگا کچھ......ان کی عادت ہے۔ وہ بعض اوقات یوں ہی بول جاتی ہیں۔ آپ دل پر نہ لیں۔ وہ آپ کے گاؤں نہیں جائیں گی۔'' اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر ایبک کو دیکھا۔
''آپ کو کیسے پتہ کہ وہ نہیں جائیں گی؟ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اماں سے اور ابا سے میری شکایت لگائیں گی کہ میں......'' وہ پھر اٹک گئی تھی۔
ایبک مسکرایا تھا۔
''مجھے پتہ ہے وہ نہیں جائیں گی آپ کے گاؤں۔ اور اب پلیز یہ آنسو صاف کرلیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کا رونا نہیں سہہ سکتا۔''

''جی!'' اس نے فوراً ہی دونوں ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کیا اور پھر چادر کے پلو سے رگڑ ڈالا۔
''آیئے، میں آپ کو اندر چھوڑ آؤں۔''
''نہیں۔'' اس نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ ''میں جا رہی ہوں۔''
وہ تیز تیز چلتی ہوئی انیکسی کی طرف جا رہی تھی اور اس کی سیاہ چادر کا پلو زمین کو چھو رہا تھا۔
بالکل ایسے ہی، بالکل یونہی۔
اُس کی کہانی کی ہیروئن کی طرح۔
وہ جب اپنی کہانی کی ہیروئن کا سراپا لکھ رہا تھا تو اس کے سامنے شاید اریب فاطمہ تھی۔
ویسی ہی بھیگی بھیگی آنکھیں۔
اور ان غزال آنکھوں میں ٹھہرا سہم۔
وہ وہیں گیٹ کے پاس پڑی چوکیدار کی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ انیکسی کی طرف مڑتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی چہرہ موڑ لیا تھا۔
ایبک کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہوگئی۔
یہ لڑکی......اس لڑکی میں ایسا کیا ہے جو براہِ راست دل پر ضرب لگاتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسے روتے دیکھ کر بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکل گیا تھا۔
''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اریب فاطمہ!''
اپنے الفاظ پر وہ خود ہی حیران رہ گیا تھا اور اب اسے یونہی روتے دیکھ کر اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن خود اس کا دل اپنی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ آج سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی سے ایسی بات کہتا۔ پھر آج ہی کیوں؟ تو کہیں وہ سچ مچ تو اریب فاطمہ سے......
اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔
'صرف چند ملاقاتوں میں یا کوئی کسی سے محبت کر سکتا ہے؟ بغیر جانے، بغیر سمجھے؟'
'بہرحال!' اس نے ہولے سے سر کو جھٹکا۔ 'کچھ بھی ہو، اس لڑکی میں مقابل کو متاثر کرنے کی زبردست صلاحیت ہے۔'
تب ہی اس کی نظر کرنل شیر دل کے گھر کی طرف سے آتے عمر احسان پر پڑی۔ اس کے ساتھ کرنل شیر دل کا ملازم چائے کا سامان اٹھائے چلے آ رہا تھا۔
''ارے ایبک بھائی! آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟'' عمر نے ملازم کو انیکسی کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود گیٹ کی طرف ایبک کے پاس آیا تھا۔ ایبک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''بس یونہی بیٹھ گیا تھا۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔
عمر احسان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''آپ تو کولڈ ڈرنکس لینے گئے تھے۔''
''اوہ ہاں، بس جا رہا تھا۔'' ایبک نے گیٹ پر ہاتھ رکھا۔
''لیکن اب تو چائے بن گئی ہے۔ چلیں ادھار رہا آپ پر۔ پھر کبھی سہی۔ اس وقت تو گرما گرم چائے کے ساتھ گرما گرم چکن رول اور پکوڑے، سموسے اور زبردست قسم کا چاکلیٹ کھایئے آ کر۔ آنٹی شیر دل نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ چکن رول اور سموسے فریز کر رکھے تھے اور پکوڑے ابھی ابھی تلے ہیں اور اس وقت مزید کچھ تل رہی ہیں۔''
''اچھا؟'' ایبک مسکرایا تھا۔ ''اتنی سی دیر میں آنٹی سے دوستی کر لی؟''
''ہاں۔ آنٹی شیر دل تو بہت کیوٹ سی ہیں۔''
''آنٹی شیر دل کی اصطلاح پر ایبک کو ہنسی آئی تھی۔ وہ عمر احسان کے ساتھ باتیں کرتا جب انیکسی میں آیا تو منیبہ اور

حفصہ سب کو پلیٹیں سرو کر رہی تھی۔ بڑی پھرتی کے کے ساتھ انہوں نے سٹنگ میں موجود چھوٹی گول ڈائننگ ٹیبل پر سب اشیز رکھوا دی تھیں اور اب ایک ایک ڈش اٹھا کر سب کو پیش کر رہی تھیں۔ اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ "الریان" کی لڑکیوں میں بلا کا سلیقہ اور سگھڑ پن تھا۔ سوائے رابیل کے۔

ایبک فلک شاہ نے سوچا اور بابا جان والے بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے تھوڑا سا کھسک کر اس کے لیئے جگہ بنائی۔

"کونے میں کیوں ٹِک گئے ہو؟..... ایزی ہو کر بیٹھو بیٹا!" بابا جان نے اپنے خوب صورت نواسے کو دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی نظریں اس کے چہرے سے ہٹالی تھیں مبادا اُن کی نظر لگ جائے۔

"میں ٹھیک ہوں بابا جان!" منیبہ شاہ نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"تھینک یو۔" ایبک شاہ نے پلیٹ لے لی تھی اور اب حفصہ رول اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ اس نے ایک رول اٹھا لیا۔

"بیٹا! تم خود بھی کچھ لے لو نا۔ ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"

"آپ کو پتہ ہے پھپھو!" عمر احسان نے سموسہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مونی آپا اور حفصہ آپا "الریان" کی وہ ہستیاں ہیں جو دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتی ہیں۔"

بابا جان نے محبت سے انہیں دیکھا۔

"مونی بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔ مرتضٰی بھی بچپن میں ایسا ہی تھا۔ اپنے حصے کی چیزیں چھوٹے بہن بھائیوں کو کھلا کر خوش ہوتا تھا۔"

"تو پھر مرتضٰی ماموں پاکستان کیوں نہیں آتے کبھی؟" عمارہ سے جڑی بیٹھی عاشی نے بابا جان سے پوچھا۔

"تا کہ وہ پاکستان آ کر اپنے حصے کی چیزیں سب چھوٹوں میں بانٹ دیں۔" زبیر احسان کو اس بات پر بے تحاشا ہنسی آئی۔ عاشی نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"زبیر بھائی! آپ کے پاس تو سینس ہی نہیں ہے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔"

اب کے عمر احسان کا قہقہہ بہت بلند تھا۔

"شیور!" اس نے زبیر احسان کو انگوٹھا دکھایا تھا۔ "ہماری عاشی گڑیا تو بہت ذہین ہے۔"

"تو پھر آپ کا کیا مطلب تھا عاشی رانی؟" ایبک نے تھوڑا سا آگے جھک کر عاشی کے رخسار کو دو انگلیوں سے چھوا۔

"مرتضٰی ماموں اتنے لِونگ، اتنے کیئرنگ ہیں تو یہاں کیوں نہیں رہتے "الریان" میں ہم سب کے ساتھ؟ میں نے تو کبھی انہیں نہیں دیکھا جب سے "الریان" میں آئی ہوں دو سال سے۔"

عثمان شاہ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں میری جان! جاب کی۔ زندگی کے سیٹ اپ کی۔ وہ "الریان" سے دور نہیں جانا چاہتا تھا لیکن......"

"الریان" سے تو کبھی کسی نے دور نہیں جانا چاہا تھا۔ اس کے بابا جان نے بھی نہیں۔ ایبک نے افسردگی سے سوچا۔ اور وہ کبھی "الریان" سے دور ہوئے بھی نہیں تھے۔ وہ بہاولپور میں رہ کر بھی "الریان" میں سانس لیتے تھے اور ان سے زیادہ کس نے "الریان" کو چاہا ہوگا بھلا۔

"بابا جان! عاشی کو تو مجھے دے دیں۔ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ ہماری زارا کی نشانی ہے۔ اپنی جان سے بڑھ کر چاہوں گی اسے۔ اور مومی کا تو آپ کو پتہ ہے نا، ہمیشہ بہنوں کی طرح چاہا زارا کو۔ بہنوں جیسا ہی مان دیا اسے۔ زارا کو اس دنیا سے گئے دو سال ہو گئے، ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب مومی نے زارا کو یاد نہ کیا ہو۔"

"ہاں، میرے بعد لے جانا اسے۔ اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔ سوچتا تھا میرے بعد کیا ہوگا اس کا..... کون خیال

رکھے گا اس کا۔ یہ بچیاں تو کل اپنے گھروں کی ہو جائیں گی۔ اور میری عاشی سات سال کی عمر میں ماں سے تو محروم ہوئی ہی، باپ نے بھی بھلا دیا۔''

''بابا جان! آپ نے پھر وہی باتیں شروع کر دیں۔'' عمارہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''یہ زندگی کی حقیقت ہے بیٹا! جانا تو ہے نا سب نے۔ اور ہم تو عمر کی اس منزل پر ہیں کہ سامان باندھے بیٹھے ہیں۔ جانے کب گاڑی آ جائے۔ بس بیٹا! جب تک زندہ ہوں، عاشی کو اپنے پاس رکھوں گا۔ اس کی صورت میں تم دونوں کی صورتیں دیکھتا ہوں۔'' ماحول میں یکدم افسردگی سی پھیل گئی تھی۔

''بس اب ایک ہی حسرت ہے کہ ایک بار موی کو دیکھ لوں، اس سے مل لوں، گلے لگا لوں۔'' انہوں نے ایبک کی طرف دیکھا۔

''بیٹا! اس سے کہو آ جائے یہاں تمہارے پاس۔ فون کرواسے۔ میری بات کرواؤ...... میں کہتا ہوں اس سے کہ ایک بار مجھ سے آ کر مل جائے۔ ''الریان'' کے دروازے اس نے خود پر بند کئے تھے، یہاں تو آ سکتا ہے نا۔'' ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔ ایبک نے ان کے لرزتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''جی بابا جان! وہ تو خود آپ سے ملنے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔''

اُس کی نظریں یک دم اندر آتے کرنل شیر دل پر پڑی تھیں اور شیر دل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہنے سے منع کیا تھا۔ ایبک نے فوراً بات بدل کر کرنل شیر دل کو مخاطب کیا۔

''ارے انکل! یہ آپ اپنے ساتھ کیا لائے ہیں؟ پورے کمرے میں مزیدار خوشبو پھیل گئی ہے۔''

''فرائیڈ چکن ہے بھئی۔ تمہاری آنٹی کی اسپینش ریسیپی۔'' کرنل شیر دل نے منیبہ کی طرف دیکھا۔ ''بیٹا! باہر ٹیبل سے ڈش اٹھا کر سرو کرو۔''

''جی۔'' منیبہ جو کھڑی تھی، باہر چلی گئی۔

ایبک، بابا جان کو بتانے لگا۔ ''آنٹی چکن کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر کے ٹوتھ پک میں پرو کر جانے کون سے مسالے لگا کر فرائی کرتی ہیں کہ بس، آپ چکھ کر دیکھیں۔''

''اچھا دیکھتے ہیں۔'' بابا جان مسکرا دیئے تھے۔

ایبک موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بابا جان ابھی ایک اٹیک سے سنبھلے تھے اور کرنل شیر دل کو ڈر تھا کہ وہ فلک کے متعلق جان کر کہیں ڈسٹرب نہ ہو جائیں اور کچھ مسئلہ نہ ہو جائے۔ تب ہی انہوں نے ایبک کو تاکید کی تھی کہ بابا جان ذرا ریلیکس ہو جائیں تو آرام سے انہیں بتا دینا اور پھر میں یا تم جا کر اسے لے آئیں گے۔

''اریب باجی! آپ تو کچھ بھی نہیں لے رہیں۔ کم از کم یہ چکن تو لے لیں نا، جس کی ایبک بھائی نے اتنی تعریف کی ہے۔''

عمر احسان کی آواز پر چونک کر ایبک نے ادھر دیکھا۔ اریب فاطمہ، عمر کے قریب ہی ایک موڑھے پر بیٹھی تھی۔ جانے یہ موڑھا کب یہاں آیا تھا۔ شاید انکل شیر دل نے بھجوایا ہوگا۔

اریب فاطمہ نے ایک اسٹک اٹھالی تھی۔ اس کی اس کی آنکھوں کے نیچے رخساروں پر سرخی تھی۔ غالباً رگڑنے سے اور رونے سے...... اُس کے گندم رنگ رخساروں پر یہ ہلکی سرخی بہت بھلی لگ رہی تھی اور اس پر قدرے سوجی ہوئی آنکھیں اور بھی غضب ڈھا رہی تھیں۔ عمر نے نہ جانے اس سے کیا کہا تھا کہ وہ مسکرا رہی تھی۔ نگاہیں جھکائے وہ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی اور اس کی لمبی گھنی پلکوں کا سایہ اس کے رخساروں پر لرز رہا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔

اُس کی اس محویت کو سب سے پہلے منیبہ شاہ نے ہی محسوس کیا تھا، جو حفصہ کی مدد سے سب کو چائے تقسیم کر رہی تھی۔ ایبک کو چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے وہ ہولے سے کھنکھاری تھی۔

''ایبک بھائی! چائے۔''

''اوہ ہاں!'' ایبک نے چونک کر ہاتھ میں پکڑی پلیٹ حفصہ کی ٹرے میں رکھ دی اور چائے کا کپ منیبہ سے لیتے ہوئے مسکرایا۔ منیبہ نے جان بوجھ کر شرارت سے مڑ کر اریب فاطمہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

''فاطمہ! تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو، بہت پیاری۔''

ایبک اور ہمدان نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔

''مونی آپا! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اریب آپی تو ہمیشہ سے ہی خوب صورت ہیں۔ صرف آج ہی تو پیاری نہیں لگ رہی ہیں۔''

عمر کو اریب فاطمہ بہت خوب صورت لگتی تھی۔ معصوم، پاکیزہ اور شفاف سی۔

عمارہ نے دلچسپی سے اریب فاطمہ کو دیکھا جو خود کو موضوع بنائے جانے پر گھبرا سی گئی تھی اور اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔

''اگر رابیل آپی ادھر ہوتیں نا تو آپ سے ناراض ہو جاتیں عمر بھائی!'' عاشی ابھی تک عمارہ سے جڑی بیٹھی تھی۔ عمارہ نے ایک بازو اس کی گردن میں حمائل کر رکھا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' عمر نے سر ہلایا۔

''اور کیا پتہ ماریں بھی۔'' اس نے مزے سے کیک کھاتے ہوئے آنکھیں جھپکائیں۔

''وہ کیوں بھلا گڑیا؟'' ایبک نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے عاشی کی طرف دیکھا۔

''وہ نہیں پسند کرتیں نا، ان کے علاوہ کسی اور کی تعریف ہو۔ اور وہ تو مجھے بھی پسند نہیں کرتیں۔''

''کیوں، آپ کو پسند کیوں نہیں کریں؟'' ایبک کو اس کی باتیں بہت دلچسپ لگ رہی تھیں۔

''میں ان سے زیادہ خوب صورت جو ہوں۔ ہوں نا؟'' اس نے ایبک سے تائید چاہی۔

''ہاں بالکل ہو۔'' صرف ایبک کے ہی نہیں، سب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ اُٹھی۔

''ہماری شہزادی کا تو کوئی مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔'' ایبک نے جواباً کہا تو اس نے اریب کی طرف دیکھا۔

''اریب فاطمہ بھی نہیں؟''

''نہیں۔'' ایبک کھل کر ہنسا۔

''لیکن اریب آپی، رابی باجی سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ وہ ذرا زیادہ گوری ہیں، لیکن اریب آپی زیادہ کیوٹ ہیں۔ سب کو اچھی لگتی ہیں اس لئے تو مائرہ آنٹی ان سے جلتی ہیں۔ اور ان سے لڑائی بھی کرتی ہیں۔ اس روز ان سے کہہ رہی تھیں کہ میں تمہیں رابیل کے حق پر ڈاکا نہیں ڈالنے دوں گی۔ اب اس میں اریب آپی کا کیا قصور کہ سب انہیں خوب صورت کہتے ہیں۔ رابی باجی سے بھی زیادہ۔''

وہ مزے سے، اردگرد سے بے نیاز کہے جا رہی تھی۔ جب کہ کمرے میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی اور اریب نے جو ایبک کی ہنسی میں کھوئی ہوئی ابھی تک سوچ رہی تھی کہ اس شخص پر ہنسی واقعی سوٹ کرتی ہے، ایک دم چونک کر عاشی اور پھر سب کی طرف دیکھا۔

عاشی اب مزید کیا کہنے والی تھی؟ وہ یک دم خوفزدہ ہو گئی اور ہاتھ میں پکڑا کپ، عمر کو پکڑا کر وہ فوراً اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔ لیکن عاشی نے مزید کچھ نہیں کہا تھا اور اپنی انگلیوں پر لگی کریم اور چاکلیٹ چاٹ رہی تھی۔ تب ایبک بے اختیار ہی اٹھ کر اس کے پیچھے باہر گیا تو ہمدان اور منیبہ کے لبوں پر ایک ساتھ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ لیکن دونوں نے سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپالی تھی۔ جبکہ بابا جان بہت دل گرفتگی سے عثمان شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''عثمان! یہ مائرہ بیٹی کو اس بچی سے کیا دشمنی ہے؟ میں نے کئی بار محسوس کیا ہے، اس کا رویّہ اس بچی سے صحیح نہیں ہے۔ مروہ نے ہماری ذمہ داری پر اسے یہاں چھوڑا ہے۔ وہ اسے اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہے۔ بیٹیوں کی طرح ہی پیار کرتی ہے وہ اس سے۔''

''اگر مروہ کی بیٹی کا مائرہ بھابی ''الریان'' میں رہنا پسند نہیں کرتیں تو پھر ہمارے بچوں کی ''الریان'' میں موجودگی بھی انہیں کھلتی ہوگی۔'' عثمان شاہ کے لہجے میں جانے ایسا کیا تھا کہ منیبہ ایک دم بولی تھی۔

''نہیں نہیں چچا جان! مائرہ چچی تو ہم سب سے بہت پیار کرتی ہیں۔''

''گاڈ فادر!'' عمر زیر لب کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اریب فاطمہ غیر ہیں، اجنبی ہیں۔ اس لئے مائرہ چچی کو ان کا ''الریان'' میں رہنا پسند نہیں ہے۔'' منیبہ وضاحت کر رہی تھی۔

''ایک بچی کا کیا بوجھ؟...... کتنا کھا جاتی ہے وہ؟ جہاں اتنے نوکر چاکر کھاتے پیتے ہیں، وہاں اگر مروہ کی منہ بولی بیٹی کھا رہی ہے تو مائرہ کو کیا تکلیف ہے؟ ابھی تو ہم زندہ ہیں۔'' بابا جان ابھی تک افسوس میں تھے۔

''ایسا نہیں ہے بابا جان! آپ کو پتہ تو ہے، مائرہ بھابی کا مزاج ایسا ہی ہے۔'' عمارہ نے ہولے سے ان کا بازو تھپتھپا کر تسلی دی۔ ''آپ خوامخواہ دل پر مت لیں۔''

''وہ تو یہ بھی کہتی ہیں، رحمت بوا مفت کی روٹیاں کھاتی ہیں۔ نہ کام کی، نہ کاج کی۔ ان کی اب ''الریان'' میں کیا ضرورت ہے؟'' عاشی نے ٹشو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا تو عثمان شاہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''عاشی گل! آپ خوامخواہ کی فضول باتیں مت کیا کریں۔''

عاشی سہم کر عمارہ سے لپٹ گئی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ عمر احسان نے دروازے پر ہاتھ رکھے رکھے مڑ کر عاشی اور عثمان چچا کی طرف دیکھا اور پھر باہر کا دروازہ کھول کر لان میں قدم رکھا لیکن ایبک کو اریب فاطمہ کے پاس کھڑے دیکھ کر مسکرایا۔

''ایبک بھائی! اریب آپی کو جانے مت دیجئے گا۔ آنٹی شیر دل زبردست قسم کا ڈنر تیار کر رہی ہیں۔''

ایبک نے مڑ کر اسے دیکھا تو وہ ہاتھ ہلاتا ہوا واپس انیکسی میں چلا گیا۔

''اریب فاطمہ! رُکیں پلیز۔ کہاں جا رہی ہیں آپ؟''

اریب فاطمہ کو دوبارہ گیٹ کی طرف جاتے دیکھ کر ایبک کے لبوں سے نکلا تو اریب فاطمہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

''میں آپ سے پوچھ رہا تھا، آپ اس طرح کیوں چلی آئی ہیں؟ اور آپ رو کیوں رہی ہیں؟ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔ عاشی نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔''

''عاشی نے۔'' ان کے لب کپکپائے۔ ''ہاں، عاشی نے کچھ نہیں کہا مجھے۔ لیکن اگر اس نے سب کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو مجھے مائرہ مامی نے کہی تھیں تو سب کیا سوچیں گے؟ مجھے نہیں پتہ تھا، جب وہ مجھے ڈانٹ رہی تھیں تو عاشی سن رہی تھی۔''

''عاشی نے اور کچھ نہیں کہا۔'' ایبک کے لہجے میں نرمی تھی۔ ''میرا خیال ہے، اس نے زیادہ کچھ نہیں سنا ہوگا۔ اور اگر آپ صحیح ہیں تو آپ کو لوگوں سے نہیں ڈرنا چاہئے اریب فاطمہ!''

''نہیں۔'' اس نے چادر کے پلّو سے اپنا بھیگا چہرہ اچھی طرح صاف کیا۔ ''ہمیں لوگوں سے ڈرنا چاہئے۔ میری اماں کہتی ہیں کہ لوگوں کا ڈر اور خوف اچھی چیز ہوتا ہے۔ خاص کر لڑکیوں کے لئے...... احتساب کا کام کرتا ہے۔ بہت بڑا محتسب ہوتا ہے، لوگوں کا ڈر بھی۔''

''مجھے کبھی اپنی ماں سے ملوائیے گا اریب فاطمہ! کیا وہ کوئی فلسفی یا ادیب ہیں؟''
''نہیں۔'' اریب فاطمہ نے سنجیدگی سے کہا۔'' وہ نہ فلسفی ہیں نہ ادیب۔ لیکن زمانے نے جو کچھ اُنہیں سکھایا ہے، آپ ادیب ہو کر بھی نہ سیکھ پائے ہوں گے۔''
ایبک کی آنکھوں میں لحہ بھر کے لئے حیرت کی رمق اُبھری اور پھر معدوم ہو گئی۔
''آپ اچھا بولتی ہیں اریب فاطمہ! ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا، آپ صرف روتی اور ڈرتی ہیں۔''
''ہاں۔ مجھے ڈر لگتا ہے زمانے سے۔ لوگوں سے۔''
''اریب فاطمہ! جب آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے، آپ بالکل صحیح ہیں تو پھر کس لئے ڈرنا؟''
''لیکن لوگ تو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتے اور سنتے ہیں۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ جھوٹ اور سچ کی تحقیق کرتا پھرے؟''
''لیکن سچ کبھی زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا۔ حقیقت ایک دن ظاہر ہو جاتی ہے۔''
''ہاں۔ ایک دن حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔'' وہ پتہ نہیں کیوں یک دم تلخ ہو گئی تھی۔ ایبک حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔'' لیکن بعض اوقات حقیقت ظاہر ہونے تک سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ آپ کسی پر جھوٹا الزام لگا دیں۔ ایک دنیا اس الزام کو سچ مان لے اور جب آپ پر سچ ظاہر ہو تو آپ کس کس کے پاس جا کر گواہی دیں گے کہ وہ جھوٹ تھا۔ کون آپ کی بات کا یقین کرے گا؟ اور اگر کر بھی لیا تو ایک زندگی جو اس جھوٹ کی وجہ سے زندہ درگور ہو گئی، آپ اس میں زندگی واپس لا سکیں گے؟ جو کھو گیا، جو نقصان ہو گیا، وہ پورا کر سکیں گے؟...... نہیں۔ کبھی نہیں۔''
''آپ ٹھیک کہتی ہیں شاید۔ لیکن کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ مائرہ مامی نے ایسا کیا کہہ دیا ہے جو آپ اتنی ڈری ہوئی اور خوف زدہ ہیں؟ مجھ پر اعتبار کریں۔ مجھے بتائیں۔ شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔''
'ہاں، کوئی تو ہو۔ کسی کو تو پتہ ہو کہ مائرہ مامی نے کتنی گھٹیا بات کی ہے۔' اریب فاطمہ نے سوچا اور ایبک کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے بولی۔
''وہ کہہ رہی تھیں، میں ہمدان بھائی کو...... یقین کریں۔ میں نے کبھی ہمدان بھائی کے متعلق ایسا سوچا بھی نہیں۔''
''اور ایسا سوچنا بھی نہیں اریب فاطمہ!'' بے اختیار ہی ایبک کے لبوں سے نکلا تھا۔
''کیا کہا آپ نے؟'' اریب فاطمہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
''کچھ نہیں اریب فاطمہ! میں کہہ رہا تھا، آپ مائرہ مامی کی باتوں کی پروا مت کیا کریں۔ وہ تو جو منہ میں آتا ہے، بولتی چلی جاتی ہیں۔ آپ پلیز اندر چلیں نا۔ بابا جان آپ کے اس طرح اٹھ آنے سے پریشان ہو گئے تھے۔''
تب ہی اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ عمر احسان ادھر ہی آ رہا تھا۔
''ایبک بھائی! آپ ابھی تک یہیں کھڑے ہیں۔ میں سمجھا، آپ فاطمہ آپی کو گھر چھوڑنے چلے گئے ہیں۔''
''میں تو اریب فاطمہ سے بات کر رہا تھا کہ عاشی تو بچی ہے۔ ایسے ہی بے سوچے سمجھے بول جاتی ہے۔''
''تو اور کیا۔ میری ماما آپ سے بالکل بھی جیلس نہیں ہوتی ہیں۔ آئیں چلیں اندر۔ بابا جان آپ کے لئے پریشان ہو رہے ہیں۔''
ایبک نے آہستہ سے اسے جانے کے لئے کہا۔
''آپ کہیں جا رہے ہیں ایبک بھائی؟'' عمر نے پوچھا۔
''ماما کی دوائیاں لینی تھیں اسٹور سے۔ اور دس پندرہ منٹ کا ایک اور کام ہے۔'' وہ بات کر کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا اور عمر، اریب فاطمہ کے ساتھ واپس انیکسی کی طرف جانے لگا۔

❁○❁

اس نے ٹیبل پر اپنا سامان رکھتے ہوئے کچھ دیر کے لئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ آج کا سارا دن بے حد مصروف گزرا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی سب لوگ انکل شیر دل کے گھر سے ڈنر کر کے نکلے تھے۔ بقول عمر احسان کے، آنٹی شیر دل نے زبردست ڈنر تیار کیا تھا۔ انکل مصطفیٰ اور ثنا آنٹی بھی ڈنر تک آ گئے تھے۔

''آنٹی! یہ اتنا سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' ہمدان نے کہا تو منیبہ نے اس کی بات اچک لی۔

''ہاں کچھ اگلے دنوں کے لئے رکھ لیتیں۔ کیونکہ ہم کو تو اب روز ہی آنا ہے، جب تک عمارہ پھپھو اور بابا جان یہاں ہیں۔''

مسز شیر دل بہت خوش تھیں۔

''مجھے آپ سب لوگوں کا آنا بہت اچھا لگا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہماری بے رنگ زندگی میں رنگ سا آ گیا ہے آپ لوگ روز آئیں......ڈنر ہر روز ہماری طرف۔''

وہ سب ہی کرنل شیر دل اور ان کی بیگم کے خلوص و محبت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

منیبہ کو بار بار افسوس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ پہلے کرنل شیر دل کی بیگم سے کیوں نہیں ملے۔

یونہی ہنستے مسکراتے ماحول میں کھانا کھایا گیا اور ایبک فلک شاہ کو بھی آج کا کھانا ہر روز کے کھانے سے کہیں زیادہ اچھا لگا تھا۔ آج اس نے اپنے ہوش میں پہلی بار ماما کو اس طرح کھل کر ہنستے دیکھا تھا۔

کاش بابا بھی اس ماحول کا حصہ ہوتے۔ کتنے اُداس اور کتنے اکیلے ہوں گے وہ وہاں۔ ایبک، فلک شاہ کے خیال سے اُداس ہو گیا تو اس نے سر جھٹک کر خود کو یقین دلایا۔

'ایک روز بابا بھی ضرور بابا جان سے ملیں گے، اِن شاءاللہ۔'

وہ سیدھا ہو کر بیٹھا اور ٹیبل پر پڑا کلپ بورڈ اٹھالیا۔

سب لوگ ڈنر کے بعد چلے گئے تھے۔ بابا جان دوا کھا کر سو گئے تھے اور کرنل شیر دل نے اس کے لئے میٹرس بھجوا دیا تھا جو اس نے سٹنگ میں بچھا لیا تھا۔ ماما بھی تھک گئی تھیں، اس لئے وہ انہیں سونے کی تلقین کرتا ہوا سٹنگ میں آ گیا تھا۔ لیکن خود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سو اس نے لکھنے کا سوچا تھا۔

''کیا ہی اچھا ہو، یہ کہانی جلد مکمل ہو جائے تو وہ ٹی وی کے لئے بھی ڈراما لکھ سکے۔ جس پر بہت پہلے ڈسکس کیا جا چکا تھا اور اس کا فلور بھی تیار کر لیا گیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، اسے لگتا تھا کہ یہ کہانی اس کی شاہکار کہانیوں میں سے ہوگی۔ اس لئے پہلے وہ یہ کہانی لکھنا چاہتا تھا اور پھر ڈرامے پر کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کلپ بورڈ اُٹھایا اور ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔ کلپ بورڈ کے اوپر لگے ہوئے کاغذوں پر نظر دوڑائی اور قلم اٹھایا اور لکھا۔

''اس نے ایک ناراض سی نظر مجھ پر ڈالی اور میری مٹھیوں سے اپنی اوڑھنی کا پلو چھڑانے کی کوشش کی۔

''نہیں، پلیز حورعین! اس طرح خفا ہو کر مت جاؤ۔ یہاں آؤ، بیٹھو اور مجھے بتاؤ اپنے متعلق...... اچھا، اپنے متعلق کچھ بھی مت کہو۔ زمین کے متعلق بتاؤ۔ میں بہت دھیان سے تمہاری بات سنوں گا اور بالکل بھی نہیں بولوں گا۔ لیکن بس تم میرے پاس بیٹھی رہو یہاں۔ بولتی رہو اور میں تمہیں سنتا رہوں۔''

وہ اب بھی شاکی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کی اوڑھنی کا پلو اب بھی میری مٹھی میں تھا۔

''زمین کے سینے پر اتنے زخم لگے ہیں کہ اگر میں تمہیں ایک ایک زخم دکھاؤں تو کئی صدیاں بیت جائیں۔''

''یہ زمین بھی تو صدیوں پرانی ہے حورعین!''

''ہاں، صدیوں پرانی۔'' ایک آہ کے ساتھ وہ وہیں بیٹھ گئی تھی اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا تھا۔ ''اچھا، میرا پلو تو چھوڑ دو۔''

''جی چاہتا ہے، اب تمہارا پلو پکڑا ہے تو زندگی کی آخری سانس تک پکڑے رکھوں۔''

''یہ تم شاعر ادیب بھی بس باتوں میں ماہر ہوتے ہو۔'' مسکراہٹ اس کے لبوں پر اس طرح طلوع ہوئی تھی، جیسے اُفق کے کنارے سے سورج کی پہلی کرن جھانکے۔ اُس کی پلکیں جھک گئی تھیں۔ لانبی گھنی پلکیں لرز رہی تھیں اور ان کا سایہ اس کے رخساروں پر اس طرح پڑ رہا تھا جیسے......

''جیسے اریب فاطمہ کے رخساروں پر۔' وہ چونکا۔

'اریب فاطمہ!' اُس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ 'یہ ایسی لڑکی ہے کہ اسے چاہا جائے۔ معصوم، شفاف اور...... مجھے لگتا ہے، کسی روز میں اس لڑکی کی محبت میں بہت شدت سے مبتلا ہو جاؤں گا۔'

'تو کیا اب بھی تم اس لڑکی سے محبت نہیں کرتے ہو؟' دل نے ہولے سے سرگوشی کی تھی۔

'شاید......'

'شاید نہیں، سچ مچ تم اس سے محبت کرتے ہو ایبک فلک شاہ! اُس روز سے جب تم نے پہلی بار اسے ''الریان'' میں منیبہ کے پیچھے چھپے بیٹھے دیکھا تھا اور وہ منیبہ کے کندھے کی اوٹ سے چپکے چپکے تمہیں دیکھتی تھی اور اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکتے تھے اور پلکیں جھک جاتی تھیں۔'

'شاید۔' وہ مسکرایا۔ 'شاید اسی روز اس نے میرے دل میں کہیں، کسی کونے میں جگہ بنالی ہو۔'

ہولے سے سر جھٹک کر اس نے پھر قلم اٹھالیا تھا۔ 'تو میں کیا لکھ رہا تھا؟'

اس نے ایک نظر اپنے لکھے پر ڈالی اور پھر تیزی سے اس کا قلم چلنے لگا۔

''اور زمین کے آنسو تو کبھی خشک ہی نہیں ہوئے۔ ایک کے بعد ایک زخم، ایک نیا چرکا، ایک نیا دکھ۔ اور زمین تو شاید بنی ہی رونے کے لئے ہوئی تھی...... اس کا اور آنسوؤں کا تو ازلی ساتھ ہے۔ تم تو شاعر ہو، ادیب ہو، مصنف ہو۔ تم نے تو تاریخ کے اوراق کھول کر دیکھے ہوں گے۔ تمہیں تو ان موتیوں کی قیمت کا اندازہ ہوگا، جو اس بدنصیب کی آنکھوں سے ہمیشہ بہتے رہے۔''

''تم زمین کے لئے اتنی دُکھی کیوں ہوتی ہو؟'' میں اُس کی آنکھوں کے کٹوروں کو پانیوں سے بھرتا دیکھ رہا تھا۔

''اس لئے کہ میرا اور زمین کا ازلی رشتہ ہے۔ ہمارے دکھ بھی سانجھے ہیں اور خوشیاں بھی۔

میں تو زمین کی طرح صدیوں سے رو رہی ہوں، جب میری کوکھ اُجاڑی گئی۔ جب دو ہاتھوں نے مجھے زندہ گڑھے میں ڈال کر اوپر مٹی ڈالی تو میری ننھی چیخیں صرف زمین سنتی تھی اور اپنے ماتا بھرے ہاتھوں سے مجھے تھپکتی تھی۔ لیکن تم دیوانے شاعر، تم کیا جانو زمین کے دکھ۔''

آنکھوں کے کٹورے چھلک پڑے تھے۔

''تمہیں تو لب و رخسار کے قصے کہنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ تم تو بس محبت کی جھوٹی کہانیاں لکھو۔ حالانکہ تم تو خود محبت کے میم کے بھی معنی نہیں سمجھتے، پوری محبت کا ادراک کیسے کرو گے؟''

اُس نے نظریں جھکالیں۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا جو بھیگتا جا رہا تھا۔

وہ جب جب زمین پر لگنے والے زخموں کا ذکر کرتی تھی، اس کا پورا وجود جیسے کسی اذیت سے تڑپتا تھا۔

''سنو! مجھے اب جانے دو۔ اور تم اپنے خیالی محبوب کے تصور سے اپنی بزم سجاؤ اور اس کے لب و رخسار کی کہانیاں لکھو۔'' وہ اُٹھنے لگی تھی۔ لیکن میں نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ میری اس جسارت پر وہ جز بز ہوئی لیکن اپنا ہاتھ چھڑا کر چلی گئی۔''

''ٹک......ٹک......''

ایبک نے چونک کر قلم رکھ دیا اور سامنے دیکھا۔ کلاک نے دو بجائے تھے۔ اس نے لکھے ہوئے آخری صفحے کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اسے نیچے رکھا۔ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے ہلکا سا دبایا اور پھر قلم اُٹھایا۔

آج اس نے کافی لکھ لیا تھا۔ اور لکھتے ہوئے اس کا قلم ایک بار بھی نہیں رکا تھا۔ ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اس نے لکھے ہوئے کاغذوں پر ایک نظر ڈالی اور مزید لکھنے کا ارادہ ترک کر کے کاغذوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے اس نے ایک سرسری نظر ان پر ڈالی۔

اور یوں ہی ایک صفحہ پڑھنے لگا۔

''اور اس روز جب مکے کی گلیوں میں گزرتے ہوئے بوڑھی عورت نے کوڑا پھینکا تھا اور جس روز طائف والوں نے پتھر برسائے تھے تو کیسے کیسے زمین کا جی چاہا تھا کہ وہ دھنس جائے، مارے شرمندگی کے۔ اور کبھی ظاہر نہ ہو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم باغ میں ہاتھ اٹھائے اہلِ طائف کے لئے دعائیں کرتے تھے کہ یا اللہ! انہیں بصیرت عطا کر، یہ نا سمجھ ہیں۔ تو زمین اُن کی تار تار اوڑھنی اور زخمی پاؤں دیکھ کر تڑپ تڑپ کر روتی تھی، کُرلاتی تھی اور ان پاکیزہ مقدس قدموں پر نثار ہوتی تھی۔ اور جب شعب ابی طالب میں وہ سب درختوں کے پتے کھاتے تھے، اللہ سے صبر وشکر کی دعا کرتے تھے تو زمین کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اپنا سینہ چیر کر ان کے لئے پھلوں اور اناج کے ڈھیر لگا دے۔ بس وہ آنسو بہاتی تھی اور روتی تھی۔ مریم کی طرح۔

''یہ مریم کا ذکر، زمین کے ذکر میں کہاں سے آ گیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''مریم کے ذکر کو زمین کے ذکر سے الگ تو نہیں کیا جا سکتا نا۔ لیکن تم کیا سمجھو گے، خوابوں اور خیالوں میں رہنے والے اور زمین کی ملکیت پر فخر کرنے والے۔ تم زمین کو اپنی ملکیت کیوں سمجھتے ہو؟''

''اسے چھوڑو۔ تم بتاؤ، مریم کون ہے؟'' مجھے تجسس ہو رہا تھا۔

''مریم!'' اس نے اپنے لبوں پر زبان پھیری تھی۔ ''مریم نے صدیوں پہلے جنم لیا تھا۔ یوں سمجھ لو، اس زمین کے ساتھ ہی اس کا جنم ہوا تھا اور زمین پر پہلا قتل بھی اسی کی وجہ سے ہوا۔ چاہے تم اسے کوئی نام، کوئی روپ دے دو۔

کبھی وہ بے نام ہوتی ہے۔

زندہ دفن کر دی جانے والی۔

کبھی وہ شوہر کی چتا پر جل جانے والی ہوتی ہے۔

کبھی اس کے گلے میں طوق ڈال دیا جاتا ہے۔

کبھی وہ کنیز ہوتی ہے، بادشاہوں کا دل بہلانے والی۔ اور کبھی بازار میں بیٹھ کر گانے والی۔

کبھی شوہر کی جوتیاں کھا کر بھی اس کے در کو نہ چھوڑنے والی۔

کبھی ونی اور کبھی سوارہ بننے والی۔

لیکن یہ کس مریم کا میں نے ذکر کیا ہے نا، یہ چک فیروز شاہ کے چودھری، غلام فرید کی بیوی تھی۔ جس کی پانچ بیٹیاں تھیں اور جو روتی تھی زمین کی طرح اور اللہ سے صبر وشکر کی دعا کرتی تھی۔''

ایبک کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

'لگتا ہے میں کچھ ایسا لکھنے میں کامیاب ہو رہا ہوں جو شاہکار کہلایا جا سکے۔'

اس نے تمام کاغذ ترتیب سے فائل میں رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اڑھائی بج رہے تھے۔ وہ میٹرس پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

''لے سنگ لاتے ویلاتر...... Le songlot de la terra''

''زمین کی سسکیاں۔''

''آہ! پاؤلن لیکولی...... بدقسمت ماں۔''

وہ ہولے سے ہنسا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نیند دور دور تک آنکھوں میں نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ ایک بار

اُٹھ کر لکھنا شروع کر دے۔ لیکن اب لکھنے کا موڈ نہیں رہا تھا۔

پتہ نہیں، ژل لافورگ (Zhil Laforg) کی ''زمین کی سسکیاں'' شاہکار قرار دی گئی تھیں یا نہیں۔ لیکن ایبک فلک شاہ کی ''زمین کے آنسو'' کو ایک شاہکار ہونا چاہئے۔ ایسی کتاب، جو اس کی پچھلی تمام کتابوں کو پیچھے چھوڑ دے۔ میں صبح اس سارے لکھے گئے کو دوبارہ پڑھوں گا اور اسے پھر سے لکھوں گا۔

اسے دوبارہ لکھنے کی عادت نہ تھی۔ وہ ایک بار ہی لکھتا تھا۔ بعض اوقات تو وہ اپنے لکھے ہوئے کو دوبارہ پڑھتا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس بار وہ غلطی کی گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

جب کوئی تحریر چھپ کر آتی تھی، کئی بار تو اسے دیکھ کر اسے احساس ہوتا تھا کہ اسے لکھنے کے بعد اسے ایک دفعہ پڑھ لینا چاہئے تھا۔ اور اگر وہ پڑھ لیتا تو اس موضوع پر زیادہ بہتر لکھ پاتا۔ لیکن وہ ہمیشہ ہی وقت کی کمی کا شکار رہتا تھا۔ لیکن اس بار وہ جب تک مطمئن نہیں ہوگا، اس تحریر کو چھپنے کے لئے نہیں دے گا۔ اسے اپنی فرانسیسی زبان پڑھانے والی ٹیچر پاؤلن لیکولی کا خیال آیا۔ پتہ نہیں، وہ اب بھی وہاں اس انسٹیٹیوٹ میں ہوگی یا اپنے وطن چلی گئی ہوگی۔ ان دنوں جیسے دوسری زبانیں سیکھنے کا فیشن چل نکلا تھا اور اس کے کتنے ہی کلاس فیلولڑکے اور لڑکیاں جرمن اور فرنچ زبان سیکھ رہے تھے۔ وہ بھی فرنچ سیکھنے لگا تھا۔

پاؤلن لیکولی...... وہ سنہرے بالوں اور بھوری آنکھوں والی اس کی ٹیچر...... وہ صبح ضرور جا کر پتہ کرے گا۔ کیا پتہ وہ اب بھی وہیں ہو۔ اور پھر وہ اس سے ژل کے متعلق کچھ اور جاننے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس کی نظمیں پڑھ کر دیکھے گا اور پاؤلن کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ اسے اپنا شاہکار تخلیق کرنے کے لئے کچھ محنت کرنی چاہئے۔

اس نے کروٹ بدلتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

❁○❁

''بابا...... بابا! وہ آ رہے ہیں۔ پہنچ گئے ہیں ایئر پورٹ پر۔'' انجی بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔ ''ابھی جواد کا فون آیا ہے۔''

فلک شاہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ انہوں نے انجی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

''بابا! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' انجی پریشانی سے انہیں دیکھنے لگی۔ انہیں خاموش دیکھ کر گھبرا کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

''مجھے پورچ تک لے چلو۔''

''نہیں بابا! ہم یہیں پر ان کا استقبال کریں گے۔'' انجی گھبرا گئی۔ وہ رات سے ان کی کیفیت دیکھ رہی تھیں۔ کہیں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کی طبیعت خراب ہوگئی تو۔

''باہر...... سردی ہے بابا!'' انجی نے کہا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

انہوں نے اپنی کرسی کی پشت پر سر ٹیکتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں اور دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن کر گزر رہا تھا۔

بالآخر یہ لمحے گزر گئے تھے۔ گیٹ پر ہارن کی آواز آئی تی۔ پھر گیٹ کھلنے کی آواز پر انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ انجی تیزی سے اندرونی گیٹ کھولنے کے لئے جا رہی تھی۔ انہوں نے سختی سے دانتوں پر دانت جما لئے تھے اور دل پر ہاتھ رکھے آگے کو جھک گئے تھے۔ ایبک، بابا جان کا ہاتھ تھامے سب سے پہلے لاؤنج میں آیا تھا اور اس کی نظر آگے کی طرف فلک شاہ پر پڑی تھی۔

بابا جان کا ہاتھ جواد کے ہاتھ میں دیتے وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔

''بابا!...... بابا!''

انہوں نے ایبک کی آواز سنی تھی۔ سر اٹھا کر اسے دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ کچھ بول نہیں سکے تھے۔ انہوں نے بابا جان کو بے قراری سے اپنی طرف آتے دیکھا تھا لیکن وہ اُٹھ کر، دوڑ کر ان کے گلے نہیں لگ سکتے تھے۔ انہوں نے بے بسی سے اپنی ٹانگوں کو دیکھا، جنہوں نے برسوں پہلے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ انہیں سہارا دینے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ 1979 تھا جب ایک رات اُنہیں گرفتار کر لیا گیا تھا، ملک میں فتنہ وشر پھیلانے کے الزام میں۔ کوٹ لکھپت جیل اور پھر شاہی قلعے میں ان پر جو بھی گزری تھی، وہ اذیت کی ایک داستان تھی۔ لیکن وہاں سے نکل کر وہ کن لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے، وہ آج تک نہیں جانتے تھے۔ شاید یہ وہی لوگ تھے، جنہوں نے حق نواز کو مارا تھا...... یا پھر کوئی اور...... وہاں جو تشدد ان پر ہوا، اپنی طرف سے تو وہ انہیں مار کر ہی پھینک گئے تھے۔ لیکن زندگی دینے والے نے انہیں زندگی دے دی تھی۔ مگر پھر اس کے بعد وہ اپنے قدموں پر کھڑے نہ ہو سکے تھے۔

بابا جان اُن کے قریب آئے تھے۔ انہوں نے اُن کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر چوما تھا۔ ان کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ لیکن وہ ایک سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ بابا جان روتے ہوئے ان کے ماتھے کو، ان کے رخساروں کو چوم رہے تھے۔

''یہ تم نے کیا کر لیا مومی! اسی لئے منع کرتا تھا۔ اسی لئے سمجھاتا تھا، مت اس سیاست کے کھیل میں پھنسو۔ یہاں سیاست تھوڑی ہوتی ہے؟ اس ملک میں تو......''

''بابا جان!'' وہ اُن سے معافی مانگنا چاہتے تھے، لیکن ان کے ہونٹوں سے آواز نہیں نکلی تھی۔ بس انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''مومی!'' بابا جان نے تڑپ کر ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومے تھے، آنکھوں سے لگائے تھے۔ ''ان ظالموں نے تمہارے ساتھ یہ کیا، کیا؟...... کیوں کیا؟''

''بابا جان!'' ان کے منہ سے نکلا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ ان کے گرد حمائل کر کے وہ بلک بلک کر رونے لگے تھے۔ ان کی کرسی کے پاس کھڑے بابا جان نے ان کا سر اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور وہ ان کے دامن میں منہ چھپائے، بازو ان کی ٹانگوں کے گرد حمائل کئے روئے جا رہے تھے۔

''بابا جان! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے بہت ظلم کیا اپنے ساتھ، عمارہ کے ساتھ، آپ کے ساتھ۔''

''بس کرو مومی بیٹا!...... بس کرو اب۔'' انہوں نے آہستگی سے ان کے بازوؤں کو الگ کیا۔ ''ہم نے بھی غلطیاں کیں۔ ہم بھی قصور وار ہیں۔ ہم نے دوسروں کے کانوں سے سنا اور دوسروں کی آنکھوں سے دیکھا۔ ورنہ کوئی درمیانی راستہ نکالا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ جدائیاں نصیب میں تھیں۔''

''بابا جان! پلیز...... آئیں ادھر بیٹھیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' ایبک نے انہیں اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے کہا۔

''کہاں لے چلے ہو مجھے؟ یہاں اپنے مومی کے پاس بیٹھنے دو۔''

''کہیں نہیں بابا جان! یہ آپ ادھر صوفے پر ایزی ہو کر بیٹھ جائیں اور ماما! آپ بھی۔ میں بابا کی چیئر ادھر ہی لے آتا ہوں۔''

بابا جان کو صوفے پر بٹھا کر فلک شاہ کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے تھوڑا سا جھک کر فلک شاہ سے کہا۔

''بابا پلیز! اب نہیں رونا آپ نے۔'' اور پھر خود ہی ایک ہاتھ سے ان کے آنسو صاف کئے۔

''بابا! آپ کو پتہ ہے نا، بابا جان کی اور ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کے اس طرح رونے سے وہ ڈپریس ہو جائیں گے۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آج بابا جان آئے ہیں، کل باقی سب بھی آ جائیں گے، اِن شاء اللہ۔''

''اب جب عمر کی نقدی ختم ہوا چاہتی ہے آبی!...... جب زندگی کے چھبیس سنہرے سال سب کی جدائیاں سہتے گزر

گئے، اب؟'' اُن کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔
''اور اگر اب بھی یہ جدائیاں ختم نہ ہوتیں تو؟'' ایبک نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
''تو یہ حسرت دل میں لے کر قبر میں اُتر جاتا کہ......''
''تو پھر بابا! خوش ہو جائیں نا کہ اب بھی اللہ نے کرم کیا۔'' وہ ہولے ہولے کہتا اُن کی کرسی دھکیلتا، بابا جان کے قریب لے آیا تھا۔
''مومی!'' بابا جان نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''کیسے جی لیا تم نے ''الریان'' کے بغیر؟...... کیسے گزارے اتنے سال؟''
''عمو سے پوچھیں بابا جان! کیسے گزارے۔'' ان کی آواز بھرّا گئی تھی۔
اور عمارہ نے ایک بار نہیں، کئی بار بتایا تھا۔
''مومی نے تو ایک ایک پل ''الریان'' کو یاد کیا ہے اور ان چھبیس سالوں میں اتنے آنسو بہائے ہیں کہ سمندر بھر جاتے۔''
وہ کتنی ہی دیر تک سکتے کے عالم میں فلک شاہ کی وہیل چیئر کو دیکھتے رہے تھے۔
''کب ہوا یہ حادثہ؟ مجھے کسی نے بتایا کیوں نہیں؟...... کبھی ہمدان نے بھی ذکر نہیں کیا، میرا مومی معذور......''
''مومی نے منع کیا تھا بتانے سے۔'' عمارہ نے نظریں جھکائیں۔
وہ تقریباً دو سال بعد بہاول پور سے آئے تھے اور کرنل شیر دل کے گھر ہی ٹھہرے تھے۔ دو سال انہیں سنبھلنے میں لگے تھے پھر بھی جب وہ کرنل شیر دل کے گلے لگے تھے تو پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے، جیسے لاہور میں قدم رکھتے ہی سارے زخم تازہ ہو گئے تھے۔ اس رات انہوں نے حق نواز کو بھی یاد کیا تھا، جو ناحق مارا گیا تھا۔
اور وہ رات تو جیسے ان کے دل پر کندہ تھی، جب انہوں نے اپنے لئے ''الریان'' کو شجرِ ممنوعہ بنا دیا تھا۔ اس روز شیر دل کے ساتھ وہ سر الطاف کی طرف گئے تھے۔ سر الطاف بہت افسردہ تھے۔
''یہ صحیح نہیں ہوا۔ بالکل بھی صحیح نہیں ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ پہلے اسے انصاف کے کٹہرے میں لایا جاتا، اس پر فردِ جرم عائد کی جاتی۔ ثبوت دکھائے جاتے۔ پھر بھی یہ ظلم ہوا ہے فلک شاہ!...... بے شک میں اس کی پارٹی کا رُکن نہیں تھا۔ لیکن میں ظالم کی حمایت نہیں کر سکتا۔ میں ظلم کا حامی نہیں ہوں۔ تم تو اس کی پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔''
''ہاں، حق نواز کی وجہ سے۔ وہ اپنی صحافی دوست کے اغوا سے بہت دل برداشتہ تھا۔ ورنہ پارٹی سے ہمیں کئی اختلافات تھے۔''
''اتنا بڑا سانحہ ہو گیا۔ کیا کسی نے احتجاج نہیں کیا؟...... جلوس نہیں نکالے؟''
''اتنے بڑے پیمانے پر نہیں۔ شاید لوگ خوف زدہ ہیں۔ حالانکہ اپوزیشن اور مخالف لیڈر کو بھی یہ پھانسی دیا جانا پسند نہیں آیا۔'' سر الطاف نے انہیں بتایا تھا۔
''ان کے کارکنوں کو کچھ تو کرنا چاہئے تھا۔ کوئی احتجاج، کچھ تو......''
پھر پتہ نہیں، انہیں کیسے اس کی آمد کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے، اپنے دفتر میں۔ وہ سب احتجاج کرنا چاہتے تھے۔ ایک بڑا جلوس نکالنے کی تیاری کر رہے تھے کہ فلک شاہ کو ان کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ تب شیر دل کیسے مارا مارا پھرا تھا۔ کتنی کوششیں کی تھیں جب اسے کوٹ لکھپت سے قلعے میں منتقل کیا گیا تھا۔ اور جب شیر دل کسی بہت اونچی سفارش کے ساتھ قلعے پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ اسے تو کل صبح ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ لیکن پھر پورے ایک دن بعد بالکل حق نواز کی طرح انہیں کوئی کرنل شیر دل کی کوٹھی کے باہر پھینک گیا تھا۔ ان کی ٹانگیں کچل دی گئی تھیں۔
''بس کرو خدا کے لئے شیر دل!...... بس کرو۔ مزید سننے کی تاب نہیں ہے مجھ میں۔'' بابا جان رو پڑے تھے۔ فلک شاہ

کی وہیل چیئر دیکھ کر انہیں شیر دل کی زبانی اپنے موی پر ہونے والے ظلم کی داستان پھر سے یاد آ گئی تھی۔ پتہ نہیں چھبیس سال کیسے گزار لئے تھے انہوں نے اس بے خبری میں۔ اور انہوں نے مصطفیٰ یا عثمان سے بھی نہیں پوچھا تھا اور نہ ہی احسان شاہ کی ناراضی کا خیال کیا تھا۔ بس مصطفیٰ کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ بہاول پور جا رہے ہیں، موی سے ملنے۔

''ابھی آپ کی طبیعت کچھ اور سنبھل جاتی تو میں آپ کو لے جاتا، بابا جان!''

لیکن انہوں نے مصطفیٰ کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

'چھبیس سالوں میں تو تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ مجھے میری عمو اور موی کے پاس لے جاؤ۔ تم نے کبھی ان فاصلوں کو پاٹنے کی کوشش نہیں کی جو خود بخود ہی بنتے چلے گئے تھے۔'

انہوں نے دل ہی دل میں سوچا ضرور تھا لیکن مصطفیٰ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس رات کے بعد بیچ میں صدیوں کے فاصلے حائل ہو گئے تھے۔

وہ رات کیسے گزری تھی؟ انہیں خبر نہیں تھی۔

غصے میں اس نے سوچا تک نہیں کہ وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ انہوں نے کتنی ہی بار اماں جان سے کہا تھا اور وہ تو خود پوری رات روتی رہی تھیں۔

'میں نے غصہ کیا تھا..... ڈانٹا تھا۔ بزرگ تھا۔ اس کے باپ کی جگہ تھا۔ میں غصے میں تھا تو وہ ہی خاموش ہو جاتا۔ یہ غضب نہ ڈھاتا۔'

رات آنکھوں میں کٹی تھی اور صبح وہ فجر کے لئے نکلے تو سیدھے ملک ہاؤس جا پہنچے۔ وہاں تالا لگا ہوا تھا۔

'کہاں چلے گئے آخر دونوں اتنی صبح؟'

انہوں نے سوچا تھا۔ پھر اس روز انہوں نے دو تین چکر لگائے تھے۔ ان کا گھر مقفل تھا۔ تب انہوں نے مصطفیٰ کو فون کر کے ساری حقیقت بتا دی تھی۔ اور جب وہ مصطفیٰ سے بات کر رہے تھے تو احسان شاہ اندر خاموشی سے آ کر بیٹھ گئے تھے اور انہیں مصطفیٰ سے بات کرتے سنتے رہے تھے۔ اور جب وہ بات کر چکے تھے تو احسان شاہ نے کہا تھا۔

''بابا جان! اس گھر کے دروازے خود موی نے اپنے اوپر بند کر لئے ہیں۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میں خود اس کا آنا بند کر دیتا۔''

انہوں نے حیرانی سے احسان شاہ کو دیکھا تھا۔

''وہ یہاں نہیں آ سکتا۔ اور نہ ہی ''الریان'' کا کوئی فرد ان سے کوئی تعلق یا رابطہ رکھے۔''

''کیوں رابطہ نہ رکھے احسان شاہ!...... وہ کوئی غیر تو نہیں ہے۔ ہماری عمارہ کا شوہر ہے۔ ٹھیک ہے، وہ جذباتی ہے، غصیلا ہے۔ میں نے کبھی اس طرح اس سے بات نہیں کی تھی اتنے غصے سے اور ناراضی سے تو وہ برداشت نہیں کر سکا اور فضول اور غلط بول دیا۔ میں جاؤں گا کل خود مفتی صاحب کے پاس، مسئلہ پوچھوں گا۔''

''بابا جان! میں نے آپ سے کہا نا کہ وہ خود یہ نہ کرتا تو میں منع کر دیتا اُسے یہاں آنے سے۔''

''لیکن کیوں احسان شاہ!...... کیوں؟...... کیا، کیا ہے موی نے؟''

''بہتر ہے بابا جان! آپ کچھ مت پوچھیں۔ جو بھرم ہے، اسے رہنے دیں۔''

اور اپنی بات مکمل کر کے احسان شاہ وہاں رکا نہیں تھا بلکہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا اور وہ سوچتے ہی رہ گئے تھے کہ آخر احسان کو کس بات پر اتنا غصہ ہے۔ شاید کسی بات پر موی سے ناراض ہے اور احسان شاہ کی بچپن سے عادت تھی کہ وہ بڑی سے بڑی بات پر بھی ناراض ہوتا تھا، نہ برا مانتا تھا۔ لیکن اگر کبھی کسی بات پر ناراض ہو جاتا تو پھر سخت ناراض ہوتا تھا۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ موی سے زیادہ عرصہ تک وہ ناراض نہیں رہ سکتا۔ اور پھر اگلے دو تین دن احسان شاہ کے منع کر لینے کے باوجود بھی انہوں نے ملک ہاؤس کے چکر لگائے تھے اور مفتی صاحب کے پاس جا کر بھی اس مسئلے کو ڈسکس کیا تھا اور

[illegible] صاحب کے بتانے کے بعد کہ اب کوئی صورت نہیں، وہ اور بھی دل برداشتہ ہوئے تھے۔ لیکن دل میں یہ اُمید تو تھی [illegible] وہ نہیں، ہم تو ملنے جاسکتے ہیں۔

انہوں نے کتنی ہی بار بہاول پور فون کیا تو پتہ چلا، وہ وہاں نہیں ہے۔ آخر دونوں کہاں چلے گئے۔ پریشان ہوکر وہ پھر احسان کے پاس ہی آئے تھے۔ "الریان" میں صرف وہی تو تھے اس وقت۔

"یہیں اسی شہر میں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"کیسے پریشان نہ ہوں احسان! غصے میں کچھ کر نہ بیٹھا ہو وہ۔ خدا کے لئے بیٹا! اُس کا پتہ کرو۔"

"کچھ نہیں کیا اس نے بابا جان! آیا تھا میرے آفس میں مجھ سے ملنے۔ میں نہیں ملا۔"

"کیوں نہیں ملے تم اس سے؟"

"میں اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ آج، نہ پھر کبھی زندگی میں۔ اور عمارہ کا فون آیا تھا میرے پاس۔ میں نے اس [illegible] کہہ دیا ہے کہ ایک کو چھوڑ کر آجاؤ۔ لیکن اگر اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تو لے آؤ اسے بھی۔ "الریان" کے دروازے اس [illegible] لئے کھلے ہوئے ہیں۔"

"وہ کیسے آسکتی ہے یہاں؟ تم کیا کہہ رہے ہو، اس کا مطلب سمجھتے ہو؟ وہ اگر یہاں قدم رکھے گی تو اسے طلاق ہو [illegible] جائے گی۔"

"سمجھتا ہوں بابا جان! اسے کسی ایک کو تو چھوڑنا ہوگا۔ ہمیں یا موی کو۔"

"درمیانی راستہ بھی نکالا جاسکتا ہے بیٹا!...... یہ جو غلطی موی نے کی ہے، اس کا ازالہ تو نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہم انہیں [illegible] تو نہیں چھوڑ سکتے۔ ملنے جاسکتے ہیں۔"

"نہیں، آپ کیسے ملنے جاسکتے ہیں؟ موی نے کہا تھا کہ وہ یا ان کی بیوی اگر "الریان" میں آئی یا ہم لوگوں سے [illegible] تو......"

یہ مائرہ تھی جو وہیں بیٹھی اُن کی اور احسان کی گفتگو سن رہی تھی۔

"نہیں، نہیں۔" انہوں نے فوراً بات کاٹی تھی۔ "موی نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اس سے ملنے کی بات ہرگز نہیں کی [illegible]۔"

انہیں پورا یقین تھا، لیکن پھر مائرہ نے اتنی بار اس بات کو دہرایا کہ انہیں یقین سا ہونے لگا۔ "لیکن اس روز جب زارا [illegible] تھی اور اس نے رو رو کر عمارہ کے پاس جانے کی التجا کی تھی تو وہ یکدم ہی تیار ہوگئے تھے بہاول پور جانے کے لئے اور [illegible] موی کا کہا ایک ایک لفظ یاد آگیا تھا...... اور اماں جان نے بھی اس کی تصدیق کی تھی۔ تب احسان شاہ نے وہ بات [illegible] دی تھی کہ وہ ششدر سے ہوکر رہ گئے تھے۔

"عمارہ نے ہمارے بجائے موی کا انتخاب کیا ہے۔ یہ اس کی اپنی چوائس ہے...... لیکن "الریان" سے اگر کوئی شخص [illegible] یا عمارہ سے ملنے جائے گا تو میں قسم کھاتا ہوں کہ اسی وقت خود کو اور مائرہ کو ختم کردوں گا۔"

اتنی نفرت، اتنا غصہ۔

وہ حیرت سے احسان شاہ کو دیکھتے رہ گئے۔

"آخر ایسا کیا کر دیا ہے اس نے احسان شاہ! مجھے بتا کیوں نہیں دیتے؟" انہوں نے بے بسی سے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں بابا جان! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اس بات پر پردہ ہی پڑا رہنے دیں۔"

اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئے تھے۔ زارا روتی ہوئی چلی گئی تھی۔ کتنے سارے دن یوں ہی گزر گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں [illegible] نہیں آتا تھا۔ ان کے پاس تو کسی کا فون تک نہیں آیا تھا۔ نہ عمارہ کا، نہ موی کا۔ وہ کتنی ہی بار ملازموں سے پوچھتے [illegible] کوئی فون تو نہیں آیا؟ تب زارا کا فون آیا تھا۔ وہ نجیب کے ساتھ بہاول پور کا چکر لگا آئی تھی۔

''عمارہ اور موی بھائی بہاول پور آ گئے ہیں۔'' اس نے انہیں اطلاع دی تھی۔

''دونوں کی حالت بہت خراب ہے بابا جان! پلیز آپ اور اماں جان جا کر اُنہیں مل آئیں۔ بہت روتے ہیں موی بھائی۔ عمو آپی سے بھی زیادہ ان کی حالت بری ہے۔ بابا جان! پلیز ان کی غلطی کو معاف کر دیں اور ان سے تعلق مت توڑیں۔ آپ ان کے ساتھ ہوں گے تو انہیں یہ غم سہارنے کی طاقت ملے گی۔ ''الریان'' چھوڑنے کا غم بہت بڑا ہے۔ آپ لوگوں نے بھی چھوڑ دیا تو کیسے سہیں گے؟''

تب انہوں نے کتنی بے چینی سے بہاول پور کا نمبر ملایا تھا۔

''عمارہ یا موی سے بات کروا دو۔''

''جی عمارہ بی بی تو ہاسپٹل گئی ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر تک آ جائیں گی۔ آپ پھر فون کر لینا۔''

''عمارہ ہاسپٹل گئی ہوئی ہے۔'' انہوں نے اماں جان کو بتایا تھا، جو پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

''ہاں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں کب سے کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر کے پاس چلی جائے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

اور پھر دوبارہ فون کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ مائرہ نے شاید احسان شاہ کو بتایا تھا فون کے متعلق۔ تب ہی وہ ان کے کمرے میں چلے آئے تھے۔

''بابا جان! میں نے کہا تھا ''الریان'' سے کوئی رابطہ نہیں کرے گا۔ نہ ملے گا ان دونوں سے۔''

''یہ رشتے ٹوٹنے والے تو نہیں بیٹا!...... بیٹی ہے وہ ہماری۔ ایک حماقت اس نے کی ہے۔ دوسری اب ہم کریں گے۔''

''احسان نے قسم کھائی ہے بابا جان! وہ......'' مائرہ نے آہستگی سے کہا تھا۔

''قسم کا کفارہ بھی ادا کیا جا سکتا ہے بیٹا! احسان نے بھی غصے میں کہہ دیا ہے۔ اب......''

''میں نے غصے میں بات نہیں کی تھی، سنجیدگی سے کہا تھا۔ اور میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ اگر آپ، اماں جان یا کوئی اور یہاں سے مراد پیلس گیا تو میں ابھی اسی وقت خود کو شوٹ کر لوں گا۔''

انہوں نے جیب سے اپنا پستول نکال لیا تھا۔

''یہ کیا حماقت ہے احسان شاہ!' وہ یکدم گھبرا اُٹھے۔ ''ڈالو اسے جیب میں۔ خوامخواہ کیوں اُٹھا لائے ہو اسے؟''

''خوامخواہ نہیں بابا جان!...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ ان سے تعلق رکھیں، ملیں...... لیکن اس سے پہلے میری لاش سے گزر کر جایئے گا۔''

اور وہ تو جیسے ڈھے سے گئے تھے۔

''جاؤ احسان! اپنے کمرے میں اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' اس روز اماں جان کے آنسو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں تھے تھے اور خود انہوں نے رات جاگ کر گزاری تھی۔

''مصطفیٰ! خدا کے لئے جلدی آ جاؤ۔'' انہوں نے مصطفیٰ کو فون کیا تھا۔

لیکن ان کے آنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ احسان شاہ نے مصطفیٰ کی بھی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ ان کی ایک ہی بات تھی۔ میری اور مائرہ کی موت کے بعد۔

مصطفیٰ بھی خاموش ہو گئے تھے۔

''بابا جان! کچھ عرصے بعد احسان کا دل موم ہو جائے گا۔ ابھی تو سختی سے اپنی بات پر اڑا ہوا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ وہ ایسا کر بھی گزرے گا۔ یاد ہے نا، بچپن میں اس نے ضد میں آ کر ٹیرس سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔''

''لیکن کیوں؟...... احسان ایسا کیوں کر رہا ہے مصطفیٰ؟''

''بابا جان! اس سلسلے میں وہ کچھ نہیں کہتا۔ ہمارے لئے اس وقت سب سے اہم احسان کی زندگی ہے۔ کچھ عرصے بعد ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ حوصلہ رکھیں۔''

لیکن وہ کچھ عرصہ چھبیس سالوں پر محیط ہو گیا تھا۔ انہوں نے اماں جان کی بیماری پر کتنی ہی بار مائرہ سے کہا تھا۔
''عمو کو فون کر دو۔ اسے ماں کی بیماری کا بتا دو۔ وہ بیٹی سے اپنے ان آخری لمحوں میں ملنا چاہتی ہے۔ وہ ''الریان'' نہیں آ سکتی لیکن ہاسپٹل میں تو آ سکتی ہے۔''
لیکن اماں جان جب بھی ہوش میں آتیں، عمارہ کا پوچھتیں۔ پتہ نہیں، مائرہ نے فون بھی کیا تھا یا نہیں۔ تب انہوں نے احسان شاہ سے کہا تھا۔
''شانی بیٹا! اپنی مرتی ہوئی ماں کی آخری خواہش پوری کر دو۔ عمارہ کو لے آؤ اپنی ماں سے ملانے کے لئے۔'' انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔
''یہ کیا کر رہے ہیں بابا جان!'' احسان شاہ نے ان کے ہاتھ تھام لئے تھے۔
''میں مائرہ سے کہتا ہوں، وہ بہاول پور فون کر کے عمارہ کو بتا دے گی، اماں جان کی بیماری کا۔ اور کہہ دے، اسے لے کو ہاسپٹل میں۔ لیکن اکیلی آئے۔ موی ساتھ نہ ہو اس کے۔''
اور تب مائرہ نے انہیں بتایا تھا کہ اس نے دو بار عمارہ کو فون کیا تھا۔ لیکن عمارہ نے بتایا ہے کہ اسے موی نے اجازت نہیں دی آنے کی۔
''نہیں۔'' وہ کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے مائرہ کو دیکھتے رہے تھے۔ ''موی ایسا نہیں ہے۔''
''وہ کیسا ہے بابا جان! آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' احسان شاہ نے آہستگی سے کہا تھا لیکن انہوں نے سن لیا تھا۔ ''اور عمارہ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ موی نے اسے اجازت نہیں دی ہو گی۔''
اور وہ خاموش ہو گئے تھے۔ اور پھر جب وہ وفات پا گئی تھیں، تب بھی انہوں نے مائرہ کی منت کی تھی۔
''اسے اطلاع کر دو، اپنی ماں کا آخری بار منہ تو دیکھ لے۔''
اور مائرہ نے بتایا تھا کہ اس نے بتا دیا ہے لیکن وہ نہیں آئی تھی۔
جنازہ کی نماز پڑھتے ہوئے، قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے بھی انہیں انتظار تھا کہ وہ آ جائیں گے۔ موی اتنا شقی القلب نہیں ہو سکتا کہ عمارہ کو اس کی ماں کی موت پر بھی نہ آنے دے۔ مگر......
اور پھر اس روز کے بعد انہوں نے احسان یا مائرہ سے کبھی موی اور عمارہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ زارا اُن سے آ کر کتنا روئی تھی۔
''اماں جان، عمو آپی اور میں بھی اس کے لئے آپ کو معاف نہیں کروں گی۔''
اماں جان کی حسرت بھری نظریں...... دروازے کی طرف آخری لمحوں تک دیکھتی اور ان سے سوال کرتی نظریں۔ وہ بھی بھلا نہیں پائے تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مائرہ نے عمارہ کو فون نہیں کیا ہو گا۔ عمارہ کا اماں جان کی بیماری اور موت کا سن کر بھی نہ آنا۔ احسان شاہ کی حتمی بات۔ انہوں نے بھی سوچ لیا تھا کہ شاید اب عمارہ اور موی سے ملنا ناممکن ہے۔ جب مصطفیٰ ہمیشہ کے لئے واپس پاکستان آ گئے تھے تو ایک بار پھر انہوں نے چاہا تھا کہ احسان شاہ کے دل میں کدورت ہے، فلک شاہ کے متعلق وہ ختم ہو جائے اور مصطفیٰ سے التجا کی تھی کہ وہ سمجھائے شانی کو۔ خون کے رشتے ختم نہیں کئے جا سکتے۔ وہ اپنی فضول قسم کا کفارہ ادا کرے اور انہیں اجازت دے کہ وہ مصطفیٰ کے ساتھ عمارہ اور موی سے جا مل آئیں۔
''جب موی نے عمو کو ماں کی بیماری اور موت پر نہیں بلایا تو اب آپ کا وہاں جانا کیسے پسند کرے گا؟'' یہ مائرہ کا کہنا تھا۔
''وہ پسند کرے یا نہ کرے لیکن میں آپ کو واضح طور پر بتا چکا ہوں کہ میری لاش پر سے گزر کر ہی آپ بہاول پور جا سکیں گے۔''

''شانی! اتنی نفرت کہاں سے تمہارے دل میں آ کر جمع ہو گئی ہے بیٹا! وہ تو تمہارا یار تھا۔ تم اسے اپنا دل کہتے تھے۔ کیسے پتھر کر لیا ہے تم نے اپنے دل کو؟''

''اور آپ کے لئے بھی یہی بہتر ہے بابا جان! کہ آپ بھی اپنا دل پتھر کر لیں۔ یہی سمجھ لیں کہ عمارہ کبھی تھی نہیں۔''

احسان شاہ سختی سے کہتا ہوا چلا گیا تھا۔

اور انہوں نے بظاہر اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ لیکن وہ اس باپ کے دل کو کیا کرتے جو ہمہ وقت عمارہ کی خوشگوار زندگی کی دعائیں کرتا اور اس سے ملنے کو تڑپتا تھا۔

اس روز کے بعد انہوں نے کبھی عمارہ کی طرف جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی اور چپ سادھ لی تھی۔ ایک بار مصطفیٰ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

''بابا جان! میں نے آج مراد پیلس فون کیا تھا۔ عمو اور فلک شاہ، ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔ شاید انگلینڈ۔''

انہوں نے مصطفیٰ کی بات خاموشی سے سنی تھی اور کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ یہ تو اب عمارہ نے اُنہیں بتایا تھا کہ مومی اور وہ، مومی کے علاج کی غرض سے انگلینڈ گئے تھے دو ماہ کے لئے کہ شاید ٹانگوں کے وہ ٹشو جو خراب ہو چکے تھے، ٹھیک ہو جائیں۔

اس کے بعد جیسے ''الریان'' سے ان کا ناتا ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا تھا۔ اماں جان زندہ تھیں تو عمارہ اور مومی کا ذکر ہوتا تھا۔ اب ''الریان'' میں وہ کس سے عمارہ اور مومی کی بات کرتے؟

احسان شاہ اور مائرہ تو ان کا نام بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔ زارا آتی تو بغیر خوف کے ذکر کرتی۔ پندرہ دنوں کے قیام میں بہت بار عمارہ کا ذکر ہوتا۔ وہ ہر بار ان سے ''مراد پیلس'' چلنے کو کہتی، وہ ہر بار منع کر دیتے۔ احسان شاہ کی بات بتائے بغیر وہ لڑتی، ناراض ہوتی اور چلی جاتی تھی۔

انہوں نے کبھی احسان شاہ سے اُس کی اس درجہ ناراضی کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید وہ ڈرتے تھے کہ اس نے مومی کے متعلق کچھ ایسا ویسا کہہ دیا تو وہ کیسے برداشت کریں گے۔

اور پھر ماں کی بیماری اور موت پر عمارہ کے نہ آنے کا اُنہیں دکھ تھا۔ جب زارا نے پاکستان آنے کے بعد انہیں بتایا کہ عمارہ کو تو خبر ہی نہیں، اماں جان کی وفات کی۔

مصطفیٰ طویل عرصہ بعد پاکستان آ کر سیٹل ہو گئے تھے۔ مرتضیٰ اور عثمان باہر ہی سیٹل ہو گئے تھے۔ سو ''الریان'' میں کون تھا جو عمارہ اور مومی کی کمی کو محسوس کرتا اور ان فاصلوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتا۔

مصطفیٰ اپنے بزنس میں مصروف رہتے تھے۔ ہاں ثناء تھی۔ جب سے ''الریان'' میں واپس آئی تھی، وہ عمارہ اور مومی کا کوئی نہ کوئی ذکر لے کر بیٹھ جاتی تھی۔

وہ خاموشی سے اس کی بات سنتے رہتے تھے۔ انہوں نے لب سی لئے تھے۔ وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ انہوں نے جیسے اس دکھ کو قبول کر لیا تھا اور حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ پھر زارا کی اچانک موت نے تو جیسے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ زارا کے غم سے نڈھال ہونے کے باوجود ان کی نظروں نے مومی کو کھوجا تھا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

بہن کہتا تھا زارا کو۔ لیکن کتنا سنگ دل ہو گیا کہ نہ بہن کے جنازے کو کندھا دیا اور نہ ہی قبر پر مٹی ڈالی۔

کتنے ہی دن ان کے دل میں یہ خیال آتا رہا تھا۔

انہوں نے سوچا تھا، اتنے سالوں بعد وہ عمارہ کو دیکھیں گے وہ باپ کے گلے لگ کر بہن کی موت پر روئے گی۔ لیکن انہیں تو بس عمارہ کی ایک جھلک ہی نظر آئی تھی۔ جب وہ زارا کا چہرہ دیکھنے کے لئے اندر آئے تھے۔ وہ زارا کی چارپائی پر جھکی رو رہی تھی۔ اور جب وہ اسے دفنا کر آئے تھے تو انہوں نے اِدھر اُدھر اُسے کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ اور جب وہ کہیں نظر نہ آئی تھی تو انہوں نے ثنا سے پوچھا تھا، کیا عمارہ چلی گئی؟

''جی بابا جان! وہ تو جنازہ اُٹھتے ہی چلی گئی۔''
''اور مومی؟'' ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
''وہ تو اپنی ملازمہ اور ڈرائیور کے ساتھ اکیلی آئی تھی۔''
اور اس روز انہوں نے سوچا تھا کہ اب شاید کبھی یہ دُوریاں ختم نہیں ہوں گی۔ اور انہوں نے اس روز کے بعد پھر کسی سے تو کیا، خود اپنے آپ سے بھی عمارہ اور مومی کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا۔
واقعات کیسے تانا بانا بُن کر غلط فہمیاں بڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ یہ تو اب عمارہ نے اُنہیں بتایا تھا کہ اس روز پتہ نہیں کیسے مومی کی کرسی اُلٹ گئی تھی اور وہ فرسٹ فلور کی سیڑھیوں سے نیچے لاؤنج میں گر گئے تھے۔ بہت چوٹیں آئی تھیں انہیں اور کئی گھنٹے تک انہیں ہوش نہیں آیا تھا۔ زارا کو اطلاع ملی تو وہ آئی سی یو میں تھے۔ ایک کو ان کے پاس چھوڑ کر وہ پتہ نہیں کیسے وہاں پہنچی تھیں اور وہاں پہنچتے ہی ایک کا فون آ گیا تھا کہ ان کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ لیکن وہ یہ سب نہیں جانتے تھے، اسی لئے تو جب ہمدان، ایک کو لے کر آیا تھا تو انہوں نے ایک بار بھی اس سے عمارہ اور مومی کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ ایک سے بھی وہ زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ لیکن اسے ''الریان'' میں دیکھ کر انہیں خوشی ہوتی تھی، جسے انہوں نے کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔
''بابا جان! آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟...... میں نے بڑی غلطی کی۔ بہت تکلیف دی آپ کو، اماں جان کو، عمارہ کو......''
ملک شاہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔
''بیٹا! تمہارا کیا قصور؟ بس مقدر میں لکھی تھیں یہ جدائیاں۔''
''بابا جان! اب آپ یہاں رہیں گے نا ہمارے پاس بہت سارے دن؟''
انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔
''اور مصطفیٰ بھائی! باقی لوگ...... شانی...... کیا وہ بھی آئیں گے یہاں؟'' وہ بچوں کی طرح پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے پھر سر ہلا دیا تھا۔
''شانی تو مجھ سے بہت ناراض تھا، بہت خفا تھا بابا جان! کیا وہ ابھی تک......؟''
''وہ تم سے اتنا کیوں ناراض تھا مومی؟'' بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
''کیا آپ کو اس نے کبھی نہیں بتایا بابا جان کہ......؟''
''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''لیکن وہ تمہارا نام بھی سننا پسند نہیں کرتا۔ اور یہ وہی ہے جس کی وجہ سے عمارہ کی اماں جان اس سے ملنے کی حسرت لئے دنیا سے چلی گئیں۔ اسی نے سب کو زنجیر کر رکھا تھا۔ ورنہ ہم کیسے دور رہ سکتے تھے تم سے؟''
''ہاں...... شانی نے کہا تھا کہ میں ''الریان'' میں دوبارہ قدم نہ رکھوں اور میں......''
انہوں نے ایک گہری سانس لے کر نظریں جھکا لی تھیں۔
''لیکن کیوں؟...... کیوں کی اُس نے ایسی بات؟ اس نے مجھے آج تک نہیں بتایا۔ کیا تم بھی نہیں بتاؤ گے مومی؟''
''بابا جان!'' انہوں نے پُر امید نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''کیا آپ میری بات کا یقین کریں گے؟''
''کیوں نہیں؟''
''میں نے آج تک عمارہ کو بھی کچھ نہیں بتایا۔'' ان کی نظریں جھک گئیں۔
اور انہوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ مائرہ سے اپنی پہلی ملاقات سے لے کر اس رات کی بات تک۔ اور بابا جان حیرت سے سب سن رہے تھے۔

''شیر دل اور مروہ پھپھو کو بھی پتہ ہے سب۔''
''لیکن مروہ نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔'' بابا جان سب جان کر از حد حیران ہوئے تھے۔ ''اور اگر مروہ مجھے بتا دیتیں تو میں ہرگز شانی کی شادی ادھر نہ کرتا۔ لیکن مروہ......''
''سمجھ میں نہیں آتا، اس رات عنایت بی بی نے کیوں جھوٹ بولا۔ جبکہ عمارہ میرے کمرے میں تھی۔'' وہ بڑبڑائے لیکن ایبک نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔
''بس اب پرانی باتیں یاد کر کے ڈپریس نہ ہوں۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اور چلیں! آپ کو کمرے میں لے چلوں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔''
فلک شاہ نے عمارہ کی طرف دیکھا، جو شاکی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور انہوں نے جیسے اس کے دل میں جھانک کر دیکھ لیا تھا۔
''سوری عمو! صرف تمہاری پریشانی کے خیال سے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔''
''اور خود تنہا اتنا بوجھ لئے پھرتے رہے؟''
''تو کیا کرتا؟ ڈر لگتا تھا کہ تمہیں دکھ ہوگا۔''
''اور مروہ پھپھو...... میں سوچ رہی ہوں، انہوں نے بھی کبھی آج تک نہ فون کیا، نہ آئیں۔ سب ہی خفا تھے ہم سے۔''
فلک شاہ کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔ تب ہی انجی ٹرالی دھکیلتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی۔
''ادھر آؤ بیٹا! میرے پاس آ کر بیٹھو۔ تمہیں جی بھر کر دیکھ لوں۔''
بابا جان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''زارا کہتی تھی، انجی بالکل عمارہ کی طرح ہے۔''
''تم تو عمو سے بھی زیادہ پیاری ہو۔'' انجی کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔
''بابا جان! یہ لیں نا چکن سموسے۔ میں نے بہت کم مرچیں ڈال کر بنائے ہیں۔''
''میری بیٹی نے بنائے ہیں تو ضرور لوں گا۔''
موضوع بدل گیا تھا۔ سب نے ہنسی مذاق کرتے ہوئے چائے پی اور پھر ایبک انہیں آرام کے لئے سلجوق والے کمرے میں لے گیا تھا۔
''بابا جان! بس اب آپ لیٹ جائیں۔'' فلک شاہ اور عمارہ بھی ان کے ساتھ ہی آئے تھے۔
''کچھ دیر آرام کر لیں۔ بلکہ لیٹنے سے پہلے اپنی دوا لے لیں۔''
ایبک کو یاد آیا تھا کہ یہ ان کی دوا کا وقت ہے اور دوا کھانے کے کچھ دیر بعد ہی وہ سو گئے تھے۔ تب ایبک نے فلک شاہ اور عمارہ سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ کچھ دیر آرام کریں۔
''بابا! آپ تو سکون کے لئے کوئی دوا لے کر سو جائیں۔ انجی نے بتایا ہے کہ آپ پوری رات نہیں سوئے۔ ڈاکٹر نے جو میڈیسن آپ کے لئے تجویز کی ہیں، وہی لے لیں۔''
''آبی!'' ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ انہوں نے ایبک کے ہاتھ تھامتے ہوئے بھرّائی آواز میں پوچھا۔ ''شانی کی غلط فہمی کیسے دور ہوگی بیٹا؟''
''بابا جان! واپس جا کر ان سے بات کریں گے نا۔''
''لیکن وہ نہیں مانے گا۔ وہ بابا جان کی بات نہیں مانے گا۔ اسے مائرہ پر بہت یقین ہے اور ان چھبیس سالوں میں تو.....''
''سب ٹھیک ہو جائے گا بابا جان!...... اِن شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کی مروہ پھپھو بھی تو ہیں نا۔ آپ ان سے کہیے گا۔ احسان انکل ان کی بات تو سنیں گے نا۔''
''پتہ نہیں۔'' وہ کچھ مایوس سے تھے۔ جتنی شدید محبت احسان شاہ نے ان سے کی تھی، اتنی ہی شدید نفرت بھی کر لی۔

انہوں نے ان سے اس روز جب وہ ان کے آفس میں گئے تھے ملنے تو انہوں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا، کہہ رہا تھا۔
''نفرت ہے مجھے اس شخص سے۔ کہہ دو، وہ آئندہ میرے آفس میں قدم نہ رکھے۔''
اور جب انہوں نے فون کیا تھا تو کیا کہا تھا احسان نے؟.....ان کی سماعت میں وہ لفظ جیسے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے تھے۔
''جتنی شدید محبت میں نے تم سے کی تھی مومی! اب اتنی ہی شدید نفرت کرتا ہوں۔ تمہاری شکل دیکھنا تو درکنار، میں تمہاری آواز سننا بھی نہیں چاہتا۔ بلکہ تمہارا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا۔''
''شانی پلیز! ایک بار میری بات سن لو۔'' انہوں نے التجا کی تھی لیکن احسان شاہ نے فون بند کر دیا تھا۔
اتنی شدی محبت جب نفرت میں بدل جاتی ہے تو کیا وہ نفرت پھر محبت میں بدل سکتی ہے؟
انہوں نے سوچا تھا، شاید نہیں۔
''بابا! چلیں، آپ کو کمرے میں لے جاؤں۔ سو کر اُٹھیں گے تو فریش ہو جائیں گے۔''
اور پھر واقعی وہ سو کر اُٹھے تو کافی فریش تھے۔ لنچ بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ ان کے اور عمارہ کے بچپن کی، طارق کی، زارا کی باتیں......چھبیس سال پہلے وہ اتنی زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ دوستنہ روّیہ رکھنے کے باوجود وہ سب سے بہت زیادہ بے تکلف نہیں تھے۔ اور ابھی وہ کھانا کھا کر قہوہ پی رہے تھے کہ مروہ پھپھو کا فون آ گیا۔ بابا جان پر وہ ناراض ہو رہی تھیں۔
''مجھے کسی نے آپ کی بیماری کا بتایا تک نہیں۔ وہ تو آج میں نے عبداللہ بھائی کو فون کیا تو انہوں نے بتایا۔ ''الریان'' میں کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ مجھے بھی بتا دیتے۔''
''میں اب ٹھیک ہوں چندا!......تم پریشان نہ ہو۔''
''اور یہ آپ ''مراد پیلس'' کیسے آ گئے؟ میں نے ''الریان'' میں فون کیا تو پتہ چلا کہ آپ یہاں ہیں۔ کیا کوئی گنجائش نکل آئی یا پھر مومی اور عمارہ میں طلاق......''
''نہیں، نہیں مروہ گڑیا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے یہاں آنے میں تو کوئی ممانعت نہیں تھی۔ پہلے ہی بہت دیر کر دی ہم نے۔ بہت بھول ہو گئی ہم سے۔ بہت دکھ سہے ہیں میری عمو اور مومی نے ایک ذرا سی غلطی سے۔''
'ہاں۔ اِک ذرا سی غلطی سے۔'
ایبک نے جو عمارہ کے گرد بازو حمائل کئے بیٹھا خاموشی سے سن رہا تھا، سوچا۔

زیست کے سفر میں کچھ
در بھی چھوٹ جاتے ہیں
گھر بھی چھوٹ جاتے ہیں
زیست کے سفر میں پھر
وہ کبھی نہیں ملتا
جو کہ چھوٹ جاتا ہے
ایک ہاتھ، ہاتھوں سے

'ہاں.....اِک ذرا سی غلطی سے کیا کیا کچھ بکھر جاتا ہے۔' اُس نے سر جھٹک کر بابا جان کی طرف دیکھا جو کہہ رہے تھے۔
''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مروہ بچے! مومی نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ تم نہیں جانتیں، احسان نے اسے ''الریان'' میں آئندہ قدم نہ رکھنے کو کہا تو غصے میں اس کے منہ سے وہ نکل گیا، جس کی اذیت مرتے دم تک ہم سب کے دلوں کو کاٹتی رہے گی۔''

''لیکن بابا جان! مجھ سے تو مائرہ نے کہا تھا کہ موی نے کہا ہے کہ اگر ہمارے خاندان کے کسی بھی فرد سے اس نے یا عمو نے بات کی یا ملے تو......''

''جھوٹ بولا تھا اس نے مروہ! یہ سارا کیا دھرا اسی کا تو ہے۔ کاش! تم شروع میں ہی سب کچھ بتا دیتیں۔''

ان کی آواز بلند ہوگئی تھی اور ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ تب پاس ہی اپنی کرسی پر بیٹھے فلک شاہ نے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا تھا۔

''مروہ پھپھو! آپ نے بھی اتنے سالوں میں ہماری خبر نہیں لی۔ پوچھا تک نہیں، کیا گزری ہم پر۔ آپ کی عمارہ پر۔''

''موی!......موی! یہ تم ہو نا؟'' مروہ پھپھو بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

''ہاں پھپھو! میں ہی ہوں۔''

''یقین کرو موی! کتنا دل چاہا، جب میں پاکستان آئی اور اس سب کا پتہ چلا تو کتنا تڑپی میں عمارہ کے لئے۔ بہت پیار ہے مجھے اس سے۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو بھابی جان سے زیادہ میرے پاس رہتی تھی۔ لیکن مائرہ ہم سے ملنے رحیم یار خان آئی تھی۔ اور اس نے سختی سے منع کیا تھا، مجھے تم لوگوں سے ملنے اور فون کرنے سے۔ کیونکہ اس طرح......اور میں کیا نہیں جانتی تھی کہ عمارہ اور تم ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہو۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی، جس سے تم دونوں میں علیحدگی ہو جائے۔ مجھے پتہ تھا، زارا تم سے ملتی ہے۔ لیکن مائرہ نے بتایا تھا کہ زارا کے علاوہ......اور پھر تین منٹ کی کال میں خیر خیریت کے علاوہ کبھی لمبی بات ہی نہیں ہوئی۔''

انہوں نے ایک گہری سانس لی تھی۔

''جو وقت گزر گیا، وہ پلٹ نہیں سکتا مروہ پھپھو! ہماری غلطی کی بہت بڑی سزا ملی ہے ہمیں۔ آپ سب نے ہمیں چھوڑ دیا۔ اکیلا کر دیا۔ اور شانی تو نفرت کرنے لگا ہے مجھ سے۔''

''کیوں؟'' مروہ کو حیرت ہوئی تھی۔ ''مجھے تفصیل سے بتاؤ موی! وہ تو تم سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور پھر مائرہ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ شانی کے ساتھ بہت مخلص ہے اور بہت محبت کرنے لگی ہے اس سے۔ اور یہ کہ ماضی میں اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ سب بھول جاؤں اور کبھی ذکر نہ کروں کسی سے۔ وہ بہت روئی تھی اس روز اپنی بے وقوفی پر۔ اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔ پھر ایسا کیا ہو گیا موی!......کیا پھر وہ......''

''نہیں پھپھو! اس نے کہا تھا کہ وہ میری زندگی جہنم بنا دے گی۔ اپنی بے عزتی کا انتقام لے گی۔ اور اس نے لے لیا پھپھو!''

فون بند ہو گیا تھا۔ انہوں نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ یک دم ہی ماحول میں افسردگی چھا گئی تھی۔ ایبک نے قریب آ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا اور مسکرایا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر وہ بھی زبردستی مسکرائے تھے اور خود کو کمپوز کرتے ہوئے وہ جواد کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، جو جانے کی اجازت لے رہا تھا۔

''جواد بیٹا! فارغ ہو کر ادھر ہی آنا۔ تم سے مل کر جی نہیں بھرا۔ اللہ تمہیں اور انجی کو بہت ساری خوشیاں دے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ آپ جب تک یہاں ہیں، میں ادھر سے ہٹوں گا ہی نہیں۔''

بابا جان مسکرا دیئے۔

یہ منظر خوابوں میں، خیالوں میں کتنی بار انہوں نے دیکھا تھا۔ لیکن یہ ابھی نامکمل تھا۔ اس منظر کو بھرنا تھا۔ مصطفیٰ، احسان، عثمان، مرتضیٰ بھائی......وہ تصور ہی تصور میں ان سب سے اس منظر کو بھرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو رہی تھی۔

✿○✿

زور سے آنکھیں میچتے ہوئے انہوں نے ٹرائیگر پر انگلی دبا دی۔ انہیں لگا جیسے ان کا ہاتھ اکڑ گیا ہو اور انگلیاں پتھر کی

ہوں، جنہیں وہ حرکت دینے سے قاصر ہوں۔
انہوں نے دانت پر دانت جما کر پوری قوت سے ٹرائیگر دبانے کی کوشش کی لیکن ان کی اُنگلی نے حرکت نہیں کی۔
گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر چونک کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی زن سے کوڑے دان کے پاس سے گزر کر روڈ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ پستول پر ان کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ پستول ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اپنے پاؤں کے پاس پڑے پستول کو دیکھتے رہے۔ ان کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے چہرے سے پسینہ پونچھا اور پستول اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے مرے مرے قدموں سے سر جھکائے چلتے ہوئے روڈ پر آ گئے۔ اسٹاپ پر رکھے بنچوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے جیب سے رومال نکال کر ایک بار پھر ماتھے سے بہتے پسینے کو پونچھا۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ تھوک نگل کر انہوں نے خشک حلق کو تر کرنے کی کوشش کی۔
دو لڑکیاں باتیں کرتی ہوئی ان کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ غالباً کسی آفس میں کام کرتی ہوں گی اور اب چھٹی کے بعد واپس گھر جا رہی ہوں گی۔ ایک لڑکی کے ہاتھ میں تھرماس تھا۔ لڑکی نے اس میں سے پانی نکال کر پیا اور پھر پانی پیتے پیتے اس کی نظر ان پر پڑی تھی، جو بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد جیب سے رومال نکال کر ماتھے پر بہتے پسینے کو صاف کرتے۔
"انکل! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" لڑکی اُنہیں ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پھر اپنے خشک ہو جانے والے ہونٹوں پر زبان پھیری تو لڑکی نے تھرماس کے ڈھکن میں پانی ڈال کر ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے تشکر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پانی لے لیا۔
"آپ کو کہاں جانا ہے انکل؟" خالی ڈھکن واپس لیتے ہوئے لڑکی نے پوچھا۔
"سمن آباد۔"
"پتہ نہیں آپ کے روٹ کی وین یا بس کب آئے۔ آپ رکشہ کیوں نہیں کر لیتے؟ مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ یہاں سے رکشے والا زیادہ پیسے نہیں لے گا۔" لڑکی بات کر کے اپنا پرس کھولنے لگی تھی۔
"نہیں...... نہیں بیٹا! میرے پاس رقم ہے۔" وہ اس کا ارادہ سمجھ کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور قریب سے گزرتے ہوئے رکشے کو رُکنے کے لئے کہا اور مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔
"جیتی رہو بیٹا! اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے۔" اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کے ہاتھ لرزنے لگے تھے اور آواز بھرا گئی تھی۔
وہ اسے دعا دے کر تیزی سے رکشے کی طرف بڑھ گئے۔ رکشے والا آواز لگا رہا تھا۔
"میاں صاحب! جلدی کریں۔"
انہوں نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی وہیں کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔
"میاں صاحب!" رکشے والے نے پھر کہا تو وہ تیزی سے رکشے میں بیٹھتے ہوئے بولے۔
"سمن آباد۔" اور رکشہ جھٹکا کھا کر ہوا ہو گیا۔
'کون کہتا ہے کہ ہماری نئی نسل سب ادب و آداب بھول بیٹھی ہے۔ پتہ نہیں کیوں، ہم اپنی نئی نسل سے مایوس ہو گئے ہیں اتنی جلدی۔ حالانکہ...... میں...... میں بھی تو مایوس ہو گیا تھا۔' وہ چونک کر سیدھے ہو گئے۔
'اگر اس روز میں اسے اپنے پاس بٹھا کر سمجھایا، غلط اور صحیح کا ادراک دیتا تو شاید۔ ایک چانس تو مجھے اسے دینا چاہئے تھا۔ اگر نہ سمجھتا تو...... لیکن اب...... اب کیا فائدہ؟ اب تو پانی سر سے گزر چکا۔'
ایک بار پھر بہت سارے پچھتاوؤں نے انہیں گھیر لیا۔ ان کی خشک آنکھوں میں نمی اُتر آئی اور آنسو ان کے اندر

گرنے لگے۔

'میں بہت کمزور ہوں۔ بہت بزدل ہوں۔ میں اس پر گولی نہیں چلا سکا۔ میرے ہاتھوں نے میرا ساتھ نہیں دیا۔'

انہوں نے ہاتھ پھیلا کر اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا اور پھر جیب تھپتھپا کر پستول کی موجودگی کو محسوس کیا۔

دو سال پہلے جب آس پاس کے ایک دو گھروں میں ڈاکا پڑا تھا، یہ پستول وہ یہ پشاور سے لایا تھا اور اسی نے بھاگ دوڑ کر کے لائسنس بنوایا تھا۔ اور اب اسی پستول کی گولی وہ اس کے سینے میں اُتارنے کے لئے آئے تھے۔ آج اس نے جھوٹے نبی کی گواہی دی تھی۔ ایک شخص کو نعوذ باللہ نبی تسلیم کیا تھا۔ کل کو وہ خود بھی نبوت کا دعویٰ کر سکتا تھا۔

'یا اللہ! مجھے ہمت عطا کر۔'

وہ یکدم دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگے۔ رکشے والے نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

''میاں صاحب! خیریت ہے نا؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ اور وہ ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

'میں بہت کمزور ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں ''قرطبہ کے قاضی'' جیسے۔ اپنی ہی اولاد کے خلاف فیصلہ سنانے والے۔ میرے جیسے کمزور دل تو......'

''ہاں!'' انہوں نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

گھر آ گیا تھا۔ انہوں نے کرایہ ادا کیا۔ رکشہ سے اُتر کر بیل پر ہاتھ رکھا لیکن فوراً ہی اُٹھا لیا۔ اب وہ پھر مڑ کر گلی سے باہر روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ روڈ پار کر کے وہ دوسرے روڈ پر آ گئے۔ یہاں انہوں نے کچھ ہی دن پہلے ایک پی سی او دیکھا تھا۔ دل ہی دل میں پختہ ارادہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے والٹ سے ایک کارڈ نکالا۔ یہ کارڈ بہت دن پہلے اُس ایس ایچ او نے دیا تھا جو احمد رضا کو تفتیش کے لئے لے گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر کبھی اس کذاب کے ٹھکانے کا علم ہو تو اس نمبر پر فون کر دینا۔

کچھ دیر کارڈ ہاتھ میں لئے وہ متذبذب سے کھڑے رہے، پھر پی سی او کی طرف بڑھے۔

''ایک فون کرنا ہے جناب!''

کیبن میں بیٹھے ہوئے شخص نے جو کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا، ناول سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔

''فون خراب ہے۔ کمپلین کر رکھی ہے۔ کچھ دیر بعد آئیے گا۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

ایک گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے سر ہلایا اور واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ مٹھی میں دبا ہوا کارڈ انہوں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ اندر کہیں گہرائی میں اطمینان سا پھیل گیا تھا۔ پولیس گولی بھی چلا سکتی تھی......اور وہ گولی کسی کو بھی لگ سکتی تھی۔ احمد رضا کو بھی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکے اور پھر تیز تیز چلنے لگے۔

وہ گھر سے بھی فون کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے سوچا تھا کہ وہ گمنام آدمی کی حیثیت سے فون کر کے پولیس کو بتا دیں گے کہ وہ کذاب کہاں چھپا ہوا ہے اور احمد رضا.......

احمد رضا تو محض اُس کا مرید ہے۔ اُمید ہے، پولیس اسے چھوڑ دے گی اور نہ بھی چھوڑا تو وہ وکیل کر لیں گے۔ اچھا ہے، تھوڑی سزا ہو جائے گی تو اسے بھی سمجھ میں آ جائے گی۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ تین چار وکیلوں کے متعلق سوچ چکے تھے، جن سے کسی نہ کسی ذریعے سے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔

''ابو! آج پھر آپ کو دیر ہو گئی۔'' سمیرا برآمدے میں ہی بیٹھی تھی۔

''ہاں بیٹا! ان دنوں کام زیادہ ہے کچھ۔'' وہ اس کے پاس تخت پر ہی بیٹھ گئے۔

''ابو! آپ ڈھونڈنے گئے تھے رضی کو؟'' سمیرا انہیں دیکھ رہی تھی۔ ''کچھ پتہ چلا؟''

وہ اس کی بات سن کر چونکے، پھر بے اختیار ان کا سر نفی میں ہل گیا۔

''آپ دو دن سے دفتر نہیں جا رہے۔ آپ کے دوست ہیں نا قاضی صاحب، ان کا فون آیا تھا۔ آپ کی طبیعت پوچھ رہے تھے۔''

سمیرا نے نظریں جھکا لی تھیں۔ حسن رضا خاموش ہی رہے تھے۔

''کیا کچھ اندازہ ہے آپ کو کہ وہ کہاں ہوگا؟''

''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور غیر ارادی طور پر ان کا ہاتھ اپنی پینٹ کی جیب کی طرف بڑھا۔

''ابو! یہ آپ کی پاکٹ میں کیا ہے؟'' سمیرا کی نظریں اُن کی اُبھری ہوئی پاکٹ پر تھیں۔

''وہ...... یہ......'' بالکل غیر ارادی طور پر انہوں نے پستول جیب سے نکالا۔

''یہ......'' سمیرا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ''آپ...... ابو! آپ اس لئے رضی کو ڈھونڈ رہے ہیں کہ اسے......''

وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی اور بے حد خوف زدہ سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

''نہیں، نہیں...... میں بھلا کیسے...... نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اسے نہیں مار سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ میں ایک کمزور دل باپ ہوں۔ میرے سینے میں صرف ایک باپ کا دل دھڑکتا ہے۔ صرف باپ کا دل۔ جو اپنے مرتد بیٹے کو قتل نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ نبوت کا دعویٰ کر لے۔ چاہے وہ......''

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

سمیرا نے جو خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی، یکدم ان کے قریب ہوتے ہوئے ان کے بازو پر ہاتھ رکھے۔

''ابو پلیز روئیں نہیں۔ پلیز ابو!'' وہ ہولے ہولے ان کا بازو تھپتھپا رہی تھی۔ لیکن وہ روئے چلے جا رہے تھے۔ روتے روتے انہوں نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر سمیرا کی طرف دیکھا۔

''پتہ ہے سمیرا! ایک بار حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کے بیٹے نے کہا۔ اسلام لانے سے پہلے جب ایک جنگ میں آپ کا سامنا ہوا تو میں نے تلوار نیچی کر لی اور وہاں سے ہٹ گیا۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''بخدا! اگر تم میرے سامنے آتے تو میں ہرگز اپنی تلوار نیچے نہ کرتا۔''

وہ قوت ایمانی ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو بس دعا کر سکتا ہوں، رو سکتا ہوں، انتظار کر سکتا ہوں۔ شاید وہ سن لے۔ شاید وہ تائب ہو جائے، شاید اس کا دل پلٹ جائے۔''

''اس کا دل ضرور پلٹے گا ابو! مجھے یقین ہے۔ وہ ضرور تائب ہوگا۔ اس سے غلطی ضرور ہوئی ہے، لیکن غلطیوں کی معافی مل جایا کرتی ہے۔ اللہ تو بہت رحیم و کریم ہے۔ وہ توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی توبہ قبول کرے گا۔''

''ہاں ضرور۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سمیرا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اب وہ دونوں رو رہے تھے۔ تب ہی زبیدہ نے کمرے کے دروازے سے جھانک کر انہیں دیکھا اور باہر آ گئیں۔

''یہ کیا مغرب کے وقت باپ بیٹی نے رونا دھونا مچایا ہوا ہے۔ اللہ خیر کرے، میرا بیٹا سلامت رہے۔ خوش رہے۔ اس وقت مل رہے ہیں اور تم......''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر واپس مڑ گئی تھیں۔ سمیرا نے الگ ہوتے ہوئے جلدی سے آنکھیں صاف کر لیں اور حسن رضا کی طرف دیکھا۔

''ابو! آپ وضو کر لیں۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ نماز پڑھ لیں، پھر کھانا لگاتی ہوں۔''

''نہیں۔ بھوک نہیں ہے بیٹا!''

''صبح سے بھوکے ہیں۔ مجھے پتہ ہے، آپ نے کچھ کھایا نہیں ہوگا۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے تخت پر پڑا پستول اٹھایا۔

''نہیں...... نہیں، ادھر دو۔ بھرا ہوا ہے۔ احتیاط سے۔''

انہوں نے اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ سمیرا وہیں برآمدے میں حیران سی کھڑی تھی۔

'ابو بھرا ہوا پستول لے کر رضی کو ڈھونڈنے گئے تھے۔ اللہ کرے رضی کبھی نہ ملے ابو کو' اس نے زیرلب کہا تھا اور پھر ایک جھرجھری سی لے کر فوراً ہی دعا مانگی تھی۔

''یا اللہ!.....رضی آ جائے۔ واپس آ جائے۔'' اور پھر وہیں تخت پر بیٹھ کر دعا مانگنے لگی تھی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی، مغرب کی اذانیں کب کی ہو چکی تھیں۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ پورے وجود میں یکدم کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ اُٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے لبوں سے ایسی غلط بات کیوں نکلی؟...... یا اللہ! رضی آ جائے۔ ابھی آ جائے۔ آج ہی، کل ہی۔''

وہ بمشکل نماز کے لئے اُٹھی تھی۔ نماز پڑھ کر اس نے چائے کے لئے پانی رکھا اور ساتھ ہی سالن گرم کرنے لگی۔ ابو صبح سے بھوکے ہیں۔ ناشتے میں بھی کچھ نہیں لیا تھا۔

جلدی جلدی ٹرے میں سب سامان لگایا اور کمرے میں آئی۔ حسن رضا آنکھیں موندے بیڈ پر نیم دراز تھے اور زبیدہ ابھی تک جاء نماز پر بیٹھی تھیں۔

''ابو! کھانا کھا لیں۔'' اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔

''میں نے کہا تھا بیٹا! مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''تھوڑا سا کھا لیں ابو! میں پھر چائے لے کر آ رہی ہوں۔''

وہ ایک بار پھر انہیں کھانے کی تاکید کرتی ہوئی چلی گئی تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور سائیڈ ٹیبل سے ٹرے اٹھا کر بیڈ پر رکھی۔ ڈونگے کا ڈھکن اٹھایا۔ قیمہ کریلے پکے تھے۔

احمد رضا کو قیمہ کریلے بہت پسند تھے۔ فرمائش کر کر کے پکوایا کرتا تھا۔

''اماں جانی! آپ کے جیسے قیمہ کریلے پورے پاکستان میں کوئی بھی نہیں بنا سکتا۔'' وہ موڈ میں ہوتا تو کہتا تو وہ اسے چڑانے کو کہتے تھے۔

''نہیں محترم! میری اماں جیسے قیمہ کریلے تو تمہاری اماں مر کر بھی نہیں پکا سکتیں۔''

'اُف.....!' اُن کے لبوں سے سسکی نکل گئی اور انہوں نے ڈونگے پر ڈھکن رکھ دیا۔

زبیدہ جو نماز پڑھ کر ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں، جاء نماز ایک طرف رکھ کر بیڈ کے قریب آئیں۔

''آپ نے کھانا کیوں چھوڑ دیا؟'' انہوں نے سر اٹھا کر زبیدہ کی طرف دیکھا۔

''تم نے یہ قیمہ کریلے......''

''مجھے لگا تھا، جیسے وہ آج آ جائے گا۔ اتنے بہت سارے دن وہ کہاں ہمارے بغیر رہ سکتا ہے۔'' وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''یاد ہے نا، جب آپ کے تایا جان کا انتقال ہوا تھا تو ہم رحیم یار خان گئے تھے۔ ہمیں وہاں کچھ زیادہ دن لگ گئے تھے۔ اور رضی اپنے امتحان کی وجہ سے یہاں تھا۔ پھر یاد ہے، جب ہم واپس آئے تھے تو وہ رو پڑا تھا۔ حالانکہ دسویں میں پڑھتا تھا۔''

''ہاں۔ کہتا تھا، میں آئندہ کبھی اتنے بہت سارے دن آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سن لیں۔ اب آپ جب کبھی رحیم یار خان یا کہیں اور جائیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ امتحان بے شک ہوتے رہیں۔''

انہوں نے ٹرے اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتے ہوئے زبیدہ کی طرف دیکھا۔

'تو کیا اس نے صبر کر لیا ہے؟......صبر آ گیا ہے اسے یا پھر؟' زبیدہ کے چہرے پر وہ پہلے جیسی بے چینی اور بے سکونی نہیں تھی۔

'جھوٹی امیدوں نے اسے بہلا لیا ہے۔'
زبیدہ کے چہرے سے نظریں ہٹا کر انہوں نے ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے آواز بلند کی۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔
''آج شام ایک مخبر کی اطلاع پر ایک جگہ چھاپا مارا گیا، جہاں اسمٰعیل کذاب کے کارندے میٹنگ کر رہے تھے اور......''
وہ سانس روکے ٹی وی کی طرف دیکھ رہے تھے اور انہیں سوائے نیوز کاسٹر کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، جیسے ان کے اردگرد ساری آوازیں مرگئی تھیں۔ انہیں سمیرا کے دروازہ کھولنے کی آہٹ بھی سنائی نہیں دی تھی۔
''جس مکان پر چھاپہ مارا گیا تھا، وہاں کوئی تقریب ہو رہی تھی۔''
نیوز کاسٹر اب خبروں کی تفصیل بتا رہا تھا۔
''آج شام وقت مغرب خفیہ اطلاع پر مکان کے گرد گھیرا ڈالا گیا تاکہ اسمٰعیل کذاب اور اس کے ساتھوں کو گرفتار کیا جا سکے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے فساد پھیلنے کا خطرہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کے نبوت کے جھوٹے دعوے کی وجہ سے مذہبی حلقوں اور عام لوگوں میں سخت غم وغصہ پایا جاتا ہے بلکہ شبہ ہے کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں بھی ملوث تھا۔ تاہم وہ لوگ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ غالباً کوئی خفیہ راستہ تھا۔''
انہوں نے بہت دیر سے روکی ہوئی سانس کو خارج کیا اور ان کی نظریں سمیرا سے ملیں، جن میں شکوک کے سائے لہراتے نظر آئے تھے انہیں۔ بے اختیار نفی میں ان کا سر ہلا۔
''ابو! چائے لے لیں۔''
سمیرا کی آواز نے کمرے کے سکوت کو توڑا۔ انہوں نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور زبیدہ کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہت آہستگی کے ساتھ نکل نکل کر ان کے رخساروں پر سے ہوتے ہوئے گردن تک آ رہے تھے۔
''تم نے اپنی امی کو چائے نہیں دی؟'' انہوں نے ریموٹ سے ٹی وی بند کرتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔
''نہیں۔ انہوں نے منع کر دیا تھا۔''
''زبیدہ! مت روؤ۔ اس طرح اللہ رحم کرے گا۔ اس پر بھی اور ہم پر بھی۔''
انہوں نے چائے کا کپ بھی ٹرے میں رکھ دیا اور زبیدہ کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔ زبیدہ اسی طرح بیٹھی تھیں اور آنسو یونہی خاموشی اور آہستگی سے بہہ رہے تھے۔ سمیرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔
''ابو! کیا رضی بھی...... رضی بھی ان کے ساتھ ہوگا؟''
''پتہ نہیں۔'' انہوں نے سمیرا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ زبیدہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔
''ابو! اگر پولیس والے کامیاب ہو جاتے تو کیا وہ رضی کو بھی پکڑ لیتے؟...... جیل میں ڈال دیتے؟''
سمیرا کے ذہن میں بہت سارے سوالوں کے بھنور بن اور ٹوٹ رہے تھے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ابو سے کیا پوچھے۔ وہ کیا جاننا چاہتی تھی؟ اسے ابھی یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کون سا اتنی بڑی ہو گئی تھی۔ فرسٹ ایئر کی طالبہ ہی تو تھی۔ بے شک زبیدہ کی تربیت اور گھر کے ماحول نے اسے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ بردبار، زیادہ سمجھ دار بنا دیا تھا۔ پھر بھی یہ سب جو اُن کے ساتھ ہوا تھا، وہ اسے سہہ نہیں پا رہی تھی۔
''ابو! کیا آپ کو پتہ تھا کہ رضی اور وہ لوگ کہاں ہیں؟...... میرا مطلب ہے اس گھر کا پتہ تھا آپ کو؟''
بہت دیر سے وہ سوال جو اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا، لبوں پر آ گیا۔ آنکھوں کے سامنے تخت پوش پر پڑا ہوا پستول آ گیا تھا۔
''نہیں۔ مجھے اس گھر کا علم نہیں تھا۔'' انہوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر زبیدہ کے آنسو پونچھنے چاہے۔

سمیرا کھڑی ہوگئی۔

''ابو!'' اس نے ٹرے اٹھاتے ہوئے چائے کے کپ کو دیکھا جو اسی طرح بھرا پڑا تھا۔

''لے جاؤ بیٹا! کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا۔''

''ابو!'' اس نے پھر کہا۔ ''اگر کبھی رضی کے کسی ٹھکانے کا پتہ چلے تو اکیلے جانے کے بجائے مجھے بھی ساتھ لے جائے گا۔ وہ میری بات ضرور سنے گا اور سمجھے گا بھی۔''

اُس کے لہجے میں یک دم ہی ایک یقین سا، مان سا آ گیا تھا۔ انہوں نے سر ہلا دیا اور وہ ٹرے اٹھائے کمرے سے باہر چلی گئی تو ایک گہرا سانس لیتے ہوئے انہوں نے زبیدہ کے بازو سے ہاتھ ہٹالیا۔

''میں کچھ دیر لیٹوں گا زبیدہ! اگر آنکھ لگ گئی تو عشاء کے لئے جگا دینا۔''

زبیدہ نے دنوں ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کیا اور دروازہ بھیڑ کر باہر چلی گئیں تو انہوں نے لیٹتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

'پتہ نہیں کون تھا وہ جس نے مخبری کی۔ چاہتے تو وہ بھی تھے لیکن ہمت نہ کر پائے تھے۔ پتہ نہیں اب کہاں گئے ہوں گے وہ لوگ۔'

یونہی سوچتے سوچتے جانے کب ان کی آنکھ لگ گئی۔ دبارہ وہ زبیدہ کے جگانے پر ہی اُٹھے تھے اور عشاء پڑھ کر دعا مانگتے ہوئے انہوں نے عہد کیا تھا کہ آج کے بعد وہ رضی کے متعلق سوچیں گے بھی نہیں۔ یہی سمجھیں گے کہ ان کا کوئی بیٹا تھا ہی نہیں۔ وہ نہ تو اسے تلاش کریں گے اور نہ اس کے پیچھے بھاگیں گے۔ لیکن یہ عہد کرتے ہوئے وہ ہرگز نہیں جانتے تھے کہ وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ لوگ انہیں بھولنے نہیں دیں گے۔ نماز پڑھ کر وہ خاموشی سے بیڈ پر آ کر لیٹ گئے اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

اگلی صبح وہ معمول کے مطابق اٹھے تھے۔ پچھلے کئی دنوں کی طرح انہوں نے گھر میں ہی نماز پڑھی۔ اور جب تیار ہو کر دفتر جانے کے لئے باہر نکلے تو گلی کے نکڑ پر انہیں فیاض صاحب مل گئے۔

''ارے حسن رضا صاحب! آج کل کہاں ہوتے ہیں آپ؟ مسجد میں بھی نظر نہیں آتے۔''

''جی بس کچھ طبیعت خراب تھی۔''

''احمد بھی نظر نہیں آیا کئی دنوں سے۔ کہیں گیا ہوا ہے کیا؟''

''جی۔'' انہوں نے قدم آگے بڑھانا چاہے۔

''وہ میں نے سنا تھا۔'' انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں بلے۔ ''وہ جو ہے نا اپنا کریانے والے کا بیٹا، علی...... وہ کہہ رہا تھا کہ احمد رضا کی تصویر چھپی تھی اخبار میں۔ کسی جھوٹے نبی کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ کیا سچ ہے یہ؟''

ایک لمحے کے لئے انہیں اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا تھا لیکن انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے فیاض صاحب کی طرف دیکھا۔

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جب واپس آئے گا تو پتہ چلے گا۔''

''کہاں گیا ہوا ہے؟'' فیاض صاحب کی متجسس نظریں جیسے انہیں اپنے وجود میں اُترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''رحیم یار خان گیا ہوا ہے۔'' انہوں نے قدم آگے بڑھائے۔ ''دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔'' وہ فیاض صاحب کی بات سنے بغیر آگے بڑھ گئے۔ اب پتہ نہیں فیاض صاحب نے ان کی بات کا یقین کیا تھا یا نہیں لیکن یہ تو ہونا ہی تھا۔ ایسی باتیں بھی بھلا کبھی چھپی ہیں؟ آج فیاض صاحب نے پوچھا کل ملک صاحب استفسار کریں گے۔ پھر کوئی اور، پھر محلے کی عورتیں آ کر زبیدہ کو کریدیں گی۔

وہ سر تھام کر اسٹاپ پر موجود بینچ پر بیٹھ گئے۔
اب انہیں بہت ساری نظروں کا سامنا کرنا تھا۔ ترس کھاتی، ہمدردی جتاتی، طنز کرتی، مذاق اُڑاتی، ہر طرح کی نظریں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی احمد رضا کو اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتے تھے۔ اس کی ولدیت کے خانے میں ہمیشہ ان ہی کا نام رہنا تھا۔
اگلے کئی دن تک خاموشی رہی۔ فیاض صاحب کے بعد کسی نے ان سے احمد رضا کے متعلق کچھ نہیں پوچھا تھا۔ یوں بھی انہوں نے خود کو گھر اور آفس تک محدود کر لیا تھا۔ اب وہ ساری نمازیں گھر میں ہی پڑھ رہے تھے۔ گھر میں اخبار نہیں آتا تھا اب لیکن دفتر میں وہ اخبار ضرور پڑھتے اور اسمٰعیل کے متعلق دی گئی چھوٹی سی خبر کو بھی وہ کئی کئی بار پڑھتے۔ یوں ہی ہفتہ۔ پھر پتہ نہیں، کہاں سے کچھ پاپارازی قسم کے صحافی ان کی کھوج لگا کر ان کے گھر تک پہنچ گئے۔
''احمد رضا آپ کا بیٹا ہے؟''
''جی!'' وہ اس کی ولدیت سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔''
''کہاں ہے؟''
''مجھ علم نہیں۔''
''کیوں؟'' صحافیوں کی متجسس نظریں انہیں کھوج رہی تھیں۔
''میں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔''
''ہم نے آس پڑوس سے سنا ہے، وہ بڑا فرماں بردار اور مہذب بچہ تھا۔ پھر وجہ گھر سے نکالنے کی؟''
''ابلیس بھی پہلے اللہ کا بہت عبادت گزار اور برگزیدہ تھا۔''
''کیا آپ سے رابطہ ہے ان کا؟''
''نہیں۔'' وہ ان سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ لیکن وہ تو جسے انہیں زچ کرنے پر تلے تھے۔
''یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ گھر والوں سے رابطہ نہ رکھے؟''
''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اسے گھر سے نکال چکا ہوں۔''
''اوہ ہاں!''
بڑی مشکل سے انہوں نے ان سے جان چھڑائی تھی۔
لیکن پھر تو جیسے سب کے لئے راستے کھل گئے تھے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی چلا آتا تھا۔ کبھی دفتر میں، کبھی گھر میں۔ ایک صحافی تو ان کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا اور بار بار اصرار کر رہا تھا۔
''کیا یہ میرا گناہ ہے کہ اللہ نے مجھے اُس کا باپ بنایا؟ ہر آدمی کو اپنے حصے کا بوجھ اٹھانا ہے۔ اسے ڈھونڈو، اسے جا کر اس سے پوچھو، جو پوچھنا ہے۔'' وہ تلخ ہوئے تھے۔
''سر! وہ کہاں ملیں گے؟ کوئی پتہ ٹھکانہ ہے تو لکھوا دیں۔''
''اللہ کا واسطہ! میری جان چھوڑ دو۔ ہمارے لئے وہ مر چکا ہے۔ اسی روز مر گیا تھا، جب اس نے اس ملعون کی حمایت کی تھی اور اسے سچا قرار دیا تھا۔''
انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور اندر ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس کھڑی سمیرا کانپ گئی تھی۔
'نہیں! وہ ہمارے لئے کبھی نہیں مر سکتا۔ ہمارے لئے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ بھلے وہ جہاں بھی رہے۔'
اگلے بہت سارے دن وہ بہت زیادہ مصروف رہے تھے۔ آفس سے اٹھ کر وہ مختلف پراپرٹی ڈیلرز کے پاس جاتے تھے۔ گھر میں انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اندھیرا پڑنے پر ہی وہ گلی میں قدم رکھتے تھے اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سر جھکائے اپنے گھر کی طرف بڑھ جاتے۔ اگر کوئی سلام کرتا تو یونہی سر جھکائے

سلام کا جواب دیتے۔ انہیں لگتا تھا جیسے محلے کا ہر فرد انہیں ہمدردی اور ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ کبھی لگتا جیسے سب کی آنکھوں میں ان کے لئے نفرت اور تمسخر ہے۔ کچھ عرصہ قبل گلی میں وہ سر اٹھا کر فخر سے چلتے اور لوگوں کی تحسین وصول کرتے تھے۔

''بہت لائق اور اچھے بچے ہیں۔ بہت خوش نصیب ہیں آپ۔ نیک اولاد بھی بڑی نعمت ہوتی ہے جناب!''

وہ ایسے ہی جملے اب تک سنتے رہے تھے۔ اور اب لوگ انہیں مشورہ دیتے کہ اخبار میں اشتہار دے دو کہ میں نے اپنے بیٹے کو عاق کر دیا ہے۔ وہ مشورہ دینے والوں کو حیرت سے دیکھتے۔

''میں اس کا مجاز نہیں ہوں۔ وارثوں کو ان کے حق سے محروم کرنے کا اختیار اللہ نے ہمیں نہیں دیا۔''

گھر میں اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔

اس روز انہیں معمول سے بھی زیادہ دیر ہوگئی تھی بیل ہوئی تو سمیرا بھاگ کر گیٹ تک آئی تھی اور حسن رضا کو دیکھ کر ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح دور تک گلی میں دیکھا تھا۔ گلی خالی تھی۔ گیٹ بند کر کے جب وہ برآمدے میں آئی تو حسن رضا تخت پر بیٹھ چکے تھے اور جھک کر جوتے اُتار رہے تھے۔ سمیرا نے جلدی سے تخت کے نیچے سے ان کے چپل نکال کر سامنے رکھے۔

انہوں نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ان چند ماہ میں اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کی وہ شوخ چمک ماند پڑ گئی تھی۔

جب سے احمد رضا گیا تھا، انہوں نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں دیکھی تھی۔ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے انہوں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

'کسے معلوم ہے
لیکن ذرا سی لغزشِ پا سے
توازن کب بگڑ جائے
یہ دنیا کب اُجڑ جائے'

بہت پہلے کی پڑھی ہوئی نظم کے چند مصرعے ان کے ذہن میں آئے تو انہوں نے زیرلب دہرایا۔

''ہوا مسرور کرتی ہے
مگر خطرے کی اِک گھنٹی کہیں بجتی ہی رہتی ہے
کسے معلوم ہے لیکن
ذرا سی لغزشِ پا سے
توازن کب بگڑ جائے
یہ دنیا کب اُجڑ جائے''

انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے سارے گھر پر نظر دوڑائی۔

یہ گھر...... یہاں ان کی زندگی کے کتنے بہت سارے سال گزرے تھے۔ زبیدہ نے کیسے کمیٹیاں ڈال ڈال کر اور اپنا زیور بیچ کر یہ گھر خریدا تھا۔ اسی گھر میں احمد رضا اور سمیرا پیدا ہوئے۔

جب وہ زبیدہ کو شادی کے بعد لاہور لے کر آئے تھے تو تب انہوں نے کرائے پہ گھر لیا تھا اور زبیدہ کُڑھتی تھی کہ ہر ماہ کرائے پر اتنا پیسہ خرچ ہو جاتا ہے۔

''ابو!'' سمیرا نے گھبرا کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''ابو! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

ان کے لبوں پر مدھم سی غم زدہ مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہوگئی۔ انہوں نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں

میں آنسو چمک رہے تھے۔
کہہ رہا تھا سمیرا بیٹا!
کسے معلوم ہے لیکن
توازن کب بگڑ جائے
یہ دنیا کب اُجڑ جائے
کسے معلوم ہے بیٹا! کل کیا ہوگا۔''
آنکھوں میں چمکتے آنسو رخساروں پر لڑھک آئے تھے۔ اُجڑ گئی تھی اُن کی دنیا بھی۔
سمیرا نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔
''ابو! کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟......رضی ٹھیک ہے نا؟......آپ نے کیا، کیا ہے اس کے ساتھ؟''
سمیرا کے اندر کا ڈر زبان پر آگیا۔ اس نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔
''اس نے اپنے ساتھ خود جو کچھ کرلیا ہے، اس کے بعد اور کیا ہوسکتا تھا؟''
انہوں نے سر جھکا لیا اور تخت پر پڑی اس کی کتابوں کو دیکھا۔
''تم یہاں سردی میں بیٹھ کر پڑھ رہی تھیں۔ کل بھی تم سے کہا تھا۔ موسم بدل گیا ہے۔''
''جی ابو!'' وہ خود کو سنبھال کر کتابیں سمیٹنے لگی۔
'کتنی ڈسٹرب ہوگئی ہے۔ پہلی بار اس کا دسمبر ٹیسٹ کا رزلٹ اس طرح آیا ہے۔ پچاس فیصد تو کبھی زندگی میں نمبر نہیں لئے تھے۔ ہمیشہ اسّی فیصد سے زیادہ ہی لیتی تھی۔ تو میں نے جو فیصلہ کیا، وہ صحیح ہے۔'
مشکل مرحلہ سمیرا اور زبیدہ کو اس فیصلے سے آگاہ کرنے کا تھا جو انہوں نے رات کے کھانے کے بعد کرلیا۔ زبیدہ اور سمیرا خاموش بیٹھی انہیں دیکھتی رہیں۔
''کیا اس کے بغیر کوئی اور چارہ نہیں تھا؟'' زبیدہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔
''نہیں۔'' انہوں نے زبیدہ کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا اور وہ دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ زبیدہ اس گھر کے لئے بہت خوار ہوئی تھیں۔ بہت بچتیں کی تھیں انہوں نے۔ جب فرسٹ فلور پر کمرا اور واش روم وغیرہ بن رہا تھا تو سمیرا اور احمد رضا کتنے خوش تھے۔
سمیرا نے کمرہ تیار ہونے کے بعد رگڑ رگڑ کر خود فرش دھویا تھا۔ پھر کارپٹ اور پردوں کے لئے دونوں بہن بھائی کتنی دکانوں پر پھرے تھے۔ مناسب قیمت میں خوبصورت پردے اور کارپٹ لینا آسان نہیں تھا۔ چیز پسند آجاتی تو قیمت زیادہ ہوتی۔
''اور اگر وہ واپس آیا تو ہم نہ ہوئے تو؟''
''وہ اب واپس نہیں آئے گا زبیدہ! اسے دولت کی ہوس اور لالچ کے سانپ نے ڈس لیا ہے۔''
''پھر بھی، کبھی ہم اسے یاد آئے تو؟''
''تو......اللہ کو منظور ہوا تو کوئی سبب بنا دے گا۔'' انہوں نے اب بھی زبیدہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ سمیرا اس دوران ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی رہی۔ انہوں نے ذرا کی ذرا اس کے چہرے پر نظر ڈالی تھی۔ وہ پتھروں جیسی سنجیدگی چہرے پر سجائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ہولے سے کھنکارے۔
''یہ ضروری تھا زبیدہ! بے حد ضروری۔ یہاں جینا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن چلے آتے تھے احمد رضا کا پوچھنے۔ اور اب تو ایک بار پھر کالم نگاروں نے لکھنا شروع کر دیا ہے۔''
سمیرا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''کل کے ایک اخبار میں ایک کالم نویس نے صرف احمد رضا کے متعلق لکھا ہے۔''
''نہیں۔'' اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ 'کیا وہ اتنا اہم ہوگیا ہے؟ وہ تو ایک معمولی مرید ہے۔' اس نے سوچا۔
''کل دو صحافی میرے دفتر میں آئے تھے اور اب آتے رہیں گے۔ خبر رکھوں گا۔ تم فکر نہ کرو زبیدہ! جب بھی موقع ملا، پتہ چلا...... میں خود جا کر اسے لاؤں گا۔''
زبیدہ نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ یونہی خاموش بیٹھی رہیں۔
''تم کل لیونگ سرٹیفکیٹ کے لئے درخواست دے دینا۔''
''ہم کہاں جائیں گے ابو؟'' سمیرا نے پہلی بار بات کی۔
''راولپنڈی یا اسلام آباد۔ تاکہ تمہاری پڑھائی اچھے اداروں میں ہو سکے۔''
سمیرا اپنا کچھ کہے کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ صرف کنیئرڈ کالج میں ایڈمیشن لینے کے شوق میں اتنی محنت کرتی تھی کہ اس کا میرٹ بن جائے اور کسی سفارش کے بغیر اسے ایڈمیشن مل جائے۔ اور یہ شوق اس وقت سے اس کے دل میں پیدا ہوا تھا، جب وہ ایک بار رحیم یار خان گئی ہوئی تھی اور ابو اسے لے کر اپنی پھوپھی زاد بہن کے گھر گئے تھے۔ وہاں اس نے ایک بہت باوقار سی عورت کو دیکھا تھا جو اسے بے حد اُداس سی لگی تھی۔ وہ تب چھوٹی سی تھی۔ آٹھ نو سال کی شاید۔ اور ابو نے اسے بتایا تھا کہ یہ آپا کی بیٹی ہیں...... بہت لائق اور ذہین ہیں۔ انہوں نے میٹرک میں ٹاپ کیا تھا۔ ان کے ابا تب لاہور میں ملازمت کرتے تھے۔ اور پھر انہوں نے کنیئرڈ کالج سے ایف ایس سی کیا اور پھر ان کی شادی ہوگئی، رحیم یار خان کے قریب ہی ایک گاؤں میں۔ ان کے تین بچے بھی تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ ابو جب ان کے متعلق بتا رہے تھے کہ وہ کنیئرڈ میں پڑھتی تھیں تو ان کے لہجے میں بڑا فخر تھا۔ اور تب ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی کنیئرڈ میں پڑھے گی۔ اور پھر ابو اس کے متعلق بھی فخر سے بتایا کریں گے کہ میری بیٹی نے کنیئرڈ کالج سے پڑھا ہے۔
وہ کمرے سے چلی گئی تھی اور زبیدہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر حسن رضا نے اُٹھ کر دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ وہ سر جھکائے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑے اسے رک رک کر سیڑھیاں چڑھتے دیکھتے رہے۔ وہ جب اوپر جا رہی تھی تو اس کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت میں بہہ رہے تھے۔
حسن رضا ایک آہ بھر کر واپس کمرے میں آگئے۔ انہوں نے اس کے پیچھے جانے کا سوچا تھا لیکن پھر نہیں گئے۔ اچھا ہے، اکیلی رہ کر بھڑاس نکال لے۔
اوپر والا پورشن دونوں نے مل کر سجایا تھا۔ ٹیرس میں بیلوں والے بڑے بڑے گملے رکھے تھے۔ اب تو بیلوں نے ٹیرس کے پورے جنگلے کو ڈھک دیا تھا۔ باہر خوب صورت اِن ڈور پھولوں کے گملے تھے۔
بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے زبیدہ کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی حسرت سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ کبھی ان کی نظریں کھڑکی کی طرف اُٹھتیں، کبھی پردوں سے اُلجھتیں۔ پھر وہ حسرت سے وارڈروب کو دیکھنے لگیں۔ جب یہ گھر انہوں نے خریدا تھا تو اس بیڈروم میں وارڈروب نہیں تھا۔ بعد میں زبیدہ نے بنوایا تھا۔
وہ زیادہ دیر تک زبیدہ کا حسرت بھرا چہرہ نہ دیکھ سکے اور ایک دم واپس مڑے۔
''میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔ صبح سمیرا نے انڈے اور ڈبل روٹی لانے کے لئے کہا تھا، یاد نہیں رہا۔ گیٹ باہر سے لاک کر جاؤں گا۔''
بہت دنوں سے وہ محلے کے اسٹور پر نہیں گئے تھے۔ بلکہ دفتر سے نزدیکی مارکیٹ میں چلے جاتے اور وہاں سے سب کچھ لے آتے تھے۔ آج بھی اسٹور کی طرف جاتے جاتے وہ ٹھٹکے لیکن پھر سر جھکائے اسٹور پر آگئے۔
''ایک درجن انڈے اور ڈبل روٹی دے دینا۔''
اسٹور کے مالک نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''ارے رضا صاحب! آپ بڑے دنوں بعد آئے۔ خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہیں تھی؟''

''طبیعت خراب نہ ہو تو کیا ہو بھئی۔'' ان کے پڑوسی، قاضی صاحب بھی وہیں کھڑے تھے۔ ''جوان بیٹا اس عمر میں چھوڑ کر چلا گیا اور وہ بھی ایک مرتد، بے دین کافر شخص کے پیچھے۔ ہم تو شکر کرتے ہیں کہ ہمارے بیٹے نے ایک لڑکی کے لئے ہی گھر چھوڑا۔ کم از کم دین تو خراب نہیں کیا اپنا۔''

انہوں نے بنا کچھ کہے پیسے ادا کئے اور ڈبل روٹی اور انڈے لے کر گھر کی طرف پلٹ گئے۔

''بے چارے رضا صاحب۔'' انہوں نے اپنے پیچھے اسٹور والے کی آواز سنی تو تیز تیز چلنے لگے

پھر مزید چند دن لگے تھے سب کچھ طے کرنے میں۔

گھر بک گیا اور جاب سے انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ کچھ سال ہی رہ گئے تھے ریٹائرمنٹ میں بھی۔ دفتر کے ساتھیوں نے سمجھایا۔ باس نے کمرے میں بلا کر وجہ پوچھی۔

انہوں نے وجہ نہیں بتائی تھی۔ پھر راولپنڈی شفٹ ہونے سے پہلے انہوں نے دو دن مسلسل بانس بازار سے آگے والے اس مکان کا چکر لگایا تھا، جہاں احمد رضا رہتا تھا۔ لیکن مکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ وہ طیب خان کے ٹھکانے پر بھی گئے لیکن وہاں بھی تالے کے ساتھ ایک نوٹ لگا ہوا تھا۔

''کرائے کے لئے خالی ہے۔''

وہ یہ شہر چھوڑنے سے پہلے ایک بار پھر اس سے ملنا چاہتے تھے۔ زبیدہ اور سمیرا سے ملوانا چاہتے تھے۔ لیکن پتہ نہیں کہاں گم ہو گئے تھے وہ سب۔

'شاید ملک چھوڑ گئے ہوں۔' انہوں نے سوچا تھا۔

لیکن انہوں نے ملک نہیں چھوڑا تھا۔ اور اس وقت بھی جب وہ اس مکان کے سامنے سے مایوس ہو کر واپس جا رہے تھے، اسی گلی کے ایک اور مکان کے بیسمنٹ میں وہ الوینا کے ساتھ بیٹھا ہوا پوچھ رہا تھا۔

''کب تک الوینا!...... کب تک ہم یوں انڈر گراؤنڈ رہیں گے؟ کم از کم مجھے تو جانے دو۔ مجھے اپنے گھر والوں سے ملنا ہے۔''

''تمہیں کیسے جانے دیں؟..... پاگل ہو گئے ہو کیا؟...... تمہارے ذریعے انہیں ہم تک پہنچنے میں تھوڑی دیر بھی نہیں لگے گی۔''

''میں رات میں کسی وقت یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

''رات میں...... تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے گھر کی نگرانی نہیں کر رہے ہوں گے؟''

وہ ہولے سے ہنسی تھی۔

''تم لوگ فون بھی نہیں کرنے دیتے مجھے گھر میں تاکہ میں اپنے امی ابو کو اپنی خیریت بتا سکوں۔ تم اندازہ کر سکتی ہو، وہ میرے لئے کتنے پریشان ہوں گے۔''

''نہیں۔'' الوینا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''اس لئے کہ میں نے ماں باپ کی محبت نہیں دیکھی۔ کسی بھی رشتے کی محبت نہیں دیکھی میں نے۔ پھر بھی تمہاری حالت سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ اچھا تم فکر نہ کرو۔ آج میں رچی سے بات کرتی ہوں کہ تم فون کر سکو گھر۔''

اس نے ہولے سے اس کا بازو دبایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''ہم حالات کا جائزہ لے رہے ہیں احمد! جیسے ہی حالات بہتر ہوتے ہیں، تم گھر جا سکو گے۔ یوں بھی تمہارا اور باقی سب کا پاسپورٹ بن گیا ہے۔ جلد ہی ہم کسی اور ملک میں چلے جائیں گے۔''

''لیکن مجھے کہیں نہیں جانا۔''

''ہاں، ہاں، ٹھیک ہے۔ مت جانا۔ یہ تو اس لئے کہہ رہی ہوں کہ کیا خبر، حالات کیا ہوں۔ جانا پڑے۔ اوے! تم ٹی وی سے دل بہلاؤ۔ میں ذرا حضرت جی کی طرف جا رہی ہوں۔''

وہ چلی گئی تو وہ لیٹ گیا۔ اس کا ٹی وی دیکھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے یہاں بند ہوئے۔ اس روز اسے تقریب کے بعد گھر جانا تھا، جس میں رچی اور اس کے ساتھیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اسمٰعیل خان نے اسلام کے حوالے سے تقریر کی تھی۔ بڑی پُراثر تقریر تھی۔ وہ متاثر سا سن رہا تھا، جب اسمٰعیل خان نے کہا۔

''دنیا گمراہی کے اندھیرے میں گھر چکی ہے۔ اور یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب بھی گمراہی بہت زیادہ پھیل جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے اپنے پیارے بندوں کو پیغمبر بنا کر بھیجتا ہے اور وہ بنی نوع انسان کو گمراہی کے اندھیرے سے نکال لیتا ہے۔ اب ایک بار پھر دنیا گمراہی کے اندھیرو میں ڈوب چکی ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی اصلاح کے لئے بھیجا ہے کہ ہم انہیں سیدھا راستہ دکھائیں۔ صحیح اور غلط میں فرق بتائیں اور.......''

''آپ کا مطلب ہے کہ آپ نعوذ باللہ پیغمبر ہیں؟'' کسی نے کہا تھا۔ احمد رضا نے چونک کر کہنے والے کو دیکھا تھا۔

''نہیں۔'' وہ یکدم کھڑا ہو گیا تھا۔ ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے آخری نبی ہیں اور ان کے بعد نبیوں اور پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔''

''بیٹھ جاؤ احمد رضا!'' پاس بیٹھے طیب خان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔ ''اس طرح حضرت صاحب کی گفتگو کے دوران انہیں ٹوکنا خلاف ادب ہے۔''

''لیکن وہ شخص۔'' اس نے مڑ کر اس شخص کو دیکھنا چاہا تھا، جس نے بات کی تھی۔ لیکن وہ محفل میں اسے نظر نہیں آیا۔ اسمٰعیل خان دونوں ہاتھ رخساروں پر ہولے ہولے مارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''توبہ..... توبہ! کہاں میرے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام و مرتبہ، کہاں مجھ جیسا ناچیز حقیر...... ارے میں تو ان کے قدموں کی خاک، ان کی گلی کا کتا......''

'کیا یہ سب بہروپیے ہیں اور میں بہروپیوں میں پھنس گیا ہوں؟' احمد رضا نے پہلی بار سوچا تھا اور تب ہی ایک دم ہال کا دروازہ زور سے کھلا۔ ایک شخص جو غالباً گارڈ تھا اور دروازے پر ڈیوٹی دے رہا تھا، اندر آیا۔

''پولیس...... وہ گلی میں داخل ہو رہے ہیں اور مکان کو گھیرے میں لینا چاہتے ہیں۔''

الو ینا اور دوسری لڑکیاں جو اسمٰعیل خان کے پیچھے کھڑی تھیں، تیزی سے اسمٰعیل خان کے ساتھ پردے کے پیچھے غائب ہو گئیں۔ طیب خان نے حیران بیٹھے احمد رضا کا ہاتھ پکڑا اور پھر وہ سب دوڑتے ہوئے مکان کے پچھلے حصے میں بنی ایک کوٹھری میں آ گئے تھے، جس میں سے ایک دروازہ باہر ایک تنگ سی گلی میں کھل رہا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے اس گلی میں آ گئے۔ یہ کُل گیارہ افراد تھے۔ باقی شریک محفل افراد وہیں ہال میں رہ گئے تھے۔

''تیزی سے اس سامنے والے مکان میں چلو۔'' طیب خان نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ مکان کا دروازہ ایک دستک سے کھل گیا تھا۔ یہ بھی اس مکان کا پچھلا دروازہ تھا۔ پھر وہ اس مکان کی بیسمنٹ میں چلے گئے تھے۔ کیونکہ اس وقت تک پولیس نے مکان کا گھیراؤ کر لیا تھا اور گلیوں میں پھیل گئے تھے۔ پھر دو تین دن اسی مکان کے تہہ خانے میں رہنے کے بعد ایک رات یہاں اس مکان میں منتقل ہوئے تھے اور اب تک یہیں تھے۔

زندگی نے یہ کیسا کھیل کھیلا تھا اس کے ساتھ۔

'کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے میرے ساتھ۔' وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ 'بہت غلط۔'

لیکن اب وہ اس غلط کو صحیح کرنے پر قادر نہیں رہا تھا۔ کم از کم اکیلے وہ اس غلط کو صحیح نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ کسی اپنے کی...... ابو، سمیرا، امی۔

یہی تین افراد تھے جن کے سہارے وہ اس غلط کو صحیح کر سکتا تھا۔ وہ اس کے اپنے تھے۔ جوتیاں بھی ماریں گے تو

الت میں اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ ابو نے کب کب اسے سہارا نہیں دیا تھا۔ ایک بار جس اس کی کالج کے لڑکوں سے لڑائی ہوئی تھی۔ مخالف گروہ کے لڑکوں نے ایف آئی آر کٹوا دی تھی۔ وہ کیسے اس کے ساتھ تھانوں میں مارے مارے پھرے تھے اور کیسے انہوں نے معاملہ ہینڈل کیا تھا۔

اُسے ہر قیمت پر گھر جانا تھا۔

وہ اُٹھا اور چپل پہن کر باہر نکلا۔ اس تہہ خانے میں تین چار چھوٹے کمروں کے علاوہ ایک بڑا ہال بھی تھا۔ ان کمروں کے دروازے اس ہال میں کھلتے تھے۔ اوپر گراؤنڈ فلور پر جانے کے لئے سیڑھیاں اسی ہال سے گزرتی تھیں۔ ہال میں الوینا کھڑی تھی۔ اس نے مڑ کر احمد رضا کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

''آؤ.....گھر فون کرلو۔ میں نے رچی سے بات کی ہے۔ تسلی ہو جائے گی اور پتہ بھی چل جائے گا کہ تمہارے گھر کی نگرانی ہو رہی ہے یا نہیں۔''

وہ الوینا کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے سرے پر دروازہ تھا۔ الوینا نے تین بار دروازے پر دستک دی تھی، تب دروازہ کھلا۔ اس نے اندر قدم رکھا۔ یہ ایک چھوٹی سی لابی تھی اور لابی کے اختتام پر لاؤنج تھا۔ سامنے ٹی وی لگا تھا اور صوفوں پر رچی اور اس کے ساتھی بیٹھے ڈرنک کر رہے تھے۔ جب سے وہ اس مکان میں چھپے تھے، پہلی بار وہ اوپر آیا تھا۔ رچی کا اسلامی نام اگرچہ عبداللہ رکھا گیا تھا لیکن وہاں سب ابھی تک اسے رچی ہی بلاتے تھے اور اس نے بھی کبھی منع نہیں کیا تھا۔ رچی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہیلو۔'' الوینا نے رچی کی طرف دیکھا۔ ''احمد کو فون کرنا ہے۔''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔'' اس نے فون اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھا تھا۔ پھر اس کی اُنگلیاں بے تابی سے نمبر ملانے لگیں۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی لیکن کسی نے فون ریسیو نہیں کیا تھا۔

'بھلا اس وقت کہاں جا سکتے ہیں؟ ابو بھی دفتر سے آچکے ہوں گے۔ سمیرا، امی......'

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ پھر نمبر ملا رہا تھا۔ شاید امی اور سمیرا کچن وغیرہ میں ہوں۔

'شاید ان کا فون خراب ہے۔'

الوینا نے اس کے چہرے پر پھیلتی مایوسی کو دیکھ کر تسلی دی۔

پھر وقفے وقفے سے اس نے کئی بار نمبر ملایا۔ کبھی بیل ہوتی، کبھی انگیج کی بیل ہونے لگتی۔

'فون ہی خراب ہے۔' اس نے مایوسی سے سوچا اور ایک بار پھر نمبر ملانے لگا۔ لیکن اس بار وہ کمپلین کروا رہا تھا۔ رچی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''جی فون خراب ہے۔ پتہ نہیں کب سے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں نے تو ابھی فون کیا ہے اس نمبر پر۔ اٹینڈ نہیں ہو رہا۔'' وہ سب اُس کی طرف متوجہ تھے۔

''جی تھینک یو۔ کب تک ٹھیک ہو جائے گا؟'' وہ ریسیور کریڈل پر ڈال کر مڑا اور الوینا کی طرف دیکھا۔

''فون ہی خراب ہے۔ کہہ رہے ہیں جلد ٹھیک کر دیں گے۔ لیکن پتہ نہیں کب کریں گے۔''

رچی نے الوینا کو اشارہ کیا۔

''ہو جائے گا۔ گھبراؤ نہیں۔'' الوینا نے اسے تسلی دی۔

''رچی! تمہارا اگر کوئی جاننے والا ہو تو تم فون کرو۔ ورنہ یہ لوگ بڑا تنگ کرتے ہیں۔ کمپلین کروا بھی دو تو ہفتہ ہفتہ نہیں آتے۔''

وہ پھر احمد کی طرف مڑی۔

''چلو پھر نیچے ہی چلتے ہیں۔ میں چیک کرتی رہوں گی۔ ٹھیک ہوا تو تمہیں بتا دوں گی۔''

وہ الوینا کے ساتھ واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ لیکن اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ باہر کھلی فضا میں جانا چاہتا تھا۔ اپنا گھر، اپنا محلہ، اپنی گلیاں، اپنی یونیورسٹی......سب یاد آ رہا تھا اسے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک ان کی مرضی نہ ہوئی، وہ یہاں سے نہیں جا سکتا۔ کوشش کرے، تب بھی نہیں۔ سوا سے انتظار کرنا تھا اس وقت کا جب یہ لوگ اسے اجازت دیں گے۔

ایک بار وہ یہاں سے چلا گیا تو پھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اس وقت آنے والے لمحوں سے بے خبر وہ سوچ رہا تھا۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا، فون ٹھیک نہیں ہو سکا تھا۔ وہ دن میں ایک بار ضرور کوشش کرتا تھا۔

پورے ایک ہفتے کے بعد الوینا نے اسے کہا تھا۔

''چلو آج تمہارے گھر چلتے ہیں۔''

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔''

''ٹھیک ہے.....چلو۔''

اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے اور جلدی سے جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا سوٹ کیس گھسیٹا۔

''یہ سامان بعد میں لے جانا۔ ابھی دیکھو وہاں کے حالات کیا ہیں۔ تمہارے ابو تم سے سخت ناراض تھے۔ انہوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا تھا۔''

''ہاں۔ لیکن ابو کا غصہ بہت جلد اُتر بھی جاتا ہے۔ میں جب انہیں یقین دلاؤں گا کہ ایسا کچھ نہیں تھا، جو انہوں نے سمجھا تو وہ میری بات کا یقین کر لیں گے۔''

''اس روز بھی تو تم نے اُنہیں یقین دلایا ہو گا۔'' الوینا دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔

''نہیں۔ اس روز میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں تو بس حیران رہ گیا تھا۔ خیر اب تو امی اور سمیرا بھی ہوں گی نا میری سفارش کرنے کو۔'' وہ مسکرایا اور پھر ہاتھ اپنے اٹیچی کیس کے ہینڈل پر رکھا۔

''رہنے دو۔ پھر لے جانا۔''

''میں اگر نہ آنا چاہوں تو؟'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''ایز یو وِش۔'' وہ بھی مسکرائی تھی۔ ''اب جلدی کرو۔''

''میں خود ہی چلا جاتا ہوں ٹیکسی کر کے۔'' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے کہا۔

''اب تکلف مت کرو۔'' الوینا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ اور جب وہ پورچ میں آیا تھا تو ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ یوں، جیسے مدتوں بعد اس نے سورج کی روشنی دیکھی ہو۔ اور جب تک گاڑی روڈ پر نہیں آئی تھی، اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے گھر جا رہا ہے۔ اس کا دل بار بار تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا۔

امی، ابو، سمیرا......ان کی شکلیں بار بار اس کے تصور میں آ رہی تھیں۔

سمیرا دوڑ کر دروازہ کھولے گی۔ اسے دیکھ کر چیخ پڑے گی۔ بھاگ کر برآمدے میں جائے گی۔ یا پھر وہیں سے ہی امی کو آواز دے گی۔

سب کچھ ایسا ہی ہو گا۔ وہی گیٹ، وہی صحن، برآمدہ، وہی برآمدے میں پڑا تخت۔ بھلا اتنے سارے دنوں میں کیا تبدیلی آ سکتی ہے؟' اس نے سوچا تھا۔

اس نے الوینا کو خدا حافظ کہا۔

''میں یہیں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ کچھ دیر رُکوں گی۔ کیا پتہ.....'' اس نے احمد رضا کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے ابو

راضی نہ ہوں اور تمہیں واپس آنا پڑے۔

اس نے الوینا کی طرف دیکھا۔ وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن پھر کچھ کہے بنا آگے بڑھ گیا۔ اتفاق سے گلی میں کوئی بھی واقف کار نہیں ملا تھا۔ وہ سیدھا گیٹ تک آیا اور بیل پر انگلی رکھ دی تھی۔ اندر کہیں بیل ہوئی تھی۔ سمیرا کا تصور کر کے وہ مسکرایا۔

اتنی دیر تک بیل ہونے پر وہ ضرور جھنجلا رہی ہوگی۔ پھر گیٹ کھلا اور ایک اجنبی صورت نظر آئی۔

''جی! کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''حسن رضا صاحب سے۔'' وہ بوکھلا گیا۔

''وہ تو یہاں سے چلے گئے۔''

''کہاں؟'' اس پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ ''یہ تو اپنا......ان کا اپنا گھر تھا۔''

''جی ہاں! فروخت کر دیا ہے انہوں نے۔ ہم نے خریدا ہے۔'' وہ شخص کہہ رہا تھا۔

''آپ کو ان کا ایڈریس پتہ ہے، کہاں گئے ہیں وہ؟'' اُس نے پُر امید نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہیں۔ ہمیں تو علم نہیں ہے۔ کہیں کسی دوسرے شہر چلے گئے ہیں شاید۔''

وہ شخص گیٹ بند کر کے چلا گیا تھا لیکن وہ وہیں کھڑا تھا۔ مایوس اور دل گرفتہ سا۔

کچھ دیر وہیں کھڑا رہنے کے بعد وہ پلٹا۔ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح سر جھکائے وہ واپس جا رہا تھا۔ جب حسن رضا صاحب نے گلی میں قدم رکھا اور اسے گیٹ کے پاس سے مڑتے دیکھا۔ اتنی دور سے بھی انہوں نے پہچان لیا تھا۔ وہ احمد رضا تھا۔

''احمد رضا......'' ان کے لب ہلے تھے اور دل سینے کے اندر زور سے پھڑ پھڑایا۔ لمحہ بھر کے لئے انہوں نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کسی مکان کی دیوار سے ٹیک لگائی اور پھر یونہی دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

❀○❀

''یہ مریم کی کہانی ہے۔

مریم جو حورعین کی ماں تھی۔ حورعین نے اس سے صبر سیکھا تھا اور آنسو اس نے اس سے ورثے میں پائے تھے۔ اور یہ زمین کی کہانی ہے۔ مریم، حورعین اور زمین ایک ہی تو ہیں۔ تینوں میں دکھ کی سانجھ ہے۔''

پاؤلن لیکولی دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں ٹھوڑی رکھے، کہنیاں گود میں رکھے کشن پر ٹکائے بہت دلچسپی سے سامنے بیٹھے ایبک فلک شاہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی۔

''تو تمہارا یہ خیال ہے ایبک فلک شاہ! کہ تمہاری یہ کہانی تمہاری شاہکار کہانی ہو سکتی ہے۔''

ایبک مسکرا دیا۔

''اور اگر یہ شاہکار نہ بھی ہوئی، تب بھی تم مجھے اسے پڑھنے کے لئے ضرور دینا۔ میں اسے شاہکار سمجھ کر ہی پڑھوں گی۔''

وہ پھر مسکرا دیا۔

وہ کل صبح ہی بہاول پور سے آیا تھا اور آج شام پاؤلن لیکولی کے سامنے بیٹھا تھا۔ بابا جان ابھی لاہور میں ہی تھے اور اسے یہاں ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں شرکت کرنا تھی۔ وہ بابا جان سے معذرت کر کے کل ہی یہاں پہنچا تھا۔ اور اب وہ الحمرا آرٹس کونسل میں ہونے والی اس تقریب میں شرکت کر کے باہر نکلا تو کچھ فاصلے پر فرنچ انسٹیٹیوٹ کا بورڈ دیکھ کر اس کے دل میں ایک دم پاؤلن لیکولی کا خیال آیا تھا اور اس نے اپنی گاڑی انسٹیٹیوٹ کی طرف موڑ دی تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ آج اتنے سالوں بعد بھی وہاں ہی ہوں گی۔ لیکن غیر متوقع طور پر وہ اسے انسٹیٹیوٹ کے گارڈن میں ہی مل گئی تھیں۔ وہ شاید کلاس لے کر نکلی تھیں۔

''گڈ ایوننگ میم!''

''گڈ ایوننگ۔'' پاؤلن نے اپنی عینک کو اچھی طرح ناک پر جماتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ذہین اور خوبصورت اسٹوڈنٹ کو پہچاننے میں اسے دیر نہیں لگی تھی۔

''تم ایبک فلک شاہ ہو نا؟''

اور ایبک فلک شاہ مسکرا دیا تھا۔ ''مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ مجھے پہچان لیں گی۔ آپ کی یادداشت حیرت انگیز ہے میم!''

اب وہ انہیں اپنی کہانی کے متعلق بتا رہا تھا اور پاؤلن دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

''تو یہ مریم اور حورعین کی کہانی ہے۔'' پاؤلن نے ایبک کی طرف دیکھا۔

''یہ دکھ کی سانجھ کی کہانی ہے۔''

''لیکن ایبک فلک شاہ! انہیں کیا دکھ تھا؟''

''ان کے بے حساب دکھ تھے میم!..... پتہ نہیں، میں سارے دکھوں کو لکھ بھی پاؤں گا یا نہیں۔''

''اور جب تم مریم کے دکھ لکھو تو اس پردیسی پاؤلن لیکولی کے دکھ بھی اس میں شامل کر لینا۔'' ان کی بھوری آنکھوں کی سطح گیلی ہو گئی تھی۔ ''یہ ساری دنیا کی عورتوں کے دکھ سانجھے کیوں ہوتے ہیں فلک شاہ! چاہے وہ فرانس کی پاؤلن لیکولی ہو یا تمہارے پاکستان کی مریم۔''

''میم!'' ایبک نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک لڑکی نے اسٹاف روم کے دروازے سے جھانکا۔

''میڈم! آپ کلاس لیں گی یا ہم چلے جائیں؟''

''میں آتی ہوں ابھی۔''

''او کے میم! میں اب چلتا ہوں۔ آپ کا وقت لیا۔''

''کوئی بات نہیں۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ اور میں تم سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ ہاں، تمہارے کام نہ آ سکنے کا افسوس ہے۔ اگر تم کہو تو پیرس میں میری ایک دوست ہے۔ اس سے کہوں؟''

''نہیں میڈم! کچھ ایسی ضروری بھی نہیں ہے۔ یوں ہی جب میں اپنی کہانی کا عنوان لکھ رہا تھا تو مجھے ژل لافورک کا خیال آ گیا تھا۔''

''تمہاری کتاب چھپے تو مجھے ضرور بھیجنا۔''

''شیور۔'' ایبک انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا تھا۔

ڈرائیو کرتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر ژل کی نظموں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ نظمیں جو ''لے سنگ لاتے ویلاتر'' میں چھپی تھیں۔ بہت یاد کرنے پر بھی اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ جب وہ فرنچ زبان سیکھ رہا تھا تو اس نے اس کی کئی نظموں کا انگریزی ترجمہ پڑھا تھا۔

''March for the death of earth funeral......(زمین کا جنازہ)''

کتنی انوکھی اور حیرت انگیز نظم تھی۔

اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ اور اس نے غیر ارادی طور پر دائیں طرف باہر دیکھا اور چونکا۔ اسے لگا جیسے اسٹاپ پر وہ کھڑی تھی۔

''اریب فاطمہ!'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''لیکن یہاں اس وقت، جب شام ہو رہی ہے؟'' اس نے گاڑی ریورس کی اور پھر بغور باہر دیکھا۔

وہ اریب فاطمہ ہی تھی۔ سیاہ چادر کو اچھی طرح لپیٹے کچھ گھبرائی ہوئی سی، اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی۔ شاید وہ اپنے روٹ کی

اس یا وین کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ یکدم ہی گاڑی روک کر نیچے اُترا تھا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔
''آپ یہاں؟''
اریب نے چونک کر سر اٹھایا۔
''آپ غالباً وین کا انتظار کر رہی ہیں۔''
''جی.....جی!'' اس نے پریشانی سے سڑک کی طرف دیکھا۔
''آیئے، میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔''
''نہیں۔ تھینک یُو۔ میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے ذرا فاصلے پر کھڑے لڑکوں کی طرف دیکھا۔ جب سے وہ اسٹاپ پر آئی تھی، وہ دونوں لڑکے وہاں کھڑے اسے گھورے جا رہے تھے۔
''آیئے اریب!'' ایبک کا لہجہ حتمی تھا۔ ''یہاں وین کے انتظار میں کھڑے ہونا مناسب نہیں ہے۔''
وہ ایک لمحہ کے لئے جھجکی۔ لڑکے اب بھی اس پر نگاہیں جمائے کھڑے تھے۔
''آیئے پلیز۔ اعتبار کریں مجھ پر۔''
اور اریب بنا کچھ کہے اس کے ساتھ چل پڑی۔ ایبک نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور خود چکر کاٹ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھا۔
وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔ ایبک نے ایک گہرا سانس لے کر گاڑی آگے بڑھا دی۔
''آپ یہاں کس کام سے آئی تھیں؟'' ایبک نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے رکھے ذرا سا رُخ موڑ کر اریب کی طرف دیکھا جو شولڈر بیگ گود میں رکھے مضطرب سی اس کے اسٹریپ کو انگلی پر لپیٹ اور کھول رہی تھی۔
''وہ میری ایک فرینڈ رہتی ہے ادھر۔ میرے نوٹس اور بکس اس کے پاس تھیں۔ وہ ہر روز کالج لانا بھول جاتی تھی تو......'' وہ ایک ہی سانس میں تیز تیز بولتے ہوئے ایک دم چپ ہو گئی تھی۔ ایبک جو اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کے خاموش ہونے پر وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔
''آپ کو عمر یا ہمدان کے ساتھ آنا چاہئے تھا۔ یوں اکیلے۔ آپ کو تو یہاں کے راستوں کا بھی صحیح طرح سے علم نہیں ہے۔''
''وہ میں اپنی فرینڈ کے ساتھ آئی تھی ادھر۔ اکیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے کہا تھا، وہ واپس مجھے گھر چھوڑ جائے گی۔ لیکن اس کے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اس کے ابو اور امی کہیں گئے ہوئے تھے۔ گاڑی نہیں تھی گھر پر۔'' وہ پھر تیز تیز بول رہی تھی۔ گھبرائی گھبرائی سی۔
''تو عمر کو ہی بلوا لیتیں۔''
''وہ عروج، میری دوست کہہ رہی تھی کہ ابھی پاپا آ جائیں گے تو وہ مجھے ان کے ساتھ جا کر چھوڑ آئے گی۔ اب شام ہونے لگی تھی تو میں خود ہی نکل آئی۔ عروج نے بتایا مجھے کہ کون سے نمبر کی بس یا وین جائے گی ماڈل ٹاؤن کی طرف۔''
''بہرحال آپ کو محتاط رہنا چاہئے اریب فاطمہ! آپ اس طرح کسی اجنبی پر بھروسہ نہیں کر سکتیں۔'' ایبک سنجیدہ تھا۔
''وہ اجنبی نہیں، میری دوست ہے۔''
''جو لڑکی آپ کے نوٹس لے کر آپ کو واپس دینا بھول جاتی ہے، وہ آپ کی دوست کیسے ہو سکتی ہے؟ اریب فاطمہ! آئندہ اسے اپنے نوٹس مت دیجئے گا۔'' ایبک نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔
اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور وہ بے دردی سے اپنا نچلا ہونٹ کچل رہی تھی۔
''پلیز! اپنی آنکھوں اور ہونٹوں پر ظلم نہ کریں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ صرف سمجھایا ہے آپ کو۔ پھر بھی برا لگا ہو سوری۔''
''نہیں، نہیں۔'' اس نے جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔ ''مجھے برا نہیں لگا۔ بالکل بھی برا نہیں لگا۔ آپ

صحیح کہہ رہے ہیں۔ مجھے اس طرح نہیں آنا چاہئے تھا اس کے ساتھ۔ میں بہت بے وقوف ہوں۔''
''دریں چہ شک است۔'' ایبک کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''میں کبھی کبھی یونہی بلا سوچے سمجھے......''
اس کی آنکھوں کی سطح پھر گیلی ہونے لگی تو اس نے جلدی سے چادر کے پلو سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ ایبک کے لبوں پر ٹھہری مسکراہٹ گہری ہوگئی۔
''بابا جان کیسے ہیں؟ اور آپ کب آئے؟'' اسے ایک دم خیال آیا تھا۔
''بابا جان ٹھیک ہیں۔ اور میں کل ہی آیا تھا۔''
اس نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اریب نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ اس کا دل ایک دم زور سے دھڑکا۔ اتنی دیر میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ ایبک کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہے۔ اور اگر مائرہ آنٹی مجھے ایسے دیکھ لیں تو......
اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ بے اختیار اپنے دھڑکتے دل پر رکھا۔
''سنیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''آپ مجھے اسٹاپ پر ہی اُتار دیجئے گا۔''
''کیوں؟'' ایبک پوچھنا چاہتا تھا لیکن پھر یکدم رک گیا۔ ''او کے۔ لیکن آپ اتنا ڈرتی کیوں ہیں اریب فاطمہ؟''
اریب فاطمہ نے ایک شاکی نظر اس پر ڈالی۔
'کیا وہ نہیں جانتا کہ مائرہ آنٹی......شاید اس روز میں نے اسے انکل شیر دل کے گھر میں بتایا تو تھا۔'
ایبک نے اس کی نظروں کی شکایت پڑھی اور نرمی سے کہا۔
''زندگی یوں ڈر ڈر کر نہیں گزر سکتی اریب فاطمہ! ڈرنے والوں کو لوگ زیادہ ڈراتے ہیں۔''
'اور اماں اس کے بالکل برعکس بات کرتی ہیں۔ اماں اور ایبک شاید دونوں کے اپنے اپنے تجربے ہیں۔' اس نے سوچا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔
سیاہ چادر میں خود کو چھپائے، ہاتھ گود میں رکھے، شولڈر بیگ پر دھرے وہ ذرا سا رخ موڑے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ایبک نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ اپنی تمام تر سادگی کے باوجود دل میں اُتری جا رہی تھی۔
'اریب فاطمہ! آپ اتنی نایاب اور انمول ہیں کہ کسی بھی دل کی خواہش ہوسکتی ہیں۔ اور کاش میں آپ کو یہ بتا سکتا۔'
ایبک نے سوچا اور گاڑی روک دی۔
''لیجئے آپ کا اسٹاپ آ گیا۔''
''شکریہ۔'' اس نے بھیگی پلکیں اُٹھائیں اور چادر سنبھالتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔
'اریب فاطمہ۔' ایبک نے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر سوچا۔ 'پتہ نہیں کیوں، حورعین کا سراپا لکھتے ہوئے تمہارا سراپا میرے سامنے آجاتا ہے۔'
وہ بازو اسٹیئرنگ پر رکھے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ سیدھا ہوا۔
اس کا ''الریان'' جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ صرف بابا جان کے لئے الریان جاتا تھا اور اب بابا جان ''الریان'' میں نہیں تھے تو......
اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ لیکن یوٹرن لے کر وہ پھر واپس آ رہا تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے گاڑی موڑی تھی۔
اندر کہیں اسے مزید دیکھنے کی طلب جاگی تھی یا جانے کیا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ ''الریان'' کے گیٹ کے سامنے موجود تھا۔ لیکن نہ تو اس نے ہارن دیا تھا، نہ ہی وہ گاڑی سے اُترا تھا۔

'شاید احسان ماموں گھر پر ہوں اور اُنہیں میرا آنا اچھا نہ لگے۔ ہمدان نے بتایا تھا کہ احسان ماموں، بابا جان کے بہاول پور جانے پر بہت ناراض ہوئے تھے۔' یک دم اسے خیال آیا تھا۔

'تو میرا خیال ہے، مجھے واپس چلے جانا چاہئے۔' اس نے سوچا۔ تب ہی گیٹ کھلا اور اندر سے عمر احسان باہر آیا اور اس کی گاڑی دیکھ کر تیزی سے گاڑی تک آیا۔

''آپ کب آئے ایبک بھائی! اور بابا جان کیسے ہیں؟ وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟ کب آئیں گے وہ؟....اور آپ یہاں کیوں رک گئے؟ گاڑی اندر لے آئیے نا۔ میں گیٹ کھولتا ہوں۔'' خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

''ارے نہیں عمر! بس میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا، آپ لوگوں کی خیریت پوچھتا چلوں۔ اب تم سے باہر ہی ملاقات ہوگئی ہے تو اندر نہیں آؤں گا۔ سب ٹھیک ہیں نا؟.....عاشی، بابا جان کو بہت یاد کرتی ہوگی۔ اسے بتا دینا۔ بابا جان دو تین روز تک آ جائیں گے۔''

اس کی اتنی لمبی چوڑی بات عمر احسان نے بڑے دھیان سے سنی تھی اور کوئی جواب دیئے بغیر گیٹ کھول دیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ عمر احسان اسے یوں ''الریان'' کے روڈ سے واپس آنے دیتا اور عمر احسان کے اصرار پر وہ گاڑی باہر ہی لاک کر کے اس کے ساتھ اندر آ گیا تھا۔

اور پھر سب ہی لونگ روم میں جمع ہو گئے تھے۔ منیبہ، حفصہ، ہمدان، زبیر، عاشی سب ہی بابا جان کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

''یار! میں تو ایک دو روز میں بہاول پور آنے والا تھا۔'' ہمدان نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بابا بھی کہہ رہے تھے۔ شاید وہ بھی چلیں۔''

''رئیلی؟'' ایبک کو بے حد خوشی ہوئی۔ ''بابا بہت خوش ہوں گے ہومی! تمہیں پتہ ہے نا وہ مصطفیٰ انکل کو کتنا یاد کرتے ہیں۔''

عاشی نے جو تقریباً منیبہ کے پیچھے چھپی ہوئی تھی، سر تھوڑا سا آگے کر کے ایبک کو دیکھا۔

''ایبک بھائی! آپ ہمارے بابا جان کو اپنے ساتھ کیوں لے گئے ہیں؟''

''ارے عاشی گڑیا! آپ اداس نہ ہوں۔ بابا جان دو چار روز میں آ جائیں گے۔''

''لیکن مائرہ مامی تو کہتی ہیں، وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ ادھر ہی رہیں گے، بہاول پور۔''

'کاش ایسا ہو کہ وہ وہیں رہ جائیں۔ ماما اور بابا کے پاس۔' ایبک نے دل گرفتگی سے سوچا اور عاشی کی طرف دیکھا۔

''نہیں گڑیا رانی! وہ آ جائیں گے۔''

ایبک نے لونگ روم میں موجود سب چہروں پر نظر ڈالی۔ وہ ان میں نہیں تھی۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

''اوکے۔ میں چلتا ہوں۔''

''ارے کہاں چلے؟'' ہمدان نے جو اپنے دھیان میں ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، حالانکہ آواز بند تھی اور صرف تصویریں نظر آ رہی تھیں، چونک کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

''گھر۔ انکل شیر دل انتظار کرتے ہوں گے۔ میں نے انہیں......''

''تو فون کر دو انہیں۔'' ہمدان نے اس کی بات کاٹی۔ ''اتنے دنوں بعد تو ملاقات ہوئی ہے اور ہم نے ابھی کوئی بات ہی نہیں کی۔''

''اور اتنی دیر سے آپ ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ ایبک بھائی کی طرف تو دیکھ ہی نہیں رہے۔'' عمر احسان کو ہمدان کا ایبک کی موجودگی میں ٹی وی کی طرف اتنی توجہ سے دیکھنا بہت برا لگا تھا۔

ایبک نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اسے اپنا یہ جذباتی سا ماموں زاد بھائی بہت عزیز تھا۔

''بیٹھ جاؤ یار!'' ہمدان نے پھر اصرار کیا تو وہ بیٹھ گیا۔ حفصہ چائے کا کہنے باہر چلی گئی۔
''ایبک بھائی! بابا جان کو اب تک آ جانا چاہئے تھا۔ آپ کو پتہ ہے نا۔ عثمان چچا اور چچی جان کے جانے میں تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں اور ان کا پروگرام عادل بھائی اور حفصہ کی منگنی کا بھی تھا۔''
سب کی فکر اور خیال رکھنے والی منیبہ کی ہر بات پر نظر ہوتی تھی۔
''بابا جان کو علم ہوگا۔ ان کی بات ہوتی رہتی ہے، مصطفیٰ انکل اور عثمان انکل سے۔'' ایبک بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔
اور تب ہی ایبک کی نظریں دروازے کی طرف اُٹھیں اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ دائیں ہاتھ سے پیشانی پر آئے بال پیچھے ہٹاتی ہوئی وہ اندر آ رہی تھی۔ لیکن پھر وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے گلے میں لٹکتے دوپٹے کو سر پر لیا اور واپس جانے لگی۔ اور عین اسی لمحہ منیبہ کی نظر بھی اس پر پڑی تھی۔
''ارے اریب! کہاں جا رہی ہو؟ یہ ایبک بھائی آئے ہیں، ان سے نہیں ملو گی؟''
ایبک اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اریب فاطمہ نے نظریں اٹھائیں اور پھر فوراً ہی جھکا لیں۔ لانبی پلکوں کا سایہ رخساروں پر لرزنے لگا۔
''کیسی ہیں آپ؟'' اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے ایبک نے شرارت سے پوچھا۔
''ٹھیک ہوں۔''
''ریبا آپی! آپ کب آئیں؟ میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔'' ایبک کے پاس بیٹھے بیٹھے عاشی نے پوچھا۔
''کچھ دیر پہلے ہی آئی ہوں۔'' وہ جانے کے لئے پلٹی۔
''کہاں جا رہی ہو اریب! کتنے دنوں بعد یہاں سب اکٹھے ہوئے ہیں۔ ورنہ جب سے بابا جان گئے ہیں جیسے ''الریان'' میں ویرانی ہی چھا گئی ہے۔''
اریب جھجکتی ہوئی سی آ کر منیبہ کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔ ایبک کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ ہمیشہ منیبہ کے پیچھے چھپ کر بیٹھتی تھی۔
''ایبک بھائی! آپ کھانا کھا کر جایئے گا۔'' حفصہ صافی سے ہاتھ پونچھتی ہوئی لاؤنج کے دروازے تک آئی تھی۔
''ارے نہیں۔ کھانے تک نہیں رُکوں گا۔ بس چائے پلوا دیں۔''
''چائے تو خیر آ رہی ہے۔ لیکن آپ کھانا بھی کھا کر جایئے گا۔''
''شکر ہے، آج ''الریان'' کے کسی ایک فرد کو تو ایبک بھائی کو کھانے تک روکنا یاد رہا۔'' عمر احسان نے با آواز بلند کہا۔
''ارے عمر! میں نے تم سے کچھ منگوایا تھا۔ ابھی تک گئے نہیں؟'' حفصہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔
''جا رہا ہوں۔''
''باقی سب لوگ کہاں ہیں؟'' ایبک نے پاس بیٹھے ہمدان مصطفیٰ سے پوچھا تھا لیکن جواب عمر کی طرف سے آیا تھا کہ ''الریان'' کے متعلق ساری خبریں اکثر وہی دیا کرتا تھا۔
''پاپا تو اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ مصطفیٰ انکل ابھی آفس سے ہی نہیں آئے جبکہ عثمان انکل، چچی جان، ثنا آنٹی شاپنگ کے لئے نکلے ہوئے ہیں عادل بھائی کے ساتھ۔ مرینہ بی بی سو رہی ہیں غالباً۔ کیونکہ کچھ دیر پہلے ان کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے ان کے خراٹوں کی آواز سنی تھی۔ جبکہ پرنسز رابیل احسان شاہ اور کوئین مائرہ احسان شاہ اپنے اپنے کمرے میں ہوں گی۔''
''یہ عمر بھی نا۔''
منیبہ نے مسکرا کر پاس بیٹھی اریب فاطمہ کو دیکھا تھا جو دوپٹے کے ایک کونے کو اپنی اُنگلی پر لپیٹ اور کھول رہی تھی۔

''فاطمہ!'' منیبہ کبھی کبھی اُسے فاطمہ کہہ کر بلاتی تھی اور اریب کو بہت اچھا لگتا تھا۔ کیونکہ اماں بھی کبھی کبھی اسے فاطمہ کہہ کر بلاتی تھیں۔ اس نے نظریں اُٹھائیں۔ ایبک، عاشی کے گرد ایک بازو حمائل کیے چپکے چپکے اس سے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔

'عاشی، ایبک کے آنے سے کتنا خوش ہوگئی ہے۔ ورنہ بابا جان کے جانے کے بعد کتنا کملا گئی تھی۔ حالانکہ سب ہی اس کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ عثمان انکل اور مصطفیٰ انکل گھر آتے ہی پہلے اس کا پوچھتے تھے۔ اور کیا ہی اچھا ہوا گر ایبک ہر روز الریان آتا رہے جب تک وہ یہاں ہے۔ عاشی بھی تو خوش رہے گی۔' اس نے سوچا۔

''کیا صرف عاشی یا تم بھی اریب فاطمہ؟'' دل نے سرگوشی کی تو وہ یکدم گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

''ارے رُکو تو۔ کہاں جا رہی ہو؟ حفصہ چائے لا رہی ہے۔'' منیبہ کو بھول گیا کہ وہ اس سے کیا بات کرنے والی تھی۔

''وہ میں مرینہ کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ اسے فلو ہو رہا تھا نا۔ کیا پتہ جاگ رہی ہو۔''

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

عاشی سے باتیں کرتے کرتے ایبک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ یہاں موجود تھی تو جیسے دل کے اندر خود بخود ہی جلترنگ بج رہے تھے اور وہ چلی گئی تھی تو اندر ایک دم خاموشی ہوگئی تھی۔

''مان لو ایبک فلک شاہ! کہ تم اس لڑکی اریب فاطمہ کے لئے دل میں کچھ خاص جذبات رکھتے ہو۔ بھلے اوپر سے کتنا بھی انکار کرو۔''

اس نے خاموش بیٹھے ہمدان کی طرف دیکھا جو پُرسوچ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور سوچا کہ یہ ہمدان آج اتنا چپ چپ سا کیوں ہے۔

''کیا بات ہے ہومی! تم کچھ خاموش سے ہو۔ سب ٹھیک ہے نا؟'' اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں۔'' ہمدان چونکا۔ ''بس یونہی سستی سی ہو رہی ہے۔ تم کچھ دن رُکو گے یا......''

''رُکوں گا۔ دو دن یا شاید زیادہ۔''

''تو ٹھیک ہے۔ کل آؤں گا تمہاری طرف۔''

ایبک نے بغور اسے دیکھا۔ کوئی بات تھی ضرور جو ہمدان مصطفیٰ کو پریشان کر رہی تھی۔

تب ہی حفصہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی اندر آئی تھی۔

''چائے آگئی۔'' ہمدان مصطفیٰ کے کندھے سے سر ٹکائے اونگھتا ہوا زبیر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

ایبک فلک شاہ کا دل یکا یک اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ چائے پی کر رکا نہیں تھا۔ حالانکہ سب نے ہی بے حد اصرار تھا۔ اور سب کو خدا حافظ کہہ کر وہ تیز تیز چلتا ہوا جا رہا تھا، جب اپنے کمرے کی کھڑکی سے رابیل احسان نے اسے جاتے دیکھا۔

یہ تو ایبک تھا......

وہ تھوڑا سا آگے کو جھکی۔ اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا اور اس کی کھڑکی سے پورچ، لان اور گیٹ نظر آتا تھا۔

'ایبک اور عمارہ پھپھو اتنے برے ہرگز نہیں ہیں جتنا مما انہیں سمجھتی ہیں۔'

اس نے عمر اور ہمدان کو اس کے پیچھے گیٹ تک جاتے دیکھا اور مڑ کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

'اور مما تو یونہی ہر ایک سے فوراً بدگمان ہو جاتی ہیں۔ جیسے اریب فاطمہ سے ہوئیں۔ حالانکہ وہ بے چاری تو وہاں اپنے گاؤں کی لڑکی سے ملنے گئی تھی اور مما نے پوری کہانی بنا لی۔ شکر ہے ان کی غلط فہمی دُور ہوئی۔'

اس نے تکیے کے پاس پڑی کتاب اٹھا لی۔ تب ہی مائرہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔

''ایبک یہاں آیا ہوا ہے نیچے۔'' مائرہ نے اسے مخاطب کیے بغیر کہا۔ ''سمجھ نہیں آتا، اب کیوں آیا ہے یہاں؟ پہلے تو

بابا جان سے ملنے کا بہانہ تھا اور اب۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ''مجھے منیبہ سے کام تھا کوئی۔ اور اب نہ جانے کب تک بیٹھے گا وہ۔''

''وہ چلا گیا ہے مما!'' رابیل نے سر اٹھا کر مائرہ کو دیکھا۔

''کیا تم اس سے ملنے نیچے گئی تھیں؟''

''نہیں۔''

''تو تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ چلا گیا ہے؟''

''کھڑکی سے دیکھا تھا اسے جاتے ہوئے کچھ دیر پہلے۔'' وہ بے زار ہوئی اور نظریں کتاب پر جما دیں۔

''تم جانتی ہو نا، رابی! تمہارے پاپا عمارہ، ایبک اور اس کے باپ کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ نفرت کرتے ہیں ان سے۔''

''حالانکہ الریان کا ہر فرد ان سے محبت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ عمر اور زبیر بھی۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ مائرہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''مجھے اس طرح مت دیکھیں مما!'' وہ مزید بے زار ہوئی۔ ''مجھ ایبک یا اس کے خاندان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''او کے!'' مائرہ نے پُرسکون ہوتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا اور کھڑی ہو گئیں۔ اپنے ہاتھوں سے اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو پیچھے کیا۔

''کیا پڑھ رہی ہو؟''

''یونہی، مونی سے ایک ناول لیا تھا پڑھنے کے لئے۔''

ور مونی کے نام پر اسے یاد آیا کہ وہ تو منیبہ کی طرف جا رہی تھیں...... پھر ایک کا سن کر رک گئی تھیں۔

ٹھیک ہے۔ تم پڑھو۔ میں ذرا نیچے جا رہی ہوں۔''

کمرے سے باہر نکل گئیں تو رابیل نے کتاب کھول لی لیکن وہ غیر ارادی طور پر ایبک اور عمارہ پھپھو سے متعلق نے لگی تھی۔ 'پتہ نہیں، مما اور پاپا ان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟ شاید عمارہ پھپھو اور انکل مومی نے انہیں کبھی کوئی چایا ہو۔ کوئی گہرا دکھ۔'

سیڑھیاں اُترتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔ 'مجھے جلد از جلد احسان اور مصطفیٰ بھائی سے ہمدان کے لئے بات کر لینی ے۔ تاکہ رابیل کا دھیان اِدھر اُدھر نہ ہو۔ لیکن پہلے مجھے مونی سے بات کرنی چاہئے کہ ہمدان کا کیا خیال ہے رابی شعلق۔'

وہ اپنے دھیان میں سیڑھیاں اُتر رہی تھیں کہ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ان کی نظر اریب فاطمہ پر پڑی۔ جو لاؤنج میں کونے والے صوفے پر تنہا بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اور اس کی گود میں کتاب کھلی پڑی تھی۔ وہ وہیں سیڑھی پر ٹھٹک کر رک گئیں۔

یہ لڑکی تو جیسے یہاں آ کر روز بروز نکھرتی جا رہی ہے۔

تب ہی ہمدان، لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آیا تھا اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر لونگ روم میں چلا گیا تھا۔ اریب فاطمہ نے چونک کر ہمدان کو جاتے دیکھا اور پھر اس کی نظر سیڑھیوں پر کھڑی مائرہ پر پڑی تو وہ یکدم کھڑی ہو گئی۔ کتاب اس کی گود سے نیچے گر پڑی۔

''تم یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟'' اس کے قریب آ کر مائرہ نے سخت لہجے میں پوچھا۔ اریب فاطمہ گھبرا گئی۔

''وہ بس یوں ہی...... میں یہاں بیٹھ کر پڑھ رہی تھی۔''

''سنو لڑکی! میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا؟'' مائرہ نے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھا تو اریب فاطمہ کو حیرت ہوئی۔

نے تو اس روز کے بعد سے ہمدان سے کبھی بات تک نہ کی تھی اور اگر اسے علم ہوتا کہ ہمدان سب کے ساتھ بیٹھا ہوا تو وہ منیبہ اور حفصہ کے اصرار کے باوجود وہاں نہ جاتی تھی۔

"یہ لڑکوں والا گھر ہے اریب فاطمہ! تمہیں محتاط ہو کر رہنا چاہئے۔ ایسی جگہوں پر مت بیٹھا کرو کہ آتے جاتے کی نظریں تم پر پڑیں اور خوامخواہ میں کوئی بات بنے۔ اور تم بھی اپنی ماں کی طرح...... اپنی ماں کا قصہ تو تمہیں پتہ ہی ہو گا نا۔"

"ماں کا قصہ...... کیا قصہ؟" اس نے بے حد حیران ہو کر سوچا۔

"پتہ نہیں یہ مردہ مامی نے بھی تمہیں یہاں کیوں بھیج دیا۔ وہاں رحیم یار خان میں ہی تمہیں ہاسٹل بھجوا دیتیں۔ پھر اتنا پڑھ لکھ کر تم نے کرنا بھی کیا ہے۔ شادی تو وہیں ہونا ہے نا تمہاری ددھیال میں۔ سنا تھا، تمہاری دونوں پھپھیاں تمہیں بہو بنانا چاہتی ہیں اور ان کے لڑکے ان پڑھ۔ چار جماعتیں بھی پاس نہیں کیں انہوں نے۔"

مائرہ نے اتنی لمبی چوڑی بات کر کے ساکت کھڑی اریب کی طرف دیکھا جو اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے مائرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی سوالیہ نظریں بار بار مائرہ کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ "کیا ہے؟..... اماں کا بھلا کیا قصہ ہے؟" لیکن یکدم اُمڈ آنے والے آنسوؤں نے اس کا حلق بند کر دیا تھا۔ اس نے جیسے مائرہ کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ وہ تو ان ہی دو لفظوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ مائرہ بات مکمل کر کے وہاں رُکی نہیں تھیں اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی لاؤنج سے چلی گئی تھیں۔ لیکن وہ وہاں ہی کھڑی تھی، ساکت۔ آنسو اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھلملا رہے تھے اور وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔

"یہ مائرہ آنٹی نے کیا کہا اور کیوں؟" اسے کبھی کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر کبھی کوئی بات ہوئی ہوتی تو کیا ابا اور ان کی اماں بار بار نہ دہراتیں؟ جبکہ وہ اماں کی معمولی سی بات کو مہینوں دہراتی تھیں۔

اماں نے کنیئرڈ سے ایف۔ ایس۔ سی کیا تھا۔ پھر فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ لیکن پھر اپنے والد کی وفات کی وجہ سے انہیں رحیم یار خان آنا پڑا اور ان کی شادی اچانک ابا سے ہو گئی اور ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ایک بار اماں نے اسے بتایا تھا۔ آنکھوں میں اٹکے آنسو رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ اور عین اسی لمحے ایک فلک شاہ اور عمر نے لاؤنج میں قدم رکھا تھا۔

"ایبک بھائی! آپ یہاں رکیں۔ میں چابی لے کر آتا ہوں۔" عمر نے ایبک سے کہا اور لِونگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی نظر کونے میں کھڑی اریب فاطمہ پر نہیں پڑی تھی۔ لیکن ایبک نے اچانک ہی دائیں طرف دیکھا تھا اور پھر اس کی نظر اریب فاطمہ پر پڑی۔ اریب فاطمہ کے رخسار آنسوؤں سے بھیگتے جا رہے تھے اور وہ ساکت کھڑی تھی۔ اریب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اریب فاطمہ رو رہی تھی۔

وہ مضطرب سا ہو کر اس کی طرف بڑھا۔

"کیا ہوا اریب فاطمہ؟" اضطراب اس کے لہجے سے چھلکتا تھا۔

ساکت کھڑی اریب فاطمہ کے وجود میں جنبش ہوئی۔ اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر ایبک کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ لرزے۔

"اریب فاطمہ! تمہارے آنسو مجھ سے سہے نہیں جاتے۔ مت رویا کرو۔"

اس کے کانوں میں جیسے کسی نے سرگوشی کی۔ اس نے بے اختیار ہاتھ اونچا کیا رخساروں پر بہتے آنسو پونچھنے کے لئے اور ایک دم کچھ کہے بنا وہ جھکی اور زمین پر پڑی کتاب اٹھا کر تیزی سے سامنے منیبہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ایبک نے پریشانی سے اسے جاتے دیکھا۔ ایک لمحہ کو اس کا جی چاہا، وہ اس کے پیچھے جائے اور اس سے رونے کا سبب پوچھے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ وہیں رک گیا اور لِونگ روم سے آتے عمر کو دیکھنے لگا جس کے ہاتھ میں اس کی گاڑی کی چابی تھی۔

"یہ لیجئے ایبک بھائی! وہیں صوفے پر پڑی تھی، جہاں آپ بیٹھے تھے۔"

ایبک نے چابی لے لی۔
وہ عمر اور ہمدان کے ساتھ ''الریان'' سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے ملک صاحب اپنے گیٹ سے باہر آتے ہوئے نظر گئے تو وہ ان سے باتیں کرنے لگا۔ ملک صاحب اسے بتا رہے تھے کہ وہ گھر فروخت کر کے اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا رہے ہیں۔ جیسے ہی گھر بکا، وہ چلے جائیں گے۔ ہمدان انہیں بات کرتا چھوڑ کر واپس اندر چلا گیا تھا۔ جبکہ عمر وہیں کھڑا رہا تھا۔ اور جب ملک صاحب سے اجازت لے کر وہ گاڑی تک آیا اور اس نے چابی کی تلاش میں پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تو اسے یاد آیا کہ چابی تو شاید وہ اندر ہی صوفے پر چھوڑ آیا ہے۔
اس نے عمر کا بازو تھپتھپایا اور لاؤنج کا دروازہ کھولتا تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گیا۔
'اریب فاطمہ رو رہی تھی۔
وہ کیوں رو رہی تھی؟
وہ مردہ پھپھو کے پاس کیوں رہتی تھی؟ اور پھر یہاں.....'
وہ ڈرائیو کرتے ہوئے مسلسل اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔
وہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ منیبہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ مردہ پھپھو کے پاس رہتی تھی۔ مردہ پھپھو نے اسے اپنی بیٹی بنا رکھا تھا۔ اور اس کے والدین گاؤں میں رہتے تھے۔
یکا یک بہت شدت سے اس کے دل میں اس کے متعلق جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کا رونا اور اس کے آنسو اسے بہت تکلیف دیتے تھے۔
'کاش وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ سکتا۔'
بے اختیار اس کے دل نے خواہش کی اور وہ چونک اٹھا۔ پھر اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''اریب فاطمہ! میں سچ مچ تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اور کون جانے تم کب یہ جان پاؤ گی۔'' اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہوئی۔
گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے جب وہ اپنی انیکسی کی طرف جا رہا تھا تو اسے کرنل شیر دل لان میں مل گئے تھے۔
''بہت دیر کر دی۔ کیا بہت بڑا فنکشن تھا؟ زیادہ گیدرنگ تھی؟'' اس کے ساتھ چلتے کرنل شیر دل نے پوچھا۔
''نہیں۔ زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اور کتاب پر تبصرہ بھی صرف چند لوگوں نے کیا تھا۔ میں دراصل ''الریان'' چلا گیا تھا۔''
''تمہیں بھی اپنے بابا کی طرح ''الریان'' سے عشق ہوتا جا رہا ہے۔'' کرنل شیر دل مسکرائے تو وہ بھی مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اریب فاطمہ کا سراپا لہرایا۔
''ہاں، اب بتاؤ میرے یار! کیا حال ہے؟'' انیکسی کے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کرنل شیر دل نے اسے دیکھا۔
''بابا خوش ہیں بہت اور مضطرب بھی۔ کبھی کبھی ایک دم رو پڑتے ہیں۔''
''ہاں! میں سمجھ سکتا ہوں، وہ کن کیفیات سے گزر رہا ہوگا۔ گزرا ہوا وقت پلٹ تو نہیں سکتا۔ لیکن کاش! ٹوٹے سارے رشتے پھر سے جڑ جائیں۔ احسان شاہ کے شک اور بے اعتباری نے میرے دوست کو مار ڈالا۔''
انہوں نے ایک گہری سانس لے کر میز پر پڑا اخبار اٹھا لیا۔
''چور، چوری سے چلا جائے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا ایبک!'' کرنل شیر دل نے کہا۔
''کیا مطلب؟'' وہ جو کافی بنانے کچن کی طرف جا رہا تھا، پلٹ پڑا۔
''مطلب یہ میری جان! کہ تم نے سیاست میں حصہ نہ لینے کا وعدہ کیا تھا مجھ سے، اپنے باپ سے۔''
''تو؟'' ایبک نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"یہ اپنا کالم دیکھا ہے یار!.....اپنے قلم کی دھار ذرا کم کرلو۔تمہارے اکثر کالم پڑھ کر میں خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔"

"انکل شیر دل!" ایبک سنجیدہ ہوا۔ "کیا ہم اپنی قوم کے لئے آنسو بھی نہیں بہا سکتے؟ یہ سب کچھ جو ہمارے وطن میں ہو رہا ہے اور ہمارے عوام جس دکھ سے گزر رہے ہیں، کیا اس پر کچھ لکھنا بھی جرم ہے؟"

"نہیں۔لیکن مجھے تمہارے قلم کی کاٹ سے ڈر لگتا ہے۔کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔بس بوڑھے لوگوں کے دل کمزور ہوتے ہیں۔مجھے وہ رات کبھی نہیں بھولتی جب تمہاری مخالف پارٹی کے لوگوں نے تمہیں مار مار کر زخمی کر دیا تھا۔تب پہلی بار مجھے اور تمہارے بابا کو پتہ چلا تھا کہ تم نے کوئی سیاسی پارٹی جوائن کر لی ہے۔"

"ہاں۔" ایبک کو بھی بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔اپنی اس اسٹوڈنٹ لائف میں وہ بہت پُر جوش ہوا کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ نوجوانوں کو سیاست میں ضرور حصہ لینا چاہئے۔لیکن پھر اس حادثے کے بعد اسے بابا سے وعدہ کرنا پڑا تھا کہ وہ کبھی سیاست میں حصہ نہیں لے گا۔لیکن شاید انکل شیر دل سچ ہی کہہ رہے تھے۔چور چوری سے چلا جائے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ملکی سیاست پر اس کی گہری نظر تھی اور اس کے کالم کافی مقبول تھے۔

وہ عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ وعدے کی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔سو اس نے قلم تھام لیا تھا اور ایک مشہور اخبار میں پچھلے تین سال سے وہ "اے شاہ" کے نام سے کالم لکھ رہا تھا۔

اور کرنل شیر دل کے علاوہ اس کے جاننے والوں میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ "اے شاہ" ایبک فلک شاہ ہی ہے۔

اخبار ہاتھ میں لئے لئے کرنل شیر دل کھڑے ہو گئے۔

"ارے! آپ کہاں چلے؟ میں آپ کے لئے کافی بنانے جا رہا تھا۔

"نہیں یار! اس وقت کافی پی لی تو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔اور سنو، تمہاری آنٹی نے کھانے پر کچھ خاص اہتمام کر رکھا ہے تمہارے لئے۔تم ادھر ہی آ جاؤ، چینج کر کے۔"

"لیکن مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔"

"تمہاری آنٹی کو تمہارے نہ آنے سے مایوسی ہو گی۔تھوڑا سا کھا لینا۔" کرنل شیر دل اسے تاکید کر کے چلے گئے تو وہ پھر بیٹھ گیا۔

'کاش! بابا نے مجھ سے وعدہ نہ لیا ہوتا تو میں اپنی ایک سیاسی پارٹی بناتا۔جس میں صرف محبِ وطن، مخلص اور دیانت دار لوگ شامل ہوتے۔قائداعظم جیسے لوگ۔'

اس کے دل میں کہیں کسی پچھتاوے کا احساس جاگا تھا۔

'ہمارے یہ خالی خولی لفظ تو ایک چیونٹی تک نہیں مار سکتے اور دشمن ہماری صفوں میں گھس آئے ہیں۔' اور اسے یاد آیا۔بابا نے ایک بار کہا تھا۔

"حق نواز بھی تمہاری طرح کی باتیں کرتا تھا اور اس نے بھی ایک یوٹوپیا بنا رکھا تھا۔یہ سب باتیں ہیں محض۔اس ملک میں تم صرف ایسے خواب دیکھ سکتے ہو۔لالچ ان کی ہڈیوں میں گھس گیا ہے اور گودے میں شامل ہو گیا ہے۔"

ایک گہری سانس لے کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

❁○❁

اس نے اپنی فائل نکالی اور چند لکھے ہوئے صفحات پر سرسری سی نظر ڈال کر اس نے کاغذ کلپ بورڈ پر لگائے اور لکھا۔

"اور جب حورعین پیدا ہوئی تو چوہدری غلام فرید کی حویلی میں ماتم بپا ہو گیا اور چوہدری غلام فرید کی دونوں بہنوں نے بین کئے اور بھائی کے نصیب پر دھاڑیں مار مار کر رونے کا ڈرامہ کیا۔اور خود چوہدری غلام فرید سات دن تک گھر نہیں آیا۔اور ساتویں دن جب اس نے گھر میں قدم رکھا تو اس نے حورعین کی طرف دیکھا تک نہیں، جو مریم کی گود میں لیٹی تھی اور مریم اسے تھپک رہی تھی۔نہ مریم نے پوچھا کہ وہ کہاں تھا اور نہ اس نے بتایا۔

مریم کو سوال کرنے کی عادت نہ تھی۔ اور چوہدری فرید نے یہ بتانا ضروری نہ سمجھا تھا کہ وہ پانچویں بیٹی کا غم بھلانے کس چوبارے پر گیا ہوا تھا۔

''چوہدری غلام فرید اتنا ظالم بھی نہیں تھا حورعین! جتنا تم ثابت کرنا چاہتی ہو۔'' میرے لبوں سے بے اختیار نکل گیا تھا۔ ''نہ اس نے دوسری شادی کی، نہ مریم کو طلاق دی۔''

''ہاں......!'' اس نے ایک ناراض سی نظر مجھ پر ڈالی۔ ''ہاں کیونکہ مریم اپنے ساتھ چار مربع زمین لائی تھی اور اس کے تینوں بھائی بہت طاقتور تھے۔ وہ چوہدری فرید کو ہرگز ایسا نہ کرنے دیتے۔ اور خود غلام فرید کو بھی چار مربعوں کا لالچ تھا۔''

''چوہدری فرید بقول تمہارے ظالم نہیں تھا۔ لیکن مریم کو لگتا تھا۔'' اس نے پھر ایک ناراض نظر مجھ پر ڈالی۔ ''وہ اونچی دیواروں والے صحن میں کھڑی ہوتی تو گلی سے گزرنے والے داور سائیں کی آواز سن کر تڑپ کر دروازے تک آتی تھی اور داور سائیں اپنے میں مگن گاتا چلا جاتا۔

''میں نیل کرائیاں نیلکاں
میرا تن من نیلوں نیل
نی میں نیل کرائیاں''

اور مریم اپنے بازوؤں، اپنے چہرے اور اپنے جسم کے ہر نظر آنے والے حصے پر ہاتھ پھیرتی اور نہ نظر آنے والے نیل اسے اذیت دیتے تھے۔ زخم صرف وہی تو نہیں ہوتے جو نظر آتے ہیں۔

اس کے نیل بھی نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن اسے لگتا تھا جیسے اس کا پورا جسم نیلوں نیل ہے۔ چوہدری غلام فرید کی باتیں زخم لگاتی تھیں تو اس کی بہنوں کے طنز نیلوں نیل کر دیتے تھے۔ وہ اپنے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتی جاتی اور دروازے سے لگی کھڑی سائیں کی درد میں بھیگی آواز کو سنتی رہتی۔

بالکل زمین کی طرح۔ چپ، ساکت۔ لبوں پر مہر لگائے درد سہتی رہتی۔

اس کی گفتگو میں پھر زمین کا ذکر آ گیا تھا

زمین نے بہت دکھ سہے ہیں۔

اور یہ ازل سے دکھ سہہ رہی ہے۔''

میں نے بے زاری سے اسے دیکھا۔ لیکن خاموش رہا۔ مجھے پتہ تھا، میں کچھ کہتا تو وہ ناراض ہو کر چلی جاتی اور میں...... میرا جی چاہتا تھا، وہ بولتی رہے۔ اور میں اسے سنتا رہوں۔

اور جب اس کی پلکیں بھیگنے لگیں اور موتیوں کے قطرے اس کے رخساروں پر ڈھل آئیں تو میں ان موتیوں کو انگلیوں کی پوروں سے چن لوں۔

زمین نے بہت دکھ سہے ہیں۔

اس کے آنسو کبھی خشک نہیں ہوئے۔

''کیا زمین کو کبھی کوئی خوشی نہیں ملی، کیا وہ ہمیشہ روتی ہی رہی ہے؟'' بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے بے حد شاکی نظروں سے مجھے دیکھا اور سر سے ڈھلک جانے والی اوڑھنی کو اپنے سر پر ڈالا۔ ''بہت بار وہ ہنسی بھی اور کھلکھلائی بھی۔ لیکن اس کے آنسو، اس کی ہنسی سے بہت زیادہ ہیں اور اس کی خوشی اس کے دکھوں سے بہت کم۔''

''لیکن تم صرف اس کے آنسوؤں کا ذکر کرتی ہو۔''

''اس لئے کہ حورعین نے زندگی میں صرف آنسو ہی دیکھے ہیں۔ اپنی پیدائش سے لے کر اب تک۔ اس لئے اسے

صرف آنسو ہی نظر آتے ہیں۔ تم شاعر ہو نا، تو یہ بات تم بھی جانتے ہو گے نا کہ جس نے گلابوں کو چھوا ہی نہ ہو کبھی، وہ گلابوں کی نرماہٹ کو کیسے جان سکتا ہے؟ اس کے ہاتھ تو صرف کانٹوں کی چبھن سے ہی آشنا ہوں گے نا پھر......

زمین اس وقت بے اختیار ہنسی تھی جب حضرت آمنہؓ کی گود میں عرب کا چاند چمکا تھا۔

جب میرے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زمین پر پہلی بار اپنے پاؤں رکھے تھے تو زمین ان ننھے قدموں کو چومتی اور نثار ہوتی تھی اور خوشی سے جھوم جھوم جاتی تھی۔

اور اس روز بھی جب سراقہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعاقب کرتا ہوا ان تک آ پہنچا تھا اور آواز آئی تھی۔ ''یا ارض خذیہ۔'' (اے زمین اسے پکڑ لے) اور سراقہ کے قدموں کو زمین نے جکڑا تھا تو زمین خوشی سے رقص کرتی اور ناچتی تھی۔''

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''تم کیسے آدمی ہو؟ کیا تم نے کبھی تاریخ کے ایوانوں میں جھانک کر نہیں دیکھا؟''

میں شرمندہ ہو گیا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے تاریخ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میری شرمندگی نے اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے حیرت بھر دی۔ پھر وہ سر جھکا کر اپنی انگلیوں سے زمین پر لکیریں ڈالنے لگی۔ اُلٹی سیدھی، ٹیڑی میڑھی۔ اس کی لانبی پلکوں کا سایہ اس کے صبیح رخساروں پر لرزتا تو دل چاہتا، اس منظر کو دل میں کہیں قید کر لوں۔

کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''اور اس رات جب مسلم بن عقیل اور ان کے بیٹوں ابراہیم اور محمد پر کوفہ کی زمین تنگ پڑ گئی تھی اور ان کا اور ان کے بچوں کا سرخ خون زمین میں جذب ہوتا تھا تو زمین تڑپتی تھی۔ اور اپنی تنگی پر شرمندہ ہوتی تھی۔

اور جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے خیمے کا چراغ بجھا دیا تھا اور جب وہ اپنے ہاتھوں سے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے لختِ جگر، قاسم کو میدانِ جنگ میں روانہ کر رہے تھے اور جب علی اکبر کا خون کربلا کی ریت پر گرتا تھا اور جب علی اصغر کے حلقوم میں تیر پیوست ہوتے تھے اور جب حضرت عباسؓ کے بازو کٹے تھے اور وہ دانتوں میں مشک پکڑتے تھے اور جب شمر ''ذی الجوشن'' للکارتا تھا۔ اور جب زرعہ بن شریق تمیمی نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کے سر مبارک کو تن سے جدا کرتا تھا۔ اور جب ثنان بن انس نخوی، سر مبارک کو نیزے پر لٹکاتا تھا۔ اور قولی بن یزید اسے لے کر آگے بڑھتا تھا تو زمین دھاڑیں مار مار کر روتی تھی اور اس کے آنسو سمندر بھرتے تھے۔

اور جب حضرت زینبؓ لٹے پٹے قافلے کو لے کر کربلا کے میدان سے نکلی تھیں تو زمین کے آنسو سیلاب لاتے اور اس کی چیخیں عرش ہلاتی تھیں۔ آنسو جو نظر نہیں آتے تھے اور چیخیں جو سنائی نہیں دیتی تھیں۔''

اُس نے سر جھکا کر اپنے گیلے چہرے کو اپنی اوڑھنی کے پلو سے پونچھا۔

''اور مریم بھی اسی طرح روتی تھی۔ اس کے اندر سے بھی چیخیں اُٹھتی تھیں۔ لیکن نہ اس کے آنسو کسی کو دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔

لیکن حورعین کو۔

جب اُس نے بولنا شروع کیا تھا تو مریم کی گود میں لیٹے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کے رخساروں پر پھیرتی اور کہتی۔

''اماں! آپ تیوں (کیوں) لوتی (روتی) ہو؟''

اور مریم کی خشک آنکھوں میں حیرت اُتر آتی۔ وہ اُس کے ننھے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر بے تحاشا چومتی چلی جاتی اور اس کی خشک آنکھوں میں نمی سی پھیل جاتی۔

''میں تو نہیں روتی میری جان!'' حورعین نے اسی عمر میں مریم کے نظر نہ آنے والے آنسوؤں کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔''

وہ بغیر تھکے لکھتا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر ہوگئی تھی۔ شاید فجر کی اذان ہو رہی تھی، جب اس نے قلم رکھا تھا اور اپنے اکڑے ہوئے ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے دباتے ہوئے کرسی کی پشت پر سر ٹیکتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے اریب فاطمہ کا سراپا لہرا رہا تھا۔

'اریب فاطمہ!......آئی لو یو۔'

اُس نے زیر لب دہرایا اور ٹانگیں پھیلائیں۔ پھر جانے کب وہ یوں ہی کرسی کی پشت پر سر رکھے رکھے ہی سو گیا۔

دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو ہمدان اس کا کندھا جھنجوڑ رہا تھا اور کھڑکی سے آنے والی سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رات وہ انیکسی کا دروازہ بند کیے بغیر ہی سو گیا تھا۔

''ہومی تم!'' وہ گھبرا کر سیدھا ہوا تھا۔ ''تم اس وقت؟......سب خیریت ہے نا؟''

''ہاں۔ سب خیریت ہے۔ گیارہ بج رہے ہیں۔ تم شاید رات بہت دیر سے سوئے تھے۔''

''ہاں۔'' اس نے پیچھے مڑ کر دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا۔

''کل تم سے باتیں نہیں ہو سکی تھیں۔ تم جلدی چلے آئے تھے۔ اور مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔'' ہمدان مصطفیٰ کی آنکھیں چمکیں اور وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''تم جاؤ، فریش ہو کر آ جاؤ تو پھر سکون سے بات کرتے ہیں۔''

''او کے۔'' ایبک اٹھا اور اس نے ہمدان کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ کو اور اس کی چمکتی آنکھوں کو۔

''مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے یار!''

ہمدان کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''کسی لڑکی کا چکر تو نہیں ہے؟ یہ مسکراہٹ، یہ چمک۔''

''ہاں ایبک فلک شاہ! مجھے محبت ہوگئی ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

ایبک جاتے جاتے پلٹ پڑا۔

''اور تم مجھے اب بتا رہے ہو۔ مجھے، جسے تم اپنا سب سے بہترین دوست کہتے ہو۔''

''تم بہاول پور میں تھے نا جب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اس روز جب ماما نے مجھ سے رابی کے متعلق پوچھا تو مجھے لگا۔ نہیں، رابیل نہیں۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو کوئی اور ہے۔ اور وہ میری آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

اس کی آنکھوں کا حزن۔

اُداسی کے غبار میں لپٹا اس کا وجود۔

اور اس کی غزالی آنکھوں میں ٹھہرا سہم۔ یوں، جیسے اس نے کسی درد کو اوڑھ رکھا ہو اور کوئی گہرا دکھ اس کے دل کو چھیل رہا ہو۔''

ہمدان مصطفیٰ بتا رہا تھا اور ایبک فلک شاہ کو یوں لگ رہا تھا، جیسے کوئی اس کے دل کو کسی تیز دھار آلے سے کاٹے جا رہا ہو۔

'تو کیا وہ اریب فاطمہ سے اتنی شدید محبت کرتا ہے؟'

اس نے کرسی کی پشت پر مضبوطی سے اپنا ہاتھ جماتے ہوئے ہمدان مصطفیٰ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی اور وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا تھا۔ یوں جیسے وہ اسے اپنے سامنے مجسم دیکھ رہا ہو۔

ایبک فلک شاہ کو اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا اور وہ ڈوبتے دل کو سنبھالے ہمدان کی طرف دیکھنے لگا۔

❁○❁

''مصطفیٰ! کیا وہ مجھ سے بہت خفا، بہت ناراض ہے کہ مجھ سے ملنے تک نہیں آیا؟ میں کتنے دنوں بعد بہاول پور سے آیا ہوں اور احسان آ کر ملا تک نہیں۔ اس نے آ کر پوچھا تک نہیں کہ بابا جان! آپ کیسے ہیں؟'' اُن کی آواز بھرّا گئی تو وہ خاموش ہو گئے۔

''بابا جان!'' مصطفیٰ نے جو اُن کے بیڈ کے قریب ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آ جائے گا۔ وہ بھلا آپ سے دُور رہ سکتا ہے؟ ابھی اس کو کچھ علم نہیں ہے، حقیقت کیا ہے۔''

''تو تم اسے حقیقت بتا کیوں نہیں دیتے کہ مومی نے کچھ نہیں کیا۔ وہ خوامخواہ اس سے بُغض لئے بیٹھا ہے۔''

''بابا جان! وہ کل سے مجھ سے بھی کہاں ملا ہے؟ ناراض ہے مجھ سے۔ اسے دکھ ہے کہ ہم نے اس کی پروا نہیں کی اور بہاول پور چلے گئے۔''

''اتنے سارے سال ہم نے صرف اُس کی ہی تو سنی ہے۔ اسی کی تو مانی ہے۔'' بابا جان کے لہجے سے ناراضی جھلکتی تھی۔ ہم اگر اس کی نہ مانتے تو یہ اتنی لمبی جدائیاں ہمارا مقدر نہ بنتیں۔ تم اسے سمجھاؤ۔''

''جی بابا جان! میں سمجھاؤں گا۔'' مصطفیٰ نے آہستگی سے کہا۔ لیکن وہ جانتے تھے، یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ احسان شاہ ان کی کوئی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔ کل بہاول پور سے آئے تھے اور رات میں جب وہ احسان سے ملنے گئے تو مائرہ نے بتایا کہ وہ سو رہے ہیں۔ صبح آفس میں جب انہوں نے احسان شاہ سے بات کرنا چاہی تو وہ ضروری کام کا بہانہ کر کے آفس سے نکل گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ جان بوجھ کر انہیں اگنور کر رہے ہیں۔

''اگر وہ گھر پر ہے تو اسے بلاؤ۔ مجھے خود اس سے بات کرنا ہے۔ غضب خدا کا، اس نے ایک عورت کی باتوں میں آ کر ہماری زندگیوں میں سے چھبیس سال نکال دیئے۔ چھبیس سال ہم اپنی عمو اور مومی سے دُور رہے۔ اس نے کبھی ایک پل کے لئے بھی نہیں سوچا کہ ہماری عمو بھی ہمیں اتنی ہی پیاری ہے جتنی کہ اسے اپنی بیٹی رابیل۔''

''بابا جان پلیز! مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ اِن شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیا سب ٹھیک ہو جائے گا مصطفیٰ؟'' انہوں نے دل گرفتگی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے نیچے سے نکالا۔ ''وہ وقت واپس آ جائے گا جو گزر گیا۔ تمہاری اماں لوٹ آئیں گی اور......''

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر سر بیڈ کراؤن سے ٹیکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

''میں بات کروں گا شانی سے۔ سب بتاؤں گا اسے۔'' انہوں نے پھر بابا جان کو تسلی دی۔

''لیکن وہ بات سنے تو تب نا۔ وہ تو تمہاری بات ہی نہیں سنتا۔'' بابا جان نے آنکھیں موندے موندے کہا تو مصطفیٰ خاموش ہو گئے۔ یہ سچ ہی تو تھا کہ شانی نے ان کی کوئی بھی بات سننے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ بہاول پور سے آئے تو سیدھے احسان شاہ کے کمرے میں آئے تھے۔

''مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی مصطفیٰ بھائی! پلیز فلک شاہ اور عمارہ کے متعلق مجھ سے کوئی بات مت کیجئے گا۔''

وہ ہاتھ کے اشارے سے انہیں مزید کچھ کہنے سے منع کرتے ہوئے باہر نکل گئے تھے اور مائرہ نے ان سے کہا تھا۔
''میرا خیال ہے، آپ اب اس قصے کو نہ ہی چھیڑیں تو اچھا ہے۔ احسان، فلک شاہ کا نام تک سننا پسند نہیں کرتے۔''
''لیکن مائرہ بھائی! وہ......''
''پلیز مصطفیٰ بھائی!'' اور مائرہ بھی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں اور وہ حیران سے کمرے میں تنہا کھڑے رہ گئے تھے۔
انہیں لگا تھا کہ ان کے بہاول پور سے واپس آنے پر مائرہ گھبرا سی گئی تھیں۔ فلک شاہ سے انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد شانی کو لے کر ان کے پاس آئیں گے۔ لیکن پتہ نہیں وہ اپنا یہ وعدہ پورا بھی کر سکیں گے یا نہیں۔
فلک شاہ انہیں بھی کم عزیز نہ تھا۔ سلجوق کی وفات کے بعد تو وہ اس کا بہت خیال رکھنے لگے تھے۔ پھر وہ بہت پسندیدہ عادات کا مالک تھا اور عمارہ سے شادی کے بعد تو یہ تعلق اور گہرا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے دل میں کبھی بھی فلک شاہ کے لئے کوئی غصہ یا نفرت محسوس نہیں کی تھی۔ انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس واقعے کے بعد کبھی فلک شاہ سے یا عمارہ سے ملنے نہیں جائیں گے۔ ٹھیک ہے، فلک شاہ اور عمارہ کے الریان میں آنے پر عمارہ کو طلاق ہو سکتی تھی تو وہ تو مراد پیلس جا سکتے تھے۔ اور وہ جانا بھی چاہتے تھے۔ لیکن یہ احسان شاہ تھا، جس نے سب کو باندھ دیا تھا۔ زنجیر کر دیا تھا۔ اور فلک شاہ سے تعلق کو اپنی موت کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔
وہ کتنے بے بس تھے۔ یہ صرف وہ ہی جان سکتے تھے۔ شروع شروع میں جب وہ الریان واپس آئے تھے تو بہت مضطرب اور بے چین رہتے تھے۔ لیکن پھر ہولے ہولے سب کے ساتھ انہوں نے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ہمدان نے مراد پیلس جانا شروع کیا تو انہیں انجانی سی خوشی ہوئی تھی۔ اس کے توسط سے انہیں عمارہ اور فلک شاہ کی خیریت پتہ چل جاتی تھی۔ پھر ایبک کا الریان آنا بھی انہیں اچھا لگتا تھا۔ وہ بھی دوسروں کے ساتھ اس کی آمد کے منتظر رہتے تھے۔ گو انہوں نے کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ اور اب بابا جان کا بہاول پور جانا بھی انہیں اچھا لگا تھا اور انہیں احسان شاہ کے ردعمل پر حیرت ہوئی تھی جو ان کے بہاول پور جانے پر بہت غصے میں تھا۔
''وہ محض تمہاری وجہ سے اتنے سالوں سے اپنی بیٹی کی جدائی برداشت کر رہے ہیں۔ اب ان کے کمزور دل میں اتنی طاقت نہیں رہی احسان!''
''میری وجہ سے نہیں مصطفیٰ بھائی! فلک شاہ کی وجہ سے۔ حالانکہ وہ اتنا جذباتی تو کبھی بھی نہیں تھا کہ محض بابا جان کے منع کرنے پر وہ اتنی بڑی بات کہہ دے۔ پھر بھی اس نے ایسا کر دیا تھا تو اس غلطی کو درست کیا جا سکتا تھا۔ ہم عمارہ سے ملنے جاتے رہتے۔ اسے یوں اکیلا نہ چھوڑتے۔ لیکن تم نے احسان!......تم نے ہمیں مجبور کر دیا۔ بابا جان کو اور ہم سب کو۔''
''لیکن آج بابا جان چلے گئے۔ مجھے بتائے بغیر۔''
''اتنے سال گزر گئے۔ اب غصہ تھوک دو یار!'' انہوں نے احسان شاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور وہ ان کا ہاتھ جھٹک کر چلے گئے تھے۔ اور وہ سوچتے رہ گئے تھے کہ وہ بہاول پور جائیں یا نہ جائیں۔ لیکن جب بابا جان نے ان سے کہا۔
''مصطفیٰ! تم آ کیوں نہیں جاتے فلک شاہ سے ملنے؟ وہ وہیل چیئر پر ہے، بہت روتا ہے وہ۔ بہت تڑپتا ہے تم سب سے ملنے کے لئے۔ بہت یاد کرتا ہے تمہیں۔''
وہ جانتے تھے، احسان شاہ اُن کے بہاول پور جانے کا سن کر بہت ناراض ہوگا۔ لیکن وہ رہ نہ سکے تھے۔ ثنا کو بتا کر چلے آئے تھے۔
''میں بابا جان کو لینے جا رہا ہوں ثنا! عثمان کی چھٹی ختم ہونے والی ہے۔ اور ہمیں حفصہ اور عادل کی منگنی بھی کرنا ہے۔ اور بابا جان تو وہاں جا کر بیٹھ ہی گئے ہیں۔''
ثنا کو اپنے جانے کا جواز دے کر وہ بہاول پور آ گئے تھے اور فلک شاہ انہیں دیکھ کر جذباتی ہو گئے تھے۔ کتنی ہی دیر تک

ان کے آنسو تھم نہیں سکے تھے۔ اور خود ان کے لئے فلک شاہ کو وہیل چیئر پر دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔
وہ دوڑتا بھاگتا، زندگی سے بھرپور فلک شاہ نظروں میں گھوم رہا تھا۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور فلک شاہ شکوہ کر رہے تھے۔
''مصطفیٰ بھائی! آپ نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔ اکیلا کر دیا...... پتہ نہیں کیوں، میرا دل کہتا تھا ''الریان'' سے اور کوئی آئے نہ آئے لیکن مصطفیٰ بھائی ضرور آئیں گے ہماری خبر لینے۔''
اور وہ کیا کہتے، کیا بتاتے کہ احسان نے انہیں زنجیر کر دیا تھا، اپنی موت کی دھمکی دے کر۔ اس کی زندگی کی قیمت پر وہ کیسے آسکتے تھے۔ یقیناً بابا جان نے انہیں سب بتایا ہوگا۔
احسان شاہ کی ضد۔ اُس کی دھمکی اور مجبوری۔ انہوں نے فلک شاہ کی طرف دیکھا جو اپنے آنسو پونچھ رہے تھے۔
''تم اتنے زیادہ جذباتی تو کبھی بھی نہ تھے فلک شاہ! پھر تم نے بابا جان کی ذراسی ڈانٹ پر اتنی بڑی بات کہہ دی۔''
''نہیں مصطفیٰ بھائی!'' انہوں نے تڑپ کر اپنا جھکا سر اٹھایا تھا۔ ''میں نے تو بابا جان کی بات دھیان سے سنی بھی نہ تھی۔ مجھے تو احسان شاہ کے شک نے مار دیا تھا۔ میں تو صرف اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں لہراتے شک کو۔ اور ان آنکھوں میں اس وقت کتنی اجنبیت اور غیریت تھی...... کتنی نفرت تھی، آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ اور پھر میری سماعتوں نے صرف اس کی آواز سنی تھی۔
''آئندہ یہاں قدم مت رکھنا الریان میں۔'' یہ مجھ سے احسان شاہ کہہ رہا تھا۔ میرا سب سے زیادہ اپنا۔ اور تب میرے منہ سے وہ نکل گیا مصطفیٰ بھائی! جس کی تلافی بھی ممکن نہ تھی۔''
وہ پوچھنا چاہتے تھے، کیسا شک؟ لیکن تب ہی عمارہ اور بابا جان آگئے تھے۔
اور وہ ایک رات ہی تو رُکے تھے بہاول پور میں اور دوسرے دن بابا جان کو لے کر یہاں آگئے تھے۔

❁○❁

''مصطفیٰ!'' عبدالرحمٰن شاہ نے آنکھیں کھول کر اُنہیں پکارا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ''عثمان کی چھٹی کا کیا بنا؟...... بڑھی یا نہیں؟''
''بڑھ گئی ہے بابا جان! اور اس کی خواہش ہے کہ منگنی کے فنکشن پر ہی نکاح بھی ہو جائے دونوں کا۔ رخصتی چند ماہ بعد ہو جائے گی۔''
''اچھا...... لیکن مصطفیٰ!'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ''میری عمو اور میرا فلک تو شریک نہیں ہو سکیں گے نا۔''
''کیوں نہیں بابا جان! فنکشن تو ہال میں ہی ہوگا۔ وہ وہاں تو آسکتے ہیں۔''
''اجنبیوں کی طرح، غیروں کی طرح ہال میں سے ہی آکر چلے جائیں گے...... نہیں مصطفیٰ! میں اپنی زندگی کے ان آخری سالوں میں عمارہ کو اس کا میکہ لوٹانا چاہتا ہوں۔''
''وہ کیسے بابا جان؟'' مصطفیٰ شاہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
''میں چاہتا ہوں، کوئی گھر خرید لوں...... یہاں ہی آس پاس کہیں۔ اور عمارہ کے لئے میکے کا دروازہ کھل جائے۔ وہ وہاں آکر میرے پاس رہے۔''
''تو کیا آپ ''الریان'' کو چھوڑ دیں گے؟''
''نہیں۔'' ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ''جب عمارہ اور فلک شاہ کو آنا ہوگا تو میں اس گھر میں چلا جایا کروں گا۔ وہاں وہ پورے مان سے آیا کرے گی۔ مصطفیٰ! پتہ کرو آس پاس سے۔''
مصطفیٰ بھی ان کی بات سمجھ گئے تھے۔
''ٹھیک ہے۔ میں پتہ کرواتا ہوں۔''

''لیکن یہ کام جلد کرنا ہے۔ عادل اور حفصہ کے نکاح سے پہلے۔ اور تم خود جا کر فلک شاہ اور عمارہ کو لانا۔ بلکہ انجی اور جواد کو بھی۔ انجی نے تو آج تک اپنے نانا کا گھر بھی نہیں دیکھا۔''

وہ خوشی خوشی مصطفیٰ کو انجم اور جواد کے متعلق بتانے لگے۔ مصطفیٰ خاموشی سے سن رہے تھے کہ اچانک اُنہیں خیال آیا۔

''ارے بابا جان! شاید ملک صاحب اپنا گھر فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ اس روز عمر کچھ بتا رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے پاس جا رہے ہیں۔''

''کیا واقعی؟..... مصطفیٰ! تم ابھی جاؤ۔ ابھی جا کر بات کرو ملک صاحب سے۔ کہیں وہ کسی اور سے سودا نہ کر لیں۔''

''جی بابا جان! جاتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' مصطفیٰ شاہ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''سنو! جاتے ہوئے عثمان کو میرے پاس بھیج دینا۔ کچھ باتیں طے کرنا ہیں۔ اور تم بھی ملک صاحب سے بات کر کے ادھر ہی آنا۔ مشورہ کر کے دن اور تاریخ طے کر لیتے ہیں۔ میرے خیال میں اتوار کا دن مناسب رہے گا۔ اور احسان سے بھی کہنا کہ باپ کو اپنی شکل تو دکھا جائے۔''

''جی اچھا۔'' مصطفیٰ شاہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ عثمان انہیں لاؤنج میں ہی بیٹھے اخبار پڑھتے مل گئے تھے۔ عثمان کو بابا جان کے پاس بھیج کر وہ احسان شاہ کو سمجھانے کا ارادہ کر کے ان کے کمرے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ان کی نظر سیڑھیوں سے نیچے اُترتی رابیل پر پڑی تو وہ رک گئے۔

''کیسی ہو رابی بیٹی؟''

''ٹھیک ہوں تایا جان! آپ کو کچھ پتہ ہے، پاپا اور مما اچانک رحیم یار خان کیوں چلے گئے؟''

''مجھے تو علم نہیں ہے۔ وہ کب گئے ہیں؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''وہ کچھ دیر پہلے ہی گئے ہیں۔ مما کہہ رہی تھیں شاید انہیں زیادہ دن لگ جائیں وہاں۔''

''ہو سکتا ہے، اپنا کوئی کام ہو۔ یا تمہارے ننھیال میں کوئی خوشی غمی۔''

''ہو سکتا ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''لیکن مما نے کچھ بتایا نہیں۔''

وہ بات کر کے وہاں رُکی نہیں تھی بلکہ منیبہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

مصطفیٰ شاہ اندازہ کر سکتے تھے کہ احسان شاہ کیوں رحیم یار خان گئے ہیں۔ وہ بابا جان اور مصطفیٰ شاہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ یقیناً ان کے بہاول پور جانے کی وجہ سے بہت غصے میں تھے۔

'احسان شاہ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔' انہوں نے سوچا۔ 'بابا جان اب عمر کے جس حصے میں ہیں، وہ کوئی شاک، کوئی صدمہ نہیں سہہ سکتے۔'

'اور کیا احسان شاہ اور مائرہ، حفصہ اور عادل کے نکاح کے فنکشن میں بھی شریک نہیں ہوں گے؟' وہ یکدم پریشان ہو گئے تھے۔

کمرے کا دروازہ کھولتے ہی رابیل نے مڑ کر انہیں جاتے دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گئی۔

اندر منیبہ اکیلی اپنے بیڈ پر کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ رابیل کو دیکھ کر وہ ذرا سا حیران ہوئی کہ رابیل بہت کم ہی ان کے کمروں میں آتی تھی۔

''آؤ آؤ رابی!'' منیبہ نے جلدی جلدی کتابیں سمیٹ کر اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی۔

''سب لوگ کہاں ہیں مونی؟ کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔ حفصہ، عاشی، مرینہ۔''

''حفصہ تو ثنا چچی کے ساتھ پارلر گئی ہوئی ہے، اس کی اسکن بہت رف اور کھردری ہو رہی تھی۔ کچھ فیشل وغیرہ کروائے گی۔ عاشی بھی ان کے ساتھ ہے۔''

''اسکن تو خراب ہونا ہی تھی۔ چوبیس گھنٹے کچن میں گھسی رہتی ہے۔ حالانکہ خانساماں ہے۔ اس کی مدد کے لئے ملازم

لڑکا ہے اور.....'' رابیل نے ناک چڑھائی۔

''اسے اچھا لگتا ہے سب کے لئے اپنے ہاتھوں سے کچھ بنانا۔'' منیبہ مسکرائی۔

''تو عادل کے دل میں اس نے ایسے ہی جگہ بنائی ہے۔'' رابیل کا لہجہ طنزیہ تھا۔لیکن منیبہ نے محسوس نہیں کیا۔

''نہیں تو...... یہ تو بچپن سے ہی طے تھا۔ ذکر اس لئے نہیں کیا گیا تھا کہ بڑے ہو جانے پر جانے کس کا کیا رجحان ہو۔''

''ہوں! ٹھیک ہے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' رابیل نے بیڈ پر پڑی کتابوں میں سے ایک کتاب اُٹھائی۔ ''یہ تم کیا پڑھ رہی تھیں؟'' اُس نے کتاب کے ورق اُلٹے۔ ''اُف! کس قدر مشکل اور خشک سی لگ رہی ہے۔تم کیسے پڑھ لیتی ہو یہ سب؟''

''یہ فقہ کی کتاب ہے۔'' منیبہ مسکرائی۔ ''اور میں بھی ایسے ہی پڑھ لیتی ہوں جیسے تم پڑھ لیتی ہوں اپنی کورس کی کتابیں۔''

''کیا تم وکیل بننے کے بعد پریکٹس بھی کرو گی؟'' رابیل نے کتاب واپس رکھ دی۔

''ہاں! ارادہ تو ہے۔لیکن کل کی کس کو خبر ہے؟''

رابیل نے سر ہلایا۔

''اور یہ ایبک نہیں آیا، بابا جان سے ملنے۔کیا واپس چلا گیا ہے بہاول پور؟''

''معلوم نہیں۔ ہمدان کو پتہ ہو شاید۔''

تب ہی واش روم کا دروازہ کھلا اور گیلے چہرے کے ساتھ اریب فاطمہ باہر آئی۔

''السلام علیکم رابیل آپی!''

''وعلیکم السلام۔'' رابیل نے اُس کے دُھلے دُھلے، نکھرے نکھرے چہرے کی طرف دیکھا۔

'مما سچ کہتی ہیں، اریب فاطمہ یہاں آ کر بہت نکھر گئی ہے۔اور اگر ہمدان نے اس کو پسند کر بھی لیا ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے ہمدان سے ایسی دلچسپی نہیں ہے جیسے مما چاہتی ہیں......اور مما تو چاہتی ہیں کہ میں اور ہمدان...... ہونہہ ہمدان جیسا لڑکا کبھی بھی میرا آئیڈیل نہیں ہو سکتا۔حفصہ اور منیبہ کی طرح ہر لمحے ہر ایک کی خدمت کو تیار۔'

اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔ اریب فاطمہ اپنے بیڈ پر بیٹھ چکی تھی۔

''فاطمہ! تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ٹیسٹوں میں اچھے مارکس آ جاتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔ ورنہ میں سمجھ رہی تھی، تمہارے لئے یہاں ایڈجسٹ کرنا مشکل ہوگا۔''

''نہیں۔ وہاں رحیم یار خان میں بھی ہمارا کالج اچھا تھا۔ اور پروفیسرز بھی بہت اچھے تھے۔''

فاطمہ کو حیرت ہوئی۔ جب سے وہ الریان آئی تھی، رابیل نے پہلی بار اس سے اتنی بات کی تھی۔

'رابیل شائد مائرہ آنٹی سے مختلف ہے۔' اس نے سوچا۔

وہ اسے بہت مغرور لگتی تھی۔ اور آج سے پہلے......اسے لگتا تھا کہ وہ اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ شاید وہ اسے کمتر سمجھتی ہے۔

''مائرہ آنٹی کہاں گئی ہیں؟'' منیبہ نے رابیل سے پوچھا۔

''مما اور پاپا تو رحیم یار خان چلے گئے ہیں۔'' رابیل نے بتایا۔

''رات تو آنٹی نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔'' منیبہ کو حیرت ہوئی۔

''ہاں! بس اچانک ہی پروگرام بنا۔ شاید نانو اور نانا جان سے ملنے کو دل چاہ رہا ہوگا۔ ویسے رات مما بہت دیر تک تم

سے باتیں کرتی رہی تھیں۔کوئی خاص بات تھی کیا؟''
رابیل نے لاپروائی سے کہا تھا۔لیکن منیبہ کو اس کے لہجے میں چھپا تجسس محسوس ہو گیا۔
'تو رابی اس لئے آئی ہے میرے کمرے میں۔صرف یہ پوچھنے کہ مائرہ آنٹی اتنی رات دیر تک میرے کمرے میں کیوں بیٹھی رہیں۔ورنہ بقول عمر''الریان'' کی شہزادی ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگوں سے زیادہ فری ہونا پسند نہیں کرتیں۔'
اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔بس یونہی وہ عمر کا پتہ کرنے آئی تھیں۔اور پھر ان کے کالج کے زمانے کا ذکر چھڑ گیا۔اور باتوں میں وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔''
اور اس میں کسی حد تک حقیقت بھی تھی۔نہ جانے کس بات پر ان کے کالج کا ذکر چھڑا تھا۔اور پھر بہت دیر تک وہ اپنی کالج لائف کے متعلق باتیں کرتی رہی تھیں۔اریب فاطمہ کو انہوں نے باہر بھیج دیا تھا۔
دراصل مائرہ آنٹی چاہتی تھیں کہ وہ ہمدان سے رابیل کے متعلق رائے پوچھے۔
''بھلا ہمدان کو رابی کے ساتھ شادی سے کیا انکار ہو سکتا ہے؟......اتنی خوب صورت بلکہ ''الریان'' کی ساری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت اور دلکش۔لیکن مائرہ چاہتی تھیں کہ ہمدان کی رائے بھی معلوم ہو جائے،تب وہ مصطفیٰ شاہ سے بات کریں گی۔
''اور رابی؟......کیا آپ نے اس کی رائے پوچھی؟''اس نے پوچھا تھا۔
''بھلا رابی کو کیا انکار ہو سکتا ہے؟''مائرہ مسکرائی تھیں۔''الریان'' کے سارے لڑکے ہی بہت قابل اور اچھے ہیں۔''
منیبہ کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔'کتنا مزا آئے گا نا......حفصہ اور عادل کے بعد رابی اور ہمدان۔اور آج میں ضرور ہمدان سے رابی کے متعلق پوچھ لوں گی۔'
''یہ آپوں آپ کیوں مسکرایا جا رہا ہے؟......کیا سوچ رہی تھیں؟''رابیل بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''میں سوچ رہی تھی،اب حفصہ کے بعد تمہاری منگنی یا شادی کا فنکشن ہونا چاہئے۔''
''تمہارا کیوں نہیں؟''رابیل کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔
''میرا بھی ہو جائے گا۔لیکن پہلے......''
''منیبہ!......منیبہ بیٹے!''عبدالرحمٰن شاہ کی آواز سنائی دی اور منیبہ بات ادھوری چھوڑ کر ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔
منیبہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔لاؤنج میں عبدالرحمٰن شاہ اور عثمان شاہ کھڑے تھے۔
''جی بابا جان!''عثمان شاہ سے بات کرتے کرتے انہوں نے منیبہ کی طرف دیکھا۔
''حفصہ کی ساری شاپنگ مکمل ہو گئی تھی کیا؟ہم نے اتوار کا دن سوچا ہے۔''
''جی بابا جان!بس کپڑے ٹیلر کے پاس سے اٹھانے ہیں۔''
''تو ایسا کرو،تم کسی کو ساتھ لے کر چلی جاؤ اور عاشی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔میں تو بہاول پور میں تھا۔پتہ نہیں اس کے لئے بھی کسی نے شاپنگ کی ہے یا نہیں۔''
''بابا جان!میں نے اور شنا چچی نے اس کے لئے فنکشن کے حساب سے شاپنگ کر لی تھی۔''
''رابی میری بیٹی!کیسی ہے؟''عبدالرحمٰن شاہ نے منیبہ کے کمرے سے آتی ہوئی رابیل کو دیکھا۔
''جی بابا جان!میں بالکل ٹھیک ہوں۔آپ کیسے ہیں؟''
''میں تو ٹھیک ہوں۔اتنے دنوں بعد بہاول پور سے آیا ہوں اور تم نے صبح سے اب تک چکر تک نہیں لگایا میرے کمرے کا۔''
''بس بابا جان!میں آنے ہی والی تھی۔لیکن پھر مما نے کہا،میری پیکنگ کر دو تو ذرا مصروف ہو گئی تھی۔''

''پیکنگ......کیا مطلب؟.......کیا وہ کہیں گئی ہیں؟''
''جی وہ تو رحیم یار خان گئی ہیں۔ کیا آپ سے مل کر نہیں گئیں؟'' رابیل نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
''نہیں تو۔ مجھے تو خبر ہی نہیں ہے۔ کیا تمہارے پپا بھی گئے ہیں؟''
''جی! ان ہی کے ساتھ گئے ہیں۔''
''دیکھا......دیکھا تم نے عثمان! یہ احسان کیا کر رہا ہے میرے ساتھ۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ''وہ جان بوجھ کر چلا گیا ہے تا کہ مجھ سے بات نہ کرنا پڑے۔ اس نے مصطفیٰ سے بھی بات نہیں کی......اتنا پتھر ہے وہ۔ ایسے تو کوئی نہیں کرتا نا عثمان!'' انہوں نے نظر اٹھا کر عثمان کی طرف دیکھا۔ ''مجرم کو بھی صفائی کا موقع دیا جاتا ہے، لیکن اس نے تو بغیر صفائی کے فیصلہ سنا دیا۔ اس سے کہو، میرے پاس آئے۔ میری بات سنے اور اگر اسے میری بات غلط لگے، اسے اس سب پر یقین نہ آئے جو فلک شاہ نے مجھے بتایا ہے تو پھر......''
''پھر کیا بابا جان؟'' عثمان نے بے چینی سے پوچھا۔
''پھر میں مراد پیلس چلا جاؤں گا۔ عمارہ اور فلک شاہ کے پاس۔ میں نے بہت جدائیاں سہی ہیں......میرا دل ابھی عمارہ اور فلک شاہ کو دیکھ دیکھ کر بھرا ہی کب تھا۔ میں تو صرف حفصہ اور عادل کی خاطر آیا ہوں۔''
رابیل اور منیبہ اُلجھی اُلجھی سی کھڑی انہیں دیکھ رہی تھیں۔
''میں اب مزید جدائیاں نہیں سہہ سکتا عثمان! نہ عمو اور فلک شاہ کی، نہ احسان کی۔ میرے دل میں اتنی طاقت نہیں ہے۔'' ان کی آواز بھرّا گئی تھی۔ منیبہ ایک دم آگے بڑھی تھی اور ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔
''بابا جان پلیز۔ ریلیکس ہو جائیں۔ اب کچھ نہیں ہو گا اِن شاء اللہ۔ اور پتہ ہے، ہم نے تو ایبک بھائی سے کہہ دیا تھا کہ عادل اور حفصہ کی منگنی کے فنکشن پر سب آئیں گے۔ عمارہ پھپھو، فلک انکل، انجی، جواد بھائی سب۔ مائرہ چچی اور احسان چچا تو رابی کی نانو سے ملنے گئے ہیں۔ آ جائیں گے ایک دو روز تک۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی نا۔''
وہ کچھ بھی نہ جانتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہی اس کی سب کو تسلی دینے کی عادت۔
بابا جان نرمی سے مسکرائے اور پاس بیٹھی منیبہ کی طرف دیکھا۔
''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ، ٹیلر سے کپڑے اُٹھا لاؤ۔ دن ہی کتنے ہیں بیچ میں، صرف دو۔ آج جمعرات ہے اور......''
''جی بابا جان!'' منیبہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''کچھ شاپنگ رہ گئی ہو تو وہ بھی کر لینا۔ اور ہاں، وہ بچی فاطمہ، اس کے لئے بھی نئے کپڑے بنوائے ہیں نا؟''
''جی، وہ ثنا چچی نے اریب فاطمہ کے لئے بھی کپڑے بنوائے ہیں۔'' منیبہ فوراً ہی بولی۔
''وہ اپنے گھر سے اتنی دور یہاں ہے۔ اس کا خیال رکھا کرو۔'' انہوں نے تاکید کی۔
''جی بابا جان! ہم سب اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' منیبہ نے جواب دے کر رابیل کی طرف دیکھا۔
''رابی! تم جلدی جا کر تیار ہو جاؤ تو پھر چلتے ہیں۔''
''میں بس تیار ہو رہی ہوں۔ تم آ جاؤ۔''
''اچھا۔ میں بھی بس چادر لے کر آتی ہوں۔''
منیبہ کمرے میں چادر لینے گئی تو اریب فاطمہ جو کتاب گود میں رکھے خاموش بیٹھی جانے کن سوچوں میں گم تھی، منیبہ نے اس کی طرف دیکھا۔
''فاطمہ! ہم ٹیلر سے حفصہ کے اور اپنے کپڑے لینے جا رہے ہیں۔ تم بھی چلو۔ آؤٹنگ ہو جائے گی۔''
اریب نے چونک کر منیبہ کی طرف دیکھا۔
''لیکن مجھے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔''

''ہوتی رہے گی ٹیسٹ کی تیاری۔'' منیبہ نے الماری سے چادر نکالتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔ ''کم آن یار!''
منیبہ نے اس کی چادر نکال کر اسے پکڑائی۔ اریب فاطمہ نے چادر پکڑ لی اور سیاہ چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے وہ مونی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔
عبدالرحمٰن شاہ نے اپنے والٹ سے کچھ نوٹ نکال کر منیبہ کو دیئے۔
''بابا جان! پیسے تو تھے۔ صبح مصطفیٰ انکل نے دیئے تھے۔''
''کوئی بات نہیں، یہ بھی رکھ لو۔ اور فاطمہ بیٹی! کسی بھی چیز کا دل چاہے تو لے لینا۔ جھجکنا مت۔''
''جی!'' اریب فاطمہ نے صرف اتنا ہی کہا اور وہ تینوں لاؤنج سے نکل گئیں۔ تب عبدالرحمٰن شاہ نے پاس بیٹھے عثمان شاہ کی طرف دیکھا۔
''عثمان بیٹا! احسان کا نمبر ملاؤ۔ پہنچ گیا ہوگا، رحیم یار خان اب تک۔''
''جی! میرا خیال ہے۔ وہ کافی سویرے نکل گئے تھے۔''
عبدالرحمٰن شاہ کی بات کا جواب دے کر عثمان شاہ، احسان شاہ کا نمبر ملانے لگے۔
''وہ اٹینڈ نہیں کر رہا، بابا جان!'' عثمان شاہ نے بتایا تو انہوں نے متفکر نظروں سے انہیں دیکھا۔
''لینڈ لائن پہ بات کرو۔ موبائل وہ اٹینڈ نہیں کرے گا۔ جو بھی اٹھائے، اس سے کہنا، احسان سے بات کروا دے۔''
''جی بابا جان!'' عثمان شاہ پھر نمبر ملانے لگے تھے۔
کچھ دیر بعد ہی احسان شاہ لائن پر آ گئے تھے۔ انہیں رحیم یار خان پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔
''شانی! بابا جان تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' عثمان شاہ نے خیریت پوچھنے کے بعد کہا تو دوسری طرف کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر احسان شاہ کی آواز آئی۔
''عثمان بھائی! بابا جان سے کہیں، مجھے فلک شاہ کے متعلق کئی بات نہیں سننی۔ بالکل نہیں۔ ناٹ ایٹ آل۔''
اور عبدالرحمٰن شاہ نے ان کے ہاتھ سے فون لے لیا۔
''شانی! وہ میری بیٹی ہے۔ بالکل ایسے ہی، جیسے رابیل تمہاری بیٹی ہے۔ جس طرح تم محبت کرتے ہو رابی سے، میں بھی عمارہ کا باپ ہوں۔ تمہیں اگر ایسی جدائی سہنی پڑے تو سہہ سکو گے؟...... میں نے سہی ہے چھبیس سال۔ تمہاری ماں اسے دیکھنے کی حسرت لئے قبر میں چلی گئی۔ تمہارا پتھر دل کیوں نہیں پگھلتا؟''
اور احسان شاہ ذرا سے نرم پڑے تھے۔
''ٹھیک ہے بابا جان! میں نے آپ کو اب تو عمارہ سے ملنے سے نہیں روکا۔''
''لیکن تمہیں اچھا بھی نہیں لگا احسان! میں جانتا ہوں۔ عمو ہسپتال آئی۔ تم نے اس سے بات تک نہیں کی۔ میں بہاول پور گیا تو تم......''
''بابا جان! اتنے لمبے سفر کے بعد میں بہت تھک گیا ہوں۔ کچھ دیر آرام کروں گا۔ پلیز...... پھر کبھی بات کریں گے۔''
انہوں نے دوسری طرف ریسیور رکھ دیا تھا اور عثمان کو فون واپس کرتے ہوئے انہوں نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔
''ٹھیک ہے بابا جان! فلک شاہ نے غصے میں کچھ ایسا کہہ دیا تھا، جس نے ''الریان'' کے دروازے ان پر بند کر دیئے۔ اس غلطی کی سزا ہم سب نے بہت بھگت لی۔ لیکن احسان...... وہ آخر اتنا زیادہ ناراض کیوں ہے فلک شاہ سے؟ اس نے کچھ نہیں بتایا۔'' عثمان شاہ نے فون لیتے ہوئے کہا۔
''شاید کوئی غلط فہمی ہے اسے۔''
''تو یہ غلط فہمی دور بھی تو ہو سکتی ہے۔'' عثمان شاہ اُلجھے ہوئے تھے۔
''وہ کسی کی بات سننا ہی نہیں چاہتا۔'' عبدالرحمٰن شاہ کی آواز میں تھکن تھی۔

جو فلک شاہ نے انہیں بتایا تھا، وہ انہوں نے مصطفیٰ کو نہیں بتایا تھا۔ اور نہ ہی عثمان یا کسی اور سے ذکر کرنا چاہتے تھے۔

مائرہ ان کی بہو تھی۔ احسان شاہ کی بیوی۔

انہیں اس کی عزت اور بھرم عزیز تھا۔

لیکن احسان شاہ کی ضد؟

وہ بے حد پریشان سے تھے۔ وہ کیسے اس کے دل کو نرم کریں، کیسے اسے وہ سب بتائیں؟ لیکن شاید بتانے کا بھی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کبھی یقین نہیں کرے گا۔ وہ سب جھوٹ سمجھے گا۔

''عثمان! عادل اور حفصہ کی منگنی میں احسان شرکت نہیں کرے گا، اگر عمارہ اور فلک شاہ آئے تو۔ اور میرا جی چاہتا تھا کہ وہ سب بھی آئیں۔ انجی، جواد، ایبک۔ وہ بھی اس خاندان کا حصہ ہیں۔''

عثمان شاہ جانتے تھے کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ فنکشن سے صرف دو تین دن پہلے رحیم یار خان جانے کا اور کیا مطلب تھا؟

''بابا جان! پلیز۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم فنکشن ایک ہفتہ آگے کر دیتے ہیں۔ اگلے سنڈے کو سہی۔ تب تک تو شانی واپس آ جائے گا۔ اتنے زیادہ دن تو وہاں نہیں رہ سکتا۔ اس کی جاب ہے یہاں۔''

''ہاں۔ ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ شاید فلک شاہ اور عمارہ بھی اتنی جلدی نہ آ سکیں۔''

تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھول کر مرینہ نے اندر قدم رکھا۔ ''السلام علیکم بابا جان!''

''وعلیکم السلام بیٹا! آج بڑی دیر کر دی۔'' عبدالرحمٰن شاہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''آج میں سمیرا کے ساتھ ہاسٹل چلی گئی تھی۔''

اس نے مڑ کر اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی عینک درست کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''یہ سمیرا ہے، میری دوست۔ مجھ سے جونیئر ہے۔ ہاسٹل میں ہے۔ راولپنڈی سے آئی ہے۔ ایف ایس سی میں ٹاپ کیا تھا اس نے راولپنڈی بورڈ میں۔''

ہمیشہ کی طرح وہ تیز تیز بول رہی تھی۔

''کالج میں تین دن کی چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ یہ راولپنڈی نہیں جا رہی تھی۔ میں اسے زبردستی گھر لے آئی۔ ہاسٹل میں سے کافی لڑکیاں چلی گئی تھیں نا۔ یہ تو آ ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے خود ہی اس کے ابو سے اجازت لی ہے فون کر کے۔''

''اچھا کیا بیٹی!'' عبدالرحمٰن شاہ نے مسکرا کر سمیرا کو دیکھا۔ وہ انہیں بے حد سنجیدہ اور خاموش طبع لگی تھی۔

''اور یہ میرے پاپا ہیں۔ دبئی میں جاب کرتے ہیں۔ آج کل عادل بھائی کی منگنی کے لئے آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے پھر مڑ کر سمیرا کی طرف دیکھا۔ ''ممی بھی آئی ہوئی ہیں۔''

سمیرا نے جھجکتے ہوئے سلام کیا۔

''جیتی رہو بیٹا!'' عبدالرحمٰن شاہ نے دعا دی اور مرینہ سے مخاطب ہوئے۔ ''بیٹی! انہیں اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ رفیق سے کہو، چائے وغیرہ کے لئے۔ کیونکہ تمہاری بہنیں تو سب گئی ہوئی ہیں۔ ابھی آتی ہوں گی۔''

''مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ ہماری مرینہ نے بھی کسی کو دوست بنایا۔ ورنہ سکول، کالج میں بھی اس کی کوئی دوست نہیں رہی۔ یہ اپنے میں ہی مگن رہتی تھی۔''

عثمان شاہ نے کھڑے ہوتے ہوئے سمیرا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مرینہ کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ کیونکہ وہ سمیرا کی جھجک کو محسوس کر رہے تھے۔

''آؤ سمیرا!'' مرینہ، سمیرا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور عثمان شاہ بیٹھتے ہوئے بابا جان کی طرف متوجہ

ہو گئے۔

❁○❁

''احمد!......رضی!'' وہ پوری طاقت سے چیخے تھے۔لیکن ان کی آواز ان کے حلق میں ہی گھٹ گئی تھی۔

''رضی!'' ان کے لبوں سے نکل رہا تھا اور وہ تقریباً دوڑنے لگے تھے۔

احمد رضا گلی کا موڑ مڑ چکا تھا۔اب وہ انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ روڈ کی طرف جا رہا ہوگا۔اس گلی سے آگے ایک اور گلی اور بس۔

''حسن رضا صاحب!'' قاضی صاحب اچانک ہی ان کے سامنے آئے تھے۔''السلام علیکم! کیسے ہیں جناب! آپ نے کوئی اتا پتہ بھی نہیں بتایا، نہ کسی سے ملے۔ برسوں کا ساتھ تھا۔''

''جی قاضی صاحب! اچانک جانا پڑ گیا۔'' وہ بس لمحہ بھر کو رُکے تھے۔انہوں نے قاضی صاحب کو دیکھا تھا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

''نہ سلام نہ دعا، ایسی بھی کیا بے مروّتی۔'' قاضی صاحب کندھے اچکاتے ہوئے بڑبڑائے۔لیکن حسن رضا گلی پار کر کے روڈ پر پہنچ چکے تھے۔

''احمد رضا!'' انہوں نے پوری طاقت لگا کر اسے آواز دی تھی۔لیکن احمد رضا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔وہ دیوانوں کی طرح اسے پکارتے ہوئے بھاگے۔لیکن گاڑی لمحوں میں ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔وہ سڑک کے کنارے موجود درخت کے تنے سے ٹیک لگائے، بے بسی سے خالی سڑک کو دیکھ رہے تھے۔

وہ آج ہی راولپنڈی سے آئے تھے۔کچھ چھوٹے موٹے کام تھے جو ابھی باقی تھے اور اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی وہ نہ جانے کس خیال سے اپنے گھر کی طرف آ نکلے تھے اور......

'احمد رضا یہاں تھا۔اسی شہر میں۔ابھی وہ کہیں نہیں گیا تھا۔شاید وہ وہیں ہو اسی گھر میں۔میں وہاں جا کر پتہ کرتا ہوں۔' اُن کے دل میں اُمید کا دیا جل اُٹھا تھا۔

'وہ ضرور مل جائے گا۔ایک بار مجھے اس سے بات کرنا ہے اور اسے زبیدہ اور سمیرا کے پاس لے کر جانا ہے۔بس ایک بار وہ مل جائے۔'

اور کچھ دیر بعد وہ ایک نئی امید کے ساتھ اس کے پرانے ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے۔لیکن وہ گھر بدستور بند تھا۔

پھر وہ سارا دن اسے مختلف جگہوں پر ڈھونڈتے پھرے۔حالانکہ انہیں آفس جانا تھا اور اپنا Experience سرٹیفکیٹ بنوانا تھا۔لیکن رات ہوگئی تھی۔جب تھکے تھکے وہ ایک ہوٹل کے ریسیپشن پر کھڑے کمرے کا پوچھ رہے تھے۔

اگلے دو تین دن تک وہ لاہور میں ہی مقیم رہے۔آفس میں سلیم صاحب سے انہیں پتہ چلا تھا کہ احمد رضا آفس آیا تھا اور ان کے متعلق پوچھ رہا تھا۔سلیم احمد وہ واحد شخص تھے جو ان کے جاب چھوڑنے کی وجہ جانتے تھے اور احمد رضا کو بھی جانتے تھے۔

احمد رضا انہیں ڈھونڈ رہا تھا۔وہ یقیناً شرمندہ ہوگا۔وہ ماں اور بہن کے لئے اُداس ہوگا۔انہوں نے سلیم احمد کو اپنا فون نمبر دیا تھا۔

''اگر کبھی احمد رضا پھر آئے تو اسے یہ نمبر دے دینا سلیم! لیکن اس کے علاوہ اور کسی کو نہیں۔''

وہ سلیم احمد کو تاکید کر کے چلے آئے تھے کہ انہیں واپس جانا تھا۔اجنبی شہر میں سمیرا اور زبیدہ اکیلی گھبرا رہی ہوں گی۔وہ انہیں رات تک واپس آ جانے کا کہہ کر آئے تھے۔لیکن رک گئے تھے اور گھر فون کر دیا تھا۔انہیں یہاں آئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔سلیم صاحب کو فون نمبر دے کر وہ ہوٹل آئے تو بے چین سے ہو گئے۔انہیں وہاں گئے ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا۔ابھی تو وہ وہاں کسی کو جانتی تک نہیں۔اگر کوئی مسئلہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔زبیدہ کی طبیعت خراب ہوگئی تو......انہوں

نے گھر فون کیا تو سمیرا بار بار پوچھنے لگی۔

''آپ وہاں کیوں رُکے ہوئے ہیں؟ کیا رضی آپ کو مل گیا ہے؟.....اور کیا رضی.....؟''

''نہیں، رضی نہیں ملا۔ بس ویسے ہی۔''

''ابو! کیا آپ وہاں رضی کو مارنے کے لئے رُکے ہوئے ہیں؟ کیا آپ اُسے.....؟'' سمیرا پتہ نہیں کیا کیا سوچ رہی تھی۔

''نہیں بیٹا! بالکل نہیں۔ میں تو بس.......''

''آپ آ جائیں ابو! وہ اب نہیں ملے گا۔ وہ نہیں آئے گا پلٹ کر۔''

وہ اسے بتانا چاہتے تھے کہ وہ آیا تھا۔ گھر میں، آفس میں۔ لیکن وہ اس سے مل نہ پائے تھے۔ لیکن سمیرا نے روتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

انہوں نے آنکھوں میں پھیلتے آنسوؤں کو انگلیوں سے پونچھا اور بیگ اٹھا کر ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

سمیرا بہت دیر تک وہیں فون اسٹینڈ کے پاس کھڑی رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ پتہ نہیں کب تک وہ ایسے ہی کھڑی رہتی کہ زبیدہ نے اسے آواز دی۔

''بیٹا! کہاں ہو؟ ادھر آ کر کمرے کی کھڑکی بند کر دو۔ بہت ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔''

اور اس نے چونک کر اپنے آنسو پونچھے تھے اور کمرے میں جا کر کھڑکی بند کر کے زبیدہ کی طرف دیکھا تھا جو دیوار کی طرف کروٹ لئے لیٹی تھیں۔

''تمہارے ابا کا فون تھا کیا؟'' انہوں نے یوں ہی دیوار کی طرف کروٹ لئے لئے پوچھا۔

''جی اماں!''

''وہ کیا کہہ رہے تھے؟ کچھ احمد رضا کا پتہ چلا؟''

''نہیں۔'' وہ دوسرے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

جنوری 2000ء کی پہلی صبح اس کی آنکھ راولپنڈی کے اس مکان میں کھلی تھی، جو اس کے لئے اجنبی تھا۔ نامانوس در و دیوار۔ اجنبی نظروں سے تکتے کھڑکیاں اور دروازے۔ پتہ نہیں ان سب سے مانوس ہونے میں کتنا وقت لگے گا۔ اینٹ، مٹی اور چونے کی دیواریں بھی جیسے سانس لیتی ہیں۔ اپنے اندر محبت اور اپنائیت رکھتی ہیں۔

سمن آباد کا وہ مکان جو وہ چھوڑ آئے تھے، کتنا اپنا تھا۔ اور یہ مکان.....تھا تو یہ بھی اپنا ہی۔ لیکن کتنا اجنبی اور پرایا پرایا سا لگتا تھا۔

حسن رضا کرائے کا مکان دیکھنے آئے تو اس مکان پر ''برائے فروخت'' کا بورڈ دیکھ کر رُک گئے اور پھر مکان اندر سے دیکھنے پر پسند آیا تو خرید لیا۔ یہ مکان انہیں اس رقم سے کم قیمت میں مل گیا تھا جو انہیں سمن آباد والا مکان فروخت کر کے ملی تھی۔ باقی کی رقم انہوں نے سمیرا کی شادی اور تعلیم کے لئے محفوظ کر دی تھی۔

''یہاں کتنی ظالم سردی ہے سمیرا!....... ہمارے لاہور میں تو اتنی سردی نہیں ہوتی تھی نا۔'' زبیدہ نے کروٹ بدل کر اسے دیکھا۔

''آپ کو اگر سردی زیادہ لگ رہی ہے تو ہیٹر جلا دوں؟''

''ہاں جلا دو۔ تمہارے ابو کل تک آ جائیں گے نا؟''

''شاید۔''

''وہ ضرور احمد رضا کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔'' وہ اُمید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سمیرا نے نظریں جھکا لیں۔ زبیدہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں اور پھر کروٹ بدل لی۔

'آج سے چند دن پہلے کسے خبر تھی کہ ہم یہاں ہوں گے۔ اس اجنبی شہر اور اجنبی گھر میں۔' اسے اسلام آباد دیکھنے کا شوق ضرور تھا لیکن اس نے یہاں رہنے کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا اور نہ کبھی یہ سوچا تھا کہ وہ کنیئرڈ کے علاوہ کسی اور کالج سے ایف ایس سی کرے گی۔ لیکن اب۔ وہ ایک گہری سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔

حسن رضا نے راولپنڈی آتے ہی سب سے پہلا کام اس کے ایڈمیشن کا کیا تھا۔ اور اسے گورنمنٹ کالج سیٹلائٹ ٹاؤن میں داخل کروا دیا تھا۔ یہاں اس کا بالکل بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ صرف چند دن ہی کالج گئی تھی۔ جب سے حسن رضا لاہور گئے تھے، وہ گھر پر ہی تھی۔ حالانکہ انہوں نے لاہور سے فون پر اسے تاکید کی تھی کہ وہ کالج باقاعدگی سے جاتی رہے تاکہ پڑھائی کا حرج نہ ہو۔ گھر کے پاس ہی کالج وین آتی تھی اور کئی لڑکیاں جاتی تھیں۔ حسن رضا کے لئے آج بھی ہر چیز سے زیادہ پڑھائی اہم تھی۔

اس نے ایک نظر زبیدہ پر ڈالی۔ اسے لگا جیسے وہ لحاف کے اندر بھی کانپ رہی ہوں۔ اس نے دوسرے بیڈ پر پڑا کمبل اٹھا کر ان کے لحاف پر پھیلا دیا اور خود آہستگی سے دروازہ بند کرتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی۔ لاؤنج میں بے حد ٹھنڈ تھی۔ لیکن وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا دل جیسے کسی شکنجے کی زد میں تھا۔ بار بار ڈوب کر اُبھر رہا تھا۔

ابو کیا صرف احمد رضا کو مارنے کے لئے وہاں رُکے ہوئے ہیں؟

کیا ہم پھر کبھی رضی کو دیکھ سکیں گے؟

کیا ہم پھر کبھی ایک فیملی کا حصہ بن سکیں گے؟

کیا رضی کبھی لوٹ کر آئے گا؟'

بہت سے سوال تھے جو اس کے ذہن میں آ رہے تھے۔ لیکن اس کے پاس ان سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک کا ہر وہ لمحہ جس میں رضی تھا، اسے یاد آ رہا تھا۔

رضی کے ساتھ مل کر شرارتیں کرنا۔

رضی کے ساتھ گرمیوں کی راتوں میں ٹہلنے کے لئے جانا اور واپسی پر کارنر والے اسٹور سے آئس کریم کھانا۔

رضی کا امتحان کے دنوں میں رات گئے تک پڑھنا اور اس کا اسے چائے بنا کر دینا اور رضی کا شکریہ ادا کرنے کا انداز۔

''مجھے اب سمجھ میں آیا کہ بہنیں اتنی پیاری کیوں ہوتی ہیں۔''

''کیوں؟'' وہ چائے کا کپ تھماتے ہوئے پوچھتی۔

''اس لئے کہ وہ امتحان کے دنوں میں بھائیوں کو چائے بنا کر دیتی ہیں۔''

''بس صرف اس لئے؟'' وہ ناراضی سے اسے دیکھتی تو شرارت سے اس کی آنکھیں چمک رہی ہوتیں۔ اس کے لبوں سے سسکی نکل گئی۔

'تو کیا یہ سب رضی کو یاد نہ آتا ہوگا؟ اور وہ بھی تڑپتا نہ ہوگا؟'

وہ بے چین سی ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور پھر بیٹھ گئی۔ کوئی بھی کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ نہ پڑھنے کو، نہ کچھ اور۔ زبیدہ بھی شاید سو گئی تھیں۔ یا اگر جاگ بھی رہی تھیں تو انہوں نے تو باتیں کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ راولپنڈی آ کر تو جیسے انہیں بالکل ہی چپ لگ گئی تھی۔ کوئی بات کی تو جواب دے دیا، ورنہ خاموش ہی رہتیں۔ بے حد مضطرب ہو کر اس نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھا لیا۔ شاید کچھ دل بہل جائے۔ شاید یہ سب سوچیں ذہن سے نکل جائیں۔

ٹی وی پر خبریں آ رہی تھیں۔

''آج صبح اسمٰعیل کذاب کو ایئرپورٹ پر سے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ کسی اور نام سے پاسپورٹ پر سفر کرنے والا تھا۔ لیکن کسی مخبر کی اطلاع پر پولیس نے جہاز پر سوار ہونے سے کچھ پہلے گرفتار کر لیا۔ البتہ اس کے ساتھیوں کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اسی جہاز سے سفر کرنے والے تھے یا پہلے ہی ملک سے فرار ہو چکے ہیں۔''

سمیرا جو بہت توجہ سے ٹی وی کی طرف دیکھ رہی تھی، ایک دم چونکی۔
'تو کیا احمد رضا بھی ملک سے جا چکا ہے؟'
ٹی وی پر اب اسمٰعیل کذاب کے متعلق تفصیل سے بتایا جا رہا تھا۔ لیکن وہ بالکل نہیں سن رہی تھی۔ وہ صرف احمد رضا کے متعلق سوچ رہی تھی۔
'وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔'
اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچل ڈالا۔ لیکن پھر بھی آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو رخساروں پر پھیل آئے اور وہ انہیں روکنے پر قادر نہ تھی۔
وہ آنسو پونچھتی اور دوسرے ہی لمحے رخسار پھر گیلے ہو جاتے تھے۔
تو زندگی کا ایک باب ختم ہوا۔
احمد رضا گھر سے ہی نہیں، ملک سے بھی چلا گیا۔
تو اب ہمیں زندگی اس کے بغیر ہی گزارنا ہوگی۔ اجنبی شہر کے اس اجنبی گھر میں۔
اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور ہولے ہولے اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ اور زبیدہ بیگم اپنے کمرے کے دروازے میں ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔ سمیرا گرد و پیش سے بے نیاز روئے چلی جا رہی تھی۔ اونچا اونچا۔ بلند آواز میں۔ اُس کے اندر ٹمٹماتا اُمید کا دیا بجھتا جا رہا تھا۔

❀○❀

الزینا کے کمرے میں بیڈ پر بیٹھے احمد رضا کی آنکھوں کی چمک بھی ماند پڑ گئی تھی۔ وہ گود میں ہاتھ رکھے ساکت بیٹھا تھا اور اس کے دائیں طرف کھڑا رچی کہہ رہا تھا۔
''تو میں کہہ رہا تھا احمد رضا! کہ تمہاری زندگی کا ایک باب ختم ہوا۔ کل سے تم ایک نئی زندگی شروع کرو گے۔ ایک نئے نام، ایک نئی پہچان کے ساتھ۔ کل اس وقت تم یو۔ کے جانے کے لئے جہاز میں بیٹھے ہو گے۔''
احمد رضا نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔
''نیا نام، نئی پہچان، یو۔ کے کا سفر۔ لیکن کیوں؟...... کس لئے؟...... مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔ مجھے یہیں رہنا ہے۔ اس ملک میں۔''
''یہاں رہو گے تو پھر جیل کی کوٹھڑی میں باقی عمر گزار دو گے۔''
''لیکن میرا قصور کیا ہے؟'' وہ رچی سے بحث کر رہا تھا۔
''تمہارا قصور یہ ہے کہ تم ایک جھوٹے نبی کے ساتھ تھے۔ جسے آج ملک سے بھاگتے ہوئے ایئرپورٹ پر سے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ صرف جھوٹا نبی ہی نہیں تھا۔ بلکہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں بھی ملوث تھا۔''
''نہیں...... وہ ایسے نہیں تھے۔'' احمد رضا نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔
''یہ میں نہیں کہہ رہا احمد رضا! بلکہ تمہارا پریس کہتا ہے۔ اب وہ باقی ماندہ زندگی جیل میں ہی گزار دے گا۔ اور اگر وہ یہاں رہتا تو کسی روز کوئی سر پھرا اُسے مار دیتا۔ اسی لئے اس کا ملک سے باہر جانا ضروری تھا۔ لیکن افسوس! نہ جانے کس کی غلطی کی کہ وہ پکڑا گیا۔ شکر کرو، تم اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اگر ساتھ ہوتے تو تم بھی پکڑے جاتے۔''
''تو......؟'' احمد رضا الجھا۔ ''تحقیق کرنے پر وہ مجھے چھوڑ دیتے۔ مجھ پر کوئی جرم ثابت نہ ہوتا۔''
''اچھا!'' رچی کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ اُبھری اور اس نے تمسخرانہ نظروں سے احمد رضا کو دیکھا۔ ''تم ابھی یہاں کی پولیس اور جیل کے متعلق کچھ نہیں جانتے میری جان! تحقیق پر تم ضرور بے گناہ ثابت ہو جاؤ گے۔ لیکن تحقیق میں کتنا وقت لگے گا، تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔ تمہاری باقی ماندہ زندگی جیل میں ہی گزر جائے گی، چکی پیستے ہوئے۔

جانتے ہو جس کوٹھڑی میں تمہیں رکھا جائے گا، وہاں جو جگہ تمہیں ملے گی، اتنی چوڑی اور لمبی ہو گی جس میں تم بمشکل لیٹ سکو گے۔ کروٹ بدلنا بھی مشکل ہو گا۔ اور پھر تمہارے ساتھ جو اور لوگ اس کوٹھڑی یا بیرک میں تمہارے ساتھ ہوں گے، وہ تمہاری طرح پڑھے لکھے، نازک مزاج نہیں ہوں گے۔ ان میں ڈاکو بھی ہوں گے اور قاتل بھی۔ نشہ کرنے والے بھی ہوں گے اور دادا قسم کے لوگ تم سے ٹانگیں بھی دبوائیں گے۔ اور ہر طرح کا ان کا حکم تمہیں ماننا پڑے گا...... جب کنکر ملی دال کا پانی اور جلی ہوئی روٹیاں کھاؤ گے تو تمہیں افسوس ہو گا کہ تم نے میری بات کیوں نہیں مانی۔"

اس نے خاموش بیٹھے احمد رضا کو دیکھا اور قدرے نرمی سے کہا۔

"دیکھو احمد رضا! یہ ضروری نہیں کہ تم بے گناہ ہی ثابت ہو جاؤ۔ ہماری پولیس کے لئے کسی بے گناہ کو گناہ گار ثابت کرنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہوتا۔ تم اپنی عمر دیکھو اور سوچو کہ کیا تم اپنی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا پسند کرو گے یا ایک لگژری زندگی کو ترجیح دو گے؟"

اس نے ذرا سا جھکتے ہوئے اس کے گود میں رکھے ہاتھوں کو چھوا۔

"یہ ہاتھ...... یہ قلم تھامنے والے نازک ہاتھ۔ جب تمہیں جیل کی مشقت جھیلنا پڑے گی تو ان ہاتھوں میں گڑھے پڑ جائیں گے یا کھردرے اور بھدے ہو جائیں گے۔" وہ اسے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔

احمد رضا نے ایک جھرجھری سی لی۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ اس نے رچی سے کچھ نہیں کہا۔ رچی لحہ بھر اسے دیکھتا رہا اور پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے احمد رضا کی طرف دیکھا۔

"آج رات اچھی طرح سوچ لینا احمد رضا! کل کسی فلائٹ سے تمہیں جانا ہے۔ ہم سب بھی ایک ایک، دو دو کر کے یہ ملک چھوڑ دیں گے۔ بعد میں اگر تم نے یہ ملک چھوڑنا چاہا تو شاید تمہارے لئے اتنا آسان نہ ہو۔ ایک نئے نام، نئی شناخت سے آئی ڈی کارڈ حاصل کرنا، پاسپورٹ بنانا تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس کے لئے ہمیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑے اور کتنا پیسہ خرچ کرنا پڑا۔"

اس نے دروازہ کھولا۔

"اور اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اپنے لئے جیل کی کوٹھڑی منتخب کرتے ہو یا ایک شان دار شاہانہ زندگی۔ شان دار گھر، گاڑی، نام، شہرت۔ بہت کچھ سوچ رکھا ہے ہم نے تمہارے لئے۔"

وہ ایک دم ہی دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

دروازہ اس کے پیچھے بند ہو گیا تھا۔ اور احمد رضا خالی دروازے کو دیکھ رہا تھا۔

جیل کی مشقت بھری زندگی۔

ایک شان دار زندگی۔

ایک ایسی زندگی، جس کی اس نے تمنا کی تھی۔ لیکن اس تمنا کی تصویر میں وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے سب اس کے ساتھ تھے۔

امی، ابو اور سمیرا۔

لیکن یہ زندگی جس کی پیشکش ابھی رچی کر کے گیا، اس میں وہ تنہا تھا۔ بالکل اکیلا۔

سمیرا، امی، ابو کہیں نہیں تھے۔ تصویر میں صرف وہ تھا۔ لیکن سمیرا، امی، ابو اب کہاں تھے؟ اب بھی تو وہ اکیلا تھا۔

وہ اس کو چھوڑ گئے تھے۔ آج صبح بھی وہ اپنے گھر کی طرف گیا تھا اور اس نے الوینا کو بھیجا تھا اپنے گھر۔ لیکن وہی جواب۔ "کچھ نہیں جانتے حسن رضا صاحب کہاں ہیں۔" الوینا نے قاضی صاحب اور ملک صاحب کے دروازے پر بھی دستک دی تھی۔ لیکن وہ بھی بے خبر تھے۔ اس روز وہ آفس بھی تو گیا تھا اور سلیم صاحب نے اسے بتایا تھا کہ وہ جاب چھوڑ

کر چلے گئے ہیں۔ کہاں؟ یہ وہ نہیں جانتے تھے۔

تو اگر میں نہ بھی جاؤں تو میرے پاس سمیرا، امی، ابو نہیں ہوں گے اور مجھے اکیلے قید کی صعوبتیں برداشت کرنا ہوں گی۔ ابو ہوتے تو شاید مجھے قید سے بچا لیتے۔ بھاگ دوڑ کر کے وہ کچھ نہ کچھ کر ہی لیتے۔ آخر اتنے سارے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں۔ لیکن اب جب اسے تنہا ہی رہنا ہے تو وہ جیل کی بند کوٹھڑی میں زندگی گزارنے کے بجائے ایک شاندار زندگی کا انتخاب کیوں نہ کرے۔

اس نے سوچا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

وہ اُلجھ رہا تھا، پریشان ہو رہا تھا۔ شاید وہ کبھی فیصلہ نہیں کر پائے گا۔

اس نے سوچا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔

''یہ بہت مشکل ہے۔'' اس نے زیر لب کہا۔ لیکن بند دروازے کے باہر لاؤنج میں کھڑا رچی پورے یقین سے کہہ رہا تھا۔

''وہ فیصلہ کر چکا ہے الوینا!''

''کیا فیصلہ؟'' الوینا بے چین ہوئی۔ ''وہ نہیں جائے گا۔ وہ یہ ملک کبھی نہیں چھوڑے گا جہاں اس کے والدین اور بہن ہاں ہے۔ ہم نے جو کچھ اس پر انویسٹ کیا ہے، وہ سب ضائع چلا جائے گا۔'' الوینا کچھ مایوس سی تھی۔

''کچھ بھی ضائع نہیں جائے گا الوینا!'' رچی مسکرایا۔ ''وہ فیصلہ کر چکا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے، صاف لکھا ہوا۔ بس وہ کہنے سے جھجک رہا ہے۔ اور یہ کام تم کرو گی الوینا! اور تمہارے پاس آج کی رات ہے۔ صبح تک تم کو اس سے فیصلہ لینا ہے اور کل اس وقت تم اور احمد رضا جہاز میں بیٹھے ہو گے۔''

الوینا نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور رچی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔

الوینا نے دروازہ کھولتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''جی سر! اب کچھ ایسے ہی ہوا ہے جیسا آپ نے کہا تھا۔ اسے گرفتار کروا دیا گیا ہے۔ لیکن سر! کیا یہ کچھ جلدی نہیں تھا؟''

''اوکے سر! آپ بہتر سمجھتے ہیں۔'' الوینا دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''بالکل سر!...... آج اس کی زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا ہے۔ کل سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے۔ نئی زندگی۔ نیا نام، نئی پہچان۔''

وہ زور سے ہنسا اور مڑ کر الوینا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ الوینا کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ رچی بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے وکٹری کا نشان بنایا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ الوینا ہلکا سا سر خم کرتے ہوئے دروازہ کھول کر کمرے میں چلی گئی۔ رچی وہیں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

❁○❁

''تو کیا وہ...... وہ بھی تم سے؟'' ایبک نے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا، جیسے ابھی اس کا دل سینے کی دیواری توڑ کر باہر آ گرے گا۔

''وہ..... وہ بھلا کیسے؟'' ہمدان کی آنکھوں میں حیرت اُتری ''وہ تو مجھے جانتی تک نہیں۔ میری کبھی اس سے بات نہیں ہوئی۔ میں نے اسے صرف تین یا چار بار دیکھا ہے، جب میں رینا کو لینے گیا تھا اس کے کالج۔ اور اس نے بھی ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ اور رینا کا تو پتہ ہے نا تمہیں، اس نے میرا تعارف تک نہیں کروایا اس سے۔''

اور ایبک کو لگا جیسے اس کا بہت دیر سے رُکا ہوا سانس بحال ہوا ہو۔ وہ کرسی کی پشت پر بازو ٹیکتے ہوئے تھوڑا سا آگے کو جھکا۔

''کون ہے؟........ کیا نام ہے؟'' ایبک نے اپنی آواز کی لرزش کو خود محسوس کیا۔ شاید یہ اچانک مل جانے والی خوشی تھی کہ دھڑکنیں ابھی تک بے ترتیب تھیں۔

''وہ رینا کی کوئی دوست ہے۔ بظاہر وہ گندمی رنگت کی ایک عام سی شکل وصورت کی لڑکی ہے لیکن اس کی آنکھیں...... میں تمہیں کیا بتاؤں، اس کی آنکھوں میں کتنا سحر ہے۔ مجھے لگا میں نے پہلے بھی انہیں کہیں دیکھا ہے۔ اتنی ہی حسین، اتنی ہی حزیں آنکھیں۔ تمہیں کیا بتاؤں ایبک فلک شاہ! ان آنکھوں میں کتنا حزن تھا، کتنی اُداسی تھی۔ جیسے جنوری کی سرد صبحوں میں سیاہ پانیوں والی جھیلوں پر برف جمی ہو۔ جب پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا تو سوچا اگر ان جھیلوں پر سے اُداسی کا یہ کہر ہٹ جائے تو یہ کیسی لگیں گی۔ جگمگ کرتی، جگنوؤں کی طرح دمکتی۔ میں نے پل کے پل ان آنکھوں کو کئی رنگوں میں دیکھ لیا تھا۔ خوشی کے رنگ، ہنسی کے رنگ، مسرت کے رنگ۔

یاسین چھٹی پر تھا اور میں رینا کو لینے گیا تھا۔ وہ رینا کے ساتھ کالج گیٹ سے باہر آئی تھی، رینا نے گاڑی کے قریب آ کر اسے خدا حافظ کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ مڑ کر کسی اور لڑکی سے باتیں کرنے لگی۔ رینا نے گاڑی میں بیٹھتے ہی ہمیشہ کی طرح کتاب کھول کر گود میں رکھ لی تھی۔ اس نے مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ تب میں نے خود ہی پوچھ لیا۔

''رینا! تمہارے ساتھ یہ کون لڑکی تھی؟''

''دوست ہے میری۔'' جواب دے کر وہ پھر کتاب میں کھو گئی تھی۔

ایبک دلچسپی سے اسے دیکھتا ہوا کرسی پر بہت اطمینان سے بیٹھ گیا۔

''مرینہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والی لڑکی ہے۔''

''ہاں، لیکن اس روز سے پہلے مجھے اس کی یہ عادت کبھی بری نہیں لگی تھی۔'' ہمدان نے برا سا منہ بنایا۔ ''میں چاہتا تھا وہ اس کے متعلق کچھ بتائے۔ لیکن وہ تو پڑھنے میں مگن تھی۔ دوسرے روز میں خود مرینہ کو لینے پہنچ گیا تھا۔ وہ اس روز بھی رینا کے ساتھ ہی کالج سے باہر آئی تھی اور اس کا پورا وجود اُداسی کی کہر میں لپٹا ہوا تھا۔ یوں جیسے کوئی بے حد خوب صورت جزیرہ گہری دُھند میں لپٹا ہو۔

آج مرینہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بتایا تھا۔

''یہ میری دوست ہے سمیرا۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ مجھ سے جونیئر ہے۔''

''اور تمہیں لگتا ہے کہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے؟'' ایبک کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''ہاں۔ لیکن مجھے لگتا نہیں ہے بلکہ مجھے سچ مچ اس سے محبت ہو گئی ہے۔ اور یہ بات میں نے صرف تم سے شیئر کی ہے۔ ماما کی خواہش رابی کے لئے ہے اور شاید مائرہ چچی بھی یہی چاہتی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کہا تو نہیں ہے لیکن مجھے کچھ اندازہ ہے۔ اگر میں نے سمیرا کو نہ دیکھا ہوتا تو مجھے رابی سے شادی کرنے میں کوئی انکار نہیں تھا۔ لیکن اب..... اب نہیں ایبک! اب کسی اور سے شادی کرنا خود اپنے ساتھ منافقت کرنا ہے۔''

اس نے ایبک کی طرف دیکھا۔

''کیا محبت ایسے بھی ہو جاتی ہے؟ اس طرح اچانک، صرف ایک نظر دیکھ کر؟....... وہ تو شاید کسی اور ہی دنیا میں رہتی ہے۔ اپنے آپ میں گم۔ اردگرد سے بے خبر۔''

''ہاں شاید۔ کبھی کبھی ہو جاتا ہے ایسا۔'' ایبک مسکرا دیا۔

''لیکن انجام..... اس کا انجام کیا ہو گا؟''

''محبت ہمیشہ اپنے انجام سے بے خبر ہوتی ہے میری جان!'' ایبک اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں نے بہت کوشش کی کہ اس کا خیال میرے ذہن سے نکل جائے۔ لیکن میں آج تک ان آنکھوں کے سحر سے نکل ہی نہیں پا رہا ہوں۔''

تو مرینہ سے پوچھنا اس کے متعلق۔ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کیا پتہ وہ پہلے سے ہی کہیں انگیجڈ ہو۔''

ایبک نے بغور اسے دیکھا۔ وہ واقعی بے حد اُلجھا ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔

''میں نے ابھی شادی، رفاقت، اس سب کے متعلق کچھ بھی نہیں سوچا۔ ابھی تو میں صرف محبت کی کسک سے آشنا ہوا ہوں۔ یہ بڑا عجیب سا احساس ہے۔ میٹھی میٹھی سی چبھن۔ یوں جیسے آپ نے ہاتھوں میں بہت سے گلاب لے رکھے ہو۔ گلابوں کی خوشبو مشام جاں کو معطر کرتی اور مست کیئے دیتی ہو۔ اور کانٹے ہتھیلیوں میں چبھتے ہوں اور میٹھی میٹھی سی اذیت دیتے ہوں۔''

اور ایبک کو بھی لگا جیسے اس کے دل میں بھی کانٹے چبھے ہوں۔ میٹھی میٹھی سی اذیت اور کوئی خوشبو اندر ہی اندر لہرا لہرا کر مست کرتی ہو۔

''کیا تم نے بھی کبھی کسی سے محبت کی ایبک؟''

''میں نے......'' ایبک فلک شاہ چونکا۔ اریب فاطمہ کا سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تو اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ اُبھری۔

''میں فریش ہو کر آتا ہوں تو پھر باہر چلتے ہیں۔''

''کہاں؟'' ہمدان نے پوچھا۔

''کہیں بھی، کسی بھی جگہ پر۔'' ایبک واش روم کی طرف بڑھا تو ہمدان نے پھر اسے آواز دی۔

''آبی! ایک خاص بات تو تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ رات پاپا، بابا جان کو لے کر آ گئے اچانک۔''

''کیا؟'' ایبک نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''لیکن پرسوں میری بابا سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بابا جان کے آنے کے متعلق تو کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ بابا جان سے بھی بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں بہاول پور واپس گیا تو وہ میرے ساتھ لاہور آئیں گے۔''

''ہاں۔ پاپا آفس سے پرسوں کسی ٹائم بہاول پور کے لئے نکل گئے تھے بابا جان کو لینے۔ وہی حفصہ اور عادل کی منگنی کا سلسلہ ہے۔''

''اچھا!'' ایبک یکدم خوش ہوا۔ ''بابا تو مصطفیٰ ماموں سے مل کر بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ کتنا یاد کرتے تھے وہ انہیں۔''

'بابا نے مجھے فون کیا ہوگا۔ لیکن میرا فون بند تھا۔ لکھتے لکھتے سو گیا۔ چارج کرنا یاد ہی نہیں رہا تھا' اس نے سوچا۔

''احسان انکل نے مصطفیٰ ماموں کو منع نہیں کیا بہاول پور جانے سے؟''

''میری پاپا سے زیادہ بات نہیں ہوئی ہے۔ کل تمہارے جانے کے کوئی دو گھنٹے بعد پاپا، بابا جان کے ساتھ آئے۔ کسی کو بھی نہیں پتہ تھا ان کے بہاول پور جانے کا۔ عادل نے مجھے بتایا تھا، وہ کل صبح سویرے ہی آفس چلے گئے تھے اور وہاں سے ہی ایئرپورٹ چلے گئے تھے۔ شاید عثمان انکل کو پتہ ہو۔ پاپا تو جلدی سونے کے لئے چلے گئے تھے لیکن ہم سب کافی دیر تک بابا جان کے پاس بیٹھے رہے۔ مائرہ آنٹی تو آئی تھیں بابا جان سے ملنے۔ لیکن جب تک میں وہاں تھا، احسان انکل نہیں آئے تھے۔ حالانکہ بابا جان نے دو بار ان کے متعلق پوچھا بھی تھا۔''

ہمدان نے تفصیل سے بتایا اور ایبک سر ہلاتے ہوئے فریش ہونے چل دیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ دونوں ''الریان'' کی طرف جا رہے تھے۔

ہمدان کی بائیک انہوں نے کرنل شیر دل کے گیراج میں چھوڑ دی تھی۔ اور اب ایبک کی گاڑی میں تھے دونوں۔

''تمہاری کہانی کا کیا بنا؟...... مکمل ہوئی یا نہیں؟ عمر کو جب بھی موقع ملتا ہے، وہ اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔'' ہمدان نے پوچھا تو ایبک مسکرا دیا۔

''حالانکہ عمر نے اس کے صرف ابتدائی چند صفحات ہی پڑھے تھے۔''

''بعض اوقات ایک نظر ہی کافی ہوتی ہے۔'' ہمدان نے ذومعنی بات کی۔ اس سے پہلے کہ ایبک کچھ کہتا، ہمدان نے اچانک سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ ہجوم کیسا ہے؟''

''شاید کوئی حادثہ ہوا ہے۔'' ایبک نے کہا اور پھر ایک دم ہی اس کی نظر منیبہ پر پڑی تھی جو ہجوم سے باہر آ رہی تھی۔

''یہ...... یہ تو منیبہ ہے، ہومی!'' منیبہ نے لحہ بھر رک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر تیزی سے سڑک کراس کرنے لگی۔

ایبک نے فوراً ہی گاڑی سائیڈ پر کر کے بریک لگائے تھے اور ہمدان تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا اور اس نے بلند آواز میں پکارا تھا۔

''مونی!...... منیبہ......!'' اور منیبہ یک دم ٹھٹک کر رُکی تھی اور پھر اس کی نظر ہمدان پر پڑی تھی۔

''ہمدان!...... ہومی!'' اس کے لبوں سے نکلا تھا اور وہاں ہی کھڑے کھڑے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ ہمدان اور دوسری طرف سے ایبک تقریباً دوڑتے ہوئے ایک ساتھ اس کے قریب پہنچے تھے۔

''کیا...... کیا ہوا مونی!...... کیوں رو رہی ہو؟'' ہمدان نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا تھا۔

''وہ...... رابیل...... رابیل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے وہاں...... ادھر......''

''نہیں...... کیسے؟'' ہمدان کے لبوں سے نکلا اور منیبہ بلند آواز میں رونے لگی تھی۔ اس کی بات سنے بغیر ایبک دوڑ پڑا تھا اور دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے وہ لحہ بھر کے لئے رک گیا تھا۔ اس نے اریب فاطمہ کو دیکھا جو رابیل کا سر گود میں رکھے اپنی سیاہ چادر سے پٹیاں کاٹ کاٹ کر رابیل کے سر اور بازوؤں پر کس کس کر باندھ رہی تھی اور سب لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ اردگرد کی آوازوں سے بالکل بے نیاز تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

''ارے کوئی گاڑی روکو۔''

''کسی نے ٹکر مارنے والے کا نمبر دیکھا؟''

''وہ لڑکی گئی تو ہے اپنے ڈرائیور کو بلانے۔ گاڑی ہے ان کے پاس۔''

مختلف آوازیں تھیں۔

یہ اریب فاطمہ تھی، جس کی آنکھیں ذرا سی بات پر آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔

اس نے دانتوں سے چادر کا ذرا سا حصہ کاٹا اور پھر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پھاڑ ڈالا۔ اب پھر وہ اس کے سر پر پٹی باندھ رہی تھی۔ لیکن خون تھا کہ بہتا ہی چلا جا رہا تھا۔ یہ سب ایبک نے چند لحوں میں دیکھ لیا تھا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے سب سے پہلے رابیل کی نبض چیک کی تھی۔ اریب فاطمہ ہاتھ میں پٹی پکڑے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ایبک نے رابیل کا بازو نیچے رکھا اور پھر کھڑا ہوا اور جھکتے ہوئے رابیل کو دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔

''آؤ......!'' اس نے ساکت بیٹھی اریب کو دیکھا تو اریب کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ وہ کھڑی ہوئی۔ اس کے کپڑے خون آلود تھے۔

لوگوں نے اطراف میں ہو کر ایبک کو راستہ دیا تھا۔ اریب، ایبک کے پیچھے چل رہی تھی اور اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس کے لب ہل رہے تھے۔ وہ مسلسل دعا مانگ رہی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کی طرف آتا ہمدان اور اس کے پیچھے آتی منیبہ رک گئی۔

''کیا زیادہ زخمی ہے؟ بہت خون بہہ رہا ہے؟ مائی گاڈ! کیا ہوگا؟'' اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہمدان کہہ رہا تھا۔
منیبہ نے اریب کی طرف دیکھا۔
''حوصلہ کرو اریب! دعا کرو۔ اللہ، رابیل کو زندگی دے گا۔'' منیبہ اپنی پریشانی بھول کر اب لاریب فاطمہ کو تسلی دے رہی تھی، جس کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔
''ہمدان! میری پاکٹ سے گاڑی کی چابی نکالو اور گاڑی لاؤ قریب۔'' ایبک نے ایک نظر ہمدان کو دیکھا۔
پٹی باندھنے کے باوجود خون بہنا بند نہیں ہوا تھا۔ رابیل کے سر سے بہنے والے خون سے ایبک کی آستین اور شرٹ خون آلود ہو رہے تھے۔
گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اریب فاطمہ کے لب اب بھی مسلسل ہل رہے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور رخسار آنسوؤں سے گیلے ہو رہے تھے۔
''اریب فاطمہ! آپ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں اور رابیل کا سر گود میں رکھیں۔ آپ کے کپڑے پہلے ہی خون آلود ہو چکے ہیں۔''
اریب فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گئی۔
ہمدان کی مدد سے اس نے رابیل کو پچھلی سیٹ پر اس طرح لٹایا کہ اریب فاطمہ نے اس کا سر اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور ایک بازو اس کے گرد حمائل کر کے اسے سہارا دے رکھا تھا۔
''منیبہ! آپ پلیز اپنی گاڑی میں آئیے۔'' ایبک نے پریشان حال کھڑے یاسین کو دیکھا۔
''یاسین! تم منیبہ بی بی کو لے کر ہمارے پیچھے آؤ۔''
''ہمدان پلیز! تم نزدیک ترین کسی بھی کلینک، ہسپتال میں لے چلو جلدی۔'' فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ایبک فلک شاہ نے ہمدان شاہ سے کہا جو ہونٹ بھینچے بازو اسٹیئرنگ پر رکھے پیچھے مڑ کر رابیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔
ہمدان نے چونک کر اسے دیکھا
''ہاں، یہاں آگے کہیں ایک پرائیویٹ کلینک ہے تو سہی۔''
''ٹھیک ہے۔ وہیں چلو۔ کسی بڑے ہسپتال تک جانے میں زیادہ خون بہہ جانے کا خطرہ ہے۔ یہاں سے فرسٹ ایڈ لے کر پھر کسی ہسپتال میں چلتے ہیں۔''
بات مکمل کر کے ایبک نے مڑ کر دیکھا۔ اریب فاطمہ کی نظریں رابیل کے چہرے پر تھیں۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور رخسار گیلے تھے۔
ایک گہری سانس لے کر ایبک نے رخ موڑ لیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ایک کلینک کے سامنے تھے۔ گاڑی رکتے ہی ایبک تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔ ابھی وہ راہداری میں ہی تھا کہ اندر سے آتے ایک شخص نے ایبک کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یک دم چمک نمودار ہوئی تھی۔
''آپ......آپ ایبک ہیں نا؟......ایبک فلک شاہ؟''
''ہاں۔''
''میں ڈاکٹر حمزہ خالد ہوں۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''مجھے آپ سے ملنے کا......''
اس کی نظر یک دم ایبک کے خون آلود کپڑوں پر پڑی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ایبک نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
''اس وقت میں بہت پریشان ہوں۔ میری کزن کا یہاں سے کچھ فاصلے پر ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ گاڑی میں ہے۔ پلیز پہلے اس کے لئے کچھ کریں۔''

اور ڈاکٹر اسٹریچر لانے کا کہہ کر ایک کے ساتھ ہی تقریباً دوڑتا ہوا باہر پارکنگ میں کھڑی گاڑی تک آیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد رابیل کو اندر تھیٹر میں منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر حمزہ انہیں وہیں پر چھوڑ کر ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ تھیٹر میں چلے گئے اور وہ سب وہاں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

اریب فاطمہ خاموشی سے کھڑی تھی۔

''بیٹھ جاؤ اریب فاطمہ پلیز۔'' ایک نے نرمی سے کہا تو اریب فاطمہ، منیبہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اب کیا ہوگا مونی! رابیل......'' اس نے منیبہ کی طرف دیکھا تو منیبہ نے ہولے سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

منیبہ بھی مسلسل دعا مانگ رہی تھی۔

ہمدان اپنے فون پر نمبر ملا رہا تھا۔

''بابا جان کو ایک دم اچانک کچھ مت بتانا ہمدان!''

''نہیں۔ میں پاپا کو فون کر رہا ہوں۔ وہ خود بابا جان سے بات کر لیں گے۔''

''پاپا! میں ہمدان ہوں۔ وہ رابیل کا......''

وہ مصطفیٰ شاہ کو تفصیل بتا رہا تھا جب ایک اٹھ کر تھیٹر کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ واپس آ گیا تھا۔ اریب فاطمہ اور منیبہ بیسن کے پاس کھڑی تھیں جو ایک طرف لابی میں ہی لگا ہوا تھا۔ ہاتھ دھو کر اریب واپس آئی تو ایک کی نظریں اس کی چادر پر پڑی تھیں اور پھر اس کے چہرے پر لمحہ بھر کو ٹھہر کر جھک گئی تھیں۔

''منیبہ! تم اور اریب فاطمہ، یاسین کے ساتھ گھر چلی جاؤ۔ اریب کے کپڑے......''

''نہیں، نہیں۔'' اریب نے یکدم اس کی بات کاٹی۔ ''ابھی نہیں۔ رابیل ہوش میں آ جائے اور ڈاکٹر تسلی دے دے تو پھر چلی جاؤں گی۔''

ایک خاموش ہو گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر حمزہ، تھیٹر سے باہر آئے تھے۔

''اسٹچز وغیرہ لگ گئے ہیں۔ سر کا زخم گہرا تھا۔ بازو پر ہلکا سا فریکچر ہے لیکن خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ خون کی ضرورت ہوگی۔ کیا بلڈ گروپ کا علم ہے آپ کو؟''

''ہاں، ہاں۔ او پازیٹو ہے رابی کا بلڈ گروپ۔ ایک دفعہ ہم نے چیک کروایا تھا۔'' منیبہ نے جلدی سے کہا۔

''تو پھر میرا بھی او پازیٹو ہے۔ میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔''

ایک، ڈاکٹر حمزہ کے ساتھ ہی چلا گیا تھا لیکن فوراً ہی واپس آ گیا۔

''ہمی!......ہمی! آنٹی اور انکل احسان کو فون کر دو۔ میرے خدا!......کیا ہونے والا ہے۔ رابی کا سانس اُکھڑ رہا ہے۔ یا اللہ!......انکل مصطفیٰ کب تک پہنچیں گے؟''

ہمدان نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

''کیا بہت حالت خراب ہے؟''

''ہاں شاید۔ ڈاکٹر حمزہ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ آکسیجن لگائی ہے۔''

اریب فاطمہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جوں ہی مڑا، بے اختیار اٹھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''وہ......وہ ٹھیک تو ہو جائیں گی نا؟''

''انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ان شاء اللہ۔'' ایک نے اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ پر تسلی آمیز انداز میں ہاتھ رکھا اور تیزی سے مڑ گیا۔ لابی کے آخر میں تھیٹر کی طرف مڑنے سے پہلے ایک نے مڑ کر اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے دعائیں مانگ رہی تھی اور اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور عمر کہتا تھا کہ رابیل، اریب فاطمہ سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتی۔ اور یہ اس طرح رو رو کر اس کے لئے دعا کر رہی ہے جیسے بہت قریبی عزیز ہو۔ اتنے آنسو تو

منیبہ نے بھی نہیں بہائے ہوں گے جتنے اب تک یہ بہا چکی ہے۔
'اور یقیناً اریب فاطمہ! تم ایک انمول دل کی مالک ہو۔'
وہ تھیٹر سے باہر نکلتے ڈاکٹر حمزہ سے بات کرنے لگا تھا۔ اور جب عثمان شاہ اور مصطفیٰ شاہ، عمر اور زبیر کے ساتھ وہاں پہنچے تو اسے تھیٹر سے ملحق کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور خون کی بوتل لگا دی گئی تھی۔ ہمدان نے اس کے بیڈ کے نزدیک کھڑے کھڑے بغور اسے دیکھا۔ وہ مغرور آنکھیں بند تھیں۔ گلابی لب، جن پر اکثر طنز بھری مسکراہٹ ہوتی تھی، ان پر پپڑی جمی تھی۔ سفید رنگت میں زردیاں گھلی تھیں۔ ہمدان کے دل کو کچھ ہوا۔
وہ بابا جان کی بہت لاڈلی تھی۔
اور اپنے غرور اور تنک مزاجی کے باوجود وہ الریان کے ہر فرد کو بہت عزیز تھی۔
اس نے دیکھا۔ عمر اس کے بیڈ کے کنارے پر ٹکا اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا اور لحہ لحہ بعد دایاں ہاتھ اٹھا کر ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتا تھا۔ زبیر بھی نم آنکھوں کے ساتھ اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ اور مصطفیٰ شاہ، منیبہ سے پوچھ رہے تھے۔
''یہ کیسے ہوا؟..... کیونکر؟''
''ہم لوگ مارکیٹ سے باہر نکل کر دوسری مارکیٹ میں جا رہے تھے۔ وہ بائیک والا لڑکا رانگ سائیڈ سے آیا تھا۔ اس نے رابیل کو ٹکر ماری تھی۔ رابیل گر پڑی تھی۔ میں اور اریب دو قدم پیچھے تھے۔ ابھی ہم ششدر سے کھڑے تھے کہ ایک گاڑی رابیل سے ٹکراتی ہوئی تیزی سے نکل گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔'' اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ ''مجھے لگا تھا، گاڑی نے رابیل کو کچل دیا ہے۔ پھر اریب فاطمہ کی چیخ پر میں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ رابیل کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اریب اور میں تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھے تھے۔ لوگ ہمارے اردگرد جمع ہونے لگے تھے۔ اریب نے اس کا سر گود میں رکھ لیا تھا۔ میں یاسین کو بلانے کے لئے آئی تھی کہ ہمدان اور ایبک نے ہمیں دیکھ لیا۔''
ایبک نے بھی مصطفیٰ شاہ اور عثمان شاہ کے ساتھ منیبہ کی بات پورے دھیان سے سنی تھی۔ تب ہی ڈاکٹر حمزہ اندر آئے تھے۔ انہوں نے ڈرپ کا جائزہ لیا تو مصطفیٰ شاہ نے بے چینی سے پوچھا۔
''کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟''
''نہیں۔ سر میں اور گردن کے پاس زخم ہے بس۔ خون زیادہ بہہ گیا تھا۔ شکر ہے بلڈ کا بروقت انتظام ہو گیا۔ ایبک شاہ کا بلڈ میچ کر گیا۔''
اور تب ہی عمر احسان شاہ نے بے حد عقیدت اور تشکر سے ایبک فلک شاہ کو دیکھا۔ اس کے دل میں ایبک شاہ کا قد اور بھی بڑھ گیا تھا۔
''تھینک یو ایبک!'' عمر نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔
''بکومت۔'' ایبک شاہ نے ہلکا سا ہاتھ اس کے کندھے پر مارا تو ہمدان شاہ کو یاد آیا کہ وہ تو ایبک کے لئے جوس لینے جا رہا تھا اور پھر مصطفیٰ شاہ اور احسان شاہ کو آتے دیکھ کر ان کے ساتھ ہی پلٹ آیا تھا۔
''سوری یار!'' وہ ایک دم کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے ایبک کو مخاطب کیا تھا۔ ''میں تمہارے لئے جوس لے کر آتا ہوں۔ ڈاکٹر حمزہ نے کہا تھا، تمہارے لئے جوس لے آؤں۔''
''آئی ایم فائن یار!'' ایبک نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھو تم۔ اور ہاں، تم نے انکل احسان کو اور مائرہ آنٹی کو فون کر دیا ہے؟''
''وہاں کوئی فون ہی نہیں اٹھا رہا۔ پھر ایک بار کوشش کرتا ہوں۔''
''ایسا کرو بیٹا! میسج کر دو۔'' مصطفیٰ شاہ نے کہا۔ وہ راستہ بھر انہیں فون کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن وہ فون

نہیں اٹھا رہے تھے۔ اور پی ٹی سی ایل پر بھی کوشش کی تھی لیکن مسلسل انگیج کی بیل آ رہی تھی۔
ہمدان نے فون نکالا تو مصطفیٰ شاہ نے منع کر دیا۔
''میں کرتا ہوں خود۔''
''فون کیوں نہیں اُٹھا رہے ہو احسان!......رابی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ہم ہسپتال میں ہیں۔''
انہوں نے میسج کیا تو فوراً ہی بیل بج اُٹھی تھی۔ دوسری طرف احسان شاہ تھے۔
''کیا ہوا؟......کیسے؟......کہاں ہے رابی؟'' وہ بے قراری سے پوچھ رہے تھے۔
''رابی زخمی ہے اور ہوش میں نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ خطرہ نہیں ہے۔ پھر بھی......''
''جو بھی پہلی فلائٹ ملتی ہے، ہم اسی سے آ رہے ہیں۔''
مصطفیٰ شاہ انہیں تفصیل بتانے لگے تھے اور ڈاکٹر حمزہ، ایبک سے کہہ رہا تھا۔
''میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں ایبک شاہ!''
'اور یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا' ہمدان نے سوچا۔ 'ورنہ کسی اور ہسپتال میں جاتے تو یوں فوراً رابیل کو ٹریٹمنٹ نہ ملتی۔ پہلے تو انکوائری رپورٹ اور شاید پولیس۔ اس بھلے ڈاکٹر نے تو تفصیل جانے بغیر ہی......'
فون آف کر کے مصطفیٰ شاہ نے ایبک کی طرف دیکھا۔
''بیٹا! تم چلے جاؤ گھر اور بچیوں کو بھی لے جاؤ۔ کپڑے چینج کر کے آ جانا۔''
''لیکن میں یہیں پر رہوں گی، رابی کے پاس۔'' منیبہ نے انکار کر دیا تھا۔ ''ہاں، اریب کے کپڑے خون سے بھرے ہیں۔ یہ چلی جائے۔''
یہ ایک چھوٹا سا کلینک تھا۔ یہاں کسی پیشنٹ کے رہنے کا انتظام نہیں تھا۔ اس لئے ڈاکٹر حمزہ کے کہنے پر اسے عمر ہسپتال منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔
''ڈاکٹر عمر میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ میں انہیں فون کر دوں گا۔'' ڈاکٹر حمزہ کا رویّہ بے حد مخلصانہ تھا۔ عمر متاثر ہوا۔
''تھینک یو ڈاکٹر حمزہ!'' ایبک نے ڈاکٹر حمزہ کا شکریہ ادا کیا اور پھر اریب کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور مصطفیٰ شاہ سے کہا۔
''میں اریب کو ''الریان'' چھوڑ کر کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔ تب تک شاید رابیل ہوش میں آ جائے تو پھر عمر ہسپتال چلتے ہیں۔''
بات کر کے اس نے اریب کی طرف دیکھا جو اپنی چادر درست کر رہی تھی۔ اس کی نظر ایک لمحہ کے لئے چادر کے پھٹے ہوئے حصے پر ٹھہری تھی۔ پھر اس نے اریب سے نظریں ہٹا لیں۔
''آیئے اریب فاطمہ!'' اریب اس سے دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔ ایبک نے گاڑی کے پاس پہنچ کر اسے دیکھا اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ بغیر کچھ کہے بیٹھ گئی تو دروازہ بند کر کے لمبا چکر کاٹ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
سر جھکائے بیٹھی اریب فاطمہ بے حد تھکی ہوئی، اُداس اور نڈھال لگ رہی تھی۔
''آپ بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ چینج کر کے آرام کر لیجئے گا کچھ دیر۔ بلکہ کوئی سکون آور یا نیند کی ٹیبلٹ لے لیجئے گا۔ ذہن کو سکون ملے گا۔''
ایبک نے گاڑی روڈ پر لا کر ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔
''وہ......رابیل وہ......ڈاکٹر نے آپ سے کیا کہا تھا؟ کیا واقعی خطرے والی کوئی بات نہیں ہے؟'' کچھ دیر بعد اس

نے پوچھا تو ایبک مسکرا دیا۔
"خطرے والی کوئی بات نہیں ہے اریب فاطمہ! ڈاکٹر نے یہی کہا ہے۔ لیکن اطمینان تو تب ہی ہوگا، جب وہ ایک بار ہوش میں آجائے۔"
"اللہ کرے وہ جلدی ہوش میں آجائیں۔ اُف! خون اتنی تیزی سے نکل رہا تھا کہ میری کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ ہم کیا کریں۔ شکر ہے آپ اور ہمدان بھائی آگئے۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہوتا۔ میں گھر جا کر نفل پڑھوں گی۔"
"آپ بہت پریشان تھیں اور ابھی تک ہیں۔"
"مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا، کہیں رابیل کو کچھ ہو نہ جائے۔ بہت دعائیں مانگیں میں نے اللہ سے کہ رابیل کو کچھ نہ ہو۔"
"اللہ نے آپ کی دعا سن لی۔" ایبک ذرا سا رخ موڑے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "ویسے مائرہ آنٹی کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟"
"وہ اماں کے کسی کزن کی بیٹی ہیں۔ انکل احسان بھی اماں کے کزن ہیں۔"
اریب فاطمہ کی نظریں اپنے ہاتھوں پر تھیں۔
"بی اے کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے؟ ماسٹرز کریں گی؟"
ایبک کا جی چاہ رہا تھا وہ اس سے باتیں کرتا رہے۔ یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں۔ چند لمحے پہلے اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اسے بتائے کہ آج صبح وہ اسے کھونے کے کرب سے گزرا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے اس کے لئے زندگی ختم ہوگئی ہے اور زندگی کے سارے رنگ مر گئے ہیں۔
اور کیا صرف ایک اریب فاطمہ کے کھو دینے کا احساس زندگی کو اس کے لئے اتنا بے رنگ کر گیا تھا۔ اس وقت اس نے خود سے اعتراف کیا تھا کہ وہ اریب فاطمہ سے محبت کرتا ہے اور اس میں کسی قسم کے شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ اپنے احساسات اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کی مسکراہٹ اس کے لئے کئی قرنوں کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے اور اسے پانا اس کے لئے زندگی کی شدید خواہشوں میں سے ایک خواہش ہے۔ لیکن یہ وقت ان باتوں کے لئے مناسب نہ تھا۔ تب ہی اپنے احساسات کو دل میں چھپائے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا۔
'پتہ نہیں۔ ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ شاید ابا اجازت دیں، شاید نہ دیں۔'
کچھ دیر بعد اس نے کہا۔
"اگر آپ نے ماسٹرز کیا تو کس سبجیکٹ میں اور کہاں سے کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟"
"پتہ نہیں۔" اس نے پھر کہا تھا۔ "شاید میں واپس چلی جاؤں۔ وہاں رحیم یار خان میں بھی بہاول پور یونیورسٹی کیمپس ہے۔ لیکن ہمارا گھر گاؤں میں ہے۔ چک نمبر 151۔ ابا ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ بھائیوں کو بھی پسند نہیں ہے۔ اس لئے سروہ آنٹی نے مجھے یہاں چھوڑ دیا اتنی دُور۔ ابا مان جاتے تو میں رحیم یار خان میں ہی رہتی۔ یہاں نہ آتی۔"
"آپ یہاں نہ آتیں تو مجھے کیسے ملتیں؟" بے اختیار ایبک کے لبوں سے نکلا تھا۔
اریب فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن یک دم تیز ہو کر مدھم ہوئی تھی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔
"آپ کو یہاں آنا ہی تھا، اریب فاطمہ!...... کچھ باتیں لکھ دی جاتی ہیں اور وہ ہونی ہی ہوتی ہیں۔"
اریب فاطمہ نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے نچلے ہونٹ کو کچل رہی تھی اور اس کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ وہ اس وقت سگنل پر رُکے ہوئے تھے۔ وہ اسٹیئرنگ پر بازو رکھے مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ یوں پلکیں

جھپکاتی، ہونٹ کچلتی اس کے دل و دماغ کو اسیر کیئے دیتی تھی۔ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا تھا اور آج صبح سے اب تک کیا کیا محسوس کیا تھا، وہ اسے بتا نہیں سکتا تھا۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ بے وقعتی سے ڈر رہا تھا۔ جذبے دل میں ہوں تو بہت عظیم ہوتے ہیں۔ الفاظ میں ڈھل جائیں تو اکثر اپنی قدر و قیمت کھو دیتے ہیں اور وہ اپنے احساسات کے بے قدر و قیمت ہونے سے ڈرتا تھا۔

ایک ساتھ کئی گاڑیوں کے ہارن بجے تھے۔ اس نے چونک کر گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ اس کے پیچھے گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی جن کے ہارن مسلسل بج رہے تھے۔

''یورپ میں اگر کوئی اس طرح ہارن بجائے تو فائن ہو جاتا ہے ان پر۔'' اس نے ونڈ اسکرین میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہاں ایسا لگتا ہے جیسے ہر شخص بہت جلدی میں ہو۔ ایک رکشے والے سے لے کر بائیک والے تک سب۔ صبر کسی میں نہیں ہے۔''

وہ اپنے ان احساسات سے بچنا چاہ رہا تھا جو اسے ابھی تک گھیرے ہوئے تھے۔

''ہاں۔'' اریب نے اس کی تائید کی۔ ''راستہ بلاک ہو چکا ہے۔ کوئی ہوا میں تو اُڑ کر جا نہیں سکتا۔ لیکن پیچھے والے سچویشن جانتے ہوئے بھی ہارن پر ہارن بجائے جاتے ہیں۔ آپ صحیح کہتے ہیں۔ اماں بھی کہتی ہیں، صبر کسی میں نہیں ہے آج کل۔''

'اور حورعین نے صبر مریم سے سیکھا تھا۔ اپنی ماں سے۔'

بے اختیار اپنی ہی کہانی میں لکھا گیا جملہ اس کے لبوں پر تھرتھرایا اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر کر معدوم ہو گئی۔

'پتہ نہیں یہ کہانی کب مکمل ہو گی؟...... ہو گی بھی یا نہیں۔'

وہ اریب سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ لیکن ''الریان'' کا گیٹ نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ ''الریان'' کے گیٹ سے گاڑی اندر لے جا رہا تھا۔

مرینہ اسے لاؤنج میں ہی مل گئی تھی۔

''کیسی ہے وہ اب؟ پاپا کا فون آیا تھا۔ لیکن مجھے تسلی نہیں ہو رہی۔ ایبک بھائی! پلیز، آپ مجھے لے جائیں ہسپتال۔'' حسبِ معمول وہ تیز تیز بولتے ہوئے دائیں ہاتھ سے بار بار پھسل آنے والی عینک کو ناک پر درست کر رہی تھی۔

''وہ ٹھیک ہے اب۔ تم پریشان مت ہو۔ بابا جان کیسے ہیں؟''

مرینہ کی نظریں ان کے خون آلود کپڑوں پر تھیں۔ ''کیا آپ دونوں بھی زخمی ہیں؟'' وہ خوف زدہ سی تھی۔

''نہیں رینا گڑیا! یہ رابیل کو سنبھالنے میں لگ گیا۔ میں نے بابا جان کا پوچھا ہے۔''

''بابا جان کو میں نے سکون کے لئے ٹیبلٹ دے دی تھی۔ اس وقت سو رہے ہیں۔ مما اور ثنا آنٹی ابھی تک واپس نہیں آئی ہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔ تم پریشان مت ہونا۔''

''لیکن میں رابی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز ایبک بھائی!''

''بابا جان گھر میں اکیلے ہیں۔ کوئی آ جائے گھر میں تو چلی جانا۔ بلکہ میں کپڑے چینج کر کے ہسپتال جاتا ہوں تو ہمدان اور منیبہ کو بھیج دیتا ہوں۔ پھر تم آ جانا۔'' اس نے اریب کی طرف دیکھا۔

''آپ پلیز چینج کر لیں اور کچھ ریسٹ کر لیں۔'' وہ جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ تب ہی مرینہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر سمیرا باہر آئی تھی۔

''مرینہ پلیز۔ میں اب چلتی ہوں۔ تم لوگ خود پریشان ہو۔ ایسے میں میرا یہاں رہنا...... پھر کبھی آ جاؤں گی۔''

اس نے ایبک کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ مرینہ سے مخاطب تھی۔ ایبک کی نظریں لمحہ بھر کو اس کی طرف اُٹھی تھیں، پھر

جھک گئی تھیں۔ شاید وہ مرینہ کی کوئی سہیلی تھی۔

''یہ ایبک بھائی ہیں...... ایبک فلک شاہ۔ میں نے تمہیں بتانا تھا نا اُن کے متعلق۔ میرے کزن ہیں۔''

ایبک نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا لیکن اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''اور پلیز سمیرا! تم پریشان مت ہو۔ میں صرف تھوڑی دیر کے لئے جاؤں گی۔ تم اریب فاطمہ سے باتیں کرنا۔''

اب کے ایبک چونکا تھا۔

''یہ سمیرا ہے۔ میری دوست۔'' مرینہ نے جب بتایا تو وہ واپس کمرے میں جا رہی تھی۔

تو ہمدان نے اس کے متعلق صحیح ہی کہا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی۔ اور اس کا پورا وجود کسی گہری خاموشی میں لپٹا ہوا لگ رہا تھا۔ جب وہ بول رہی تھی، تب بھی یہ خاموشی اس کے وجود کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اور اس کی آنکھیں۔ جب وہ مرینہ کی طرف دیکھ رہی تھی تو اسے لگا تھا جیسے ان کی آنکھوں سے کوئی الم جھانکتا ہو۔ ایسا الم، ایسا دکھ جو اندر ہی اندر کاٹتا ہو اور وجود کو لہو کرتا ہو۔

ایبک نے واپس جاتے ہوئے سوچا۔

'اور ہمدان مصطفیٰ شاہ! یہ لڑکی سمیرا بے حد دلکش بھی ہے...... اس کی گندمی رنگت میں بلا کی ملاحت اور کشش ہے اور اس کی بے نیازی میں دل کھینچ لینے والا سحر ہے۔ اور اگر ہمدان مصطفیٰ کو پتہ ہوتا کہ وہ اس وقت ''الریان'' میں ہے تو وہ اُڑ کر یہاں پہنچتا اور اپنی خوش نصیبی پر رشک کرتا۔'

اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ گاڑی ''الریان'' کے گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔

❁○❁

ایبک نے صوفے کی پشت پر سر رکھتے ہوئے ٹانگیں پھیلائی تھیں۔ آج کا سارا دن ہی بے حد مصروف گزرا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ بہاول پور فون کرے۔ لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔

جب وہ کپڑے تبدیل کر کے ہسپتال پہنچا تو مصطفیٰ شاہ اور عثمان شاہ بے حد پریشان تھے۔ رابیل کو ہوش نہیں آیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی نیورو سرجن سے بھی چیک کرا لیا جائے۔ کہیں سر پر کوئی اور سیریس اندرونی چوٹ نہ ہو۔ پھر سرجن سے چیک بھی کرا لیا۔ کئی ایکسرے ہوئے۔ اسے عمر ہسپتال میں منتقل بھی کر دیا گیا لیکن وہ بے ہوش تھی۔ عمر ہسپتال میں ڈاکٹر عمر کے علاوہ بھی کئی ڈاکٹر جاننے والے تھے۔ سو فوراً ہی پرائیویٹ روم بھی مل گیا تھا اور ڈاکٹرز چیک بھی کر رہے تھے۔ ادھر احسان شاہ اور مائرہ، شیخ زید ایئر پورٹ پر لاہور کی فلائٹ کے انتظار میں بیٹھے تھے اور بار بار فون کر رہے تھے۔

دس بجے کے قریب رابیل نے آنکھیں کھولی تھیں اور عمر احسان شاہ نے جو اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھا تھا، نم آنکھوں اور روتی آواز کے ساتھ جو پہلی بات رابیل سے کی تھی، وہ یہ تھی۔

''رابی آپی! آپ کا بہت خون بہہ گیا تھا اور پتہ ہے ایبک بھائی نے آپ کو خون دیا۔''

رابیل کی نظریں ایک لمحہ کے لئے ایبک کی طرف اُٹھی تھیں جو دروازے کے پاس کھڑا ہمدان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

'اور یہ عمر بھی بس۔' ایبک نے سوچا تھا۔ 'اب یہ بھی کوئی کرنے کی بات تھی؟'

وہ ڈاکٹر کو بلانے باہر چلا گیا تھا۔ اور پھر ڈاکٹر نے رابیل کو چیک کر کے سب کو تسلی دی تو سب نے شکر ادا کیا۔ اس وقت تقریباً سب ہی وہاں موجود تھے۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد مرینا، ثنا آنٹی اور عثمان انکل واپس الریان چلے گئے تھے۔ لیکن ایبک کو گھر آتے آتے بارہ بج گئے تھے۔

اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی احسان شاہ اور مائرہ بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ مصطفیٰ شاہ کو صبح پھر آنے کا کہہ کر چلا آیا تھا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، لیکن وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اندر لفظوں کا ایک ہجوم

تھا۔ خیالات کا ایک بحر بے کراں تھا جو اُمڈ آنے کو بے تاب تھا۔ اسے سونا نہیں تھا۔ وہ اٹھا، اپنے لئے کافی بنائی اور پھر کافی پیتے ہوئے اس نے پچھلے لکھے ہوئے چند اوراق کا جائزہ لیا اور کافی ختم کر کے لکھنے بیٹھ گیا۔

''تو مریم اس روز کھڑی جالیوں میں سے باہر دیکھتی تھی۔ یہ گھڑونچی اندرونی صحن میں بنی تھی اور گھڑونچی کی دیوار میں اینٹیں اس طرح لگی تھیں کہ سوراخ سے بن گئے تھے۔ اور ان سوراخوں یا جالیوں میں سے حویلی کے پیچھے والا میدان دکھتا تھا اور عموماً گھڑونچیوں کی پچھلی دیوار اس طرح جالی دار بنائی جاتی تھی تا کہ ہوا آتی رہے اور گھڑوں میں پانی ٹھنڈا رہے۔ مریم گھڑونچی کے اوپر بنی الماری کا پٹ کھولے ساکت کھڑی جالیوں سے باہر دیکھتی تھی اور باہر دارو سائیں پیپل کے درخت کے گرد، دیوانوں کی طرح چکراتا تھا اور کبھی کبھی اس کے لبوں سے ہوک کی طرح گیت کے بول باہر آتے تھے۔

''نی میں نیل کرائیاں نیلکاں''

مریم ساکت کھڑی سنتی تھی اور اسے یاد نہیں تھا کہ وہ الماری سے کیا نکالنے آئی تھی۔

اور اسے اکثر بھول جاتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ کبھی وہ کچن میں ہی کھڑی سوچتی رہتی کہ وہ آخر یہاں کیا کرنے آئی ہے۔

کبھی سٹور میں، کبھی کمرے میں۔

اور اب بھی اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ الماری سے کیا لینے آئی تھی اور اسے پتہ بھی نہیں چلا تھا کہ سعدیہ کب اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور جالیوں میں سے دارو سائیں کو دیوانوں کی طرح چکراتے دیکھ رہی تھی۔

سعدیہ، چوہدری فرید کی دوسرے نمبر کی بیٹی تھی۔ اس کی پانچوں بیٹیوں میں سے سب سے زیادہ خوب صورت، شوخ اور چنچل۔ اس کی آنکھیں ہنستی تھیں اور اس کے لبوں پر کلیاں چٹکتی تھیں اور مریم کو پتہ نہیں کیوں اس کی ہنسی اور اس کی شوخی خوف زدہ کر دیتی تھی۔ اور مریم کی خوف کے ساتھ بھی پرانی سانجھ تھی۔

جب وہ اپنے میکے گھر کے آنگن میں سعدیہ کی طرح تتلی بنی چکراتی تھی، تب بھی یہ خوف اس کے وجود میں پنپتا تھا اور وہ اس خوف سے کبھی الگ نہیں ہوئی تھی۔ رات کو وہ اس خوف کو ساتھ لے کر سوتی اور صبح جاگنے پر وہ اسے اپنے پہلو میں پاتی۔

''یہ دارو سائیں کی آواز میں کتنا سوز، کتنا درد ہے۔ ہے نا اماں؟ اس کے گائے بول دل میں وحی کی طرح اُترتے ہیں اماں! اور اندر جل تھل کر دیتے ہیں۔'' جب سعدیہ نے اس کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے کہا تھا تو مریم چونکی تھی۔ سعدیہ کی آنکھیں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔

''نی سودے کیتے دلاں دے''

اس نے بڑے جذب سے گایا تھا اور مسکرائی تھی۔

''اماں! یہ دارو سائیں کو کسی سے محبت تو نہیں ہو گئی تھی؟''

''پیچھے ہٹ۔'' مریم کانپ گئی تھی۔ ''جھلا ہے، کم نصیب۔''

اور وہ گھڑونچی کے پاس سے ہٹ کر صحن میں بچھے سرخ پایوں والے نواڑی پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔ لیکن سعدیہ جالیوں میں سے جھانکتی تھی۔ گیت کے بول دہراتی تھی اور جیسے مست ہوئی جاتی تھی۔

اس کی عمر کتنی تھی۔ صرف سولہ سال۔ اور اس نے سولہ سال کی عمر میں دارو سائیں کی آواز میں سوز اور درد کو کھوج لیا تھا۔

مریم، سعدیہ کو کھوجنا چاہتی تھی، لیکن اس نے کوئی کھوج دیا ہی نہیں۔ اور بھلا کوئی کھوج ملتا بھی کیسے؟ اس کے سپنوں کا شہزادہ تو سیّد امتیاز علی شاہ تھا، جسے اس نے پہلی بار چھت پر سے باہر والے صحن میں ٹہلتے دیکھا تھا۔

اس کے چھوٹے چاچے چوہدری نوید کا دوست۔ جو ہر سال ایک بار ان کی حویلی میں آ کر ٹھہرتا تھا، چند دنوں کے لئے شکار کھیلنے کے لئے۔ چاچا نوید کہتا تھا۔

''وہ پرندوں پر گولی نہیں چلاتا۔ وہ صرف ہرن کا شکار کرتا ہے۔''
لیکن سعدیہ کے دل کا پرندہ تو زخمی ہو کر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ کسی ایسے پرندے کی طرح تھی جو دُور کہیں جھاڑیوں میں گرا ہو۔ تڑپتا ہو، پھڑ پھڑاتا ہو۔ لیکن شکاری اسے ڈھونڈ نہ پائے اور ذبح کر کے اس تکلیف سے نجات نہ دلائے اور وہ ایں جھاڑیوں میں تڑپ تڑپ کر مر جائے۔
''تو کیا وہ......'' میں نے اس کے دکھ کو اپنے دل میں محسوس کیا۔
''ہاں۔'' اس کی آواز میں ایک دم صدیوں کی تھکن اُتر آئی تھی۔ ''وہ اس کے گھر کے مردوں سے بالکل مختلف تھا۔ نرمی اور آہستگی سے بات کرتا تھا۔ اور اس کے گھر کے مرد تو اتنا اونچا بولتے تھے کہ درختوں پر بیٹھے پرندے سہم کر اُڑ جاتے تھے۔ سعدیہ تو اس کی آواز کی نرماہٹ پر مر گئی تھی۔ کبھی بھڑولے والے کمرے کے روشن دان سے لٹک کر جو باہر مردانے میں کھلتا تھا۔ کبھی باہر والے صحن سے گزرتے ہوئے گیسٹ روم کی کھڑکی کے پاس جان بوجھ کر کسی بہانے سے رک کر وہ اس کی آواز سنتی تھی اور اس کی آنکھوں میں جیسے ہیرے کی کنیاں دمکتی تھیں۔
اور مریم حیران ہوتی تھی۔ وہ تو کبھی کسی غیر مرد سے نہیں ملی۔ کبھی اکیلی گھر سے باہر نہیں گئی۔ پھر اس کی آنکھیں اتنی جگر جگر کیوں کرتی ہیں؟
اس کی چال میں اتنی مستی کہاں سے آ گئی ہے؟ سیندھ تو گھر کے اندر سے لگی تھی، پر مریم بے خبر تھی۔ اور وہ بھر بھر کلائیوں میں چوڑیاں پہنتی۔ آنکھوں کو کاجل سے سجاتی اور ذرا سی بات پر کھلکھلا کر ہنستی۔
پر اس روز اس کی ہنسی اس کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئی تھی۔ وہ جو پل پل گن کے گزارتی تھی کہ کب موسم بدلے اور کب امتیاز شاہ شکار کھیلنے ان کے گاؤں آئے۔ چوہدری فرید سے بات کرتے چوہدری نوید نے اس کے انتظار کے شیش محلوں میں چکنا چور کر دیئے تھے۔
''نہ بھاجی! امتیاز شاہ تو امریکہ سیٹل ہو گیا ہے، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ اب اس نے کیا آنا شکار کھیلنے۔''
اور اس کی آنکھوں کی جوت یک دم بجھی تھی اور پھر.......
حورعین چپ کر گئی تھی۔ سر جھکائے اپنی اوڑھنی کے پلو کو اپنی بائیں ہاتھ کی انگلی پر لپیٹتی۔ وہ اتنی تھکی ہوئی، اتنی افسردہ لگ رہی تھی کہ میرا جی چاہا، میں اس سے کہوں۔
''حورعین! آؤ میں تمہاری تھکاوٹیں بانٹ لوں اور تمہاری آنکھوں سے نکلنے والے ہر آنسو کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لوں۔'' لیکن مجھے اس کی خفگی سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ناراض ہو کر چلی گئی تو؟
میں چپ چاپ اسے انگلی کی پور سے پلکوں پر اٹکے ایک آنسو کو پونچھتے دیکھ رہا تھا۔
''پھر......؟''
''پھر کیا؟'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''چالیس اور پچاس کی دہائی کی طرح جالیوں اور جھروکوں اور کواڑوں کی سے ایک جھلک کی محبت نے اسے کھا لیا۔ اس کا خوب صورت بدن گھلنے لگا۔ وہ چارپائی پر لیٹی رہتی۔
مریم اسے ڈاکٹروں، حکیموں کے پاس لئے لئے پھری اور اٹھارہویں صدی کی ہیروئین کی طرح اسے ٹی بی ہو گئی تھی۔ اس کے اندر سے زندگی مر گئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے چارپائی پر پڑی رہتی، ساکت۔
کھلی کھڑکی سے جب دارو سائیں کی آواز آتی تو وہ ایک دم چونک کر آنکھیں کھول دیتی۔ اس کے ساکت وجود میں ہلچل ہوتی۔
وہ کہنیوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کرتی اور باہر پیپل تلے دارو سائیں کی آواز بلند ہوتی۔

''اَج منصف ہو جا سوہنڑیا
میں کیتا عشق وکیل''

اور جب دارو سائیں کی آواز آنا بند ہو جاتی تو وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر جاتی۔ اس کے ہونٹ ہولے ہولے ہلتے رہتے۔

''اساں سودنے کیتے دلاں دے
تے رکھ لے نین''

اس کے سرہانے رکھی میز پر دوائیوں کی شیشیاں بڑھتی گئیں۔ مریم کے سجدے لمبے ہوتے گئے، لیکن......
اس نے سر جھکا لیا۔
''حورعین!'' میں نے تڑپ کر اسے دیکھا تو اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں جیسے کسی نے ان میں خون بھر دیا ہو۔
''اس روز زمین اسے اپنی آغوش میں سمیٹے سسکیاں بھرتی تھی۔
اور دارو سائیں دیوانہ وار قبرستان میں چکراتا تھا اور اس کی پُرسوز آواز پورے قبرستان میں گونجتی تھی۔

''مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال
دھواں دھکے میرے مرشد والا جاں پھولاں تاں لال
مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال''

اور مریم، قبر کی گیلی مٹی پر رخسار ٹکائے ہولے ہولے سعدیہ کو پکارتی تھی اور روتی تھی اور زمین کے آنسو اس کے ساتھ بہتے تھے اور داور سائیں کا کپکپاتا ہاتھ ایک لمحہ کے لئے مریم کے سر پر ٹکا تھا اور مریم کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ اور داور سائیں پھر قبرستان میں چکرانے لگا تھا۔
''مائے نی.....''
اور داور سائیں کا درد کون جانتا تھا، سوائے مریم کے۔ لیکن سعدیہ کا درد تو مریم بھی نہ جان پائی تھی۔
اس رات داور سائیں پوری رات قبرستان میں چکراتا رہا تھا اور ساری رات زمین نے آنسو بہائے تھے اور زمین تو ہمیشہ ہی ایسے ہیروں کو اپنی آغوش میں چھپائے روتی تھی۔
جب طاعون نے کیسے کیسے لعل پارے اس کی گود میں بھر دیئے تھے۔
ان لعل پاروں کی جگہ اس کی گود تو نہیں تھی۔ انہیں تو کہیں اور دمکنا تھا۔ وہ انہیں گود میں بھرتی جاتی اور روتی جاتی۔
تمہیں اتنا تو پتہ ہوگا نا شاعر! جب تمہارے اس برصغیر میں طاعون نے تباہی مچائی تھی تو ہر گھر سے دو دو، چار چار جنازے اُٹھتے تھے۔ اور ایک وقت ایسا آیا تھا کہ انگریز سرکار نے اعلان کر دیا تھا کہ پنڈی کو توپوں سے اُڑا دیا جائے۔ اور یہ 1918ء تھا۔ جب قحط نے انسانوں کو ہڈیوں کے ڈھانچوں میں بدل دیا تھا اور جب لوگ زمین کھود کھود کر چیونٹیوں کے بلوں سے ان کی جمع شدہ خوراک نکال کر کھاتے تھے تو زمین اس بے بسی پر روتی تھی۔ اور جب قحط ان کی ہڈیوں سے روح نکال لیتا تھا، وہ کسی مہربان ماں کی طرح ان کو اپنی آغوش میں لے لیتی تھی اور ان کے لئے روتی، آنسو بہاتی تھی۔ پر اس رات سعدیہ کو آغوش میں لئے وہ اسے تھپکتی تھی اور آہیں بھرتی تھی۔
اور حویلی کے کمروں میں اِدھر سے اُدھر چکراتے ہوئے مریم اپنی چیخوں کو روکتی تھی اور ہوا کے دوش پر کبھی کبھی لہراتی، داور سائیں کی آوازیں۔

''مائے نی میں کنوں آکھاں، درد وچھوڑے دا حال۔''

اُس کا سینہ چیرتی تھی۔''
اور حورعین کی آنکھوں سے آنسو برس پڑے تھے۔
''خدا کے لئے حورعین! بس کرو۔'' میں بے آواز چیخا تھا۔ ''تمہارے آنسو میں اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹ نہیں پاتا۔

ابھی آج میرے سامنے مت بہاؤ۔ ہاں ایک دن میں تمہارا سر اپنے سینے سے ٹکا کر کہوں گا، یہ سینہ تمہارا ہے۔ جتنا چاہے کھل لو۔ بہت کھل کر برس لینا، میں تمہیں سنبھال لوں گا۔ اور تمہارے آنسو بھی سمیٹ لوں گا۔ لیکن اس وقت مت روؤ۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔"

"ٹن، ٹن......"

پتہ نہیں کب سے موبائل بج رہا تھا۔

ایبک فلک شاہ نے چونک کر ٹیبل پر پڑے موبائل کو دیکھا اور ہاتھ آگے بڑھا کر اسے اٹھانا چاہا۔ لیکن بیل بند ہو گئی تھی۔ وہ قلم ہاتھ میں پکڑے یوں ہی خالی خالی نظروں سے ٹیبل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

حورعین رو رہی تھی اور اسے کیا لکھنا تھا؟ وہ سوچنے لگا۔ تب ہی بیل دوبارہ بج اُٹھی تھی۔ اس نے فون اٹھالیا۔ دوسری طرف ہمدان تھا۔

"ایبک!......ایبک وہ......"

"کیا ہوا؟" وہ ایک دم جیسے ہوش میں آیا تھا۔

"کیا ہوا؟ رائبل تو ٹھیک ہے نا؟.....اور تم کہاں ہو ہمدان!..... بولو نا"

"ہسپتال میں ہوں اور......" وہ ایک دم رو پڑا تھا

"ہومی!......ہومی! کچھ کہو...... بولو"

لیکن اس نے روتے روتے فون بند کر دیا تھا۔ ایبک نے دو تین بار اس کا نمبر ملایا لیکن کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

❁○❁

بہاول پور کی وہ صبح بہت خوب صورت تھی یا فلک مراد شاہ کو لگ رہی تھی۔ انہوں نے آج برسوں بعد عمارہ کو یوں سامنے بٹھائے رکھا تھا۔ جتنی بار بھی عمارہ نے اٹھنا چاہا، انہوں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

"نہیں عمو! کچھ دیر تو اور بیٹھو۔ باتیں کرو۔"

اور عمارہ کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں بلکہ اس حادثے سے پہلے تک وہ اکثر یوں ہی عمارہ کو اپنے سامنے بٹھالیا کرتے تھے۔ اٹھنے ہی نہ دیتے تھے۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ جی چاہتا ہے کہ تم میرے سامنے بیٹھی رہو اور میں تمہیں تکتا رہوں۔"

وہ جھنجلاتی۔ کبھی اسے کچن میں ہدایات دینا ہوتیں، کبھی آپی کا کوئی کام ہوتا اور وہ اس کی جھنجلاہٹ سے محظوظ ہوتے۔

"ٹھیک ہے، میں اجازت نہیں دے رہا جانے کی۔ تم کو جانا ہے تو چلی جاؤ۔"

اور عمارہ بے بس سی بیٹھی رہتی۔ لیکن اس حادثے نے تو جیسے سارے استحقاق ختم کر دیئے تھے۔ وہ تو عمارہ سے نظریں بھی نہ ملا پاتے تھے۔ انہوں نے چھبیس سال خود کو کٹہرے میں کھڑا کیے رکھا۔ وہ خود کو عمارہ کا مجرم سمجھتے تھے۔ ان کی حماقت نے ان کی زندگیوں میں سے چھبیس سال نکال دیئے تھے۔

بابا جان آئے تھے۔

مصطفیٰ شاہ آئے تھے۔

ان سے مل کر، بابا جان سے دل کا حال کہہ کر بھی، ساری حقیقت بتا کر بھی جیسے دل کا بوجھ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ اندر سے شرمندہ تھے۔ انہوں نے مصطفیٰ شاہ سے نظریں نہیں ملائی تھیں۔ وہ ان سب کے بھی تو مجرم تھے۔ بابا جان کو بیٹی سے جدائی کا عذاب دینے میں احسان شاہ کی طرح برابر کے قصور وار۔ پہل تو انہوں نے کی تھی۔ اور احسان شاہ نے اس

دُوری پر مہر لگا دی تھی۔ لیکن اصل قصوروار تو وہ تھے۔
احسان شاہ بھلے ان سے خفا ہی رہتا، ان پر ''الریان'' کے دروازے بند کر دیتا، وہ کبھی اس کی غلط فہمی دور نہ کر پاتے لیکن عمارہ کے لئے تو ''الریان'' کے دروازے کھلے رہتے۔ ایک اور انجی تو اپنے ننھیال سے محروم نہ ہوتے۔ وہ کئی لوگوں کے مجرم تھے۔
اس احساس نے چھبیس سال انہیں تڑپایا اور رُلایا تھا۔ اور ابھی بھی یہ احساس ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ بابا جان اور مصطفیٰ شاہ کے جانے کے بعد بھی وہ یوں ہی مضطرب اور بے چین تھے۔ بار بار عمارہ سے معافی مانگتے تھے۔ لیکن یہ صبح عثمان شاہ نے کیا فسوں پھونکا تھا کہ وہ......
ان کے سامنے بیٹھی عمارہ نے سوچا تو انہوں نے جیسے ان کی سوچ پڑھ لی اور بہت گہری نظروں سے عمارہ کو دیکھا۔ عمارہ ان کی نظروں کی حدت محسوس کر کے گھبرائیں تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
''عمو! تم آج بھی چھبیس سال پہلے کی طرح میرے سامنے بیٹھنے سے پزل ہو جاتی ہو۔ لگتا ہے جیسے کچھ بھی نہیں بدلا اور سوچو تو، سب کچھ بدل گیا۔''
وہ ذرا سا اُداس ہوئے تھے، لیکن پھر عثمان شاہ کی باتیں یاد کر کے ان کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ عثمان شاہ نے کہا تھا۔
''مومی! ہمیں معاف کر دو۔ ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔ ہم نے شانی کی دھمکی سنی اور یقین کر کے ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ کیا تم اور عمارہ اتنے غیر اہم، اتنے پرائے تھے کہ ہم نے سب کچھ بڑی آسانی سے قبول کر لیا کہ ہاں! ٹھیک ہے ایسا ہی ہے۔ عمو اور مومی نہ سہی تو زندگیوں میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں میں، اپنے اپنے بچوں کے ساتھ خوش تھے۔ اماں شاید سچ ہی کہتی تھیں کہ اولاد ہو جائے تو پھر بہن بھائی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یار! پیچھے تو ہوتے ہیں، اولاد کے بعد سہی، لیکن ہم نے تو تمہیں اور عمو کو قطار سے ہی نکال دیا، جیسے تم کبھی اس قطار کا حصہ تھے ہی نہیں۔ ہم نے کبھی اماں جان اور بابا جان کا سوچا ہی نہیں۔ عمو جن کی اولاد تھی، عمو سے میری سفارش کرنا مومی! اس کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ وہ جب یہاں آئی تو میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ پایا۔ معافی بھی نہیں مانگ پایا۔''
تم ہمیشہ سے جذباتی سے مومی! ہم سب جانتے تھے، شانی نے تمہیں ضرور ہرٹ کیا ہوگا۔ ہمیں تو چاہئے تھا کہ اس کا کان سے پکڑ کر تمہارے پاس لاتے کہ لو، دونوں لڑ جھگڑ لو اور دل صاف کر لو۔ ایک دوسرے سے کہہ سن لو۔ ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔ لیکن یہ سب لکھا جا چکا تھا۔ ایسا ہی ہونا تھا میری جان! ہمیں معاف کر دو۔''
ہمیشہ کے کم گو سے عثمان شاہ کی اتنی طویل گفتگو فلک شاہ نے خاموشی سے سنی تھی۔
''مجھے تو خود آپ سے معافی مانگنی ہے۔ میرے غصے نے اور......''
''بس اب مزید اس پر بات نہیں ہوگی۔ مومی! اب ماضی پر رونے کے بجائے حال کے گزرتے لمحوں کو پکڑنا ہے۔ تم اور عمارہ لاہور آنے کی تیاری کرو۔ عادل کی منگنی ہے حفصہ کے ساتھ۔ اور تمہیں، انجی اور جواد سب کو آنا ہے۔''
''کہاں... ہم کہاں آئیں گے عثمان بھائی! کرنل شیر دل کے گھر یا ہوٹل میں؟'' ان کے لبوں سے سسکی نکل گئی تھی۔
''ایسے تو زخموں کے ٹانکے اُدھڑ جائیں گے۔ اور جو شانی نے ہمیں ہال سے ہی نکال دیا تو......''
''عمارہ اپنے میکے گھر، اپنے بابا جان کے پاس آئے گی۔ مومی اور شانی سے تو اب میں سمجھوں گا۔'' عثمان شاہ کی آواز میں چہکار تھی اور فلک شاہ کا دل ڈوب گیا تھا۔ عمارہ کا میکہ تو انہوں نے عمارہ کے لئے اور اپنے لئے شجرِ ممنوعہ بنا دیا تھا۔
''گھر اینٹ، پتھر اور چونے کی چار دیواری سے ہوتا ہے مومی! عمارہ کا میکہ وہی ہے، جہاں عمارہ کے گھر والے ہوں گے۔ بابا جان، ملک صاحب والا گھر لے رہے ہیں۔ مصطفیٰ بھائی ابھی ملک صاحب سے ہی بات کرنے گئے ہیں۔'' وہ خوشی سے سرشار تفصیل بتانے لگے تھے۔
''عثمان بھائی نے ایسا کیا کہہ دیا مومی! جو آپ......'' عمارہ نے پوچھا تو وہ چونکے۔

"عمارہ! بابا جان ہمارے لئے گھر لے رہے ہیں۔ جہاں تم جا کر ان کے ساتھ رہو گی۔ وہ تمہیں تمہارا میکہ لوٹا رہے ہیں جو میری وجہ سے چھن گیا تھا۔"

"اور آپ؟" عمارہ کی نظریں ان پر تھیں۔

"میں...... میں بھلا وہاں کیسے جا سکتا ہوں عمو!......احسان شاہ......"

"تو میں آپ کے بغیر جب پہلے نہیں گئی تو اب کیوں جاؤں گی؟" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ لیکن انہوں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

"اب جانے میں اور پہلے جانے میں بہت فرق ہے۔ اور میں آج بہت خوش ہوں عمو! تمہارے میکے کا مان تمہیں مل رہا ہے۔ تم عادل اور حفصہ کی منگنی میں شریک ہونا، جیسے عورت میکے کی کسی تقریب میں شرکت کے لئے خوش خوش تیار ہوتی ہے، تم بھی خوشی خوشی تیاری کرو۔ تمہیں تیاری کرتے دیکھ کر میں بہت خوش ہوں گا۔ انجی اور جواد بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ یہ خواب ان چھبیس سالوں میں کتنی بار دیکھا ہے میں نے اور تم نے بھی۔"

"لیکن میرے خوابوں میں آپ بھی میرے ساتھ تھے موی! اور مجھے اپنے خواب کی پوری تعبیر چاہئے۔ آدھی نہیں۔" وہ مسکرائیں اور پھر سے انہیں "الریان" کی تقریبات یاد آ گئیں۔

بہت کچھ یاد آ کر آنکھیں نم کر گیا تو فلک شاہ تڑپ اُٹھے۔

"او کے، ٹھیک ہے۔ لیکن عمو! مجھ معذور کا بوجھ کہاں اٹھاتی پھرو گی؟"

اور عمارہ نے ایک ناراض نظر ان پر ڈالی اور اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے پھر ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

"اچھا ناراض تو مت ہو۔ جو حکم تمہارا۔"

وہی چھبیس سال پہلے والا انداز۔ وہی لہجہ، وہی جملے۔

"مروا دے لو، لیکن ناراض مت ہوا کرو۔" اور ہمیشہ کی طرح عمارہ کوئی بحث کئے بغیر بولی تھیں۔

"فنکشن ہے کب؟"

"ابھی نہیں۔ عثمان بھائی نے بتایا نہیں۔ لیکن جلد ہی ہو گا۔ انہیں واپس بھی تو جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ بابا جان گھر لے لیں تو ہم چلیں گے۔ ایک سے بات ہوئی آپ کی؟"

"نہیں۔ جب سے بابا جان گئے ہیں، بات ہی نہیں ہوئی۔ تم کرو نا۔"

"میں نے کچھ دیر پہلے کیا تھا۔ اس نے اٹینڈ نہیں کیا۔ شاید سو رہا تھا۔ آپ کے لئے چائے بنا لاؤں، پھر کرتی ہوں۔ بابا جان کے لاہور آنے کا بھی نہیں پتہ ہو گا۔ مصطفیٰ بھائی اچانک ہی تو آئے تھے۔"

"آج چائے رہنے دو۔ جی نہیں چاہ رہا۔ تمہیں یاد ہے، وہ عبدالغفور کا چائے کا کھوکھا...... الریان سے نکل کر روڈ پر سے پہلے کونے میں۔ کبھی کبھی جب میں اور شانی سردی میں وہاں کی کڑک چائے پینے رات نو بجے چپکے سے جاتے تو تم بھی ساتھ چل پڑتی تھیں۔ اور پھر چائے پی کر کتنے برے برے منہ بناتی تھیں۔"

"اتنا میٹھا۔ ہونٹ چپک گئے۔ اتنا دودھ۔ یہ چائے ہے یا دودھ کا شربت۔"

"ہاں......" عمارہ مسکرائیں۔ "پتہ نہیں آپ کو اور شانی کو وہ عبدالغفور چاچا کی چائے اتنی پسند کیوں تھی۔"

"ہمیں عبدالغفور چاچا پسند تھا، اس کی سادگی، اس کا خلوص، اس کی محبت۔"

اس کے ساتھ پتہ نہیں اور کیا کیا کچھ یاد آ گیا تھا اور وہ جیسے کسی خواب کے عالم میں بول رہے تھے۔

"یاد ہے نا عمو! شانی کے ساتھ کبھی کبھی تم بھی تو زبردستی زارا کا ہاتھ تھام کر ساتھ چل پڑتی تھیں۔ اور زارا کو تو ہم انکار نہیں کر سکتے تھے۔ شاہ عالمی کی قلفی اتنی بار کھائی کہ پھر مزا ہی نہیں رہا۔ لکشمی کے دال چاول اور کڑاہی اور سبز چائے، انارکلی، نوہا زار کی چاٹ اور نیشنل لاء کالج کی الحمرا آرٹ کونسل کے باہر بیٹھنے والے سے شکر اور ستو کا شربت اور......"

''اور اماں جان کی ڈانٹ۔'' عمارہ ان کی بات کاٹ کر کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔ اور وہ مسرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ کتنے سالوں بعد وہ اس طرح پورے دل سے ہنسی تھیں۔

''ایک سے کہوں گا، مجھے ان ساری جگہوں پر لے جائے جہاں میں شانی کے ساتھ جایا کرتا تھا۔''

کیا کیا یاد آ گیا تھا۔ ریگل سینما کی انگلش فلمیں، گلشن اقبال کے فوارے، شادمان کی شوخ و چنچل نوعمر لڑکیاں، جناح پارک کے اونچے درخت، اسٹیج ڈرامے، ماڈل ٹاؤن کے سیخ کباب۔ اور ماڈل ٹاؤن میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا گھر اور اس میں آرٹ کی نمائندگی کرتے پیتل کے اسکیچ، گلیکسی شاپنگ پلازہ کی پھسلواں ماربل کی سیڑھیاں۔

کیا کیا کچھ یاد آ رہا تھا۔ وہ ایسے یادوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ انہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب عمارہ گرم گرم بھاپ اُڑاتی چائے کا کپ ان کے پاس رکھ کر چلی گئی تھیں۔ چائے کی خوشبو ان کے اطراف پھیلی ہوئی تھی اور وہ لاہور کی گلیوں میں گھوم رہے تھے۔

اور یہ مسلسل فون کی بجتی گھنٹی تھی، جو انہیں ان گلیوں سے باہر لائی تھی۔ وہ چونک کر کچھ دیر یوں ہی خالی خالی نظروں سے پاس پڑے فون کو تکتے رہے۔ بیل بند ہو گئی تو انہیں خیال آیا کہ انہیں ریسیور اٹھانا چاہئے تھا۔ جانے کس کا فون تھا۔ عمارہ ضرور اِدھر اُدھر ہوں گی، ورنہ باہر والا فون اُٹھا لیتیں۔ بیل دوبارہ ہونے لگی تھی، اب انہوں نے فوراً ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو!'' ان کے ہیلو کہنے پر دوسری طرف سے کوئی اجنبی آواز سنائی دی تھی۔ بولنے والی کوئی خاتون تھی۔

''مجھے فلک شاہ سے بات کرنا ہے۔''

''جی میں فلک شاہ ہی بول رہا ہوں۔ آپ کون؟''

دوسری طرف لمحہ بھر کے لئے خاموشی چھا گئی، پھر ایئر پیس سے آواز آئی۔

''مائرہ...... مائرہ احسان شاہ۔''

''مائرہ۔'' انہوں نے بے حد حسرت سے ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو دیکھا۔ بھلا مائرہ نے اب اتنے سالوں بعد کیوں فون کیا ہے یہاں؟ کیا وہ شرمندہ ہے؟ کیا اب سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے؟ اتنے سالوں بعد۔ کیا وہ احسان شاہ کو سب کچھ بتا دے گی، جو سچ تھا؟

ایک دم ہی بہت ساری خوش فہمیوں نے انہیں گھیر لیا اور انہوں نے سوچا، آج کی صبح واقعی بہت خوب صورت ہے اور جب وہ بولے تو ان کی آواز سے خوشی کا تاثر ملتا تھا۔

''مائرہ بھابی! آپ کو ہمارا نمبر کہاں سے اور کیسے ملا؟''

''یہ نمبر تھا فلک شاہ! تم نہیں تھے، جو نہ ملتے۔''

اور وہ ششدر رہ گئے۔ ان کا ریسیور والا ہاتھ کانپ گیا۔

یہ مائرہ اتنے سالوں بعد کیا کہہ رہی تھی؟ جب ان کے بچے جوان ہو گئے تھے۔

''مائرہ بھابی......!'' وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ مائرہ نے سختی سے ٹوک دیا۔

''میں نے اس رشتے کا حق تمہیں کبھی نہیں دیا موی! میں تمہاری بھابی نہیں ہوں اور نہ ہی احسان شاہ تمہارا بھائی ہے۔ شاید کبھی اس نے بھائی کہا ہو۔ لیکن اب وہ تمہیں اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔ اس کی بیوی پر بری نظر ڈالنے والا اس کا بھائی نہیں ہو سکتا۔''

''شٹ اپ مائرہ! اس سے آگے ایک لفظ بھی کہا تو......''

''تو کیا کرو گے؟'' وہ عجیب طرح سے ہنسی۔

''مائرہ......!'' ان کی آواز کانپنے لگی تھی۔ ان کے اندر مسلسل الارم بج رہا تھا۔

فلک شاہ! غصے پر کنٹرول رکھو۔ اس غصے نے ان کی زندگی میں سے چھبیس سال نکال دیئے تھے۔

''چپ کیوں ہو گئے؟...... بولو، کہو۔'' مائرہ کی آواز انہیں مذاق اُڑاتی ہوئی سی تھی۔ تاہم انہوں نے بہت تحمل سے کہا۔
''آپ اصل بات کریں مائرہ! آپ نے فون کیوں کیا ہے؟''
''میں تمہیں دیکھنا نہیں چاہتی فلک شاہ! ہم سے دور رہو۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ اتنی شدید کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میری بات اچھی طرح سن لو اور سمجھ لو۔ میرے اندر یہ جو نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے، یہ کبھی نہیں بجھے گی۔ ایسا نہ ہو کہ اب کے یہ آگ تمہیں جلا کر بھسم کر دے۔ تمہارا رہا سہا بھرم بھی ختم ہو جائے۔''
''ضروری تو نہیں مائرہ احسان! کہ جیت ہمیشہ تمہاری ہی ہو۔'' انہوں نے حیرت انگیز تحمل سے کہا۔
''لوگ تو وہی دیکھیں گے جو انہیں دکھایا جائے گا فلک شاہ!...... کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ اور حفصہ اور عادل کی منگنی میں شرکت کرنے کے لئے مت آنا۔ بابا جان عمارہ سے اور تم سے مل لئے۔ مصطفیٰ بھائی بھی مل لئے۔ اسی پر اکتفا کرو۔ میں سر عام تمہارا پول کھول دوں گی، بتا دوں گی سب کو کہ تم کیا تھے۔''
''وہ سب جھوٹ تھا، ڈرامہ تھا جو تم نے کیا۔ تم جانتی ہو کہ حقیقت کیا ہے۔'' وہ بے حد برداشت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔
''ہاں۔ میں جانتی ہوں۔ لیکن لوگ نہیں جانتے فلک شاہ! میری گواہی احسان دے گا۔ تمہاری گواہی کون دے گا؟'' وہ پھر ہنسی تھی۔
''میری گواہی اللہ دے گا، مائرہ احسان شاہ!'' ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
ایک لمحہ کے توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔
''میری بات کو مذاق مت سمجھنا فلک! اور مت آنا یہاں۔ ورنہ اپنے بچوں سے بھی نظر نہ ملا سکو گے۔''
اس نے ایک دم ہی فون بند کر دیا تھا۔ ریسیور سے ٹوں ٹوں کی آواز آنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک یوں ہی ریسیور ہاتھ میں تھامے رہے، پھر ایک گہری سانس لے کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور چائے کی طرف دیکھا جو ٹھنڈی ہو چکی تھی۔
'تو تم چاہتی ہو مائرہ احسان شاہ! کہ ہم عادل اور حفصہ کی منگنی میں شرکت کے لئے نہ آئیں۔ شاید میں پہلے نہ آتا، لیکن اب میں ضرور آؤں گا۔ چاہے بابا جان الگ گھر لیں یا نہ لیں۔'
وہ جیسے دل ہی دل میں فیصلہ کر رہے تھے۔ اور پھر فیصلہ کرنے کے بعد جیسے وہ مطمئن سے ہو گئے تھے۔ وہ اپنی وہیل چیئر کے پہیے گھماتے ہوئے باہر آئے۔ عمارہ کچن میں تھیں۔
''عمارہ!'' انہوں نے باہر سے آواز دی۔ عمارہ، صافی سے ہاتھ پونچھتی ہوئی باہر آئیں۔
''چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی عمارہ!...... پلیز اگر ہو سکے تو ایک کپ بنا دو۔''
اور عمارہ خوشی سے نہال ہو گئیں۔ کتنے سالوں بعد انہوں نے کوئی فرمائش کی تھی۔ ورنہ ان چھبیس سالوں میں انہوں نے خود سے کبھی اپنے لئے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس ہمیشہ شرمندہ سے نگاہیں جھکائے رہتے تھے۔
''آپ چلیں، میں ابھی لے کر آتی ہوں۔''
عمارہ کو بھی آج کی صبح بہت روشن اور چمک دار لگی تھی۔
وہ وہیل چیئر پر اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے کوریڈور میں رکھے فون اسٹینڈ کے پاس ٹھہر گئے۔ فون کی بیل ہو رہی تھی۔ انہوں نے جھک کر سی ایل آئی پر نمبر دیکھا۔
یہ وہی نمبر تھا، جس سے ابھی کچھ دیر پہلے کال آئی تھی۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد انہوں نے ریسیور اٹھا لیا۔

❁○❁

وہ بڑی روانی سے فون پر عربی میں باتیں کرتا ہوا اچانک اپنے پیچھے آنے والے شخص کی طرف مڑا، مسکرایا اور فون پر الوداعی جملے کہہ کر فون بند کر دیا۔
''سوری طیب خان! میں تمہیں ایئر پورٹ پر لینے نہیں آ سکا۔ کچھ مہمان آ گئے تھے دبئی سے۔ ان کے لئے کچھ انتظام

کرنا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" طیب خان مسکرایا۔

وہ اپنے مخصوص لباس میں تھا۔ سر پر مخول اور سبز رنگ کی افغانی جیکٹ زیب تن کئے ہوئے تھا۔ داڑھی پہلے کی نسبت زیادہ لمبی تھی۔

"میرا ارادہ تو بائی روڈ آنے کا تھا لیکن پھر تمہارا پیغام ملا کہ بائی ایئر پہنچو۔ سب خیریت تو ہے نا؟ کوئی پرابلم؟"

"نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔" اب دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

پورچ بہت بڑا تھا۔ بیک وقت دس بارہ گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ اس وقت بھی تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک وہی تھی، جس میں وہ ایئرپورٹ سے آیا تھا۔

طیب نے سراہتی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ گیٹ میں بائیں طرف وسیع پورچ تھا اور دائیں طرف بہت خوب صورت اور وسیع لان، جس میں پلاسٹک کی چند کرسیاں اور ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ مالی لان میں مصروف تھا۔ پھولوں کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو طیب خان؟"

"بہت خوب صورت، بہت شان دار گھر ہے تمہارا۔"

"گھر نہیں، عارضی ٹھکانہ کہو۔ آج یہاں ہیں۔ کل نہ جانے کہاں ہوں گے۔"

پورچ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ایک لمحہ کے لئے رکا تھا۔ پانچ سیڑھیوں کے بعد لکڑی کا منقش دروازہ تھا، جو زمین سے چھت تک تھا۔ دوازے کے سامنے پہنچتے ہی دروازہ خود بخود کھل گیا تھا۔ شاید کوئی اندر سے دیکھ رہا تھا، جس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی طیب خان نے دروازہ کھولنے والے کو دیکھنا چاہا۔ وہ ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی تھی۔ شاید ملازمہ۔

یہ سٹنگ روم تھا۔ یہاں سے ایک محراب ٹی وی لاؤنج کی طرف تھی، جس پر جالی کا بے حد خوب صورت پردہ تھا۔ جبکہ ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی سٹنگ روم میں ہی کھل رہا تھا۔ یہ بھی لکڑی کا ایک منقش بھاری دروازہ تھا۔ طیب خان اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آیا اور بیٹھتے ہی بولا۔

"کمال کا بھیس بدلا ہے تم نے رچی! پہلی نظر میں تو تمہیں پہچان ہی نہیں سکا۔ اور پھر تمہارا عربی لب و لہجہ۔ جو شخص تمہیں پہلے سے نہ جانتا ہو، وہ تمہیں عرب ہی سمجھے گا۔"

رچی اس وقت مکمل عربی لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں سچے موتیوں کی تسبیح تھی، جسے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کلائی پر لپیٹ لیا تھا۔

رچی مسکرا دیا۔

"میں ایک بار پہلے بھی ضلع رحیم یار خان آیا تھا۔ صادق آباد میں باس سے ملنے۔ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ ویسے ایک بات ہے، پاکستان ایک بہت خوب صورت ملک ہے۔"

"واقعی اس میں سب کچھ ہے۔ ندی، نہریں، پہاڑ، وادیاں، میدان، صحرا، معدنیات۔"

"تب ہی تو تم اس پر دانت لگائے بیٹھے ہو۔" طیب ہنسا۔

"رال تو تمہاری بھی ٹپکتی ہے۔"

"ہا..... ہا....." اب کے طیب بہت زور سے ہنسا تھا۔ "ہمارا معاملہ اور ہے رچی میڈ! ہمیں لگتا ہے کہ اس ملک پر ہمارا حق ہے۔ یہ ہمیں واپس ملنا چاہئے۔"

"اچھا....." رچی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تو تم یہ خواب بھی دیکھتے ہو۔"

''تم یہ بتاؤ کہ آخر تم نے مجھے اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلایا ہے؟ میں اپنے بہت سے کام ادھورے چھوڑ کر آیا ہوں۔''
رچی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ وہ کچھ دیر تک عربی میں بات کرتا رہا۔ بات ختم کرنے کے بعد اس نے طیب کی طرف دیکھا، جو ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
''یہ تمہارے مہمان کیا عرب ہیں؟''
''ہاں۔''
''کوئی خاص؟'' طیب نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''نہیں۔ بے ضرر سے دبئی کے شیخ ہیں۔ تیل کی دولت خرچ کرنے آئے ہیں۔'' وہ ہنسا۔
''میں نے سنا تھا، یہاں رحیم یار خان میں عرب شیخ نے محل وغیرہ بنا رکھے ہیں اور شکار کھیلنے آتے ہیں۔''
''صحیح سنا تم نے۔ اچھا یہ بتاؤ، تمہارا مشن کیسا رہا؟''
''کامیاب۔'' طیب خان مسکرایا۔
''ہاں تو رچی!''
''رچی نہ کہو۔'' رچی نے اسے ٹوک دیا۔ ''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''
''تو کیا کہوں، لارنس آف عریبیا؟''
''ہش......'' رچی نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ''شیخ عبدالعزیز...... کئی سال پہلے پاکستان آیا تھا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ مسقط میرا وطن ہے اور کوئی دو سال پہلے میں نے رہائش کے لئے ضلع رحیم یار خان کے اس شہر صادق آباد کو اپنے لئے پسند کیا۔''
رچی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ طیب بھی مسکرا دیا۔ ملازم ٹرے میں جوس کے گلاس رکھے اندر آیا۔ رچی نے جوس کا گلاس لیتے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا۔
''جیسے ہی چک والے مہمان آئیں، مجھے اطلاع دو۔''
لڑکا سر خم کرتا ہوا چلا گیا۔
''میرا خیال تھا کہ تم اس وقت آرام کرتے ہو۔ رات میں تفصیل سے بات ہوتی۔ لیکن تم کچھ بے چین نظر آ رہے ہو تو ذرا کچھ بتا دیتا ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔'' طیب خان نے جوس کا گھونٹ لیا۔
''تم لوگوں نے صادق آباد کو ہی اپنا ہیڈ کوارٹر کیوں بنایا؟ لاہور میں نہ سہی، آس پاس، اِدھر اُدھر کئی چھوٹے بڑے شہر تھے۔''
رچی مسکرایا۔
''یہ پانچ سال پہلے ہی طے ہو گیا تھا، جب ہم نے عارضی طور پر پاکستان چھوڑا تھا کہ ہم اب ضلع رحیم یار خان میں ٹھکانہ بنائیں گے۔ اور صرف صادق آباد میں ہی نہیں، رحیم یار خان اور ایک دو اور جگہوں پر بھی ہمارے ٹھکانے ہیں۔ رہی صادق آباد کی بات تو یہ دیکھو......''
اس نے چغے کی جیب سے ایک رول کیا ہوا چھوٹا سا نقشہ نکالا اور اسے سامنے موجود ٹیبل پر پھیلا دیا۔
''یہ دیکھ رہے ہو۔ یہ ضلع رحیم یار خان کا نقشہ ہے۔ اور یہ اس کی تحصیل صادق آباد ہے۔ یہ دیکھو! اس کے جنوب میں انڈیا کا بارڈر ہے اور یہ مغرب میں گھوٹکی ہے۔''
رچی بتا رہا تھا اور طیب خان معنی خیز انداز میں سر ہلا رہا تھا۔
''مان لیا شیخ عبدالعزیز! تمہارے بڑوں کی سوچ بہت دور تک ہے۔''

''ہوں۔'' رچی سیدھا ہوا اور جوس کا گلاس اٹھا کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔
''احمد رضا کیسا جا رہا ہے؟''
''حیرت انگیز۔ ونڈرفل۔ ایک سال میں اس نے بے شمار نوجوان طلباء اور طالبات کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ کھنچے چلے آ رہے ہیں اس کی طرف۔''
''پائپ پائپر۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔
''کمال ہے۔ میں نے پشاور سے لاہور تک اس ایک سال میں کئی چکر لگائے ہیں، لیکن میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔''
''اس بار کام کرنے کا طریقہ مختلف ہے۔ ہم سب الگ الگ ہیں۔ الوینا، نتاشا، جان سوات میں ہیں۔ ارباب حیدر ان کے ساتھ ہے اور......''
اس نے بات ادھوری چھوڑ کر گلاس میں بچا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اُتارا اور خالی گلاس میز پر رکھا۔
''میٹنگ میں کل شام تمہاری سب سے ملاقات ہو گی۔''
''اوہ......تو کیا سب کو بلایا ہے؟''
''ہوں۔'' رچی نے سر ہلایا۔ ''نیویارک سے باس بھی آ رہے ہیں۔''
''اچھا!''
تب ہی ملازم لڑکا اندر آیا۔ لڑکے کی عمر پندرہ، سولہ سال تھی۔
''سر! چک والے مہمان آ گئے ہیں۔''
''ٹھیک ہے، اُنہیں ادھر ہی لے آؤ اور چائے وغیرہ۔''
''یس سر! لا رہا ہوں۔''
کچھ دیر بعد دو جوان اندر داخل ہوئے۔
''مرحبا، مرحبا!'' رچی نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ طیب غور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
ایک کی عمر کوئی تیس سال کے قریب ہو گی اور دوسرا اس سے کچھ چھوٹا ہو گا، دو تین سال۔
''یہ عظمت یار ہیں۔ اور یہ اسفندیار۔'' رچی نے تعارف کروایا۔
''اور یہ ہمارے دوست ہیں طیب خان۔ افغانستان سے تعلق ہے ان کا۔ مجاہد ہیں، جہادِ افغانستان میں حصہ لیا، بہت نیک اور پرہیزگار ہیں اور اب پھر امریکہ نے چڑھائی کی تو تب بھی انہوں نے بھرپور حصہ لیا۔ اسامہ کے ساتھیوں میں سے تھے۔''
''آپ نے اسامہ کو دیکھا ہے؟ ملے ہیں؟ وہ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟'' نسبتاً کم عمر والے نے بڑے جوش سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔
''ملاقات تو نہیں ہوئی، البتہ دُور سے دیکھا تھا۔ اور زندہ ہیں یا مر چکے ہیں، علم نہیں۔''
طیب خان نے بھی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا اور دوسرے لڑکے سے مصافحہ کرنے لگا۔
''یہ دونوں بڑے محبِ وطن اور مخلص لڑکے ہیں۔ چک نمبر 151 سے تعلق ہے ان کا۔ یہ اپنے گاؤں کے لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان سے ان کی کچھ زمین خریدی ہے۔ بنجر تھی۔ وہاں ہم ایک ادارہ بنا رہے ہیں، جو دنیا کی خواتین کی مدد کرے گا۔ وہاں ہم ورکشاپ کروائیں گے، خواتین کو سلائی کڑھائی اور دوسری دستکاریاں سکھائی جائیں گی۔ اور اگر ان کے کوئی مسائل ہیں تو وہ بھی حل کئے جائیں گے۔ بغیر کسی سود کے گھریلو دستکاریوں کے لئے قرضے دیئے جائیں گے۔''

''اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔'' اسفندیار کی آنکھوں میں عقیدت اور ممنونیت تھی۔
''یہ دنیا تو عارضی ٹھکانہ ہے بھائی! ہم سب نے ایک دن چلے جانا ہے۔ یہ صدقہ جاریہ ہے۔ جس کا اجر صرف اس خدائے عظیم کے پاس ہے۔''
طیب نے دیکھا کہ تسبیح کلائی سے اُتر کر نہ جانے کب اس کے ہاتھوں میں آگئی تھی اور اب دانے مسلسل نیچے گر رہے تھے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔
''اس کارِ خیر میں ہمیں بھی اپنا حصہ شامل کرنے دیتے۔ ہم نے تو کہا تھا کہ زمین ہم یوں ہی اس ادارے کے لئے دے دیتے ہیں۔'' عظمت یار نے بھی عقیدت میں ڈوبی آواز میں کہا۔
''ارے نہیں میرے بھائی!'' رچی نے پاس بیٹھے عظمت یار کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''یہ کیا کم ہے جو آپ کر رہے ہیں اور عمارت کی تعمیر کی نگرانی بھی کر رہے ہیں۔ بہت مواقع ملیں گے، آپ کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کو۔ ابھی تو ہمیں کچھ کرنے دیں، ہم تو مسافر پنچھی ہیں۔ ہم چلے جائیں گے تو سب کچھ آپ کو ہی کرنا ہوگا۔''
''ارے نہیں شیخ صاحب! جانے کی بات مت کریں۔'' اسفندیار نے بے اختیار کہا تھا۔ ''آپ جیسے لوگ تو قوموں کا سرمایہ ہوتے ہیں۔''
''ابھی تو یہاں ہیں۔ جب حکم ہوا، تب ہی رختِ سفر باندھیں گے۔ ہم تو اس کی مرضی اور اشارے پر چلتے ہیں۔'' اس نے ہاتھ کی انگلی سے اوپر اشارہ کیا۔
لڑکا سامان سے بھری ٹرالی لئے اندر آیا اور پیش کرنے لگا۔ ٹرالی میں کیک، نگٹس، روسٹ، بٹیریں، کباب اور کئی طرح کے بسکٹ تھے۔
اسفندیار اور عظمت یار نے ایک ایک کباب اپنی پلیٹ میں رکھا۔
''تکلف بالکل نہیں چلے گا جناب!'' رچی نے خود ایک ایک بٹیر اُٹھا کر ان کی پلیٹ میں رکھا۔ ''میرا کک بہت بہترین بٹیر روسٹ کرتا ہے۔ میرے ملکی اور غیر ملکی مہمان فرمائشیں کر کے بناتے ہیں اور آج تو بطورِ خاص میں نے آپ کے لئے روسٹ کرنے کو کہے تھے۔''
دونوں کی آنکھوں میں تشکر نظر آیا اور وہ بے حد رغبت سے کھانے لگے۔ رچی کا فون ایک بار پھر بج اٹھا تھا۔ دوسری طرف شاید اس کے وہی مہمان تھے۔ کیونکہ وہ عربی میں بات کر رہا تھا۔ اسفندیار اور عظمت یار کھانا چھوڑ کر یوں مؤدب ہو کر بیٹھ گئے، جیسے رچی قرأت کر رہا ہو۔ طیب نے سر جھکا کر اپنی ہنسی چھپائی۔ بات ختم کر کے رچی ایک دم کھڑا ہو گیا۔
''دو منٹ پلیز۔ میں ابھی آیا۔ آپ لوگ کھائیں، پلیز...... طیب خان! میرے مہمانوں کا خیال رکھنا۔ یہ تکلف نہ کریں۔''
وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سٹنگ روم سے گزرتا ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا۔
''سوری سر!''
''یہ کیا حماقت تھی؟'' دوسری طرف سے کہا گیا۔
اب گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اور وہ فون پر موجود شخص کو اسفندیار اور عظمت یار کے متعلق بتانے لگا۔ اندر طیب خان انہیں دلچسپی سے کھاتے دیکھ رہا تھا۔
''یہ نگٹس لیں۔'' اس نے پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔
اسفند نے ایک نگٹس اٹھالیا اور پلیٹ میں کیچپ ڈالتے ہوئے طیب خان سے پوچھا۔
''آپ نے جب سے روسیوں کے خلاف جنگ کی اور اب جب نائن الیون کے بعد امریکیوں کے خلاف لڑے تو ذرا اس کا احوال بتائیے۔ مجھے بہت شوق تھا جہاد میں شرکت کرنے کا۔ میرا ایک دوست تھا، اس کا بھائی جہاد میں شرکت

کے لئے گیا۔ وہ شہید ہو گیا تھا تو ابا نے مجھے منع کر دیا تھا ورنہ......''

اور طیب خان نے دل ہی دل میں رچی کو سراہا۔ وہ ہمیشہ صحیح بندے ڈھونڈتا تھا۔

یہ دونوں لڑکے ان کے بہت کام آ سکتے تھے۔ رچی واپس آ گیا تھا۔ وہ معذرت کرتا ہوا بیٹھ گیا تھا۔ ملازم لڑکا چائے لے آیا تھا اور چائے سرو کر رہا تھا، جب رچی نے پوچھا۔

''آپ کو ڈرائیونگ آتی ہے؟''

''نہیں۔ گاڑی تو کبھی ڈرائیو نہیں کی۔'' عظمت نے جواب دیا۔ ''موٹر بائیک ہے ہمارے پاس۔ ابھی میں نے لی ہے سال بھر پہلے۔'' اس کے لہجے میں فخر تھا۔

''میرا جو بندہ ہے نا وہاں گاؤں میں، وہ سکھا دے گا آپ کو۔'' رچی نے اپنے چغے کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر عظمت کو دی۔

''یہ کیا ہے جناب؟''

''نئی زیرو میٹر گاڑی کی چابی ہے۔ میری طرف سے آپ کے لئے تحفہ ہے۔ آپ ہمارے لئے کام کریں گے تو آپ کو اِدھر اُدھر آنے جانے میں آسانی رہے گی۔''

''لیکن ہمیں کیا کام کرنا ہو گا جناب! ہمارا اپنا زمینوں کا کام بھی ہوتا ہے۔''

''آپ کا زمینوں کا کام متاثر نہیں ہو گا عظمت صاحب! جب بھی آپ فارغ ہوں گے، ادارے کا کام بھی دیکھ لیجئے گا۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ ہم آپ کو تنخواہ بھی دے دیں گے۔''

''نہیں، نہیں۔ تنخواہ کی کیا ضرورت ہے؟'' اسفند جلدی سے بولا تھا۔ جبکہ عظمت نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تو یہ چابی رکھ لیں محترم! اور گاڑی آپ کو وہاں چک میں ہی مل جائے گی، مع کاغذات کے۔''

''لیکن......'' عظمت نے پھر کچھ کہنا چاہا تو رچی نے اسے ٹوک دیا۔

''پلیز کچھ مت کہئے گا۔'' اور اس کا ہاتھ پکڑ کر چابی اس کے ہاتھ میں دے کر اس کی مٹھی بند کر دی۔ طیب نے دیکھا، دونوں بھائیوں کے چہرے چمک اُٹھے تھے۔

''عمارت کی تعمیر مکمل ہو جائے تو ہمیں کچھ پڑھی لکھی خواتین کی بھی ضرورت ہو گی جو وہاں کا انتظام وغیرہ دیکھیں۔ ایک، دو ٹیچر تو ہم ہائر کر لیں گے کسی بڑے شہر سے۔ لیکن کچھ مقامی لڑکیاں بھی ہوں تو......''

''جی، جی...... ہمارے گاؤں میں کافی لڑکیاں ہیں، جو میٹرک تک پڑھی ہوئی ہیں۔ کالج میں بھی پڑھ رکھا ہے کئی لڑکیوں نے۔'' اسفند نے جواب دیا۔

''تو پلیز آپ دیکھئے گا، تیار کیجئے گا۔''

''جی ضرور۔''

کچھ دیر بعد اسفند یار اور عظمت یار رخصت ہو گئے تو طیب نے پوچھا۔

''یہ کیا چکر ہے بھئی؟''

''یہ حکم ملا ہے اوپر سے، اس طرح کے خواتین کی فلاح و بہبود کے ادارے بنانے کا۔ ہم نے یہاں ''ویمن ایکشن فورم'' کے نام سے ایک این جی او بھی بنائی ہے، جو انسانی حقوق، حقوقِ نسواں، جینڈر بیلنس اور خواتین کے خلاف امتیازی قوانین کے خاتمے کے لئے کام کرے گی۔''

''گویا اس بار تم کثیر مقاصد کے ساتھ آئے ہو۔''

''کہہ سکتے ہو۔'' رچی مسکرایا۔ ''ویسے یہ سب نیا نہیں ہے۔ کافی پہلے سے ان پر کام ہو رہا ہے یہاں۔ خیر...... مجھے ابھی اپنے مہمانوں کی طرف جانا ہے۔ وہ چولستان کا کچھ حصہ دیکھنا چاہ رہے ہیں۔''

''چولستان میں کیا ہے؟'' طیب بھی کھڑا ہو گیا۔
''دیکھنے والوں کے لئے بہت کچھ۔ باذوق لوگوں کو تو مسحور کر دیتا ہے۔ تم چاہو تو آرام کرو۔ ملازم تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دے گا۔ کہیں گھومنا چاہو تو گاڑی اور ڈرائیور موجود ہے۔''
''ویسے رچی!...... سوری شیخ عبدالعزیز صاحب! آج جب تم ان لڑکوں سے بات کر رہے تھے تو مجھے اسمٰعیل خان یاد آ گیا۔ وہی انداز، وہی اسٹائل۔''
''آہا......'' رچی نے قہقہہ لگایا۔ ''کمزور ایمان کا آدمی تھا۔ جلدی ہمارے جھانسے میں آ گیا تھا۔ بلکہ اب تو سچ مچ ہی خود کو پیغمبر سمجھنے لگا تھا۔ خواب آنے لگے تھے، خواب میں وحی نازل ہونے لگی تھی اس پر۔'' دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے ہنسے۔
''مجھے تو ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے، جو پڑھے لکھے، سمجھ دار ہوتے ہیں۔ اور پھر ان جیسے لوگوں پر ایمان لے آتے ہیں، یقین کر لیتے ہیں۔ ان پڑھ اور کم علم لوگ اگر ان کے پیروکار ہوں تو ماننے والی بات ہے۔ لیکن اس جھوٹے نبی کے بھی تو ہزاروں پیروکار ہیں جو انگریزوں نے کھڑا کیا تھا۔ آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اور سوچنے سمجھنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ دراصل ان کے لئے ہدایت کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔''
''ہاں...... جیسے احمد رضا'' طیب خان نے احمد رضا کو یاد کیا۔ ''احمد رضا ان لوگوں میں سے تھا جو وقتی طور پر متاثر ہوتے ہیں لیکن جلد سنبھل جاتے ہیں۔ ویسے وہ شکوک کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ تو ہمارا جال اس کے گرد مضبوط تھا، ورنہ جلد یا بدیر وہ ہمارے پنجے سے نکل جاتا۔ ہمیں ایسے نوجوانوں کی بہت ضرورت تھی۔ اور ہمیں اس سے بہت کام لینا تھا اور لیا۔'' رچی نے کہا۔
''بے چارہ اسمٰعیل خان...... سنا ہے جیل میں چیخیں مار مار کر روتا تھا اور الوینا اور نتاشا اور دوسری لڑکیوں کو آوازیں دیتا تھا۔ شراب طہور کی طلب میں پاگل ہو کر قیدیوں سے لڑ پڑتا تھا اور ان سے کہتا تھا، وہ اس کا ادب کریں، جھک جائیں اس کے سامنے۔ کیونکہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہے۔ ایسے ہی ایک روز ایک سزائے موت کے قیدی نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اس روز اس نے (نعوذ باللہ) خود کو اللہ کا سچا اور آخری نبی کہا تھا۔ برا انجام ہوا اس کا۔'' طیب خان نے رچی کو بتایا۔
''ہاں! دو سال پہلے یہ ساری تفصیل باس نے وہاں نیویارک میں بتائی تھی۔''
''سوچتا ہوں رچی! کہیں ہمارا بھی انجام ایسا ہی نہ ہو۔'' طیب خان نے پتہ نہیں کیوں کہا۔ رچی نے بغور اسے دیکھا۔
''نہیں۔ ہمارا انجام ایسا نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ ہم اپنے وطن کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اپنے مذہب کے لئے جو سچا ہے۔ تم جو جگدیش ہو، پچھلے کئی سال سے طیب خان بنے ہوئے ہو اور میں......''
''لارنس آف عریبیا۔ جس کے بہت سے نام ہیں اور بہت سے چہرے۔''
طیب ہنسا تو رچی بھی ہنسنے لگا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے پورچ تک آ گئے تھے۔
''او کے...... پھر کل ملاقات ہو گی۔''
رچی نے ہاتھ ملایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ طیب خان وہیں کھڑا گاڑی کو گیٹ سے باہر جاتے اور پھر گیٹ بند ہوتے دیکھتا رہا۔ اور پھر واپس جانے کے بجائے وہیں لان میں بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں کیوں اسے احمد رضا کا خیال آ گیا تھا۔
اسے اس سے اپنی آخری ملاقات یاد آ رہی تھی۔ اس روز وہ بے حد مضطرب اور بے چین تھا۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اندر سے کوئی احساس اسے روکتا تھا اور خوف اسے رکنے سے منع کر رہا تھا۔ تب ہی تو اس نے طیب خان سے کہا تھا۔
''رچی مسلمان نہیں ہے، تم مسلمان ہو۔ مجھے لگتا ہے، یہ غلط کہہ رہا ہے، میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بھلا مجھے کیوں ماریں گے؟''

'بے چارہ نہیں جانتا تھا کہ میں بھی.....' طیب خان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
'یہ رچی بھی پورا شیطان ہے۔ جانے کہاں ہوگا اس وقت احمد رضا۔ ہے بھی یا نہیں۔'
رچی نے کبھی ان ڈیڑھ سالوں میں اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ احمد رضا کے متعلق سوچنے لگا۔

❁○❁

احمد رضا اس وقت دونوں ہاتھ پیچھے موڑے سر ہاتھوں پر رکھے لیٹا تھا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔
یہ فروری 2005ء تھا۔ اور وہ آٹھ جنوری 2000ء کی صبح تھی، جب اس نے ملک چھوڑا تھا۔ اس وقت جب وہ الوینا کے ساتھ چلتے ہوئے ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوا تھا تو اس نے سوچا تھا، اگر وہ یہاں سے بھاگ جائے، کہیں چھپ جائے، کسی چھوٹے سے گاؤں میں چلا جائے، وہاں کچھ عرصہ چھپا رہے۔ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا، ڈاکہ نہیں ڈالا۔ بس اسمٰعیل کذاب کو سمجھنے کی غلطی ہوئی تھی اس سے۔ اس نے اسے سچ مچ ایک پرہیزگار اور نیک آدمی سمجھا تھا۔ وہ عدالت میں جا کر اعتراف کرلے گا کہ اس سے اس شخص کو سمجھنے میں غلطی ہوئی، اسے معاف کر دیا جائے۔ لیکن نہیں۔
وہ چونکا تھا۔
'رچی نے بتایا تھا، وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں بھی ملوث تھا۔ اور اگر عدالت نے مجھے اس کا ساتھی سمجھ لیا تو ملک سے غداری کرنے والوں کا انجام.....'
اُس نے جھرجھری سی لی اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی الوینا نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
''کیا ہوا احمد رضا؟''
''کچھ نہیں۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے الوینا کی طرف دیکھا تھا اور پھر اس کی نظریں ان پولیس والوں پر پڑی تھیں، جو ایئرپورٹ کی عمارت میں کھوجتی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔ غیر ارادی طور پر الوینا کے ہاتھ پر اس کی گرفت سخت ہوگئی تھی۔
''ساری زندگی جیل کی کوٹھڑی میں سڑتے رہو گے احمد رضا!'' رچی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔ ''جیل کے اندر کی زندگی بہت اذیت ناک ہوتی ہے احمد رضا!''
رچی کی آواز مسلسل اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ اگر وہ اسے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ الوینا کی اوٹ میں چلتا ہوا خود کو ان پولیس والوں کی نظروں سے بچانے کی کوشش کرتا ہوا اب ایک لگژری زندگی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ فی الحال وہ یو کے جا رہے تھے اور پھر جلد ہی انہوں نے امریکہ چلے جانا تھا۔ رچی نے یہی کہا تھا۔ اور ابو کہتے تھے، وہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر اپنے خرچ پر بھیجنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا اسے خود محنت کرنا ہوگی، تاکہ اسے اسکالرشپ مل سکے۔ اور اب.....اب وہ وہاں جا کر اپنی پڑھائی شروع کر سکتا تھا۔
ابو نے جب اس کا سامان پیک کیا تھا تو اس کے تمام تعلیمی کاغذات بھی رکھ دیئے تھے۔ وہ پڑھے گا، ابو کا خواب پورا کرے گا اور پھر کچھ عرصہ بعد سمیرا اور امی ابو کو بھی وہیں پر اپنے پاس بلا لے گا۔ تب تک ابو کا غصہ بھی ختم ہو جائے گا۔
وہ جانتا تھا کہ ابو اس سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ وہ زیادہ دن اس سے ناراض نہیں رہ سکتے۔ اصل بات یہ تھی کہ ان کے مذہبی جذبات پر ضرب پڑی تھی۔ وہ اسے مرتد سمجھ رہے تھے اور حالات نے اسے اس طرح اپنے شکنجے میں جکڑا تھا کہ اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔
رچی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد اس کی فیملی کے متعلق پتہ کروا لے گا۔ امریکہ، انگلینڈ اور دوسرے یورپی ممالک میں جانے کی اسے ہمیشہ خواہش رہی تھی۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ جب کبھی موقع ملا تو وہ ضرور باہر جائے گا۔ اور ہو

سکا تو وہیں سیٹل ہو جائے گا۔ اور اب خود بخود قسمت سے موقع مل گیا تھا تو......اس نے قدرے مطمئن ہو کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ وہ پولیس والے، لوگوں کے ہجوم میں کہیں چھپ گئے تھے۔

اس نے الوینا کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور اب بڑے اعتماد سے چل رہا تھا۔ آگے ایک خوب صورت زندگی اس کی منتظر تھی۔ اس زندگی میں کیا کچھ ہونے والا تھا۔ اس وقت وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بہت سارے خواب تھے۔ ایک اچھی، خوب صورت اور لگژری زندگی کے خواب۔

وہ لاہور سے لندن تک ایسے ہی خواب دیکھتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ طیارہ ہیتھرو ایئرپورٹ پر اُتر گیا۔ انہیں لینے کے لئے جنیفر آئی تھی۔ اور اگلے ایک سال تک وہ اس کی میزبان رہی تھی۔ الوینا سے زیادہ مہربان۔

رائل ہوٹل کے سامنے بنے عربوں کے فلیٹوں میں سے ایک فلیٹ میں اس نے ایک سال کا عرصہ گزارا تھا۔ جنیفر نے اسے بتایا تھا کہ یہ سارے فلیٹس عربوں نے خرید رکھے ہیں۔

ایک سال اس نے لندن میں گزارا تھا۔ دریائے ٹیمز، اس کے کنارے پر ایستادہ دو بڑے ستون اور بڑے بڑے مجسمے، نیچی نیچی سی، کائی زدہ عمارتوں کے باہر جرنیم اور ڈیفوڈل کے پھول۔

ہائیڈ پارک کا کونا۔

آکسفورڈ اسٹریٹ کو مڑنے والی سڑک۔

لندن آئی، مادام تساؤ۔ سرپنٹائن لیک۔

اور جھیل کے صاف شفاف پانی میں تیرتی بطخیں۔ برمنگھم کا واٹر مال۔

ماربل آرچ کے کونے والا اٹاپ۔

نیلسن کا سیاہ فام مجسمہ۔

ٹیوب کی گرم گرم فضا۔

مہنگے بوتیک۔ آلرز کورٹ کا بازار۔

لندن کے سب سے مہنگے اسٹور ہیرالڈ میں شاپنگ۔

ایک سال میں ہی وہ ان سب سے اوب گیا تھا۔ اسے لاہور یاد آتا تھا۔ لاہور کی رونقیں اسے تڑپاتیں۔ وہ اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ اس ایک سال میں اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس ایک سال میں رچی سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ الوینا بھی صرف دو، تین بار ملی تھی۔

وہ اکثر اپنے فلیٹ میں خاموش لیٹے غور کرتا تھا کہ ایسا کیا تھا اسمٰعیل خان میں کہ وہ اس کی طرف کھنچتا چلا گیا؟ چند خوب صورت لڑکیاں...... یہ ان کی کشش تھی یا پھر اس کی مذہب سے لاعلمی۔ وہ مذہب کے متعلق اتنا نہیں جانتا تھا، جتنا اسے جاننا چاہئے تھا۔

یا پھر اسمٰعیل خان کا اندازِ گفتگو۔

شروع شروع میں جب وہ اس کی محفلوں میں جاتا تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق و محبت کی باتیں کرتا اور انہیں درود شریف پڑھنے کی تلقین کرتا تھا۔ پھر......نہیں، شاید کہیں کچھ غلط ہے۔ کسی نے اسمٰعیل خان کے متعلق غلط افواہ پھیلا دی تھی۔

اس کا یقین پھر متزلزل ہو جاتا۔ وہ شکوک کا شکار ہو جاتا۔ آخر لوگ کیوں اس کے دیوانے ہو رہے تھے؟ وہ گوالمنڈی کا تاجر اسحاق کشمیری، جس نے اپنی دکانیں فروخت کر کے سارا پیسہ اسمٰعیل کو دے دیا تھا۔ اور وہ کتنا بڑا عقیدت مند تھا اس کا۔

پورا ایک سال اس نے وہاں گزار دیا تھا۔ رچی اور الوینا کا کوئی مفاد وابستہ نہیں تھا اس سے۔ اس ایک سال میں

اسے یقین ہو گیا تھا، وہ یقیناً اس کے ساتھ مخلص ہے۔
رچی جو مسلمان ہو گیا تھا، جس نے اسمٰعیل خان کے سامنے اسلام قبول کیا تھا اور جس کے متعلق وہ کبھی کبھی شکوک کا شکار ہو جاتا تھا، وہ ایک اچھا آدمی ہے۔
یہ اس کی رائے تھی۔ اس نے بغیر کسی غرض کے اسے جیل میں جانے سے بچایا تھا۔ اس ایک سال میں وہ پرُتعیش زندگی گزارنے کا عادی ہو چکا تھا اور سہل پسند بھی ہو گیا تھا۔ بغیر کسی محنت کے اس کے پاس سب کچھ تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں لاکھوں پونڈز جمع تھے اور یہ سب رچی نے جمع کروائے تھے۔
جنیفر ہمہ وقت اس کی دلجوئی کے لئے اس کے ساتھ تھی۔ اس کے فلیٹ کے پارکنگ ایریا میں اس کی شاندار گاڑی تھی۔ کیا زندگی میں انسان کسی اور چیز کی بھی خواہش کر سکتا ہے؟ کئی بار اس نے سوچا تھا۔ شاید نہیں۔ اور جواب بھی خود ہی دے دیتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اس کا دل گھبرا جاتا تھا۔ اسے لاہور یاد آتا۔ اسے سمن آباد والا اپنا گھر یاد آتا۔ اسے ابو، امی اور سمیرا یاد آتے۔
اور ایک سال بعد جب وہ یہاں کی ہر چیز سے تنگ آ گیا تو اس نے جنیفر سے کہا تھا۔ وہ پاکستان جانا چاہتا ہے۔ وہ اب یہاں مزید نہیں ٹھہرنے گا۔ گھومنا پھرنا، کھانا پینا اور سو جانا۔ وہ اس طرح کی بے مقصد زندگی کا عادی نہیں ہے۔ اس طرح کی زندگی آدمی کو بہت جلد تھکا دیتی ہے۔ وہ بھی تھکنے لگا ہے۔
اس نے جنیفر سے کہا تھا کہ وہ کل اس کے ساتھ چلے، وہ پاکستان کے لئے ٹکٹ خریدنا چاہتا ہے۔ اور اسی رات رچی آ گیا تھا۔
رچی نے اسے بتایا تھا کہ اسمٰعیل خان کے خلاف پاکستان کی عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ اس نے ایک اخبار اسے دکھایا تھا۔ اخبار میں لکھا تھا۔
''اسمٰعیل کذاب جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا، اس کے خلاف ختم نبوت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کمیٹی کی طرف سے کیس رجسٹرڈ کیا گیا تھا۔ اسمٰعیل کذاب تو جیل میں ہے لیکن اس کا خلیفہ، احمد رضا غائب ہے۔ جبکہ اس کا مقرب خاص، ارباب حیدر بھی ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ عدالت نے دونوں افراد کو جلد از جلد پیش کرنے کا حکم دیا ہے۔''
رچی نے ایک اور اخبار دکھایا تھا۔
''اسمٰعیل کذاب نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ اللہ کا نبی (نعوذ باللہ) ہے۔ اور جس رات اسے نبوت عطا ہوئی تھی، احمد رضا اس کے پاس تھا اور وہ اس کا گواہ ہے اور اس کا صحابی ہے۔ اور ''ورلڈ اسمبلی'' کے ہر اجلاس میں وہ اس کے ساتھ شریک رہا ہے۔''
احمد رضا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اخبار دیکھ رہا تھا۔
''نہیں۔'' اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ ''یہ جھوٹ ہے۔ میں ورلڈ اسمبلی کے ایک دو اجلاسوں میں شریک تھا لیکن نبوت....''
رچی نے اخبار لپیٹ کر رکھ دیئے۔
''میں جانتا ہوں احمد رضا! لیکن میں نے تمہیں یہ اس لئے دکھایا ہے کہ جنیفر نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ تم پاکستان جا رہے ہو۔ اتنی جلدی مت کرو میرے دوست! کیس کا فیصلہ ہونے دو، پھر بہت شوق سے چلے جانا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے احمد رضا! میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی جوانی جیل میں ضائع کر دو۔ تم پاکستانیوں کو جانتے ہو نا، کتنے سر پھرے ہیں۔ کسی طرح جیل جانے سے بچ گئے تو مارے جاؤ گے۔''
اور احمد رضا کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
''تو......؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''تو کچھ نہیں میری جان! جب وقت آئے گا تو میں تمہیں خود بھجوا دوں گا۔''
''اور میری فیملی کے متعلق کچھ پتہ چلا؟''
''ہاں پتہ چلا تھا کہ وہ فیصل آباد میں ہیں۔ لیکن جب میرا بندہ وہاں گیا تو وہ وہاں سے جا چکے تھے۔ خیر، پتہ چل جائے گا۔''
ایک سال کے اندر کچھ نہیں پتہ چلا تھا تو......'' اس کے اندر مایوسی پھیل گئی تھی۔
''تم جانتے ہو، میں یہاں کیوں آیا ہوں؟''
اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔
''ہم ایک ہفتے تک امریکہ جا رہے ہیں۔ تم اپنی تیاری کر لو۔''
اور یوں وہ امریکہ چلا گیا تھا۔ امریکہ میں اسے الوینا ملی تھی۔ لیکن یہاں جو اپارٹمنٹ اسے ملا تھا، اس میں وہ اکیلا رہ رہا تھا۔ اب رچی سے اس کی اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ رچی کے علاوہ بھی کئی لوگوں سے وہ ملا تھا۔
رچی کے کہنے پر اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ رچی نے اسے ملازمت بھی دلوا دی تھی۔ آئی سی جی ''انٹرنیشنل کرائسز گروپ'' یہ ایک بین الاقوامی ادارہ تھا۔
بظاہر یہ ساری دنیا میں مسائل حل کرتے تھے اور لڑائیاں ختم کرواتے تھے لیکن درحقیقت ان کا مقصد اسلامی ملکوں میں اسلام ختم کرنے کی کوشش کرنا تھا۔ لیکن احمد رضا ان کے اندرونی مقاصد کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے رچی سے کہا تھا، وہ پڑھنا اور جاب کرنا چاہتا ہے۔ اس نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔
رچی نے کہا تھا۔ جیسے ہی کسی یونیورسٹی یا کالج میں ایڈمیشن اوپن ہوتے ہیں، تم ایڈمیشن لے لینا۔ تمہیں نئے سرے سے سب پڑھنا پڑے گا۔ یہاں پہلے گریجویشن کرنا پڑے گا تمہیں۔''
اور پھر رچی اسے اس شاندار آفس میں لایا تھا۔ اسے کمپیوٹر کا کچھ کام دیا گیا تھا۔ مختلف رپورٹس کے پرنٹ نکالنا، کچھ ملز چیک کرنا وغیرہ۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ان کے مقاصد میں سب سے اہم کام مسلمانوں میں انتشار پھیلانا ہے۔ اسلامی فرقوں اور مسلکوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنا، قرآن و حدیث میں ترمیم وغیرہ کرنا شامل ہے۔
وہ نہیں جانتا تھا کہ جو احادیث کی کتابیں اور قرآن کے تراجم اس کی نظر سے گزر رہے تھے، وہ ترمیم شدہ تھے۔ اور یہ سب کتابیں اسلامی ممالک میں پھیلائی جا رہی تھیں۔ اسے اپنے دینی علم کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ اس لئے وہ ان آسانی سے دستیاب ہونے والی کتب کو بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ وہ اصل احادیث کے متعلق نہیں جانتا تھا، سو وہ انہیں اصل احادیث سمجھ کر پڑھتا تھا۔
جب نائن الیون کا واقعہ ہوا تو وہ نیویارک میں تھا۔ یہ بڑے مشکل دن تھے۔ رچی اسے ایک ایسی جگہ لے گیا تھا، جہاں رہنا اسے عذاب لگتا تھا۔ وہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے پُر آسائش زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن یہ جگہ، جہاں رچی اسے لے کر آیا تھا، ایک تنگ و تاریک کمرہ تھا۔ لکڑی کی خستہ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اس کمرے میں آئے تھے۔ اندر سیلن اور پرانی بُو تھی۔ ایک بیڈ تھا، جس کے گدّے کے اسپرنگ چبھتے تھے۔ کمرے کے ساتھ ہی چھوٹا سا کچن تھا۔ گندا سا باتھ روم اور نیچے گلی میں ہر وقت شراب پی کر ہنگامہ کرتے اور گالیاں دیتے کالے مرد اور عورتیں۔
رچی نے کہا تھا۔ ''لوگ بہت غصے میں ہیں۔ ہوسکتا ہے مسلمان سمجھ کر وہ تمہیں نقصان پہنچا دیں۔ جہاں تم رہتے تھے، وہاں کچھ متعصب نوجوان تھے۔''
رچی نے ایک بار پھر اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے نیچے اسٹریٹ میں ایک لڑکے کے پوچھنے پر اپنا نام ڈیوڈ بتایا تھا۔ اس نے جو دس دن یہاں گزارے تھے، وہ بہت اذیت ناک تھے۔ جب بھی وہ اپنے کمرے سے نکل کر نیچے بیکری تک جاتا تو اسٹیٹ میں موجود لڑکے اس پر آوازیں کستے اور ہنستے۔

ایک بار تو ایک لڑکا اس کا سامان چھین کر بھاگ گیا تھا۔
ایک بار نشے میں دھت ایک موٹی سیاہ فام عورت اسے کھینچنے لگی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اردگرد کھڑے سب ہنسنے لگے۔
ٹھیک دس دن بعد وہ رچی کو فون کر رہا تھا۔ اور اس کے بعد اس نے خود کو مکمل طور پر رچی کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے وہی کیا جو رچی نے اور دوسروں نے کہا۔
''سر! آپ کی فلائٹ ہے دو گھنٹے بعد۔'' سانولے رنگ کی دبلی پتلی سی لڑکی ثمینہ حیدر اس کی سیکرٹری ہی نہیں، اس کے گھر کے تمام امور کی بھی نگرانی کرتی تھی۔
اس نے چونک کر اسے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔
''ٹھیک ہے۔ تم نے کنفرم کر لیا ہے کہ فلائٹ لیٹ تو نہیں ہے؟''
''جی سر!''
''او کے۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔ تم نے ڈرائیور کو بتا دیا ہے کہ ایئرپورٹ جانا ہے؟''
''جی سر۔''
ثمینہ حیدر چلی گئی تو وہ اٹھا۔
'سب کچھ ہے میرے پاس۔ عزت، دولت، شہرت۔ وہ سب جو میں نے چاہا تھا۔ پھر بھی پتہ نہیں کیوں، اُداسی پَر پھیلائے بیٹھی رہتی ہے۔ اندر کا موسم ہمیشہ کہر آلود ہی رہتا ہے۔'
''تم ناشکرے ہو احمد رضا!'' رچی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ ''تمہارے اللہ نے تمہیں اتنا نوازا ہے۔ کیا تم نے کبھی تصور بھی کیا تھا کہ تمہارے پاس بی ایم ڈبلیو ہوگی۔ ڈیفنس میں تمہارے پاس چار کنال کا گھر ہوگا۔ لندن اور نیویارک میں تمہارا ذاتی اپارٹمنٹ ہوگا؟''
''ہاں......'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں نے اس سب کا تصور نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ سب مجھے کیا کچھ کھو کر ملا ہے۔ جو کھو گیا ہے، وہ کھونے کا کرب مجھے پورے طور پر خوش نہیں ہونے دیتا رچی! تم کیا جانو۔''
وہ وارڈروب کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا وارڈروب برانڈڈ کپڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ یو۔ ای۔ ٹی میں لڑکے ریبوک، لیویز اور مارک اینڈ سپنسر کی باتیں کرتے تھے تو وہ حیران ہوتا تھا۔ آج اُس کے وارڈروب میں تمام مشہور برانڈز کے کپڑے تھے۔ Perri Garden ،Gucci ،Burberry ،Ralph ،Lauren...... ہر برانڈ کے ڈریسز وارڈروب میں مشہور تھے۔ جوتے، والٹ، گلاسز اور پرفیومز سب مشہور اور مہنگے برانڈز کے تھے۔
اس نے وارڈروب کھولا۔ اس کے کپڑے تیار تھے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی وہ ایسے برانڈڈ کپڑے پہن سکے گا۔ اُس نے ایک سیاہ شرٹ نکالی۔ فوراً اُس کے کانوں میں زبیدہ کی آواز آئی۔
''رضی! تم یہ سیاہ رنگ مت پہنا کرو۔ بہت کھلتا ہے تم پر۔ نظر لگ جائے گی۔''
اور پھر سمیرا کی ہنسی۔
''او ہو امی! کالا رنگ تو بذاتِ خود نظر بھن (نظر توڑنے والا) ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کبھی، جب لوگ نیا گھر بناتے ہیں تو اکثر گھروں پر کالی پٹی بندھی ہوتی ہے۔ اور اکثر رکشوں، ٹرکوں اور بسوں پر بھی ایک کالی دھجی لٹک رہی ہوتی ہے تا کہ نظر نہ لگے۔
سمو کی بچی! تم نے میرا دل ہی برا کر دیا۔ سنبھالو یہ کالی شرٹ اور کوئی دوسری استری کر دو۔''
لمحہ بھر وہ یونہی شرٹ ہاتھ میں پکڑے کھڑا رہا اور پھر اس نے شرٹ واپس لٹکا دی۔
'پتہ نہیں، امی اور ابو مجھے یاد کرتے ہوں گے یا نہیں۔ ایسے، جیسے میں یاد کرتا ہوں۔ امی تو مجھے ہر لمحہ یاد کرتی ہوں گی۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ ابو تو اسے کسی بات پر ٹوک بھی دیا کرتے تھے۔ لیکن امی نہیں۔ وہ اس کی ہر ضد، ہر خواہش پوری کرتی تھیں۔

فون کی بیل ہو رہی تھی۔ اس نے مڑ کر اپنے بیڈ پر پڑے فون کو دیکھا اور اٹھا لیا۔ دوسری طرف کسی نے اس کا پروگرام پوچھا تھا۔

''بس میں ایئرپورٹ کے لئے ہی نکلنے لگا ہوں۔''

فون بند کر کے اس نے پھر بیڈ پر رکھ دیا۔

'پتہ نہیں اس وقت امی، ابو، ثمیرا کہاں ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے۔' اس نے سوچا اور وارڈروب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

❁○❁

زبیدہ بہت دیر سے ٹی وی لاؤنج میں اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ ٹی وی پر کیا ہو رہا تھا، انہیں خبر نہیں تھی۔ بس وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔

حسن رضا کچھ دیر پہلے ہی اسٹور بند کر کے آئے تھے اور اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت بہت تھکے ہوئے تھے۔ زبیدہ انہیں چائے دے کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئی تھیں۔ جب سے ثمیرا لاہور گئی تھی، زبیدہ فارغ ہو کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی تھیں۔ انہیں ٹی وی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر اس سے انہیں دوسراہٹ کا احساس ہوتا تھا، جیسے وہ اکیلی نہیں ہیں۔

حسن رضا نے زندگی بھر جاب کی ہے، آفس میں ٹیبل کے پیچھے بیٹھ کر فائلیں دیکھنا اور لکھنے پڑھنے کا کام کرنا اور سارا دن اسٹور میں گاہکوں سے سر کھپانا بہت مختلف تھا۔ لیکن زندگی گزارنے کے لئے کچھ کرنا ضروری تھا۔ اس عمر میں جاب ملنا آسان نہ تھا۔ سو انہوں نے اپنے لئے اسٹور کھولنا مناسب سمجھا تھا۔ ان چند سالوں میں آس پاس کے کئی افراد سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ سب ان کی عزت کرتے تھے۔ پانچوں وقت مسجد میں نماز پڑھنا، ماتھے پر سجدوں کا نشان، خاموش طبع، سب کے دکھ سکھ میں شریک حسن رضا محلے والوں کے لئے ایک معتبر اور پرہیز گار شخص تھے۔

وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر نفل پڑھتے اور احمد رضا کے لئے دعا کرتے۔

''یا اللہ! وہ جہاں کہیں بھی ہے، اسے سیدھا راستہ دکھا۔''

زبیدہ، ثمیرا کے جانے کے بعد اور بھی خاموش ہو گئی تھیں۔ ان کے اور حسن رضا کے درمیان بہت کم بات چیت ہوتی تھی۔ بس ضروری باتیں۔

لگتا تھا جیسے ان کے پاس بات کرنے کے لئے کوئی موضوع رہا ہی نہیں ہے۔ اس وقت بھی وہ ٹی وی لاؤنج میں تھیں اور حسن رضا اپنے کمرے میں لیٹے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اخبار کا ایک ٹکڑا تھا، جسے وہ دیکھ رہے تھے۔ کبھی وہ اسے آنکھوں کے قریب کرتے، کبھی ذرا دور کر کے پڑھتے۔ جیسے دور یا نزدیک کرنے سے تحریر بدل جائے گی۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔

اخبار کا ٹکڑا والٹ میں رکھتے رکھتے وہ پھر اسے پڑھنے لگے تھے جب دروازہ زور سے کھلا۔ انہوں نے فوراً اخبار کا ٹکڑا مٹھی میں بند کر لیا اور آہستہ سے ہاتھ پیچھے کر کے اسے تکیے کے نیچے رکھا اور دروازے میں کھڑی زبیدہ کی طرف دیکھا ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

''کیا ہوا زبیدہ! کیا بات ہے؟'' وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔

''وہ...... وہ احمد رضا...... وہ احمد ہے...... اپنا رضی...... ادھر ٹی وی پر بول رہا ہے۔ بس اس نے داڑھی رکھ لی ہے۔ اس کی آنکھیں، اس کے بال......''

''وہ...... لیکن وہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو......'' انہوں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر پیچھے تکیے کی طرف دیکھا۔ ''نہیں وہ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں وہم ہوا ہے۔ وہ تو کہیں کسی اور ملک میں چلا گیا تھا۔'' انہوں نے پورے یقین سے کہا۔

"آپ آئیں تو...... دیکھیں تو۔"

وہ واپس مڑ گئیں۔حسن رضا بھی اُٹھ کر ان کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں آ گئے تھے۔ٹی وی چل رہا تھا۔ٹی وی پہ اشتہار آ رہے تھے۔

وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئے۔یہ ایک نیا چینل تھا۔اس وقت پاکستان میں کتنے چینل کام کر رہے تھے، وہ نہیں جانتے تھے۔انہوں نے کبھی ٹی وی نہیں دیکھا تھا۔جب سے احمد رضا جدا ہوا تھا، انہوں نے خبریں دیکھنی بھی چھوڑ دی تھیں۔

"اس چینل پر ایک پروگرام شروع ہوا ہے "کڑوا سچ" وہ اس پروگرام کا اینکر ہے۔احمد حسن نام ہے اس کا۔" زبیدہ انہیں بتا رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد اشتہار ختم ہو گئے تھے۔اب احمد حسن نظر آ رہا تھا۔وہ ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگے۔زبیدہ صحیح کہہ رہی تھیں۔وہ ان کے احمد رضا سے بہت ملتا جلتا تھا۔ویسے ہی براؤن بال، ویسی ہی آنکھیں، وہی پیشانی، وہی اونچی اُٹھی ہوئی ناک۔لیکن یہ احمد رضا نہیں ہو سکتا تھا۔لیکن جو کوئی بھی تھا، بہت سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔داڑھی نے جیسے اس کی وجاہت میں اضافہ کر دیا تھا۔پھر اس کے بولنے کا انداز۔دھیما اور ٹھہر ٹھہر کر بولنا بہت متاثر کن تھا۔صرف ایک بولنے کا انداز اُسے احمد رضا سے جدا کرتا تھا۔بولنے کا انداز بھی اس جیسا ہوتا، پھر ہی وہ پورے یقین سے کہہ سکتے تھے کہ وہ احمد رضا ہی ہے۔وہ کہہ رہا تھا۔

"ہمارے حکمرانوں نے ہمیں امریکہ کے ہاتھوں میں بیچ دیا ہے۔اس پاکستان کو جسے لاکھوں لوگوں نے جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا، اسے امریکہ کے پاس گروی رکھ دیا ہے۔امریکہ ہمارے ملک میں گھس آیا ہے۔یہ پاکستان، پاکستان نہیں رہا۔را، موساد اور سی آئی اے کے ایجنٹوں کا گڑھ بن چکا ہے۔ہمیں اپنی شناخت، اپنا تشخص ایک مسلمان......"

وہ بہت دھیان سے سن رہے تھے جب زبیدہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ...... یہ احمد رضا ہی ہے نا؟...... ہمارا رضی...... آپ فون کریں ابھی اس چینل پر...... اس کا نمبر لیں۔بات کریں اس سے۔" زبیدہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بہت جوش سے بول رہی تھیں۔

"زبیدہ!" انہوں نے آہستگی سے ان کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں لیا اور نرمی سے بولے۔ "زبیدہ! تمہیں وہم ہوا ہے۔یہ ہمارے رضی جیسا ہے لیکن ہمارا رضی نہیں ہے۔تمہیں پتہ ہے، اس دنیا میں سات بندے ایک ہی جیسی شکل کے ہوتے ہیں۔"

"نہیں! آپ غلط کہہ رہے ہیں۔یہ محض لوگوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔کوئی کسی سے نہیں ملتا۔میرا دل کہہ رہا ہے، یہ رضی ہے۔ہمارا رضی۔"

"زبیدہ!" وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچلنے لگے۔وہ سچ، جو وہ ڈیڑھ سال سے چھپائے ہوئے تھے، وہ کیسے زبیدہ سے کہہ دیتے۔انہیں اپنے دل پر بہت بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔انہیں لگ رہا تھا وہ زیادہ عرصہ تک یہ بوجھ نہیں اُٹھا سکیں گے۔تقریباً ڈیڑھ سال پہلے...... یہ ستمبر 2003ء تھا اور رضی کو ان سے جدا ہوئے تقریباً تین سال ہو گئے تھے۔وہ سمیرا کو لاہور ہاسٹل میں چھوڑ کر واپس آ رہے تھے۔سمیرا، کے۔ای میں پڑھ رہی تھی۔اس نے شاندار نمبروں میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا اور اب کے۔ای میں تھی۔انہوں نے تین سال سے اخبار نہیں پڑھا تھا۔لیکن اس روز کوچ میں ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے شخص نے اخبار پڑھ کر ان کی طرف بڑھایا تھا۔

"لیجئے صاحب! اخبار پڑھیں گے؟"

غیر ارادی طور پر انہوں نے اخبار پکڑ لیا تھا۔سب سے پہلے ان کی نظر جس خبر پر پڑی تھی، اس نے اُنہیں اندر تک ہلا

دیا تھا۔
انہوں نے اخبار میں موجود اس چھوٹی سی خبر کو دو تین بار پڑھا۔
''اسمٰعیل کذاب کا خلیفہ اور مقرب خاص، احمد رضا نام کا لڑکا کل صبح نیویارک میں ایئرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا۔ اس نے موقع پر ہی جان دے دی۔ جبکہ اسمٰعیل کذاب کو چند ماہ پہلے ایک قیدی نے جہنم واصل کر دیا تھا۔ خس کم جہاں پاک...... اس کی ڈیڈ باڈی کو وہاں موجود ایک اسلامی تنظیم کے حوالے کر دیا گیا جو لاوارث مسلمانوں کے کفن دفن کا انتظام کرتی ہے۔''
''نہیں......'' ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
انہوں نے اپنی چیخیں روکنے کے لئے اپنے دانت سختی سے بھینچ لئے اور اپنے ہونٹوں کو اتنے زور سے دانتوں تلے دبایا کہ ان سے خون چھلکنے لگا۔
'اتنی سی زندگی لے کر آئے تھے تم احمد رضا! اور اتنی سی زندگی میں تم نے کیا، کیا...... ہائے افسوس۔''
وہ اخبار پر نظریں جمائے بیٹھے تھے اور انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ ساتھ والا مسافر کب، کس جگہ پر اُتر گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ سے صبر کی دعا مانگ رہے تھے۔
''یا اللہ! مجھے صبر دے...... یا اللہ! مجھے ہمت عطا کر۔''
ایک دم انہوں نے خوف زدہ ہو کر اخبار بیگ میں ٹھونس دیا۔ یہ اخبار نہیں تھا، کوئی تیز دھار خنجر تھا، جو اندر اُتر گیا تھا۔ باقی سفر کیسے کٹا تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔ ان کے اندر آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ چیخیں تھیں۔ سسکیاں تھیں۔ اور وہ ضبط کئے بیٹھے تھے۔
وہ بیگ ہاتھ میں اٹھائے جب گھر میں داخل ہوئے تھے تو زبیدہ لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ وہ خاموشی سے آ کر زبیدہ کے پاس بیٹھ گئے۔ زبیدہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔
''کوئی خبر، کوئی اطلاع؟''
انہوں نے بے اختیار نفی میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے زبان سے کبھی کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن آج وہ پوچھ رہی تھیں۔
''آپ نے احمد رضا کا پتہ کیا کسی سے؟...... اس کے کسی دوست سے ملے؟...... کیا خبر وہ لوٹ آیا ہو۔ سلیم صاحب کے پاس گئے تھے آپ؟''
'کیا ماں کے دل کو خبر ہو گئی ہے؟' انہوں نے زبیدہ کی طرف دیکھا۔
کیا وہ اسے بتا دیں کہ اب وہ ان سے سوال نہ کرے۔ احمد رضا اب کبھی نہیں آئے گا۔ وہ وہاں چلا گیا ہے، جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ انہوں نے ان کی طرف دیکھا۔ زبیدہ کی آنکھوں میں ایک دم جیسے چمک سی آ گئی تھی۔
''میں نے کل رات خواب میں اسے دیکھا تھا۔ وہ سمیرا کے ساتھ کھڑا ہنس رہا تھا...... یہ اچھا خواب ہے نا حسن صاحب!...... شاید وہ وہاں کہیں اِدھر اُدھر آتے جاتے سمیرا کو نظر آ جائے۔''
انہوں نے یکدم جھک کر بیگ اٹھایا تھا اور تیزی سے لاؤنج سے نکل گئے تھے۔ وہ اُن کی اُمید ختم نہیں کر سکتے تھے۔ احمد رضا کے لوٹ آنے کی آس ہی زبیدہ کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اگر امید ختم ہو گئی، یہ آس ٹوٹ گئی تو...... اُنہیں لگا تھا، اگر وہ کچھ دیر اور وہاں رکے تو وہ ضبط نہیں کر سکیں گے۔ کمرے میں آتے ہی انہوں نے بیگ کو بیڈ کے نیچے چھپا دیا تھا اور پھر بیڈ پر بیٹھتے ہی ان کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے تھے۔ وہ رو رہے تھے۔ چیخ چیخ کر، دھاڑیں مار مار کر۔ زبیدہ ان کے رونے کی آواز سن کر بھاگتے ہوئے اندر آئی تھی۔
''کیا ہوا...... کیا ہوا حسن صاحب! آپ اس طرح کیوں رو رہے ہیں؟''
وہ خود پر قابو نہیں پا رہے تھے۔ زبیدہ ہولے ہولے ان کا کندھا تھپک رہی تھیں۔

''ہمارا احمد رضا لوٹ آئے گا۔ آپ اس طرح مت روئیں۔ میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔ وہم آتا ہے مجھے۔''
لیکن وہ زبیدہ کے دونوں ہاتھ تھامے بچوں کی طرح روتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔
''تمہیں یقین ہے نا زبیدہ! ہمارا رضی ایک دن واپس آجائے گا؟'' وہ جیسے اس خبر کو جھٹلانا چاہتے تھے۔
''ہاں۔ مجھے یقین ہے۔'' زبیدہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھیں۔ ماما کی دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔''
''اچھا! لیکن مجھے یقین کیوں نہیں آتا؟ میرا دل کیوں بجھتا جا رہا ہے؟'' وہ زبیدہ کے کندھے پر سر رکھے اس روز اتنا روئے تھے کہ زبیدہ گھبرا گئی تھیں۔ اور تب سے، اس روز سے وہ اس بوجھ کو تنہا اُٹھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے سمیرا کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے کئی بار ہمت کی تھی کہ وہ سمیرا کو بتا دیں لیکن وہ نہیں بتا سکے تھے۔
''حسن صاحب!...... حسن صاحب!''
انہوں نے چونک کر دیکھا۔ زبیدہ ٹی وی کے بالکل پاس کھڑی تھیں۔
''یہ آپ ذرا قریب آ کر دیکھیں نا۔ یہ ہاتھ دیکھیں اس کے۔''
احمد حسن نے کوئی بات کرتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھایا تھا۔
''اس کے ہاتھ بھی بالکل احمد رضا جیسے ہیں۔ یہ اس کی انگلیاں۔'' وہ ٹی وی کے کچھ اور قریب ہوئی تھیں اور تھوڑا سا جھک کر احمد حسن کو دیکھ رہی تھیں۔
''زبیدہ! تم پاگل ہوگئی ہو۔ اب ہر شخص تمہیں احمد رضا لگتا ہے۔ یہ احمد رضا نہیں ہے۔'' انہوں نے سختی سے کہا۔ زبیدہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے تو کبھی اس طرح سختی سے بات نہیں کی تھی۔ وہ تو بہت نرمی اور حلیمی سے بات کرتے تھے۔ وہ ان سے نظریں چراتے ہوئے تیزی سے لاؤنج سے باہر نکل گئے اور اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے تکیے کے نیچے سے اخبار کی وہ کٹنگ نکالی جو کسی حد تک بوسیدہ ہو چکی تھی۔
'کیا پتہ۔' انہوں نے بے یقینی سے خود سے کہا۔ 'کیا پتہ میں نے غلط پڑھا ہو۔ احمد رضا کے بجائے کوئی اور نام لکھا ہو۔ ہو سکتا ہے، مجھ سے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہو۔'
اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں سینکڑوں بار پڑھی جانے والی اس خبر کو وہ پھر پڑھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر ان کے رخساروں کو بھگوتے جا رہے تھے۔

❁○❁

وہ ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں اخبار پر تھیں۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھے دو لڑکے کافی دیر سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی کی اور پھر اُٹھ کر اس کے قریب آئے۔ ان کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔
''السلام علیکم!''
اس نے نظریں اٹھائیں اور سلام کا جواب دے کر مسکرایا۔
''آپ احمد حسن ہیں نا؟'' ایک لڑکے نے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
''ہم آپ کے بہت فین ہیں۔ آپ کے پروگرام دیکھتے ہیں۔ آپ کے کالم پڑھتے ہیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح کبھی آپ سے روبرو ملاقات ہوگی۔'' دوسرا لڑکا بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔
پہلے لڑکے نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور آواز دی۔
''ہائے نمرہ! ادھر آؤ۔ یہ احمد حسن ہیں۔ ''کرُ واچ'' کے اینکر۔''
لڑکی تقریباً دوڑتی ہوئی اس تک آئی تھی۔
''سر!...... سر السلام علیکم۔''
''وعلیکم السلام۔'' احمد حسن کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

''سر! میں آپ کا ہر پروگرام دیکھتی ہوں۔ ہر پروگرام دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ کو بھی ہمارے حکمران امریکہ کے حوالے نہ کر دیں۔ ہمارا سارا خاندان آپ کے لئے دعائیں کرتا ہے۔''

لڑکے کے بلانے پر ڈیپارچر لاؤنج میں موجود کچھ اور افراد بھی اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے۔

''ہم آپ کی تقاریر، تنقید اور تجزیوں کو اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں۔''

ایک ادھیڑ عمر شخص نے اس کے کندھوں پر تھپکی دی۔

''ہمیں تمہارے جیسے جوانوں کی ہی ضرورت ہے۔ بے باک، بہادر، سچے، کھرے۔ تم جیسے جوانوں نے ہی پاکستان بنایا تھا اور اب تم کو ہی اس کی حفاظت کرنا ہے۔''

احمد حسن احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ادھیڑ عمر شخص نے پُرستائش نظروں سے اسے دیکھا۔

''بیٹھو بیٹھو بیٹا! اللہ تمہارا نگہبان ہو۔'' اس شخص نے احمد حسن کے بازو پر تھپکی دی۔ پاس ہی کھڑے ایک اور شخص نے بھی اسے سراہا۔

''بلاشبہ آپ جیسے مرد مجاہد کی زبان و بیان سے اسلام اور مسلمانوں کی ترجمانی لق و دق صحرا میں کسی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے یا شجرِ سایہ دار کے مترادف ہے۔''

''آپ کا حُسنِ ظن ہے جناب! ورنہ میں تو ایک حقیر بندہ ہوں۔ معمولی انسان۔ بس دل کا گداز اور وطن سے محبت مجبور کرتی ہے۔''

''آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں جناب! آپ کے سچے اور کھرے تجزیے، یہود و امریکہ کے خلاف بے لاگ تبصرے اور آپ کا علم و فہم اور ذہانت۔ ایک دنیا اس کی معترف ہے۔''

احمد حسن نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا۔

لوگ اس سے سوال کر رہے تھے، اس کے پروگراموں کے حوالے سے بات کر رہے تھے اور وہ دھیمی آواز میں سب کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

''سر! کیا آپ کوئی پارٹی بنائیں گے اپنی؟'' کسی نے پوچھا۔

''نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں، ہم امریکہ کے تسلط سے آزاد ہو جائیں۔ ہم کسی امریکہ، اسرائیل، بھارت کے غلام نہیں ہیں۔''

وہ بول رہا تھا۔ دھیمی، متاثر کن آواز میں۔ اور اُس کے اردگرد لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔

''میرے گھر کچھ مخلص، محبِ وطن لڑکے ہر سنڈے کو آتے ہیں۔ آپ بھی جو آنا چاہیں، آ سکتے ہیں۔ ہم مل بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ ہم اپنے طور پر اس وطن کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔''

وہ کسی نوجوان کے سوال کا جواب دے رہا تھا کہ اس کی فلائٹ کے متعلق اناؤنس منٹ ہوئی۔

''رحیم یار خان کی فلائٹ تیار ہے۔ رحیم یار خان جانے والے مسافر......''

اس نے سب سے مصافحہ کیا، جھک کر اپنا بیگ اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔

❁○❁

''اریب!......اریب فاطمہ! رُکو......رُکو پلیز۔ مجھے اس طرح چھوڑ کر مت جاؤ۔ دیکھو، میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں......بہت محبت کرتا ہوں۔''

وہ اس کے پیچھے تقریباً بھاگ رہا تھا اور اریب فاطمہ پیچھے دیکھے بغیر تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ اس کی چادر کا پلو زمین پر لگ رہا تھا۔ بالکل اس کی کہانی کی حورعین کی طرح۔ جس کی اوڑھنی کا ایک پلو ہمیشہ زمین سے چھوتا رہتا تھا۔

اریب فاطمہ نے چلتے چلتے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔

''نہیں اریب فاطمہ! اس طرح مت روؤ۔ تمہارے آنسو مجھے نگار کر دیں گے۔ میں نے بچپن سے اب تک صرف آنسو دیکھے ہیں۔ ماما کے اور بابا کے آنسو۔ وہ آنسو جو آنکھوں میں چمکتے اور رخساروں پر بہتے تھے۔ اور وہ آنسو جو دکھتے نہیں تھے لیکن دل کی زمین کو بھگوتے تھے۔ تم تو مجھے اپنے آنسو مت دکھاؤ۔ اپنی ہنسی دان کر دو مجھے پلیز! ایک بار رک کر میری بات سن لو۔''

لیکن وہ پھر منہ موڑ کر بھاگنے لگی تھی۔

''اریب فاطمہ!......اریب فاطمہ!'' وہ اُس کے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور اسے لگا جیسے کوئی سر پر ہتھوڑے برسا رہا ہو۔

اس نے کروٹ بدلی اور کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ باہر دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ کچھ دیر وہ یوں ہی لیٹا رہا۔

دستک پھر ہوئی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت گہری نیند سے جاگا تھا۔

''اریب فاطمہ!'' اس کے لبوں سے نکلا اور اس نے غیر ارادی طور پر اپنے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

'اوہ خدایا!.....تو وہ خواب تھا۔'

دستک پھر ہو رہی تھی۔ وہ اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ وہ اُٹھا اور دروازہ کھولا۔ باہر کرنل شیر دل کا ملازم تھا۔ اس نے ایک کی طرح آنکھوں کو دیکھا۔

''آپ بہت گہری نیند میں تھے شاید۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کرنل صاحب کو بلا لاؤں۔''

''ہاں! شاید بہت گہری نیند میں تھا۔ خیریت ہے نا؟''

''جی بالکل خیریت۔ کرنل صاحب کہہ رہے ہیں، ادھر ہی آ جائیں ناشتے کے لئے۔ بیگم صاحبہ نے نہاری اور مٹر بنایا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔'' وہ واپس مڑا اور سوچا۔

'کیا عجیب خواب تھا۔ شاید یہ میری کہانی کا اثر تھا، جو اس طرح کا خواب دیکھا میں نے۔'

اس نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات کو اکٹھا کر کے کلپ بورڈ پر لگایا۔ رات وہ لکھتے لکھتے ہی سو گیا تھا۔ یوں ہی کرسی کی پشت پر سر رکھے۔ پھر رات کے درمیانی پہر اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ بستر پر آ کر لیٹ گیا تھا۔ وہ اپنی کہانی جلد از جلد

مکمل کرنا چاہتا تھا اس لئے ان دنوں وہ رات گئے تک لکھتا رہتا تھا۔ پچھلا ہفتہ بہت پریشانی میں گزرا تھا۔
پہلے رابیل کا حادثہ اور پھر احسان شاہ کی بیماری۔ اُس روز ہمدان کا فون سن کر وہ سمجھا تھا کہ شاید رابیل کو کچھ ہو گیا ہے۔ شاید اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے یا پھر شاید......

''نہیں......'' اس نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سر جھٹکا۔ وہ کوئی غلط بات نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ رابیل کے ساتھ اس کی کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ مائرہ آنٹی کی طرح رابیل بھی اسے پسند نہیں کرتی۔ لیکن وہ اس کی صحت اور زندگی کے لئے مسلسل دعائیں کر رہا تھا۔

وہ بابا جان کی بے حد لاڈلی تھی۔

وہ احسان شاہ کی بیٹی تھی، جو فلک شاہ کو جان سے زیادہ پیارے تھے۔ اور وہ اس کی سگی ماموں زاد تھی۔ کہیں تو تعلق کے دھاگے جڑے تھے کہ وہ آندھی کی رفتار سے ڈرائیو کرتا ہسپتال پہنچا۔ ہمدان اسے گیٹ کے پاس ہی مل گیا۔

''ہومی! رابی کیسی ہے؟......سب خیریت ہے نا؟......ٹھیک ہے نا؟'' اس نے بے تابی سے ہمدان کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو ایک لمحہ کے لئے ہمدان کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔

''ہاں! رابی تو ٹھیک ہے۔ وہ دراصل انکل احسان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے، شدید قسم کا۔ ابھی تک ایمرجنسی میں ہیں۔ ڈاکٹر ٹریٹ منٹ دے رہے ہیں۔'' ہمدان کی آواز بھرّا گئی۔

''میں سمجھا شاید رابیل......'' ایبک نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں! سوری۔ میرے فون کی چارجنگ ختم ہو گئی تھی۔ ایک دم بند ہو گیا اور میں تمہیں پوری بات نہیں بتا سکا۔ اب میں باہر پی سی او سے تمہیں فون کرنے جا رہا تھا۔''

''کیا پہلے بھی کبھی انہیں ہارٹ کی تکلیف ہوئی؟''

''نہیں۔ کبھی نہیں۔ آج بالکل اچانک ہی وہ رابی سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک دم بات کرتے کرتے انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا اور پورا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا۔ میں ان کے پاس ہی کھڑا تھا۔ یقین کرو ابی! ان کی پیشانی سے پسینہ ایسے بہہ رہا تھا جیسے پانی بہتا ہے۔ انہوں نے ہونٹ کھولے تھے لیکن بول نہیں پائے تھے۔ ان کے ہونٹ بالکل سفید ہو رہے تھے۔ ایک دم ہی ان کا سر ڈھلک گیا۔ وہ گرنے لگے تھے لیکن زبیر نے سنبھال لیا۔ پھر (را)ہی انہیں ایمرجنسی میں لے گئے تھے ہم۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے ہمیں بتایا تھا کہ اُنہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔''

دونوں باتیں کرتے کرتے ایمرجنسی کے قریب آ گئے تھے۔

ایمرجنسی کے باہر پڑی بینچ پر عبدالرحمٰن شاہ، عثمان شاہ اور مصطفیٰ شاہ بیٹھے تھے۔

''میرا شانی......آبی!......میرے بچے! میرے بیٹے کے لئے دعا کرو۔ اسے کچھ ہو گیا تو......''

ایبک کو دیکھتے ہی عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھیں برس پڑیں۔

''ان شاء اللہ! انہیں کچھ نہیں ہوگا بابا جان! وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' ان کے اس بیٹھتے ہوئے اور ان کے بازوؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایبک نے انہیں تسلی دی۔

اور پھر کچھ دیر بعد انہیں ایمرجنسی سے آئی سی یو میں لے جایا گیا۔ لیکن بابا جان کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ آئی سی یو میں انہیں دیکھنے گئے تو جتنی دیر وہاں رہے، مسلسل ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ تب مصطفیٰ شاہ کے اشارے پر ایبک انہیں باہر لے آیا۔

''آپ پلیز حوصلہ کریں۔ انکل احسان اِن شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

وہ انہیں تسلی دیتا ہوا وزیٹر روم میں لے آیا تھا۔ انکل عثمان انہیں وہیں مل گئے۔ انہوں نے ایبک سے کہا کہ وہ بابا جان کو گھر چھوڑ دے۔

عبدالرحمٰن شاہ بڑی مشکل سے گھر جانے پر تیار ہوئے تھے۔
''رابی کے پاس کون ہے ہمدان؟'' اسے اچانک ہی خیال آیا۔ ہمدان نے ایک بار پھر اسے حیرت سے دیکھا۔
''مائرہ آنٹی، میں اور ثنا آنٹی ہیں۔ مونی اور حفصہ کچھ دیر پہلے ہی گھر گئی ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔ میں بابا جان کو گھر چھوڑ کر آتا ہوں، پھر......''
''نہیں۔ تم بیٹھو۔ میں جا رہا ہوں۔ مجھے گھر سے کچھ سامان بھی لانا ہے۔''
اور پھر اگلے کئی دن وہ مسلسل ہسپتال جاتا رہا۔ احسان شاہ، آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کر دیئے گئے تھے۔ رابیل کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ احسان شاہ کی انجیو گرافی ہوئی اور پتہ چلا تھا کہ ان کی دو وینز بند ہیں۔ عثمان شاہ واپس چلے گئے تھے اور حفصہ اور عادل کی منگنی کا فنکشن ملتوی ہو گیا تھا۔
عثمان شاہ اکیلے ہی واپس گئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ ڈیڑھ ما بعد وہ پھر آئیں گے چھٹی لے کر اور منگنی کے بجائے فوراً شادی کر دی جائے گی۔ فلک شاہ کو ایبک نے احسان شاہ کی بیماری کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ اور ہمدان کو بھی منع کر دیا تھا کہ الریان میں بابا جان اور مصطفیٰ انکل سے کہہ دے کہ وہ بابا کو احسان شاہ کے متعلق کچھ نہ بتائیں۔ کتنے سالوں بعد وہ تھوڑا خوش ہوئے ہیں۔ احسان شاہ کی بیماری کا سن کر وہ پریشان ہو جائیں گے۔ ایسے میں جبکہ وہ بھی وہاں نہیں ہے۔ ماما اکیلے کیسے اُنہیں سنبھالیں گی۔ وہ خود بیمار ہیں۔
اس نے خود ہی اُنہیں فون کر کے منگنی کے ملتوی ہونے اور عثمان انکل کے واپس جانے کے متعلق بتا دیا تھا۔

❁○❁

احسان شاہ تقریباً ایک ہفتہ ہسپتال رہنے کے بعد گھر منتقل ہو گئے۔ ان کے گھر جانے کے بعد بھی اس نے دو چکر ''الریان'' کے لگائے تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ احسان شاہ اس کی موجودگی میں بے چینی محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے براہِ راست ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن اسے لگتا تھا کہ مائرہ آنٹی کی طرح انہیں بھی اس کا ''الریان'' میں آنا پسند نہیں ہے۔ البتہ حیرت انگیز حد تک رابیل کا روّیہ بدلا ہوا تھا۔ دونوں بار رابیل نے اس سے بہت اچھی طرح بات کی تھی۔
''لگتا ہے، اس حادثے نے رابیل کو بدل دیا ہے۔'' اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
'چلو! رابیل بی بی کو بھی کچھ اخلاق نبھانے آ گئے ہیں۔ ورنہ پہلے تو اگر وہ لاؤنج میں بیٹھی ہوتی تو اسے دیکھ کر رخ موڑ لیتی تھی اور اب نہ صرف یہ کہ اس نے ماما پاپا کی خیریت پوچھی تھی بلکہ اسے چائے کی پیش کش بھی کی تھی۔ اگر عمر احسان شاہ کو یہ سب پتہ چلے تو وہ تو حیرت سے اُچھل پڑے۔ بلکہ اسے یقین ہی نہیں آئے گا کہ رابیل احسان شاہ اور چائے کی پیش کش......'
ایبک کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے دراز سے فائل نکالی اور کلپ بورڈ پر سے کاغذات اُتار کر ترتیب دینے لگا۔
کاغذات کو ترتیب سے رکھتے ہوئے اس کی نظریں غیر ارادی طور پر لفظوں پر پھسل رہی تھیں۔
حورعین، چوہدری فرید کی پانچویں بیٹی تھی۔ اس لئے اس نے کبھی حورعین کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔ بلکہ دو ماہ تک کسی نے اس کا نام بھی نہیں رکھا تھا۔ اس کی پیدائش کے دو ماہ بعد اس کی ایک پھوپھی نے جو سات جماعت پاس تھی، اس کا نام رکھا تھا۔
''یہ خمسہ ہے۔ پانچویں۔ رابعہ چوتھی تھی۔'' اور اپنے علم پر نازاں ہو کر وہ قہقہہ مار کر ہنسی تھی۔
حورعین کی اس پھوپھی کو اپنی سات جماعتوں پر بے حد ناز تھا اور چوہدری فرید بھی اپنی بہن سے ہر مشورہ کرتا تھا اور کہتا تھا۔

''اس کی سمجھ تم سب سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ اس نے سات جماعتیں پڑھ رکھی ہیں۔ وہ بھی شہر میں رہ کر۔''
دراصل حورعین کی اس پھوپھی کو اس کے ماموں بچپن میں اپنے ساتھ شہر لے گئے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ لیکن بدقسمتی سے جب اس کی اس پھوپھی نے ساتویں جماعت پاس کی تو ماموں، ممانی کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا اور پھوپھی کو واپس حویلی آنا پڑا۔

چوہدری فرید کو اس کی سات جماعتوں کا بڑا مان تھا۔ حالانکہ خود اس نے اپنی بیٹیوں کو پانچ جماعتوں سے زیادہ پڑھنے نہیں دیا تھا۔

رقیہ اس کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور اسے بہت شوق بھی تھا پڑھنے کا۔ سکول کی بڑی استانی جی نے خود گھر آ کر مریم اور چوہدری فرید سے کہا تھا کہ وہ رقیہ کو آگے پڑھنے دیں۔ کم از کم مڈل تک تو گاؤں میں ہی سکول ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

''پھر آپ کہیں گی، آٹھویں پڑھ لی ہے تو شہر بھیج دو دس پڑھنے کے لئے۔'' چوہدری فرید نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔
''نہ بابا! نہ...... ہمیں تو معاف ہی کرو۔ ہمیں نہیں پڑھا لکھا کر عشق و عاشق کروانا۔''

اور بڑی استانی جی کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ رقیہ مارے شرم کے سر جھکائے بیٹھی تھی اور چوہدری فرید کے جانے کے بعد بار بار استانی جی سے معافی مانگی تھی، جو اس کے کہنے پر ہی مریم اور چوہدری فرید کو سمجھانے آئی تھیں۔

چوہدری فرید کی بیٹیوں نے پرائمری تک پڑھا تھا پھر بھی سعدیہ کو عشق ہو گیا تھا اور عشق بھی ایسا جس نے اسے خاک میں ملا ڈالا اور مٹی اس کا خوب صورت جسم کھا گئی۔ آہ!

''تمہارا نام خمسہ ہے تو پھر یہ حورعین؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو حورعین نے جو سر جھکا کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی، اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔

اسے حورعین تو اس کی ماں مریم بلاتی تھی یا پھر جب تم نے اسے پہلی بار دیکھا تھا، تم نے اسے حورعین کہہ کر بلایا۔ یوں تو حورعین کی ساری بہنیں ہی خوب صورت تھیں۔ لیکن حورعین کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ سحر طاری کرتی تھیں۔ اور مریم نے جب پہلی بار اسے اپنی گود میں اٹھایا تو اس کے لبوں سے بے اختیار ''حورعین'' نکلا تھا۔ پر اس کی پھوپھی نے کہہ دیا تھا۔

''خمسہ تو بس خمسہ۔'' اس کی پھوپھی کی کہی ہر بات پر چوہدری فرید مہر لگا دیا کرتا تھا۔ اس نے خود تو ایک بار بھی نظر بھر کر اسے نہیں دیکھا تھا۔

وہ کب ہنسی تھی؟ کب اس نے دانت نکالے تھے؟ کب اس نے چلنا شروع کیا تھا؟ اور کب سکول جانا؟ وہ ہر بات سے بے خبر تھا۔

یوں بھی وہ مہینوں بعد حویلی آتا تھا۔ زیادہ تر وہ ڈیرے پر ہی رہتا تھا۔ نوراں مصلن اور میراں میراثن ڈیرے پر آتی جاتی رہتی تھیں اور ان راتوں میں مریم جاگتی تھی۔

باہر دارو سائیں پیپل تلے بیٹھا جب کچھ گاتا اور اس کی آواز رات کے سناٹوں میں ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی مریم کے کانوں میں پڑتی تو وہ بے چین ہو کر اُٹھ بیٹھتی۔ گرمیوں کی راتوں میں صحن میں ساتھ ساتھ بچھی چارپائیوں پر سوتی اس کی دلہیاں جوانی کی الہڑ نیند سو رہی ہوتیں تو وہ ایک نظر ان پر ڈال کر کشاں کشاں گھڑونچی تک آتی اور پھر گھڑونچی کی جالیوں سے باہر بے خودسی دیکھے جاتی اور دارو سائیں کی آواز بلند ہو جاتی خود بخود ہی۔

''نی میں گلیاں دا روڑا کوڑا
تے محل چڑھایا سائیاں''

اور گاتے گاتے بول اور لے بدل جاتی۔

''شالا مسافر کوئی نہ تھیوے
نے ککھ جناں توں بھاری ہو''

اور جالیوں سے چہرہ ٹکائے بے خود کھڑی مریم کی آنکھیں برسنے لگتیں۔ اور ایسی ہی ایک رات میں رقیہ اپنی چارپائی سے اُٹھ کر اس کے پیچھے گھڑونچی تک چلی آئی تھی۔ رقیہ، چوہدری فرید کی سب سے بڑی بیٹی تھی اور چند دن پہلے ہی چوہدری فرید نے اس کا رشتہ ملک ممتاز چوہدری سے طے کر دیا تھا۔

ملک ممتاز چوہدری جو دو بیویاں بھگتا چکا تھا اور اولاد سے محروم تھا۔ لیکن وہ بڑا زمین دار تھا اور اس کی جاگیر کئی میلوں تک پھیلی تھی۔ چوہدری فرید خوش تھا۔ لیکن مریم کو یہ رشتہ منظور نہ تھا۔

سولہ سالہ سعدیہ کو جانے کس دکھ نے چاٹ لیا تھا، جو اب سترہ سالہ رقیہ کو دکھوں کی بھٹی میں جھونک دیتی۔ بھلا سترہ سال اور پچاس سال کا کیا میل؟

''مرد کی عمر کس نے دیکھی ہے بے وقوف عورت! اور پھر ملک ممتاز تو ہٹا کٹا ہے۔ دس جوانوں پر بھاری ہے وہ۔''

پر مریم مان کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ کہاں اس کی چنبیلی کی طرح نازک رقیہ اور کہاں ملک ممتاز۔

''اماں!'' رقیہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ مریم چونک کر مڑی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ''اماں! کیوں روتی ہو؟''

''رقیہ!'' مریم کے آنسو زیادہ تیزی سے بہنے لگے۔ رقیہ ایک بازو اس کے گرد حمائل کیے اسے ساتھ لے کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''میرا غم نہ کر اماں! سعدو کا دکھ ہی کم نہیں ہے تیرے لئے۔ اب میرا دکھ بھی اوڑھ لیا ہے تُو نے۔ کچھ نہیں ہوگا۔ ابا کو اپنی کرنے دے۔ میں راضی ہوں اماں!''

اور میم اسے لپٹا کر یوں بلک بلک کر روئی کہ ساتھ والی چارپائیوں پر سوئی اس کی تینوں بیٹیاں جاگ اُٹھیں۔ اور حیران اور پریشان سی اسے دیکھنے لگیں۔

رابعہ جو چوتھی تھی اور فریدہ جو تیسری تھی اور حورعین جو تب صرف چند سال کی تھی۔ رقیہ اسے اپنے ساتھ لگائے ہولے ہولے تھپکتی ہوئی یوں تسلی دے رہی تھی جیسے وہ مریم سے بڑی ہو یا پھر اس کی کوئی گہری سہیلی ہو۔ بیٹیاں جب ماں کے کندھوں کو چھونے لگتی ہیں تو وہ یوں ہی ماؤں کی گہری سہیلیاں بن جاتی ہیں۔ ان کے دکھ سکھ کی سانجھی۔

اس رات رقیہ کے نصیب پر مہر لگ گئی تھی، جب رقیہ اپنی چارپائی پر لیٹ گئی اور مریم نے چادر اوڑھ لی۔ رابعہ اور فریدہ بھی ماں کے کہنے پر بنا کوئی اصرار کیے آنکھیں موندے لیٹ گئیں۔ لیکن حورعین اسی طرح رابعہ کی چارپائی پر بیٹھی مریم کو تکتی تھی۔ اس رات وہ رابعہ سے کہانی سنتے سنتے اسی کے پاس سوگئی تھی۔ ورنہ وہ تو مریم کا ہاتھ، ہاتھوں میں لے کر سوتی تھی۔

''سو جا خسی!'' رابعہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ لیکن وہ چارپائی سے اُتر کر مریم کے پاس آگئی۔ اور پھر مریم کے پاس لیٹتے ہوئے اس کے بازوؤں پر ہاتھ رکھے ہولے ہولے اسے تھپکنے لگی۔ مریم نے اس کی طرف کروٹ بدلی۔ اس کے گرد بازو حمائل کر کے اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے۔

اور تب یکایک اسے احساس ہوا تھا کہ رات کے اس پہر فضا ایک دم ساکت تھی اور وہ جو ہوا کے دوش پر دارو سائیں کی آواز آتی تھی، وہ اب نہیں آتی تھی۔ اب حبس تھا اور ہوا دوسری سمت چلتی تھی۔ دارو سائیں پیپل کے تنے پر سر مارتے ہوئے بلک بلک کر روتا تھا۔ اس کے رونے کی آواز مریم تک نہیں آتی تھی۔ لیکن وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی تھی اور حورعین بند ہوتی آنکھیں کھول کھول کر مریم کو دیکھتی تھی۔

اس رات نہ مریم سوئی تھی، نہ رقیہ۔ صبح دونوں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور حورعین جب چائے کا بڑا سا کپ لے

کر حویلی سے باہر دارو سائیں کو دینے آئی تھی تو اسے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ دارو سائیں کے ماتھے پر اور چہرے پر خون جما ہوا تھا اور ماتھے پر کسی کسی خراش سے اب بھی لہو رستا تھا۔ وہ دوڑ کر واپس حویلی میں آئی۔ اور جب کٹورے میں پانی اور رُوئی لے کر وہ باہر آئی اور گھڑونچی کی جالیوں سے چہرہ ٹکائے مریم اسے پانی میں رُوئی بھگو کر دارو سائیں کا چہرہ صاف کرتے دیکھتی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں کی جھیلوں میں تیرتے تھے۔ دارو سائیں حیرت سے اسے تکتا تھا۔ پھر اس نے حورعین کے ننھے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کچھ دیر اپنی ویران آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ کہا بھی تھا۔ لیکن حورعین کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر یکایک اس نے ایک دم حورعین کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور بھاگنے لگا۔

حورعین بھیگی رُوئی اور پانی کا کٹورا ہاتھوں میں لئے اسے حیرت سے بھاگتے دیکھ رہی تھی اور اندر جالیوں سے باہر جھانکتی مریم کے سامنے کوئی منظر بار بار آتا تھا جیسے سینما کی اسکرین پر ایک ہی منظر ٹھہر گیا ہو۔

وہ ایک بچہ تھا، دس گیارہ سال کا۔ اور وہ بچی حورعین سے تھوڑی ہی بڑی ہوگی، سات آٹھ سال کی۔ اس کے ہاتھ میں بھی پانی کا کٹورا تھا اور وہ رُوئی بھگو بھگو کر بچے کی پیشانی سے بہتے خون کو صاف کرتی تھی اور بچہ مسکرا مسکرا کر اسے دیکھتا تھا۔

''اور رقیہ؟'' بہت دیر سے میرے دل میں جو سوال کلبلا رہا تھا، وہ میرے لبوں پر آ گیا۔ حالانکہ مجھے پتہ تھا کہ حورعین کو پسند نہیں کہ میں اسے باتوں کے درمیان ٹوکوں۔ لیکن مجھ میں صبر تو بالکل بھی نہیں تھا۔ اتنی دیر سے میں بے چین ہو رہا تھا، یہ جاننے کے لئے کہ کیا رقیہ کی شادی ہو گئی اُس پچاس سالہ ملک ممتاز سے؟...... حورعین نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔

''ہاں! رقیہ اپنی حویلی سے وداع ہو کر ملک ممتاز کی حویلی میں چلی گئی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھی ملک ممتاز کو صاحب اولاد نہ کر سکی تو بہت جلد ملک ممتاز کے دل سے اُتر گئی اور باقی دو کی طرح حویلی کے ایک کمرے میں مقید ہو گئی۔ ملک ممتاز تینوں بیویوں کے بانجھ ہونے کا دُکھڑا روتے روتے چوتھی بیاہ لایا اور چوتھی کے اصرار پر رقیہ کو طلاق دے کر گھر بھجوا دیا۔ چوتھی بیوی کو رقیہ کی کم عمری اور خوب صورتی سے خوف آتا تھا۔ باقی دو تو بوڑھی ہو گئی تھیں۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ بھی ملک کو اولاد نہ دے سکی تو اس واجبی صورت والی سفینہ کو چھوڑ کر ملک پھر کہیں رقیہ کی طرف متوجہ نہ ہو جائے۔

مریم کا دکھ سوا تھا۔

بچھڑ جانے والی بیٹی کا دکھ۔

اور اُجڑ جانے والی بیٹی کا غم۔

اس کی آنکھیں تو کبھی خشک نہیں ہوتی تھیں لیکن وہ کبھی شکوہ نہیں کرتی تھی۔ نہ اللہ سے، نہ چوہدری فرید سے۔

ایک لحہ کے لئے حورعین خاموش ہوئی تو میں نے فوراً پوچھا۔

''وہ بچہ کون تھا؟ اور......''

''وہ بچہ دارا شکوہ تھا۔ مریم کا تایا زاد۔ جس درختوں پر چڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر درختوں سے گر کر زخمی ہو جاتا تھا۔ مریم اس کے زخم صاف کرتی جاتی اور اسے ڈانٹتی رہتی، بالکل تائی جان کی طرح۔ اور وہ سنتا رہتا۔ وہ کبھی سمجھ نہیں سکا تھا کہ وہ بار بار جان بوجھ کر زخمی کیوں ہوتا ہے؟ اور اسے مریم کا اپنے زخم صاف کرنا اور اپنے لئے پریشان ہونا اچھا کیوں لگتا ہے۔

اور جب سمجھنے کی عمر آئی اور وہ مریم کو بتانا چاہتا تھا کہ اسے بار بار زخمی ہونا اور مریم سے زخم صاف کروانا کیوں اچھا لگتا تھا تو اس کے تایا اور سوتیلے بھائی نے جائیداد کی خاطر اسے زندہ درگور کر دیا اور وہ پھر کبھی مریم کو نہیں بتا سکا تھا کہ وہ.....

''اور کیا مریم نہیں جانتی تھی، اس کے بتائے بنا ہی؟''

''ہاں۔ اس لالچ اور ہوس نے بہت سارے لوگوں کو ان کے پیاروں کے ہاتھوں زمین میں دفن ہوتے دیکھا تھا۔''
''تب تو زمین بہت روتی ہوگی نا حورعین؟'' اب کے زمین کا ذکر میں نے چھیڑا تھا۔
''وہ بھی تو دارا شکوہ تھا...... علم کا سمندر۔ لیکن علم نے اسے گمراہ کر دیا۔ میں نے پڑھا ہے تاریخ کی کتابوں میں، وہ ہندو سادھوؤں کی صحبت میں رہتا۔ ان ہی جیسا حلیہ بنائے رکھتا۔ اس کا بڑا بھائی بڑا دین دار اور نیک تھا۔ لیکن بھائی کے ہاتھوں بھائی کا قتل زمین کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ زمین پر بھائی کے ہاتھوں بھائی کے پہلے قتل کے بعد سے اب تک نہ جانے کتنے بھائی اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔''
اس نے قدرے فخر سے حورعین کی طرف دیکھا۔ وہ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔
''تو تمہیں بھی تاریخ سے دلچسپی ہوگئی ہے۔''
اس کی مسکراہٹ نے مجھے شرمندہ کر دیا تھا۔ یہ تو کورس کی کتاب میں کہیں اورنگ زیب اور دارا شکوہ کے متعلق پڑھا تھا تو اب دارا شکوہ کے نام پر یاد آ گیا تھا۔
''زمین کی جھولی دکھوں سے بھری ہوئی ہے شاعر!'' حورعین کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ایک دم بجھ گئی تھی۔
''اور اسے تو صدیوں سے رونے کی عادت ہے۔ دریا، سمندر، ندی، نالے، چشمے، جھیلیں... سب اس کے آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے شاعر! اُس رات جب حضرت لوط علیہ السلام کے شہر سدوم میں دو فرشتے خوب صورت لڑکوں کے روپ میں آئے تھے اور حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان ٹھہرے تھے تو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگ ان کے دروازے پر ہتھوڑے برساتے تھے اور مہمان لڑکوں کو مانگتے تھے...... تو کیا زمین خوف سے کانپتی نہیں ہوگی؟ اور آنے والے عذاب کے ڈر سے ان کے لئے روتی نہیں ہوگی جو نہیں سمجھتے تھے۔ اور جب عذاب نے انہیں آ لیا تو تب کون تھا اس کے آنسو دیکھنے والا؟ وہ روتی تھی، پکارتی تھی کہ شاید سنبھل جائیں۔ لیکن زمین دھماکے سے پھٹ گئی اور پتھروں کے ٹکڑے بستی پر برستے تھے اور بستیاں اُلٹ پلٹ ہو کر بحرِ مردار کے نیچے دفن ہوگئی تھیں اور دور اپنے خیمے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، فرشتوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی خوشخبری پا کر بھی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے لئے دُکھی تھے اور اللہ تعالیٰ سے کہتے تھے۔ اگر لوط کی قوم میں دس بندے بھی نیک ہیں تو ان پر عذاب نازل نہ کر۔ لیکن وہاں تو پوری قوم ہی مبتلائے گناہ تھی۔
زمین اپنی پیدائش سے لے کر اب تک اربوں، کھربوں انسانوں کے قتل پر، ان کے دکھوں پر، ان کی اذیتوں پر روئی ہے۔ کیا ماں اولاد کے دکھوں پر نہیں روتی؟...... تم شاعر تو زمین کو دھرتی ماں کہتے ہو اور آج تمہاری صفوں میں بھی قومِ لوط کے افراد کو دیکھ کر زمین روتی ہے، اس عذاب کے ڈر سے جو آئے گا تو بستیاں اُلٹ پلٹ ہو جائیں گی۔''
حورعین میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی پلکیں ہمیشہ کی طرح بھیگی ہوئی تھیں۔
''مریم بھی اولاد کے دکھوں پر روتی تھی، چھپ چھپ کر۔ اور دعائیں مانگتی تھی، ان کی خوشیوں کے لئے۔''
ایبک اپنی ہی لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے میں یوں محو ہو گیا تھا کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اسے تو ناشتہ کرنے شیر دل کی طرف جانا ہے۔ دروازے کی بیل بج رہی تھی۔
اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کاغذات جلدی سے فائل میں رکھے اور دروازے تک آیا۔
''ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے سر!..... کرنل صاحب کہہ رہے ہیں کہ جلدی آئیں۔''
''ہاں ہاں! چلو میں آ رہا ہوں۔''
اور پھر وہ بہت عجلت میں تیار ہو کر کرنل شیر دل کی طرف آیا تھا۔ کرنل شیر دل ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔
''بہت انتظار کروایا یار!''
''سوری انکل!'' وہ شرمندہ ہوا۔ ''میں بس ایسے ہی......''

''رات دیر تک جاگتے رہے ہو؟'' کرنل شیر دل مسکرائے۔
''جی! میں چاہ رہا تھا کہ اس ماہ کے اینڈ تک میری کتاب مکمل ہو جائے۔''
تب ہی بیگم شیر دل ملازم کے ساتھ ناشتہ لے کر آ گئیں۔
''السلام علیکم آنٹی!'' وہ کھڑا ہو گیا۔
''ارے بیٹھو بیٹا! کیسے ہو؟''
''ٹھیک ہوں آنٹی!'' ایبک بیٹھ گیا۔
''ایک تو تمہارے آنے جانے کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔'' انہوں نے نہاری کا ڈونگا اس کی طرف بڑھایا اور ملازم کو آواز دی۔
''کریم! لیموں اور ادرک کہاں ہے؟ جلدی لے کر آؤ۔''
پھر وہ ایبک کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
''کل میں نے تمہارے پسندیدہ قیمہ کریلے اور چکن تکہ بنایا تھا۔ دو دفعہ کریم کو بھیجا لیکن پتہ چلا، تم نہیں ہو۔''
''میں کچھ مصروف ہو گیا تھا آنٹی! اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرا انتظار نہ کیا کریں۔ اگر میں کھانے کے وقت گھر پر ہوں تو خود ہی آ جاتا ہوں۔''
''جانتی ہوں، کتنے خود آتے ہو۔ یہ مغز لے لو۔''
''جی! شکریہ۔'' ایبک نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا مغز ڈالا۔
''کچھ اِدھر بھی نظرِ کرم ہو جائے بیگم صاحبہ!'' کرنل شیر دل مسکرائے۔
''یہ سامنے ہی تو ڈونگا پڑا ہے۔ لیجئے نا!''
کرنل شیر دل کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور انہوں نے ڈونگا اپنی طرف کھسکا لیا۔
''تو میاں!'' بیگم شیر دل پھر ایبک کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ''پڑھائی تم کر چکے، ملازمت کی تمہیں کوئی خاص ضرورت نہیں۔ بغیر ملازمت کے ہی خاصا کما رہے ہو۔ نہ کماؤ تو بھی زمینوں، جائیدادوں سے کافی آتا ہے۔ بیوی بچے تمہارے بھوکے نہیں مریں گے۔''
ایبک نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔
''بیوی بچے؟''
''ہاں ہاں! کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب تمہیں شادی کر لینی چاہئے۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے نا کہ شادی کر لو گے تو بیوی بچوں کو کھلا پلا نہیں سکو گے۔''
''آپ بھی کمال کرتی ہیں۔'' کرنل شیر دل نے قہقہہ لگایا۔ ''اتنا گھما پھرا کر بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ صاف صاف کہہ دیں کہ میاں! اب شادی کے قابل ہو گئے ہو، شادی کر لو۔ ویسے کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟''
''ارے لڑکیوں کی کون سی کمی ہے کرنل صاحب! اس کے اپنے خاندان میں ایک سے ایک بڑھ کر لڑکی ہے۔ اس کے ماموؤں کی بیٹیاں ہیں۔ سگھڑ، خوب صورت، پڑھی لکھی۔ اور وہ لڑکی، کیا نام ہے اس کا.....رابیل۔ وہ کتنی پیاری ہے۔''
ایبک سر جھکائے کھانے میں مشغول تھا۔ لیکن اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔
''ایک وہ ہمارے والے صاحبزادے ہیں۔ امریکہ جا کر بیٹھ گئے۔ جب بھی شادی کی بات کرو، جواب ملتا ہے سوچ کر بتاؤں گا۔ تم بھی سوچتے ہی نہ رہ جانا۔ ساری اچھی لڑکیاں تمہارے سوچتے سوچتے میں ہاتھوں سے ہی نہ نکل جائیں کہیں۔''
''جی......!'' ایبک نے ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ صاف کئے۔
بیگم شیر دل چائے لینے چلی گئیں تو کرنل شیر دل نے ایبک کی طرف دیکھا۔
''اپنی آنٹی کی بات پر غور کرنا یار! تمہارے بابا بھی چاہتے ہیں کہ اب تم شادی کر لو۔ زندگیوں کا کیا اعتبار۔ اگر کسی کو

پسند کرتے ہو تو اپنی مام کو بتا دو اور......''

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ بیگم شیر دل ہاتھ میں کارڈلیس لئے آ رہی تھیں۔

''آپ کے صاحبزادے نے یاد فرمایا ہے۔ بات کر لیں۔''

کرنل شیر دل نے فون لے لیا اور بات کرنے لگے۔ ایبک سوچنے لگا۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جب والدین کو اولاد کی رفاقت، اس کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے تو اولاد اپنی زندگیاں بنانے کے چکر میں انہیں چھوڑ جاتی ہے۔ اب یہ حیدر شیر دل کتنے سالوں سے امریکہ میں سیٹل تھا۔ پہلے اسپشلائزیشن کے چکر میں سات سال لگا دیئے اور اب اچھی جاب کی کشش اسے پاکستان آنے سے روکے ہوئے تھی۔ دو تین سال بعد دس پندرہ دنوں کے لئے چکر لگا جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پاکستان میں ڈاکٹروں کو اتنی سیلری نہیں ملتی کہ وہ اپنی زندگیاں اچھے طریقے سے گزار سکیں۔

آنٹی اور انکل شیر دل نے ایبک کو ہمیشہ بہت محبتیں اور شفقتیں دی تھیں۔ حیدر کے حصے کی بھی۔

کرنل شیر دل نے حیدر سے بات کر لی تو ایبک بھی چائے پی کر کھڑا ہو گیا۔

''آج کیا پروگرام ہے؟ کھانے تک آ جاؤ گے؟''

''ابھی تو بابا جان سے ملنے جا رہا ہوں۔ ایک دو روز تک بہاول پور جا رہا ہوں۔ سوچا، آج فارغ ہوں تو مل آؤں۔ پھر شاید مجھے ٹائم نہ ملے، اگلے دو دن۔''

''بابا جان سے میرا بھی سلام کہنا۔'' کرنل شیر دل بھی کھڑے ہو گئے۔

الریان جانے کا پروگرام ابھی اچانک ہی ناشتہ کرتے ہوئے اس نے بنایا تھا۔ آنٹی شیر دل صحیح تو کہتی ہیں کہ کہیں سوچتے سوچتے میں سب کچھ ہاتھوں سے نکل ہی نہ جائے۔ اریب فاطمہ وہ پہلی لڑکی تھی، جسے ایبک فلک شاہ کے دل نے چنا تھا اور رفاقت کی خواہش کی تھی۔ وہ کسی اچھے اور مناسب وقت کے انتظار میں تھا کہ اریب سے دل کی بات کر سکے۔ ایسا وقت مل ہی نہیں پا رہا تھا۔ اسے خود ہی یہ وقت تلاش کرنا ہوگا۔

انیکسی میں آ کر اس نے میز پر پڑی گاڑی کی چابی اٹھائی۔ اس کی نظر ایک شاپنگ بیگ پر پڑی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے شاپنگ بیگ اٹھا لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ الریان کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ مسلسل اریب فاطمہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔

'مجھے آج ضرور موقع دیکھ کر دل کی بات کہہ دینا چاہئے۔ لیکن کیسے؟ وہاں تو سب ہوں گے۔ اور پھر اریب فاطمہ تو سب کی محفل میں آتی بھی نہیں ہے۔ حفصہ اور منیبہ کتنی بار بلاتی ہیں، تب کہیں آ کر کھڑے کھڑے سلام کرتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ لیکن وہ میری وجہ سے تو نہیں...... محبت میں بدگمانی پتہ نہیں کیوں ساتھ ساتھ رہتی ہے۔' اس نے سوچا۔

'اریب فاطمہ نے تو کبھی اپنے رویے سے ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا کہ اسے میرا الریان آنا پسند نہیں ہے۔ وہ بس محتاط لڑکی ہے۔ ورنہ تو کئی بار ایسا محسوس ہوا ہے کہ اریب فاطمہ کے دل میں بھی میرا خیال ہے۔ نہیں۔ اریب فاطمہ مجھے ناپسند نہیں کر سکتی۔' اسے یقین ہوا کہ محبت خوش گمان بھی تو بہت ہوتی ہے۔

'کاش! وہ آج مجھے کہیں اکیلی مل جائے کچھ دیر کو۔' اس کے دل نے بہت شدت سے خواہش کی۔

اور بعض خواہشیں ایک دم پوری ہو جاتی ہیں...... اچانک۔ جیسے ایبک کی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً اریب فاطمہ تھی، جو ارد گرد سے بے خبر سر جھکائے چلی جا رہی تھی۔ وہ تقریباً الریان کے قریب ہی تھا۔ اس نے ایک دم گاڑی پیچھے کی اور روڈ کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اریب فاطمہ کو دیکھا۔ وہ پارک کی طرف مڑ گئی تھی اور اس کے گیٹ سے اندر جا رہی تھی۔ یہ پارک الریان کے قریب ہی تھا اور عموماً خواتین اور بچے رات میں ٹہلنے آتے تھے یا پھر چھٹی والے دن بچے یہاں کھیلتے رہتے تھے۔

'اس وقت اریب پارک میں کیوں جا رہی ہے؟' ایبک نے سوچا۔ پسنجر سیٹ پر پڑے ہوئے اس نے شاپنگ بیگ کو

اٹھایا اور گاڑی سے باہر نکل کر پارک کی طرف بڑھا۔
اس وقت تقریباً ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اتوار کے باوجود اس وقت پارک میں رش نہیں تھا۔ کچھ چھوٹے بچے ایک طرف کرکٹ کھیل رہے تھے۔ چند بچے جھولوں میں بیٹھے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر صاحب ایک بینچ پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور ان کے سامنے دو گول مٹول، پیارے پیارے بچے ایک دوسرے کی طرف گیند پھینک رہے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے اریب فاطمہ نظر آ گئی۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھی تھی۔ یہ جگہ ذرا پیچھے تھی اور اس طرف اس وقت کوئی نہیں تھا۔
''اریب فاطمہ!'' اس کے بالکل سامنے جا کر ایبک نے آہستہ سے کہا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر ایبک کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔
''آپ یہاں؟''
''میں الریان جا رہا تھا۔ آپ کو ادھر پارک میں آتے دیکھا تو میں بھی ادھر آ گیا۔ دراصل مجھے آپ سے ہی کام تھا۔''
''مجھ سے؟'' اریب فاطمہ کی آنکھوں میں ٹھہری حیرت گہری ہو گئی۔ ''مجھ سے بھلا آپ کو کیا کام ہو سکتا ہے؟''
''کیوں، کیا مجھے آپ سے کام نہیں ہو سکتا؟'' ایبک کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی اور وہ بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔
''اریب فاطمہ! کیا ہم یہاں کچھ دیر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟''
''یہاں؟'' اریب فاطمہ نے چاروں طرف دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا لڑکا پاپ کارن بیچ رہا تھا اور دو تین چھوٹے بچے پاپ کارن خرید رہے تھے۔ جبکہ دور سے ایک غبارے والا، غباروں کا ڈنڈا اُٹھائے ادھر ہی آ رہا تھا۔
''ہاں۔ یہاں...... اگر کوئی حرج نہ ہو تو۔'' ایبک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی پلکیں نم ہوں۔
''مگر...... میرا مطلب ہے الریان جا کر بات کر لیتے ہیں۔'' وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ''آپ چلیں الریان۔ میں آ جاتی ہوں کچھ دیر تک۔''
''لیکن میں اگر اکیلے میں بات کرنا چاہوں تو؟...... آپ کو اگر یہاں بات کرنا نامناسب لگ رہا ہے تو پلیز میرے ساتھ چلیں۔ کہیں کسی پُرسکون جگہ چل کر بات کر لیتے ہیں۔ آیئے پلیز۔''
وہ مڑا اور پھر چند قدم چل کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ وہیں بینچ کے پاس متذبذب سی کھڑی تھی۔
''کیا آپ مجھ پر ٹرسٹ نہیں کرتیں؟'' وہ پھر اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔ اریب فاطمہ گھبرائی گھبرائی سی کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر کسی نے اسے ایبک کے ساتھ جاتے دیکھ لیا تو......
ابھی کچھ دیر پہلے ہی مائرہ آنٹی نے کتنی باتیں سنا ڈالی تھیں، بلاوجہ ہی۔ پتہ نہیں، مائرہ آنٹی اتنے غصے میں کیوں تھیں۔ جس روز سے احسان شاہ ہسپتال سے آئے تھے، ان کا موڈ خراب تھا۔ لیکن آج تو حد ہو گئی تھی۔ وہ لاؤنج میں کھڑی عمر سے کہہ رہی تھیں کہ جب وہ مارکیٹ جائے تو اسے ایک ہیلپنگ بک لا دے۔
کچھ چیزیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں تو اس نے سوچا تھا کہ وہ اس بک کی مدد سے خود ہی سمجھ لے گی۔ پہلے اس نے احان سے مدد لینے کا سوچا تھا۔ لیکن پھر مائرہ آنٹی کے خوف سے اس نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ وہ کسی بک سے ان سوالوں کو سمجھ لے۔ مائرہ آنٹی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئی تھیں۔ غالباً وہ رابیل کے کمرے میں تھیں۔
اسے عمر کے پاس کھڑے دیکھ کر ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور انہوں نے بے حد غصے سے اس کی طرف دیکھا۔
''اریب فاطمہ! میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا؟''
''جی!'' وہ بے حد حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
یہ عمر تھا...... اسے تو بالکل بچہ لگتا تھا، شہریار کی طرح۔ اور وہ بھی اسے آپی کہتا تھا۔

''لیکن یہ عمر......'' وہ ہکلا گئی۔ ''مجھے ایک کتاب منگوانی تھی اس سے، کورس کی۔''

''تم ڈرائیور یا خان سے بھی کتاب منگوا سکتی ہو۔ لیکن تمہیں تو اپنی ماں کی طرح شوق ہے لڑکوں سے باتیں بگھارنے کا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا لیکن......''

وہ ہکا بکا سی اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ عمر بھی حیرت سے مائرہ کو دیکھ رہا تھا۔

''مما! اگر اریب آپی نے مجھے کتاب لانے کو کہہ دیا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ میں آخر حفصہ آپی اور مونی آپا کے بھی......''

''تم چپ ہو احمق لڑکے!'' مائرہ نے اسے ڈانٹ دیا۔

''مما......!'' عمر احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن مائرہ نے اسے ٹوک دیا۔

''عمر! جاؤ۔ میرا دماغ مت کھاؤ۔ اور ہر ایک کے ساتھ فری مت ہوا کرو۔ تمہاری بہن صرف رابیل ہے، سمجھے؟ تم تو ہو ہی عقل سے پیدل۔''

اور عمر احسان کی بھوری آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ اسے مائرہ کا اس طرح اریب فاطمہ کے سامنے بات کرنا انتہائی ناگوار گزرا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا منیبہ کے کمرے میں گھس گیا۔

لاؤنج میں مائرہ اور اریب کھڑی رہ گئی تھیں۔ اریب کی مٹھی میں دبے دوسو روپے پسینے میں بھیگ گئے تھے۔

''یہ مٹھی میں کیا ہے؟...... کس کا خط دبا رکھا ہے؟...... میرا بیٹا معصوم اور سادہ سا ہے۔ اپنے مقاصد کے لئے اسے استعمال مت کرنا۔ کہیں اس کے ذریعے رقعہ بازی تو نہیں کر رہی ہو کسی سے، اپنی ماں کی طرح؟''

لفظ کبھی اتنے زہریلے بھی ہو سکتے ہیں؟ اریب نے اس سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ لفظ اس طرح بھی جسم و جان میں تیز دھار خنجر کی طرح اُترتے ہیں، اسے اندازہ نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا، جیسے اس کے پورے وجود میں درد و اذیت کی لہریں اُٹھ رہی ہوں۔

مائرہ نے ایک دم ایک قدم آگے بڑھ کر اس کی بند مٹھی کھول دی تھی۔ پسینے میں بھیگے سوسو کے دو نوٹ نیچے گر پڑے۔

مائرہ نے ایک نظر نیچے گرے ہوئے نوٹوں کو دیکھا اور تیز تیز چلتی ہوئی لاؤنج سے باہر نکل گئیں۔ اریب نے امڈ پھیلتے درد کو نظر انداز کرتے ہوئے مائرہ کو بتانا چاہا کہ اس کی اماں ایسی نہیں تھیں اور وہ خوامخواہ اماں پر الزام مت لگائیں، لیکن مائرہ جا چکی تھی اور اریب کی آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔

اس نے منیبہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کا دروازہ بند تھا اور اندر سے عمر احسان کے بولنے کی آواز آ رہی تھی، پتہ نہیں، وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ ایک دم لاؤنج سے نکلی اور پھر اندرونی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر کچھ دیر کھڑے ہو کر اس نے ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کرتے ہوئے سوچا۔

'مجھے یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ مائرہ آنٹی کو میرا یہاں رہنا قطعاً پسند نہیں ہے۔ اور اس کے لئے وہ خوامخواہ اماں کا نام لے کر فضول باتیں کرتی ہیں اور میں...... مجھے یہ سب سننا پڑتا ہے۔ مجھے مروہ پھپھو کو فون کرنا چاہئے کہ میں ہاسٹل جانا چاہتی ہوں۔ مروہ پھپھو ضرور میری بات سمجھ لیں گی۔'

وہ برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کر گیٹ کی طرف بڑھی۔ لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتے مالی کو آواز دی۔

''بابا! گیٹ بند کر لیں۔''

سڑک پار کر کے ایک اسٹور تھا۔ اسٹور والے نے ایک چھوٹا سی پی سی او بھی بنا رکھا تھا، جہاں کالنگ کارڈ کے ذریعے وہ بات کروا دیتا تھا۔

'لیکن پیسے۔' اسٹور کی طرف جاتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ خالی تھے۔ پیسے تو وہاں لاؤنج کے فرش پر گر پڑے تھے۔ بے دھیانی میں وہ خالی ہاتھ نکل آئی تھی۔

'تو کیا میں واپس جا کر پیسے لے آؤں؟' اس نے سوچا۔ لیکن اس وقت واپس جانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے عمر کا سامنا کرنے سے شرمندگی ہو رہی تھی۔

'وہ کیا کہتا ہو گا۔ کیا سوچتا ہو گا۔ میں کیسی لڑکی ہوں۔ اور پھر میری اماں؟......اور کیا پتہ عمر نے اندر منیبہ سے بھی بات کی ہو۔'

اُس کی بلند آواز لاؤنج تک آ تو رہی تھی لیکن اس نے سننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ قریبی پارک کی طرف مڑ گئی۔ حفصہ اور منیبہ کے ساتھ چند بار وہ رات کو اس پارک میں چہل قدمی کے لئے آئی تھی۔

ایبک بہت غور سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے اریب فاطمہ! آپ کچھ پریشان ہیں۔ کیا گھر میں کچھ بات ہوئی؟'' اس نے بے حد نرمی سے پوچھا۔

اریب فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں......نہیں تو۔''

''پھر آپ اتنی اپ سیٹ کیوں لگ رہی ہیں؟ شاید آپ مجھ پر ٹرسٹ نہیں کرنا چاہ رہی ہیں۔ او کے! پھر میں چلتا ہوں۔ الریان میں ہی بات کر لوں گا۔''

''نہیں، نہیں۔'' اس کے لبوں سے ایک دم نکلا۔ ''وہاں الریان میں مائرہ آنٹی بھی ہوں گی۔ آپ یہیں بات کر لیں، جو کہنا ہے۔'' اس نے جیسے فیصلہ کر لیا اور بینچ پر بیٹھ گئی۔

اسے ایبک کے ساتھ جاتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا تو نہ جانے کتنی باتیں بنیں۔ اگر مائرہ آنٹی نے کوئی اُلٹی سیدھی بات، ابا سے کہہ دی تو اسفندیار اور ابا تو اسے زندہ گاڑ دیں گے۔ یہاں اگر کسی نے دیکھ لیا تو وہ کہہ سکتی ہے کہ وہ تو پارک میں اکیلی بیٹھی تھی۔ ایبک وہاں سے گزرا تھا۔ اسے بیٹھے دیکھ کر رک گیا، بس۔

اس نے سوالیہ نظروں سے ایبک کی طرف دیکھا۔ ایبک کھڑا تھا اور اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کہیے! کیا کہنا تھا آپ کو؟''

''مجھے کہنا تو بہت کچھ تھا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن ابھی مختصر بات کرتا ہوں۔ پھر کبھی سہی۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا شاپنگ بیگ بینچ پر رکھا۔

''اریب فاطمہ! یہ......''

''یہ کیا ہے؟''

''کھول کر دیکھیں تو......''

اریب فاطمہ نے شاپنگ بیگ اٹھا لیا۔ اس میں سے چادر نکلی۔ وہ حیرت سے اس چادر کو دیکھ رہی تھی۔ ایبک کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

تین چار گھنٹے مارکیٹ میں گھومنے کے بعد اُسے یہ سیاہ چادر پسند آئی تھی۔ اس پر نفیس کڑھائی تھی اور کڑھائی میں کہیں کہیں شیشے لگے تھے۔ چادر پیک کراتے ہوئے اس نے کوئی دس بار سوچا تھا کہ اریب فاطمہ جب اس چادر کو اوڑھے گی تو اس کے ہالے میں وہ کیسی لگے گی۔

''اُس روز آپ نے اپنی چادر پھاڑ کر رابیل کے زخموں پر پٹی باندھی تھی۔ مارکیٹ میں خریداری کرتے ہوئے اچانک ہی اس چادر پر نظر پڑی تو میں نے اسے خرید لیا۔''

''لیکن میرے پاس اور چادر تھی۔ یہ......'' اس نے خود پر نظر ڈالی۔ اس وقت وہ صرف دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ گو کہ دوپٹہ خاصا بڑا تھا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے گھر سے باہر نکلی تھی۔

''پلیز! اسے قبول کر لیں۔''

''تھینک یو۔'' اریب فاطمہ نے چادر شاپنگ بیگ میں رکھی۔ ''بہت خوب صورت چادر ہے۔'' اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''آپ اوڑھیں گی تو اور خوب صورت ہو جائے گی۔'' ایبک نے زیرلب کہا تھا لیکن اریب فاطمہ نے شاید سن لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم استعجاب نظر آیا اور اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔

''اریب فاطمہ! میں آپ سے لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا۔ میں آپ کے گھر اپنی ماما کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو شریکِ زندگی بنانا چاہتا ہوں اور یہ میرے دل کی شدید خواہش ہے۔ میں نے جب جب آپ کو دیکھا، مجھے لگا کہ آپ......آپ ہی وہ ہستی ہیں، جس کی ہمراہی میں مجھے زندگی کا سفر طے کرنا ہے۔ لیکن میں ماما کو بھیجنے سے پہلے آپ کی رائے لینا چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

لمحہ بھر کے لئے اریب فاطمہ کی آنکھوں میں حیرت اُبھری اور پھر ان میں جیسے ہیرے دمکنے لگے۔ اس کی پلکیں جھک گئیں اور رخساروں پر ہولے ہولے شفق پھیلنے لگی۔ اسے کئی بار لگا تھا کہ ایبک اس کے لئے دل میں کچھ خاص جذبے رکھتا ہے۔

جب اس نے کہا تھا، وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

جب اس نے کہا تھا، اس کے آنسو اس سے سہے نہیں جاتے۔ اس کا رونا اس تکلیف دیتا ہے۔ تب ہر بار اس کے دل نے ایک انوکھی سی خوشی محسوس کی تھی۔ اس کے اندر چراغاں ہوا تھا۔ لیکن پھر خود ہی ان چراغوں کی لو مدھم پڑ گئی تھی۔

''نہیں۔ کہاں ایبک اور کہاں میں۔ شاید اس نے عادتاً ہی یہ کہا ہوگا۔ مخلص اور ہمدرد ہے۔ بس اس لئے۔ ورنہ بقول مرینہ کے اس کے کالج کی آدھی لڑکیاں ایبک پر مرتی ہیں.....اور میں چک نمبر 151 کی ایک دیہاتی لڑکی، جسے مردہ مامی نے اپنی بیٹی بنا رکھا ہے اور جو مردہ مامی کے میکے میں پڑھنے کی غرض سے آئی ہے، بھلا اس کی اہمیت ہی کیا؟

اندر پھول کھلتے اور مرجھا جاتے۔ اور ان مرجھا جانے پھولوں کا دکھ کئی کئی دن تک اسے افسردہ رکھتا۔ وہ ت ایبک کے ساتھ کی خواہش کرنے سے بھی ڈر جاتی تھی۔ اور ایبک کہہ رہا تھا، وہ اسے شریک زندگی بنانا چاہتا ہے۔ عمر بھر کی رفاقت کا خواہش مند ہے۔

''پلیز......'' ایبک فلک شاہ کے اندر بے چینی پھیل گئی۔ ''اریب فاطمہ! آپ کی خواہش میرے لئے بہت محترم ہے۔ اگر آپ......''

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔ ''میں یہیں سے پلٹ جاؤں گا۔ پلیز! آپ کو اعتراض ہے تو......''

''نہیں......'' ایک دم اس کے لبوں سے نکلا اور اس کا سر نفی میں ہل گیا۔

''کیا......آپ کا مطلب ہے، آپ کو میرا ساتھ منظور نہیں؟''

اریب فاطمہ کا سر جھک گیا اور شفق کی سرخی گہری ہو گئی۔

ایبک نے دلچسپی سے اس کی سرخ ہوتی رنگت کو دیکھا۔ جیسے لالے کے پھولوں نے اس کے رخساروں کو چھو لیا ہو۔

''تھینک یو اریب فاطمہ!'' وہ کھڑے کھڑے تھوڑا سا جھکا۔ ''میں آج ہی ماما کو فون کرتا ہوں۔ وہ مردہ آنٹی سے بات کر لیں۔''

''نہیں......پلیز ابھی نہیں۔'' اس نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

مائرہ آنٹی کے لگائے جانے والے الزامات کے خوف سے اس کی رنگت سفید پڑ گئی۔ جیسے کسی نے ایک دم رخساروں کی ساری سرخی چوس لی ہو۔

مائرہ آنٹی نہ جانے کتنی باتیں بنائیں گی۔ وہ ضرور کہیں گی کہ میں نے ایبک کو پھنسا لیا ہے۔

''ابھی کیوں نہیں اریب فاطمہ؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔
اور بے اختیار اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو اریب فاطمہ نے پلکیں جھپک جھپک کر چھپانے کی کوشش کی۔
''ابھی مجھے بی اے کرنا ہے۔''
''تو آپ پڑھتی رہیں، جتنا جی چاہیں۔ ابھی تو صرف.....''
''نہیں۔ ابھی نہیں۔'' اس کا لہجہ حتمی تھا۔ ''جب تک میں یہاں ہوں، تب تک نہیں۔ میرے جانے کے بعد۔''
''اوکے!'' چند لمحے اسے بغور دیکھنے کے بعد ایبک نے کہا۔ ''اگر آپ نے ایسا کہا ہے تو یقیناً کوئی وجہ ہو گی۔ کوئی ٹھوس وجہ۔''
اریب نے سر ہلایا اور اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی۔
''میں آپ کی خواہش کا احترام کرتا ہوں اور آپ سے اس کی وجہ بھی نہیں پوچھتا۔ لیکن پلیز! آپ روئیں تو مت۔ آپ کا ایک آنسو بھی مجھے سارا بھگو دیتا ہے۔ میں گھنٹوں ڈسٹرب رہتا ہوں۔''
اس نے ذرا سا جھک کر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اس کی پلکوں پر اٹکے ہوئے آنسو کو چن لیا۔ اریب کا دل اس زور سے دھڑکا، جیسے ابھی باہر آ جائے گا۔
''مجھ سے وعدہ کریں اریب! کہ آپ آج کے بعد اپنے دکھوں، اپنے آنسوؤں اور اپنی خوشیوں میں مجھے شریک کریں گی۔'' اریب فاطمہ نے سر ہلایا۔
''میں جانتا ہوں، آپ آج بھی یوں ہی بلاوجہ الریان سے باہر نہیں آئی ہیں۔ ضرور کسی نے آپ کا دل دُکھایا ہے۔ شاید بہت زیادہ۔ کاش! میں آپ کے اور آپ کی طرف بڑھنے والے دکھوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا۔''
اریب فاطمہ کا دل جیسے اتنی محبت، اتنے گہرے احساس پر پانی ہو کر بہنے کو بے تاب ہوا۔ اس نے شعوری کوشش سے آنسوؤں کو آنکھوں تک آنے سے روکا۔ وہ اپنے آنسو دکھا کر اس دل کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی جس میں اس کے لئے اتنی قیمتی اور خوب صورت احساسات چھپے ہوئے تھے۔
''اریب فاطمہ! ایک آخری بات۔ آپ وعدہ کریں، آپ کبھی راستہ نہیں بدلیں گی۔ انتظار کے ان سالوں میں کہیں کوئی اور بہتر شخص......''
''نہیں.....'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ بھلا ایبک فلک شاہ سے بہتر بھی کوئی شخص ہو سکتا ہے؟ اور اگر ہو بھی تو اس کا دل تو پہلی بار ایبک فلک شاہ کو ہی دیکھ کر دھڑکا تھا اور دل نے شدت سے اس شخص کی چاہ کی تھی۔ لیکن پھر اپنی کم مائیگی کے احساس سے خود ہی شرمندہ ہو کر اس چاہ کا گلا گھونٹا تھا۔
''پرامس!'' ایبک اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اریب فاطمہ نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔ اس کا ہاتھ ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ ایبک فلک شاہ نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔ ایبک فلک شاہ اپنے بابا فلک مراد شاہ کی طرح محبتوں کے معاملے میں بہت کمزور دل تھا۔ بلکہ شاید اپنے بابا سے بھی زیادہ کمزور۔
''پتہ ہے اریب فاطمہ! ایک روز میں تمہیں کھو دینے کے تجربے سے گزرا اور مجھے لگا، جیسے میرا دل بند ہو جائے گا۔ میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ تب اس روز ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ......''
''پاپ کارن......گرم گرم خستہ۔''
پاپ کارن بیچنے والا لڑکا اپنی چھوٹی سی ریڑھی دھکیلتا قریب آ گیا۔ ریڑھی پر شیشے کے اندر چٹک چٹک کر مکئی کے دانے سفید پھولوں میں بدل رہے تھے۔
''پاپ کارن لو گی؟'' ایبک نے پوچھا۔

سر ہلاتے ہوئے مسکراہٹ اریب فاطمہ کی آنکھوں میں کھلی۔ ایبک مبہوت سا اسے دیکھنے لگا۔ کیا بند ہونٹوں کے ساتھ مسکراہٹ کسی کی آنکھوں میں اتنی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے؟

''ہاں! مجھے اچھے لگتے ہیں۔''

ایبک، لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔ پاپ کارن لے کر جب وہ اریب فاطمہ کی طرف مڑا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اریب فاطمہ نے پاپ کارن کا پیکٹ پکڑتے ہوئے کئی بار کی سوچی ہوئی بات کو سوچا۔

'مسکراہٹ اس کے چہرے پر کتنی سجتی ہے۔'

''کیا خیال ہے، چلیں اب؟''

''ہاں۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوتے بیٹھ گئی۔ ''آپ جائیں، میں تھوڑی دیر تک آتی ہوں۔''

''او کے۔'' وہ اس کی احتیاط سمجھ گیا۔

پارک سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور پیکٹ سے پاپ کارن نکال نکال کر کھا رہی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

گاڑی پارکنگ سے نکالتے ہوئے ایک مرتبہ اس نے سوچا، وہ الریان نہ جائے اور واپس گھر چلا جائے۔ اس وقت آنکھیں بند کر کے وہ صرف اریب فاطمہ کے متعلق سوچنا چاہتا تھا۔ خوشی کے اس احساس کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرنا چاہتا تھا جو اس کے اندر رنگ بکھرا رہی تھی۔ لیکن الریان کے اتنے قریب آ کر بابا جان سے ملے بغیر چلے جانا بھی غلط تھا۔ پھر پتہ نہیں وہاں کتنے دن لگ جائیں۔ اس نے گاڑی الریان کی طرف بڑھا دی اور کچھ دیر بعد ہی وہ الریان میں تھا۔

لاؤنج میں رابیل، صوفے پر بیٹھی تھی اور اس کے پاس احسان شاہ کھڑے تھے۔ شاید وہ اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔

''السلام علیکم!'' اس نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔

احسان شاہ نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ رکے نہیں تھے اور نہ ہی ایبک سے مزید کوئی بات کی تھی۔ غیر ارادی طور پر ایبک نے کندھے اچکائے اور رابیل کی طرف دیکھا۔

''آپ کیسی ہیں؟''

''بالکل ٹھیک۔'' رابیل اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''آج کل کیا ہو رہا ہے؟'' ایبک لاؤنج میں ہی کھڑا تھا۔ اسے ایک دم وہاں سے جانا مناسب نہیں لگا تھا۔ جبکہ رابیل بھی وہاں بیٹھی ہوئی تھی اور پچھلے دنوں وہ جتنی بار بھی آیا تھا، رابیل کا رویہ اس کے ساتھ مناسب ہی رہا تھا۔

''کچھ نہیں۔ بس فارغ ہی ہوتی ہوں۔ پاپا سے جاب کا پوچھا، انہوں نے منع کر دیا۔''

''احسان ماموں اب بالکل ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ کہہ رہے تھے، کل سے آفس جاؤں گا۔''

''لیکن انہیں ابھی کچھ آرام کرنا چاہئے تھا۔''

''ہاں! سب نے منع تو کیا ہے۔ لیکن وہ کہہ رہے تھے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر تو ویسے ہی ڈرا دیتے ہیں۔''

اور ایبک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ مزید اس سے کیا بات کرے۔ رابیل کے ساتھ اس کی بے تکلفی نہ تھی۔ جبکہ حفصہ اور منیبہ یا مرینہ ہوتیں تو وہ گھنٹوں اس سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔

''میں بابا جان سے ملنے آیا تھا۔ دراصل میں ایک دو روز میں واپس بہاول پور جا رہا ہوں۔''

''آپ ہمیشہ بابا جان سے ہی ملنے آتے ہیں؟'' رابیل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ایبک کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے حیرت نمودار ہوئی۔ پھر وہ ہولے سے ہنس دیا۔

''ہاں! اتفاق سے۔ ہومی اور عمر سے تو باہر بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔''
''ہمدان اور عمر کے علاوہ بھی کچھ لوگ الریان میں رہتے ہیں اور انہیں بھی آپ سے ملنے کی چاہ ہوسکتی ہے۔'' آج
بالکل اسے حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔
''مثلاً اور کون؟'' ایبک نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ کو وہ سٹپٹائی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اعتماد سے بولی۔
''مثلاً حفصہ، منیبہ، مرینہ، عمر، زبیر وغیرہ۔''
''چلیں! بابا جان کے ساتھ انہیں بھی شامل کرلیں۔ ایبک فلک شاہ محبتوں کی قدر کرنے والا شخص ہے۔ اور اگر
الریان میں کوئی ہمارا انتظار کرتا ہے اور اسے ہم سے ملنے کی چاہ ہے تو ہم سینکڑوں بار اس کی خاطر الریان میں آسکتے ہیں۔
خواہ کچھ لوگوں کو ہمارا آنا اچھا نہ لگے۔''
اس کے ہونٹوں پر وہی شریر اور دلکش مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔ رابیل کی نظریں ایک دم اس کی طرف اُٹھیں اور پھر
جھک گئیں۔ اس کا دل یک دم بڑے زور سے دھڑکا تھا۔
''میرے خیال میں تو کسی کو بھی آپ کا آنا برا نہیں لگ سکتا۔'' اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے آہستہ سے کہا۔ تب ہی
اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر مائرہ باہر نکلیں۔ ایبک انہیں سلام کر کے عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
''یہ کیا کہہ رہا تھا؟'' انہوں نے رابیل کے قریب آکر پوچھا۔
''بابا جان کا پوچھ رہا تھا۔'' رابیل نے صوفے پر پڑا میگزین اٹھا لیا۔
''اور کیا باتیں کر رہا تھا؟'' انہوں نے متجسس نظروں سے رابیل کو دیکھا۔
''فار گاڈ سیک ماما! میری جاسوسی کرنا چھوڑ دیں۔ مونی کیا کہہ رہی تھی؟ حفصہ سے کیا بات ہو رہی تھی؟ فون پر کس
بات کر رہی تھی؟ کس کا فون تھا؟ مائی گاڈ۔''
اس نے میگزین صوفے پر پٹخا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
مائرہ نے کسی قدر حیرت سے اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ یہ رابیل اتنی چڑچڑی کیوں ہو رہی ہے؟ انہوں نے یہی
تو پوچھا تھا نا کہ ایبک کیا باتیں کر رہا ہے۔ اس میں اتنا غصہ کرنے کی کیا بات تھی؟...... تو ان کا شک صحیح تھا کہ وہ کسی میں
انٹرسٹڈ ہے۔
''نہیں، ایبک۔' انہوں نے خود ہی اپنی بات کی نفی کی۔ 'وہ ایبک کو تو بالکل پسند نہیں کرتی۔ یقیناً کوئی یونیورسٹی فیلو ہو
گا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ہمدان سے شادی کرنے سے کیوں انکار کرتی؟' چند دن پہلے انہوں نے شانی کے کہنے پر اس سے
ہمدان کے متعلق پوچھا تھا تو اس نے صاف منع کر دیا تھا۔
''میں نے ہمدان کے متعلق ایسا کبھی نہیں سوچا مما!''
''تو اب سوچ لو میری جان!...... وہ ایک بہترین لڑکا ہے۔ ایجوکیٹڈ، خوب صورت، دولت مند، شریف۔ اس کے علاوہ
اور کیا چاہیئے ہوتا ہے بھلا؟''
''ٹھیک ہے مما! ہمدان میں کوئی برائی نہیں۔ وہ بہت اچھا ہے۔ لیکن مجھے اس سے شادی نہیں کرنا۔''
اس نے حتمی بات کہی تھی۔ تب کتنی ہی بار انہوں نے چپکے چپکے اس کی باتیں سنی تھیں۔ جب وہ فون کر رہی ہوتی یا
جب کسی کا فون آتا یا حفصہ اور منیبہ سے گفتگو کر رہی ہوتی۔ آج صبح وہ حفصہ کے کمرے میں کسی کام سے گئی تھیں تو یوں
ہی انہوں نے منیبہ سے جو حفصہ کے کمرے میں بیٹھی تھی، پوچھ لیا تھا۔
''رابی اگر ہمدان سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو کیا وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے؟''
''نہیں۔ میرے خیال میں تو نہیں۔ شاید وہ فی الحال شادی ہی نہ کرنا چاہتی ہو۔ ہومی بھی فی الحال شادی نہیں کرنا چاہ

رہا۔'' منیبہ نے انہیں بتایا۔
''کیوں..... کیا وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتا ہے؟''
''نہیں۔ اس نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی یہ کہا ہے کہ وہ رابی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔''
لیکن رابی نے تو صاف منع کر دیا تھا۔ وہ جھنجلائی ہوئی سی نیچے اُتری تھیں اور لاؤنج میں اریب کو عمر سے بات کرتے دیکھ کر خوامخواہ ہی انہیں غصہ آ گیا تھا۔
''اریب کہاں ہے؟'' انہوں نے اسے لاؤنج سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ شاید خود ہی مارکیٹ چلی گئی تھی کتاب خریدنے۔
انہوں نے کندھے اچکائے اور صوفے پر بیٹھ گئیں۔ احسان شاہ کمرے میں آئے تو انہوں نے بتایا تھا کہ ایبک آیا ہے اور اتنی دیر سے وہ کھڑا رابیل کا منہ تو نہیں تک رہا ہوگا۔
''اپنے باپ کی طرح جادوگر ہے۔ کہیں میری رابی کو ورغلا ہی نہ لے۔''
وہ پریشان سی بیٹھی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جادو کی کیسی چھڑی گھمائیں کہ رابیل اور ہمدان کا بیاہ ہو جائے۔
وہ جب بیاہ کر الریان آئی تھیں تو ہمدان چھوٹا سا تھا اور انہیں بہت پیارا لگتا تھا۔ تب ہی ایک بار انہوں نے ثنا سے کہا تھا۔
''ثنا بھابی! اسے تو میں اپنا داماد بناؤں گی۔ دعا کریں اللہ مجھے ایک بیٹی ضرور دے۔''
رابی شادی کے تین، چار سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ لیکن مائرہ کو اپنی کہی ہوئی بات یاد تھی اور انہوں نے ضد کی تھی کہ رابیل اور ہمدان کی منگنی کر دی جائے۔ لیکن بابا جان، مصطفیٰ، احسان سب ہی اتنی کم عمری میں منگنی کے بے حد خلاف تھے۔
''بڑے ہو کر بچوں کا رجحان جانے کیا ہو۔ اس لئے کم عمری میں انہیں پابند کرنا مناسب نہیں ہے۔''
'اگر رابی کسی کو پسند نہیں کرتی تو پھر احسان سے کہوں گی، اسے سمجھائیں۔ وہ احسان شاہ کی تو کوئی بات نہیں ٹالتی۔ اُمید ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔' انہوں نے خود کو تسلی دی۔
تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھول کر اریب فاطمہ اندر داخل ہوئی۔ وہ بے حد مطمئن سی ایک شاپنگ بیگ اٹھائے اندر آئی تھی۔ انہوں نے کسی قدر حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر عجیب الوہی سی چمک تھی۔ اریب فاطمہ انہیں لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر ایک لمحہ کو ٹھٹکی۔ پھر سر جھکائے منیبہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
'کہیں یہ باہر ہمدان سے تو مل کر نہیں آ رہی؟' ایک لمحہ کو انہیں گمان گزرا۔
'یہ آنکھوں کی چمک، یہ چہرے پہ کھلتی بہار بلاوجہ تو نہیں ہو سکتی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو......'
تب ہی سیڑھیوں سے نیچے اُترتے ہمدان کو دیکھ کر انہوں نے ایک گہری سانس لی۔
'آخر کیا کمی ہے ہمدان میں؟'
کمی تو احسان شاہ میں بھی کوئی نہ تھی۔ پھر دل کیوں فلک شاہ کے لئے ہمکتا تھا؟ احسان شاہ کی زندگی میں شامل ہو کر بھی ٹھکرائے جانے کا دکھ روح میں کسی کانٹے کی طرح کھبا ہوا تھا، جو گوشت میں بہت نیچے اُتر جائے اور ہمیشہ کسک دیتا رہے۔ مائرہ کو پھر یقین ہونے لگا کہ ضرور رابیل کے دل نے کسی اور کو پسند کر لیا ہے۔ اور وہ کوئی اور کون ہے؟ اس کا کھوج انہیں لگانا تھا۔ لیکن رابیل تو ذرا سے سوالوں پر بھڑک اُٹھتی تھی۔
''ایبک کہاں ہے؟'' ہمدان نے اس کے قریب آ کر پوچھا تو مائرہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
''کیا مطلب؟...... مجھے کیا پتہ، ایبک کہاں ہے اس وقت؟''

''سوری آنٹی! دراصل میں نے ابھی ایبک کو فون کیا تو اس نے بتایا، وہ تو الریان میں ہی ہے۔''

''تو بابا جان کے پاس ہو گا پھر۔'' لاپروائی سے کہتے ہوئے مائرہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ ہمدان، بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھا۔

بابا جان بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ہولے ہولے ایبک سے جانے کیا کہہ رہے تھے۔ ایبک کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''کمال کرتے ہو یار! کم از کم تم مجھے اطلاع تو کر دیتے کہ آئے ہوئے ہو۔'' بابا جان کو سلام کر کے ان کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ہمدان نے شکوہ کیا۔

''مجھے آئے ہوئے کچھ بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''

''اور یہ چپکے چپکے کیا باتیں ہو رہی تیں؟'' ہمدان نے باری باری دونوں کو دیکھا۔ ''کہیں تم بھی بابا جان کو اغوا کرنے کا پروگرام نہیں بنا رہے؟''

''میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ انہیں ساتھ ہی لے جاؤں۔ لیکن بابا جان ہی رضامند نہیں ہو رہے۔''

''ایبک! تمہاری بات ہوئی گھر میں؟...... مومی اور عمارہ کب آ رہے ہیں؟'' عبدالرحمٰن شاہ کے لہجے سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔

''بابا نے تو مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔'' ایبک نے حیران ہو کر کہا۔

''اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ عادل اور حفصہ کی منگنی اور نکاح کے فنکشن میں آئے گا۔''

''ہاں! لیکن ابھی تک تو پتہ نہیں۔ کب ہو رہا ہے فنکشن؟''

''عثمان کا فون آیا تھا۔ اس کی چھٹی منظور ہو گئی ہے۔ ایک ہفتے تک آ رہا ہے۔ اور اس نے شادی کے لئے کہہ دیا ہے۔ مصطفیٰ اور ثنا سے بات ہو گئی ہے اس کی۔'' بابا جان نے بتایا۔

''یعنی اب شادی ہو گی ڈائریکٹ۔'' منیبہ نے کہا اور حفصہ کو خبر دینے کے لئے باہر بھاگی اور اندر آتی مرینہ سے ٹکرا گئی، جو کندھے پر شولڈر بیگ ڈالے کہیں جانے کے لئے تیار تھی۔

''اور یہ عادل کتنا گھنا ہے۔ اس نے ہوا تک نہیں لگنے دی کہ اندر ہی اندر یہ منصوبہ بنا رہا ہے۔'' ہمدان نے تبصرہ کیا۔

''یہ دراصل میری خواہش تھی۔'' عبدالرحمٰن شاہ نے وضاحت کی۔ ''میں نے عثمان اور مصطفیٰ سے کہا تھا۔ کیا پتہ کب بلاوا آ جائے تو......''

''ارے نہیں بابا جان! آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔'' عمر فوراً بولا۔ عمر کی طرف دیکھتے ہوئے مرینہ کی نظر پہلی بار ایبک پر پڑی تھی۔

''ارے ایبک بھائی! آپ...... مجھے آپ کا کتنا انتظار رہتا ہے۔ اور جب آپ آتے ہیں تو یا تو مجھے پتہ ہی نہیں چلتا اور اگر پتہ چل بھی جائے تو آپ کو جانا ہوتا ہے یا مجھے کوئی کام ہوتا ہے۔ مجھے آپ سے اپنی ایک فرینڈ کا مسئلہ ڈسکس کرنا تھا اور مجھے اس کے لئے مشورہ بھی چاہئے تھا۔ دراصل وہ بھی ایک چھوٹی موٹی کہانی نگار ہے اور اسے......''

''فار گاڈ سیک رینا آپی! کبھی اپنی گفتگو میں کومے اور فل اسٹاپ بھی لگا لیا کریں۔ یقیناً پنکچویشن کا کونچن تو آپ غلط ہی کرتی ہوں گی سکول میں۔''

وہ حسب معمول تیزی سے بول رہی تھی کہ عمر نے اسے ٹوک دیا۔ اس نے ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالی۔

''ویسے آپ کہاں جا رہی ہیں اس وقت؟'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، عمر نے پوچھ لیا۔

اس نے اپنے کندھے پر لٹکے بیگ کو درست کیا اور عبدالرحمٰن شاہ کی طرف دیکھا۔

''بابا جان! مجھے سمیرا کی طرف جانا ہے، اس کے ہاسٹل۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔ صبح میں نے کہا بھی تھا کہ میرے

ساتھ چلو، لیکن اس نے منع کر دیا۔ اب اس کی روم میٹ بھی چلی گئی ہے اور اسے ٹمپریچر ہے۔ میں نے ابھی فون کیا تو پتہ چلا کہ اس کا بخار تیز ہو گیا ہے۔ اس وقت یاسین گھر پر نہیں ہے بابا جان! آپ عمر سے کہیں مجھے چھوڑ آئے۔'' وہ بغیر رُکے بولے جا رہی تھی۔

''میں چھوڑ آتا ہوں۔'' ہمدان ایک دم کھڑا ہو گیا تو ایبک کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بابا جان! میں شام تک رہوں گی اس کے پاس۔ اریب فاطمہ کو بھی ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ شام کو یاسین کو بھیج دیجئے گا، ہمیں لے آئے گا۔''

''تو بیٹا! آپ سمیرا کو گھر لے آئیں۔ زیادہ طبیعت خراب ہو تو کسی ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔ رات کو اس کی طبیعت زیادہ بھی خراب ہو سکتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بابا جان! لیکن پتہ نہیں، وہ آئے گی بھی یا نہیں۔ وہ تو بس ایک ہی ٹریک پر ناک کی سیدھ میں چل رہی ہے۔ وہ کہتی ہے، اس کے ابو نے کہا تھا اسے، ہمیشہ سیدھا چلنا ہے۔ اِدھر اُدھر نہیں دیکھنا۔ تو......''

''لیکن کبھی کبھی سیدھا چلتے چلتے آگے سے راستہ بند بھی ملتا ہے۔ تو پھر تھوڑا سا مڑنا پڑتا ہے۔ اسے سمجھانا۔'' ہمدان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو مرینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں۔ لیکن وہ کہتی ہے، نہ اسے اِدھر اُدھر دیکھنا ہے، نہ کہیں ٹھہرنا اور رُکنا ہے۔'' اپنی عینک درست کرتے ہوئے اس نے سب کی طرف دیکھا، جو بہت خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔ اسے لگا، جیسے اس نے کہیں کچھ غلط تو نہیں کہہ دیا۔ گھبرا کر اس نے سب کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے بابا جان! میں چلتی ہوں۔''

''اللہ حافظ بیٹا!'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی تو ایبک بھی کھڑا ہو گیا۔

''بابا جان! میں بھی چلوں گا اب۔ ایک دو کام تھے۔'' وہ عبدالرحمٰن شاہ کے سامنے جھکا تو انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔

''بیٹا! اب کے آنا تو میرے بچوں کو بھی ساتھ لے کر آنا۔ اتنے سے دنوں میں ہی اُداس ہو گیا ہوں۔ اتنے سالوں کی پیاس اتنی جلدی تو نہیں بجھتی۔''

عمر نے ہمیشہ کی طرح اس کے جلدی چلے جانے پر احتجاج کیا اور ہمیشہ کی طرح اس نے پھر جلدی آنے کا وعدہ کیا اور تیزی سے ہمدان کے پیچھے لپکا۔

''سنو ہومی! میں بھی جا رہا ہوں۔ راستے میں انہیں ڈراپ کرتا جاؤں گا۔''

اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ ہمدان نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا، وہ اس کی شرارت کو سمجھ گیا تھا۔

''مجھے بھی کام سے جانا تھا۔''

''بہت کٹھن منزل ہے بھائی! وہ ناک کی سیدھ میں چل رہی ہے اور تم سائیڈ پر کھڑے ہو۔ نظر نہیں آؤ گے۔''

''تو میں سائیڈ سے ہٹ کر سامنے جا کھڑا ہوں گا۔ بے فکر رہو۔'' ہمدان کی آنکھیں اور لہجہ پُر یقین تھا۔ تب ہی اریب فاطمہ، منیبہ کے کمرے سے باہر نکلی۔ وہ نگاہیں جھکائے بیگ کی زپ بند کر رہی تھی۔ اس نے وہی سیاہ چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ سیاہ چادر پر لگے ننھے ننھے شیشے دمک رہے تھے اور اس سیاہ چادر کے ہالے میں لپٹا اس کا چہرہ آج ہمیشہ سے کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔

''تھینک یو۔'' قریب آنے پر ایبک نے دھیرے سے کہا۔ اریب فاطمہ نے نظریں اٹھائیں اور اس کے رخساروں پر شفق اُتر آئی۔

مرینہ، ہمدان کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی جا رہی تھی اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے اس کے پیچھے تھے۔ فرسٹ فلور کی

پہلی سیڑھی پر کھڑی ہوئی رابیل نے ریلنگ پر ہاتھ رکھے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور پتہ نہیں کیوں اسے لگا، جیسے اس کا دل ڈوب گیا ہو۔ جیسے کسی نے اس کی قیمتی چیز چھین لی ہو۔

وہ عجیب سے احساسات میں گھری کھڑی تھی جب عمر، بابا جان کے کمرے سے باہر نکلا اور رابیل کو کھڑے دیکھ کر دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اس کے قریب آیا۔

''ایبک بھائی آئے ہوئے تھے۔ بابا جان کے کمرے میں تھے۔'' خوشی اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔ وہ ایبک کے آنے پر ہمیشہ ایسے ہی خوش ہوتا تھا۔

''مجھے پتہ ہے۔'' رابیل نے پلکیں اُٹھائیں۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن اندر کہیں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔

''تو آپ نیچے کیوں نہیں آئیں اُن سے ملنے؟ اب تو آپ کو ان سے خفا نہیں رہنا چاہئے۔ انہوں نے آپ کو خون بھی دیا ہے۔''

''یہ بات تم مجھے ایک ہزار ایک سو بارہ مرتبہ بتا چکے ہو عمر! اس نے مجھے خون دیا ہے...... تو میں کیا کروں؟ کیسے چکاؤں اُس کے اس احسان کا بدلہ؟'' اس کی آواز ایک دم بلند ہوئی تھی۔ اپنے کمرے سے باہر آتے عبدالرحمٰن شاہ ٹھٹک کر وہیں رک گئے۔

''اگر ممکن ہوتا تو میں اس کا یہ ایک بوتل خون اپنے جسم سے نکال کر اس کے منہ پر مارتی۔ کیا سارے بلڈ بینک دیوالیہ ہو گئے تھے کہ میرے لئے اس سے خون کی بھیک مانگنی پڑی تمہیں؟ آئندہ مجھے مت بتانا۔ سمجھے؟'' اس نے ریلنگ سے اپنا ہاتھ اٹھا کر انگلی کے اشارے سے گویا اسے تنبیہ کی اور ایک دم تیزی سے مڑ گئی۔

عمر سیڑھیوں پر کھڑا ہکا بکا اُسے جاتے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے رابیل کا یہ انداز پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

'شاید غلطی میری ہی ہے۔ مجھے اس طرح بار بار رابیل آپی سے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا' اس نے ہمیشہ کی طرح خود کو ہی مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ لیکن وہ بھی کیا کرتا؟ اُسے پاپک فلک شاہ کی ہر اچھی بات کو دہرانے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اس نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا اور سر جھکائے لاؤنج میں سے ہوتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور نیچے والے لاؤنج میں عبدالرحمٰن شاہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔

یہ مائرہ نے کیا، کیا؟...... اپنے دل میں عمارہ اور مومی کے لئے موجود نفرت، رابیل کے دل میں بھر دی۔ جبکہ وہ تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے۔ جب سے منیبہ نے انہیں بتایا تھا کہ رابی، ہمدان سے شادی نہیں کرنا چاہتی اور ہمدان بھی اس میں انٹرسٹڈ نہیں ہے تو رہ رہ کر انہیں ایبک کا خیال آتا تھا۔ مگر رابیل اپنے دل میں اس کے لئے اتنی نفرت رکھتی تھی۔ یہ دل پتہ نہیں اتنا خوش گمان کیوں ہوتا ہے۔ یہ تو احسان شاہ سے بھی اُمید لگا بیٹھے تھے کہ ایک روز اس کا دل ممی کی طرف سے بالکل صاف ہو جائے گا۔

اس روز جب احسان شاہ نے ہسپتال میں طویل بے ہوشی کے بعد آنکھیں کھولی تھیں تو وہ احسان شاہ کا ہاتھ، ہاتھوں میں لیتے ہوئے رو پڑے تھے۔

''یہ کیا کر لیا تم نے خود کو؟...... ایسا مت کرو احسان شاہ! میں تمہارا دکھ برداشت نہیں کر پاؤں گا۔''

احسان شاہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''میں عمو سے نہیں ملوں گا۔ نہیں جاؤں گا اس کے گھر۔ تم ناراض مت ہو شانی!'' آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ ''میں یہ سوچ کر دل کو خوش کر لوں گا کہ میری عمو زندہ ہے، انہی فضاؤں میں سانس لے رہی ہے۔ آخر چھبیس سال سے اسے دیکھے بغیر زندہ ہی ہوں پھر بھی...... مجھے معاف کر دو شانی! تم بھی باپ ہو۔ باپ کے دل کی......''

''بابا جان!'' احسان شاہ نے تڑپ کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ ''میں ناراض نہیں ہوں آپ سے۔ کسی سے بھی نہیں۔

آپ نے صحیح کہا تھا بابا جان! عمو بھی آپ کی ایسی ہی بیٹی ہے، جیسی میری بیٹی رابی ہے۔ میں نے ان چند گھنٹوں میں جو میں نے ایئر پورٹ پر گزارے، اس اذیت کو محسوس کر لیا، جو آپ اتنے سالوں سے برداشت کر رہے ہیں۔ آپ مجھے معاف کر دیجئے بابا جان!''

انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور عبدالرحمٰن شاہ نے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے چوم لیا تھا۔

''میں نے اپنی قسم توڑ دی۔ میں اس کا کفارہ ادا کر دوں گا۔ میں کسی کو عمارہ یا اس کے میاں سے ملنے سے نہیں روکوں گا۔ لیکن بابا جان! پلیز۔ آپ مجھے مجبور مت کیجئے گا۔''

اور اس روز ہسپتال کے اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے عبدالرحمٰن شاہ کو لگا تھا، جیسے ان کے دل پر جو ایک بوجھ سا دھرا تھا، وہ ہٹ گیا ہے اور اس روز وہ دل میں اُمیدوں کے پودے بھی اُگا بیٹھے تھے، جن پر نت نئے رنگوں کے پھول کھلتے تھے۔ لیکن آج جیسے ان پھولوں کے رنگ مدھم پڑ گئے تھے۔

مائرہ نے اتنی نفرت بھر دی ہے رابی کے دل میں۔ وہ جو سمجھتے تھے کہ کسی روز جب احسان شاہ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو وہ اسے پاس بٹھا کر ہولے ہولے سب کہہ دیں گے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ شاید وہ یقین نہ کرے۔ شاید یہ سب مومی کی من گھڑت کہانی سمجھے۔

اور اگر اس نے یقین کر لیا تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ مائرہ اس کی بیوی تھی۔ کوئی غیر نہیں کہ وہ آرام و سکون سے سب سنتا اور برداشت کر لیتا۔

بچے......وہ کیا سوچتے؟ اور پھر اب وہ دل کا مریض تھا۔

سو وہ چپ تھے۔ فی الحال انہوں نے دل کو صرف اتنی سی بات پر ہی راضی کر لیا تھا کہ اسے اب ان کے عمارہ وغیرہ سے ملنے پر اعتراض نہیں تھا۔ شاید کچھ ایسا ہو جائے خود ہی کہ شانی کی غلط فہمی دور ہو جائے اور مومی اس احساسِ جرم سے نجات پا لے جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے اس کی بے چینی اور تڑپ دیکھی تھی۔

''بابا جان! اب تو بس ایک ہی خواہش ہے کہ جب میں مروں تو مجھے رونے والوں میں شانی بھی ہو۔ جب آخری بار میں کسی کو دیکھوں تو وہ شانی ہو اور اس کی آنکھوں میں میرے لئے وہ بدگمانی نہ ہو، وہ نفرت نہ ہو جو اس رات میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ اور جب میری آنکھیں بند ہو جائیں ہمیشہ کے لئے تو سب سے زیادہ مجھے وہ روئے۔ پتہ نہیں، شاید میں اسی لئے اب تک زندہ ہوں۔ ورنہ اس رات وہ تو اپنی دانست میں مجھے مار کر پھینک گئے تھے۔''

''بابا جان! آپ تیار ہیں؟'' انہوں نے چونک کر دیکھا۔ مصطفیٰ شاہ جانے کب لاؤنج میں آئے تھے اور ان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

''ہاں میں تیار ہوں۔ کب چلنا ہے؟''

''بس چلتے ہیں۔ ایک فون کرنا تھا مجھے فرنیچر والے کو۔'' وہ عبدالرحمٰن شاہ کو بتا کر فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئے۔ تب ہی احسان شاہ اپنے کمرے سے نکلے اور عبدالرحمٰن شاہ کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

''کیسے ہو بیٹا؟''

''ٹھیک ہوں بابا جان! آپ کہیں جا رہے ہیں کیا؟'' انہوں نے ان کی اسٹک دیکھ کر پوچھا۔ گھر میں وہ اسٹک استعمال نہیں کرتے تھے۔

''بس یہ مصطفیٰ کے ساتھ ملک ہاؤس تک جا رہا ہوں۔ مصطفیٰ کہہ رہا تھا کہ رنگ و روغن ہو گیا ہے۔ گھر فرنشڈ بھی کروا دیا ہے اس نے۔ کہہ رہا تھا، میں بھی دیکھ لوں، کوئی کمی بیشی ہو تو۔ ہفتے بعد عثمان اور بہو بھی آ رہے ہیں۔ عمارہ سے بھی کہوں گا، وہ بھی آ جائے۔''

انہوں نے دانستہ فلک شاہ کا نام نہیں لیا تھا۔ احسان شاہ خاموش رہے۔ لیکن عبدالرحمٰن شاہ کو لگا جیسے وہ کچھ کہنا

چاہتے ہیں۔
''کیا بات ہے شانی بیٹا! کچھ کہنا ہے؟''
''وہ بابا جان......!'' وہ جیسے جھجک کر پھر خاموش ہو گئے۔تب ہی مصطفیٰ نے ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے عبدالرحمٰن شاہ کی طرف دیکھا۔
''چلیں بابا جان!''
عبدالرحمٰن شاہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور پھر ایک قدم چلنے کے بعد مڑ کر احسان شاہ کو دیکھا۔
''تم بھی چلو گے بیٹا؟''
احسان شاہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''بابا جان! میں نے سوچا ہے کہ دونوں گھروں کے درمیان ایک چھوٹا دروازہ کھلوا دیتے ہیں۔ اِدھر اُدھر آنے جانے میں آسانی رہے گی۔'' مصطفیٰ شاہ نے قریب آ کر کہا۔
''ہاں۔ یہ اچھا سوچا ہے تم نے۔'' عبدالرحمٰن شاہ خوش ہو گئے۔''لان کی دیوار میں سے دروازہ رکھوا دو۔ اور ہاں! تم نے وہ فرش برابر کروا دیا۔ مومی کو آسانی رہے گی۔''
''جی بابا جان!'' وہ لاؤنج کے دروازے تک پہنچے ہی تھے کہ احسان شاہ نے انہیں آواز دی۔
''بابا جان! پلیز ایک منٹ، میری بات سن لیں۔''
انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ احسان شاہ مضطرب سے اپنی انگلیاں مروڑ رہے تھے۔ مصطفیٰ شاہ لاؤنج سے نکل گئے تھے اور عبدالرحمٰن شاہ کا دل انجانے اندیشوں سے لرزنے لگا۔ وہ جسم کا پورا زور اپنی اسٹک پر ڈالتے ہوئے واپس مڑے اور سوالیہ نظروں سے احسان شاہ کو دیکھنے لگے۔

❁○❁

''میں نے بکنگ کروا دی ہے۔ سنڈے چار بجے شام کی فلائٹ ہے۔'' ایبک نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بتایا تو عمارہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔ فلک شاہ بیڈ پر نیم دراز تھے اور عمارہ وارڈ روب کھولے کھڑی تھیں۔ ایبک، فلک شاہ کے بیڈ پر ہی بیٹھ گیا تھا۔
'دبابا! پہلے انکل شیر دل کے گھر جائیں گے اور پھر بعد میں بابا جان کی طرف چلیں گے۔ انہوں نے ملک ہاؤس خرید کر فرنشڈ کروا دیا ہے۔ ویسے انکل شیر دل بہت ایکسائٹڈ ہو رہے ہیں آپ کے آنے کا سن کر۔''
''ہاں۔ شیر دل بہت اچھا انسان ہے۔ میرا محسن ہے وہ۔ ہمیشہ اس کی عزت کرنا میرے بعد بھی۔ میں نہ رہوں، تب بھی اگر شیر دل کو......''
''مومو پلیز! امت کیا کریں ایسی باتیں۔'' عمارہ نے یک دم کہا اور پھر ایبک کی طرف دیکھا۔
''ایبک! دیکھو اپنے بابا کو سمجھاؤ۔ یہ بہت قنوطی ہو رہے ہیں۔ اور پچھلے دو ہفتوں سے ایسی ہی باتیں کر رہے ہیں۔ جب سے لاہور جانے کا پروگرام بنا ہے، تب سے جانے انہیں کیا ہو گیا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے ہم لاہور نہ جائیں۔''
ایبک نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ عمارہ ناراضی سے فلک شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔
''سوری عمو! اس عمر میں بندہ ایسا ہی ہو جاتا ہے، قنوطی۔'' فلک شاہ نے معذرت طلب نظروں سے عمارہ کی طرف دیکھا۔''اور ویسے بھی اب ہماری عمر جانے کی تو ہے۔ بہت جی لئے۔'' اور عمارہ احتجاجاً باہر نکل گئیں۔
''تمہاری ماما ناراض ہو گئیں ایبک!'' وہ ذرا سا مسکرائے۔ ایبک نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
''کیا آپ کو کوئی بات پریشان کر رہی ہے؟''
''نہیں۔'' فلک شاہ نے نظریں چرائیں۔ انہوں نے مائرہ سے تو کہہ دیا تھا کہ وہ جو جی چاہے کر لے، انہیں پروا نہیں

ہے۔لیکن شدید کوشش کے باوجود وہ اس کی باتوں کو اپنے ذہن سے نکال نہیں سکے تھے۔ وہ شاید اندر سے کمزور ہو چکے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں مدتوں بعد جڑنے والے رشتے پھر نہ ٹوٹ جائیں۔ مائرہ نے دوبارہ فون کر کے تنبیہ کی تھی۔

''مومی شاہ! اسے محض دھمکی مت سمجھنا۔ میں اور احسان زندگی میں دوبارہ تمہیں دیکھنا نہیں چاہتے۔ بابا جان تم سے اور عمارہ سے ملنے بہاول پور چلے گئے۔ مصطفیٰ سے بھی مل لئے، تم اسے ہی غنیمت سمجھو اور زیادہ پیر مت پھیلانا۔ نفرت ہے ہمیں تم سے اور تمہارے خاندان سے۔ ہم تمہیں دیکھنے یا تم سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتے۔''

''ٹھیک ہے مائرہ شاہ! مجھے بھی کبھی تمہیں دیکھنے کی خواہش نہ تھی۔ سو تم خود مت آنا میرے سامنے۔'' انہوں نے بے حد پُرسکون انداز میں بات کی تھی۔ لیکن بعد میں بے سکون ہو گئے تھے۔

''بابا!...... کوئی بات تو ہے۔ میں بھی ایک ہفتے سے آپ کو اُلجھا ہوا اور پریشان دیکھ رہا ہوں۔''

فلک شاہ نے نظریں اٹھائیں اور کچھ دیر ایبک فلک شاہ کو دیکھتے رہے اور پھر ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ اب ایبک سے کیا چھپا ہوا ہے۔ عمارہ، ایبک سب نے ہی تو جان لیا تھا۔ ایبک سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے مختصرہ ایبک کو مائرہ کے فون کے متعلق بتا دیا۔ ایبک کو حیرت ہوئی۔

''بعض لوگ بڑے منتقم مزاج ہوتے ہیں آبی! اور مائرہ بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔ میں اپنے لئے، تمہارے اور عمارہ کے لئے ڈرتا ہوں۔ میرے دل میں کئی طرح کے خوف ہیں۔ عمارہ اپ سیٹ ہو گئی تو؟...... انجی وہاں جا کر ڈس ہارٹ ہوئی تو؟...... وہ کتنے شوق سے تیاری کر رہی ہے وہاں جانے کی۔ وہ پہلی بار اپنے ننھیالی رشتے داروں کو دیکھے گی۔ نہیں ایبک! ایسا کرو سیٹیں کینسل کروا دو۔ ہم نہیں جائیں گے۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بابا؟...... وہاں سب اتنے شوق سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ عثان انکل بھی کل پہنچ گئے ہوں گے۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں بابا! میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔''

فلک شاہ مسکرائے۔

''او کے یار! نہیں ہوتا پریشان۔ یہ بتاؤ، یہ تمہاری ماما کیا کہہ رہی تھیں، کوئی لڑکی پسند کر بیٹھے ہو۔''

''جی بابا! ایک لڑکی ہے۔''

''اچھا...... لاہور تو جا ہی رہے ہیں۔ کیوں نہ عادل کے ساتھ ساتھ تمہاری بھی شادی سے نمٹ لیں۔ زندگی میں تمہاری بھی خوشی دیکھ لیں۔''

''ابھی نہیں بابا! ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔''

''اوہ یار! وہ ہے کون؟'' فلک شاہ کا ذہن ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

''اریب فاطمہ...... اریب فاطمہ نام ہے اس کا۔ مروہ آنٹی کی سسرالی عزیز ہے۔ الریان میں پڑھنے کی غرض سے ٹھہری ہوئی ہے۔''

''اوہ...... یہ تم سے بھی مروہ پھپھو کے سسرالی عزیز آ ٹکرائے۔'' ان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''بابا جان! وہ بہت مختلف ہے۔ مائرہ آنٹی جیسی نہیں ہے۔''

''مجھے یقین ہے۔'' فلک شاہ سنجیدہ ہوئے۔ ''تمہاری پسند کبھی مائرہ جیسی لڑکی نہیں ہو سکتی۔''

ایبک مڑ کر عمارہ کو دیکھنے لگا، جو ٹرے میں جوس کے گلاس لئے اندر آ رہی تھیں۔ ایبک نے اٹھ کر ٹرے ان سے لے لی اور ٹیبل پر رکھی اور پھر فلک شاہ کو ایک گلاس پکڑایا۔ عمارہ بھی بیٹھ گئی تھیں۔

''فریش جوس نکلوایا ہے۔ صبح وقار خان مالٹوں کا ٹوکرا دے گیا تھا۔ اور ایبک! تم اتنے کمزور لگ رہے ہو۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔'' ایبک سے گلاس لیتے ہوئے انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

''یہ حلقے تو نیند کی کمی کی وجہ سے ہیں۔'' ایبک اپنا گلاس اٹھا کر پھر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''نیند کی کمی کیوں؟'' عمارہ نے پوچھا۔
''بس دیر تک لکھتا رہتا ہوں۔ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔''
''شیر دل کہہ رہا تھا کہ تم آج کل بہت سخت لکھ رہے ہو۔ بیٹا! قلم سنبھال کر لکھو۔ بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ تم ہمارا واحد سرمایہ ہو۔''
''بابا! کیسے روکتا ہوں خود کو، آپ نہیں جانتے۔ کتنا ضبط کرتا ہوں۔ لکھ کر کاٹتا ہوں۔ صرف آپ کے خیال سے..... ماما سے کے ساتھ کئے گئے وعدے کی وجہ سے۔ ورنہ بہت دل چاہتا ہے کہ کھل کر لکھوں، بہت سارا لکھوں۔ پچھلے سال جب ڈاکٹر قدیر خان کو ٹی وی پر لایا گیا تھا اور ان سے وہ سب کہلوایا گیا تھا تو میرا دل خون کے آنسو رویا تھا۔ لیکن میں وہ نہیں لکھ سکا جو لکھنا چاہتا تھا۔ میرا قلم اس رات لہو رویا تھا۔ ہم نے اپنے محسن کے ساتھ جو کچھ کیا بابا!..... کیا قومیں اپنے محسنوں سے ایسا ہی کرتی ہیں؟..... وہ فروری 2004ء تھا اور آج 2005ء ہے۔ تب سے لے کر اب تک میں خود سے نظر نہیں ملا پایا۔'' وہ ایک دم جذباتی ہو گیا تھا۔
''میں قلم کی حرمت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ میں آج ایک سال بعد بھی رات کو بستر پر لیٹتا ہوں تو شرمندہ ہوتا ہوں۔ نہ میں نے کچھ لکھا، نہ میں کسی ریلی کا حصہ بنا۔ بابا! میں تو بہت کمزور انسان ہوں۔ جون 2004ء میں ڈرون حملے شروع ہوئے۔ میں نے ان کے خلاف دو تین پھسپھسے اور بودے لفظ لکھ دیئے ہیں۔ یہ میرا ملک ہے بابا!..... لیکن میں اس کے لئے کچھ کر نہیں سکتا۔ چند لوگوں نے اسے یرغمال بنا رکھا ہے۔''
فلک شاہ نے اس کا بازو تھپتھپایا۔
''آپ کا دل بھی تو دُکھتا تھا اس ملک کے لئے۔ جب یہ دولخت ہوا تو آپ بھی سڑکوں پر نکلے تھے نا۔ آپ بھی تو ملک کی تقدیر بدلنا چاہتے تھے۔''
''ہاں..... لیکن کچھ نہ کر سکے۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''مجھے ہمیشہ کے لئے معذوری مل گئی۔ حق نواز جان سے گیا اور اس جیسے کتنے تھے، جنہوں نے ملک کی تقدیر بدلنے کی کوشش کی اور جانیں گنوائیں۔ اب وہ لوگ نہیں رہے، ایبک شاہ!..... مخلص، محبِ وطن..... قائداعظم، لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین اور عبدالرّب نشتر جیسے لوگ نہیں رہے۔ اب تو لالچی، بھوکے انسان ہیں۔ جو دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہے ہیں اس ملک کو۔ ایک ہمارے سیاست دان ٹھیک ہو جائیں تو شاید سب ٹھیک ہو جائے۔''
''صرف ہمارے سیاست دان نہیں بابا!..... ہم خود بھی ٹھیک نہیں ہیں۔'' ایبک نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''ہم ٹھیک ہو جائیں تو ہمارا سیاست دان بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکوؤں کا سردار ڈاکو ہوتا ہے۔ چوروں کا چور ہوتا ہے۔ پرہیز گار لوگوں کا سردار کوئی پرہیز گار شخص ہی ہوتا ہے۔ تو ہمارے سردار بھی ہمارے جیسے ہی ہیں اور ہم خود کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں، دوسرے بدل جائیں۔ ہم ایسے ہی رہیں گے، جیسے ہیں۔''
''ارے!'' فلک شاہ کی نظر سامنے کلاک پر پڑی تھی۔ ''میرا تو پروگرام شروع ہو چکا ہو گا۔ میں اسے کبھی مِس نہیں کرتا۔ ٹی وی تو لگانا۔''
''کون سا پروگرام بابا؟''
''احمد حسن کا ''کڑوا سچ''..... ایک نیا چینل لانچ کیا ہے کسی نے ''سیمل'' وہاں آتا ہے یہ پروگرام۔''
عمارہ نے ٹی وی آن کر دیا تھا۔
''رات کے کھانے کے لئے کیا بنواؤں؟'' باہر جاتے جاتے انہوں نے مڑ کر پوچھا۔
''کچھ بھی بنوا لیں ماما!'' ایبک، ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹی وی پر احمد حسن اپنے کچھ مہمانوں کا تعارف کروا رہا تھا۔
''یہ احمد حسن ہے۔ تم نے کبھی اس کا پروگرام دیکھا یا ملے اس سے؟''

فلک شاہ نے پوچھا تو ایبک نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''لاہور میں ہی رہتا ہے۔اور سنا ہے کافی مقبول ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود اس کی گفتگو سے متاثر ہوتا ہوں۔ اس ملک کو ایسے ہی بے باک اور کھرے جوانوں کی ضرورت ہے۔ایسے ہی لوگ ملکوں کی تقدیر رقم کرتے ہیں۔''

ایبک نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بہت دھیان سے احمد حسن کی بات سن رہا تھا۔

❁○❁

سمیرا نے لیپ ٹاپ آف کر کے زبیدہ اور حسن رضا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں اس پر تھیں۔

''کون ہے، کہاں سے آیا ہے، کیا پتہ چلا اس کے متعلق؟'' اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر زبیدہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''پاکستانی نژاد امریکن ہے۔ ماں اسپینش اور باپ پاکستانی ہے۔ یہی لکھا ہے۔اس کا ایک انٹرویو کسی نے ڈاؤن لوڈ کیا ہوا ہے، اس میں اس نے بتایا ہے خود۔شکل سے بھی غیر ملکی لگتا ہے۔امی! آپ نے پتہ نہیں کیوں اسے رضی سمجھ لیا۔'' سمیرا نے آہستگی سے کہا۔ حالانکہ وہ خود اسے بھی یہی لگا تھا، جب اس نے احمد حسن کی تصویر نیٹ پر دیکھی تھی، اس کے انٹرویو والے پیج پر۔

''تو ہمارا رضی بھی تو غیر ملکی ہی لگتا تھا۔ جب چھوٹا سا تھا تو سب کہتے تھے۔زبیدہ! تمہارا بیٹا تو بالکل انگریز لگتا ہے۔ کیوں حسن صاحب! یاد ہے نا آپ کو؟''

حسن رضا نے جو بالکل خاموش بیٹھے تھے، سر ہلا دیا۔ وہ اس سارے عرصے میں کچھ نہیں بولے تھے۔سمیرا آج شام ہی راولپنڈی آئی تھی اور ابھی اسے آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ زبیدہ بڑے جوش وخروش سے اسے احمد حسن کے متعلق بتانے لگی تھیں۔

''تم نے دیکھا ہے اس کا پروگرام؟''

''نہیں امی! میری پڑھائی اتنی ٹف ہے کہ مجھے ٹی وی وغیرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔لیکن میں نے سنا ضرور ہے اس کے متعلق۔طلباء اکثر اس کے متعلق بات کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے کالج میں کافی لڑکے لڑکیاں اس کے فین ہیں۔''

''ہاں ضرور ہوں گے فین۔لیکن اصل بات جو میں تمہیں بتا رہی ہوں، وہ یہ ہے کہ وہ ہمارا احمد رضا ہے۔احمد حسن نہیں ہے۔''

سمیرا نے بے اختیار حسن رضا کی طرف دیکھا تھا۔انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''تمہارے ابا نہیں مانتے سمولیکن وہ میرا رضی ہی ہے۔میرا دل کہتا ہے، وہ رضی ہے۔'' زبیدہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔''ابھی آج شام کو بھی اس کا پروگرام آئے گا، پھر تم بتانا۔تمہیں میری بات پر یقین آ جائے گا۔''

سمیرا بار بار حسن رضا کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن وہ سر جھکائے اپنی انگلیاں مروڑ رہے تھے۔

''ابو! آپ نے دیکھا ہے احمد حسن کا پروگرام؟''

''تمہاری امی کے کہنے پر ایک بار۔''

''پھر......؟'' سمیرا کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

''وہ بالکل رضی کی طرح لگتا ہے۔ لیکن وہ رضی نہیں ہے، مجھے اس کا یقین ہے۔لیکن تمہاری ماں سمجھتی نہیں ہیں میری بات۔''

''آپ اس سے مل لیتے ابو!......کیا پتہ......'' سمیرا کے لہجے سے اُمید جھلک رہی تھی۔

''کیا کرتا مل کر بیٹا!'' احمد رضا کی آواز میں صدیوں کی تھکن تھی۔''جبکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں، وہ رضی نہیں ہے۔''

سمیرا لمحہ بھر انہیں دیکھتی رہی۔لیکن سمیرا کی نظروں سے نظریں ملتے ہی انہوں نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ کسی خیال کے

نحت اس نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا تھا۔ اسے یاد آیا تھا، ایک باراس کی روم میٹ نے اسے کہا تھا کہ احمد حسن کے پروگرام نیٹ پر بھی موجود ہیں اور یہ کہ اس کی پوری لائف ہسٹری وہاں موجود ہے۔ اگر کوئی جاننا چاہے تو۔

وہ احمد رضا کی بہت بڑی فین تھی۔ بلکہ ایک دو بار اس نے سمیرا سے بھی کہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس کے گھر چلے۔ ہر سنڈے کو وہاں طلباء اور دوسرے نوجوان لڑکوں کا خاصا بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ ایک بار پھر لیپ ٹاپ کھولے سرچ کر رہی تھی۔ لیکن کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے اپنی ساری تعلیم امریکہ میں حاصل کی۔ ابھی اس نے گریجویشن کیا تھا کہ امریکہ میں نائن الیون کا واقعہ ہو گیا اور امریکہ نے افغانستان پر چڑھائی کر دی تو احمد حسن نے سوچا کہ اسے اپنے باپ کے ملک میں جانا چاہئے۔ وہ اپنے وطن پاکستان اور اسلام کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی پرورش اس کے باپ نے کی تھی۔ جبکہ اس کی اسپینش ماں اس کی کم عمری میں ہی اسے چھوڑ گئی تھی۔

''سمو!......سمو! آ جاؤ۔ دیکھو پروگرام شروع ہو گیا ہے۔'' زبیدہ کی آواز آئی۔

اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور حسن رضا کی طرف دیکھا، جو کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر لیٹ گئے تھے۔

''ابو! آپ دیکھیں گے یہ پروگرام؟''

''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ لیپ ٹاپ وہیں چھوڑ کر باہر لاؤنج میں آ گئی۔ حسن رضا نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور ان کی بند آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔ زبیدہ کو وہ ٹال سکتے تھے لیکن سمیرا کو نہیں۔ وہ ضرور احمد حسن سے ملنے کی ضد کرے گی۔ وہ یوں ہی آنکھیں بند کئے لیٹے رہے۔ شاید آدھا گھنٹہ یا پھر ایک گھنٹہ۔ بعد آنکھوں کے سامنے فلم چل رہی تھی۔

جب احمد رضا پیدا ہوا۔ جب اس نے پہلی بار اماں کہا۔ جب اس نے پہلا قدم اٹھایا۔

پھر دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھلا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ سمیرا تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سرخی تھی اور آنکھیں کوئی راز جان لینے کے انداز میں چمک رہی تھیں۔

''ابو! کیا آپ نے کبھی یہ پروگرام دیکھا؟''

''ایک بار زبیدہ نے بتایا تھا تو تھوڑا سا دیکھا تھا۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا تو ہے۔''

''ابو! آپ پورا پروگرام دیکھیں۔ رات میں پھر ریپیٹ ہوگا۔''

''اس سے کیا ہوگا سمیرا؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ''وہ احمد رضا نہیں ہے۔''

''وہ ہو سکتا ہے ابو!...... بات کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں ایسا لگنے لگتا ہے کہ وہ رضی ہی ہے۔ اس کی صرف شکل ہی نہیں ملتی رضی سے، بلکہ اس کی کئی حرکات بھی ملتی ہیں اس سے۔ بات کرتے ہوئے سوچ کے وقفے کے دوران بالوں میں بالوں ہاتھ پھیرنا اور......''

''سمیرا! وہ رضی نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی رضی نہیں ہو سکتا۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''آپ اتنے یقین سے یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں ابو؟'' سمیرا نے بہت گہری نظروں سے انہیں دیکھا۔

انہوں نے سٹپٹا کر نگاہیں جھکا لی تھیں۔ ''یہ بات تو اتنے یقین سے صرف ہی شخص کر سکتا ہے جو جانتا ہو کہ رضی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔'' آج کئی سالوں بعد اسے پھر گمان گزرا تھا کہ کہیں حسن رضا نے اسے مار تو نہیں دیا۔

''ہاں.....میں جانتا ہوں۔''

''ابو......!'' سمیرا کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور آواز بلند تھی۔ ''آپ بھلا ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟......آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ احمد رضا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔''

حسن رضا بیڈ سے اُترے اور انہوں نے دروازہ لاک کر دیا اور پھر اپنے والٹ سے اخبار کا وہ پرانا ٹکڑا نکالا اور سمیرا کی طرف بڑھایا۔ سمیرا اسی طرح ساکت بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''یہ خبر میں نے اُس روز دیکھی تھی جب تمہیں ہاسٹل چھوڑ کر واپس آ رہا تھا۔'' انہوں نے رک رک کر بات مکمل کی۔ وہ رخ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ جیسے خبر پڑھتے ہوئے وہ سمیرا کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھنا چاہتے ہوں۔ اخبار کا ٹکڑا انہوں نے بیڈ پر رکھ دیا تھا۔ سمیرا نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور پھر یک دم پیچھے کر لیا۔ کچھ دیر وہ خوف زدہ نظروں سے اخبار کے اس ٹکڑے کو دیکھتی رہی، پھر دل کڑا کر کے اسے اٹھا لیا۔ بہت دیر بعد احمد رضا نے اپنا رخ پھیرا۔ سمیرا کے ہاتھ میں اخبار کا ٹکڑا تھا۔ لیکن نہ وہ رو رہی تھی، نہ چیخ رہی تھی۔ بس خالی خالی، ویران نظروں سے اخبار کے اس ٹکڑے کو دیکھ رہی تھی۔

''سمیرا.....!'' احمد رضا کے لبوں سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ سمیرا نے نگاہیں اُٹھائیں اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں......'' اس کی آواز سرگوشی کی طرح اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ ''یہ جھوٹ ہے۔ غلط ہے۔''

''دو سال پہلے......'' انہوں نے سمیرا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ یک دم اٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ پھر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اسے اپنے ساتھ لپٹائے حسن رضا ہولے ہولے کہہ رہے تھے۔

''دو سال......دو سال سے یہ بوجھ دل پر اٹھائے پھر رہا ہوں۔ میری ہمت نہیں پڑتی زبیدہ سے کچھ کہنے کی۔ میں اس کی اُمید توڑنا نہیں چاہتا۔ یہ امید ہی اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میں تمہیں بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں تمہاری امید بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ لیکن تم...... بیٹا! تم بدگمان ہو رہی تھیں۔''

''ابو......!'' سمیرا زور سے رونے لگی۔ ''سوری۔'' بہت دیر وہ یوں ہی روتی رہی اور حسن رضا ہولے ہولے اسے تھپکتے رہے۔ پھر ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے حسن رضا کی طرف دیکھا۔

''ابو! یہ جھوٹی خبر بھی تو ہو سکتی ہے نا۔ کیا پتہ ان لوگوں نے جھوٹی خبر چھپوا دی ہو، تاکہ ہم اسے ڈھونڈیں نہ۔''

''کون لوگ سمیرا!......اس کذاب کو تو کسی نے مار دیا تھا۔ پھر نام نہیں سنا اس کے پیروکاروں کا۔''

''اس کے ماننے والے ہوں گے تو سہی۔ کیا پتہ؟'' وہ اپنے دل سے اس کے واپس آنے کی امید ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''شاید۔'' حسن رضا اخبار کا وہ ٹکڑا والٹ میں رکھ رہے تھے۔ سمیرا کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس خبر کو سنبھال کر مت رکھیں۔ پھاڑ کر پھینک دیں۔ یہ جھوٹی خبر ہے۔ لیکن وہ چپ چاپ حسن رضا کو دیکھتی رہی۔ تب ہی باہر سے زبیدہ انہیں پکارتی ہوئی اندر آئیں۔

''آ جائیں، کھانا تیار ہو گیا ہے۔'' انہوں نے سمیرا کے روئے روئے چہرے اور بھیگی پلکوں کو دیکھا اور پھر حسن رضا کی طرف۔ ''جلدی آ جاؤ۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

وہ رکی نہیں۔ تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ حسن رضا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تلقین کی کہ وہ زبیدہ کو کچھ نہ بتائے۔ پھر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے لاؤنج میں آئے جہاں ایک طرف کونے میں ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ ٹیبل پر پلیٹیں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ سمیرا کچن کی طرف چلی گئی۔ زبیدہ کھانا نکال رہی تھیں۔

''امی! آپ چلیں......میں لے آتی ہوں۔''

زبیدہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''یہ سالن میں نے نکال دیا ہے۔ لے جاؤ۔ میں روٹی لے کر آتی ہوں۔''

سمیرا ڈونگا لے کر لاؤنج میں آ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ زبیدہ کے چہرے پر پہلے کی نسبت رونق تھی۔ آنکھوں میں وہ مایوسی کی کیفیت نہ تھی، جو احمد رضا کے جانے کے بعد مستقل ان کی آنکھوں سے چھلکتی تھی۔

'تو کیا امی کو احمد حسن کے احمد رضا ہونے کا پورا یقین ہے؟' سمیرا نے سوچا اور ڈونگا میز پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ تینوں نے بہت کم کھایا تھا۔ زبیدہ پہلے اُٹھی تھیں۔

''سمیرا! تم کھا کر برتن سمیٹ دینا۔ میں اب نماز پڑھ کر سو جاؤں گی۔''

''جی امی!''

حسن رضا بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سمیرا نے دیکھا، ان کی پلیٹ میں روٹی ایسے ہی پڑی تھی۔ انہوں نے صرف دو تین نوالے لئے تھے۔ ان دو سالوں میں وہ پہلے سے زیادہ کمزور اور بوڑھے لگنے لگے تھے۔ دو سال سے وہ تنہا اس دکھ پر رو رہے تھے۔ اکیلے۔

ایک گہرا سانس لے کر سمیرا نے برتن سمیٹے اور میز صاف کر کے لاؤنج میں آ بیٹھی۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی اپنے موبائل پر تصویریں دیکھتی رہی۔ یہ سب تصویریں اس کی کلاس فیلوز کی تھیں۔ ان میں مرینہ کی بھی تصویر تھی۔

مرینہ اس کی واحد دوست تھی۔ حالانکہ وہ اس سے ایک سال سینئر تھی، لیکن پھر بھی ان کے درمیان دوستی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ کے۔ای میں گئی تھی تو اپ سیٹ رہتی تھی۔ اس پر اس کی روم میٹ بھی عجیب مزاج کی تھی۔ پھر کالج میں ایک دن مرینہ سے ملاقات ہو گئی۔ اسے مرینہ دوسری لڑکیوں سے مختلف لگی تھی۔ سادہ، اپنے آپ میں مگن، مخلص سی لڑکی...... لیکن مرینہ کے قریب آنے میں بھی اسے وقت لگا تھا۔ وہ بہت محتاط رہتی تھی۔ اسے دوسروں سے گھلتے ملتے ہوئے خوف آتا تھا۔

احمد رضا کے واقعے نے اسے سہا دیا تھا۔ احمد رضا جس طرح ان کی زندگیوں میں خلا پیدا کر گیا تھا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ذات کبھی اس کے والدین کے لئے دکھ کا باعث بنے۔ وہ کبھی کسی لڑکی کے گھر نہیں گئی تھی۔ وہ شاپنگ کے لئے بھی بہت کم مجبوراً ہی جاتی تھی۔ ورنہ کسی نہ کسی سے اپنی ضرورت کی چیز منگوا لیتی تھی۔ مرینہ کے گھر بھی وہ صرف ایک مرتبہ گئی تھی۔ وہ بھی مرینہ نے خود حسن رضا سے اجازت لی تھی۔ حسن رضا یا زبیدہ نے اسے لاہور جاتے ہوئے کچھ خاص نہیں کہا تھا۔ لیکن وہ خود جانتی تھی کہ اسے وہاں کس طرح رہنا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس روز بخار کی حالت میں بھی اس نے مرینہ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ مرینہ، اریب فاطمہ کے ساتھ اسے لینے آئی تھی۔

''کیا تمہیں ہم پر اعتماد نہیں ہے سمیرا؟'' مرینہ بہت افسردہ ہو گئی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے مرینہ! میں تمہارے خلوص کی دل سے قدر دان ہوں۔ لیکن پلیز! اس وقت مجھے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرو۔''

تب مرینہ اسے ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی تھی اور ڈاکٹر کو دکھا کر اسے ہاسٹل چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ بعد میں اسے افسوس بھی ہوا تھا۔ لیکن شاید اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ مرینہ اس سے خفا ہو گئی ہو گی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اگلے دو روز بھی مرینہ، اریب فاطمہ کے ساتھ اس کے پاس ہاسٹل آئی تھی اور گھر سے اس کے لئے سُوپ وغیرہ بھی بنوا کر لائی تھی۔ اریب فاطمہ کو دیکھ کر اسے بار بار احساس ہوتا تھا کہ وہ پہلے بھی کبھی اس سے مل چکی ہے۔ لیکن اریب فاطمہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ پہلی بار لاہور آئی ہے۔ پہلے رحیم یار خان میں تھی۔ رحیم یار خان کا نام سن کر وہ چونکی تھی۔ اس کے اپنے ننھیالی اور ددھیالی عزیز رحیم یار خان، صادق آباد اور اردگرد رہتے تھے۔ آخری بار وہ رحیم یار خان تب گئی تھی، جب واپسی پر...... اور اس بات کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ کبھی رحیم یار خان نہیں آئی تھی۔ حالانکہ پہلے حسن رضا اپنے عزیزوں کی ہر خوشی میں شریک ہوتے تھے۔ کوئی قریبی عزیز نہیں تھا، پھر بھی چچا زاد، خالہ زاد، دُور پار کے رشتہ دار...... وہ سب کے ساتھ ہی رابطے میں رہتے تھے۔

''ٹن...... ٹن......''

کلاک نے گیارہ بجائے تھے۔ اس نے چونک کر پاس پڑا ریموٹ اٹھایا۔ ''کڑوا سچ'' کا ریپیٹ پروگرام شروع ہونے

والا تھا۔ اس کی نظریں اسکرین پر تھیں۔ ایک دو اشتہارات کے بعد احمد حسن اسکرین پر نظر آیا۔

''السلام علیکم ناظرین!...... ''کڑوا سچ'' پروگرام کے ساتھ احمد حسن حاضر ہے۔''

وہ بول رہا تھا اور وہ بہت دھیان سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بولتے بولتے اس نے بایاں ہاتھ اونچا کر کے پیشانی پر آنے والے بالوں کو پیچھے کیا اور مسکرایا۔

مسکراتے ہوئے اس کے اوپر والے دو دانت لحہ بھر کو نظر آئے اور اس لحہ بھر کے عرصہ میں سمیرا نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے ان سامنے والے دونوں دانتوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ تھا۔ احمد رضا کے بھی اوپر والے دو دانتوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ تھا اور اس کی مسکراہٹ بھی اتنی ہی خوصورت تھی جتنی احمد حسن کی۔

''تو ناظرین! ہمیں اب فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں امریکہ کی غلامی سے آزاد ہونا ہے یا ہمیشہ کے لئے غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا ہے۔''

اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنے دائیں کان کی لو کو پکڑا تھا اور پھر ہاتھ نیچے کر لیا تھا بالکل احمد رضا کی طرح۔ وہ بھی بات کرتے کرتے اکثر ایسا ہی کرتا تھا۔

اس نے احمد رضا کی باتیں کم سنی تھی۔ اس کا سارا دھیان اس کی حرکات کی طرف تھا۔ وہ اس کی ایک ایک جنبش کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے موبائل اٹھایا اور تصویریں دیکھنے لگی۔ بہت دن پہلے اس نے احمد رضا کی تصویر اسکین کر کے اپنے موبائل میں محفوظ کی تھی۔ اب وہ تصویر اس کے سامنے تھی۔ کچھ دیر وہ تصویر کو دیکھتی رہی احمد حسن اور احمد رضا میں کیا فرق تھا؟ صرف داڑھی کا یا کچھ اور بھی......

ہاں! احمد رضا کا چہرہ دُبلا تھا۔ لیکن احمد حسن کا بھرا بھرا تھا۔ احمد رضا گلاسز نہیں لگاتا تھا، جبکہ احمد حسن نے عینک لگا رکھی تھی۔ شاید پانچ سالوں میں اس کی نظر کمزور ہو گئی ہو۔ اس کا چہرہ بھر گیا ہو۔ احمد رضا دبلا پتلا تھا، اسمارٹ تھا۔ جبکہ احمد حسن تھوڑا صحت مند لگ رہا تھا۔ پانچ سالوں میں اتنی تبدیلی تو آسکتی ہے۔

اس کی انگلیاں مسلسل موبائل پر حرکت کر رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ فیس چینجنگ (Face changing) کے سوفٹ ویئر دیکھتی رہی۔ اس کی نگلیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ احمد رضا کے چہرے پر داڑھی لگ چکی تھی۔

پروگرام اختتام کے قریب تھا۔ ایک بار پھر وہ احمد رضا اور احمد حسن کا موازنہ کر رہی تھی۔

❁○❁

طیب خان نے ٹی وی آف کیا اور گیسٹ روم سے باہر نکل آیا۔

'تو یہ ہے احمد رضا کا کمال۔ اس کا اتنا چرچا سننے کے باوجود میں نے آج تک اس کا کوئی پروگرام نہیں دیکھا۔ رچی باس بھی اس کی تعریف کر رہا تھا کہ وہ ہماری توقع سے زیادہ ہمارے لئے کارآمد ثابت ہو رہا ہے۔ یہ احمد حسن اتنا جانا پہچانا کیوں لگ رہا تھا؟ حالانکہ میں نے پہلی بار اس کا پروگرام دیکھا ہے۔' وہ چونکا۔

'احمد حسن!' اس نے دہرایا اور برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ برآمدے میں لائٹیں جل رہی تھیں۔ یہ گیسٹ روم جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا، جو رچی کے شان دار گھر سے ملحق ایک چھوٹے سے گھر میں تھا۔ اس گھر میں لائن سے چار کمرے تھے۔ آگے برآمدہ تھا اور پھر کھلا صحن۔ برآمدہ صحن سے تھوڑا اونچا تھا۔ غالباً رچی کچھ مہمانوں کو یہاں ٹھہراتا تھا۔ اس وقت گھر میں طیب کے سوا کوئی اور مہمان نہ تھا۔ ایک ملازم تھا اور غالباً سونے جا چکا تھا۔ اور چوکیدار گیٹ کے پاس چارپائی بچھائے چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ طیب خان کچھ دیر برآمدے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے جیب سے موبائل نکال کر نمبر ملایا۔ دوسری طرف رچی تھا۔

''ہیلو! کیا ہوا طیب خان؟''

''میں نے ابھی ابھی احمد حسن کا پروگرام دیکھا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ ڈیڑھ سال سے یہ پروگرام کر رہا ہے

اور میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔“

”ڈیڑھ سال نہیں طیب خان! چار ماہ۔ صرف چار ماہ سے وہ یہ پروگرام کر رہا ہے۔ البتہ ڈیڑھ سال سے وہ اخبارات میں کالم لکھ رہا ہے اور اس نے اپنی جگہ بنالی ہے کچھ خاص حلقوں میں۔“

”ہوں......احمد حسن کیا احمد رضا ہی ہے؟“

”مے بی۔“ دوسری طرف سے رچی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ صوفے پر بیٹھے احمد رضا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ رچی نے پوچھا۔

”مجھے وہ احمد رضا ہی لگا۔ کافی مشابہت ہے۔ ہاں! ان پانچ سالوں میں اس کی شخصیت میں ٹھہراؤ سا آ گیا ہے۔ پانچ سال پہلے وہ بہت مضطرب اور بے چین نظر آتا تھا اور یہ بے چینی اور اضطراب اس کے پورے وجود سے جھلکتا تھا۔“

”ہاں! جب جنگل سے جانور پکڑ کر لاتے ہیں تو وہ بھی ابتدا میں یوں ہی بے چین اور مضطرب ہوتے ہیں۔“

”اگر یہ واقعی احمد رضا ہے تو تم نے خوب پالش کیا ہے اسے۔ گفتگو کا انداز ہی بدل گیا ہے۔ ویسے کیا احمد حسن میٹنگ میں شرکت کے لئے آ گیا ہے؟“

”نہیں۔“ رچی نے احمد رضا کی طرف دیکھتے ہوئے دائیں آنکھ کا کونا دبایا۔ احمد رضا بے حد سنجیدہ سا بیٹھا تھا۔

”میٹنگ کینسل ہو گئی ہے۔ باس کو کسی بے حد ضروری کام سے لندن جانا پڑ گیا ہے۔ میں کل کسی وقت تمہیں بریفنگ دوں گا، آئندہ کے لئے۔ اور پھر تم واپس جا سکتے ہو۔“

”اس کا مطلب ہے کہ احمد حسن سے ملاقات نہیں ہو گی۔“

”تمہارے علاوہ صرف نتاشا اور الوینا آئی ہوئی ہیں اور احمد حسن سے بہت جلد تمہاری ملاقات متوقع ہے۔ مستقبل قریب میں تم دونوں کو مل کر ہی کام کرنا ہے۔“

”کیا مجھے لاہور جانا پڑے گا؟“ طیب کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

”کیوں......کیا اپنے سسرال سے دور نہیں جانا چاہتے؟“

”رچی! تم بھی......“ طیب خان نے دانت پیسے اور رچی نے قہقہہ لگایا۔ ”وہ صرف مجھے جہادِ افغانستان کا مجاہد سمجھ کر بیاہا ہے۔“

”اور تم؟......کیا تم بھی اسے کوئی مجاہدہ سمجھتے ہو؟“ اب کے رچی کا قہقہہ بہت بلند تھا۔

”او کے......پھر ملتے ہیں صبح۔“

رچی نے فون بند کر دیا۔ طیب خان نے فون جیب میں ڈال لیا اور پھر ٹہلنے لگا۔ دوسری طرف رچی، احمد رضا کی طرف دیکھ رہا تھا جو بے حد سنجیدہ سا ہاتھ گود میں دھرے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو احمد حسن؟“ رچی نے بغور اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ طیب کیا کہہ رہا تھا؟“

”پوچھ رہا تھا کہ کیا احمد حسن ہی احمد رضا ہے؟“

”کیا پہچان لیا اس نے مجھے؟“ احمد رضا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”شک ہے اسے۔ اور احمد حسن سے مل کر اس شک کو یقین میں بدلنا چاہتا ہے۔“

’اگر طیب نے مجھے پہچان لیا ہے، جس کے ساتھ چند دن بھی نہیں گزارے میں نے......تو کیا انہوں نے مجھے نہیں پہچانا ہو گا، جن کے ساتھ زندگی گزری؟‘ اس نے بے اختیار سوچا۔

’امی تو شاید نہیں، لیکن ابو اور سمیرا تو یہ پروگرام ضرور دیکھتے ہوں گے۔ سمیرا بے حد محبِ وطن لڑکی ہے۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار وہ انڈیا کی چوڑیاں لایا تھا تو اس نے انہیں پہننے سے انکار کر دیا تھا۔

''نہیں۔ میں دشمن ملک کی مصنوعات استعمال نہیں کر سکتی۔'' احمد رضا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''کیا سوچ رہے ہو احمد رضا؟'' رچی اسے بغور دیکھ رہا تھا۔
''یوں ہی، خیال آ گیا تھا کہ شاید میرے گھر والوں نے بھی مجھے پہچان لیا ہوگا۔''
''انہیں شک تو ہوا ہوگا احمد رضا! اگر انہوں نے پروگرام دیکھا ہو کبھی...... انہیں مشابہت بھی محسوس ہوئی ہوگی۔''
''تو پھر انہوں نے کبھی فون کیوں نہیں کیا؟...... ابو نہ سہی، سمیرا تو کبھی کال کرتی۔ بلکہ ضرور کرتی۔ میں نے ''سیمل'' کے آپریٹر سے کہہ رکھا ہے کہ اگر میرے لئے کوئی کال آئے تو وہ مجھ سے بات کرا دے یا میرا نمبر دیدے اسے۔''
''اس لئے کہ شک کے باوجود انہیں یقین نہیں آیا ہوگا کہ یہ تم ہی ہو۔'' رچی اُٹھا اور اس نے دیوار میں موجود لوہے کے بڑے لاکر سے ایک فائل نکالی۔ فائل پر مارکر سے موٹا موٹا لکھا ہوا تھا۔ ''اسمٰعیل خان۔''
اس نے فائل کھولی اور محمد رضا کے سامنے رکھ دی اور جھک کر اس میں موجود اخبار کی کٹنگ دیکھنے لگا۔ اس فائل میں اسمٰعیل خان کے حوالے سے چھپنے والی ہر خبر اور ہر مضمون اور کالم کی کٹنگ تھی۔ پھر ایک کٹنگ پر اُنگلی رکھتے ہوئے اس نے احمد رضا کی طرف دیکھا۔
''اس خبر کو پڑھو احمد رضا!'' اور خود پیچھے ہٹ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ احمد رضا 2003ء میں چھپنے والی اس خبر کو پڑھ رہا تھا، جو اس کی موت کے متعلق تھی۔
''یہ...... یہ خبر کس نے چھپوائی ہے؟ یہ تو جھوٹ ہے بالکل۔'' بے اختیار ہی احمد رضا کے لبوں سے نکلا۔
''میں نے۔'' رچی نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے اطمینان سے کہا۔
''کیوں؟'' احمد رضا نے پوچھا۔
''یہ ضروری تھا۔ تم یہاں کی پولیس کو مطلوب تھے اور دو سالوں میں لوگ سمٰعیل خان اور اس کے ''حواریوں'' کو نہیں بھولے ہوں گے۔ بعض معاملات میں تم پاکستانیوں کی یادداشت بڑی تیز ہوتی ہے۔ اور بعض میں بالکل زیرو۔ مثلاً تم ہر سال ان ہی سیاست دانوں اور بندوں کو ووٹ دیتے ہو، جن کی کرپشن اور ظلم کے ہاتھوں نالاں ہوتے ہو۔ جو تم پر زندگی کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ لیکن تمہیں یاد نہیں رہتا۔ خیر!'' اس نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی۔
''ضروری تھا کہ تم ایک نئے نام اور نئی شناخت کے ساتھ یہاں آتے۔''
احمد رضا کے اندر ابھی جو خوشی کا چراغ جلا تھا، اس کی لو ایک دم بھڑک کر بجھ گئی تھی۔
'ابو تو اخبار باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ میری موت کی خبر پڑھ کر کیا گزری ہوگی ان پر۔ اور اب تک تو شاید صبر بھی آ گیا ہوگا انہیں۔' اس نے مرے مرے ہاتھوں سے فائل بند کر کے رچی کی طرف بڑھا دی۔ رچی نے فائل لے کر میز پر رکھ دی۔
''یاد رکھو! تم اب احمد رضا نہیں، احمد حسن ہو۔ تمہیں یہاں کوئی نہیں پہچانتا۔ حتیٰ کہ طیب بھی متذبذب ہے۔ ان پانچ سالوں میں تم ایک نوجوان لڑکے سے مرد میں بدل چکے ہو۔ تم اگر اپنی پہچان سے منکر جاؤ تو کوئی بھی تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔''
''آپ کا مطلب ہے کہ اگر طیب مجھ سے پوچھے کہ میں احمد رضا ہوں تو میں انکار کر دوں؟''
''نہیں۔ میرا مطلب ہے، عام لوگوں کو تمہاری پہچان نہیں ہونی چاہئے۔ طیب فی الحال تو واپس جا رہا ہے۔ لیکن ہم ایک ٹیم کا حصہ ہیں۔ ایک دوسرے سے کچھ چھپا نہیں سکتے۔ جلد یا بدیر طیب سے تمہاری ملاقات ہوگی اور تم کو مل کر کام کرنا ہے۔ لیکن......'' وہ ہنسا۔ ''مجھے یقین ہے، طیب کا تجسس اس سے پہلے ہی اسے تم تک لے آئے گا۔''
''اور میں...... کیا مجھے بھی کل واپس جانا ہے؟''
''نہیں۔ تم ابھی کچھ دن رُکو یہاں۔ بہت سی باتیں سمجھنے والی ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تمہیں وہ کرنا ہے، جس کے

لئے تم پاکستان آئے ہو۔"

"لیکن مجھے پہلے تو کچھ نہیں بتایا گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ آپ تو......"

"ہر چیز وقت آنے پر ہی معلوم ہوتی ہے احمد رضا!...... آئی سی جی نے تم پر اتنا پیسہ خرچ کیا ہے تو ظاہر ہے وہ بدلے میں کچھ چاہیں گے بھی۔ تم ان کے ملازم ہو اب بھی۔ تمہیں یہاں بغیر کچھ کئے تنخواہ مل رہی ہے۔ ہر ماہ اس مد میں تمہارے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے جمع ہوتے ہیں۔"

احمد رضا اُلجھی نظروں سے رچی کو دیکھنے لگا۔

"پریشان مت ہو ڈیئر! تمہیں کسی کو قتل کرنے کو نہیں کہا جائے گا۔ ہم سب تمہاری قدر کرتے ہیں۔ تم پڑھے لکھے، ذہین آدمی ہو۔ مجھے افسوس ہوا تھا کہ تم ایک جھوٹے شخص کے جال میں پھنس گئے ہو۔ اس لئے میں نے تمہاری مدد کی تھی۔"

"لیکن تم...... میرا مطلب ہے، آپ خود بھی تو اسمٰعیل خان کے ہاتھوں پر ایمان لائے تھے اور مجھے لگتا تھا، جیسے اسمٰعیل خان کے اس سرکل میں آپ سب سے زیادہ اہم تھے۔"

"سچ کی تلاش میں اس تک پہنچا تھا اور سمجھ ہی نہیں پایا۔ خیر چھوڑو۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ کل ہمیں ایک جگہ جانا ہے۔ تم آج رات آرام کرو۔ باقی باتیں کل ہوں گی...... گڈ نائٹ۔"

احمد رضا کمرے سے باہر نکل آیا۔

دو کمرے چھوڑ کر اس کا کمرہ تھا۔ جب وہ آیا تھا تو رچی کے ملازم نے اس کا سامان اس کمرے میں رکھا تھا اور بتایا تھا کہ یہ کمرہ اس کے لئے سیٹ کیا گیا ہے۔ گھر بہت شاندار تھا۔ وہ کچھ دیر کمرے سے باہر نکل کر بھی کھڑا رہا۔ اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔

کوئی سوچ، کوئی خیال اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ پھر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ روم فریشنر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، جیسے کسی نے کمرے میں گلاب رکھ دیئے ہوں۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ جب جوتے اتار کر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا تو حیران رہ گیا۔ دروازے سے ٹیک لگائے الوینا کھڑی تھی۔ وہ اتنی بے آواز اندر آئی تھی کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ اس نے دو سالوں بعد اسے دیکھا تھا۔ دو سال پہلے جب وہ امریکہ سے آرہا تھا تو وہ ایئرپورٹ پر اسے چھوڑنے آئی تھی۔

"تم......" وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔

الوینا مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور گرم جوشی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیسے ہو؟"

"فائن۔" احمد رضا اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا خود بھی بیٹھ گیا۔

"رچی نے بتایا تھا تم سوات میں ہو۔"

"ہاں۔ وہاں ہم خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے کام کر رہے ہیں۔"

'ان کی فلاح و بہبود کے لئے یا ان کی بربادی کے لئے۔' احمد رضا نے سوچا۔

"کیا بات ہے، تمہیں مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی؟...... چپ چپ سے ہو۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس تھکاوٹ ہے۔ سونا چاہتا ہوں۔"

الوینا نے بہت گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم خوش نہیں لگتے ہو احمد رضا! حالانکہ تمہارے پاس دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔"

"زندگی میں دولت، ہر چیز کا مداوا نہیں ہوتی الوینا! کچھ اور ایسا بھی ہوتا ہے جو ان سب سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا اور پھر سوچنے لگا۔

'ہم ایک خوشی کی خاطر بہت سی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو چھوڑ دیتے ہیں، جو ہمیں لمحہ لمحہ مل رہی تھیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے لمحات، جو تب بالکل بے وقعت اور بے معنی لگتے تھے۔ سمیرا سے چھین کر آئس کریم کھانا......اس سے بلاوجہ جھگڑنا اور اس کے چڑنے پر خوش ہونا۔ اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹنا۔ ان کا بالوں میں ہاتھ پھیرنا۔ ان کے ہاتھ کے پکے قیمہ کریلے کھانا۔ ابو سے گپ شپ لگانا۔ اور تو اور گلی میں بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنا۔ یہ اور ان جیسے سارے چھوٹے چھوٹے لمحے، دولت کے ان ڈھیروں سے زیادہ خوب صورت اور قیمتی تھے۔ پتہ نہیں، وہ کون سا لمحہ تھا، جب میں نے دولت اور شہرت کی خواہش کی تھی۔ بس ایک خیال، ایک معمولی خواہش کی اتنی بڑی سزا۔'

''پھر سوچ میں گم ہو گئے ہو رضا؟'' الوینا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

کبھی الوینا کا معمولی سا لمس بھی اسے ہیجان میں مبتلا کر دیتا تھا۔ لیکن آج وہ اپنے دل میں الوینا کے لئے کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کم از کم اس وقت......اس وقت اس کا دل بار بار اسے ان لوگوں کے درمیان لے جاتا تھا، جن سے بچھڑے پانچ سال ہو گئے تھے۔

'جب میری موت کی خبر انہوں نے پڑھی ہو گی تو کیا گزری ہو گی ان پر؟......لوگ ان کے پاس پُرسہ دینے آئے ہوں شاید۔'

''تمہیں کوئی بات پریشان کر رہی ہے احمد رضا! مجھ سے شیئر نہیں کرو گے؟''

''کوئی بات نہیں ہے الوینا! بتایا تھا نا تمہیں، تھک گیا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں۔''

''کیا رچی نے کچھ کہا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''او کے! پھر آرام کرو۔ صبح ملاقات ہو گی۔'' اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

''کچھ پیو گے؟'' وہ جاتے جاتے پلٹی۔

لمحہ بھر احمد رضا اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

''ہاں کچھ پلا دو۔ کچھ ایسا کہ ذہن پُرسکون ہو جائے۔ دماغ کے اندر یہ جو ہلچل مچی ہے، یہ نہ رہے۔ بس گہری نیند سو جاؤں میں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں لاتی ہوں۔'' وہ لہراتی ہوئی باہر نکل گئی۔

الوینا کون تھی؟ کیا تھی؟ اس نے کبھی جاننے کا تجسس نہیں کیا تھا۔ وہ اس پر فدا تھا۔ اس کے ساتھ شادی پلان کر رہا تھا۔ لیکن سب کچھ خاک ہو گیا۔ اسمٰعیل خان پکڑا گیا اور اسے ملک چھوڑنا پڑا۔ جتنا عرصہ وہ انگلینڈ رہا، اسے الوینا بہت یاد آتی تھی۔ لیکن جب وہ امریکہ گیا، الوینا سے ملا تو اسے لگا کہ الوینا محض ایک مہرہ ہے اس سارے سیٹ اپ کا۔ یہ مہرہ اسے پٹانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا اور وہ پٹ گیا تھا۔ بہت ساری باتیں وہ سمجھتا تھا، جانتا تھا۔ لیکن اس جان لینے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کھیل کا حصہ بن چکا تھا۔ وہ اب ان میں سے تھا اور اسے وہی کرنا تھا، جو وہ چاہتے تھے۔

کیا وہ کبھی ان سے دُور جا سکے گا؟......ایک لمحہ کے لئے اس نے سوچا۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ پھر بے آواز کھلا تھا۔ الوینا کے ہاتھ میں بوتل اور گلاس تھے۔ اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر سامان رکھا تھا اور پھر دروازہ بند کر کے اس کے سامنے آ بیٹھی تھی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے جینز اور شرٹ میں تھی، لیکن اب وہ لباس بدل آئی تھی۔

اس کے جسم پر باریک نائٹی تھی اور اس میں سے اس کا خوب صورت جسم جھلک رہا تھا۔ احمد رضا اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے مُردہ احساسات جاگ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے اسے ایک دم ہنسی آ گئی۔ اسے وہ مشروب یاد آ گیا تھا، جو شربتِ طہور کے نام پر پیتا تھا۔

''کیوں ہنس رہے ہو؟'' الوینا نے پوچھا تو اس نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔
''کیا یہ بھی شربتِ طہور ہے، جو خاص لوگوں کو پلایا جاتا ہے؟...... سچ بتانا! وہ کیا تھا، جو تم پلاتی تھیں اور میں مدہوش ہو جاتا تھا۔''
''شربت طہور۔'' الوینا ہنسی تو احمد رضا کو لگا جیسے اس کے چاروں طرف جلترنگ بج رہے ہوں۔ ''اسمٰعیل خان..... میرا مطلب حضرت جی سے ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ورنہ وہی بتا سکتا تھا کہ وہ کیا تھا۔''
احمد رضا نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''کیا تم..... تم بھی الوینا! یہ سمجھتی ہو کہ وہ جھوٹا تھا؟ ......وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا؟''
''اُس وقت تو وہ سچا ہی لگتا تھا۔'' الوینا نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر پھر بھر دیا۔
پھر پتہ نہیں اس نے کتنے گلاس پیئے تھے اور کب سویا تھا۔ الوینا کی رفاقت نے آج پھر اس کے اندر خوشی کے انوکھے رنگ بھر دیئے تھے۔ اور سونے سے پہلے وہ پانچ سال پہلے کی طرح سوچ رہا تھا کہ اسے الوینا سے شادی کر لینی چاہئے۔ اور وہ اس سے کہنا بھی چاہتا تھا۔ لیکن پھر نیند نے اس پر غلبہ پا لیا۔ پتہ نہیں، کہہ پایا یا نہیں۔
صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو الوینا کھڑکیوں کے پردے ہٹا رہی تھی اور شیشوں سے آنے والی دھوپ نے پورا کمرہ روشن کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر یوں ہی لیٹا چندھیائی آنکھوں سے الوینا کو پردے ہٹاتا دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ الوینا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔
''تم بہت سوئے۔ گیارہ بج رہے ہیں۔''
''بڑے عرصے بعد اس طرح سویا ہوں الوینا! ورنہ تو کروٹیں بدلتے رات گزر جاتی ہے۔ جانتی ہو، پانچ سالوں سے میں پوری نیند سو نہیں پایا۔ کبھی آنکھ لگتی بھی ہے تو اچانک جاگ اُٹھتا ہوں۔ شاید یہ تمہاری قربت اور رفاقت کا سحر ہے۔''
الوینا مسکرائی۔ ''ناشتہ کمرے میں ہی کرو گے یا ڈائننگ ٹیبل پر آؤ گے؟''
''رچی کہاں ہے؟'' اس نے پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکائے۔
''رچی تو کب کا ناشتہ کر کے چلا گیا، اپنے مہمانوں کو ایئرپورٹ چھوڑنے۔''
''کون مہمان؟''
''کچھ عرب دوست تھے اس کے۔''
''اور طیب خان؟...... کیا وہ بھی چلا گیا؟''
''میرے خیال میں۔'' الوینا دروازے کی طرف بڑھی۔ ''میں تمہارا ناشتہ بھجوا دیتی ہوں۔ رچی نے کہا تھا، وہ واپسی پر تم سے ملاقات کرے گا۔''
بیڈ کے نیچے سے سلیپر نکالتے ہوئے احمد رضا نے سر ہلایا۔ الوینا باہر چلی گئی۔ وہ کچن میں ملازم کو ناشتے کا کہہ کر کمرے میں آئی ہی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف رچی تھا۔
''تمہارے پروانے کا کیا حال ہے؟''
''جاگ گیا ہے۔''
''کچھ دیر میں ڈرائیور آئے گا۔ اس سے کہنا، وہ تیار ہو کر اس کے ساتھ چلا جائے۔ میں بھی یہاں سے فارغ ہو کر وہاں ہی پہنچ جاؤں گا۔''
''کہاں سر؟''
''چک نمبر 151 میں۔''
''کیا وہاں کام شروع ہو گیا ہے؟''

''ہو جائے گا جلد۔ تم سے شاید کل ملاقات ہو۔ میری واپسی تک تمہیں یہیں رکنا ہے۔''
''او کے......لیکن کیا میرا احمد رضا سے ملنا ضروری تھا رچی؟ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ پروپوز کر رہا تھا مجھے۔''
''ضروری تھا الوینا!......وہ پچھتا رہا تھا۔ گھر یاد آ رہا تھا اسے۔ اپنی فیملی یاد آ رہی تھی۔ ہاں! اسے وہ منشور ضرور دکھا دینا۔ میں چاہتا ہوں، جب اس سے بات کروں تو وہ پہلے سے جانتا ہو کہ اسے کیا کرنا ہے۔''
''رائٹ سر!''
الوینا نے فون بند کر دیا اور بیڈ پر سوئی ہوئی نتاشا کو دیکھنے لگی۔ نتاشا مقامی لڑکی تھی اور پچھلے دو سال سے اس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ اپنے علاقے کے لوگوں کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ اسے ہر دم متحرک رکھتا تھا۔ وہ ان کے خفیہ مقاصد سے قطعی بے خبر تھی۔
نتاشا کے چہرے سے نظریں ہٹا کر وہ احمد رضا کے متعلق سوچنے لگی۔ احمد رضا کے لئے اس کے دل میں ہمدردی کا ایک گوشہ موجود تھا۔ اسے بعض اوقات اس پر بڑا ترس آتا تھا۔ خاص طور پر ان دنوں، جب نائن الیون کے بعد وہ اس گندے علاقے میں رہ رہا تھا۔ ایک بار اس نے اپنی آنکھوں سے اسے غلیظ عورتوں کے نرغے میں گھرے دیکھا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ تب اس نے رچی سے اسے وہاں بھجوانے کی وجہ پوچھی تھی تو اس نے کہا تھا۔
''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے کہ اس واقعے کے بعد امریکن، مسلمانوں کا قتل عام کرنے لگے ہوں۔ وہ اس ماحول میں رہنے کا عادی نہیں ہے۔''
اور رچی نے شاید احمد رضا میں اس کی دلچسپی محسوس کر لی تھی۔ اس کے بعد آج وہ احمد رضا کو دیکھ رہی تھی۔
'رچی ہر پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ اسی لئے اس نے اسے اس سے دور کر دیا تھا' اس نے سوچا اور بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی فائل اٹھالی اور اسے کھولا۔
''مسلمانوں کی ثقافت کو تباہ کرنا۔
اسلام کو ریاست (State) سے خارج کرنا۔
انسانوں کے بنائے قوانین رائج کرنا۔
اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، کی تردید کرنا۔
جہاد اور جہادی لٹریچر چھاپنے والوں کے خلاف کارروائی۔ جہادی کیمپوں کا خاتمہ۔
دہشت گردی کا الزام، مساجد اور مدرسوں پر پابندی لگانا۔
مذہبی افراد کو روشن خیال بنانا۔
بھارت سے دوستی۔
ایسے چینل قائم کرنا، جو غیر مسلموں سے بھائی چارے کا سبق دیں۔ جہاں کم علم علماء کو آگے لایا جائے۔
عورت کا آزادئ نسواں کے نام پر استحصال۔''
کئی صفحات پر مشتمل فائل کو اس نے سرسری نظروں سے دیکھا اور پھر اس خفیہ فائل کو لاکر میں رکھ کر اس نے دوسری فائل اٹھالی۔ یہ وہ فائل تھی جو اسے احمد رضا کو دینا تھی۔ فائل کے باہر ایک کونے میں لکھا تھا۔
''International crisis group (I.C.G)''
الوینا فائل لے کر باہر آئی تو احمد رضا لاؤنج میں بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔
''تم نے ناشتہ کر لیا؟''
''نہیں۔ صرف چائے لی ہے۔ سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔''

"کچھ کھا لیتے۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور آئے گا تمہیں لینے۔ رچی تمہیں وہیں ملے گا۔"
"جی نہیں چاہ رہا۔"
"اتنے میں یہ فائل دیکھ لو۔"
احمد رضا نے فائل پکڑ لی۔
"کیا تم بھی I.C.G کی ممبر ہو؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں۔"
"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ میڈیا کی نامور شخصیات، پاکستان کی شہرت یافتہ خواتین، مختلف ممالک کے وزراء، صدر وغیرہ بھی اس کے ممبر ہیں۔" احمد رضا نے اس کی طرف دیکھا۔
"پتہ نہیں۔" الوینا نے کندھے اُچکائے۔ "ہم تو صرف اس کے لئے کام کرتے ہیں۔ دوسروں کے مسائل وغیرہ حل کرنے کا فلاحی کام۔"
الوینا بات کر کے وہاں رُکی نہیں تھی۔ احمد رضا فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔ چند صفحات پڑھ کر اس نے فائل بند کر دی تھی۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور اسے لینے کے لئے آ گیا۔ اس نے ملازم سے الوینا کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا، وہ نتاشا کے ساتھ کہیں باہر چلی گئی ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اسے حیرت ہوئی۔ لیکن دوسرے لمحے وہ سر جھٹک کر باہر کی طرف چل پڑا۔
الوینا ایسی ہی تھی۔ کبھی ایک دم مہربان اور کبھی ایک دم اجنبی۔ لیکن دو سالوں بعد آج اس کا دل پھر الوینا کے لئے دھڑک رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر بھی وہ مسلسل اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اتنی مصروف زندگی کے باوجود اندر ایک خالی پن تھا۔ تنہائی تھی اور ویرانی۔ اسے کسی کی مستقل رفاقت کی ضرورت تھی۔ دوسراہٹ کی خواہش تھی۔ پچھلے چند ماہ سے یہ خواہش شدت اختیار کر گئی تھی۔ اندر کا خالی پن کسی کی ہمراہی سے بھرنا چاہتا تھا۔ ایک گھر...... بچے۔
وہ گھر جو اس سے بچھڑ گیا تھا۔
وہ ایسے ہی کسی گھر کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا اور الوینا سے ملنے کے بعد وہ سوچ رہا تھا، اگر الوینا اس کی خالی زندگی کا خلا بھر دے تو۔
الوینا، اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی۔
الوینا، جسے وہ سمیرا سے ملانا چاہتا تھا۔ لیکن الوینا کو پتہ نہیں کسی گھر کی خواہش تھی بھی یا نہیں۔
"صاحب! آپ طیب خان کے ساتھ آئے تھے؟" ڈرائیور نے پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔
"نہیں تو...... میں لاہور سے آیا ہوں۔"
"اچھا اچھا! مجھے لگا، جیسے آپ بھی افغانی ہوں۔"
"نہیں۔ میں افغانی نہیں ہوں۔"
ڈرائیور بہت باتونی تھا۔ راستہ بھر باتیں کرتا رہا۔ احمد رضا "ہوں ہاں" کرتا رہا۔
چک نمبر 151 میں داخل ہوتے ہوئے وہ چونکا۔ یہ جگہ اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ ڈسٹرکٹ رحیم یار خان کا چک نمبر 151۔ اسے یاد آیا، ایک بار جب وہ میٹرک میں تھا تو ابو کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ رحیم یار خان سٹی میں تو وہ کبھی کبھار آتے جاتے رہتے تھے۔ وہاں ابو اور امی کے کافی عزیز تھے۔ لیکن یہاں اپنی یادداشت میں ایک بار ہی آیا تھا۔ حسن رضا کو یہاں کسی شخص سے ملنا تھا تو وہ رحیم یار خان سے ان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ پھر وہ ان کے ساتھ ان کے کسی کزن کے گھر بھی گئے تھے۔ بڑی سی حویلی تھی۔ بڑا سا صحن تھا۔ ابو کی وہ کزن بہت نرمی اور حلیمی سے بات کرتی تھیں۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا وہیں کھایا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن باوجود کوشش کے اسے نہ تو ابو کی اس کزن کا نام یاد آیا اور نہ ہی ان کے شوہر کا۔ لیکن پھر بھی وہ یہاں آ کر خوشی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کہیں قریب کوئی اپنا ہو۔ ایک خوشگواریت کا

احساس ہو رہا تھا اسے۔ ورنہ کچھ دیر پہلے تو انتہائی قنوطی ہو رہا تھا۔

رچی اُس کا منتظر تھا۔ یہ ایک زیرِ تعمیر عمارت تھی، جس کی ایک منزل مکمل تھی۔ جبکہ دوسری پر کام ہو رہا تھا۔ گراؤنڈ فلور کے ایک کمرے میں رچی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ارباب حیدر بھی تھا۔ رچی اس وقت عربی لباس میں تھا اور بہت جچ رہا تھا۔ رچی غالباً ارباب حیدر کو اس کے متعلق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے اسے ملا۔ لیکن احمد رضا کے انداز میں کوئی گرم جوشی نہیں تھی۔ وہ دل میں ان سب کے لئے کدورت رکھتا تھا۔ ارباب حیدر، طیب خان اور کبھی کبھی رچی کے لئے بھی۔ ان ہی کی وجہ سے وہ یہاں تھا۔ ورنہ اس وقت وہ انجینئر بن چکا ہوتا۔

''کیمو فلاج کے لئے اچھی جگہ تلاش کی ہے تم نے رچی!'' ارباب حیدر کہہ رہا تھا۔ احمد رضا نے بیٹھتے ہوئے سنا۔ جواباً رچی مسکرایا۔

''ہمارا مقصد صرف یہاں کی فلاح و بہبود ہے۔''

رباب حیدر یوں مسکرایا جیسے وہ اصلیت سے باخبر ہو۔ تب ہی ایک ادھیڑ عمر شخص نے اندر آ کر رچی کو کچھ بتایا۔

''ہاں ہاں میاں صاحب! انہیں بلا لیجئے۔ میں تو خود ان کا منتظر ہوں۔''

وہ شخص چلا گیا اور کچھ ہی دیر بعد دو افراد اندر آئے۔

''مرحبا!......مرحبا!'' رچی نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ ''السلام علیکم!......آیئے تشریف لایئے۔ بیٹھئے۔''

دونوں افراد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''ہمیں آپ کے آنے کا پتہ چلا تو ملنے آ گئے۔ بلکہ ہم آپ کو دعوت دینے آئے ہیں۔ کھانا ہمارے ہاں ہی کھایئے گا۔''

''نہیں، نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ ادھر کک ہے ہمارا۔''

''نہیں شیخ صاحب! انکار مت کیجئے گا۔ ابا کو بھی افسوس ہو گا۔'' نسبتاً کم عمر فرد نے کہا۔ احمد رضا بغور انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے وہ دونوں جانے پہچانے لگ رہے تھے۔

''یہ عظمت یار اور اسفندیار ہیں۔'' رچی نے احمد رضا سے ان کا تعارف کروایا۔

اب کے احمد رضا چونکا تھا۔ یہ زمین ان کی ہی ہے، جس پر یہ مرکز بنایا جا رہا ہے۔ اور ان کی نگرانی میں ہی سب ہو رہا تھا۔

''اور یہ احمد حسن ہیں۔''

دونوں نے باری باری احمد حسن سے ہاتھ ملایا۔ ارباب حیدر کو غالباً وہ پہلے سے جانتے تھے۔

''بس جناب! ہم اور ہمارے گاؤں والے، شیخ عبدالعزیز صاحب کے بہت شکر گزار ہیں۔ یہاں عورتیں بہت خوش ہیں۔ کوئی پندرہ بیس عورتیں آ رہی ہیں مرکز میں۔''

'یہ رچی بھی بہروپیا ہے۔ اب شیخ عبدالعزیز بن بیٹھا ہے۔ پتہ نہیں، دل سے مسلمان بھی ہوا تھا یا نہیں،' احمد رضا نے سوچا۔

''کچھ ایسی خواتین کا انتظام ہوا، جو نگرانی کر سکیں اور سارے معاملات کو ہینڈل کر سکیں؟ اچھی تنخواہ دیں گے ہم۔'' رچی کہہ رہا تھا۔

''جی، جی! ایک دو لڑکیوں سے بات کی ہے۔ لیکن ابھی کوئی تیار نہیں ہوئی ہے۔''

''میرے خیال میں الوینا اور نتاشا کو فی الحال یہاں رکھ لیتے ہیں۔ ان کو تجربہ ہے کام کا۔ باقاعدہ کام اسٹارٹ ہو جائے گا تو خود ہی خواتین ادھر آئیں گی۔''

رچی نے ارباب حیدر سے کہا تو ارباب حیدر نے تائید کی۔

''ہاں! یہ مناسب رہے گا۔ بلکہ اخبار میں اشتہار بھی دے دیں گے تو لڑکیاں جاب کے لئے آ جائیں گی۔''
''ٹھیک ہے۔تم اشتہار دے دینا۔اور یہ بھی لکھ دینا کہ باہر سے آنے والی لڑکیوں کے لئے رہائش کا انتظام بھی ہے۔''
''اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا جناب! بہت نیک کام کر رہے ہیں۔'' عظمت یار نے کہا تو رحی مسکرا دیا۔
''اللہ ہمیں ہمارے مقصد میں کامیاب کرے۔''
''ہماری ایک بہن بھی ہے۔ لاہور میں پڑھ رہی ہے۔ میں ابا سے کہوں گا، اسے بلوا لیں۔ بلکہ ابا تو پہلے ہی کہہ رہے تھے اسے بلانے کو۔ وہ بھی دیکھ لے گی سب کام۔ بہت سمجھ دار اور لائق ہے۔ اپنی کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتی ہے۔ اسے فلاحی کام کرنے کا بھی شوق ہے۔'' اسفندیار کے لہجے میں فخر تھا۔
''ہاں ضرور۔ وہ آ جائے تو مسئلہ ہی کیا ہے۔ میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ باہر کی لڑکیوں کی نسبت وہ اپنے گاؤں کی لڑکیوں کا زیادہ خیال رکھ سکے گی۔''
''جی بالکل۔ میں اسے جلدی لے آؤں گا۔ اریب فاطمہ نام ہے اس کا۔''
عظمت یار، اسفندیار، اریب فاطمہ، یہ تینوں نام ایک ساتھ اس نے کہاں سنے تھے؟ اس کے ذہن میں ایک دم جھما کا ہوا تھا۔
ابو کی وہ کزن۔ حویلی کا برآمدہ، جہاں موڑھے پر بیٹھی خاتون اپنے بچوں کا تعارف کروا رہی تھیں۔
اسفندیار...... عظمت یار...... وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔ جبکہ عظمت یار بھی بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

❁○❁

''امریکہ نہ صرف ہم سے بیگار لے رہا ہے بلکہ ہمارے ایمان سے بھی کھیل رہا ہے اور ہماری تعلیم و تہذیب کو بھی تاراج کر رہا ہے۔ اسلام ہمارا کلچر ہے۔ قانون اور نصاب کا اسلامی تعلیم کے مطابق ہونا ہمارا دستور ہے۔ مغرب نے اسلام اور عالم اسلام پر کام کرنے والے بے شمار تھنک ٹینک بنا رکھے ہیں۔ لیکن اسلامی دنیا میں بین الاقوامی سطح پر ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے۔''
احمد حسن بول رہا تھا اور اس کے ڈرائنگ روم میں موجود پندرہ بیس لڑکے لڑکیاں بہت انہماک سے اسے سن رہے تھے۔ یہ سب مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اسٹوڈنٹس تھے اور اکثر احمد حسن سے ملنے آتے رہتے تھے۔ لیکن آج ان میں سے دو لڑکیاں پہلی بار آئی تھیں۔ ایک لڑکی نے عبایا پہن رکھا تھا اور اس کا پورا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ دونوں کا تعارف مونا رشید نے کروایا تھا۔ مونا بھی کے۔ای کی طالبہ تھی اور اس کے والد ایڈیٹر تھے اور وہ پہلی بار اپنے ایک کزن، الطاف حیدر کے ساتھ آئی تھی۔ وہ احمد حسن کی بہت فین تھی۔ مونا نے دونوں لڑکیوں کے نام نہیں بتائے تھے بس مختصر بات کی تھی کہ یہ دونوں اس کی کلاس فیلو ہیں اور احمد حسن کے پروگرام بہت شوق سے دیکھتی ہیں۔
''سر! آپ کے خیال میں ہمیں ایسا کوئی ادارہ قائم کرنا چاہئے جو اسلامی دہشت گردی، خواتین کے حقوق، اقلیتوں سے سلوک، انسانی حقوق کی پامالی وغیرہ کے حوالے سے جو حملے مغرب، اسلام پر کر رہا ہے، اس کا جواب دے؟''
نئی آنے والی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے پوچھا تو حسن کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
''آف کورس مس......''
''مرینہ...... مرینہ عثمان شاہ۔'' لڑکی نے اپنا نام بتایا تو احمد حسن کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
''تو کیا آپ ایسا کوئی اداہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''
''فی الحال تو میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہاں! میری خواہش ضرور ہے کہ کوئی تو ہو جو ان کی سازشوں کو کھول سکے اور جواب دے سکے۔''

''تو وہ کوئی، آپ کیوں نہیں ہو سکتے سر؟'' ایک لڑکے نے کہا تو احمد حسن اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن اس کی طرف رخ کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے اس کی نظریں مرینہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف اُٹھیں۔ اس نے پتہ نہیں کب دھوپ کا چشمہ لگا لیا تھا۔ ایک لمحہ کو اسے لگا جیسے سیاہ شیشوں کے پیچھے سے اس کی آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن اسے اپنی طرف متوجہ پا کر شاید اس نے نظریں جھکا لی تھیں اور گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کے دستانے درست کرنے لگی تھی۔ اس نے اکثر عبایا پہننے والی لڑکیوں کی طرح سیاہ دستانوں سے اپنے ہاتھ چھپا رکھے تھے۔ ایک طرف تو یورپی کلچر ترقی کر رہا تھا۔ لڑکیاں جینز اور ٹی شرٹ پہنے دوپٹے کے بغیر نظر آ رہی تھیں اور دوسری طرف اتنی سختی سے عبایا اور نقاب کی پابندی کرنے والی لڑکیاں تھیں۔ شاید یہ اتنی شدت سے، اس حد سے زیادہ بڑھی ہوئی آزادی کا ردِ عمل تھا۔ وہ اس لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''میں اتنے وسائل نہیں رکھتا ینگ مین! لیکن میں چاہتا ہوں کہ ایسا ہو۔ اتنے چینل ہیں ہمارے لیکن کوئی ایک چینل بھی ایسا نہیں ہے جو بین الاقوامی سطح پر اپنا موقف واضح کر سکے۔ ہمیں اس کی بہت ضرورت ہے کہ ہم اپنے خلاف ہونے والے پراپیگنڈہ کا مثبت جواب دے سکیں۔ کہیں سے بھی۔ چاہے الیکٹرانک میڈیا ہو یا پرنٹ میڈیا۔ لیکن ہم نے تو آج تک کہیں سے بھی کچھ نہیں کیا۔ ہم تو آج تک کسی کو یہ بھی یقین نہیں دلا سکے کہ ہم مسلمان دہشت گرد نہیں ہیں۔''

''ہم یقین دلا بھی کیسے سکتے ہیں سر!'' مرینہ کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا لڑکا جنید علی تھا جو کسی کالج یونیورسٹی کا طالب علم تو نہیں تھا لیکن وہ احمد حسن کے گھر ہمیشہ ہی نظر آتا تھا۔

مونا نے آہستگی سے مرینہ کو بتایا تھا، جب وہ احمد حسن کے انتظار میں اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

''غالباً کسی غیر ملکی کمپنی میں جاب کرتا ہے۔''

''ہم کیوں یقین نہیں دلا سکتے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا چینل ہو، جہاں سے بیک وقت عربی، اُردو، انگریزی پروگرام ہوں۔ پھر دنیا کو پتہ چلے کہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ اگر انڈیا پراپیگنڈہ کر سکتا ہے ہمارے خلاف تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟'' مرینہ نے احمد حسن کے بجائے جواب دیا تھا۔

''محترمہ مرینہ شاہ...... یہی نام بتایا تھا نا آپ نے؟ ہم اس لئے نہیں کر سکتے کہ ہم دہشت گرد ہیں۔ ہم میں کچھ لوگ ہیں ایسے جو پڑوسی ملک میں جا کر دہشت گردی......''

''غلط...... غلط کہہ رہے ہیں آپ۔'' مرینہ کا رنگ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے، جیسے آپ انڈیا کے جاسوس ہیں اور یہاں آ کر انڈیا کی زبان بول رہے ہیں۔'' وہ تیز تیز بول رہی تھی۔

پاکستان کے خلاف تو وہ کوئی بات برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اور وہ وہی نہیں ''الریان'' کے ہر فرد کے دل میں پاکستان کے لئے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''وہ آپ جیسے ہی نام نہاد مسلمان ہیں جو اس ملک کے امن کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ جو غیروں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو تباہ اور بدنام کرنا چاہتے ہیں۔''

مونا رشید نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''پلیز کول ڈاؤن۔''

مرینہ نے بات کرت کرتے ذرا سا رخ موڑ کر مونا رشید کو دیکھا۔ مونا نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ وہ خاموش ہو جائے۔ محفل میں موجود سب طلباء خاموشی سے مرینہ کو سن رہے تھے۔ یقیناً انہیں بھی اس کی بات سے اختلاف نہیں تھا۔

احمد حسن نے اس ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوتے دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

''ہر شخص کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے مس مرینہ شاہ! ہمیں دوسروں کا موقف سن کر اسے دلیل سے قائل کرنا چاہئے۔'' احمد حسن کا لہجہ بہت خوب صورت اور نرم تھا۔ مرینہ متاثر ہوئی۔

''سوری! لیکن میں پاکستان کے خلاف کوئی بات، کوئی الزام نہیں سن سکتی۔ چاہے وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔''
احمد حسن کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''ہر پاکستانی کو اتنا ہی محبِ وطن ہونا چاہئے۔ لیکن ہمیں اپنی غلطیوں کی اصلاح بھی کرتے رہنا چاہئے تاکہ ہم ایک اچھی اور بہترین قوم کے طور پر اُبھر کر دنیا کے سامنے آئیں۔''
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! لیکن میں بہت متعصب پاکستانی ہوں۔''
احمد حسن مڑتے مڑتے ایک دم پلٹا تھا۔
''ہم سخت متعصب پاکستانی ہیں رضی! آئندہ کے لئے انڈیا کی بنی کوئی چیز مت لانا۔''
اس کے کانوں میں سمیرا کی آواز آئی تھی اور پھر ہلکی سی ہنسی۔
''یہ اپنی کسی گرل فرینڈ کو دے دینا۔''
''بکومت۔ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔''
''تو تمہارا کیا خیال ہے، میں صرف اس لئے یہ لے لوں گی کہ تمہارے پیسے خرچ ہوئے ہیں؟.....نو، نیور۔ ایک بار آدمی کمزور پڑ جائے تو پھر کمزور پڑتا ہی چلا جاتا ہے۔''
'ہاں.....ایسا ہی ہوتا ہے سمو! تم نے صحیح کہا تھا۔ میں بھی اگر......'
اس نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی نظر مرینہ کے سامنے بیٹھی عبایا والی لڑکی پر پڑی۔ اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ وہ چونکا۔
''آپ ٹھیک تو ہیں نامس......؟''
عبایا والی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گود میں رکھ ہاتھ یک دم اٹھا کر سائیڈ پر کر لئے تھے۔
''آئی ایم سوری مس!'' جنید علی نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر معذرت کی۔ ''میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ میں تو حقائق بیان کر رہا تھا کہ ہمیں اپنی غلطیوں کو ایڈمٹ کرنا چاہئے۔''
''آپ حقائق نہیں جانتے مسٹر! یا پھر آپ کے پیچھے کوئی اور ہاتھ ہے جو آپ سے اس قسم کی باتیں کہلواتا ہے۔ ہمارے اس ملک میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کے پیچھے ڈوری ہلانے والے ہاتھ کوئی اور ہیں۔ اور انہیں تو وہی کرنا ہے جو ڈوری ہلانے والے ہاتھوں کو مقصود ہے۔''
مرینہ وہ سب باتیں دہرا رہی تھی جو چند دن قبل اس نے ایک سے سنی تھیں۔
''آپ کو چاہئے کہ آپ اپنا وژن درست کریں اور سچ میں حقائق جاننے کی کوشش کریں۔''
مونا رشید نے ایک بار پھر مرینہ کا ہاتھ پکڑ کر دبایا تھا۔ مرینہ نے ناک پر پھسل آنے والی عینک کو درست کرتے ہوئے اس کی طرف معذرت خواہانہ انداز میں دیکھا۔ وہ آج پہلی بار یہاں آئی تھی اور اسے اس طرح ان کی باتوں کے درمیان نہیں دینا چاہئے تھا۔ اس نے کبھی احمد حسن کا پروگرام نہیں دیکھا تھا۔ اپنی ٹف پڑھائی کی وجہ سے اسے ٹی وی دیکھنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ کبھی کبھار منیبہ اور حفصہ کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ مل کر کوئی ڈرامہ دیکھ لیتی تھی۔ ٹاک شو غیرہ سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔
احمد حسن اور اس کے پروگرام کے متعلق کالج میں اکثر لڑکیاں بات کرتی تھیں کہ وہ ایک محبِ وطن شخص ہے۔ لیکن اس نے کبھی اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ مگر کل شام جب سمیرا نے اس سے کہا کہ وہ احمد حسن سے ملنا چاہتی ہے تو وہ ایک لمحہ کو حیران رہ گئی تھی۔
''کیوں؟''
''میں نے اس کے پروگرام دیکھے ہیں اور میں اس کے خیالات سے متاثر ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ ہر سنڈے کو کچھ

طلباء و طالبات اور ینگ لوگ اس کے گھر جاتے ہیں۔ میں بھی جانا چاہتی ہوں مرینہ!''
''او کے۔ چلیں گے۔'' مرینہ، سمیرا کو بالکل بھی انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اُداس آنکھوں والی یہ لڑکی اسے بے حد عزیز تھی۔ اس نے آج تک کوئی دوست نہیں بنائی تھی اور سمیرا کو وہ اپنی واحد دوست کہتی تھی۔
بیماری کے بعد جب سمیرا راولپنڈی سے ہو کر آئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے والدین سے ویک اینڈ پر ''الریان'' جانے کی اجازت لے لی ہے۔ اور مرینہ کو بے حد خوشی ہوئی تھی اور اس نے ''الریان'' کے ہر فرد کو باری باری خبر دی تھی۔ سب نے ہی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ سوائے رابیل کے۔ جس نے جلے کٹے انداز میں کہا تھا۔
''تو کیا ہمیں اب اُسے اسپیشل پروٹوکول دینا ہوگا یا پھر اس خوشی میں کوئی پارٹی ارینج کرنا ہوگی؟''
اور مرینہ نے منیبہ سے گلہ کیا تھا۔
''مونی! یہ رابی نے اس طرح کیوں کہا؟''
''پتہ ہے رانو! رابی کی باتوں کا برا مت مانا کرو۔ خود مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اسے اس حادثے کے بعد کیا ہو گیا ہے۔ شاید خون کی کمی ہے اس میں۔ غصہ زیادہ ہو گیا ہے۔ ہماری آپا بی کہتی تھیں، جب آدمی میں خون کی کمی ہو جاتی ہے تو وہ غصہ زیادہ کرنے لگتا ہے۔''
''لیکن اسے تو ایک بھائی نے خون دیا ہے۔ پھر بھلا خون کی کمی کیسے ہو سکتی ہے؟'' مرینہ نے بلا سوچے سمجھے ہی کہا تھا اور عین اسی وقت عمر نے انٹری دی تھی۔
''اور یہ بات تم کبھی رابی آپی کے سامنے مت کہنا مرینہ عثمان شاہ!''
''کیوں بھلا؟'' مرینہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔
''کیوں'' کا تو مجھے نہیں پتہ۔ لیکن اس بات پر وہ تمہیں قتل بھی کر سکتی ہیں۔''
''رینا!...... رینا پلیز، اب گھر چلیں۔'' اس کے پاس عبایا میں ملبوس بیٹھی سمیرا نے آہستگی سے کہا تو مرینہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
''ہاں ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔''
سمیرا نے یہاں آنے کے لئے عبایا خریدا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے ادھر آتے ہوئے دیکھے۔
''میں نے ابو سے صرف تمہارے گھر آنے کی اجازت لی ہے مرینہ! اگر انہیں پتہ چلا کہ میں ادھر آئی ہوں تو شاید ان کا اعتبار ختم ہو جائے مجھ پر۔''
اس نے محسوس کیا تھا کہ سمیرا جب سے راولپنڈی سے آئی ہے، بہت بے چین اور مضطرب سی ہے اور اس کی گفتگو میں اکثر احمد حسن کا ذکر آ جاتا ہے۔
''میں نے مونا رشید سے بات کر لی ہے۔ اسی سنڈے کو چلیں گے۔ میں تمہیں ہاسٹل سے پک کر لوں گی اور پھر وہاں سے مونا رشید کی طرف چلی گے اور اسے ساتھ لے کر احمد حسن کے گھر چلیں گے۔''
مونا ڈے سکالر تھی اور کینٹ میں رہتی تھی۔
اُس کی رضامندی پر سمیرا کے چہرے پر اطمینان سا بکھر گیا تھا۔
پروگرام کے مطابق وہ مونا رشید اور سمیرا کے ساتھ اس وقت یہاں موجود تھی۔ مونا ان کی گاڑی میں ہی آئی تھی۔
''سر! آپ اپنے چینل ''سیمل'' سے پروگرام کیوں نہیں کرتے؟ کوئی ایسا پروگرام جو اسلام کی صحیح تشریح کرتا ہو۔'' کسی لڑکے نے کہا تھا۔ موضوعِ گفتگو بدل چکا تھا۔ اور کیا باتیں ہوئی تھیں، مرینہ نے سنی نہیں تھی۔
''وہ میرا چینل نہیں ہے بھائی! میں وہاں صرف پروگرام کرتا ہوں۔ میں کسی پروگرام کے لئے انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔'' احمد حسن کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

''آپ مشورہ تو دے سکتے ہیں۔'' وہی لڑکا کہہ رہا تھا۔
''ضرور۔''
سمیرا ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔ ''مرینہ! چلو۔''
''ارے بیٹھو نا۔ ابھی چلتے ہیں۔ چائے آ رہی ہے۔'' مونا رشید نے حیرت سے اسے اُٹھتے ہوئے دیکھا۔
''چائے کوئی اتنی ضروری تو نہیں ہے۔ مونا! اُٹھو۔'' مرینہ نے آہستگی سے کہا۔ تب ہی احمد حسن اُن کی طرف متوجہ ہوا۔
''آپ لوگ بیٹھیں پلیز، چائے پی کر جایئے گا۔''
''نہیں شکریہ۔ ہم بس چلتے ہیں۔ آئندہ بھی آتے رہیں گے۔ چائے پھر کبھی سہی۔''
''مجھے خوشی ہو گی۔'' احمد حسن اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ ''لیکن میں آپ کو چائے پیئے بغیر تو نہیں جانے دوں گا، ڈاکٹر مرینا شاہ!''
''میں ابھی آدھی ڈاکٹر ہوں سر!''
''تو میں کیا کہوں، مستقبل کی ڈاکٹر صاحبہ! پلیز تشریف رکھیں۔''
احمد حسن نے ہلکا سا سر خم کیا تھا اور مرینہ کے ساتھ کھڑی سمیرا نے مرینہ کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ جیسے کوئی گرنے سے بچنے کے لئے سہارا لے۔
''تو آپ ہیں مستقبل کی ڈاکٹر، مس سمیرا احسن رضا؟'' رضی نے اس کے سامنے ہلکا سا سر خم کیا تھا۔ ''پلیز تشریف رکھیں۔''
اس نے نظریں اُٹھائیں۔ وہ دایاں ہاتھ تھوڑا سا پھیلائے مرینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سمیرا کی نظریں اس کی انگلیوں میں الجھ رہی تھیں۔ شہادت کی انگلی کی دائیں پور کے ساتھ موجود تل صاف نظر آ رہا تھا۔
''لیجئے چائے بھی آ گئی۔''
''میں چائے نہیں پیوں گی۔ مرینہ! چلو۔''
''میری دوست کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کی چائے پھر کبھی سہی۔''
مرینہ نے مونا رشید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''تم چلی جاؤ مرینہ! میں حیدر کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ بے فکر رہو۔ وہ مجھے ڈراپ کر دے گا۔''
''ٹھیک ہے پھر۔ ہم چلتے ہیں۔''
ملازم لڑکا چائے سرو کر رہا تھا جب وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکلی تھیں۔ احمد حسن پورچ تک اُنہیں چھوڑنے آیا تھا اور رضی نے بات کی تھی۔
''میں جنید علی کی طرف سے آپ سے معذرت کرتا ہوں مس مرینہ عثمان شاہ! ضروری نہیں کہ ہر آدمی ہمارے طرح سوچے...... مجھے آپ کے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی۔ ہر پاکستانی کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ متعصب پاکستانی۔''
وہ اُنہیں خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تو مرینہ نے سمیرا کی طرف دیکھا جو پتہ نہیں کس سوچ میں گم کھڑی تھی۔
''چلو سمیرا!''
''ہاں......'' اس نے چونک کر قدم اٹھایا۔
'اماں سچ کہتی ہیں۔' اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے سوچا۔ 'ایک ماں بھلا اپنے بچے کو پہچاننے میں کیسے غلطی کر سکتی ہے؟...... یہ رضی تھا۔ سو فیصد رضی۔ لیکن اسے نام اور شناخت بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا وہ ہم سے بھاگ رہا ہے۔ ہم سے چھپنا چاہتا ہے؟ اور کیا وہ ہم سے کبھی ملنا نہیں چاہتا؟...... اور اگر میں امی کو بتا دوں، وہ رضی ہے...... اور وہ انکار کر دے کہ وہ احمد رضا نہیں ہے تو امی کو کتنا شاک لگے گا۔ تو مجھے ابھی امی کو نہیں بتانا چاہئے۔ اور ابو کو تو پہلے ہی یقین ہے۔' اخبار میں چھپی خبر کی سطریں اس کی آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھیں۔

''بی بی! کہاں چلنا ہے؟...... ہاسٹل یا گھر؟''
گاڑی روڈ پر لانے کے بعد یاسین نے پوچھا تو مرینہ نے سمیرا کی طرف دیکھا۔
''سمیرا! گھر چلیں یا تم ہاسٹل جاؤ گی؟''
سمیرا نے چونک کر اسے دیکھا۔
''گھر میں بہت رونق ہے۔ بہت مزا آئے گا تمہیں سچی۔ حفصہ کی شادی ہے نا۔ تو رات میں سب اس کے کمرے میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔'' سمیرا نے سر ہلایا۔
''یاسین بھائی! گھر چلیں۔'' مرینہ اسے بتا کر سمیرا کی طرف دیکھنے لگی تھی، جس نے اب چہرے سے حجاب ہٹا لیا تھا اور ہاتھوں سے دستانے اُتار رہی تھی۔
''بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'' اس نے دستانے بیگ میں رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔
''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ا؟'' مرینہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔
''ہاں...... یہ تو بس یونہی۔'' اب وہ اسے کیا بتاتی کہ یہ گھبراہٹ اسے احمد حسن کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔
احمد حسن یا احمد رضا؟
اگر وہ احمد رضا تھا تو اسے اپنی شناخت چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟
وہ ایک اسپینش ماں اور پاکستانی باپ کا بیٹا ہے۔
اسے وہ انٹرویو یاد آ گیا تو وہ ایک بار پھر تذبذب کا شکار ہو گئی۔
'کیا ایسا ممکن ہے کہ دنیا میں دو انسان بالکل ایک جیسے ہوں۔ حتیٰ کہ نام بھی ملتے جلتے ہوں۔ احمد حسن........ احمد رضا۔'
وہ پھر اُلجھ رہی تھی اور گاڑی تیزی سے ''الریان'' کی طرف جا رہی تھی۔

❁○❁

ملازم لڑکا تیزی سے خالی کپ اور پلیٹیں، ٹرالی میں رکھ رہا تھا۔ احمد رضا، صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ہمیشہ چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔
صوفوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی تپائیاں تھیں جن پر خالی کپ وغیرہ پڑے تھے۔ لڑکے لڑکیاں رخصت ہو چکے تھے، سوائے جنید علی کے۔ جو احمد رضا کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا بہت غور سے احمد رضا کو دیکھ رہا تھا۔ جب ملازم لڑکا ٹرالی دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا تو جنید علی ہولے سے کھنکارا تو احمد رضا نے جو کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا، چونک کر اسے دیکھا۔
''کیا سوچ رہے ہو؟''
''کچھ نہیں۔ بس کچھ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔''
وہ رات ہی رحیم یار خان سے ایک ہفتے بعد آیا تھا۔ لیکن جب دس بجے کے قریب الطاف حیدر حسبِ معمول کچھ لڑکوں کے ساتھ آ گیا تو اسے ان سے ملنا پڑا تھا۔ وہ اپنا امیج خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے مزید آگے بڑھنا تھا۔ یہ رملی کی تاکید تھی۔ سو اسے مجبوراً بستر سے اٹھنا پڑا تھا۔ پتہ نہیں وہ اس سے کیا کام لینا چاہتا تھا۔ کیا وہ اسے کوئی لیڈر بنانا چاہتا تھا؟ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''یہ مسکراہٹ کیوں؟'' جنید علی اسے بغور دیکھ رہا تھا
''بس یونہی ایک خیال آ گیا تھا۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
''کیا اُس لڑکی کا جو بغیر رکے بولے چلی جا رہی تھی اور اسی رفتار سے اپنی عینک کو بھی بار بار ناک پر جما رہی

تھی؟...... میں تو کہنے ہی والا تھا۔ بی بی! اپنے لئے مناسب سائز کی عینک بنوا لو۔'' وہ ہنسا تو پتہ نہیں کیوں، احمد رضا کو بہت برا لگا۔

''تم اتنے غور سے اسے دیکھ رہے تھے؟''

''کیا دیکھنے پر پابندی ہے؟'' وہ پھر ہنسا۔ ''ویسے اس کی چھوٹی سی چپٹی ناک پر کوئی عینک ٹِک ہی نہیں سکتی۔ اگلی بار وہ آئی تو میں اُسے لینس لگوانے کا مشورہ ضرور دوں گا۔ تم چاہے کچھ بھی کہو۔''

''بکومت۔'' احمد رضا نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ اسے یہ شخص پہلے دن سے ہی اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ جب پاکستان آیا تھا تو اسی نے اسے ایئر پورٹ پر ریسیو کیا تھا اور وہ اس گھر میں آئے تھے۔ یہ وہی گھر تھا، جو پاکستان جانے سے پہلے رچی نے اسے گفٹ کیا تھا۔

پھر گھر کی چابیاں دے کر اور وہاں موجود ملازموں سے اس کا تعارف کروا کے چلا گیا تھا۔ ایک دو سال سے وہ اس کے ساتھ ہی تھا۔ ٹی وی پر بھی اسے وہی لے کر گیا تھا۔

اخبارات میں کالم بھی لکھنا اسی کی وساطت سے ہوا تھا۔ اور مختلف حلقوں میں اسی نے اسے متعارف کروایا تھا۔ اور پہلی بار چند طلباء کو بھی وہی لے کر آیا تھا۔

''وہ لڑکی...... ارے وہی برقعے والی لڑکی...... مجھے تو وہ کوئی دہشت گرد لگ رہی تھی۔'' وہ اب بڑی بے تکلفی سے عبایا والی لڑکی پر تبصرہ کر رہا تھا۔ ''مجھے تو لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی بم چھپا رکھا ہو۔ طالبان کی کوئی ساتھی لگ رہی تھی مجھے۔''

''تم کتنی فضول باتیں کرتے ہو جنید علی!'' احمد رضا نے بمشکل اپنی ناگواری اور غصے کو چھپایا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اگر اب اس نے اس لڑکی کے متعلق مزید کچھ کہا تو وہ اسے مار بیٹھے گا۔

''یہ فضول باتیں نہیں ہیں میری جان! تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ جو امریکہ قبائلی علاقوں میں القاعدہ اور اسامہ کی تلاش کے بہانے گھس آیا ہے، کیا اس کا کوئی ردِعمل نہیں ہوگا؟...... میری جان! بہت جلد تم دیکھو گے کہ ہمارے اور اس پاکستان کے ہر شہر میں خودکش حملے اور دھماکے ہوں گے۔ سڑکیں خون سے لال ہوں گی۔''

''کیا تم کوئی نجومی ہو؟'' احمد رضا نے چڑ کر کہا۔ اس کے اندر کہیں گہرائیوں میں پاکستان اور پاکستانیوں کے لئے بہت گہری محبت چھپی ہوئی تھی۔ وہ محبت، جس کی جڑیں کہیں بچپن سے ہی اس کے اندر موجود تھیں۔ شاید اس وقت سے، جب پہلی بار اس نے ''خاک و خون'' پڑھی تھی۔ یا اس سے بھی بہت پہلے سے جب دادا جان اسے اور سمیرا کو پاکستان بننے کے متعلق بتایا کرتے تھے۔ شاید اسی لئے جب رچی یا کوئی اور پاکستان ختم ہونے کی بات کرتا تھا تو اندر سے وہ کانپ اٹھتا تھا اور کتنی دیر تک اس کا دل روتا رہتا تھا اور ''نہیں، نہیں'' کی تکرار کرتا رہتا تھا۔

''نجومی ہوں یا نہیں۔'' جنید علی نے ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''لیکن تمہاری طرح آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھا ہوا۔ میں وہ کچھ جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔''

''مثلاً؟'' احمد رضا نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکی۔

''فی الحال تو میں چلتا ہوں۔ تمہیں نیند آ رہی ہے۔'' وہ یک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''شام کو تو تمہارا پروگرام بھی ہے شاید۔''

''ہاں۔ لائیو پروگرام ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ آج کے پروگرام میں تمہیں کس بات کا ذکر کرنا ہے؟ اپنے اصل موضوع کے درمیان یوں ہی سرسری سا ذکر کر دینا۔''

احمد رضا نے بے زاری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔

''ویسے آج تمہاری گفتگو اچھی رہی۔ تمہیں اس لڑکے کے مشورے پر عمل کرنا چاہئے۔ کیا نام تھا اُس کا...... وسیم وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں اپنے چینل سے اس طرح کا کوئی پروگرام شروع کرنا چاہئے۔ تم آج بات کرنا۔ اور ہاں! کل شام کو

میں تمہاری ملاقات دو ماڈرن مولویوں سے کرواؤں گا۔ کوشش کرنا کہ اگلے چند پروگراموں میں اُنہیں مہمان بناؤ۔''
اب کے احمد رضا خاموش رہا تھا۔
''میرا خیال ہے، اب مجھے چلنا چاہئے۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔ اس سے پہلے کہ تم مجھے دھکے دے کر نکال دو۔ تمہارے تیور مجھے کافی خطرناک لگ رہے ہیں۔'' اس نے قہقہہ لگایا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو احمد رضا نے یوں ہی بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملا لیا۔ اسے رخصت کرنے کے لئے اٹھا ہی نہیں۔ وہ خود ہی ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔
احمد رضا نے اس کے جانے کے بعد ایک گہرا سانس لیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ٹانگیں پھیلا لیں۔ وہ واقعی بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ آج دیر تک سوئے گا۔ لیکن ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ یوں ہی صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے لگائے اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ ایک ہفتہ رحیم یار خان میں رہا تھا۔ حالانکہ وہاں کوئی ایسا خاص کام بھی نہیں تھا۔ بس رچی یوں ہی اسے اپنے ساتھ لگائے پھرتا رہا تھا۔ وہ دو دن تک چک نمبر 151 میں رہے تھے۔ اس زیر تعمیر عمارت کے نزدیک ہی ایک چھوٹا سا مکان رچی نے خرید رکھا تھا، جس کے اندر سب سہولتیں تھیں۔ تین کمروں کو بیڈ روم بنا دیا گیا تھا۔ اور ایک بڑا کمرہ سٹنگ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس روز اسفندیار اور عظمت یار کے ساتھ کچھ دیر گفتگو کے بعد رچی، ارباب حیدر کے ساتھ کچھ معززین کے ساتھ ملنے چلا گیا تھا، جو اس سے ملاقات کے لئے آئے تھے۔ عظمت یار بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔
''تم کچھ دیر اسفند سے بات کرو احمد حسن! میں ان لوگوں سے مل کر آتا ہوں۔'' جاتے جاتے وہ مڑا تھا۔ ''ارے ہاں اسفندیار! یہ احمد حسن ہیں۔ شاید تم نے ٹی وی پر ان کو دیکھا ہو۔''
''نہیں تو۔'' اسفندیار نے سر ہلایا تھا۔ ''میں نے تو انہیں ٹی وی پر نہیں دیکھا۔ میں بہت کم ڈرامے دیکھتا ہوں۔ ویسے جب پہلے فلم شلم لگتی تھی تو دیکھتا تھا۔ اب بھی وی سی آر ہے میرے پاس۔ جب موڈ بنتا ہے تو کوئی فلم لے آتا ہوں۔'' اسے غالباً تفصیل سے بات کرنے کی عادت تھی۔
''اچھا تو یہ ٹی وی پر آتے ہیں۔ کون سے پروگرام میں؟ مجھے ان کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔'' اس نے سنا، عظمت یار، رچی سے باہر جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''ویسے آپ کس ڈرامے میں آتے ہیں؟'' اسفندیار پوچھ رہا تھا۔
وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔
''میں ایک ٹاک شو میں آتا ہوں۔ ''سیمل'' چینل سے۔''
''اوہ...... اچھا'' اسفندیار نے مایوسی سے سر ہلایا تھا۔ ''ہمارے ہاں صرف پی ٹی وی کے پروگرام آتے ہیں۔''
''اچھا...... آپ کا گاؤں بہت خوب صورت ہے۔'' احمد رضا نے تعریف کی۔ ''بلکہ پورا ضلع ہی بہت خوب صورت ہے۔ میں ایک دو بار رحیم یار خان سٹی آیا تھا۔ بہت پہلے کی بات ہے۔''
''ہم بھی پہلے رحیم یار خان بہت جاتے تھے۔ میری نانی رہتی تھیں وہاں۔ ان کی وفات کے بعد بس دو تین دفعہ ہی گیا ہوں، وہ بھی اریب فاطمہ کو لینے۔ اریب فاطمہ میری بہن ہے۔ وہ پہلے رحیم یار خان میں رہتی تھی۔ پڑھنے کے لئے۔'' اسفند نے بتایا تھا۔
اس نے سر ہلا دیا۔
''میں ایک بار یہاں بھی آیا تھا آپ کے گاؤں میں۔ دس گیارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میٹرک میں تھا تب میں۔ ہمارے ایک جاننے والے تھے حسن رضا صاحب، ان کے ساتھ آیا تھا۔''
اس نے ذرا سا رک کر اسفندیار کے چہرے پر دیکھا تھا۔ وہ اس نام کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ بہت توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''حسن رضا صاحب کا بیٹا میرا دوست تھا۔ احمد رضا نام تھا اس کا۔ حسن رضا صاحب یہاں اپنی کسی کزن سے بھی ملے تھے۔ وہ اسی گاؤں میں رہتی تھیں۔ پتہ نہیں اب بھی رہتی ہیں یا نہیں۔ دراصل میں ملک سے باہر تھا۔ اب کچھ عرصہ پہلے ہی آیا ہوں اور بہت جی چاہتا ہے اپنے دوست سے ملنے کا۔ لیکن معلوم نہیں وہ لوگ اب کہاں ہیں۔ احمد رضا کہتا تھا، تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ رحیم یار خان چلا جائے گا۔''

''اب پتہ نہیں آپ کا دوست، رحیم یار خان میں کہاں رہتا ہے؟ ایسے کیسے ڈھونڈا جا سکتا ہے کسی کو؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' احمد رضا مایوس ہوا۔ اس نے سوچا تھا، شاید اسفند یار کو کچھ علم ہو حسن رضا صاحب کا۔ کیا پتہ وہ لاہور چھوڑ کر یہیں بس گئے ہوں۔ دلِ خوش فہم چھوٹی سی کرن پا کر اُمیدوں کے چراغ جلا لیتا ہے۔

''ویسے آپ کے دوست کے والد...... کیا نام بتایا تھا آپ نے؟''

''حسن رضا۔'' وہ فوراً بولا تھا۔

''اور حسن رضا صاحب کی کزن کا نام کیا بتایا تھا آپ نے؟''

''نام تو مجھے معلوم نہیں۔''

''اوہ، خیر...... میں اماں سے پوچھوں گا۔ کیا پتہ، وہ حسن رضا صاحب کی کزن کو جانتی ہوں۔ ہمارے ننھیال والے بھی رحیم یار خان سے ہیں۔''

''ہاں ضرور پوچھئے گا۔ کیا خبر وہ جانتی ہوں اور برسوں سے بچھڑے دوست سے ملاقات ہو سکے۔''

بجھتا ہوا چراغ پھر جھلملانے لگا تھا اور اس جھنجلاہٹ میں ایک اُمید دمکتی تھی۔ بچھڑوں سے ملنے کی اُمید۔

اس روز وہ چک نمبر 151 میں ہی ٹھہرے تھے۔ رچی نے جب بتایا کہ آج اسے یہیں ٹھہرنا ہے، کل کسی وقت وہ صادق آباد جائیں گے تو اسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے دعا کی تھی۔ کاش! آج رچی یہیں رہ جائے۔ اور کبھی کبھی دعائیں یوں اچانک پوری ہو جاتی ہیں۔

رات وہ بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ ایک امید کی لو تھی جو جلتی، بجھتی اور بھڑکتی تھی۔ ارباب حیدر اور رچی نے اس سے کیا کیا کہا تھا، اس نے دھیان سے نہیں سنا تھا۔ بس رچی کے دیئے کاغذات سنبھال لئے تھے۔ آئندہ آنے والے دنوں میں اسے یہ سب بولنا تھا۔ اپنے پروگرام میں اور گھر میں طلباء اور دوسرے جوانوں کے سامنے۔ آج تک اس نے جو بھی لکھا اور جو بھی بولا تھا، سب اسے لکھا ہوا ملتا تھا۔ ہر پروگرام میں ایک یا دو جملے ہائی لائٹ کئے ہوتے تھے۔

رچی نے اس کی بیزاری محسوس کر لی تھی۔

''کیا بات ہے احمد رضا! تم ہماری بات دھیان سے نہیں سن رہے ہو۔''

''سب جانتا ہوں۔ سب علم ہے مجھے رچی!...... آخر ڈیڑھ دو سال سے یہی کچھ تو کر رہا ہوں۔''

''اور تمہیں یہی کچھ کرنا ہے احمد رضا!'' رچی کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ ''صبح تم سے بات ہو گی۔ فی الحال آرام کرو۔''

وہ خاموش رہا تھا۔ اس نے سنا، باہر نکل کر رچی نے ارباب حیدر سے کہا تھا۔

''ابھی کچھ دن احمد رضا یہیں رہے گا اور تم اس کے ساتھ رہو۔ مجھے اس کا لہجہ پسند نہیں آیا۔ میں اس کا ریزن جاننا چاہتا ہوں۔''

اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں موندتے ہوئے اسے بڑی شدت سے احساس ہوا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ان کا غلام بن گیا ہے۔ وہ رات گزر ہی نہیں رہی تھی۔ اتنی لمبی رات...... صبح اٹھا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ناشتہ بھی اس نے برائے نام ہی کیا تھا۔ اسے رچی کی نظریں مسلسل خود پر محسوس ہو رہی تھیں۔

''آج الوینا بھی آ جائے گی۔ میں نے سوچا ہے، وہ یہاں کی خواتین کو کچھ ٹریننگ دے دے کہ اس سینٹر کو کیسے چلانا ہے۔''

اس نے سر ہلایا تھا۔ الوینا کے آنے کا سن کر اس نے کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ مسلسل اسفندیار کے متعلق سوچ رہا تھا۔ پتہ نہیں اس نے اپنی اماں سے حسن رضا کے متعلق پوچھا تھا یا نہیں۔ حالانکہ جانے سے پہلے اس نے بہت تاکید کی تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں احمد رضا! کہ تم کچھ دن یہاں الوینا کے ساتھ رہو۔ تم مجھے کچھ تھکے تھکے لگ رہے ہو۔ چینج ملے گا۔'' رچی اب بھی بغور اسے دیکھ رہا تھا اور اسے رچی کے اس طرح دیکھنے سے خوامخواہ اُلجھن ہو رہی تھی۔

''الوینا کہہ رہی تھی، تم نے اسے پروپوز کیا ہے۔ کیا تم واقعی اس کے لئے سنجیدہ ہو احمد رضا؟''

اب کے وہ چونکا تھا۔ ''ہاں۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں بات کروں گا الوینا کے پیرنٹس سے۔'' رچی نے اس کے کندھے پر تھپکی دی تھی۔ ''وِش یو گڈ لک۔''

اتنی دیر میں پہلی بار وہ مسکرایا تھا۔ رچی کو کسی سے ملنا تھا۔ وہ چلا گیا تو وہ ایک بار پھر اسفندیار کے متعلق سوچنے لگا۔

اسفندیار کوئی گیارہ بجے کے قریب آیا تھا اور اس دوران اس نے سینٹر کے کوئی چار چکر لگائے تھے اور پھر وہیں آفس میں بیٹھ گیا تھا۔

''کیا الوینا کا انتظار کر رہے ہو؟'' ارباب حیدر نے شرارت سے اسے دیکھا۔

''پتہ نہیں۔'' اس کی نظریں دروازے کی طرف لگی تھیں۔

''وہ تو شام تک آئے گی۔ نتاشا کے جانے کے بعد دراصل وہ یہاں آنے کے لئے تیار نہیں ہے اور وہ سوات جا رہی ہے۔ نتاشا کے والدین نے اسے بڑی مشکل سے سوات میں کام کرنے کی اجازت دی تھی۔ شاید اس لئے۔''

''شاید۔'' اس نے سر ہلایا تھا۔

''الوینا اچھی لڑکی ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر وہ تمہاری شریکِ زندگی بن جائے۔''

''الوینا کون ہے؟...... کہاں کی رہنے والی ہے؟...... مسلم ہے یا رچی کی طرح غیر مسلم؟''

''رچی مسلمان ہو چکا ہے۔ تم جانتے ہو۔''

''پتہ نہیں۔'' اس نے کندھے اچکائے تھے۔ ''یہاں سب لوگ ابھی تک اسے رچی کہہ کر بلاتے ہیں اور اسے کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا۔''

''سب نہیں صرف چند لوگ۔'' ارباب حیدر نے تصحیح کی تھی۔ ''اور وہ بھی اس لئے کہ ان کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ اس کا مسلم نام عزیز ہے۔''

''شیخ عبدالعزیز۔'' اُس کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ اُبھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

ارباب حیدر نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیا بات ہے احمد رضا! تم کچھ شکوک و شبہات کا شکار نظر آ رہے ہو۔ اگر تمہارے دل میں رچی وغیرہ کے متعلق کچھ بدگمانی ہے تو نکال دو۔ یہ واقعی بہت مخلص لوگ ہیں اور ہم لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ تیسری دنیا کے تمام افراد کے لئے۔ وہ جو غربت اور بے بسی کا شکار ہیں۔''

''بغیر کسی غرض کے؟'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''ہاں۔ بغیر کسی غرض کے۔ جیسے تمہارے عبدالستار ایدھی۔''

اس بار اس نے صرف سر ہلایا تھا۔ اس کی نظریں کھلے دروازے سے گیٹ کھول کر اندر آتے اسفندیار کو دیکھ رہی تھیں۔ کافی بڑا احاطہ تھا اور پھر کمرے تھے۔ اسفندیار احاطہ طے کر کے آفس کی طرف ہی آ رہا تھا۔

''تم اس بے وقوف لڑکے سے گپ لگاؤ۔ میں فون سن کر آتا ہوں۔''

اس نے فون اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل کر اسفندیار کو دور سے ہی ہاتھ ہلاتا ہوا کسی اور کمرے میں گم ہوگیا۔ وہ بے چینی سے اسفندیار کو آتے دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں اس نے اپنی اماں سے بات کی یا نہیں...... پتہ نہیں اس کی اماں کو امی ابو کے متعلق بھی کچھ معلوم ہے یا نہیں۔

اسفند بڑی گرم جوشی سے اسے ملا تھا۔ احمد رضا نے بھی گرم جوشی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔

''شیخ عبدالعزیز صاحب کہاں ہیں؟'' اسفندیار نے بیٹھنے سے پہلے کھوجتی نظروں سے چاروں طرف دیکھا تھا۔

''کسی کام سے گئے ہوئے ہیں آتے ہیں۔'' اس نے اپنی بے تابی چھپاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''کیا شخصیت ہے شیخ صاحب کی بھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے دل والے اور ہمدرد انسان نہیں دیکھے۔ کیوں احمد حسن صاحب! صحیح کہہ رہا ہوں نا میں؟''

''جی...... جی ہاں بالکل۔ آپ نے ٹھیک کہا۔'' اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا اور پھر خود ہی پوچھ لیا۔ مزید انتظار اب ممکن نہیں تھا۔

''وہ آپ نے اپنی اماں سے پوچھا تھا، حسن رضا کے متعلق؟''

''جی ہاں بالکل پوچھا تھا۔'' وہ ہنسا۔

وہ سانس روکے اسفندیار کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اور دیکھو ذرا، میری اماں ہی تو آپ کے حسن رضا صاحب کی کزن ہیں۔ لیکن اماں کو نہیں پتہ ان کا کہ وہ کہاں ہوتے ہیں آج کل۔ وہ بھی کوئی دس گیارہ سال پہلے ملی تھیں ان سے۔ اماں دراصل ان کی فرسٹ کزن نہیں ہیں۔''

''تو کیا مجھے کبھی اب ان کا پتہ معلوم نہیں ہو سکے گا؟'' ایک گہری مایوسی اس کے اندر اُترنے لگی تھی۔

''اماں کہہ رہی تھیں، پہلے تو وہ لاہور میں ہی رہتے تھے۔ ان کا لاہور والا ایڈریس تو ہے اماں کے پاس۔ لیکن میں نے اماں سے کہا کہ وہ اب وہاں نہیں ہیں۔ اماں بتا رہی تھی کہ ایک بار دو تین سال پہلے وہ رحیم یار خان گئیں تو پتہ چلا کہ ان کا بیٹا مرتد ہوگیا ہے اور وہ اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں کہیں۔''

''نہیں......'' احمد رضا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ایک لمحہ کو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔ ''وہ ایسا نہیں تھا۔''

''ہاں۔'' اسفندیار نے لاپروائی سے کہا۔ ''اماں بھی کہہ رہی تھیں کہ وہ غلط خبر تھی۔ وہ تو اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے، اب تک آ گیا ہو۔ اماں کبھی رحیم یار خان گئیں تو پتہ کریں گی۔ آپ مجھے اپنا نمبر دے دینا۔ میں بتا دوں گا آپ کو۔ لگتا ہے بہت گہرے دوست تھے آپ کے وہ؟''

اور احمد رضا نے سر ہلا دیا تھا۔

ساری رات اس کے اندر اُمیدوں کے دیے جلتے رہے تھے۔ ساری رات وہ اس آس میں جاگتا رہا تھا کہ شاید صبح اسفندیار سے ان کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔

''آپ چلیں نا گھر۔ اماں سے ملواؤں گا آپ کو۔ اماں کہہ رہی تھیں، احمد کا دوست ہے تو گھر کھانے پر بلا لو۔''

''ہاں ضرور۔ کسی روز چلوں گا۔''

ایک دم ہی تھکن اور نیند نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اب گھر جا کر سونا چاہتا تھا۔ تب ہی ارباب حیدر واپس آ گیا تو وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

''ارباب حیدر! میں رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ کیا میں گھر جا کر کچھ دیر سو سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں؟ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟'' ارباب حیدر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں نے سوچا شاید کوئی کام ہو۔''

''نہیں۔ فی الحال تو تمہارے کرنے کو ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''اوکے پھر میں چلتا ہوں۔'' اس نے اسفند سے ہاتھ ملایا۔ ''ان شاء اللہ آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔''

وہ باہر نکلا تو اس نے سنا۔ ارباب حیدر پوچھ رہا تھا کہ کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ اور جیسا کہ دو ملاقاتوں میں اس نے جانا تھا، اسفند یار غیر ضروری تفصیلات تک بتانے کا عادی تھا۔ وہ اپنی اور اس کی گفتگو کے متعلق سب کچھ بتا چکا ہوگا اور اگر ایسا ہو بھی تو کیا ہوا۔ اپنے والدین کو تلاش کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔ اور رچی نے خود اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے متعلق پتہ کروائے گا اور اس نے کوشش بھی کی تھی، اُنہیں ڈھونڈنے کی۔

کمرے میں آتے ہی وہ بیڈ پر گر گیا اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔

'پانچ سال...... پانچ سال میں جانے کیا کچھ ہو چکا ہوگا...... پتہ نہیں، امی ابو...... نہیں نہیں، کچھ نہیں ہو سکتا۔' آنسو اس کی آنکھوں سے نکل نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

آج بہت سارے دنوں بعد وہ پھر ان سب کو یاد کر کے رو رہا تھا۔ پھر وہ یوں ہی انہیں یاد کرتے اور روتے سو گیا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو گھر میں کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو رچی اور ارباب حیدر کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے اور ملازم لڑکا ٹیبل پر کھانا لگا رہا تھا۔

''آؤ...... آجاؤ۔ میں نے سمجھا تم سو رہے ہو، اس لئے اٹھایا نہیں۔'' رچی کا لہجہ بے حد خوشگوار تھا۔ وہ اس وقت بھی عربی لباس میں تھا۔

اسے بھی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے آکر ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا۔

''تم کچھ پریشان ہو احمد رضا!...... سوری یار! میں نے...... میرا مطلب ہے کہ میں نے پھر پتہ ہی نہیں کروایا کہ وہ لوگ کہاں گئے۔'' غالباً ارباب حیدر اسے سب کچھ بتا چکا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ جب مقدر میں ہوگا، ملاقات ہو جائے گی۔''

''نہیں یار! میری غلطی، میں نے اگنور کر دیا۔ میں سمجھا شاید تم انٹرسٹڈ نہیں رہے۔''

احمد رضا نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''رچی! کیا تم اپنی زندگی سے گزرے تیس سال خارج کر سکتے ہو؟...... کیا تم بھول سکتے ہو کہ تمہیں جنم دینے والے کون تھے؟ وہ گھر جہاں تم نے آنکھ کھولی، جہاں تم پلے بڑھے؟''

''میری بات چھوڑو۔'' رچی مسکرایا تھا۔ ''لیکن میں جانتا ہوں، تم نہیں بھول سکتے۔ وعدہ! سب سے پہلا کام مجھے اب یہی کرنا ہے۔''

مایوسی نے پھر اُمید کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ تب ہی ملازم لڑکے نے گوبھی گوشت کا ڈونگا آکر رکھا۔

''تو سارے گھر میں اس کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔'' وہ مسکرایا۔

اس کی امی بھی جب گوبھی گوشت پکاتی تھیں تو سارے گھر میں یونہی خوشبو پھیل جایا کرتی تھی۔

''یار! تمہارے ہاں کے کھانے بندے کو اسیر کر لیتے ہیں۔'' رچی اب ارباب حیدر سے مخاطب تھا۔ ''یورپ جاتا ہوں تو وہاں کے پھیکے کھانے اچھے نہیں لگتے۔ ہر جگہ پاکستانی اور ہندوستانی ہوٹل ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔''

احمد رضا بہت رغبت سے کھا رہا تھا جب اچانک رچی نے اسے مخاطب کیا۔

''احمد رضا!......'' اس کی عادت تھی، وہ یونہی باتوں کے دوران اچانک کوئی بہت اہم بات کہہ جاتا تھا۔

''سنو! تم اپنے کسی پروگرام میں طیب خان کو انوائٹ کرو۔''

''کس حیثیت سے؟''

''ایک عالم اور متقی شخص کی حیثیت سے۔''

احمد رضا نے حیرت سے اسے دیکھا اور اس کی نظر ارباب حیدر پر پڑی تھی جو اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں اپنی مرضی سے کسی کو انوائٹ نہیں کر سکتا۔ ہاں، رائے دے سکتا ہوں۔ فائنل اقدام تو چینل والوں کا ہی ہوتا ہے۔''

''اس کی تم فکر مت کرو۔ آئندہ چند پروگراموں کے لئے مہمانوں کی لسٹ میں تمہیں دوں گا۔ ڈائریکٹر کو دے دینا۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن طیب خان! میرا مطلب ہے وہ تو......'' وہ اُلجھ رہا تھا۔

''کھانا کھالو اطمینان سے۔ پھر میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔'' رچی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

کھانے کے بعد رچی نے اسے جو وڈیو کلپ دکھایا تھا، وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

وہ یقیناً طیب خان تھا۔ اس کی داڑھی پہلے کے مقابلے میں کافی لمبی تھی۔ وہ اپنے اسی ڈریس میں تھا۔ سبز افغانی ہیٹ، کلاشنکوف اور سر پر پٹخول۔ وہ شاید کسی کوٹھی کا گیراج تھا اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف زمین پر آلتی پالتی مارے وہ بیٹھا تھا۔ لوگ آ آ کر اس کے ہاتھ چوم رہے تھے اور جگہ نہ ہونے کے باعث عقیدت کے باعث ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔

''کیا یہ بھی نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہے؟'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا اور رچی اور ارباب نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

''نہیں..... یہ حقیقتاً ایک نیک شخص ہے۔ جہادِ افغانستان میں شرکت کی وجہ سے دنیا سے محبت نہیں رہی اسے اور اس کا مذہب کی طرف جنون زیادہ ہو گیا ہے۔ پشاور اور حیات آباد میں ہزاروں مرید ہیں اس کے۔''

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

❁○❁

اگلے چند دن الوینا اس کے ساتھ ہی رہی تھی اور اس نے ڈسٹرکٹ رحیم یار خان کی کئی جگہیں دیکھی تھیں۔ بلاشبہ یہ ایک خوبصورت علاقہ تھا۔ الوینا کے ساتھ گھومتے، باتیں کرتے بار بار اس کے دل میں خیال آتا تھا کہ وہ الوینا کے ساتھ مل کر ایک گھر کی بنیاد رکھ لے۔ شاید اندر جو اتنے گہرے خلا بن گئے ہیں، وہ پُر ہو جائیں۔ امی، ابو، سمیرا سے وہ کبھی نہ مل سکے شاید۔

کبھی کبھی وہ بالکل مایوس ہو جاتا اور کبھی کوئی امید سی جاگ اُٹھتی تھی کہ شاید کبھی اچانک وہ اسے مل جائیں......راہ چلتے میں وہ اسے نظر آ جائیں۔ کہیں شاپنگ کرتے، کسی مارکیٹ، کسی گلی میں۔ اس روز وہ مسجد ھونگ صادق آباد دیکھ کر واپس اپنی قیام گاہ پر آئے تھے۔

الوینا اس کے سامنے کسی پر بیٹھی تھی اور وہ اپنے بیڈ پر نیم دراز اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ شلوار قمیض میں ملبوس تھی اور بڑا سا دوپٹہ شانوں پر پڑا تھا۔ سنہری بالوں کے گچھے سے بنے کندھوں پر جھول رہے تھے۔ وہ میک اپ سے بے نیاز بہت دلکش لگ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' الوینا نے پوچھا تھا۔

''تمہیں دیکھ رہا تھا الوینا!...... پاکستانی ڈریس تم پر بہت سوٹ کرتا ہے۔ کیا تم پاکستانی ہو؟'' اس نے بالکل رچی کی طرح درمیان میں بات کی تھی۔ وہ چونکی تھی۔

''ہاں..... نہیں۔ میرا مطلب ہے، میری والدہ امریکن ہیں اور والد پاکستانی۔''

''میری طرح کیا؟'' اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں۔ بس یونہی۔''

''یونہی نہیں احمد رضا!...... مجھے پتہ ہے، رچی نے تمہارا جو بائیو ڈیٹا تیار کیا تھا، اس میں تمہاری والدہ کا تعلق اسپین سے لکھا تھا۔ لیکن میری ممی سچ مچ امریکن ہیں اور فادر.....''

''لیو اِٹ یار! میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا۔''

''کیا تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو احمد رضا؟''

''پتہ نہیں، لیکن میں اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں اور میری سوچ پلٹ پلٹ کر تمہاری طرف آتی ہے کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہو شاید۔ اور میں چاہتا ہوں، صرف تم ہی رہو میری زندگی میں۔ کل رات میں نے بہت ایمان داری سے غور کیا تھا، جب ارباب حیدر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ فرض کرو اگر الوینا کی شادی تمہارے ساتھ نہ ہو سکی تو تم کیا محسوس کرو گے؟ تو مجھے لگا تھا جیسے میں کچھ خاص محسوس نہیں کروں گا۔ شاید تھوڑا سا افسوس ہو۔ یا زیادہ ہو۔ ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ شاید ایک وقت میں جب ہم مل کر ایک گھر کی بنیاد رکھیں گے تو مجھے تم سے بہت شدید محبت ہو جائے۔ ایک وقت ایسا تھا جب مجھے لگا تھا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ بہت شدید محبت۔''

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''جب ہم پہلی بار ملے تھے اور وہاں اس گھر میں تم مجھ پر بہت مہربان تھیں تو مجھے لگا تھا کہ میں تم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں۔ اور میں نے سوچا تھا، میں پہلے تمہیں سمیرا سے اور پھر امی سے بھی ملواؤں گا۔ تب میں نے بہت پلان بنائے تھے۔ لیکن پھر سب کچھ غلط ہو گیا۔ یہ صرف تم تھیں الوینا! جس کی کشش نے مجھے باندھ رکھا تھا۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ ورنہ میں جیل اور مارے جانے کے خوف کے باوجود وہاں سے بھاگ جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ جب میں ابو کے پیر پکڑ لوں گا تو وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ سمیرا اور امی ضرور میری سفارش کریں گی۔ لیکن تب میں تمہیں کھونے کے تصور سے ڈرتا تھا۔ مجھے واقعی لگتا تھا جیسے میں تمہاری محبت میں بری طرح مبتلا ہو گیا ہوں۔ تب میں نے سوچا تھا تم کھو گئیں تو شاید میں پھر تمہیں کبھی نہ پا سکوں۔ امی، ابو کا کیا ہے۔ کسی بھی وقت انہیں منا لوں گا۔ تب میں کتنا غلط تھا الوینا! اتنا عرصہ تم مجھے نہیں ملیں......تو میں نے جانا کہ وہ شاید محبت نہیں تھی، وقتی کشش تھی۔''

''ہاں تب ہی تو جب تم دو سال بعد امریکہ میں ملے تو کوئی خاص گرم جوش نہیں تھے۔''

''ہو سکتا ہے، تمہیں ایسا لگا ہو الوینا! لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا تھا۔ ہاں، تم نے زیادہ لفٹ نہیں کروائی تھی۔ صرف چند ملاقاتیں اور وہ بھی اجنبیت لئے ہوئے تھیں۔''

''میں ایئرپورٹ پر تمہیں خدا حافظ بھی کہنے آئی تھی۔ تم اندر لاؤنج میں جا چکے تھے۔''

''ہاں۔ بعد میں رچی نے مجھے بتایا تھا لیکن میں نے اس آخری ملاقات کے بعد...... پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ہم ایک خوشگوار زندگی گزاریں گے اور ایک دن آئے گا جب ہمیں لگے گا کہ ہم ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ ایسا ہی ہو گا نا الوینا؟''

اس نے اپنا ہاتھ الوینا کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ لیکن الوینا نے یکدم ہی اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ حیران سا اسے باہر جاتے دیکھتا رہا تھا۔ ان کے درمیان اتنی قربت رہی تھی کہ وہ کم از کم اس بات پر ناراض نہیں ہو سکتی تھی کہ اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ کیوں رکھا۔ پھر یکایک اسے کیا ہوا تھا کہ وہ اُٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ کچھ دیر وہ سوچتا رہا، پھر بیڈ سائیڈ ٹیبل سے وہ فائل نکال کر دیکھنے لگا جس میں اس کے پروگراموں کی تفصیل تھی۔ یہ سب اسے رچی نے لکھ کر دیا تھا۔

شروع شروع میں وہ تنہا ہی پروگرام کرتا تھا لیکن پچھلے دو ماہ سے مہمان بلانے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اور یہ اس کے ڈائریکٹر نے کہا تھا۔ لیکن رچی کو بہت پسند آئی تھی یہ بات۔

وہ سرسری نظروں سے ان موضوعات کو دیکھ رہا تھا، جن پر اسے بولنا تھا کہ یکدم ٹھٹک گیا۔ یہ ٹاپک تھا، نائن الیون کے

بعد پاکستان کے حالات۔
پاکستان کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے کچھ شخصیات کے نام تھے جن کا تعلق الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے تھا۔ یہ حضرات سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں۔ موساد انہیں نوازتا ہے۔ ''را'' سے ان کے تعلقات ہیں۔
''نہیں..... یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟..... یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں؟..... میرے پاس کیا ثبوت ہیں کہ میں ان معزز لوگوں پر الزام لگاؤں؟..... لوگ تو مجھے پتھر ماریں گے۔''
وہ فوراً فائل ہاتھ میں لے کر اٹھا تھا۔ تاکہ رچی سے اس کے متعلق بات کر سکے۔ آج تک اس نے جتنے بھی پروگرام کئے تھے، ان میں ایسا کچھ نہیں تھا جسے بولتے ہوئے اسے ڈر لگا ہو۔ بلکہ اسے وہ سب سچ ہی لگتا تھا۔ اور اسے رچی پر حیرت ہوتی تھی جو حالات کا اتنا صحیح تجزیہ کرتا تھا۔ رچی کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ دروازے پر دستک دیتے دیتے رک گیا تھا۔
''آخر تمہیں اعتراض کیا ہے احمد رضا سے شادی کرنے میں؟'' یہ رچی تھا۔
''تم نہیں جانتے؟'' الوینا کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''میں شادی شدہ ہوں۔ میرا شوہر ہے، بچے ہیں۔''
''تو کیا ہوا؟'' رچی نے لاپروا سے انداز میں کہا تھا۔ ''تمہاری شادی کو کیا ہونا ہے؟ پہلے بھی تو تم اس کے ساتھ رہتی رہی ہو۔ اب شادی کے نام پر رہ لینا۔ رہے تمہارے بچے اور شوہر تو انہیں کیا پتہ؟..... وہ کچھ اپ سیٹ اور اُکھڑا اُکھڑا سا ہے الوینا! اور میں چاہتا ہوں، وہ ریلیکس رہے۔ ہمیں اس سے بہت کام لینے ہیں۔ تم نہیں جانتیں، وہ کتنی پسندیدہ شخصیت بن چکا ہے۔ ہمیں ان کے اندر گھس کر ہی کام کرنا ہے۔''
اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔
وہ مرے مرے قدموں سے واپس پلٹا تھا اور فائل بیڈ پر پھینک کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ، وہ نہیں تھا جو لوگ اسے سمجھ رہے تھے۔ وہ کتنے لوگوں کو دھوکا دے رہا تھا۔ لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، وہ سب سچ تھا۔ پاکستان کو تباہ کرنے کی سازشیں کی جا رہی تھیں۔ وہ عالم اسلام کو ختم کرنا چاہتے تھے۔
وہ اس سے کیا کام لینا چاہتے تھے، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ پہلے اسے نوجوانوں کا ہیرو بنانا چاہتے تھے اور پھر......
اس روز وہ پھر کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ حالانکہ الوینا کا پروگرام قلعہ منٹو دیکھنے کا تھا۔
''میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے الوینا! پلیز تم ارباب کے ساتھ چلی جاؤ۔''
''میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔'' الوینا نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا۔
''نہیں پلیز۔'' اس نے آہستگی سے الوینا کا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔
الوینا کی آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے حیرت اُبھر کر معدوم ہو گئی تھی لیکن اس نے الوینا کی طرف نہیں دیکھا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں۔ شاید کوئی اور وقت ہوتا تو الوینا کے ہاتھوں کا لمس اس کا سارا درد ختم کر دیتا۔ لیکن اس وقت اسے الوینا کی موجودگی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔
''او کے۔ پھر ریسٹ کرو تم۔''
اس کے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ لیکن کسی ایک نکتے پر اس کی سوچ مرکوز نہیں ہو پا رہی تھی۔ کیا رچی نے اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلا تھا؟ کیا وہ کسی سازش کا شکار ہوا تھا؟ وہ تو رچی کو اپنا محسن سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے یہاں سے بچا کر لے گیا تھا۔ اس نے آج تک وہی کیا تھا جو رچی نے کہا تھا۔ لیکن اس میں غلط کیا تھا؟ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
یہ رچی تھا، جس کی وجہ سے اسے اتنی دولت اور شہرت ملی تھی۔
یہ شہرت اسے احمد رضا کے نام سے نہیں ملی تھی۔ احمد حسن کے نام سے ملی تھی۔ لیکن احمد حسن بھی تو وہ ہی تھا نا۔ آنکھیں موندے موندے اسے یاد آیا کہ ایک بار اس نے سمیرا سے کہا تھا۔

''دولت اور شہرت مجھے جس طرح بھی ملی، قبول ہو گی۔''

''بھلے وہ شہرت ہٹلر جیسی ہو یا چنگیز خان جیسی؟''

اور اس نے تب سمیرا کو چڑانے کے لئے کہا تھا۔

''ہاں۔ بھلے ہٹلر اور چنگیز خان اور ہلاکو جیسی ہو۔ شہرت تو ہو گی نا۔ تاریخ میں نام زندہ رہے گا۔''

اور تب سمیرا خفا ہو کر اس کے کمرے سے چلی گئی تھی۔

آخری دو دن اس نے پھر چک نمبر 151 میں گزارے تھے۔ الوینا اور رچی کے ساتھ وہ وہاں گیا تھا۔ اس نے الوینا کی طرف دیکھنے اور بات کرنے سے گریز کیا تھا۔ بلکہ اس روز کے بعد سے اس کی الوینا سے بہت کم بات ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے احمد رضا! تم مجھ سے بھاگ رہے ہو؟''

''نہیں تو۔'' اس نے چک نمبر 151 میں آنے سے پہلے پوچھا تھا۔ وہ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کی اور رچی کی بات سن چکا ہے۔ کیسی عورت تھی یہ۔ شوہر اور بچوں کے ہوتے ہوئے۔ وہ حیران ہوتا تھا اور الوینا بار بار اس کے قریب آنے کی کوشش کرتی تھی۔ شاید رچی نے اس سے کہا تھا۔

چک نمبر 151 کے سینٹر میں کام شروع ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، ہال نما کمرے میں دس بارہ سلائی مشینیں آ گئی تھیں اور دوسرا سامان بھی تھا۔ رچی کے آفس میں بیٹھے ہوئے اس نے عورتوں اور لڑکیوں کو چادریں اوڑھے احاطے میں سے گزر کر ہال میں جاتے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ رچی کو یہاں کافی پسند کیا جاتا تھا۔ جو لوگ بھی اس سے ملنے آتے تھے، وہ بہت عقیدت سے ملتے تھے اسے۔ اور پھر یہ جو کچھ وہ کر رہا تھا، اس میں کیا برائی تھی۔ وہ ان لوگوں کی مدد کر رہا تھا۔

اس نے دیکھا تھا، ایک کمرے میں بچوں کی کاٹ بھی تھی۔ تاکہ بچوں والی عورتوں کو سہولت رہے۔ سلائی اور دوسرے ہنر سیکھنے کے بعد ان کا کام شہر میں فروخت کے لئے بھیجا جائے گا۔ اس طرح انہیں گھر بیٹھے روزگار مل جائے گا۔

آخر اس کے پیچھے کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

وہ سوچ رہا تھا۔ اور الوینا کی باتوں سے کچھ بھی اخذ نہیں کر پایا تھا۔ وہ بہت کچھ جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ لیکن کیسے؟ پہلی بار جب وہ ابراہیم کے ساتھ اسمٰعیل کے گھر گیا تھا۔ کاش! وہ دن اس کی زندگی میں کبھی نہیں آتا۔

''کیا تمہیں کوئی بات پریشان کر رہی ہے احمد رضا؟''

اس نے محسوس کیا تھا کہ رچی ان دنوں اسے بغور دیکھتا رہتا تھا۔

''نہیں تو...... بس ایسے ہی۔ میں اس سینٹر کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ایسے سینٹر ہر گاؤں میں ہونے چاہئیں۔ یہ بہت اچھا کام کر رہے ہو تم۔''

''ہاں! ہم دنیا سے غربت اور جہالت ختم کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔'' رچی مسکرایا۔ ''تمہارے اس ملک میں عورتوں کے ساتھ بہت ناانصافی ہوتی ہے۔ بہت ظلم ہوتا ہے ان پر۔ ہم اس پر بھی کام کریں گے۔''

''ایسا نہیں ہے رچی! ہمارے دین نے عورت کو جو مقام اور مرتبہ دیا ہے، وہ کسی اور دین نے نہیں دیا۔''

''تم اپنے دین پر کتنا عمل کرتے ہو احمد رضا؟'' رچی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''خیر! چھوڑو۔ میں نے الوینا سے بات کی ہے تمہاری شادی کی۔ ذرا یہاں کے کام سے فارغ ہو جاؤں تو پھر کچھ کرتے ہیں۔''

''نہیں رچی! فی الحال میں نے شادی کا ارادہ کینسل کر دیا ہے۔''

''کیوں؟...... کیا الوینا سے کوئی ناراضگی ہو گئی ہے؟'' وہ ہنسا۔ وہ بھی مسکرا دیا اور بات بنائی۔

''ارے نہیں۔ بس میں نے سوچا، انتظار کر لوں کچھ اور۔ شاید مجھے اپنے والدین مل جائیں۔ تم نے کہا تھا نا، تم کوشش کرو گے ان کو ڈھونڈنے کی...... تو پھر......''

''ہاں ہاں! ٹھیک ہے۔''
رچی کے چہرے پر اطمینان نظر آیا تھا۔
''یہ ٹھیک ہے۔ والدین کے ملنے کے بعد ہی شادی کا پروگرام بناتے ہیں اور......''
وہ بات ادھوری چھوڑ کر باہر دیکھنے لگا۔ احاطے میں سے اسفندیار آتا دکھائی دیا۔
''بے وقوف۔'' رچی کے لبوں سے نکلا۔
پھر وہ احاطے میں ہی رک گیا اور مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ تب ہی گیٹ میں سے اس نے اندر قدم رکھا۔ سیاہ چادر، جس پر لگے چھوٹے چھوٹے شیشے دور سے ہی چمک رہے تھے اور سیاہ چادر کے ہالے میں چھپا وہ دلکش چہرہ۔ رچی اپنی سیٹ سے تھوڑا سا اُٹھ کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اشتیاق تھا اور آنکھوں میں عجیب سی چمک۔
احمد رضا کو اُس کا اس طرح دیکھنا برا لگا تھا۔
اسفندیار وہیں رک کر لڑکی کا انتظار کر رہا تھا۔ لڑکی اس کے قریب آ کر رکی۔ اسفندیار نے ہال کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکی ادھر مڑ گئی تو اسفندیار آفس کی طرف بڑھا۔ احمد رضا نے رچی کی طرف دیکھا۔ وہ اب اپنی کرسی پر بیٹھا تسبیح کے دانے گرا رہا تھا۔ اسفندیار نے اندر آ کر گرم جوشی سے سلام کیا۔
''السلام علیکم شیخ صاحب!''
اور پھر احمد رضا سے ہاتھ ملایا۔
سر کے اشارے سے رچی نے اس کے سلام کا جواب دے کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر تسبیح مکمل کر کے اسے کلائی پر لپیٹتے ہوئے اسفندیار کی طرف دیکھا۔
''کیسے ہو اسفندیار! اور عظمت صاحب کہاں ہیں؟ صبح سے نظر نہیں آئے۔''
''وہ تو آپ کے کام سے ہی گئے ہیں۔''
''اوہ ہاں!......اچھا......اور یہ لڑکی کون تھی تمہارے ساتھ؟......کیا سینٹر میں داخلہ لینے آئی ہے؟''
''نہیں، نہیں......'' اسفندیار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ تو میری بہن ہے، اریب فاطمہ۔ بتایا تھا نا میں نے، لاہور میں پڑھتی ہے۔''
''اوہ ہاں ہاں۔ یاد آیا۔ اچھا ہوا یہ آ گئی ہے۔ ہمارے پاس کام سکھانے والی اور نگران لڑکیوں کی بہت کمی ہے۔''
''نہیں۔ یہ تو بس چند دنوں کے لئے آئی ہے۔ اماں کہتی ہیں کہ اسے اپنی پڑھائی مکمل کرنا ہے۔ بی اے کر کے پھر آئے گی۔ بس تقریباً ایک سال ہی رہتا ہے۔'' اسفندیار تفصیل سے بات کر رہا تھا۔
''یہاں تو وہ زینب آپا سے ملنے آئی ہے۔ زینب آپا وہی، جو نگران ہیں سینٹر کی۔ عظمت بھائی نے ہی رکھوایا ہے انہیں یہاں۔ اریب فاطمہ سے بہت پیار کرتی ہیں وہ۔ اور اریب فاطمہ بھی جب گاؤں آئے تو ان سے ضرور ملتی ہے۔ میں نے بتایا تھا اسے کہ اب زینب آپا ادھر رہتی ہیں شام تک۔''
احمد رضا نے دیکھا، رچی بے زار سا کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہوا۔
''تم لوگ بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ ذرا زینب آپا سے پتہ کر لوں، نٹنگ مشینیں کتنی کافی ہوں گی۔''
''سر!......سر!''
احمد رضا نے چونک کر دیکھا۔ دروازے کے پاس ثمینہ حیدر کھڑی تھیں۔
''لنچ میں آپ کیا لیں گے؟''
''جو جی چاہے۔''
''اور کیا آپ کو شام کو ٹی وی اسٹیشن جانا ہے؟......آپ کے کپڑے وغیرہ نکال دوں؟''

''ہاں۔ جانا ہے۔''
''آپ یہاں لیٹے ہیں۔ بیڈروم میں جا کر سو جائیں آرام سے۔ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔''
''تھینک یو مس! میں یہاں بے آرامی محسوس نہیں کر رہا۔''
ثمینہ حیدر باہر چلی گئیں تو وہ کچھ دیر یوں ہی بے دھیانی سے سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھتا رہا اور پھر اسے عبایا والی لڑکی کا خیال آ گیا۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا، تب بھی اکثر پردہ دار لڑکیاں نظر آتی تھیں۔ خود ان کے محلے میں بھی کئی گھرانوں میں پردہ کیا جاتا تھا۔ لیکن اب جبکہ وہ تین سال بعد واپس آیا تھا تو اسے لگا تھا، جیسے کالجوں اسکولوں میں جانے والی اکثر لڑکیاں عبایا یا حجاب لینے لگی تھیں۔ اور ان مزید دو سالوں میں تو یہ رجحان اور بھی بڑھا تھا۔ اسے اچھی لگتی تھیں باپردہ لڑکیاں۔ اگر وہ کبھی سمیرا سے ملا تو اسے بھی عبایا لینے کو کہے گا۔ اپنے ہی خیالات کی تبدیلی پر وہ ہولے سے ہنسا۔
پانچ سال پہلے وہ ایسا نہیں سوچتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ کیا اس کے خیالات میں تبدیلی ابھی کچھ دیر پہلے ملنے والی اس باپردہ لڑکی کو دیکھ کر آئی تھی یا بتدریج پیدا ہوئی تھی؟ شاید بتدریج۔ ان دو سالوں میں باپردہ لڑکیوں کو ہر شعبے میں کام کرتے دیکھ کر۔
فون کی بیل ہو رہی تھی۔ کچھ دیر وہ میز پر پڑے فون کو دیکھتا رہا۔ جب اس نے ہاتھ بڑھایا تو بیل بجنا بند ہو گئی۔ اس نے جھک کر نیچے گرا ہوا کشن اٹھایا اور اسے سر کے نیچے رکھ ہی رہا تھا کہ بیل پھر ہونے لگی۔
اب کے اس نے بغیر توقف کے فون اٹھا لیا۔ رچی کا نمبر تھا۔ یقیناً جنید علی نے اسے رپورٹ دے دی ہو گی۔ یہ جنید علی بھی رچی نے غالباً اس کی نگرانی کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ اپنے آپ سے الجھتے ہوئے اس نے فون کیا اور رچی کی بات سننے لگا۔

''الریان'' میں بالکل خاموشی تھی۔ صرف مائرہ تھیں، جو صوفے پر خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کی گود میں ایک میگزین کھلا ہوا تھا۔ لیکن وہ میگزین نہیں پڑھ رہی تھیں۔ ان کا سارا دھیان ''ملک ہاؤس'' کی طرف تھا۔ ملک ہاؤس، جسے عبدالرحمٰن شاہ نے خرید لیا تھا۔ لیکن جب بھی اس کا ذکر ہوتا، اسے ملک ہاؤس ہی کہا جاتا۔

اس وقت ملک ہاؤس میں رونق لگی تھی۔ عبدالرحمٰن شاہ تو فلک شاہ اور عمارہ کے آتے ہی ادھر منتقل ہو گئے تھے۔ باقی لوگ دن بھر وہاں رہتے اور پھر رات کو اپنے اپنے ٹھکانوں پر آ جاتے تھے۔ عثمان بھی دبئی سے آ گئے تھے۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ مرتضیٰ بھی ایک لمبے عرصے بعد فرانس سے کل شام ہی اپنی بیوی کے ساتھ آئے تھے۔ بچوں کا پروگرام بعد میں آنے کا تھا۔

صرف مائرہ، احسان شاہ اور رابیل تھیں، جو ملک ہاؤس نہیں گئی تھیں۔ احسان شاہ اس وقت گھر پر نہیں تھے جبکہ رابیل اپنے کمرے میں تھی۔ عمر اور زبیر، ملک ہاؤس میں تھے۔

ان کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ ملک ہاؤس میں چلے جاتے تھے۔ زبیر نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ ''عادل کی اور حفصہ کی شادی دوبارہ نہیں ہو گی۔ آپ کے کسی سے جو بھی اختلافات ہوں، ہم عادل اور حفصہ کی شادی کو پوری طرح انجوائے کرنا چاہتے ہیں۔ پلیز! ہمیں مت روکیں۔''

تب احسان شاہ نے کہا تھا۔

''بچوں کو مت روکو مائرہ! یہ بچپن سے عادل اور حفصہ کے ساتھ ہیں۔ سگے بہن بھائیوں کی طرح رہے ہیں۔ انہیں ان کی شادی انجوائے کرنے دو۔''

اور انہیں احسان شاہ پر بہت غصہ آیا تھا۔

''میں نے کہا بھی تھا، بابا جان کو منع کریں۔ وہ انہیں یہاں مت بلائیں۔ وہ بہاول پور چلے گئے۔ عمارہ یہاں ہاسپٹل میں آئی۔ پھر شیردل کے گھر میں رہی۔ کیا ضروری تھا کہ اب اسے یہاں بھی بلایا جاتا؟ میں نے کہا بھی تھا، بابا جان سے کھل کر بات کریں۔''

''کی تو تھی میں نے بات۔'' احسان شاہ کا لہجہ مدھم تھا۔

اس روز جب وہ مائرہ کے کہنے پر عبدالرحمٰن شاہ کو کہنے آئے تھے کہ فلک شاہ اور عمارہ کو حفصہ کی شادی پر مدعو نہ کریں تو ان کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بابا جان سے بات کریں۔ وہ کتنی خوشی خوشی ملک ہاؤس کی ڈیکوریشن کروا رہے تھے۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں کیسی چمک سی آ گئی تھی۔ اور جب انہوں نے بلایا تھا کہ ''بابا جان! میری بات سن لیں'' تو چھڑی پر رکھے ان کے ہاتھوں کی لرزش، احسان شاہ سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ اور جس طرح ان کے چہرے پر زردی چھائی تھی، وہ ساری ہمت کھو بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں میں عبدالرحمٰن شاہ کی آواز آئی تھی۔

''عمو بھی میری ایسی ہی پیاری بیٹی ہے، جیسے رابیل تمہاری ہے۔''

اور تب وہ بات کہنے کے بجائے ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

''بابا جان! مرتضٰی بھائی کب تک آ رہے ہیں؟'' اور عبدالرحمٰن شاہ کے چہرے پر اطمینان چھا گیا تھا۔
دروازے کے پاس کھڑی مائرہ کا دل غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا اور وہ احسان شاہ سے ناراض ہوگئی تھیں۔
''دیکھو مائرہ! میں اس عمر میں بابا جان سے ان کی یہ خوشی نہیں چھین سکتا۔ زارا اس دنیا میں نہیں۔ اور عمارہ جیتے جی ان سے جدا ہوگئی تھی۔ صرف اتنا سوچ لو مائرہ! اگر ہماری رابی ہم سے یوں جدا ہو جائے تو......؟ ہم نے بابا جان اور اماں جان کے ساتھ بہت ظلم کیا۔ ''الریان'' کے دروازے تو خود موی نے اپنے اور عمو کے لئے بند کر دیئے تھے۔ کیا تھا اگر بابا جان اور اماں جان، عمو سے ملتے رہتے، بہاول پور جا کر۔''
اور مائرہ حیرانی سے انہیں دیکھتی رہ گئی تھیں۔
''شانی! یہ تم کہہ رہے ہو؟''
اور احسان شاہ نے نظریں چرالی تھیں۔
''مائرہ! میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہم دونوں فلک شاہ کے سامنے جائیں یا اس سے بات کریں۔ لیکن بابا جان......''
''تو بابا جان صرف عمارہ سے ملیں۔ اس سے بات کریں۔ نہ کہ موی سے۔ تمہیں منع کرنا چاہئے تھا احسان شاہ! کہ وہ کم از کم فلک شاہ کو تو مت بلائیں۔''
''میں کیسے منع کرتا مائرہ! عمارہ شاید اس کے بغیر نہ آتی۔''
''یہ...... یہ صرف اس لئے ہے احسان شاہ! کہ کوئی بھی فلک شاہ کے کرتوت نہیں جانتا، سوائے ہمارے۔ کاش! تم مجھے بابا جان کو ساری حقیقت بتانے دیتے۔ پھر میں دیکھتی کیسے بابا جان، فلک شاہ سے ملتے۔ لیکن جب بھی کسی نے پوچھا، تم نے منع کر دیا۔ لیکن اب میں ضرور بابا جان کو بتاؤں گی کہ ان کا چہیتا فلک شاہ، ان کی لاڈلی بیٹی کا شوہر اُن کی بہو پر بری نظر رکھتا تھا۔''
''مائرہ......!'' احسان شاہ کی آواز بلند ہوگئی۔ ''تم بابا جان سے کچھ بھی نہیں کہو گی۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ مجھے اپنی اور اپنے خاندان کی عزت بہت عزیز ہے۔ کیا عزت رہ جائے گی بچوں کی نظر میں ہماری؟''
تب مائرہ خاموش ہوگئیں۔ لیکن ان کا موڈ بہت خراب تھا۔ دیوار کے اس پار موی فلک شاہ تھا اور عمارہ تھی اور ''الریان'' کے سب باسی۔
موی فلک شاہ، جس نے مائرہ کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس مائرہ حسین کو، جسے اپنے حُسن، اپنی دلکشی پر بہت ناز تھا اور کالج میں لڑکے اس کے گرد پروانوں کی طرح چکراتے تھے۔ مگر وہ کسی کو گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی۔ لیکن موی فلک شاہ نے پہلی ہی نظر میں اسے اسیر کر لیا تھا۔
ٹھکرائے جانے کا دکھ اس کے دل میں گڑ گیا تھا۔ مائرہ حسین سے مائرہ احسان شاہ بن کر بھی اس دکھ کی تکلیف لی ہی رہی تھی۔ ماہ و سال نے اس زخم پر جو کھرنڈ جما دیا تھا، وہ چھل گیا تھا اور اس زخم سے پھر خون رِسنے لگا تھا۔ یہ زخم پھر اذیت دے رہا تھا۔
اتنے سال کتنے سکون سے گزر گئے تھے۔
چند سال تو ہر لمحے اسے لگتا رہا کہ جیسے ابھی عمارہ شاہ ''الریان'' میں آئے گی اور کہے گی کہ اس نے فلک شاہ کو چھوڑ دیا۔ اماں جان، بابا جان اور سب کے لئے۔ ان سب کے لئے، جن سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔ اور تب وہ فلک شاہ سے ضرور پوچھے گی کہ فلک شاہ! تم نے اس کے لئے مجھے ٹھکرایا تھا۔ آج اس نے تمہیں ٹھکرا دیا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔
عمارہ شاہ نے پلٹ کر ''الریان'' کی طرف نہیں دیکھا تھا اور زندگی کے اتنے سارے سال بتا دیئے۔ مائرہ سے عمر یا زبیر نے آ کر کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ فلک شاہ کی، نہ عمارہ کی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ لان میں موجود دروازہ پار کریں اور فلک شاہ کے سامنے جا کھڑی ہوں۔ ان کے منہ پر تھوک دیں۔ کچھ ایسا کریں کہ وہ تڑپ اُٹھے اور کسی کو منہ

دکھانے کے قابل نہ رہے۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے؟...... کیسے وہ اسے اذیت پہنچائیں؟ وہ عمر اور زبیر کو روک نہیں پائی تھیں۔ عمر تو رک بھی جاتا شاید۔ وہ ان سے ڈرتا بھی بہت تھا، روتا رہتا۔ مگر ان کی حکم عدولی نہ کرتا۔ لیکن یہ زبیر تھا، جو اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ سارا قصور احسان شاہ کا تھا۔

انہیں پھر احسان شاہ پر غصہ آنے لگا۔ ٹھیک ہے، فنکشن ہال میں ہونے تھے۔ لیکن کیا وہاں فلک شاہ نہیں ہوگا؟ آخر وہ اتنی دور سے شادی میں شرکت کے لئے ہی آیا ہے۔ اور اگر وہ ہوگا تو کیا میں اور احسان وہاں جائیں گے؟ ہرگز نہیں۔ بابا جان کو فیصلہ کرنا ہوگا۔ ہم یا مومی؟......اس کے بیوی بچے بھلے شریک ہوں۔ لیکن وہ نہیں۔

لاؤنج کے کھلے دروازے سے ڈھولکی کی ہلکی سی تھاپ کی آواز کانوں تک آئی تو مائرہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

اب اگر یہ عمارہ اور فلک شاہ کی مصیبت نہ ہوتی تو یہ ساری رونق یہاں ہوتی۔ ''الریان'' میں۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ وہاں حفصہ کی شادی کی کیا کیا تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ثنا اور مصطفیٰ نے بھی رات کتنی منتیں کی تھیں کہ وہ حفصہ اور عادل کی خاطر ساری رنجشیں بھول جائیں۔

وہ ثنا اور مصطفیٰ کو ناراض نہیں کر سکتی تھیں۔ کیونکہ ہمدان کے ساتھ رابیل کی شادی کی شدید خواہش تھی انہیں۔ اگرچہ رابیل نے سختی سے منع کر دیا تھا، پھر بھی ان کا خیال تھا کہ وہ رابیل کو منا لیں گی۔

لیکن اس سے پہلے کوئی ایسا طریقہ ہو کہ فلک شاہ اور عمارہ واپس جانے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن ان کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔

''کیسے؟......کس طرح؟''

انہوں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ تب ہی سیڑھیوں سے رابیل اُتر کر ان کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

''کیا ہوا ماما! سر میں درد ہے کیا؟''

مائرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کہیں جانے کے لئے تیار تھی اور بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ مائرہ نے چونک کر بغور اسے دیکھا۔

''کہیں جا رہی ہو کیا؟''

''ہاں۔ رات مونی نے بتایا تھا، آج وہ ڈھولکی منگوائیں گی۔ میں ذرا اُدھر جا رہی تھی۔ پھر میں ابھی تک عمارہ پھپھو سے بھی ملنے نہیں گئی۔ عمر کہہ رہا تھا، پھپھو پوچھ رہی تھیں میرا اور انجی بھی۔ مجھے خود بھی بہت اشتیاق ہو رہا ہے انجی کو دیکھنے کا۔''

مائرہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''رابی! میں نے تمہیں منع کیا تھا۔''

''کیا مطلب ہے ماما! آپ کا؟......ہم آپ کی کسی نام نہاد ناراضگی کی وجہ سے حفصہ اور عادل بھائی کی شادی بھی الجوائے نہ کریں؟''

''تو یہ بات اپنے بابا جان اور تایا جان سے کہو۔ جنہوں نے محض عمارہ اور فلک شاہ کی خاطر ہمیں الگ کر دیا ہے۔''

''نہیں ماما! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ خود الگ ہو کر بیٹھ گئی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ، انکل مرتضیٰ سے بھی ملنے نہیں گئیں۔ وہ آپ سے اور پاپا سے ملنے آئے ''الریان'' میں۔''

''تو انہیں ''الریان'' میں ہی آنا تھا۔'' مائرہ جھنجلا رہی تھیں۔

''آپ چلیں گی ماما! میرے ساتھ؟'' رابیل نے جلتی پر تیل پھینکا۔

''نہیں۔ نہ میں جاؤں گی، نہ تم۔''

''فضول ضد نہ کریں ماما! بہت ہوا تو آپ ان لوگوں سے بات مت کیجئے۔ حالانکہ ہاسپٹل میں تو آپ کی عمارہ پھپھو

سے بات ہو چکی ہے۔ اور پیچھے رہ گئے انکل فلک شاہ تو......''

''بکو مت رابی!'' اور رابیل کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

''ماما! مجھے آپ کی بالکل سمجھ نہیں آتی۔ یہ وقت ان باتوں کے لئے نہیں ہے۔ آپ کو جو بھی گلے شکوے یا لڑائی جھگڑا ہے عمارہ پھپھو اور انکل سے، وہ بعد میں حل کر لیجئے گا۔ ابھی تو شادی میں ہنسی خوشی شریک ہو جائیں۔''

مائرہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مائرہ صوفے پر بیٹھی اس لاؤنج سے باہر اور پھر لان کی طرف جاتے دیکھتی رہیں۔

وہ بچوں کو نہیں روک سکتی تھیں۔

اور کیا احسان شاہ بھتیجے اور بھتیجی کی شادی میں شرکت نہیں کرے گا؟ ابھی شادی میں بہت دن تھے۔ اس سے پہلے کچھ ایسا ہو کہ فلک شاہ اور عمارہ واپس چلے جائیں۔ لیکن کیا؟......اور اس ''کیا'' کے آگے بڑا سا سوالیہ نشان تھا۔ فی الحال ان کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ پھر سوچ میں کھو گئی تھیں۔

اور جب مرینہ اور سمیرا لاؤنج میں داخل ہوئیں تو تب بھی وہ یونہی لاونج میں صوفے پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھیں۔ سمیرا اور مرینہ کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے دے کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

مرینہ نے معذرت طلب نظروں سے سمیرا کی طرف دیکھا۔ سمیرا اپنے ہی خیالوں میں گم مرینہ کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے عبایا اُتارا اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''میں تمہارے لئے کچھ لاؤں سمیرا!......جوس، چائے یا کچھ فروٹ لے آؤں؟''

''نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی جی نہیں چاہ رہا۔''

''چلو میں چائے کے لئے کہہ دیتی ہوں۔ اور میرا خیال ہے، سب لوگ دوسرے گھر میں گئے ہوئے ہیں۔ تم تھوڑا ریسٹ کر لو۔ پھر چائے پی کر ہم چلتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں، کچن میں کوئی ہے؟''

سمیرا نے اس کی اتنی لمبی چوڑی بات میں سے صرف چائے کی بات سنی تھی۔

''نہیں پلیز مرینہ! چائے مت بنواؤ۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لئے فریش جوس لے کے آتی ہوں۔''

اب کے سمیرا خاموش رہی تھی۔ مرینہ باہر چلی گئی تھی۔ سمیرا نے اس کے جانے کے بعد آنکھیں موند کر سر بیڈ کراؤن سے ٹیک لیا تھا۔

'وہ احمد رضا ہی تھا' اس کا فیصلہ اس نے اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی کر لیا تھا۔

اتنی زیادہ مشابہت کہ انگلیوں پر بھی تل۔

اور اس تل پر انہوں نے کتنی بحث کی تھی۔

وہ کہتا تھا۔ ''ایسے شخص کے پاس بہت دولت آتی ہے۔ بہت شہرت ملتی ہے۔''

اور وہ کہتی تھی۔ ''یہ سب فضول باتیں ہیں۔''

اور کیا ممکن ہے کہ اس دنیا میں دو انسان بالکل ایک جیسے ہوں؟ بس ایک کی ماں رحیم یار خان میں پیدا ہونے والی سیدھی سادی پاکستانی عورت اور دوسرے کی ماں ایک مصورہ، جس نے اسپین کی سرزمین میں جنم لیا۔

لیکن نہیں۔ وہ احمد رضا ہی ہے۔

اس کے دل نے پھر کہا تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے پاس پڑا اپنا ہینڈ بیگ کھول کر فون نکالا۔

'مجھے ابو کو بتا دینا چاہئے کہ احمد حسن ہی احمد رضا ہے۔'

'نہیں.....ابھی نہیں......ابھی ایک دو بار اور اس کی طرف جاؤں گی۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا۔'

'یقین تو تمہیں اب بھی ہے سمیرا رضا! لیکن تم ڈرتی ہو۔ وہ جو اپنی شناخت بدل چکا، کہیں تمہیں پہچاننے سے انکار نہ کر دے۔'

آنکھوں کے کونے میں اٹکے آنسو کے ایک قطرے کو اس نے انگلی کی پور سے پونچھا۔ تب ہی مرینہ جوس لے کر اندر آئی۔

''تھینک یو مرینہ!'' جوس لے کر اس نے ممنونیت سے مرینہ کی طرف دیکھا۔ جس نے اس کی خاطر مونا سے بات کی تھی اور پھر اس کے ساتھ گئی بھی تھی۔ یقیناً مرینہ اچھی دوست تھی اور اس وقت بھی اسے اپنے ساتھ لا کر اس نے گویا اس پر احسان ہی کیا تھا۔ وہ کم از کم اس وقت اپنی روم میٹ کے اُلٹے سیدھے سوالوں کے جواب دینے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی۔

''جوس پی لو تو ذرا ساتھ والے گھر میں چکر لگا آتے ہیں۔ میں کچن میں گئی تھی تو وہاں ڈھولکی کی آواز آ رہی تھی۔ لگتا ہے، مونی نے ڈھولکی منگوا لی ہے۔''

اپنے جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے مرینہ نے سمیرا کی طرف دیکھا جو چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔

''شادی کب ہے؟'' سمیرا نے اپنی سوچوں کو جھٹک کر پوچھا۔

''شادی میں تو ابھی پندرہ سولہ دن ہیں۔ بس یونہی شغل کے لئے۔ پھپھو بھی بہت عرصہ بعد آئی ہیں نا۔''

''سنو! تم نے شادی کے سارے فنکشنز میں شریک ہونا ہے۔ ابھی سے تیاری کر لو۔ کسی دن چلیں گے اکٹھے دونوں شاپنگ کرنے۔''

''لیکن میں کیا کروں گی مرینہ! تمہارے فیملی فنکشنز میں شرکت کر کے؟''

''اور لوگ، جو فنکشنز میں شرکت کرتے ہیں، وہ کیا کرتے ہیں بھلا؟'' مرینہ نے اپنی عینک اتار کر اس پر پھونک ماری اور پھر دوپٹے کے پلو سے اسے صاف کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، تمہاری کزن کی شادی ہے۔ میرا شامل ہونا کیا ضروری ہے؟..... ہاں تمہاری شادی میں ضرور شرکت کروں گی، پرامس۔''

اس نے مرینہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے کی کوشش کی۔

''کزن...... کیا مطلب یار؟...... حفصہ مجھے کتنی عزیز ہے۔ اور پھر عادل میرا سگا بھائی ہے، جس کے ساتھ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اور تم اپنی دوست کے بھائی کی شادی میں شرکت نہیں کرو گی۔ کمال ہے۔ اکلوتا بھائی ہے میرا۔''

سمیرا نے اب کے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور جوس پینے لگی تھی۔

''میں کوئی انکار نہیں سنوں گی۔ سمجھیں تم؟''

''او کے!'' سمیرا نے جوس کا خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

''پتہ ہے، وہ اریب کی بچی بھی اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے، اپنے گھر سب سے ملنے۔ تاکید تو میں نے بلکہ سب نے کی ہے کہ شادی سے پہلے آ جانا۔ اب پتہ نہیں آتی بھی ہے یا نہیں۔ اس کے کالج میں اسٹوڈنٹ ویک کی وجہ سے اسے چھٹیاں تھیں۔ کچھ خود لے لیں۔''

''اریب بہت پیاری ہے۔ خصوصاً اس کی آنکھیں۔'' سمیرا مسکرائی تھی۔

''ہاں اس کی آنکھیں بہت پیاری ہیں، تمہاری آنکھوں کی طرح۔ ہمدان بھائی کہتے ہیں، تمہاری اور اریب کی آنکھیں ایک جیسا تاثر دیتی ہیں۔ اُداسی اور غم کا۔ پتہ ہے، ایک روز وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا، تمہاری دوست کو کیا دکھ ہے؟ میں نے کہا، بھلا اسے کیا دکھ ہو سکتا ہے؟''

''ہاں۔ بھلا مجھے کیا دکھ ہو سکتا ہے؟'' سمیرا نے اس کی بات دہرائی تھی۔ ''میں بچپن سے ایسی ہی ہوں۔ خاموش طبع

سی۔شاید اس لئے......اور اریب کو کیا دکھ ہے بھلا؟''

''نہیں بھلا۔ اریب فاطمہ کو بھی کیا دکھ ہو سکتا ہے؟ تین بھائی ہیں، والدین زندہ ہیں۔ اچھے خاصے خوشحال لوگ ہیں۔چلیں۔'' مرینہ نے اپنا گلاس خالی کر دیا تھا۔

اور سمیرا نے سوچا کہ شاید اس طرح کچھ دیر کے لئے احمد حسن اور احمد رضا کا خیال دل سے نکل جائے۔

''لیکن زیادہ دیر نہیں رُکیں گے۔ وہاں راولپنڈی جا کر میں ذرا بھی تو نہیں پڑھ سکی۔'' سمیرا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

کچن میں گلاس رکھ کر وہ دونوں کچن کے پچھلے دروازے سے ہی لان میں آ گئی تھیں۔

اور ابھی وہ دروازے تک پہنچی ہی تھیں کہ اندرونی دروازہ کھول کر برآمدے میں آتی مائرہ نے وہیں سے ہی آواز دی۔

''مرینہ! سنو، ذرا رابیل کو بھیج دینا۔''

''جی چچی جان! بھیج دوں گی۔''

مائرہ دروازہ کھول کر واپس اندر مڑ گئیں۔

''ملک ہاؤس'' کے لاؤنج میں قدم رکھتے ہی سمیرا کو احساس ہوا کہ مرینہ نے سچ کہا تھا کہ ساری رونقیں تو اس وقت ''ملک ہاؤس'' میں اُتری ہوئی ہیں۔تب ہی ''الریان'' تو بے رونق ہو گیا ہے۔

''ارے واہ! آج تو ملک ہاؤس کی قسمت جاگ اُٹھی ہے۔ پہلے شہزادی رابیل صاحبہ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا اور اب شہزادی مرینہ مع ڈاکٹر سمیرا کے تشریف لائی ہیں۔''

منیبہ نے کھڑے ہو کر سر خم کرتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔

''اور میں شہزادی عاشی ہوں۔ بابا جان کی پرنسز۔ اور الریان کی سب سے خوب صورت لڑکی۔'' عمارہ کے پہلو میں بیٹھی عاشی چہکی۔

عمارہ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔انہوں نے بازو حمائل کر کے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''بلاشبہ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ میری بیٹی سب سے زیادہ پیاری ہے۔''

سمیرا کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور دو قدم آگے بڑھ کر عاشی کے قریب آ کر ذرا سا جھکتے ہوئے اس نے اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔

مرینہ نے اسے زارا کی وفات اور عاشی کے والد کی دوسری شادی کے متعلق بتا رکھا تھا۔ بلکہ مرینہ نے تو اسے گھر کے ہر فرد کے متعلق اتنی تفصیل بتا رکھی تھی کہ اسے لگتا تھا جیسے برسوں سے وہ سب کو جانتی ہو۔ رحمت بوا سے لے کر یاسین ڈرائیور تک، سب کو۔

''بیٹھو بیٹا!'' عمارہ نے تھوڑا سا کھسک کر اس کے لئے جگہ بنائی۔

''مرینہ نے بتایا تھا کہ تم پڑھتی بہت ہو اور اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتی۔ بیٹا! اپنا خیال رکھا کرو۔صحت ہو گی تو پڑھ بھی سکو گی اور ڈاکٹر بھی بن سکو گی۔''

سمیرا کچھ نہ کہہ سکی۔ اس محبت پر اُس کا دل بھر آیا تھا۔ مرینہ صحیح کہتی تھی کہ ''الریان'' کا ہر فرد محبتوں کی مٹی سے گوندھا گیا ہے اور اس مٹی میں اللہ تعالیٰ نے خلوص، بے غرضی اور چاہت کے سارے رنگ بھی گوندھ دیئے ہیں۔

مرینہ نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ رابیل، منیبہ، حفصہ، ثنا آنٹی، مرینہ کی مما سب نیچے بیٹھی تھیں۔ جبکہ عمارہ اور عاشی صوفے پر تھیں۔

منیبہ نے ڈھولکی اپنی طرف کھینچتے ہوئے تھاپ لگائی۔

''میں بجاتی ہوں۔تم لوگ گاؤ۔''

''ہمدان کتنی اچھی ڈھولکی بجاتا ہے۔ یاد ہے نا، اس نے رانیہ اور فرحان کی شادی میں کتنی اچھی ڈھولکی بجائی تھی۔''

حفصہ یک دم بولی تھی۔ منیبہ نے پھر ڈھولکی پر تھاپ لگائی۔
''مونی بیٹا! ہاتھوں کو کیوں تکلیف دے رہی ہو؟ ایک ڈنڈا اٹھالو اور ڈھولکی کو پیٹنا شروع کر دو۔''
''تو ہومی بھیا کو بلوائیں نا۔ وہ کہاں ہیں؟''
مرینہ کو بالکل یاد نہ رہا کہ ابھی وہ ''الریان'' کے لڑکوں کا لاؤنج میں موجود نہ ہونے پر شکر ادا کر رہی تھی۔
''اور عمر اور زبیر کہاں ہیں؟...... عمر تو ڈانس بھی غضب کا کرتا ہے۔ یاد ہے نا، اس نے کیسا غضب کا ڈانس کیا تھا، مالیہ کی شادی پر۔''
اور عمارہ کو لگا، جیسے بیتے سالوں میں ''الریان'' میں ہونے والی کتنی خوشیاں ان کے بغیر آ کر چلی گئی تھیں۔
کاش! انسان کے اختیار میں ہوتا کہ وہ وقت کا پہیہ اُلٹا چلا سکتا تو آج وہ بھی......
''عمر اور زبیر کا تو پتہ نہیں کہاں گئے ہیں۔ ہومی البتہ اندر پھوپھا جان کے پاس ہے۔ اور بابا جان بھی وہیں ہیں۔''
مالیہ نے مرینہ کی بات کا جواب دیا۔
''پاپا، مصطفیٰ انکل اور عثمان انکل، ہال وغیرہ کی بکنگ کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں۔''
منیبہ نے پھر ڈھولکی پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ثنا چچی نے ڈھولکی اس کے ہاتھوں سے لے لی۔
''نہ...... نہ مونی بیٹا! ہمارے کانوں میں مزید ہمت نہیں ہے اس تھپ تھپ کو سننے کی۔''
''ارے ہاں، عمو۔'' ثنا نے ایک دم چونک کر عمارہ کو دیکھا۔ ''یہ عمو تو بہت خوب صورت ڈھولکی بجاتی ہے۔ زارا کی شادی میں تو اس نے کمال کا گایا تھا۔ آؤ عمو!..... آؤ۔''
''لیکن میں......؟'' عمارہ چونک گئیں۔ ''زارا کی شادی کے بعد تو زندگی ہی بدل گئی ثنا بھابی! اب تو کچھ یاد نہیں۔''
''آ جاؤ بھئی..... ڈھولکی ہاتھ میں لو گی تو خود ہی سب یاد آ جائے گا۔''
''ہاں پھپھو!...... آئیں نا۔'' منیبہ نے ہاتھ پکڑ کر اُنہیں اٹھایا۔
عمارہ نے ثنا کے پاس بیٹھتے ہوئے ڈھولکی سنبھالی تو جانے کیا کیا کچھ یاد آ گیا۔ سمیرا بھی حفصہ کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی اور سب اسے چھیڑ رہے تھے۔
''کنگاں لمبیاں نی مائے، کیوں جمیانی مائے۔''
ثنا نے گیت کے بول اٹھائے تو منیبہ نے بھی ان کی آواز میں آواز ملائی۔ لاؤنج میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔
سب ساکت بیٹھے ثنا اور منیبہ کو سن رہے تھے۔ چند بولوں کے بعد ثنا نے ایک دم نیا گیت شروع کر دیا تھا۔

''ساڈا چڑیاں دا چنبا اے
بابل ! اساں اُڈ جانا''

حفصہ ایک دم اُٹھ کر ثنا سے لپٹ گئی۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
''ثنا چچی! یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی سے رخصتی کے گیت شروع کر دیئے۔'' منیبہ نے آنسو پونچھتے ہوئے ثنا سے شکوہ کیا
مرینہ نے حفصہ کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اس کے رخسار کو چوما۔
''میری پیاری سی حفصہ بھابی کو سسرال میں اتنا پیار ملے گا کہ انہیں میکے کی کبھی یاد نہیں آئے گی۔''
''سسرال میں کتنا بھی پیار ملے۔ میکے کی یاد تو دل میں بسی ہوتی ہے میری جان!'' عمارہ نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ میکہ، میکے کی گلیاں، وہ کمرے، وہ در و دیوار، گڑیاں اور میکے سے وابستہ رشتے کبھی نہیں بھول پاتے بیٹی! کبھی نہیں۔ اللہ نہ کرے کہ کسی کا میکہ اس سے بچھڑے۔ کبھی بھائی کی چھیڑ چھاڑ، شرارتیں، محبتیں دامن تھامتی ہیں تو کبھی ماں کی گود رُلاتی ہے۔ دل کے آنگن میں ہر کونے کھدرے سے یادیں لپٹی ہوتی ہیں۔''
صوفے پر بیٹھی خاموشی سے آنسو بہاتی سمیرا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

رضی کی شرارتیں، محبتیں، چھیڑ چھاڑ، رُوٹھنا منانا......اس سے تو یہ سب سسرال جانے سے پہلے ہی بچھڑ گیا تھا۔ وہ جو ان سب کی محفل میں بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے بھول گئی تھی کہ ابھی وہ احمد حسن کے گھر پر تھی۔
احمد حسن، جو ہر طرح سے احمد رضا لگتا تھا۔ وہ جو بہت سارا رونا چاہتی تھی، رو نہیں پائی تھی۔ اب ان آنسوؤں کو راستہ مل گیا تھا۔
''سمیرا!......سمو!'' مرینہ نے سمیرا کی طرف دیکھا تھا اور تیزی سے اس کے پاس آئی۔ ''اتنا چھوٹا دل ہے تمہارا سمیرا!''
وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ رہی تھی، جب ہمدان، فلک شاہ کی وہیل چیئر دھکیلتا لاؤنج میں آیا اور اس کی نظریں سمیرا پر پڑیں۔ اس کے دل نے بے اختیار خواہش کی تھی کہ کاش! مرینہ کے بجائے وہ ہوتا اور سمیرا کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لیتا......اور کچھ ایسا کرتا کہ ان ہر دم بند رہنے والے ہونٹوں پر ہنسی کے پھول کھل اُٹھتے اور نم آنکھوں میں خوشیوں کے چراغ جل اُٹھتے۔ کاش! وہ اس لڑکی کا دکھ جان پاتا۔
سمیرا نے مرینہ کا ہاتھ تھام کر آہستگی سے کہا۔
''سوری! بس پتہ نہیں کیوں، دل پر اس گیت نے اتنا اثر ڈالا۔''
''کہیں تمہاری رخصتی بھی نزدیک تو نہیں ہے سمیرا؟'' منیبہ نے بے اختیار پوچھا اور ہمدان کو لگا جیسے اس کا دل ڈوب جائے گا۔ اس نے چیئر کی پشت کو مضبوطی سے پکڑا۔
''ارے نہیں۔ سمیرا کی تو ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی۔''
ہمدان نے ایک گہرا سانس لیا اور دل ہی دل میں مرینہ کا شکریہ ادا کیا۔
'تھینک یو مرینہ! مائی سویٹ سسٹر!......میں اس زندگی بخش بات پر تمہارا ممنون ہوں بے حد۔'
اور تب ہی ثنا کی نظر ان پر پڑی تھی۔
''ارے فلک! تم......اور ہمدان! وہاں کیوں رک گئے ہو؟......آ جاؤ نا۔''
فلک شاہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ آنکھوں میں ایک غم ناک سا تاثر۔ شاید انہوں نے عمارہ کی باتیں سن لی تھیں اور اس کے لئے دکھی ہو رہے تھے۔
اتنے سالوں بعد آ کر وہ بہت خوش تھے عمارہ کے ساتھ۔ سب اس کے اپنے تھے۔ عبدالرحمٰن شاہ نے کہا تھا۔
''گھر تو انسانوں سے وجود پاتے ہیں مومی بیٹا! اور یہ گھر ہی اب عمارہ کا میکہ ہے۔''
یہاں سب تھے۔ گلے شکوے، پرانی یادیں کتنی بار دہرائی جاتی تھیں۔ اور وہ خود سے پوچھتے رہ جاتے تھے۔
'کیا یہاں سب ہیں؟......کیا شانی کے بغیر عبدالرحمٰن کا گھرانہ مکمل ہے؟'
دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کئی لمحے ایسے آتے تھے کہ زخموں کے ٹانکے اُدھڑ جاتے تھے اور وہ بے چین سے دیواروں کے اس پار ''الریان'' کو دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ بند آنکھوں میں ''الریان'' کے کمرے، لان سب گھوم جاتے۔ وہ شانی کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ''الریان'' کے لان میں ٹہلتے۔ زارا کو اونچی پینگ دیتے اور......
''مومی! دیکھو یہ کون آیا ہے آج۔'' ثنا نے کہا تو انہوں نے چونک کر دیکھا۔
''کون؟''
''رابی......رابیل احسان۔''
اور ہمدان خود ان کی کرسی دھکیلتا اندر آ گیا۔ ساکت بیٹھی رابیل کو حیرت سے دیکھا۔ رابیل کی آنکھوں میں حیرت تھی اور تاسف بھی۔ وہ فلک شاہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔
'تو کیا اور اور زبیر نے اسے پھوپھا جان کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا؟'
'تو یہ فلک شاہ ہیں۔ الریان والوں کے مومی۔' رابیل کو یہ سنجیدہ اُداس آنکھوں والا شخص بہت بے ضرر اور متاثر کن

شخصیت کا مالک لگا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیوں مما اتنے خلاف ہیں ان کے؟......اور مما تو عمارہ پھپھو کے بھی خلاف ہیں۔ حالانکہ یہ وہیل چیئر پر بیٹھا شخص بھلا کسی کو کیا تکلیف پہنچا سکتا ہے؟

''رابیل بیٹا!.....ادھر آؤ میرے پاس۔'' فلک شاہ کی آواز میں شفقت تھی، محبت تھی اور ان کی آنکھوں میں بھی محبت کے وہی رنگ تھے، جو احسان شاہ کی آنکھوں میں اس کے لئے ہوتے تھے۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آئی تھی۔ فلک شاہ نے اس کے جھکے سر پر پیار کیا۔

''جیتی رہو بیٹا! بہت حسرت تھی تم سے ملنے کی۔ عمر اور زبیر سے ملا تو شانی کا پرتو نظر آیا ان میں......تھینک یو بیٹا! تم آئیں ہم سے ملنے۔''

''انکل! مجھے آنا تھا۔ بس طبیعت ٹھیک نہ تھی۔'' وہ شرمندہ ہوئی۔

''ارے کیا ہو گیا تھا ہماری بیٹی کو؟''

''بس سر میں درد تھا۔''

وہ ان کی چیئر کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی اور فلک شاہ اس سے ہولے ہولے اس کے متعلق پوچھنے لگے۔ اس کی تعلیم، اس کے مشاغل۔ سمیرا نے پاس بیٹھی مرینہ سے درخواست کی۔

''پلیز مرینہ! اب چلیں؟ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تم مجھے چھوڑ کر واپس آ جانا۔''

''ہاں ہاں چلو۔'' مرینہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور منیبہ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے تھوڑا سا جھکتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ سمیرا کو ''الریان'' چھوڑ کر ابھی آ رہی ہے۔ اور جھکتے ہوئے اس کی عینک پھسل کر گرنے ہی لگی تھی کہ اس نے اسے ہاتھوں میں سنبھالا۔ عاشی کھلکھلا کر ہنس دی اور فلک شاہ سے ہولے ہولے کچھ بات کرتے ہوئے رابیل نے چونک کر اسے دیکھا۔ منیبہ نے حفصہ کے کندھے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

''فصی! یہ اپنی رابی اس حادثے کے بعد کتنا بدل گئی ہے نا......ہے نا؟''

''ہاں۔'' حفصہ نے تائید کی۔ ''لیکن اپنی یہ تبدیلی شاید اُسے بھی اُلجھا رہی ہے۔ تم نے دیکھا، کبھی یہ بہت مہربان نظر آتی ہے، پہلی رابی سے بالکل مختلف۔ اور کبھی پہلے سے زیادہ تلخ۔'' حفصہ نے مدھم آواز میں تجزیہ کیا۔

حفصہ نے انٹری ٹیسٹ میں ناکام ہونے کے بعد بی ایس سی سائیکالوجی کے ساتھ کر کے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ کبھی کبھی یہ بالکل صحیح تجزیہ کرتی تھی۔

اور ناک پر عینک اچھی طرح جماتے ہوئے مرینہ کو مائرہ چچی کا پیغام یاد آیا تو مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے اس نے رابیل کو آواز دے کر بتایا کہ مائرہ چچی اسے گھر بلا رہی ہیں۔ اور اسے بتانے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سمیرا کا ہاتھ تھامے چل رہی تھی اور پیچھے رخ کئے رابیل کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ اس لئے اندر آتے ایبک اور انجی سے ٹکرا گئی۔ اپنی ناک سہلاتے ہوئے اس نے سمیرا کا ہاتھ چھوڑ کر انجی سے گرم جوشی سے ملتے ہوئے کہا۔

''ہائے انجی آپا! آپ کہاں تھیں؟.....میں بھی سوچ رہی تھی، یہاں کچھ کمی سی کیوں لگ رہی ہے؟''

اور انجی کا جواب سنے بغیر وہ سمیرا کی طرف مڑی تھی جو دروازے سے باہر نکل کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''سمیرا یہ میری پھپھو کی بیٹی ہیں۔ عمارہ پھپھو کی۔''

سمیرا مسکرائی۔ انجی نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما۔

''ارے ایبک بھائی! آپ کہاں گئے تھے؟'' انجی کو سمیرا سے ملتے دیکھ کر وہ ایبک کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''تم کسی کو موقع تو دو کچھ کہنے کا۔''

''ہاں ہاں، کہئے۔'' اس نے جیسے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔

''میں انجی کو شاپنگ کروانے لے گیا تھا۔''

"میں سمیرا کو چھوڑ آؤں تو پھر انجی کی شاپنگ آ کر دیکھتے ہیں۔"
مرینہ اور سمیرا چلی گئیں تو سب انجی کی شاپنگ دیکھنے لگے۔ جبکہ ایبک، فلک شاہ کی طرف بڑھا اور ایک نظر فلک شاہ کے قریب بیٹھی رابیل پر ڈلی۔
"کیسی ہیں آپ؟"
"فائن۔" رابیل نے آہستگی سے کہا۔ ایبک، فلک شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔
"بابا! کیا بات ہے، آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"
"ہاں۔" انہوں نے سر ہلایا۔ لیکن ایبک کو جیسے یقین نہ آیا۔ تھوڑا سا جھکتے ہوئے ان کا ہاتھ تھام کر اس نے بغور انہیں دیکھا۔
"نہیں بابا! آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔"
"ٹھیک ہوں یار!" ایک افسردہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھری۔ لیکن ایبک بے یقینی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
"میری جان! قریب آ کر دُور رہنے کا عذاب کیا ہوتا ہے، کیا تم نہیں جان سکتے؟" بے حد آہستگی سے انہوں نے کہا۔
ایک گہری سانس لیتے ہوئے ان کا ہاتھ چھوڑ کر وہ سیدھا ہو گیا۔
"بہت سی باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں بابا! اور وقت کے ساتھ خود بخود بہت سی باتیں درست ہو جاتی ہیں۔"
"کیا اللہ کو مجھ سے پھر کوئی آزمائش مقصود ہے ایبک؟"
"بابا! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ سب ٹھیک ہو جائے گا، اِن شاء اللہ!"
اس نے ان کا بازو تھپتھپایا اور رابیل کی طرف دیکھا جو انجی کی شاپنگ سے بے نیاز ان کی مدھم گفتگو کو سمجھنے کی کوشش میں بار بار ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"آپ کو شاپنگ سے کوئی دلچسپی نہیں رابیل؟"
"ہاں ہے۔" رابیل نے چونک کر ایبک کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور حفصہ کی طرف دیکھنے لگی، جو انجی کے لائے ڈریس خود سے لگا کر دیکھ رہی تھی۔
"ایبک! تمہاری چوائس بہت اچھی ہے۔" منیبہ نے قمیض تہہ کرتے ہوئے ایبک کی طرف دیکھا۔
"دریں چہ شک است۔ (اس میں کیا شک ہے)" ایبک صوفے پر بیٹھ گیا۔
"یہ اس بیگ میں کیا ہے؟ یہ تو دکھایا ہی نہیں تم نے۔" حفصہ کی نظر اس بیگ پر پڑی، جو انجی نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ سب ہی اُدھر دیکھنے لگے۔
"یہ......" انجی نے سٹپٹا کر ایبک کو دیکھا۔ "یہ ایبک بھائی کا ہے۔"
"اچھا......ایبک بھائی نے بھی کچھ خریدا ہے اپنے لئے۔" منیبہ تہہ شدہ ڈریس واپس شاپنگ بیگ میں رکھ چکی تھی۔
"دکھاؤ، کیا لیا ہے؟"
"اپنے لئے نہیں۔ کسی کا ہے۔"
"کسی کو گفٹ دینا ہے کیا؟" عاشی نے پوچھا تو ایبک نے بے اختیار سر ہلا دیا۔
"کوئی لڑکی ہے کیا؟" عاشی کو کسوٹی کسوٹی کھیلنے کا بہت شوق تھا۔
"اتنے ذاتی سوال نہیں پوچھتے گڑیا رانی!" ایبک مسکرایا اور رابیل کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔
"ویسے اتنے پاپولر ہو ایبک! لڑکیاں تو بہت دوست ہوں گی تمہاری۔"
یہ بات صرف مرتضیٰ کی بیوی ہی کر سکتی تھیں۔ وہ اتنے سالوں سے فرانس میں رہ رہی تھیں۔ ایبک جھینپ گیا۔
"نہیں تو ممانی جان! ایسی کوئی خاص دوست نہیں ہیں۔ وقت نہیں ہوتا میرے پاس۔"

''ایک تو خاص ہوگی نا۔'' وہ ہنسیں اور رابیل کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے کہ ''نہیں، کوئی ایک بھی خاص نہیں ہے۔''
لیکن ایبک نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ بلکہ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر کر معدوم ہوگئی۔
''ہر ایک کی زندگی میں کوئی تو خاص ہوتا ہی ہے۔'' منیبہ نے فلسفہ جھاڑا۔
''اور ایبک کی زندگی میں بھی وہ ایک خاص ہوگی، جو ان کی شریک زندگی بنے گی۔''
''اللہ وہ وقت جلد لائے۔'' عمارہ کے لبوں سے نکلا۔
''ایبک بھائی کی شادی تو بہاول پور میں ہوگی نا۔ پھر ہم سب وہاں آئیں گے۔ خوب مزا آئے گا۔'' عاشی نے خوش ہو کر کہا۔
''ہاں ضرور۔ سب آنا...... دعا کرو، اللہ یہ دن جلد لائے۔''
''کیا ایبک بھائی کی دُلہن، بہاول پور میں ہے خالہ؟''
''وہیں ہی کہیں آس پاس تلاش کرلیں گے گڑیا! اب اتنی دُور لاہور آنے سے تو رہے۔'' ایبک نے اس کے بال بکھرائے اور اُٹھ کھڑا ہوا۔
''بابا جان آرام کر رہے ہیں کیا؟''
''سو گئے تھے۔ جب میں انکل کو لے کر باہر آیا تھا۔''
اتنی دیر میں ہمدان نے پہلی بار بات کی تھی۔ انجی اپنے بیگز سمیٹ کر کھڑی ہوگئی۔
''میں یہ سب سامان کمرے میں رکھ کر آتی ہوں۔''
''جلدی آنا۔ یہاں تو گانے کی محفل جمی تھی۔ ثنا چچی گا رہی تھیں اور عمارہ پھپھو نے ڈھولکی بجائی تھی۔''
''اچھا؟'' انجی کو حیرت ہوئی۔
''رابیل بیٹا! آپ کی ممی نے بلایا تھا۔'' فلک شاہ جو بہت دیر سے رابیل کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہے تھے، کہا تو رابیل نے چونک کر انہیں دیکھا۔
''ہاں! چلتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔ کھڑی ہونے سے پہلے اس کی نظریں ایک بار پھر ایبک کی طرف اُٹھی تھیں۔ فلک شاہ ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔
اس کی نظروں میں کیا تھا ایسا؟..... اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کیا بتا رہے تھے؟
'کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرانے جا رہی ہے؟' وہ سوچ میں پڑ گئے۔
'نہیں.....' انہوں نے ہولے سے سر جھٹکا۔ 'یہ میرا وہم بھی تو ہوسکتا ہے۔ ایبک، اریب کو پسند کرتا ہے۔' اریب انہیں بھی بہت اچھی لگی تھی۔ 'ایبک کے لئے ایسی ہی لڑکی ہونی چاہئے تھی۔ سادہ، بے ریا اور معصوم سی۔'
اگرچہ اریب فاطمہ ان کے آنے کے بعد دوسرے دن ہی گاؤں چلی گئی تھیں اور ان کی ملاقات اس سے ذرا دیر کے لئے ہوئی تھی۔ لیکن اس ذرا سی دیر میں ہی انہوں نے اریب فاطمہ کو جان لیا تھا کہ ایبک ایسی ہی لڑکی کے ساتھ خوش ہو سکتا ہے۔
''بیٹا جاؤ نا آبی! کھڑے کیوں ہو؟'' ہمدان نے اسے مخاطب کیا تو فلک شاہ چونکے او انہوں نے رابیل کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔
''نہیں یار! میں بس جا رہا ہوں۔ کچھ ضروری کام ہے۔ رات کو چکر لگاؤں گا۔''
''تم یہیں کیوں نہیں آجاتے، آبی؟ جب تک پھپھو اور موی انکل یہاں ہیں، تم بھی یہیں رہو۔''
''آجاؤں گا ایک دو روز تک۔'' اس نے فلک شاہ کی طرف دیکھا۔ ''بابا جان اگر جاگ رہے ہیں تو میں ان سے مل کر چلوں گا۔ رات کو پھر ملاقات ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے! مجھے بھی لے چلو۔ میں کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہا ہوں۔'' فلک شاہ نے آہستگی سے کہا تو ایبک نے ان کی وہیل چیئر کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے رابیل کی طرف دیکھا، جو ابھی تک کھڑی تھی۔

''احسان ماموں کی طبیعت کیسی ہے اب؟''

''ٹھیک ہیں۔ آج صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔'' رابیل نے بتایا۔

اور ایبک، فلک شاہ کی چیئر کو دھکیلتا ہوا ان کے کمرے میں آ گیا۔ اس کے لاؤنج سے نکلتے ہی منیبہ نے ہمدان کو ڈھولکی بجانے پر لگا دیا۔ ہمدان نے ڈھولکی سنبھال لی۔

''رابی! چچی جان کی بات سن کر آ جانا۔ دیکھو نا! یہاں کتنا مزہ آ رہا ہے۔'' رابیل نے لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے منیبہ کی بات سنی۔

''یہ محفل ''الریان'' میں بھی تو سجائی جا سکتی تھی۔ بلکہ ''الریان'' میں ہی سجنی چاہئے تھی۔ لیکن......''

بات ادھوری چھوڑ کر وہ چلی گئی۔ عمارہ نے بے حد شدت سے اس کی بات محسوس کی۔ اس کا لہجہ تو نارمل تھا، لیکن اس میں چھپی تلخی نے عمارہ کو شرمندہ کر دیا۔ صرف ان کی وجہ سے مائرہ اور وہ، حفصہ کی شادی کو انجوائے نہیں کر پا رہے تھے۔

''ثنا! میرا خیال ہے کہ یہ سب تم ''الریان'' میں ہی کرو۔ ہم تو یہاں مہمان ہیں۔ اور مہمانوں کے لئے اتنا تردد۔'' وہ کھڑی ہو گئیں۔

''بکومت۔'' ثنا چچی نے عمارہ کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔ ''رابی کی باتوں کا برا مت مانو عمو! وہ یوں ہی بلا سوچے سمجھے بول دیتی ہے۔''

''نہیں۔ میں نے برا نہیں مانا۔ لیکن وہ صحیح کہہ رہی تھی کہ......''

''بس اور کچھ مت کہنا عمارہ!...... ہاں، ہومی! اچھا سا گیت گاؤ۔ کوئی خوشی کا۔'' وہ ہمدان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

اور ہمدان نے سچ مچ ہی ایسا گانا شروع کر دیا تھا کہ سب کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''میرا یار بنا ہے دُولہا اور پھول کھلے ہیں دل کے
میری بھی شادی ہو جائے ، دعا کرو سب مل کے''

''آمین..... آمین'' کی آوازوں سے لاؤنج گونجنے لگا تھا۔ ہنسی، شور، مذاق۔ لاؤنج میں ایک بار پھر زندگی مسکرا اُٹھی۔

اور اندر بیڈروم میں ایبک، فلک شاہ کے پاس بیٹھا پوچھ رہا تھا۔

''بابا! آپ بہت ڈپریس ہیں...... کیوں؟''

''بتایا تو تھا یار! قریب رہ کر دُوری کا عذاب سہنا بہت مشکل ہے۔ ہر روز سوچتا ہوں، شاید آج رات وہ آ جائے۔ رات ہوتی ہے تو صبح اس امید پر جاگتا ہوں کہ شاید آج صبح وہ ساری ناراضگیاں بھلا کر گلے سے آ کر لگ جائے۔ دیوار کے اس طرف وہ بڑے اطمینان سے سوتا ہے اور میں..... پوری نیند سو نہیں پاتا۔ اتنے قریبی، اتنے عزیز لوگ بھی یوں لمحوں میں اجنبی بن جاتے ہیں۔ یقین نہیں آتا۔''

''بابا! سچ کبھی نہ کبھی ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ وہ وقت بھی ضرور آئے گا۔ آپ یقین رکھیں۔''

''ایسا کرو آبی! کچھ دنوں کے لئے مجھے شیر دل کی طرف لے چلو۔''

''ٹھیک ہے بابا! ابھی لے چلتا ہوں۔''

''نہیں۔ ابھی تو کوئی بھی گھر پر نہیں ہے۔ بابا جان بھی سو رہے ہیں۔ رات بابا جان سے بات کر لوں گا تو صبح چلیں گے۔'' ''سنو آبی! ایک بات پوچھوں؟''

''جی بابا! پوچھئے نا۔''

''یہ جو رابیل ہے، احسان کی بیٹی۔ یہ تمہیں پسند کرتی ہے کیا؟''

''ارے نہیں بابا!'' ایبک بے اختیار ہنس پڑا۔ ''رابی اور مجھے پسند کرے؟...... ناممکن ہے بابا! مائرہ آنٹی اور وہ مجھے سخت ناپسند کرتے ہیں۔ رابیل کا بس چلتا تو وہ میرے ''الریان'' میں داخلے پر پابندی لگا دیتی۔''

اور رابیل جولان سے یہ سوچ کر پلٹ آئی تھی کہ اتنے دن ہو گئے اسے بابا جان سے ملے اور یہ کتنی غلط بات تھی کہ ملک ہاؤس میں آ کر بھی وہ بابا جان سے نہ ملے۔

ایبک کی بات سن کر وہیں دروازے پر ٹھٹک کر رک گئی۔ کچن کی طرف پانی پینے جاتی عاشی نے اسے بتایا تھا کہ بابا جان اس کمرے میں ہیں۔

'تو ایبک ایسا سمجھتا ہے۔' ناب پر ہاتھ رکھے رکھے اس نے سوچا۔

'اور کچھ غلط بھی تو نہیں سمجھتا۔' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ 'ایبک جب ''الریان'' میں آتا تھا، سب اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے تھے اور اس کے جانے کے بعد بھی عمر اور منیبہ اس کے قصیدے پڑھتے رہتے تو وہ بہت چڑتی تھی ایبک سے۔ اور اسے عمر کا اس کی تعریف کرنا زہر لگتا تھا۔ لیکن اب......اب......

اس کا دل بہت تیزی سے دھڑکا۔

اب ایبک فلک شاہ نے جانے کب بہت خاموشی سے اس کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا تھا اور دل اس کے نام پر دھڑک اُٹھتا تھا۔ وہ ''الریان'' میں آتا تو اس کا بھی دل چاہتا کہ وہ بھی اس سے جا کر باتیں کرے اور ایبک اس سے بھی اتنی ہی بے تکلفی سے بات کرے، جیسے باقی سب سے کرتا ہے۔ لیکن وہ جھجک جاتی۔

''ایبک ایسا ہے کہ اس کی ہمراہی کی خواہش کوئی بھی لڑکی کرے۔''

منیبہ کی اس بات کا اس نے دل ہی دل میں کتنی بار اعتراف کیا تھا۔ حالانکہ جب منیبہ نے یہ بات کہی تھی تو اس نے کتنا مذاق اُڑایا تھا۔

''بھلا کیا ہے ایسا خاص ایبک میں؟ اس سے زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ لڑکے ہماری یونیورسٹی میں بھرے ہوئے ہیں۔''

''جب آنکھوں کے سامنے نفرتوں کی دبیز چادر ہو تو اس کے پار سے کچھ نظر نہیں آتا۔''

منیبہ ان دنوں ایبک کی وکالت کرتی تھی اور ''الریان'' کے باقی سب لوگ اس کی تائید کرتے تھے۔ ان دنوں پہلی بار تو ''الریان'' والوں نے اپنے اس کزن کو دیکھا تھا اور کزن بھی وہ، جو ایک مشہور شخصیت تھا اور جسے جانے بغیر ہی عمر اور زبیر اس پر فدا تھے۔

''بھلا مجھے کیوں نفرت ہو گی ایک ایسے بندے سے، جسے دوسری یا تیسری بار دیکھ رہی ہوں؟'' تب اس نے کہا تھا۔

''یہ تو خود سے پوچھو رابیل احسان شاہ!'' منیبہ کہہ کر چلی گئی تھی اور اسے خود سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مائرہ، ایبک فلک شاہ اور عمارہ سے نفرت کرتی ہے۔ اور یہ نفرت اس نے رابیل میں بھی منتقل کر دی تھی۔

اس نے ناب سے ہاتھ ہٹا لیا اور بابا جان سے ملے بغیر ہی واپس مڑ گئی۔ ایک لمحہ کو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اندر جا کر ایبک سے کہے کہ وہ اس کو ناپسند نہیں کرتی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ یہ نہیں کہہ سکتی۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ لیکن ایک دن وہ ضرور اسے بتائے گی کہ وہ اسے ناپسند نہیں کرتی۔ بلکہ......

❁○❁

مائرہ نہ جانے کتنی دیر سے لاؤنج میں ٹہل رہی تھیں۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک جاتیں تو بیٹھ جاتیں۔

'یہ رابی تو وہاں جا کر بیٹھ ہی گئی ہے۔ کیا کروں؟'

تب ہی اندرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ تیز تیز چلتے ہوئے انہوں نے جا کر دروازہ کھولا اور رابیل کو دیکھ کر اطمینان بھری سانس لی۔

''خیریت تھی ماما!......آپ نے کیوں بلایا تھا؟ سر درد زیادہ تو نہیں ہو گیا؟'' لاؤنج میں آ کر رابیل نے پوچھا تو مائرہ غصے سے بولیں۔

''تمہیں میری خیریت کی اتنی ہی فکر ہے۔ تب ہی پیغام ملتے یہ بھاگی چلی آئیں۔''

''ماما پلیز! اس طرح مت کہا کریں۔ آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں عمارہ پھپھو اور ان کی فیملی سے نہ ملوں، نہ بات کروں۔ عمارہ پھپھو بہت اچھی ہیں۔ انجی اتنی کیوٹ سی ہے۔ پہلی بار میں نے اسے دیکھا ہے اور انکل مومت، کتنی زبردست پرسنالٹی ہے ان کی۔ اس عمر میں بھی ان کی شخصیت میں کتنی کشش ہے۔''

''بس کرو رابی! میں نے تمہیں ان کا قصیدہ پڑھنے کے لئے نہیں کہا۔''

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، آپ کو عمارہ پھپھو کے خلاف ہی باتیں کرتے سنا ہے۔ آخر انہوں نے ایسا کیا، کیا ہے آپ کے ساتھ؟ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

رابیل صوفے پر بیٹھ گئی۔ مائرہ دکھ اور تاسف سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''رابی! میرا منہ نہ کھلواؤ تم......ورنہ......''

''ٹھیک ہے ماما! لیکن یہ جو آپ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے نا، اس سے ہم سب ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔''

''اچھا۔'' مائرہ کی آنکھوں میں تمسخر نظر آیا۔

''عمارہ پھپھو اور انکل مومی اس گھر میں نہیں آ سکتے۔ ان کی مجبوری ہے۔ تو ہمیں ان کی مجبوری سے سمجھوتہ کرنا چاہئے۔ گھر کے سب افراد اگر اس بات کو سمجھ رہے ہیں تو آپ بھی سمجھیں نا۔ پتہ ہے، انکل فلک شاہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔''

''مت نام لو اس شخص کا میرے سامنے۔'' مائرہ نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔ ''اور اپنے باپ کے سامنے بھی مت ذکر کرنا اُس کا۔''

رابیل نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور پھر خاموش ہو گئی۔ مائرہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں، پھر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

''ضروری نہیں ہے رابی بیٹا! کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے۔ ہم نے تمہیں حفصہ اور عادل کی خاطر وہاں جانے کی اجازت دی ہے تو یہ کافی ہے۔ انجی یا عمارہ کی فیملی سے پریت بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔''

رابیل خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی کہ مائرہ سے کچھ کہنا بے کار ہے۔

''لیکن میں بابا جان سے ضرور پوچھوں گی کہ آخر ماما، پاپا اور انکل فلک شاہ میں کیا ناراضی اور جھگڑا ہے؟..... میں بابا جان سے کہوں گی کہ وہ دونوں کے درمیان صلح کروا دیں۔ اور پھر میں ایبک کو بتاؤں گی کہ میں اسے ناپسند نہیں کرتی۔ بلکہ......'' لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

مائرہ جو اسے بغور دیکھ رہی تھیں، اس کی مسکراہٹ پر چونکیں۔ انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''رابی! میں نے تمہیں کسی بات پر غور کرنے کے لئے کہا تھا۔''

''کون سی بات ماما؟'' رابیل نے بے دھیانی سے ان کی طرف دیکھا۔

''میں نے تمہیں ہمدان کے متعلق سوچنے کے لئے کہا تھا۔ دیکھو! وہ......''

''ماما! میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ مجھے ہمدان سے شادی نہیں کرنا۔''

''ہاں۔ لیکن میں نے تمہیں کہا تھا کہ ایک بار پھر سوچنا۔''

''ہزار بار بھی سوچوں تو میرا جواب ''نہ'' ہی ہو گا۔ ماما! مجھے ہمدان سے شادی نہیں کرنا ہے بس۔''

''تو کیا کسی اور سے شادی کرو گی؟'' مائرہ کو اپنے غصے پر تو کبھی قابو نہیں رہا تھا۔

''اگر میں کہوں، ہاں.....تو پھر؟''

''کون ہے وہ؟'' مائرہ کو اپنی آواز خود دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''وقت آنے پر بتا دوں گی۔''

رابیل نے اپنے بازو پر سے ان کا ہاتھ ہٹایا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ مائرہ صوفے پر ساکت بیٹھی اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ رہی تھیں۔

❁○❁

''میرا یار کیسا ہے ایبک بیٹے؟''

کرنل شیر دل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ایبک نے، جو انیکسی کا دروازہ کھول رہا تھا، مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

''بابا بہت ڈپریس ہو رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ آپ کی طرف لے چلوں۔''

''ڈپریس تو ہوگا ہی نا۔ اس شہر میں آنا اس کے لئے کون سا آسان رہا ہوگا؟......اس شہر کی سڑکوں نے سینکڑوں بار اس کے قدم چومے ہوں گے۔ کیسے کیسے نہ دل مچلتا ہوگا اس کا کہ پہلے کی طرح وہ شانی کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بے مقصد ان سڑکوں پر گھومے۔ آدھی رات کو اٹھ کر کافی پینے جائے۔ حق نواز کے ساتھ سڑکوں پر مارچ کرتے ہوئے پاکستان کی بقا کے لئے نعرے لگائے۔''

''ارے!'' ایبک نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''آپ تو بابا کی طرح باتیں کر رہے ہیں۔ بالکل یہی کچھ بابا بھی محسوس کرتے ہیں۔''

''اس شہر نے جہاں میرے دوست کو بہت کچھ دیا، وہاں بہت کچھ چھین بھی لیا۔''

''آیئے نا انکل! اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''میں چلوں، تمہاری آنٹی کو بتا دوں فلک شاہ کے آنے کا۔ فارغ ہے کئی دنوں سے۔ ذرا کچھ مصروف ہو جائے گی کچن میں۔''

کرنل شیر دل وہیں سے واپس مڑ گئے۔ ایبک نے صوفے پر بیٹھ کر جوتے اُتارے اور ٹانگیں پھیلا کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی اور آنکھیں موند لیں۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے اریب فاطمہ کا سراپا لہرانے لگا۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

'محبت پر اتنی کہانیاں لکھنے کے باوجود میں سچ میں نہیں جانتا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ اور یہ تو میں نے اب جانا ہے..... پتہ نہیں، اریب فاطمہ کب واپس آئے گی۔ لگتا ہے جیسے اسے دیکھے ہوئے صدیاں ہی گزر گئی ہوں۔'

اُس روز جب وہ ''الریان'' کے لِونگ روم میں بیٹھا تھا اور عاشی نے آ کر خبر دی تھی کہ اریب فاطمہ جا رہی ہے تو وہ ایک دم چونکا تھا اور اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''کہاں......کہاں جا رہی ہے؟''

اور پھر اپنی ہی بے اختیاری محسوس کر کے اس نے وہاں موجود سب لوگوں کی طرف چور نظروں سے دیکھا تھا۔ لیکن کسی کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ سب حفصہ کے ولیمے کے ڈریس کے ڈیزائن پر ڈسکس کر رہے تھے۔ اور ایسے میں کسی نے عاشی کی بات نہیں سنی تھی۔

وہ اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ اریب فاطمہ اپنے اماں، ابا سے ملنے گاؤں جا رہی ہے۔ ایک ہفتے کے لئے۔

وہ جو صرف اریب فاطمہ سے ملنے کے لئے آیا تھا، مایوس سا ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اندرونی گیٹ سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اریب فاطمہ سیاہ چادر اوڑھے چھوٹا سا بیگ اٹھائے اپنے کمرے سے نکلی۔ عاشی اپنا ہاتھ چھڑا

کر باہر چلی گئی اور وہیں کھڑا اریب فاطمہ کا انتظار کرنے لگا۔ اریب فاطمہ کی پلکیں جھکی تھیں اور ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

''اریب فاطمہ! آپ جا رہی ہیں؟''

اریب فاطمہ نے ذرا کی ذرا پلکیں اُٹھائی تھیں اور پھر فوراً ہی جھکا لیں۔

''ہاں! مجھے اماں سے ملنا تھا بہت ضروری۔ میری دوست گاؤں جا رہی تھی۔ میں نے بھی پروگرام بنا لیا۔''

''کون دوست؟ وہی ہسپتال والی نرس؟'' اس نے پوچھا۔ اریب فاطمہ نے سر ہلا دیا۔

''لوکل پہ تو نو دس گھنٹے لگ جائیں گے شاید۔''

اور اریب فاطمہ نے پھر سر ہلا دیا۔

''کیا آپ ابھی جائیں گی؟ بہت دیر نہیں ہو جائے گی، وہاں پہنچتے پہنچتے؟''

اریب فاطمہ نے نظریں اٹھائیں۔

''میں رات کو اپنی دوست کے پاس ہی رہوں گی اور کل صبح سویرے نکلیں گے۔''

''تو اس وقت آپ اپنی دوست کی طرف جا رہی ہیں؟''

اس نے سر ہلا دیا۔

''میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔''

''نہیں۔ بابا جان نے یاسین سے کہا ہے، وہ مجھے ہسپتال چھوڑ آئے گا۔ وہ وہیں کوارٹر میں رہتی ہے۔''

''آپ کیوں اجازت نہیں دے دیتیں اریب فاطمہ! کہ میں کچھ دور تک آپ کی ہمراہی میں چلوں؟''

بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا۔ اریب فاطمہ نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپ تو عمر بھر کی ہمراہی کے خواہاں ہیں، پھر یہ تھوڑی دور کی ہمراہی کی چاہ......''

''اریب! عمر بھر کی ہمراہی کی چاہ تو میری زندگی کی سب سے بڑی چاہ ہے۔ میں تو اس وقت جانے سے پہلے....''

''یہ مناسب نہیں ہے۔'' اریب فاطمہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے یہاں بہت محتاط ہو کر رہنا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی کی انگلی میری طرف اُٹھے۔''

''اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کی عزت، آپ کا وقار میرے لئے زندگی سے بڑھ کر ہے۔'' اس نے دروازہ کھول کر اسے گزرنے کے لئے راستہ دیا تھا۔

''آپ ناراض تو نہیں ہو گئے؟'' اریب فاطمہ پریشان سی ہو گئی۔

''ہرگز نہیں۔'' وہ کھل کر مسکرایا۔ ''ایسا سوچنا بھی مت۔ میں کبھی آپ سے ناراض نہیں ہو سکتا۔''

اریب فاطمہ کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ گئی۔

اس نے اریب فاطمہ کے پیچھے قدم رکھا۔ لان خالی تھا۔ سب لوگ ملک ہاؤس جا چکے تھے۔ یاسین، پورچ میں گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔

''اللہ حافظ اریب فاطمہ!''

''اللہ حافظ۔''

اریب فاطمہ نے بھی آہستگی سے کہا تھا اور سیڑھیاں اُتر کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کی نظریں رائٹنگ ٹیبل پر پڑیں۔ اور اسے یاد آیا کہ وہ تو ملک ہاؤس سے اس لئے ادھر آیا تھا کہ لکھنے کا کام نمٹا لے۔ اسے ہفتہ وار کالم لکھنا تھا اور کچھ تحقیقی کام بھی کرنا تھا۔

وہ اُٹھا اور یوں ہی ننگے پاؤں چلتا ہوا رائٹنگ ٹیبل تک آیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے دراز سے فائل نکالی۔ لوگ اس لے

کالم پسند کرتے تھے۔ ہر ہفتے ایک نیا موضوع، ایک نئی بات۔ موضوعات کی کمی نہ تھی۔ بے شمار ایشو تھے، بے شمار دکھ تھے اور بے شمار زخم تھے جو روز اس پاک سرزمین کے سینے پر لگتے تھے۔ وہ کالم نہیں لکھتا تھا، آنسو پروتا تھا اپنے لفظوں میں۔ لیکن آج..... آج کیا لکھے۔

اس نے قلم نکالا اور فائل میں سے سادہ صفحات نکالے۔

''ہمیں پینے کے لئے صاف پانی ملے نہ ملے، روشنی نصیب ہو نہ ہو، ہمارا عدالتی نظام ضرور آزاد ہونا چاہئے۔ وہ قومیں تباہ ہو جاتی ہیں، جن سے انصاف رخصت ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔ تم سے پہلے قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ وہ امیروں کو معاف کر دیتے تھے اور غریبوں کو سزا دیتے تھے۔''

وہ لکھتے لکھتے ٹھٹک گیا۔

اس موضوع پر تو وہ پہلے بھی لکھ چکا ہے۔ ایک نہیں، بلکہ دو کالم..... پھر کیا لکھے؟ کچھ دیر وہ قلم یوں ہی ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہا۔ پھر فائل بند کر کے اس نے دراز سے دوسری فائل نکالی۔

''زمین کے آنسو۔''

فائل پر لکھا تھا۔ اس نے فائل کھولی۔

بہت دنوں سے وہ یہ بھی نہیں لکھ پایا تھا۔ جب سے فلک شاہ اور عمارہ لاہور سے آئے تھے، تب سے اس نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔

اس نے فائل کھولی اور پچھلے لکھے پر سرسری سی نظر ڈالنے لگا۔

''مجھے ہمیشہ بہت آنسو ملتے رہے ہیں۔ میرا سینہ زخمی ہے۔ میں تھک گئی ہوں۔ اتنی کہ اب صرف آنسو بہتے ہیں۔''

حورعین کہہ رہی تھی اور اس کے آنسو خاموشی سے اس کے رخساروں پر بہتے تھے۔ میں فاصلے پر بیٹھا تڑپتا تھا اس کے لئے۔ اور اس کے آنسو میرے دل پر گرتے تھے۔

مریم کی طرح۔

اور زمین کی طرح میں نے بھی بہت آنسو بہائے ہیں شاید۔

مریم کے دکھوں پر اور زمین کے دکھوں پر۔

مریم کے دکھوں کو بانٹنے والا کوئی نہ تھا۔

جب سعدیہ مری تھی۔

اور جب رقیہ، ملک ممتاز کے ساتھ رخصت ہوئی تھی۔ اور رخصتی سے پہلے اس نے اپنی نندوں کی منتیں کی تھیں، ہاتھ جوڑے تھے۔ وہ جو رقیہ سے پیار کرتی تھیں یا جتاتی تھیں اور اسے لاڈ میں ملکہ الزبتھ کہتی تھیں کہ ان کے نزدیک خوبصورتی کا معیار یہ ہی تھا۔ لیکن کسی نے اس کی دادرسی نہیں کی تھی اور اس کا پورا وجود ایک آنسو بن گیا تھا۔

اور صرف حورعین تھی، جو اس کے دکھوں کی بھیدی تھی۔ اور جو نہ روتی تھی، نہ مریم کو تنگ کرتی تھی۔ اور جن راتوں میں مریم سعدیہ اور رقیہ کے کچھ میں جاگتی رہتی تھی، وہ بھوکی ہی سو جاتی تھی۔

اس نے صفحہ پلٹا۔

جب یہودا اسکر یوتی تیس سکوں کے عوض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کاہنوں کے ہاتھ فروخت کر رہا تھا تو زمین کے آنسو رکتے ہی نہ تھے۔

''یہ یہودا کون تھا حورعین؟'' میں نے شرمندگی سے لبریز آواز میں پوچھا۔

''متی کی انجیل میں ہے کہ یہودا، حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ حواریوں میں سے تھا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ حضرت مسیح کو مجرم قرار دیا جا رہا ہے تو اس نے سکے پھینک کر خودکشی کر لی تھی۔''

میں نے کئی صفحے اُلٹ ڈالے اور پھر ایک صفحہ پر اُس کی نظریں ٹھہر گئیں۔

''اور اس شام جب ملگجے سے اندھیرے میں مریم، حورعین کا ہاتھ تھامے گھر سے نکلی تھی تو ہر قدم پر ایک سسکی اس کے لبوں سے نکلتی تھی۔

وہ رقیہ اور سعدیہ کو نہیں بچا سکی تھی۔

لیکن وہ فریدہ کو ہر قیمت پر بچانا چاہتی تھی۔

فریدہ جو تیسری بیٹی تھی اور صرف تیرہ سال کی تھی، وہ بھی رابعہ کے ساتھ حویلی کے صحن میں کیکلی ڈالتی اور گڑیوں اور پٹولوں سے کھیلتی تھی۔ جس کی سریلی آواز، کچن میں کام کرتی مریم کے لبوں پر مسکراہٹ لے آتی تھی۔ وہ رابعہ کے ساتھ مل کر اونچا اونچا گاتی۔

''ہرا سمندر گوپی چندر

بول میری مچھلی کتنا پانی''

''گوڈے گوڈے''

رابعہ جواب دیتی۔

اور پھر دونوں کی کھلکھلاہٹوں سے حویلی میں پھول سے بکھر جاتے تھے اور مریم اندر اونچی پیڑھی پر بیٹھی بے اختیار ان کی خوشیوں کے لئے دعا مانگتی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، مریم کی دعائیں بے اثر رہ جاتی تھیں۔

حورعین کا ہاتھ تھامے ملگجے سے اندھیرے میں اچھی طرح چادر سے خود کو لپیٹے جب وہ شیر افگن چوہدری کے دروازے پر دستک دیتی تھی تو اس کا دل کانپتا تھا اور اس کے کانوں میں گلابو ماچھن کی آواز آتی تھی۔

''سنا ہے چوہدری فرید، شیر افگن کی بیٹی سے شادی کرنے والا ہے اور بدلے میں اپنی بیٹی کا رشتہ دے رہا ہے اسے۔''

پہلی بات اس نے بے دھیانی سے سنی تھی۔ لیکن دوسری بات نے اسے دہلا دیا تھا۔

''مجھے نورو مصلن نے بتایا ہے کہ فریدہ......''

''نہیں۔'' اس کی چیخ صرف اس نے خود ہی سنی تھی۔ فریدہ صرف تیرہ سال کی تھی اور شیر افگن جو چوہدری فرید کا چچیرا بھائی تھا، عمر میں اس سے بھی بڑا تھا اور پچھلے سال اس کی بیوی ہیضے سے مر گئی تھی اور اس کی بیٹی تیس سال کی تھی یا شاید تھوڑی بڑی۔

کیا کل رات اس نے جو چوہدری فرید سے کہا تھا، یہ اس کا ردِعمل تھا یا پھر اس نے پہلے سے ایسا سوچ رکھا تھا؟ کل رات چار راتوں کے بعد وہ ڈیرے سے گھر آیا تھا تو اس نے چوہدری فرید سے کہا تھا۔

''میں تجھے بیٹا نہیں دے سکی۔ تُو شادی کر لے، کسی سے بھی۔ نورو سے یا میراں سے۔ لیکن اس طرح راتوں کو ڈیرے پر...... ہماری بیٹیاں بڑی ہوگئی ہیں اور وہ باپ کے رازوں کو جاننا چاہتی ہیں۔''

چوہدری فرید نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس سوچتی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

اور اب وہ شیر افگن کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

''میری بیٹی بہت چھوٹی ہے شیر افگن! صرف تیرہ سال کی۔''

''تو؟'' شیر افگن مونچھیں مروڑ رہا تھا۔

''یہ ظلم نہ کر......''

''فرید سے کیوں نہیں کہتی؟''

''شنوائی نہیں ہوگی۔ جانتی ہوں۔''

''لیکن میں زبان دے چکا ہوں اور برادری میں سب کو پتہ ہے کہ تُو فرید کو بیٹا نہیں دے سکی۔ اس لئے وہ دوسری

لالی کررہا ہے۔"

"تجھے تو اللہ نے بیٹے بھی دیئے ہیں اور بیٹیاں بھی۔ تو میری بیٹی کا خیال چھوڑ دے۔ میں تیری بیٹی کو خود دُلہن بنا کر لے جاؤں گی۔ اسے سونے کے پلنگ پر بٹھا کر ساری زندگی اس کی چاکری کروں گی۔ پھولوں کی طرح رکھوں گی۔ پر مری بیٹی کو معاف کردے۔ اس سے شادی کا خیال دل سے نکال دے۔ منع کردے چوہدری فرید کو۔"

اور جب وہ واپس آرہی تھی تو گاؤں کی گلیوں میں اندھیرا پھیل گیا تھا اور حورعین کا ہاتھ تھامے وہ بمشکل قدم اٹھاتی تھی۔

فیر الکن نے کوئی اُمید نہیں دلائی تھی۔ بس چپ چاپ بیٹھا رہا تھا۔ مونچھوں کو بل اور دل ہی دل میں مسکراتا۔

گھر واپس جاتی مریم کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی...... اور دارو سائیں پتہ نہیں کس گلی سے نکل کر ان کے پیچھے پاؤں چلتا تھا۔

دارو سائیں جو اُس کا سگا پھوپھی زاد تھا۔ لیکن وہ جب اس کی طرف دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں میں پہچان کے کئی رنگ ہوتے تھے۔ اجنبی نظریں۔

پھر بھی مریم کو لگتا تھا کہ دارو سائیں اس کے دکھوں پر روتا ہے۔

اور اس روز جب گاؤں کی گلیوں میں اندھیرا اُتر آیا۔ دارو سائیں اس کے پیچھے پاؤں چلتا تھا اور نورو مصلن ہونٹوں کو مِسی سے رنگے اور چہرے پر پاؤڈر تھوپے لہرا کر مست چال چلتی اس کے پاس سے گزر کر ڈیرے کی طرف جا رہی تھی تو مریم کا دل پاتال میں گرتا تھا اور آنکھیں لہو روتی تھیں۔ پھر بھی وہ چادر اچھی طرح لپیٹے حورعین کا ہاتھ تھامے تیز تیز چلتی حویلی کی سمت جاتی تھی۔ اندر حویلی میں رقیہ بار بار گھڑونچی کی جالیوں میں جھانکتی تھی کہ مریم نے دیر کیوں کردی۔"

ایبک نے گہری سانس لے کر ایبک نے سوچا۔ پتہ نہیں کب مکمل ہوگی یہ کہانی۔

اور پھر صفحے پلٹتے ہوئے اس نے ایک صفحے کو پڑھا۔

یہ 14 جولائی 1099ء تھا۔ جب بیت المقدس کے راستوں پر ہر جگہ مسلمانوں کے کٹے ہوئے سروں، ہاتھوں اور پاؤں کے انبار لگے تھے اور ہیکل سلیمانی میں لاشیں خون میں تیرتی پھرتی تھیں۔

اور زمین ہچکیاں لے لے کر روتی تھی۔ تم کہتے ہو، زمین کو تو رونے کی عادت ہے۔ لیکن زمین کیا کرے؟ جب تم نے اسے صرف آنسوؤں کی سوغات ہی دی ہے۔ اتنے آنسو کہ سدا اس کی آنکھیں بھیگی ہی رہتی ہیں۔

میں نے دیکھا، حورعین کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور وہ اوڑھنی کے پلو سے اپنا گیلا چہرہ پونچھ رہی تھی۔ اور جب سے وہ ملی مجھے، میں نے اسے روتے ہی دیکھا تھا۔

"حورعین!" میں نے آہستگی سے اسے بلایا۔

دروازے پر بیل ہو رہی تھی۔

اس نے چونک کر فائل بند کردی اور اٹھا۔

'شاید انکل شیر دل ہوں یا آنٹی نے کسی کو بھیجا ہو۔ لیکن اگر آنٹی نے بلایا تو میں معذرت کرلوں گا۔' اس نے سوچا۔ اس کا موڈ لکھنے کا بن رہا تھا۔

پڑھتے پڑھتے الفاظ اور خیالات اس کے اندر بن اور بگڑ رہے تھے۔

'آج میں ضرور کچھ بہت سارا لکھوں گا۔'

دروازہ کھولتے ہوئے اس نے سوچا اور دروازہ کھولتے ہی اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"آپ یہاں؟" وہ حیرت سے رابیل کو دیکھ رہا تھا۔

رابیل کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اور وہ اس طرح ایبک کو دیکھ رہی تھی، جیسے اس کی حیرت کو انجوائے کر رہی ہو۔

ایبک نے رابیل کے پیچھے کسی اور کو دیکھنے کی کوشش کی۔
''میں اکیلی آئی ہوں۔'' رابیل نے اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بتایا۔
''لیکن کیوں؟...... کس لئے؟...... خیریت ہے نا؟'' ایبک کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ وہ ابھی تک دروازے ہی کھڑا تھا اور رابیل دروازے سے باہر۔
''خیریت ہے۔ اور کیا میں نہیں آ سکتی یہاں؟''
ایبک نے سر ہلا دیا۔ لیکن وہ ابھی تک حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اگر اسے کوئی کام بھی تھا تو وہ ابھی ''ملک ہاؤس'' سے ہی آ رہا تھا۔ وہ کہہ سکتی تھی۔
''آپ کو غالباً مجھے یہاں دیکھ کر بہت حیرت ہو رہی ہے۔ میری جگہ اگر منیبہ یا حفصہ ہوتیں تو شاید آپ اتنے حیران نہ ہوتے۔''
''شاید۔'' ایبک نے آہستگی سے کہا۔ وہ ابھی تک اُلجھا ہوا تھا اور رابیل کے یہاں آنے کا مقصد سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
''تو چلیں، میں آپ کی حیرانی دور کر دیتی ہوں۔ ایکچوئیلی میں یہاں آنٹی مسز شیر دل سے ملنے آئی ہوں۔ ہسپتال میں دو بار میری ان سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ کسی روز میں ان سے ملنے ان کے گھر آؤں گی اور ان کی بنائی ہوئی پینٹنگ اور پھول وغیرہ دیکھوں گی۔''
ایبک نے اطمینان کا سانس لیا۔
''اور اندر جانے سے پہلے میں ادھر اس لئے آئی ہوں کہ مجھے آپ کو ایک بات بتانا تھی۔''
''جی۔'' ایبک پھر ذرا سا حیران ہوا اور ایک طرف ہو کر اسے اندر آنے کے لئے راستہ دیا۔ ''آیئے۔''
رابیل نے ایک قدم اندر رکھا اور پھر وہیں رک گئی اور نظریں اٹھا کر ایبک کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔
''مجھے آپ کو صرف یہ بتانا تھا کہ......'' وہ تھوڑا سا رُکی۔ ''آپ مومی انکل سے کہہ رہے تھے کہ میں، آپ کو ناپسند کرتی ہوں اور اگر میرا بس چلے تو میں، آپ کا داخلہ ''الریان'' میں بند کر دوں...... تو ایسا نہیں ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ کو ناپسند نہیں کرتی۔''
''اوہ...... تو آپ نے میری بات سن لی تھی۔'' اتنی دیر میں پہلی بار ایبک کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔ لیکن پھر وہ ایک دم چونکا۔
''کیا رابیل نے بابا کی بات بھی سنی تھی؟ اور کیا وہ......؟''
''سوری۔'' رابیل نے نظریں جھکائیں۔ ''میں بابا جان سے ملنے آئی تھی کہ آپ کی بات سن کر وہیں سے ہی پلٹ آئی۔''
ایبک نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا کہ کیا واقعی اس نے صرف اتنی سی ہی بات سنی تھی یا......
''بیٹھیں پلیز۔'' اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
رابیل نے ایک لمحہ کے لئے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔
''نہیں۔ بس اب چلتی ہوں۔ آنٹی شیر دل انتظار کر رہی ہوں گی۔ آنے سے پہلے میں نے فون کر دیا تھا انہیں۔ دراصل مجھے بہت دکھ ہوا تھا کہ آپ میرے متعلق اتنا غلط سوچتے ہیں۔ میں یہاں سے گزر رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ حفصہ نے بتایا تھا کہ آپ یہاں انیکسی میں رہتے ہیں۔ عمر بھی اکثر ذکر کرتا رہتا ہے۔ تو بے اختیار میں ادھر آ گئی کہ آپ کی غلط فہمی دُور کر سکوں۔''
ایبک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ رابیل کا جو رویّہ تھا، وہ صرف اسے ہی نہیں، سب کو محسوس ہوتا تھا۔ عمر نے تو کتنی دفعہ بے حد تاسف سے کہا تھا۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے۔ رابی آپی، آپ سے اتنا چڑتی ہیں۔"
"میں جلدی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی۔ میری نیچر ہے یہ۔ آپ سے بھی جھجک آتی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں آپ کو ناپسند کرتی ہوں۔ آپ میرے کزن ہیں۔"
اسے خاموش دیکھ کر رابیل نے وضاحت کی تو ایبک بے اختیار ہنس دیا۔
"اٹس اوکے رابیل! میں نے تو یوں ہی ایک بات کر دی تھی۔ آپ نے اسے اتنا محسوس کیا۔ سوری۔"
'اور یہ ایبک کی ہنسی کیسے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیتی ہے۔' رابیل نے بالکل اریب فاطمہ کی طرح سوچا اور نظریں ایبک کے چہرے سے ہٹالیں۔
"سوری تو مجھے کرنا چاہئے کہ آپ میرے روّیے سے ہرٹ ہوئے اور آپ نے ایسا سوچا۔"
"اب آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں رابیل! اور میں ایسی باتوں سے ہرٹ نہیں ہوتا۔ بے شک میں آپ کا کزن ہوں لیکن آپ کے لئے اجنبی ہی تھا ایک طرح سے۔ ہاں! آپ کے لئے میں اجنبی نہ ہوتا، پھر آپ کا روّیہ ضرور مجھے ہرٹ کرتا۔"
"میں اب چلوں۔" رابیل نے باہر قدم رکھا۔
"میں آپ کو اندرونی دروازے تک چھوڑ آؤں۔"
"نہیں، میں چلی جاؤں گی۔"
رابیل چلی گئی تو دروازہ بند کر کے وہ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔
'کمال ہے......' وہ بڑبڑایا۔ 'یعنی کہ رابیل احسان یہاں میری انیکسی میں صرف یہ بتانے آئی ہے کہ وہ مجھے ناپسند نہیں کرتی......شاید رابیل کے اندر یہ تبدیلی اس لئے آئی ہے کہ میں نے اسے بلڈ دیا تھا۔' اس نے سوچا لیکن اندر کہیں اک چبھن سی تھی۔
اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کھلی ہوئی فائل کے صفحے پر نظر دوڑائی۔
"تو اُس روز فصیلوں اور برجوں پر ان کے لوگ موجود تھے اور بیت المقدس کے راستوں میں مسلمانوں کے کٹے ہوئے ہاتھوں، پیروں اور سروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔"
اس نے ایک ساتھ کئی صفحات اُلٹ دیئے تھے اور اب آخری لکھے گئے صفحے کو دیکھ رہا تھا۔
"اور اس رات حورعین کو لگا جیسے وہ ایک دم بڑی ہو گئی ہو۔ جیسے وہ گیارہ سال کی معصوم بچی نہ ہو بلکہ ایک میچور عمر کی ہو اور وہ گیارہ سالہ حورعین، ماں کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی تھی اور اپنے سامنے کھڑے چوہدری فرید کی آنکھوں میں دیکھتی تھی۔"
اس نے قلم اٹھایا اور کافی دیر یوں ہی قلم ہاتھ میں تھامے خالی صفحے کو دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں، وہ کیا لکھنا چاہتا تھا۔ اس روز اس نے یہاں تک ہی لکھ کر چھوڑ دیا تھا۔
اب کتنے دنوں بعد اس نے یہ فائل اٹھائی تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے اس کے ذہن میں کہانی کے واقعات بن اور سنور رہے تھے۔ لیکن اب ذہن بالکل خالی تھا۔ کہیں کوئی ایک لفظ، کوئی ایک جملہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ یقیناً رابیل کی اس اچانک آمد نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔
اس نے فائل بند کر دی۔ اور ہاتھ بڑھا کر میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا تا کہ کسی خبر کو اپنے کالم کا موضوع بنا سکے۔
بہرحال اسے ہر صورت کالم تو لکھنا تھا۔ اسے اپنے مطلب کی خبر مل گئی تھی۔ وہ کچھ دیر اخبار ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر رائٹنگ ٹیبل کے پاس آیا اور اب وہ کالم لکھ رہا تھا۔ اس کا قلم بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ کالم لکھ کر وہ اُٹھا اور اس نے سوچا کہ ہاتھ لے کر وہ کچھ دیر کے لئے سو جائے۔ سونے اور ہاتھ لینے سے یقیناً وہ فریش ہو جائے گا تو شاید کچھ

مزید لکھ سکے اپنی کہانی۔ کم از کم وہ کچھ جو اس نے ادھورا سا چھوڑ دیا تھا۔ پتہ نہیں وہ اس وقت کیا لکھنا چاہ رہا تھا؟ حور عین کیوں مریم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی تھی؟ کیا تھا اس کے ذہن میں؟

وہ سوچتا ہوا سو گیا۔ جانے کتنی دیر سویا تھا وہ۔ اس کی آنکھ پھر فون کی آواز سے ہی کھلی تھی۔ وہ بے دھیانی سے فون کی آواز سنتا رہا۔ فون بج کر خاموش ہو گیا تھا۔

''اریب فاطمہ!'' اس کے لبوں سے نکلا۔

اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور آنکھوں کے سامنے اریب فاطمہ کا سراپا لہرایا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ اریب فاطمہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں کسی دریا کے کنارے پتھروں پر بیٹھے تھے۔ سامنے برف سے ڈھکے پہاڑ تھے۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور اریب فاطمہ کا بڑا سا دوپٹہ تیز ہوا سے اُڑ اُڑ کر اس کے چہرے سے ٹکراتا تھا اور جیسے اس کے مشام جاں کو معطر کر جاتا تھا۔

''اریب فاطمہ!'' اُس کے اُڑتے دوپٹے کے پلو کو دونوں مٹھیوں میں بھینچتے ہوئے، اس کی خوشبو سونگھتے ہوئے وہ بڑے جذب سے کہہ رہا تھا۔ ''اریب فاطمہ! مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا۔''

''میں بھلا آپ کو کیوں چھوڑ کر جاؤں گی؟ میں تو......'' اریب فاطمہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اریب فاطمہ کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبا جاتا تھا۔

''اریب فاطمہ! تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں اور ان میں کتنا سحر ہے۔ پتہ ہے، مجھے پہلے تمہاری آنکھوں نے ہی اسیر کیا تھا۔''

اریب فاطمہ کے رخسار شفق رنگ ہو گئے تھے اور لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ آن کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا، جب رابیل نے اس کے کندھے پر آ کر ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔ رابیل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

''اُٹھو آبی!......تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

وہ حیران سا رابیل احسان کو دیکھتا تھا اور اریب فاطمہ کی آنکھوں کے کٹورے پانیوں سے بھرتے جاتے تھے۔ وہ اریب فاطمہ کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے کٹوروں سے چھلک جانے والے پانیوں کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا۔ وہ رابیل کو بتانا چاہتا تھا کہ اسے اس کے ساتھ نہیں جانا۔ بلکہ وہ یہاں اریب کے ساتھ بیٹھنا اور اسے دیکھنا چاہتا ہے کہ فون کی بیل سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

'پتہ نہیں، کس کا فون ہے۔'

اس نے آنکھیں کھول کر تکیے کے پاس پڑے اپنے سیل فون کو دیکھا۔ اجنبی نمبر تھا۔ شاید رانگ نمبر ہو۔ اور کتنا اچھا ہوتا اگر بیل نہ ہوتی۔

'اگر تم جان لو اریب فاطمہ! کہ میں تمہارے متعلق کتنے خواب دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاؤ۔ جب تم ملو گی تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا کہ میں ہر رات تمہیں خواب میں دیکھتا ہوں......اور آج تو دن میں بھی تم میرے خوابوں میں چلی آئی ہو۔'

رابیل..... یہ آج رابیل کہاں اس کے خواب میں چلی آئی تھی۔

اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

'اور یہ غالباً اس کی آج کی آمد کا نتیجہ ہے۔ میں سونے سے پہلے اسے ہی سوچ رہا تھا۔ اس لئے وہ خواب میں چلی آئی۔'

اس نے سامنے کلاک پر نظر ڈالی۔ چھ بج رہے تھے۔

اس نے فون نیچے رکھا ہی تھا کہ بیل پھر ہونے لگی۔ وہی نمبر تھا۔ اس نے فون آن کیا۔

''ہیلو......!''

''السلام علیکم۔ آپ ایبک ہیں نا؟''

''جی!'' وہ چونکا۔ اسے اپنے کانوں پر شبہ ہوا۔

''میں اریب ہوں...... اریب فاطمہ۔''

''اریب فاطمہ!...... آپ کیسی ہیں؟...... خیریت ہے نا؟ سب ٹھیک ہے نا؟ آپ نے کیسے فون کیا؟''

''جی! سب ٹھیک ہے۔ میں یہاں اپنی دوست کے گھر آئی ہوئی تھی۔ وہ ادھر کام کرتی ہے، ایک این جی او میں۔ ان نے اسے سیل فون دے رکھا ہے۔ اس کے فون سے بات کر رہی ہوں۔ میں نے سوچا، آپ کو بتا دوں، میں یت سے پہنچ گئی ہوں۔ اور یہاں سب ٹھیک ہے۔ اماں، ابا، بھائی سب۔''

''تھینک یو...... تھینک یو اریب فاطمہ!'' ایبک بے حد خوش ہوا تھا۔ ''یقین کریں، میں کس قدر بے چین تھا جاننے کے لئے کہ آپ وہاں خیریت سے پہنچ گئی ہیں۔ لیکن آپ نے تو اس طرح کی کوئی امید نہیں دلائی تھی کہ......''

''مجھے خود نہیں پتہ تھا کہ میں آپ کو فون کر سکوں گی یا نہیں۔ زینب آپا سے ملنے آئی تھی۔ ان سے کہا، میں نے ایک ان کرنا ہے اور انہوں نے اجازت دے دی۔ اتفاق سے آپ کا کارڈ بھی جو اس روز آپ نے دیا تھا، میرے پرس میں تھا۔ یوں بات ہو گئی۔ زینب آپا میری دوست ہیں۔''

''تھینک یو۔'' ایبک کا جی چاہ رہا تھا، وہ اس سے بہت دیر باتیں کرے، اسے بتائے کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسے خواب میں دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں کتنی حسین وادی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ کسی کا فون استعمال کر رہی ہے۔

''سنیں اریب فاطمہ! آپ فون بند کریں۔ میں فون کرتا ہوں آپ کو۔ آپ کی فرینڈ کا بیلنس ختم ہو جائے گا اور......''

''نہیں۔ بیلنس کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اُسے اُس کی این جی او والے بیلنس کروا کے دیتے ہیں۔ اور اس نے مجھے اجازت دی ہے کہ جتنی مرضی بات کر لوں۔ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ لیکن میں اب بند کرتی ہوں۔ وہ چائے بنانے گئی ہے۔ آ رہی ہو گی۔''

''آپ کی آواز میں کتنا سحر ہے اریب فاطمہ! مجھے لگتا ہے، میں آپ کی آواز سے جی اُٹھا ہوں۔''

وہ ہولے سے ہنسی۔ ''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

''سچ کہہ رہا ہوں اریب فاطمہ!'' ایبک کی آواز بوجھل ہو گئی۔ ''آپ نہیں جانتیں اریب فاطمہ! آپ میرے لئے کیا ہیں۔ میری زندگی...... میری حیات کی روشنی۔''

وہ پھر ہنسی تھی۔ مدھر مدھر سی ہنسی۔

''آپ کی ہنسی بھی بہت خوب صورت ہے اریب فاطمہ!'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ ''میں نے پہلے کبھی آپ کی ہنسی کی آواز نہیں سنی۔ ہمیشہ آپ کی آنکھوں میں نمی دیکھی ہے۔ کاش! اس وقت میں آپ کے قریب ہوتا اور اس ہنسی کو آپ کے لبوں پر بکھرتے اور چہرے کو روشن کرتے دیکھتا۔''

''پلیز! اب اجازت دیں۔ زینب آپا آ رہی ہیں۔'' وہ اتنی دور سے بھی اس کی آواز میں گھبراہٹ محسوس کر سکتا تھا۔ وہ شرما بھی رہی ہو گی اور اس کی لانبی پلکوں کا سایہ اس کے رخساروں پر لرز رہا ہو گا۔

''اریب فاطمہ! یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کب تک آ رہی ہیں۔''

''ابھی تو آئی ہوں۔ کم از کم ایک ہفتہ اور رہوں گی۔ اماں بہت کمزور ہو رہی ہیں۔ مجھے ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگی۔'' اس کی کھلکھلاتی آواز میں اُداسی کی خزاں اُتر آئی۔ وہ بے چین ہو گیا۔

''کیا ہوا ہے اماں کو؟''

''کچھ نہیں۔ وہ بیمار نہیں ہیں۔ معمول کے مطابق سب کام کر رہی ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے، وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ لیکن وہ

کہتی ہیں، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں اریب فاطمہ! اور کسی ڈاکٹر سے چیک اپ کروالیں ان کا۔ تسلی ہو جائے گی۔ اگر صرف ویک نا
ہے تو آپ ان کی خوراک کا خیال رکھئے گا۔"

"جی۔"

"پھر کب فون کریں گی؟" اس نے پوچھا۔

"پتہ نہیں...... شاید کروں...... شاید نہ کرسکوں۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔"

فون بند ہو گیا تھا۔ لیکن ایبک ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھ رہا تھا۔

"تھینک یو اریب فاطمہ۔" اس نے آہستگی سے کہا اور فون رکھ دیا۔

'آپ کو کیا خبر اریب فاطمہ! آپ سے بات کرنا، آپ کا انتظار کرنا اور آس رکھنا ملن کی، اتنا ہی خوب صورت ہے
جتنا کسی خوب صورتی کا خوب صورت ہونا اور خوب صورت تر ہوتے چلے جانا۔"

وہ اُٹھا تو اس کے لبوں پر بڑی گہری مسکراہٹ تھی۔ اریب فاطمہ سے بات کر کے وہ ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔
گنگناتے ہوئے تیار ہوا تھا۔ اسے "الریان" جانا تھا لیکن جانے سے پہلے وہ کچھ دیر تک انکل شیر دل کے پاس رکا تھا۔
اپنی نگرانی میں فلک شاہ کے لئے گیسٹ روم تیار کروا رہے تھے اور بے حد خوش تھے۔

"تم کہاں جا رہے ہو آبی؟" ایک تنقیدی نظر گیسٹ روم پر ڈال کر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔

"پہلے اخبار کے دفتر میں جاؤں گا۔ پھر بابا کی طرف۔"

"انتظار نہیں ہو رہا یار! اسے رات میں ہی لے آنا۔"

ایبک مسکرا دیا۔ "کہوں گا اُن سے...... یہ آنٹی کہاں ہیں؟ اُن سے مل لوں۔"

"پڑوس میں گئی ہیں۔ ویسے تمہاری آنٹی کمال کی عورت ہیں یار! انہیں مومی کی پسند، ناپسند سب کی یاد ہے۔ اس لئے
سے کچن میں گھسی، ابھی باہر نکلی ہیں۔ تمہاری کزن کو بھی کچن میں ہی بٹھا لیا تھا۔"

ایبک نے سر ہلا دیا۔

جب وہ انکل شیر دل کے پاس سے اٹھا تو باہر اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اور جب وہ ملک ہاؤس پہنچا تو روشنیاں جل اٹھی
تھیں۔ ملک ہاؤس میں خاموشی تھی۔ ورنہ جب سے فلک شاہ اور عمارہ آئے تھے، ہر وقت رونق لگی رہتی تھی۔

"ارے! سب کہاں ہیں؟" اس نے لاؤنج میں بیٹھی عمارہ سے پوچھا، جو بے حد انہماک سے احمد حسن کا پروگرام دیکھ
رہی تھی۔

"الریان میں۔" عمارہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ایبک کو لگا، جیسے وہ بہت افسردہ اور خاموش ہوں۔

"کیا ہوا ماما؟" ایبک نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے ٹی وی کی آواز بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں۔"

"نہیں۔ کچھ تو ہے۔ آپ اُداس لگ رہی ہیں۔" ایبک نے عمارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پریشانی سے
انہیں دیکھا۔ "اور سب لوگ "الریان" کیوں چلے گئے؟...... کیا کوئی بات ہوئی ہے؟"

"ارے نہیں۔" عمارہ ہولے سے ہنسیں۔ "میں نے خود کہا تھا ثنا بھابی سے کہ آج وہ لوگ "الریان" میں ہی،
جو ہلا گلا کرنا ہے، ادھر ہی کریں۔ تمہاری مائرہ مامی بہت محسوس کر رہی تھیں کہ وہ ان رونقوں کو انجوائے نہیں کر پا رہیں۔
جبکہ ان کا حق ہے کہ وہ بھی اس رونق کا حصہ بنیں۔"

"تو کیا ان کے پاؤں میں مہندی لگی ہے؟ جب سب ادھر آ سکتے ہیں تو وہ کیوں نہیں آ سکتیں؟"

"ان کی مرضی آپی!" عمارہ کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔
"آپ اُداس نہ ہوں ماما پلیز۔" ایبک نے اپنے ہاتھ میں دبے ان کے ہاتھ کو ہولے سے دبایا۔
"کچھ دکھ ان کانٹوں کی طرح ہوتے ہیں آپی! جو گوشت میں دُور تک اُتر جاتے ہیں۔ ان کانٹوں کو نکال بھی دو تو کسک باقی رہتی ہے۔ میں کبھی "الریان" میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ یہ کانٹا تو ہمیشہ گوشت کے اندر گہرائی میں موجود چبھتا رہے گا۔ اور اس سب سے بڑھ کر شانی کی ناراضی اور خفگی۔ تمہارے بابا اندر ہی اندر گھل رہے ہیں آپی!...... اتنا تو انہوں نے شانی بھائی کو وہاں بھی یاد نہیں کیا تھا، جتنا یہاں آ کر کرنے لگے ہیں۔ ان کی ایک ایک بات دس دس بار دہراتے ہیں۔"
عمارہ کی آنکھیں نم ہو گئیں اور ان کی نم آنکھوں نے ایبک کو تڑپا دیا۔
"ماما! پلیز اس طرح دل چھوٹا مت کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، اِن شاء اللہ۔ مجھے یقین ہے، ایک دن احسان انکل خود بابا کے پاس آئیں گے۔ وقت بھی بہت بڑا منصف ہوتا ہے۔ ایک دن دیکھئے گا، سب سچ سامنے آ جائے گا۔"
عمارہ نے سر ہلا دیا۔
"اور یہ انجی کہاں ہے؟"
"موبی ساتھ ہی لے گئی تھی اسے۔"
"اور بابا کیا کر رہے ہیں؟"
"بابا جان کے ساتھ سیاست پر بحث کر رہے ہیں۔" عمارہ مسکرائیں۔ "بابا جان کو سیاست سے نفرت تھی۔ لیکن آج کل ہر وقت تمہارے بابا کے ساتھ سیاست پر ہی گفتگو کر رہے ہوتے ہیں یا پھر ملکی حالات پر۔"
"آپ اکیلی بیٹھی ہیں۔ انجی کو روک لیتیں۔"
"ارے نہیں بیٹا! میں نے خود انجی کو بھیجا تھا۔ اور سچی بات ہے کہ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔ رابی نے گلہ کیا کہ یہ رونقیں ادھر ہوتیں "الریان" میں تو انجی بھی وہاں آتی۔ اب تو الریان والے بھی حفصہ کی شادی انجوائے نہیں کر پا رہے۔"
ایبک نے چونک کر انہیں دیکھا۔
"اوہ! تو اس لئے آپ نے شامامی کو ادھر بھیجا۔"
"دراصل مجھے پہلے ہی خیال کر لینا چاہئے تھا۔ ان سب نے تو پکے ڈیرے ادھر ہی جما لئے تھے۔ مائرہ بھابی نے بہت محسوس کیا۔"
ایبک بنا کچھ کہے کھڑا ہو گیا۔
"ٹھیک ہے۔ آپ اپنا پروگرام دیکھیں۔ میں بابا کے پاس جا رہا ہوں۔"
"ان سے مل کر "الریان" چلے جانا۔ ہمدان بہت تاکید کر کے گیا تھا کہ جیسے ہی تم آؤ، بھیج دوں۔"
"ٹھیک ہے۔" ایبک نے سر ہلایا اور بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ عمارہ نے ٹی وی کی آواز کھولی تھی۔ احمد حسن کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے ایبک نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔
اس شخص کی گفتگو اور شخصیت میں اثر تھا۔ لیکن پچھلے ایک دو پروگراموں میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں، جس پر ایک دو صحافیوں نے کڑی تنقید کی تھی۔ لیکن ایبک نے خود اس کا پروگرام نہیں دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے سوچا۔ کچھ دیر رک کر اس کا پروگرام دیکھے اور اندازہ کر لے کہ آیا صحافیوں نے صحیح تنقید کی تھی یا محض اس کی شہرت سے خائف ہو کر اس کے خلاف لکھا تھا۔ عجیب دور تھا۔ ہر ایک، دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنے کے چکر میں تھا۔
"پھر کبھی آرام سے دیکھوں گا یہ پروگرام۔" اس نے ہولے سے سر کو جھٹکا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
فلک شاہ اور عبدالرحمٰن شاہ کوئی ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔ موضوعِ گفتگو اسامہ بن لادن اور القاعدہ تھا۔ وہ کچھ دیر ان

کے پاس بیٹھا اور انہیں کرنل شیر دل کا پیغام دیا۔
''نہیں یار! صبح ہی چلیں گے۔ تم آج ادھر ہی رک جانا۔'' ان کا دھیان ٹی وی کی طرف تھا۔
''ٹھیک ہے۔'' وہ انہیں الریان جانے کا بتا کر باہر آ گیا۔

❁○❁

''الریان'' کے لاؤنج میں سب ہی خواتین جمع تھیں اور حفصہ کے کپڑے استری کر کے پیک کیے جا رہے تھے۔ ایبک نے دروازے پر رک کر سب پر نظر دوڑائی۔ مائرہ دائیں طرف نیچے کارپٹ پر بیٹھی مرتضیٰ شاہ کی بیوی سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی۔ جبکہ رابیل، منیبہ سے کپڑے لے کر اٹیچی میں رکھ رہی تھی۔ حسب معمول سب سے پہلے منیبہ نے ہی اسے دیکھا تھا۔
''ارے ایبک بھائی! آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟ اندر آ جائیں نا۔''
وہ ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا پیک کیا ہوا جوڑا انجی کو پکڑا دیا اور خود کھڑی ہو گئی۔
''آ جایئے نا۔ یہ ہم حفصہ کے کپڑے ٹانک رہے ہیں۔ کچھ کپڑے ہینگ کر دیئے ہیں۔ دکھاؤں؟'' بے اختیار انجی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''بھلا آپی کو خواتین کے کپڑوں سے کیا دلچسپی؟''
''یہ خواتین کے نہیں، حفصہ آپی کے کپڑے ہیں۔'' عاشی کو غالباً انجی کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنی ناک سکیڑتے ہوئے کہا تو سب کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایبک نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
''بالکل بچہ! حفصہ کے کپڑے میں ضرور دیکھوں گا۔ لیکن اس وقت میں ہمدان کی طرف جا رہا ہوں۔ اپنے کمرے میں ہوگا۔'' ایبک مڑا۔
''تو ہومی کو بھی یہیں بلا لیتے ہیں۔'' منیبہ نے پھر اسے روکا۔
''نہیں بھئی! اس خالص خواتین کی محفل میں ہمارا کیا کام؟'' وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ہمدان کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔
''تم بھی حد کرتی ہو مونی! اب بھلا یہاں ایبک کا کیا کام؟'' ایبک نے جاتے جاتے سنا۔ مائرہ کہہ رہی تھی۔
''ایبک کوئی غیر تو نہیں ہے مما!'' یہ رابیل کی آواز تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ رابیل اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ ایبک کے مڑ کر دیکھنے پر اس نے نظریں جھکا لیں۔ ایبک سیڑھیاں چڑھنے لگا۔
ہمدان آنکھیں موندے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا، جب دستک دے کر ایبک اندر داخل ہوا۔ ہمدان ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
''اب آئے ہو آپی! کہا بھی تھا، جلدی آنا۔''
''میں سو گیا تھا۔ کوئی خاص کام تھا کیا؟''
''نہیں تو۔ بس یوں ہی بہت دن ہو گئے تھے جی بھر کر باتیں کیے۔ سوچا تھا، کہیں باہر چلیں گے۔''
''تو اب چلتے ہیں۔'' ایبک ابھی تک کھڑا تھا۔
''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوتا ہوں۔ تم بیٹھو۔''
ہمدان اُٹھ کھڑا ہوا تو ایبک بیٹھ گیا اور بیڈ پر پڑا میگزین اُٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک صفحہ پلٹتے ہوئے وہ چونکا۔
آدھے خالی صفحے پر جگہ جگہ ''سمیرا'' لکھا ہوا تھا۔ مختلف انداز میں کہیں پھولوں کے اندر، کہیں کسی اسٹائل میں۔ ہمدان

شرٹ چینج کر کے واش روم سے نکلا تو ایبک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے میگزین اس کے سامنے کیا۔
''یہ کیا حماقت ہے ہمدان؟''
ہمدان نے جھک کر دیکھا اور بے حد شرمندہ ہوا۔
''سوری! یوں ہی اکیلا بیٹھا اسے سوچ رہا تھا تو لکھتا چلا گیا۔''
''تم کوئی ٹین ایجر لڑکے نہیں ہو ہومی!'' ایبک بے حد سنجیدہ تھا۔ ''یہ میگزین کسی اور کے ہاتھ بھی لگ سکتا تھا۔ وہ کیا سوچتا؟...... سمیرا کی عزت اور وقار کا خیال رکھنا چاہئے تمہیں۔''
''دراصل وہ...... تم نہیں جان سکتے آبی! کہ میری محبت کی شدت ہر گزرتے دن کے ساتھ کتنی زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ تم نے اگر کسی سے محبت کی بھی ہے تو اتنی شدت سے نہیں۔''
ایبک نے میگزین کا وہ صفحہ میگزین سے نکال لیا۔
''محبت، محبت ہوتی ہے۔ اس کی شدت کم یا زیادہ نہیں ہوا کرتی میری جان! کسی بھی دور میں یہ جب واقع ہو جائے تو اس کی شدت روزِ اوّل سے اتنی ہی ہوتی ہے، جتنی روزِ آخر۔ ہاں کبھی کبھار مختلف جگہوں سے پردہ ہٹ جانے پر اس کا روئے جمال عیاں ہو جاتا ہے۔ دھیان رکھنا کہ یہ اس طرح عیاں نہ ہو کہ محبت کا فخر اور مان باقی نہ رہے۔'' وہ نکالے گئے میگزین کے ورق کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔
ہمدان نے اسے باریک باریک ٹکڑے کرتے اور پھر رومال میں لپیٹ کر جیب میں ڈالتے دیکھا اور ڈریسنگ کے سامنے جا کر برش کرنے لگا۔
''تم نے ثنا مامی سے بات کی سمیرا کے متعلق؟''
''میں شادی کے بعد کروں گا۔''
''وش یو گڈ لک!'' اب ایبک مسکرا رہا تھا۔ ''یعنی عادل کے بعد تمہارے سہرے کے پھول کھلنے والے ہیں۔''
''وہ پڑھ رہی ہے ابھی۔'' ہمدان نے کچھ اس لہجے میں کہا کہ ایبک بے اختیار ہنس دیا۔
''ہنسو مت۔ پہلے تو تمہاری باری آنے والی ہے۔''
''اچھا! نئی خبر ہے۔'' ایبک مسکرا رہا تھا۔
''اچھا! یہ بتاؤ، تمہیں رابیل کیسی لگتی ہے؟''
برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر ہمدان اس کی طرف مڑا۔
''کیا مطلب کیسی لگتی ہے؟'' ایبک چونکا۔
''میرا خیال ہے کہ تم اسے پسند کرتے ہو۔''
''ان معنوں میں نہیں، جن میں تم کہہ رہے ہو۔'' ایبک سنجیدہ ہو گیا۔ ''وہ میرے لئے صرف احسان ماموں کی بیٹی ہے۔''
''اچھا۔'' اپنے اندازے پر ہمدان کو حیرت ہوئی۔ ''پتہ نہیں، مجھے دو بار لگا کہ شاید تم.......''
''تمہیں غلط لگا تھا۔'' ایبک نے فوراً اس کی بات کاٹی۔
''کل مرتضیٰ انکل، عثمان انکل سے کہہ رہے تھے کہ اگر ایبک اور رابیل کا رشتہ ہو جائے تو شاید مومی انکل اور شانی انکل میں جو ناراضی چل رہی ہے، وہ ختم ہو جائے۔'' ہمدان اصل حقیقت سے بے خبر تھا اور مرتضیٰ شاہ اور احسان شاہ بھی۔
''یہ ناراضی ایسے ختم نہیں ہو سکتی ہمدان!'' ایبک کھڑا ہو گیا۔ ''لیکن یہ ناراضی ختم ہو جائے گی ضرور۔ مجھے یقین ہے۔''
ہمدان نے اس کی بات سمجھے بغیر سر ہلایا اور بیڈ سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور وہ دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

ان کی واپسی کافی دیر سے ہوئی تھی۔ وہ پہلے ملک ہاؤس گئے تھے۔ مرتضیٰ شاہ، عثمان شاہ اور مصطفیٰ شاہ بھی عبدالرحمٰن شاہ

اور فلک شاہ کے ساتھ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ کھانا تقریباً وہ کھا چکے تھے۔ عمارہ انہیں آتے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

''آجاؤ بھئی۔ میں نوازش سے کہتی ہوں، گرم گرم نان لے آئے۔''

''نہیں پھپھو! ہم کھانا کھا کر آئے ہیں۔'' ہمدان شاہ نے بتایا۔

''کیا کھالیا بھائی؟'' مرتضیٰ شاہ نے پوچھا۔

''وہ ایک دوست مل گیا تھا۔ وہ زبردستی کے ایف سی لے گیا تھا۔''

''قہوہ تو پیو گے نا؟''

''ضرور۔'' وہ دونوں لاؤنج میں آ گئے۔

نوازش نے قہوہ پیش کیا تو قہوہ پی کر سب ہی اُٹھ گئے۔

''مصطفیٰ.....!'' عبدالرحمٰن شاہ نے اُنہیں آواز دی تو وہ لاؤنج سے نکلتے نکلتے رک گئے۔ جبکہ مرتضیٰ شاہ اور عثمان شاہ باہر نکل گئے۔

''جی بابا جان!'' وہ ان کے قریب آئے۔

''شانی کیسا ہے؟''

''الحمد للہ۔ ٹھیک ہے بابا جان! آج وہ چیک اپ کے لئے بھی گیا تھا ڈاکٹر کی طرف۔ کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔ آج دوپہر آنکھ لگی تو خواب میں اسے بیمار دیکھا۔ تب سے دل پریشان ہے۔''

''دوپہر میں آپ یاد کر رہے تھے نا اسے۔ اس لئے خواب میں دیکھا۔'' مصطفیٰ شاہ مسکرائے۔

''وہ اتنا ظالم تو نہیں تھا مصطفیٰ! پھر ایسا کیوں ہو گیا ہے؟''

مصطفیٰ شاہ کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے بابا جان! اب میں چلتا ہوں۔ بہت تھکن ہو رہی ہے۔''

انہوں نے مڑ کر ہمدان کی طرف دیکھا۔

''ہمدان بیٹا! ذرا مجھے کمرے تک تو چھوڑ آؤ۔''

ہمدان، عبدالرحمٰن شاہ کے ساتھ لاؤنج سے نکل گیا تھا۔ اب وہاں صرف فلک شاہ اور ایبک تھے۔ ایبک نے بغور فلک شاہ کو دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہیں بابا؟'' ایبک نے پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''کچھ نہیں۔ تم آج ادھر ہی رک رہے ہو نا؟''

''جی بابا! رات ہمدان کے کمرے میں ہی سوؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ ابھی ادھر ہی ہے ''الریان'' میں۔ تم جاؤ تو خود چھوڑ کر ادھر جانا۔ میں نے اس سے کہا تھا، اکیلے مت آئے۔ اتنا بڑا لان ہے ''الریان'' کا۔ پتہ نہیں کیوں وہم ستاتے ہیں۔ عجیب سا خوف دل کے اندر بیٹھ گیا ہے۔ اگلے اتوار کو بارات ہے نا۔ ولیمہ کے دوسرے دن کے لئے سیٹیں بک کروا لینا۔''

''جی بابا!'' ایبک نے ان کا ہاتھ تھپتھپایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ان کی وہیل چیئر کی پشت پر آ کر تھوڑا سا ان کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''پتہ ہے بابا! آج جب میں آپ کو بتا رہا تھا، رابیل مجھے پسند نہیں کرتی تو اس نے سن لیا تھا۔ اور....''

''کیا؟'' فلک شاہ نے تیزی سے رخ اس کی طرف موڑا۔ ''کیا تمہیں رابیل نے بتایا؟......کب؟''

اور ایبک سے ساری تفصیل سن کر فلک شاہ از حد پریشان ہو گئے تھے۔

'کیا مائرہ اب رابیل کے ذریعے کوئی گیم کھیلنا چاہتی ہے؟......کیا وہ ایبک؟......' اُنہیں اس کی دھمکی یاد آئی۔

'نہیں۔' انہوں نے سر جھٹکا۔ 'وہ اپنی بیٹی کو کم از کم اس گیم کا حصہ نہیں بنا سکتی۔'
انہوں نے خود کو یقین دلایا۔ لیکن وہ بے حد مضطرب سے ہو گئے۔
''آبی! تم ادھر ہی سو جاؤ بیٹا۔''
''بابا جان! میں نے ہمدان سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن......'' اس نے ان کے اضطراب اور بے چینی کو دیکھا۔ ''میں ادھر ہی رک جاتا ہوں۔ مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ہمدان کو بتا دیتا ہوں۔''
ان کے اضطراب میں ذرا سی کمی ہوئی تھی۔
''ٹھیک ہے۔ تم جا کر انجی کو لے آؤ۔''
وہ لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ ملک ہاؤس کے لان سے گزر کر وہ دروازہ کھول کر ''الریان'' کے لان میں آیا تھا۔ لان میں روشنی تھی۔ سامنے برآمدے میں اور پورچ میں لائٹیں جل رہی تھیں اور اس روشنی میں اس نے دیکھا، لان میں کوئی ٹہل رہا تھا۔
'اس وقت؟......اتنی رات گئے؟'
وہ چونکا اور چند قدم چلنے کے بعد اس نے پہچان لیا۔ وہ رابیل تھی۔
''رابیل! آپ اس وقت یہاں؟''
رابیل نے اس کی طرف دیکھا۔ ایبک کو لگا، اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں نمی تھی۔
''کیا ہوا رابی؟'' وہ ایک دم گھبرا گیا۔ ''احسان انکل تو ٹھیک ہیں نا؟''
اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔
''میں......میرا دل ایک دم گھبرانے لگا تھا اندر تو میں تازہ ہوا کے لئے باہر آ گئی۔''
''اوہ!'' ایبک نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''لیکن اس وقت یہاں ٹہلنا مناسب نہیں ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے بھی۔ آپ ٹیرس پر چلی جائیں۔''
وہ مسکرایا تو رابیل کی نظریں ایک لمحہ کو اس کے چہرے پر ٹھہر گئی تھیں۔
''آپ چلیں۔ میں آتی ہوں۔''
''اوکے۔'' وہ لان سے نکل کر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ رابیل وہیں کھڑی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ آنسو اندر کہیں حلق کو نمکین کرتے جا رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ سب کھانے کے بعد حفصہ کے کمرے میں اکٹھے ہوئے تھے۔ منیبہ کے ہونے والے سسرال اور منگیتر پر تبصرے کئے جا رہے تھے۔
''مونی! تمہارا منگیتر تصویر میں کچھ موٹا لگ رہا ہے۔'' حفصہ نے تبصرہ کیا۔
''ابھی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی۔'' منیبہ نے برا مانا تھا۔
''ہو جائے گی۔'' حفصہ نے لاپروائی سے کہا۔
''بس! تم ایسا کرنا، اسے منگنی سے پہلے کوئی جم جوائن کرنے کا مشورہ دے دو۔ پھر جوڑی پرفیکٹ ہو گی۔''
''اور مرینہ اور زبیر کی جوڑی تو ٹھیک ہے۔ بس ذرا زبیر کو چاہئے کہ ایک عینکوں کی دکان کھول لے۔ کیونکہ جس تیزی سے مرینہ کی عینکیں ٹوٹتی ہیں، اس حساب سے ذاتی دکان کا ہونا ضروری ہے۔'' یہ منیبہ تھی۔
مرینہ نے کچھ اس انداز میں منیبہ کو دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو۔ ''بروٹس تم بھی۔''
مرینہ اور سمیرا کو وہ زبردستی کھینچ لائی تھیں۔ انجی ہنس رہی تھی۔ یہ نوک جھوک اسے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ ان سارے رشتوں سے کتنا عرصہ محروم رہی تھی۔ ابھی بھی وہ ان سب سے اتنی بے تکلف نہیں ہو سکی تھی، جتنی وہ سب تھیں۔
''اور کیا آبی بھائی کی جوڑی بھی پرفیکٹ ہے انجی آپا؟......آپ نے ان کو دیکھا ہے؟'' عاشی نے انجی کے بازو پر

ہاتھ رکھا۔

''کن کو؟'' انجی چونکی۔

''وہی جن سے ایک بھائی کی شادی ہوگی اور جن کے لئے آپی بھائی نے گفٹ لیا ہے۔ پنک اور فیروزی ڈریس۔ میں نے دیکھا تھا آپ کے بیڈ پر پڑا۔''

''ہاں۔'' بے دھیانی میں انجی کے لبوں سے نکلا تھا۔ اور وہ کچھ حیران سی عاشی کو دیکھنے لگی۔

''سچ؟......کیسی ہیں وہ؟'' عاشی اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ باقی سب لڑکیاں بھی انجی کو دیکھ رہی تھیں اور رابیل کے اندر دل میں کسی گہرے زیاں نے چٹکی بھری تھی۔

''کون ہے؟ کیا کرتی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟'' مرینہ اور منیبہ ایک ساتھ بولی تھیں۔

''نہیں تو......میرا مطلب ہے، میں نے نہیں دیکھا۔'' انجی سٹپٹا گئی۔ ''ایک بھائی کا ارادہ فی الحال دو سال تک شادی کرنے کا نہیں ہے۔''

''جھوٹ۔'' عاشی دل میں آئی بات فوراً کہہ دیتی تھی۔ ''آپ کو پتہ ہے، وہ کون ہے۔ لیکن آپ بتانا نہیں چاہتیں۔'' عاشی خطرناک حد تک ذہین تھی۔

''ارے نہیں۔ بھلا کیوں بتانا نہیں چاہوں گی؟'' انجی نے اس کے گال پر چٹکی لی۔

''پتہ نہیں۔'' عاشی نے کندھے اچکائے اور رابیل ایک دم ہی اٹھ کر باہر چلی آئی تھی۔ کوئی احساسِ زیاں تھا، جو دل میں چٹکی بھرتا تھا اور آنسو تھے جو اندر گرتے تھے۔

'کیوں بھلا، کس لئے؟' اس نے لان میں بچھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے گہرے گہرے سانس لئے۔

دل بے حد گھبرا رہا تھا اور رونے کو چاہ رہا تھا۔

'کیا میں ایک سے؟'

'نہیں.....' اس نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کی تھی۔ لیکن دل نے چپکے سے اعتراف کیا تھا۔

'ہاں رابیل احسان شاہ! تم ایک فلک شاہ سے محبت کرنے لگی ہو۔ وہی ایک فلک شاہ، جس کا تم مذاق اُڑاتی تھیں۔ جب منیبہ شاہ اس کی وکالت کرتی تھی اور عمر احسان شاہ عقیدت میں ڈوبا اس کی تعریف کرتا تھا۔'

کب ایسا ہوا تھا کہ ایک فلک شاہ نے اس کے دل میں جگہ بنالی تھی اور وہ اندازہ نہیں کر پا رہی تھی۔ لیکن بہت سارے دنوں سے وہ اسے سوچنے لگی تھی۔

'اور اس کا انجام کیا ہوگا، رابیل احسان شاہ!......کیا کبھی وہ جان پائے گا کہ میں رابیل احسان شاہ اس کی محبت میں مبتلا ہوگئی ہوں؟......اور اگر جان بھی لیا تو کیا.....شاید وہ کسی کو پسند کر چکا ہے۔ وہ یا پھپھو اور انجی.......اور عاشی کہہ رہی تھی، انجی ابھی بتانا نہیں چاہ رہی۔'

وہ جو کوئی بھی تھی، کم از کم الریان سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور ''الریان'' میں تھا ہی کون اب سوائے اس کے۔

آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے نکل پڑے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی کرسی پر بیٹھی روتی رہی اور پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ جب ایک نے اسے اس وقت لان میں ٹہلتے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا تو دل مچل اٹھا تھا۔

'کہہ دو رابیل احسان شاہ! وہ سب جو تمہارے دل میں ہے۔ بتا دو اسے کہ کس طرح اس کی محبت نے تمہارے دل پر شب خون مارا ہے۔'

لیکن وہ رابیل احسان شاہ تھی۔ مائرہ حسین نہیں۔ وہ ایک سے کچھ نہیں کہہ سکی اور ایک اندر چلا گیا۔

اس نے ہاتھوں کی پشت سے بھیگی پلکیں صاف کیں اور برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر لاؤنج میں آئی۔ حفصہ کے کمرے سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن وہ حفصہ کے کمرے کی طرف جانے کے بجائے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی اور

ﻻ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ٹیرس کا دروازہ کھول کر ٹیرس پر آ گئی۔ اب ٹیرس پر پڑی پلاسٹک کی چیئر پر بیٹھی رات کے تقریباً ایک بجے وہ ایبک کے متعلق سوچ رہی تھی۔

❁○❁

اریب فاطمہ آنکھیں موندے اماں کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی اور وہ اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی تھیں۔ ﻻ ایک اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اماں! اسفند بھائی سے کہیں، مجھے کل صبح لاہور چھوڑ آئیں۔''

''دو تین دن اور رک جاتیں اریب! کالج تو تم نے بتایا تھا سنڈے سے شروع ہوگا۔''

''جی اماں! لیکن مجھے حفصہ کی شادی میں بھی تو شرکت کرنا ہے۔ وہ سب بہت ناراض ہوں گے، اگر میں شادی میں ﻻ گئی تو۔ حفصہ تو مجھ سے بات ہی نہیں کرے گی۔''

''اچھا! میں اسفند سے کہوں گی، وہ تمہیں صبح چھوڑ آئے گا۔''

''اور اگر وہ نہ چھوڑنے گئے تو؟'' اس نے پریشانی سے انہیں دیکھا۔

''اچھا تھا نا، میں پرسوں چلی جاتی صبا کے ساتھ۔ آپ نے منع کر دیا۔''

''پتہ نہیں کیوں، جی ہی نہیں بھرا تھا تجھے دیکھ کر۔'' ان کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''اماں! جی تو میرا بھی نہیں بھرا تھا اور میں کب جانا چاہتی تھی وہاں اتنی دُور۔ آپ نے خود ہی تو مجھے خود سے دور کیا تھا۔'' وہ شکوہ کر بیٹھی۔

''تمہاری تعلیم میں، میں اپنے سپنے دیکھتی ہوں اریب!'' انہوں نے اس کی پیشانی پر بکھر آنے والے بالوں کو محبت سے سمیٹ کر پیچھے کیا۔

''اچھا یہ بتا، وہاں سب تیرے ساتھ اچھے تو ہیں نا؟'' کئی بار کی پوچھی ہوئی بات کو وہ پھر پوچھ رہی تھیں۔

''ہاں اماں! سب اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ پیار کرتے ہیں۔ بس مائرہ آنٹی ذرا اُلٹا سیدھا بول جاتی ہیں کبھی کبھی۔''

''کیا...... مائرہ کیا کہتی ہے؟'' انہوں نے تڑپ کر پوچھا۔

''اماں!'' اریب فاطمہ نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔ ''مائرہ آنٹی آپ کے متعلق بات کرتی ہیں۔''

اماں کا رنگ ایک دم زرد ہوا تھا۔ ''کیا...... کیا بات؟'' ان کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔

''اماں......!'' اریب فاطمہ نے وہ سب کچھ کہہ دیا، جو جب سے وہ آئی تھی، کہنا چاہ رہی تھی۔ لیکن حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔

''اماں! مائرہ آنٹی ایسا کیوں کہتی ہیں؟ کیا دشمنی ہے ان کو آپ سے؟''

اماں ساکت سی بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ ابھی تک اریب فاطمہ کے ہاتھ میں تھے۔

''آپ پریشان ہوگئی ہیں اماں! چلیں کچھ نہ بتائیں۔ مجھے کچھ جاننا بھی نہیں ہے۔ لیکن آپ اس طرح پریشان نہ ہوں۔ مجھے لگتا ہے، مائرہ آنٹی کو مروہ مامی سے چڑ ہے تو میں چونکہ مروہ آنٹی کے حوالے سے ''الریان'' میں گئی ہوں نا، تو اس لئے وہ ایسا کہتی ہیں۔''

''نہیں۔ یہ بات نہیں ہے اریب!'' انہوں نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑائے۔ ''مجھے یہ بات تمہیں بہت پہلے بتا دینا چاہئے تھی۔ میں نے سوچا بھی تھا، جب تم لاہور جا رہی تھیں۔ لیکن مجھے موقع ہی نہیں ملا۔''

''کیا بات اماں؟'' اریب فاطمہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''تم جانتی ہو اریب! میں تمہیں ہمیشہ کہتی تھی، تمہیں بہت سارا پڑھنا ہے۔ ڈاکٹر بننا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟...... اس لئے کہ میرے ابا مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور میں ڈاکٹر نہیں بن سکی۔ لیکن جب تم پیدا ہوئیں تو میں نے سوچا، میں تمہیں

ڈاکٹر بناؤں گی۔ حالانکہ مجھے پتہ تھا، یہ بہت مشکل ہے۔ میں تو چاہتی تھی، عظمت اور اسفند بھی پڑھیں۔ لیکن......"

"سوری اماں!" اریب فاطمہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "میں ڈاکٹر نہیں بن سکی۔ میں کبھی بھی ڈاکٹر نہیں بننا چاہتی تھی۔ مجھے دوائیوں کی بُو اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں تو چاہتی تھی، بس جلدی جلدی تعلیم مکمل کر کے آپ کے پاس آ جاؤں۔"

"جانتی ہوں۔" انہوں نے اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔

"لیکن اماں! آپ تو ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں۔ پھر آپ کیوں نہیں ڈاکٹر بن سکیں؟"

"ہاں! میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ اور یہ میرے ابا کی بھی خواہش تھی۔ وہ گورنمنٹ آفیسر تھے گریڈ سترہ کے۔ اور لاہور میں رہتے تھے۔ لیکن ہم کبھی کبھار کسی غمی، خوشی میں رحیم یار خان آتے تھے۔ رحیم یار خان میں میرے ددھیال، ننھیال دونوں تھے۔ میرے دادا، دادی، تایا، پھوپھیاں، سب رحیم یار خان میں ہی رہتے تھے مدتوں سے۔ ابا کی دو بہنیں اور ایک بڑا بھائی تھا۔ اماں اکلوتی تھیں۔ نانا جان کا انتقال ہو چکا تھا۔ نانی بھی رحیم یار خان میں ہی رہتی تھیں۔ میں نے ایف۔ ایس۔ سی، کنیئرڈ کالج سے کیا تھا اور ٹاپ کیا تھا۔ مجھے بہت آسانی سے کے۔ای میں ایڈمیشن مل گیا تھا۔ میرے ایڈمیشن کی خوشی میں ابا نے بہت بڑی دعوت کی تھی۔ رحیم یار خان سے سب ہی آئے تھے اور پہلی بار مجھے پتہ لگا تھا کہ تایا جان اور پھوپھیاں خوش نہیں ہیں۔ تایا جان نے ابا سے میری پڑھائی کے متعلق بحث بھی کی تھی۔ لیکن ابا نے کہا۔

"مجھے اپنی بیٹی پر اعتبار ہے اور میں اسے ضرور ڈاکٹر بناؤں گا۔"

لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا اریب! کہ آدمی کے سارے ارادے دھرے رہ جاتے ہیں اور سارے خواب آنکھوں میں ہی مر جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے صرف چھ دن بعد ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک بار پھر وہ سب ہمارے گھر اکٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب چاہتے تھے کہ اماں اور میں ان کے ساتھ رحیم یار خان چل کر رہیں اور یہ گھر فروخت کر دیں۔ ہمارا گھر بہت زیادہ بڑا نہیں تھا، لیکن اپنا تھا۔ اماں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تایا نے سمجھایا۔

"اکیلی عورت کا جوان بچی کے ساتھ تنہا رہنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔" لیکن اماں، ابا کی خواہش پوری کرنا چاہتی تھیں۔

"پاس پڑوس میں سب اچھے لوگ ہیں۔ خیال رکھیں گے۔ مجھے یہیں رہنا ہے۔"

یہ اماں کا فیصلہ تھا۔ نانی ہمارے پاس ہی رہ گئی تھیں۔ باقی سب مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں ہر وقت ابا کو یاد کر کے روتی رہتی تھی۔ اماں نے مجھے حوصلہ دیا، سمجھایا کہ مجھے پڑھنا ہے اور ابا کی خواہش پوری کرنی ہے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور سب کچھ بھلا کر پڑھائی میں جت گئی۔

وہ ہولے ہولے ماضی کے اوراق پلٹ رہی تھیں۔

"مجھے نہیں پتہ چلا، وہ کب میرے پیچھے پڑا۔ کب اس نے مجھے دیکھا۔ میں تو اپنے دھیان میں مگن رہتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے روک لیا۔ اُس روز میں اپنے سٹاپ پر اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھے بغیر گھر کی طرف جا رہی تھی۔ گلی سنسان تھی اور وہ میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ مجھے اس سے بالکل خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بہت مہذب لگ رہا تھا۔

"مس! ایک منٹ کے لئے میری بات سن لیں پلیز۔"

"کیا بات ہے؟ میرا راستہ چھوڑ دیں۔"

وہ ایک طرف ہوا تھا اور تیز تیز بول رہا تھا۔

"میں بہت دنوں سے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ پہلے آپ مجھے اچھی لگیں۔ پھر مجھے لگا، جیسے مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔"

میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر سائیڈ سے نکل کر اپنی گلی میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد وہ میرے پیچھے ہی پڑ گیا۔ کوئی امیر زادہ تھا، کسی بڑے زمین دار کا بیٹا۔ میں نے کبھی اس سے بات نہیں کی۔ کبھی اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

مجھے پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس نے کب کب اور کہاں کہاں میرا پیچھا کیا۔ کبھی کبھی مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن میں نے توجہ نہیں دی۔ نہ ہی اس نے پھر کبھی بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس روز وہ پھر گھر کے دروازے تک آ گیا۔ ایک روز کے بعد ابا کی برسی تھی اور رحیم یار خان سے سب آئے ہوئے تھے۔ اور جب صبح میں کالج جا رہی تھی تو سب نے ہی ایک بار پھر میری پڑھائی پر اعتراض کیا تھا۔ اماں اور نانی خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی تھیں اور پھر آخر میں اماں نے حتمی بات کی تھی۔

''ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ پڑھے گی اور ڈاکٹر بنے گی۔ میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا۔ آج اس کا پیپر ہے۔ کل چھٹی کر لے گی۔''

تب اماں نہیں جانتی تھیں کہ کل کے بعد ہمیشہ کے لئے میری چھٹی ہو جائے گی۔ اس نے گھر کے بالکل سامنے مجھے روک لیا تھا۔

''سنیں مس!''

میں مڑ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''میں اپنے والدین کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو کل ہی......''

''نہیں۔'' میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ وہ بہت زبردست پرسنالٹی کا مالک تھا۔ ''مجھے ابھی پڑھنا ہے۔ میرے ابا کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ ہاں! چار سال بعد آپ اپنے والدین کو بھیج سکتے ہیں۔ لیکن فیصلہ میری امی کریں گی۔ اور اگر آپ ان کے معیار پر پورا نہ اُترے تو آئی ایم سوری۔''

وہ ایک دم ہی ہنس پڑا۔

''یعنی میں چار سال بغیر کسی اُمید کے گزار دوں؟ ...... بہرحال مجھے یقین ہے کہ آپ کی والدہ کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہوگا اور میں اس یقین کے سہارے یہ وقت کاٹ لوں گا۔''

وہ بہت پُراعتماد تھا۔ مجھے اس کے اعتماد پر حیرت ہوئی تھی۔ لیکن شاید اسے اپنی ذات پر اعتماد تھا۔ ضرور اس میں ایسی خوبیاں ہوں گی کہ اسے ردّ نہیں کیا جا سکتا ہوگا۔ ظاہری خوبیاں تو نظر آتی تھیں، لیکن شاید باطنی خوبیاں بھی ہوں گی۔ تب ہی تو۔

''لیکن آپ بھی وعدہ کریں کہ آپ چار سال سے پہلے کسی اور سے شادی نہیں کریں گی۔ ہاں! اگر آپ کی والدہ نے ریجیکٹ کر دیا تو آپ کو اختیار ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن آپ بھی میرا پیچھا نہیں کریں گے۔ جیسے ایک سال سے کر رہے ہیں۔''

''پرامس!'' چار سال تک میں آپ کو دکھائی بھی نہیں دوں گا۔'' وہ واپس مڑ گیا۔

میں نے وہاں اپنے گھر کے سامنے گلی میں کھڑے ہو کر اس سے باتیں کی تھیں۔ میں نے اس بات کی پروا تک نہیں کی تھی کہ کوئی، مجھے ایک اجنبی سے بات کرتا دیکھ کر کیا سوچے گا۔ میرے من میں کھوٹ نہیں تھا۔ لیکن، دوسروں کے من میں تو کھوٹ ہو سکتا ہے نا۔ ہر بندہ اپنی نظر سے دوسروں کو دیکھتا ہے اور اسے ایسا ہی دیکھتا ہے، جیسا وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ میں بہت مطمئن سی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا، وہ شخص جیسا کہہ رہا ہے، ویسا ہی کرے گا اور وہ مجھے اب چار سال تک نظر نہیں آئے گا۔ غیر ارادی طور پر میں نے گھر میں قدم رکھنے کے بعد پیچھے مڑ کر کھلے دروازے سے باہر دیکھا تھا۔ تایا گلی میں دروازے کے عین سامنے کھڑے تھے۔ مجھے گمان تک نہیں تھا کہ انہوں نے مجھے اس سے بات کرتے دیکھا ہوگا۔ لیکن میرا گمان غلط تھا۔ میرے اندر آتے ہی وہ زور سے دروازے کو پاؤں کی ٹھوکر سے کھولتے ہوئے اندر آئے تھے اور اندر آتے ہی انہوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

''کون تھا وہ، جس کے ساتھ گلی میں کھڑی ہو کر باتیں کر رہی تھیں؟''

''میں نہیں جانتی، کون تھا۔''

''بکواس کرتی ہے۔'' تایا کا تھپڑ میرے رخسار پر پڑا۔

اماں کچن سے باہر آئیں اور گھبرا کر پوچھنے لگیں۔

''کیا ہوا؟......کیا ہوا؟''

کسی نے میری بات نہیں سنی تھی۔ کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ اماں اور نانی نے بھی نہیں۔

اماں کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا اور میں بھی تو ہوش میں نہیں تھی۔

اور ابا کی برسی سے اگلے دن میرا نکاح تمہارے ابا سے کر دیا گیا۔ وہ تایا کے سسرالی عزیز تھے۔ پتہ نہیں، وہ وہیں تھے یا انہیں بلوایا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن مجھے اتنا پتہ ہے کہ ایک سال پہلے ابا کی زندگی میں تائی نے ان کا رشتہ ڈالا تھا۔ لیکن ابا نے انکار کر دیا تھا۔

اماں بالکل چپ ہو گئی تھیں اور سارے اختیار تایا نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ انہوں نے گھر فروخت کر دیا اور ہم سب کو لے کر رحیم یار خان آ گئے۔ چند ماہ بعد مجھے رخصت کر دیا گیا۔ اس سارے عرصہ میں نہ تو انہوں نے مجھ سے بات کی، نہ میں نے۔ تائی اور پھوپھیوں نے ہی سب تیاری کی۔ چار سالوں میں اماں صرف دو بار چک 151 آئیں۔ ایک بار اسفند کی پیدائش پر۔ ایک بار میری بیماری پر۔

عجیب سرپھرا شخص تھا۔ وعدے کے مطابق چار سال تک نہ تو وہ میرے کالج تک آیا، نہ میری گلی میں......اور چار سال بعد جب وہ اپنے والدین کے ساتھ میرے گھر گیا تو اسے پتہ چلا کہ ہم تو چار سال پہلے ہی گھر چھوڑ کر رحیم یار خان جا چکے ہیں۔

پڑوسیوں سے پتہ لے کر وہ اماں کے پاس آیا تھا۔ اس کے والدین اس کے ساتھ تھے۔ اماں سے ساری بات سن کر اس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر میری شرافت کی گواہی دی تھی کہ میری حیا اور پاکیزگی نے ہی تو اسے متاثر کیا تھا۔ اس نے اماں سے کہا۔ وہ اس بات کے لئے ساری زندگی شرمندہ رہے گا اور خود کو معاف نہیں کر سکے گا کہ اس کی وجہ سے ابا کا خواب تعبیر نہیں پا سکا۔ تب اماں چار سال بعد میرے پاس آئی تھیں اور مجھے گلے لگا کر دھاڑیں مار مار کر روئی تھیں اور مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی ایک اعلیٰ سیّد خاندان کا تھا اور اس کے والدین بڑے اعلیٰ ظرف اور شفیق تھے۔ وہ اس قصور کی معافی مانگ رہے تھے، جو انہوں نے کیا ہی نہیں تھا۔

تایا بھی شرمندہ تھے۔ لیکن اب کیا فائدہ تھا۔ میرا خواب تو مٹی میں مل گیا تھا نا۔

اماں نے گاؤں واپس جا کر دادا جان کا گھر چھوڑ دیا تھا اور نانی کے پاس چلی گئی تھیں۔

''اماں!'' اریب فاطمہ ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ ''جب سب ظاہر ہو گیا تھا تو پھر..... پھر مائرہ آنٹی ایسا کیوں کہتی ہیں؟.....اُنہیں نہیں کہنا چاہئے یہ سب۔ وہ جانتی تو ہوں گی نا سب۔ ان کو اگر یہ بتایا گیا تھا تو پھر وہ بھی بتایا گیا ہوگا۔''

''ہاں! مائرہ کی امی، اماں کی کزن ہیں اور سب جانتی ہیں وہ۔''

انہوں نے اسے تھپکا اور پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''لڑکیوں کو بہت محتاط ہو کر بہت پھونک پھونک کر زندگی گزارنا چاہئے۔''

''جی اماں! میں بہت محتاط رہتی ہوں۔''

''مائرہ کو اس کا موقع مت دو کہ وہ پھر کوئی بات کرے۔''

اریب نے سر ہلایا تھا اور ہاتھوں کی پشت سے اپنے گیلے رخسار پونچھے تھے۔

اس نے سوچا، وہ اماں کو ایبک کے متعلق بتائے۔ ایبک بھی تو اس شخص کی طرح اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ والدین کو اس کے گھر بھیجنا چاہتا تھا اور اس نے بھی اماں کی طرح اسے انتظار کرنے کو کہا تھا۔ کہیں اماں کی طرح اس کا انتظار بھی

لا حاصل نہ رہ جائے۔ اس نے جھرجھری سی لی۔
'نہیں...... اماں کو تو شاید اس سے محبت نہیں تھی۔ لیکن وہ تو اس سے محبت کرتی تھی۔'
اس کا دل خوش گوار انداز میں دھڑکا۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا۔
''کیا نام تھا اُن کا؟''
''پتہ نہیں...... نہ میں نے پوچھا، نہ اس نے بتایا۔ اماں نے بھی پھر کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ کون تھا، کہاں کا رہنے والا تھا۔ بس اتنا بتایا تھا کہ تایا اس کے خاندان کو تھوڑا بہت جانتے تھے۔''
''اماں! کیا آپ کو کبھی وہ یاد آئے؟''
پتہ نہیں، کس خیال کے تحت اس نے پوچھا۔ لیکن اماں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ بس ایک نظر اس پر ڈال کر نگاہیں جھکائی تھیں۔ تب ہی شہریار اندر آیا۔
''اماں!...... اماں! وہ آئے ہیں۔'' وہ کچھ بوکھلایا ہوا تھا۔
''کیا ہوا شیری؟'' وہ گھبرا گئیں۔
''اماں! اسفند بھائی کے ساتھ وہ آئے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز۔ بیٹھک میں بٹھایا ہے بھائی نے انہیں اور کہہ رہے ہیں کہ چائے بھیج دیں۔ اور آپ کو بھی بلایا ہے۔''
''مجھے کس لئے؟'' وہ حیران ہوئیں۔
''آپ سے ہی تو ملنے آئے ہیں وہ۔ اور ساتھ اتنا کچھ سامان لائے ہیں۔ پتہ نہیں کیا کیا۔''
شہریار بتا کر باہر بھاگ گیا تو اماں نے اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔
''تیرے بھائی اور ابا بہت تعریف کرتے ہیں شیخ صاحب کی۔''
''ہاں۔ زینب آپا بھی بہت تعریف کر رہی تھیں۔ بتا رہی تھیں کہ وہ یہاں کی عورتوں کے لئے بہت کچھ کر رہے ہیں۔''
اریب فاطمہ نے بھی تائید کی۔
اماں اُٹھ کر باہر چلی گئیں تو اریب فاطمہ، ایبک کے متعلق سوچنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اماں کو ایبک کے متعلق بتائے یا نہ بتائے۔
''اگلی بار سہی۔ پھر جب آؤں گی تو اماں کو ضرور بتا دوں گی۔''
وہ فیصلہ کر کے مطمئن ہوگئی تو اٹھ کر بیگ میں اپنا سامان رکھنے لگی۔
کتابیں اور کپڑے بیگ میں رکھ کر اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور چیک کیا۔ چیک کرتے ہوئے ایبک کا کارڈ نظر آیا تو اس کا جی چاہا وہ آج پھر ایبک سے بات کرے۔ اس روز کے بعد اس نے ایبک سے بات نہیں کی تھی۔
'چلو! شام کو زینب آپا سے ملنے جاؤں گی تو بات کرلوں گی۔' اس نے ہینڈ بیگ کی زِپ بند کی اور چارپائی پر پڑی شہریار کی پریکٹیکل کی کاپیاں دیکھنے لگی۔ اس کی ڈرائنگ اچھی تھی اور شہریار نے اسے ڈایاگرام بنانے کے لئے کہا تھا۔
شہریار پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور اماں کا خواب پورا کرے گا۔
اس نے بیالوجی کی کاپی کھولی۔ کل اسے چلے جانا تھا تو اسے آج ہی یہ کاپیاں مکمل کر دینی چاہئیں۔
وہ بے حد مصروف تھی، جب اماں اسفندیار کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی اندر آئی تھیں۔
''یہ سب بہت زیادہ ہے اسفندیار! تمہیں منع کرنا چاہئے تھا۔'' وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔
''مجھے کیا پتہ تھا اماں! وہ اتنا کچھ لے کر آ رہے ہیں۔'' اسفندیار دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔
اریب نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
''دو ٹوکرے فروٹ کے، مٹھائی کا یہ بڑا ڈبہ۔ اور سب کے لئے تحفے۔ سچ میں میرا تو دل گھبرا گیا اتنا کچھ دیکھ کر۔''

انہوں نے تفصیل بتائی تو اسفند یار مسکرایا۔ ''اماں! وہ تو ایسے ہی ہیں۔ بڑے دل والے ہیں۔ دیکھا نہیں، انہوں نے بھائی کو گاڑی دی۔ اتنا بڑا دل ہے ان کا۔''

''لیکن عظمت تو کہہ رہا تھا، کام کے لئے دی ہے۔'' اماں حیران ہوئیں۔

''ہاں۔'' اسفند سٹپٹایا۔ ''دی تو کام کے لئے ہی ہے، لیکن دی تو ہے نا۔ ہر وقت بھائی کے پاس ہی رہتی ہے۔''

''لیکن اس طرح تو ہم زیر بار ہو جائیں گے۔ ایسا کرو، ان کے گفٹ تو واپس کر دو۔''

''ارے! ایسے کیسے واپس کر دوں اماں! وہ ناراض ہو جائیں گے۔ یہ عرب شیخ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اللہ جانے کیا لائے ہیں۔ میں لے کے آتا ہوں۔''

اسفند وہاں سے واپس مڑ گیا۔ اماں اُلجھی اُلجھی نظروں سے خالی دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔

''پتہ نہیں کیوں، میرا دل پریشان ہو گیا ہے اریب! بلاوجہ ہی اتنا التفات اور محبت۔''

''اماں! پریشان نہ ہوں۔ اسفند صحیح کہتا ہے۔ اس طرح اب گفٹ واپس کرنے پر وہ برا مان جائیں گے۔ آپ ایسا کریں ایک دو روز تک اسفند کے ساتھ ان کی فیملی سے ملنے چلی جائیں اور اتنی ہی قیمت کے گفٹ لے جائیں۔ اور رہی گاڑی کی بات تو جب بھائی کا کام ختم ہو گا تو گاڑی تو واپس دینی ہی ہو گی۔ ویسے وہ کام کیا کرتے ہیں؟''

''پتہ نہیں۔'' اماں کو صرف اتنا پتہ تھا کہ اسفند اور عظمت، شیخ عبدالعزیز کے لئے کام کرنے لگے ہیں جس کی انہیں تنخواہ ملے گی اور زمینوں کی دیکھ بھال کے کام میں بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

تب ہی اسفند، تحفوں کے شاپرز اٹھائے آ گیا اور دوسری چارپائی پر بیٹھ کر کھولنے لگا۔ اماں کے لئے قیمتی چکن کا سوٹ، ابا کے لئے گھڑی۔ غرض سب کے لئے کچھ نہ کچھ تھا۔

اماں پُرسوچ نظروں سے اسفند کو شاپرز میں سے پیکٹ نکالتے اور کھولتے دیکھ رہی تھیں۔

''اسفند بیٹا! کل صبح اریب کو لاہور چھوڑ آنا۔''

''لیکن کل تو شیخ صاحب نے دعوت پہ بلایا ہے ہم سب کو۔''

''کیسی دعوت؟'' اماں نے حیرت سے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔ لیکن انہوں نے ہم سب کو بلایا ہے۔ بہت تاکید کی ہے کہ سب آئیں۔ اریب بھی۔''

''اریب کو تو کل ہر صورت لاہور جانا ہے۔''

''اماں! آپ بھی خوامخواہ اس کی پڑھائی کے پیچھے پڑی ہیں۔ کیا کرنا ہے اس نے پڑھ کر؟ آخر تو شادی کے بعد ہانڈی روٹی ہی تو کرنا ہے نا اسے۔''

''تم سے میں نے مشورہ نہیں مانگا، اسفند یار! تمہیں دعوت میں جانا ہے، جاؤ۔ عظمت یا تمہارے ابا سے کہتی ہوں، وہ چھوڑ آئیں گے اسے۔''

اماں اس کی پڑھائی کے معاملے میں ہمیشہ بہادر بن جاتی تھیں۔

''اماں......!'' اسفند نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ''اماں! آپ پتہ نہیں کیوں ہمیشہ اس کی پڑھائی کو مسئلہ بنا لیتی ہیں۔ آپ کو اس کی شادی کرنا ہے آخر......شادی سے پہلے یہ اگر یہاں آ جائے اور وہاں سینٹر میں نگرانی کا کام کر لے تو اس میں کیا حرج ہے؟ بیس پچیس ہزار سے کم تنخواہ تو نہیں دیں گے شیخ صاحب۔''

''تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم بیٹی کی کمائی کھائیں؟''

''میں یہ کب کہہ رہا ہوں اماں! اس کے اپنے پیسے ہوں گے۔ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرواتی رہے گی۔ ہم ایک دھیلا بھی نہیں لیں گے اس سے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ، اپنا کام کرو۔'' اماں نے اس کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ چھڑا لئے۔

''عظمت بھائی بھی کہہ رہے تھے کہ بہت پڑھ لیا ہے اریب فاطمہ نے......اب مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
اسفند کھڑا ہو گیا۔
اماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''یہ نہیں جائے گی اب لاہور۔'' اسفند نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا تو اماں نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔
''یہ تحفے اٹھا کر لے جاؤ اسفندیار! لگتا ہے تمہارا شیخ رشوت لے کر آیا تھا کہ بہن کو نوکری دلوا دو اس کے سینٹر میں۔''
''نہیں......نہیں اماں! انہوں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔ یہ تو میں خود کہہ رہا ہوں۔ زینب آپا بھی تو وہاں کام کر رہی ہیں......اور لڑکیاں بھی ہیں۔''
''تو یوں کہہ، تیرے اندر کا لالچ ہے یہ۔''
''اماں! آپ بھی نا بس......لیکن ایک بات سن لیں۔ ابا اور عظمت بھی اس کی مزید پڑھائی کے حق میں نہیں ہیں۔ یہ نہ آتی تو وہ خود جا کر لے آتے۔''
وہ زور سے دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اریب فاطمہ پریشان سی بیٹھی تھی۔ اماں نے اس کی طرف دیکھا۔
''پریشان نہ ہو بیٹی! اپنی تیاری کر لے۔ اور ہاں! تجھے حفصہ کو کچھ گفٹ بھی تو دینا ہوگا۔ کیا دے گی؟''
''وہاں جا کر کچھ لے لوں گی۔ پیسے ہیں میرے اکاؤنٹ میں۔ مروہ مامی نے کافی سارے بھیجے تھے۔ میں نے ایک بار بھی نہیں نکلوائے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں نے تمہارے لئے ایک بیڈ شیٹ سیٹ تیار کیا تھا۔ وہ بھی دے دینا۔''
وہ اٹھیں اور الماری کھول کر پیک شدہ بیڈ شیٹ نکالی۔
''یہ دیکھو! میں نے خود کڑھائی کی تھی۔ تمہارے لئے اور بنا لوں گی۔''
''اماں! یہ بہت خوب صورت ہے۔ لیکن اگر عظمت اور اسفند بھائی نے مجھے جانے نہ دیا تو؟'' اریب فاطمہ کو ان کے اطمینان پر حیرت ہو رہی تھی۔
''تم فکر مت کرو۔ ہاں، یہ بتاؤ تمہارا امتحان کب تک ہے؟''
''چھ سات ماہ تو ہیں ابھی۔''
''ٹھیک ہے۔ تم اب چھ سات ماہ مت آنا۔ اور میرے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑی بہت کمزوری تو عمر کے ساتھ ہو جاتی ہے نا۔ تم بی۔ اے کر لو تو پھر سوچوں گی، کیا کرنا ہے۔ ممکن ہوا تو تمہیں کہیں ہاسٹل میں داخل کروا دوں گی۔ کہیں نزدیک یا پھر پرائیویٹ ایم اے کر لینا کسی آسان مضمون میں۔''
وہ ساتھ ساتھ بیڈ شیٹ کی پیکنگ دوبارہ سے کر رہی تھیں۔
''میں نہیں چاہتی کہ تم ''الریان'' میں زیادہ رہو۔ مائرہ نے تم سے جو کچھ کہا ہے، وہ پھر بھی کہہ سکتی ہے۔ کسی نے سن لیا تو کیا سمجھیں گے۔ یہ سات آٹھ ماہ، جو تمہیں رہنا ہے، بہت محتاط ہو کر رہنا ہے۔''
''جی اماں! لیکن باقی سب تو بہت اچھے ہیں۔ خیال رکھنے والے، محبت کرنے والے۔''
''جانتی ہوں۔ مروہ بھابی کے خاندان کے لوگ یقیناً ایسے ہی ہوں گے۔ مروہ جیسے اعلیٰ ظرف، بڑے دل کے۔ میری طرف سے بہت دعائیں کہنا، حفصہ اور عادل کو۔ میں نے ان بچوں کو دیکھا نہیں، لیکن تمہاری باتوں سے میں نے انہیں جان لیا ہے۔''
انہوں نے پیک شدہ بیڈ شیٹس اُس کی طرف بڑھائیں۔
''یہ اپنے بیگ میں رکھ لو۔''
اریب فاطمہ نے بیڈ شیٹس لے کر بیگ میں رکھ لیں اور اماں باہر چلی گئیں۔ اریب فاطمہ نے بیگ کی زپ بند کی اور

کچھ دیر یوں ہی بیگ کو دیکھتی رہی۔

'اور اگر ابا، اسفندیار، عظمت یار کسی نے نہ جانے دیا تو......؟'

اُس نے زپ پھر کھول دی اور بیڈشیٹس نکال کر انہیں پھر کچھ چیزیں آگے پیچھے کر کے رکھا۔

'تو......تو پھر کیا وہ کبھی ایبک سے نہیں مل سکے گی؟ اور ایبک اس کی زندگی سے ایسے ہی نکل جائے گا، جیسے وہ اجنبی شخص اماں کی زندگی سے نکل گیا تھا؟'

زپ بند کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں لرزش تھی اور دل جیسے نیچے ہی نیچے ڈوبتا جا رہا تھا۔

'نہیں...... اماں اس سے صرف دو بار ملی تھیں، چند لمحوں کے لئے۔ اماں اس سے محبت نہیں کرتی تھیں۔ لیکن میں......میں ایبک سے محبت کرتی ہوں۔ میں......'

اُس کی آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی۔ اس نے ہاتھوں کی پشت سے بھیگی پلکیں صاف کیں اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

اماں باہر صحن میں بنے چولہے پر مٹی کی ہانڈی میں ساگ پکا رہی تھیں۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی ان کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اماں نے لکڑی کی ڈوئی، ہانڈی میں ہلائی اور پھر ہانڈی پر ڈھکن رکھ کر دو لکڑیاں کھینچ کر چولہے سے نکال لیں اور انہیں ایک طرف رکھ کر پانی کا چھینٹا مارا۔ اب ایک لکڑی مدھم مدھم سی جل رہی تھی۔ لکڑی کی مدد سے ہی انہوں نے کچھ جلتے ہوئے انگارے آگے پیچھے کئے اور مڑ کر اسے دیکھا اور اس پر سے ہوتی ہوئی ان کی نظر برآمدے میں پڑے پھلوں کے ٹوکروں پر پڑی۔ برآمدے میں تخت پوش کے پاس دونوں ٹوکرے پڑے تھے اور تخت پوش پر مٹھائی کا ڈبہ تھا۔

'خوامخواہ انہیں دیکھ کر گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'

وہ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھیں اور اسفندیار کو آواز دینے لگیں۔ اسفند نے بیٹھک کے دروازے میں سے جھانک کر اُنہیں دیکھا۔

''کیا ہے اماں؟''

''اُٹھواؤ انہیں اور اسٹور میں رکھوا دو۔ یا جو کرنا ہے، کرو۔''

اریب چپ کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''فکر کیوں کرتی ہے؟......میں ہوں نا۔ جا، اندر جا کے آرام کر۔ پیکنگ کر لی ہے نا؟''

''ہاں!'' اس نے سر ہلایا۔

''ابا ناراض تو نہیں ہوں گے نا؟ وہ بھائیوں کی بات بہت مانتے ہیں۔''

''تو؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میری بھی ماننی ہوگی۔'' وہ ذرا سا مسکرائیں۔

''اماں......!'' اریب نے بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔ اماں نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا اور جانے کتنی دیر کے رُکے آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے اور برآمدے میں ٹوکرا اُٹھاتا اسفندیار اُنہیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

❁○❁

احمد رضا اپنے بیڈروم میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا اُس سی ڈی کو دیکھ رہا تھا، جو رچی نے اسے بھیجی تھی۔ پہلے کسی کوٹھی کا بیرونی منظر تھا۔ آس پاس کافی فاصلے تک کوئی اور عمارت نظر نہیں آ رہی تھی۔ کوٹھی کے سیاہ رنگ کے بڑے سے گیٹ کے باہر تین چار مسلح افراد کھڑے تھے، جو غالباً سکیورٹی گارڈز تھے۔ پھر منظر بدلا۔ اب گھر کے اندر کا منظر تھا۔ ایک بڑے ہال نما کمرے میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ کچھ کھڑے تھے، کچھ بیٹھے تھے۔ درمیان میں ایک کرسی پر کوئی شخص بیٹھا تھا۔ لوگ باری

ہاری اس کے ہاتھ چوم رہے تھے۔ احمد رضا نے محسوس کیا کہ لوگوں میں بہت بے چینی پائی جاتی تھی۔ جیسے ہر شخص پہلے یہ سعادت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ کیمرے نے کرسی پر بیٹھے شخص کا کلوز اپ دکھایا۔ وہ یقیناً طیب خان تھا۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں تھا اور لوگ پروانوں کی طرح اس پر نثار ہو رہے تھے۔ ہال میں جھنجلاہٹ تھی۔ لوگ کچھ کہہ رہے تھے۔

احمد رضا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ان کے چہروں کے تاثرات سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ غم و غصے کا اظہار کر رہے ہیں۔ پھر طیب خان نے دایاں ہاتھ ذرا سا بلند کیا۔ پورے ہال میں خاموشی چھا گئی تھی۔

نظر پھر بدلا اور ایک بار پھر کوٹھی کا بیرونی منظر تھا۔ لیکن اب فرق یہ تھا کہ کوٹھی کے باہر سینکڑوں کی تعداد میں لوگ کھڑے نعرے لگا رہے تھے۔ وہ حیران سا دیکھ رہا تھا، جب پاس پڑے فون کی بیل ہوئی تھی۔ دوسری طرف رچی تھا۔

''تم نے دیکھا؟''

''ہاں۔'' احمد رضا نے دھیرے سے کہا۔

''یہ لوگ طیب خان کے عقیدت مند ہیں اور ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں، ہزاروں میں ہے۔''

''لیکن ابھی چند دن پہلے وہاں چک نمبر 151 میں جو کلپس تم نے مجھے دکھائے تھے، وہ...... ان میں تو طیب خان کسی کوٹھی کے گیراج میں......''

''ہاں! ابتدا وہیں سے ہوئی تھی۔'' رچی نے اس کی بات کاٹی۔ ''اور وہ کلپس تقریباً ڈیڑھ سال پرانے تھے۔''

احمد رضا کو لگا جیسے رچی دوسری طرف مسکرا رہا ہو۔

احمد رضا کو وہ کلپس یاد آئے۔ ان میں طیب خان کے چہرے پر کتنی عاجزی اور انکساری تھی اور وہ اتنی عاجزی اور انکساری سے ہی فرش پر بیٹھا تھا۔ لیکن اس طیب خان کے چہرے پر رعونت اور تکبر تھا۔ گو ماتھے پر محراب تھا اور ہاتھوں میں تسبیح۔ بظاہر وہ عاجزی سے بات کرتا نظر آ رہا تھا۔ کمپیوٹر کی اسکرین پر اس کوٹھی کے مختلف مناظر نظر آ رہے تھے۔ اس نے ایک بیڈ روم میں کارپٹ پر ایک عورت کو بھی بیٹھے دیکھا۔ وہ بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے طیب خان کے جوتوں کے تسمے کھول رہی تھی۔

سی ڈی ایک دم ختم ہو گئی تھی۔

''کمپیوٹر آف کرو احمد رضا! اور دھیان سے میری بات سنو۔''

احمد رضا کو لگا، جیسے وہ اتنی دور بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کمپیوٹر آف کر دیا۔

''سنو...... اپنے آرٹیکل میں جو چند جملے تم نے طیب خان کے متعلق لکھے ہیں، وہ اسکرپٹ میں نہیں تھے۔ آئندہ ایسی کوئی بات لکھنے سے پرہیز کرنا اور وہی لکھنا، جو پوائنٹ تمہیں بتائے جائیں۔ اِدھر اُدھر ایک لفظ بھی نہیں۔ ورنہ اس کے دیوانے تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ طیب خان چاہے تو انہیں خودکش جیکٹ پہنا کر خودکش حملہ کرنے کے لئے کہہ دے۔ چاہے تو انہیں اپنے ہی ہاتھوں سے گلا کاٹنے کا کہہ دے۔ اور وہ یہ سب کر گزریں گے۔ اتنے ہی شیدائی ہیں وہ اس کے۔''

'لوگ کس قدر پاگل اور بے وقوف ہیں۔' اس نے سوچا۔

'طیب خان بھلا ہے ہی کیا؟...... جہادِ افغانستان کی جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر وہ لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جب وہ اسمٰعیل خان کے پاس آتا تھا تو ایک بار الوینا کے منہ سے نکل گیا تھا۔ ''یہ افغانستان میں تھا تو لیکن مجھے یقین نہیں کہ یہ جہاد میں بھی شامل تھا یا نہیں۔''

''تم لوگ ایسے ہی کمزور عقیدے کے ہو احمد رضا!'' رچی دوسری طرف ہنسا تھا۔

''ایسا نہیں ہے۔'' احمد رضا نے کمزور سا احتجاج کیا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا احتجاج فضول ہے۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے اتنے پڑھے لکھے لوگوں کو اسمٰعیل کے سامنے گھٹنے ٹیکتے اور (نعوذ باللہ) اسے اللہ کا ایک معتبر اور مقرب بندہ

سمجھتے اور مانتے دیکھا تھا۔ خود وہ بھی تو یہی سمجھنے لگا تھا کہ اسمٰعیل کو اللہ سے خاص قرب حاصل ہے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ وحئ الٰہی کا سلسلہ ختم ہو چکا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں۔

''ایسا ہی ہے میری جان!'' رچی کا قہقہہ بلند ہوا۔ ''میں کسی روز دکھاؤں گا تمہیں، تمہارے ایمان کی کمزوری کے مناظر۔ اس وقت میری بات سمجھ لو۔ تمہارے اگلے پروگرام کے مہمانوں کی لسٹ تمہیں مل گئی ہے؟''

''جی......!''

''ان میں طیب خان کا نام بھی ہے نا؟''

''تم جانتے ہو رچی! پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟'' وہ جھنجلایا۔

''کنفرم کر رہا تھا۔ جو سوال تمہیں کرنے ہیں، وہ تمہیں مل جائیں گے۔ ان سوالوں کے علاوہ کوئی اور سوال نہیں۔ سمجھے؟'' رچی کے لہجے میں سفاکی در آئی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' احمد رضا نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیا طیب خان بھی ایک دن نبوت......''

''آہاہا!'' رچی پھر ہنسا۔ ''یہ سوال تم پہلے بھی کر چکے ہو۔''

''ہاں شاید۔'' احمد رضا نے آہستہ سے کہا۔

''تو میری جان! ایسا نہیں ہے۔ تب ہم غلط تھے۔ اب ہم صحیح ٹریک پر چل رہے ہیں۔''

رچی پچھلے کئی دنوں سے بہت کھل کر باتیں کر رہا تھا۔ جیسے وہ چاہتا ہو کہ احمد رضا جان لے کہ وہ کون ہے۔

اس نے مزید کوئی بات کیے فون رکھ دیا تھا۔

رچی درحقیقت کون تھا؟

طیب خان نے اسے ایک بار ''لارنس آف عریبیا'' کہا تھا......کون تھا لارنس آف عریبیا؟

مسلم اُمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والا، جس کا اصل نام ٹامس ڈیوڈ لارنس تھا۔

'تو کیا رچی بھی ایسا ہی کچھ کرنا چاہتا ہے؟' آج وہ ایک نئے انداز میں سوچ رہا تھا۔

'اور میں یہ سب کرنے میں رچی کی مدد کر رہا ہوں۔'

اُسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اس نے اس روز سے لے کر جب وہ ابراہیم کے ساتھ اسمٰعیل کے پاس گیا تھا، آج تک کی ہر بات سوچ لی تھی۔ سینما کی اسکرین کی طرح سارے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

'رچی کہتا ہے، ہم لوگوں کا ایمان اور عقیدہ کمزور ہے۔ کوئی شعبدہ دیکھ کر متزلزل ہو جاتا ہے ہمارا یقین اور ایمان۔ لیکن مجھ جیسے لوگوں کا......ہم میں سینکڑوں، ہزاروں بلکہ کروڑوں ایسے ہوں گے، جن کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوتا، جو دین اور نبی صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی حرمت پر مٹ جانے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں......اور سینکڑوں لوگ، ابو جیسے بھی ہوتے ہیں۔ جو نہ ولی ہوتے ہیں اور نہ عالم۔ لیکن ان کو حوصلہ اور صبر ولیوں جیسا ہی عطا ہوتا ہے۔'

کتنے صبر، حوصلے اور خاموشی کے ساتھ حسن رضا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے نکال دیا تھا......اپنے اکلوتے بیٹے کو......جس کے لئے اس نے ایک عمر خواب کاشت کیے تھے۔ اور جب ان خوابوں کی فصل تیار ہو کر لہلہانے لگی تو اپنے ہاتھوں سے اس کھیتی کو آگ لگا دی۔ اس نے تصور میں خود کو اپنے باپ کے قدموں میں جھکا ہوا دیکھا۔ اس کے ہاتھ حسن رضا کے پاؤں پر رکھے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ ان قدموں سے لپٹ جائے۔ وہ آج تک دل ہی دل میں اپنے ابو سے ناراض تھا۔ وہ سمجھتا تھا، انہوں نے اس کے ساتھ غلط کیا۔

اتنی سی بات پر کوئی بھلا اپنے اکلوتے بیٹے کو ہاتھ سے پکڑ کر یوں گھر سے نکال دیتا ہے؟

لیکن یہ اتنی سی بات نہیں تھی......یہ عشق کی، محبت کی بات تھی۔ اور اسے صرف عاشق ہی جان سکتے ہیں۔

حسن رضا نے کبھی عشق کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ عشق ان کے اندر دل کے نہاں خانوں میں موجود تھا۔ اور جب محبوب سے آگے کسی نے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو دل تڑپ اٹھا۔
عشق نے صرف محبوب کا جلوہ دکھایا۔
اس جلوے میں نہ بیٹا نظر آیا، نہ عمر بھر کے خواب۔ وہ نہ ولی تھا، نہ عالم۔ ایک عام آدمی تھا۔ پھر بھی ساری زندگی کے خوابوں کی پونجی گلی میں پھینک کر وہ شخص کتنے اطمینان سے تخت پوش پر خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی سماعتیں بند کر لی تھیں اور آنکھیں میچ لی تھیں۔ اس نے کتنی آوازیں دی تھیں۔ کتنا پکارا تھا۔
آج تک وہ خود کو مظلوم سمجھتا تھا اور حسن رضا کو ظالم۔ لیکن آج یکا یک دل کی کایا کیسے پلٹ گئی تھی کہ وہ تصور ہی تصور میں عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو چومتا، آنکھوں سے لگاتا اور قدموں سے لپٹتا تھا۔ کیا یہ سب ابھی ابھی چند لمحوں میں ہوا تھا؟
نہیں...... یہ چند لمحوں کی بات نہیں تھی۔ پچھلے چند دنوں سے اندر اتھل پتھل ہو رہی تھی۔
کہیں کچھ بدل رہا تھا...... سوچ...... احساس۔
وہ بھولا تو کبھی کسی کو نہ تھا۔
نہ سمیرا کو، نہ امی، نہ ابو۔
لیکن وہ خود ترسی میں مبتلا رہتا تھا۔ اسے حسن رضا سے شکایت تھی۔ اسے ان سے بے حساب گلے تھے۔ کوئی یوں بھی کرتا ہے؟...... کوئی ایسے بھی؟...... یہ جملے اکثر اس کے اندر چکراتے رہتے تھے اور اسے اپنا آپ مظلوم لگتا۔ وہ ذہین تھا، سمجھ دار تھا۔ لیکن اس نے کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
نہ رچی کو...... نہ الوینا کو...... نہ ارباب حیدر، نہ طیب خان...... لیکن بدلاؤ کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ تب ہی تو اس کے قلم سے طیب خان کے متعلق وہ جملے نکل گئے تھے، جو لکھنے کے لئے نہیں کہا گیا تھا۔
یہ بدلاؤ کب شروع ہوا تھا؟...... شاید تب سے، جب سے اس نے حاجی صاحب کے پاس جانا شروع کیا تھا۔ حاجی صاحب ساتھ والے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے بیٹے، پوتے پوتیاں تھیں اور ان کی عمر نوے برس سے بھی شاید زیادہ ہی تھی۔ وہ اکثر صبح صبح اپنے لان میں بیٹھے نظر آتے تھے۔ اس کی پہلی ملاقات ان کے گیٹ پر ہوئی تھی۔ وہ گیٹ کے باہر کھڑے تھے۔ اس نے بزرگ سمجھتے ہوئے سلام کیا تو وہ مسکرائے تھے۔ اس کے پروگرام کی تعریف کی اور دعا دی۔ پھر دو تین بار کھلے گیٹ سے انہیں لان میں بیٹھے دیکھ کر وہ ان کے پاس چلا گیا تھا۔ ان کی باتیں اسے اچھی لگی تھیں۔ ان کے پاس بہت علم تھا۔ وہ اکثر اسے پڑھتے ہوئے ہی نظر آتے تھے۔ ان کے پاس ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی تھی۔ وہ بہت زیادہ بار ان سے نہیں ملا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے اندر بدلاؤ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔
اسے لگ رہا تھا، جیسے ابھی ابھی اس کے اندر تبدیلی آئی ہے۔ ابھی کایا پلٹ ہوئی ہے۔ ابھی اس نے جانا ہے کہ وہ مظلوم نہیں ہے۔
لیکن یہ حاجی صاحب تھے، جنہوں نے غیر محسوس انداز میں اس کے اندر بدلاؤ پیدا کیا تھا۔ اس روز موضوعِ گفتگو ''توہین رسالت قانون'' تھا۔ اپنے پروگرام میں اس نے مبہم الفاظ میں اس کی مخالفت کی تھی۔ حاجی صاحب اسے بتا رہے تھے کہ ہندوستان میں BLASPHAMY کا قانون تھا جس کے تحت حضرت عیسیٰؑ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کے لئے سزا مقرر تھی۔ 1894ء میں اس میں دفعہ A-124 کا اضافہ کر کے اسے تعزیرات ہند کا نام دیا گیا تھا۔ پھر اس میں A-153 دفعہ شامل کر دی۔ جس کے تحت راج پال گستاخ کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا۔ پھر 1932ء میں نتھو رام نے ''ہسٹری آف اسلام'' کے نام سے کتاب شائع کی۔ مقدمہ چلا اور اسے ایک سال کی سزا اور برائے نام جرمانہ ہوا تھا۔ عبدالقیوم ولد عبداللہ نے غازی پور سے آ کر مقدمہ کی کارروائی کے دوران چھرا مارا تھا، جو اس نے جونا مارکیٹ سے

خریدا تھا۔

اس روز وہ تھوڑی دیر کے لئے حاجی صاحب کے پاس رکا تھا۔ موضوعِ گفتگو یہ ہی قانون تھا۔

حاجی صاحب کے لہجے اور گفتگو میں جذبے بول رہے تھے۔ انہیں مسلمانوں کی بے حسی پر افسوس تھا۔

''یہ ایک تہذیب یافتہ معاشرہ ہے۔ یہاں اب پہلے زمانے کی طرح نہیں ہوسکتا حاجی صاحب!'' اس نے کہا۔

''عشق......اور وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق تمہارے اس تہذیب یافتہ معاشرے کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ بیٹھو! میں تمہیں بتاتا ہوں ایسے ہی ایک عاشق دیوانے کے متعلق۔ جن سے میں خود ملا تھا۔ شاید کتابوں میں ان کے متعلق بہت کم لکھا گیا یا پتہ نہیں لکھا گیا ہو، لیکن میں نے نہیں پڑھا۔

سین کمپنی کلکتہ کے مالک نے کتاب چھپوائی تھی۔ ''نند جیون''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے متعلق......لاہور سے امیر احمد اور عبداللہ گئے تھے اسے مارنے۔''

''لیکن کیوں؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''یہ عشق کی باتیں ہیں احمد حسن!......غور سے سنو۔ ان میں جواز نہیں ہوتا۔ دلیل نہیں ہوتی۔ وہ دونوں رات سیٹھ موسیٰ کے مسافر خانے میں ٹھہرے تھے۔ صبح اُٹھ کر گل شاہی کی دکان پر بیٹھے رہے اور کالج سٹریٹ کا پتہ پوچھا وہاں سے۔ اور پھر جا کر تینوں کو مار دیا۔ پبلشر، مصنف اور کاتب۔ مار کر چلے گئے۔ آٹھ گھنٹے بعد وہ دونوں یہ دیکھنے کے لئے واپس آئے کہ زندہ ہیں یا نہیں۔ میں ملنے گیا تھا انہیں سینٹرل جیل کلکتہ میں۔ اس روز امیر احمد کی ماں اور بہن اور عبداللہ کا باپ آیا ہوا تھا۔ امیر احمد نے مجھے گلے لگایا تو میری ہڈیاں کڑکڑا اُٹھیں۔ کہنے لگا۔ جیل میں آکر پچپن پونڈ وزن بڑھ گیا ہے۔''

امیر احمد کی ماں عبداللہ کے باپ نے کہا۔ ''ہم رہائی کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''سب بے کار ہے۔'' امیر احمد کے چہرے پر انوکھی چمک تھی۔ ''رات خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تھے۔ فرما رہے تھے، جلدی آؤ۔ انتظار کر رہے ہیں۔''

امیر احمد کے لبوں کی مسکان اور آنکھوں کی چمک مجھے نہیں بھولتی احمد حسن!''

''پھر کیا ہوا تھا؟'' احمد رضا نے کورس کے علاوہ بہت کم پڑھا تھا۔

''ولایت تک مقدمہ لڑا گیا لیکن پھانسی ہوگئی۔ مشین گنیں رات کو ہی مسلمانوں کے محلوں میں لگا دی گئی تھیں۔ صبح فجر کے ٹائم پھانسی دی گئی تھی۔ چالیس ہزار آدمی جنازے میں تھے۔ اقبال نے امیر احمد کے متعلق ہی کہا تھا۔ ترکھانوں کا منڈا سبقت لے گیا۔''

حاجی صاحب اپنی یادیں اُس کے ساتھ شیئر (Share) کر رہے تھے۔

''غازی عبدالرشید کابل سے آیا تھا اور اس نے دہلی میں آکر شردھانند کو مارا تھا۔ جس نے اسلام کے خلاف کتاب لکھی تھی۔''

اس رات جب وہ اپنے بستر پر لیٹا تھا تو اس نے خود سے وہ سوال نہیں پوچھا تھا جو اکثر پوچھا کرتا تھا کہ ابو نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اور اکثر ہی خود ترسی اور مظلومیت میں مبتلا ہو کر سوتا تھا۔ آج اس نے خود سے سوال نہیں کیا تھا۔ لیکن جیسے اس سوال کا جواب معلوم نہ ہوتے ہوئے بھی کہیں لاشعور کے کسی کونے میں لکھا جا چکا تھا۔ جس کا ادراک اسے ابھی ابھی ہوا تھا۔

اس کے ابو ایک بڑے آدمی تھے۔ عام آدمی ہوتے ہوئے بھی بڑے آدمی۔

اور وہ کیا تھا۔ بہت پہلے شاید ساتویں یا آٹھویں جماعت میں اس نے اپنی نصاب کی کتاب میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ کہانی تو اسے یاد نہیں تھی، لیکن اس کا ایک جملہ اس وقت پتہ نہیں کیوں اسے یاد آ گیا تھا۔

''اور اس نے محض چند سکّوں کے عوض اپنی روح، شیطان کے پاس گروی رکھ دی تھی۔''
تو کیا اس نے بھی محض چند سکّوں کے عوض......؟
وہ بے چین ہوا اور مضطرب ہو کر ایک بار پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ تب ہی ثمینہ حیدر نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا۔
''جنید علی آئے ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں۔'' اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔
وہ اس وقت جنید علی سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس سے ملنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ ثمینہ حیدر کے پیچھے ہی اپنے کمرے سے نکل آیا۔
جنید علی بہت آرام دہ انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ ٹانگیں تھوڑی سی پھیلائے اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا رکھی تھی۔
احمد رضا کے اندر آنے کے بعد بھی اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔
''خیریت ہے جنید علی!......کیسے آنا ہوا؟'' احمد رضا اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
اس نے مصنوعی حیرت سے اسے دیکھا۔
''مجھے یہاں آنے کے لئے کیا کسی خاص ریزن کی ضرورت ہے احمد رضا؟''
''شاید نہیں۔'' احمد رضا کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔
''آج کل تم بہت سنجیدہ اور خاموش لگتے ہو۔''
''وہم ہے تمہارا۔'' احمد رضا کے چہرے کے تاثرات ہنوز ایسے ہی تھے۔
''چلو خیر، وہم ہی سہی۔'' جنید علی مسکرایا۔ ''لیکن تمہاری اس اُداسی اور سنجیدگی کے علاج کے لئے رچی نے یہ کچھ بھیجا ہے۔'' اس نے صوفے پر اپنے پاس پڑے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔
احمد رضا نے ایک بریف کیس کی طرف دیکھا۔
رچی کی طرف سے ہمیشہ کیش ہی ملتا تھا تو بظاہر کوئی تاثر نہ ہوتے ہوئے بھی اندر کہیں ایک خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی تھی۔
وہ ایک امیر آدمی تھا۔ اُس کا بینک بیلنس کروڑوں کے ہندسوں کو عبور کر چکا تھا۔ وہ اگر انجینئر بن بھی جاتا تو اتنے کم عرصے میں وہ اتنے بینک بیلنس کا مالک نہیں بن سکتا تھا۔ اگر ابو اسے گھر سے دور نہ کرتے تو سمیرا اور اماں......اور خوشی کی لہروں میں غم کے کنکر بھی آ گرتے۔ جن کے نوک دار کونے اُسے چبھتے اور تکلیف دیتے۔ یہ سب اس کے اندر چلتا رہتا تھا۔ لیکن آج اندر بھی دُور دُور تک کوئی خوشی کی رمق تک نہ تھی۔ یہاں سے وہاں تک سناٹا پھیلا تھا۔ اس نے سپاٹ نظروں سے بریف کیس کی طرف دیکھا۔ جنید علی بغور اسے دیکھ رہا تھا۔
''رچی کا خیال ہے، کچھ دنوں کے لئے تم کہیں گھوم پھر آؤ۔ مری، بھوربن، کاغان کہیں بھی......تم بہت تھکے تھکے لگ رہے ہو۔ ''سیمل'' پر تمہارا اس سلسلے کا یہ آخری پروگرام ہے۔ پروگرام کے بعد چاہو تو دبئی چلتے ہیں۔''
''کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟'' احمد رضا کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ جنید علی نے دانت نکال دیئے۔
''محض تمہاری دوسراہٹ کے خیال سے۔ اکیلے کوئی کیسے انجوائے کر سکتا ہے؟''
اب کے احمد رضا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔
''ہاں! اگر تم اکیلے ہی انجوائے کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ اکیلے چلے جاؤ۔ لیکن یار! پروگرام ضرور بناؤ کہیں جانے کا۔ فریش ہو جاؤ گے۔'' اس نے پھر اپنی بات دہرائی تھی۔
احمد رضا نے اب بھی سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' جنید علی نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔
''جنید علی! ایک ذاتی کام کے سلسلے میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کیا میں اُمید رکھوں کہ تم میری مدد کرو گے؟''
''کیوں نہیں احمد رضا! میرے خیال میں ہم دوست ہیں اور اگر میں تمہارے لئے کچھ کر سکا تو ضرور کروں گا۔'' اس نے احمد رضا کے چہرے پر نظر ڈالی، جو کچھ متذبذب نظر آ رہا تھا۔
''کم از کم میری حد تک تو میں خود کو تمہارا دوست ہی سمجھتا ہوں۔ ہاں! تم شاید مجھے دوست نہیں سمجھتے۔''
''میں اپنے والدین کی تلاش میں تمہاری مدد چاہتا ہوں جنید!'' علی رضا نے ایک گہری سانس لی اور اس کی طرف دیکھا۔ ''رچی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں ڈھونڈ لے گا۔ لیکن ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔''
''اوکے! میں پوری کوشش کروں گا احمد رضا! تم مجھے ان کے متعلق کچھ بتاؤ۔''
احمد رضا کو پہلی بار اس کے لہجے میں خلوص کی جھلک نظر آئی۔ وہ ہولے ہولے اسے ابو کے متعلق بتانے لگا۔ وہ کہاں رہتے تھے؟ کہاں کام کرتے تھے؟ جنید علی کے متعلق اس کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ اسے سب بتا رہا تھا۔ اسمٰعیل کے پاس جانے سے لے کر اب تک کی ہر بات اس نے کہہ دی تھی۔
جنید علی نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔
''احمد رضا! وہ تمہارے لئے کیسے تڑپتے ہوں گے، میں اس کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ تمہاری ماں اور تمہاری بہن کی تڑپ، تمہاری تڑپ سے ہزار گنا زیادہ ہوگی۔ تمہارے لئے نہ سہی احمد رضا! لیکن میں تمہاری ماں کے لئے انہیں پورے خلوص سے تلاش کروں گا۔ میں نے اپنی ماں کی تڑپ دیکھی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے لئے ایسے تڑپتی ہے، جیسے بن پانی کے مچھلی...... سولہ سال پہلے میرا سب سے بڑا بھائی رزق کی تلاش میں گھر سے ڈالرز کمانے نکلا تھا۔ پتہ نہیں اس تلاش میں کہاں کھو گیا۔ شاید میں تمہارے والدین کو تلاش کروں تو اس صدقے میں مری ماں کو اس کا کھویا ہوا بیٹا مل جائے۔''
جنید علی کی آنکھوں میں نمی تھی۔ احمد رضا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس سے پہلے جنید علی کا یہ روپ نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو اسے انتہائی مکار اور چالاک لگتا تھا۔
''اوکے! میں چلتا ہوں اب۔'' جنید علی کھڑا ہو گیا۔
''دیکھو! رچی سے اس بات کا ذکر نہ کرنا کہ تم نے مجھے اپنے والدین کی تلاش کا کہا ہے۔ اگر اس نے مجھے منع کر دیا تو پھر میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ میں اس کا حکم ماننے پر مجبور ہوں۔''
'بھلا رچی کیوں منع کرے گا؟' احمد رضا نے سوچا ضرور تھا لیکن کہا کچھ نہیں۔
''یہ رقم سنبھال لو احمد رضا! اور وہ سب باتیں یاد رکھنا، جو رچی نے تم سے کہی ہیں۔ شام تک کچھ اور ہدایات مل جائیں گی۔''
احمد رضا نے سر ہلا دیا۔
جنید علی چلا گیا، لیکن وہ وہیں بیٹھا رہا۔ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے۔ وہ ایک بار پھر اپنے سمن آباد والے گھر میں پہنچ گیا تھا۔ سمیرا پرندوں سے ڈرتی تھی۔ چاہے وہ مرغی ہو، کبوتر ہو یا چڑیا۔
پڑوس سے منے کا کبوتر اُڑ کر اُن کے گھر آ گیا تھا۔ وہ کبوتر ہاتھ میں پکڑے سمیرا کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور سمیرا چیخیں مارتی ہوئی پورے گھر میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ تصور میں آنے والے اس منظر نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔
تب ہی ثمینہ حیدر نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔
''سر! دو لڑکیاں آئی ہیں ملنے۔''
اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔
''کون؟''

"پتہ نہیں سر!.....آپ کی کوئی فین ہیں۔آپ کے پروگرام کے متعلق بات کر رہی تھیں۔"
"ٹھیک ہے۔لیکن تم نے انہیں بتایا نہیں کہ سنڈے کو سب اکٹھے ہوتے ہیں یہاں اور ملکی مسائل پر بحث ہوتی ہے، ں روز وہ بھی آ جائیں۔"
"ٹھیک ہے۔میں کہہ دیتی ہوں۔" ثمینہ حیدر باہر چلی گئی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
کم از کم آج کے دن وہ کسی سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ذہن و دل اس وقت عجیب سی کیفیت کے زیر اثر تھے۔ ں میں اُمیدوں کے بھنور بن اور ٹوٹ رہے تھے۔کبھی اسے لگتا، جیسے ابھی جنید کا فون آئے گا اور وہ کہے گا۔"احمد رضا! ے تمہارے والد کا پتہ چل گیا۔" جیسے اس کے پاس جادو کی کوئی چھڑی تھی، جسے وہ گھمائے گا اور......
وہ ایک گہری سانس لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ابھی اسے وہ ڈاکومنٹس دیکھنے تھے، جو رچی نے اُسے فیکس کئے تھے۔ رائنگ روم سے نکل کر اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے ثمینہ حیدر کی آواز سنی۔وہ کہہ رہی تھی۔
"سوری! آج حسن صاحب نہیں مل سکیں گے۔انہیں ایک اہم میٹنگ میں جانا ہے۔آپ اتوار کو آ جائیے گا۔اُس روز ر طالب علم بھی آتے ہیں۔"
آواز لِوِنگ روم سے آ رہی تھی۔غالباً لڑکیاں لِوِنگ روم میں بیٹھی تھیں۔لِوِنگ روم کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک کو اس کے قدم سست ہوئے تھے۔
"آج بھی ہم بہت مشکل سے وقت نکال کر آئے تھے۔دراصل ہماری کزن کی شادی ہے۔آج مہندی ہے، سنڈے و تو بارات ہے۔ہم نہ آ سکیں گے۔"
"تو کسی اور دن آ جائیے گا۔اگلے سنڈے کو سہی۔" یہ ثمینہ حیدر کی آواز تھی۔
"اگلے سنڈے کو.....لیکن اگلے سنڈے میں تو بہت دن ہیں۔"
یہ آواز بہت آہستہ تھی لیکن اس کی سماعتوں نے اسے کیچ کیا تھا۔اسے لگا جیسے یہ آواز اس نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔ ہت جانی پہچانی آواز تھی۔
"کیا اس سے پہلے.....میرا مطلب ہے، کل نہیں آ سکتے ہم؟" وہی پہلی آواز۔
"میں سر سے پوچھوں گی۔اگر وہ کل مصروف نہیں ہیں تو کل آ جائیے گا۔میرا نمبر محفوظ کر لیں اور شام میں کسی وقت چھ لیجئے گا۔"
"شکریہ میم!" وہی آواز۔
اس نے قدم آگے بڑھائے۔
یہ ثمینہ حیدر بھی.......اب بھلا ان کو اپنا نمبر دینے کی کیا ضرورت تھی؟ پتہ نہیں کون لڑکیاں ہیں۔صاف کہہ دینا چاہئے ا، سنڈے کو ہی آئیں۔
وہ لِوِنگ روم کے پاس سے گزر کر لاؤنج میں آ گیا۔لِوِنگ روم کا ایک دروازہ ڈائریکٹ باہر کھلتا تھا، برآمدے میں۔ آمدے کی سیڑھیاں اُتر کر پورچ تھا اور پھر آگے گیٹ تھا۔دائیں طرف لان تھا۔ٹی وی لاؤنج میں اس کے بیڈ روم کا روازہ کھلتا تھا۔یہاں دو بیڈ روم تھے۔دو بیڈ روم فرسٹ فلور پر تھے۔وہ اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے جاتے مڑا اور ٹی ی لاؤنج کی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔اس کھڑکی سے لان اور گیٹ نظر آتا تھا اور پورچ میں کھڑی گاڑی کا کچھ صہ۔وہ یوں ہی بے دھیانی سے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا، جب اس نے گیٹ کے قریب پہنچتی لڑکیوں کو دیکھا۔ایک ڑکی نے عبایا پہن رکھا تھا۔جبکہ دوسری نے سیاہ چادر اوڑھی ہوئی تھی۔سیاہ چادر، جس کی خوب صورت نفیس سی کڑھائی کے اندر ننھے ننھے شیشے دمکتے تھے۔
عبایا والی لڑکی۔وہ چونکا۔

یہ وہ لڑکی تو نہیں..... وہی...... کے۔ای والی ڈاکٹر لڑکی، جس کے ساتھ عینک والی لڑکی تھی جو بہت تیز تیز بولتی تھی۔ لیکن جو بالکل سمیرا کی طرح خود کو متعصب پاکستانی کہتی تھی۔

اُس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

'مجھے اُن سے مل لینا چاہئے تھا۔'

اُسے افسوس ہوا اور یاد آیا کہ اس نے ان سے کہا تھا کہ اپنی ٹائم وہ اس سے مل سکتی ہیں۔

چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔

سیاہ چادر والی لڑکی نے غیر ارادی طور پر مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔

''اریب فاطمہ.......'' اس کے لبوں سے نکلا۔ یہ تو اریب فاطمہ تھی۔ اسفند یار اور عظمت یار کی بہن۔

'وہ یہاں....... کیا وہ بھی کے۔ای میں پڑھتی ہے؟ لیکن نہیں۔ اسفند نے بتایا تو تھا، وہ بی اے کر رہی ہے۔'

لڑکیاں گیٹ کھول کر باہر نکل چکی تھیں جب وہ تقریباً دوڑتا ہوا اندرونی دروازہ کھولتا گیٹ تک آیا تھا۔ چوکیدار نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ روڈ کراس کر کے سامنے روڈ کے کنارے کھڑی تھی۔ عبایا والی لڑکی نے آج بھی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ جبکہ اریب فاطمہ دائیں طرف روڈ پر دیکھ رہی تھی۔ شاید کسی ویگن یا بس کو۔ وہ اریب فاطمہ تھی، اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ وہ روڈ کراس کرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک بڑے ٹرک نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ اور جب تک وہ روڈ کراس کر کے ان تک پہنچا، وہ ایک رکشہ روک کر اس میں بیٹھ چکی تھیں۔

''اریب فاطمہ.......!'' اس نے پکارا۔

اور شاید اریب فاطمہ نے اس کی پکار بھی سن لی تھی۔ کیونکہ اس نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے تھوڑا سا آگے جھک کر اسے دیکھا تھا۔

''اریب فاطمہ.......!''

اس نے پھر بلایا تھا۔ لیکن رکشہ فراٹے بھرتا آگے نکل گیا اور وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا، رکشے کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھ رہا تھا۔

''وہ قدیم عراق کا ایک بڑا شہر تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم وہاں بستی تھی۔ وہ لوگ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسرا بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ وہ حضرت نوح علیہ السلام کی بات نہیں سنتے تھے اور زمین آنے والے عذاب کے ڈر سے تھرتھر کانپتی تھی۔ جب حضرت نوح علیہ السلام کشتی بناتے تھے تو ان کی قوم حیرت سے انہیں کشتی بناتے دیکھتی تھی اور مذاق اُڑاتی تھی کہ بھلا خشکی پر کشتی کا کیا کام۔ حضرت نوح علیہ السلام، اللہ کے حکم کا انتظار کرتے تھے۔ پھر اللہ کا حکم آ پہنچا۔ بستی کو سیاہ بادلوں نے گھیر لیا اور ایک خوفناک کڑک کے ساتھ طوفانی بارش نے آن لیا۔''

حورعین دونوں بازو گھٹنوں کے گرد حمائل کیے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔ وہ جب تاریخ کے ایوانوں میں جھانک رہی ہوتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود وہاں موجود ہو۔ وقت کی قید سے آزاد، ہزاروں، کروڑوں سال پیچھے سب دیکھ رہی ہو۔

''پہاڑوں سے بہہ آنے والے پانی اور بارش کے پانی میں زمین کے آنسو بھی شامل ہو رہے تھے۔

زمین روتی تھی کہ ساڑھے نوسو برس حضرت نوح علیہ السلام نے اس قوم کو سمجھایا اور وہ نہیں سمجھی۔ وہ اس قوم کے انجام پر روتی تھی اور.......

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کو اس پہاڑ پر چڑھتے دیکھتی تھی، جو اسے بچانے والا نہیں تھا۔ لیکن کنعان نہیں سمجھتا تھا اور رب کے بجائے پہاڑ سے پناہ مانگتا تھا۔ اور پہاڑ کو حکم ربی ہوا۔ ''اے پہاڑ! ریت بن جا۔'' اور دنیا کا وہ بلند ترین پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔

جانتے ہو شاعر! یہ جو نجف ہے نا، یہیں دنیا کا وہ بلند ترین پہاڑ تھا، جس پر کنعان اور دوسرے لوگوں نے پناہ لی اور جس کی ریت کے ذرے آج بھی نجف کے میدان میں بکھرے پڑے ہیں۔''

''میں یہ سب نہیں جانتا۔ مجھے تاریخ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اور حورعین کہتی تھی، جو اپنی تاریخ سے لاعلم ہے، اس کا نہ حال ہے، نہ مستقبل۔ پتہ نہیں وہ صحیح کہتی تھی یا غلط۔ لیکن اس وقت میں نے بڑے تفاخر سے اسے دیکھا۔

''اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جس پہاڑ پر جا کر رُکی تھی، اسے ''کوہ جودی'' کہتے ہیں۔'' یہ میں جانتا تھا لیکن حورعین میری اس معلومات سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی۔

''ہاں! حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے یعنی سام، حام اور یافث جو اُن کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے تھے، ان سے ہی نوع انسان کی بڑی نسلیں وجود میں آئیں۔ قوم ''عاد'' کا تو تم نے پڑھا ہوگا۔ قوم عاد، حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی اولاد میں سے ہے۔ سام کا بیٹا ارم۔ یہ ان کی نسل میں سے تھے۔ بہت طاقتور...... لیکن ظالم...... یہ اپنے زمانے کی انتہائی متمدن قوم تھی۔ وہ لوگ اونچی اونچی عالیشان عمارتیں بناتے تھے۔ ستونوں کی مدد سے اونچی عمارتیں بنانے کا فن انہوں نے ہی ایجاد کیا۔ لیکن وہ شرک کرتے تھے اور توحید کے منکر تھے۔ پھر ان کے سب سے باعزت قبیلے خلود میں حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ وہ انہیں توحید کی طرف بلاتے تھے اور وہ ان کے قتل کا منصوبہ بناتے تھے۔ حضرت ہود علیہ السلام، اللہ کے حکم سے سورج ڈوبتے ہی بستی سے ہجرت کر گئے اور وہ رات کے اندھیرے میں خالی

گھر کے باہر ہاتھ ملتے تھے۔

اور پھر اگلی صبح اللہ کا عذاب آ پہنچا، جس کی وعید حضرت ہود علیہ السلام اُنہیں دیتے تھے تو وہ کان نہ دھرتے تھے۔ یہ آندھی کا عذاب تھا، جو آٹھ دن اور سات راتوں تک مسلسل چلتی رہی تھی۔ اس آندھی نے ان کی پناہ گاہوں کو مٹی سے ڈھانپ لیا اور انہیں اُٹھا اُٹھا کر پٹخا۔ زمین پر مٹی کے بڑے بڑے ٹیلے بن گئے، جس میں سب کچھ دفن ہو گیا۔ یہ ٹیلے قیامت تک گواہی دیں گے۔

''بے شک انسان خسارے میں ہے۔''

حورعین نے جھرجھری لی۔ جیسے وہ قوم عاد کے تنومند مردوں کو زمین پر گرتے اور مٹی تلے چھپتے دیکھ رہی ہو۔

''حورعین!'' میں نے جلدی سے پکارا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اسے شاید میری مداخلت گراں گزری تھی۔ لیکن مجھے ماضی کی داستانوں سے کیا لینا تھا۔ میں تو ہر حال میں زندہ رہنے والا شخص تھا۔

میرے سامنے حورعین بیٹھی تھی، جس کی غزالی آنکھوں کے سحر میں، میں جکڑا گیا تھا۔ ان ظالم آنکھوں کا حزن مجھے اپنے طلسم میں گرفتار کئے ہوئے تھا۔ میں تو حورعین سے حورعین کی باتیں ہی سننا چاہتا تھا اور اس بات کو جاننا چاہتا تھا، جو پچھلی ملاقات میں ادھوری رہ گئی تھی۔ اس آدھی بات نے مجھے کئی دنوں سے بے چین کر رکھا تھا اور آج اتنے دنوں بعد حورعین آئی تھی تو وہ پتہ نہیں کیوں تاریخ کے وہ صفحے پھر کھولنے لگی تھی، جو پرانے ہو چکے تھے۔

جو تہذیبیں اور قومیں نیست و نابود ہو چکی تھیں، وہ ان کا ذکر لے بیٹھی تھی۔ ان کی نافرمانی، ان کا ظلم اور پھر ان پر عذاب الٰہی۔

''آہ!'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

''اس رات کیا ہوا تھا حورعین؟''

''کس رات؟'' اس نے اپنی گھنیری پلکیں اُٹھائیں۔

''اُس رات جب گیارہ سالہ حورعین، مریم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔'' میرا صبر جواب دے گیا تھا۔

''اُس رات۔'' اُس کی آنکھیں نم ہوئیں اور پلکیں بھیگنے لگیں۔ وہ ہزاروں سالوں کا فاصلہ ٹاپ کر چوہدری فرید کے صحن میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

ہاں! اس رات، جو پانچویں تھی اور سب سے چھوٹی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بازو اوپر اٹھائے ہوئے تھے اور مریم کے سامنے کھڑی اپنے ننھے وجود سے اسے چھپاتے چوہدری فرید کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اور چوہدری فرید جو مریم کو مارنے کے لئے دوڑا تھا، اس کا اُٹھا ہوا ہاتھ گر گیا اور پھر وہ غصے سے پاؤں زمین پر مارتا اندر کمرے میں چلا گیا۔

حورعین نے ہاتھ نیچے کر کے مڑ کر مریم کو دیکھا۔ مریم اسے اپنے بازوؤں میں دبوچے اس کے سر پر چہرہ رکھے زار زار روتی تھی۔ پر اُس کی آواز نہیں آتی تھی۔ بس آنسو، حورعین کے بال بھگوتے تھے اور حورعین کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ مریم کو کسی ایسی جگہ چھپا دے جہاں چوہدری فرید اسے نہ دیکھ سکے اور جہاں مریم کو اس طرح رونا نہ پڑے۔

''پر چوہدری فرید اسے کیوں مارنے دوڑا تھا؟''

''اس لئے کہ مریم، فریدہ کے لئے اس سے لڑتی تھی۔ وہ فریدہ کا رشتہ شیر افگن کو دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس نے چوہدری فرید کی منتیں کی تھیں، ہاتھ جوڑے تھے، پاؤں پکڑے تھے کہ وہ بھلے ایک چھوڑ، چار شادیاں کر لے پر فریدہ کو شیر افگن سے بیاہنے کا خیال چھوڑ دے۔ مگر چوہدری فرید اس کی نہیں سنتا تھا۔''

''پھر...... کیا چوہدری فرید نے فریدہ کو شیر افگن سے بیاہ دیا؟'' وہ ذرا دیر کو خاموش ہوئی تو بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔ اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''تمہیں زخم کریدنے میں مزا آتا ہے شاعر؟''

"سوری!" میں شرمندہ ہوا تو اس نے ایک گہری سانس لی۔
"اسے جیتنا ہی تھا۔ وہ مرد تھا۔ اس کے پاس طاقت تھی اور مریم عورت...... اتنی زمین کی مالک ہوتے ہوئے بھی بے بس مریم کے پاس صرف صبر تھا اور آنسو۔ سو اُس نے اسی صبر کو پلو میں باندھ کر اور آنسوؤں کو دل میں اُتار کر فریدہ کو شیر افگن کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اس روز فریدہ کی عمر تیرہ سال پانچ مہینے اور چھ دن تھی۔ شیر افگن کی بیٹی، ثریا نے لال جوڑا پہن کر حویلی میں قدم رکھا تھا۔
مریم نے صبر کی چادر اوڑھے بڑی پیٹی سے اپنے جہیز کی ساٹن کی کڑھائی والی چادریں اور تکیے نکال کر اپنے جہیز کے نواڑی پلنگ پر، جس کی اونچی پشت پر براؤن لکڑی میں رنگ برنگے شیشے دمکتے تھے، بچھائی اور خود اس کمرے سے بڑے کمرے میں اُٹھ آئی اور چپ چاپ فریدہ کی چارپائی پر آ کر لیٹ گئی۔ رقیہ اُسے کن اکھیوں سے دیکھتی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے کونے پونچھتی تھی اور وہ دیوار کی طرف منہ کئے بے آواز آنسو بہاتی تھی، جو سخت تکیے کی رُوئی میں جذب ہوتے تھے۔ حورعین اس کی پیٹھ سے چمٹی اپنا ایک بازو اس پر رکھے سونے کی کوشش کرتی تھی۔
مریم پوری رات جاگی تھی۔ لیکن پھر بھی صبح سویرے اُٹھ گئی۔ ثریا اور شیر افگن کو ناشتہ بھجوا کر وہ جلے پیر کی بلی کی طرح پورے صحن میں چکراتی تھی اور کبھی کبھی گھڑونچی کی جالیوں میں جھانکتی۔ پتہ نہیں وہ داور سائیں کو کھوجتی تھی، جو دو دن سے نظر نہیں آ رہا تھا یا یوں ہی دیکھتی تھی۔"
حورعین نے سر سے ڈھلک جانے والی چادر کو درست کیا اور اُٹھنے لگی تو میں نے بے تابی سے پوچھا۔
"حورعین! فریدہ خوش تو تھی نا؟ شیر افگن نے اسے خوش تو رکھا تھا نا؟" میں پوچھ رہا تھا اور میرا دل سننا چاہتا تھا۔
"ہاں! وہ خوش تھی۔ شیر افگن نے اسے پھولوں کی طرح رکھا، چاہا۔" لیکن حورعین کی آنکھیں پہلے خون رنگ ہوئیں اور پھر چھلک پڑیں۔ وہ اُٹھتے اُٹھتے بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو پونچھا نہیں۔ وہ ہاتھ زمین پر ٹیکے آنسو بہا رہی تھی۔
"حورعین!" میں نے بے تاب ہو کر ہاتھ آگے بڑھایا اور پھر پیچھے کر لیا۔
یہ رخصتی سے دوسرے دن کی بات تھی۔ فریدہ شام کو مریم کے گھر آئی تھی اور ثریا اپنے میکے گئی تھی۔ وہاں گاؤں میں یہ رسم تھی۔ اگلی صبح شیر افگن آ کر فریدہ کو لے جاتا اور چوہدری فرید، ثریا کو۔ پر رات کا جانے کون سا پہر تھا، جب حورعین کی آنکھ کھلی اور اس نے کھلے دروازے سے چاند کی روشنی میں دیکھا۔ وہ شاید چودھویں کا یا تیرھویں کا چاند تھا۔ اس کی روشنی پورے صحن میں اُجالا کرتی تھی اور برآمدے میں بھی آتی تھی۔ مریم، فریدہ کو بازوؤں میں چھپائے بیٹھی تھی اور فریدہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔
"اماں! تجھے اللہ کا واسطہ۔ مجھے صبح وہاں مت بھیجنا۔ اماں! میں مر جاؤں گی۔"
اور مریم کبھی اس کا سر چومتی، کبھی اس کے رخساروں پر بوسہ دیتی اور اس کے ساتھ مل کر روتی۔
"میری بچی! کیا ہوا؟ بول تو۔ کچھ کہہ تو۔"
اور فریدہ بول نہ پاتی۔ بس روتی، تڑپتی تھی۔
"اماں! مجھے نہ بھیجو۔"
حورعین نے چوہدری فرید کو کمرے سے نکلتے اور پھر برآمدے میں مریم اور فریدہ کے پاس کھڑے ہوتے دیکھا۔ وہ گہری نیند سے جاگا تھا شاید۔
"کیا ہنگامہ ہے؟" فریدہ، مریم کو چھوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔
"ابا! مجھے وہاں نہ بھیجو۔ بے شک اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو، لیکن وہاں نہیں بھیجو"
صبح ہونے کا خوف اسے مارے ڈالتا تھا جب شیر افگن کو اسے لینے آنا تھا۔ اور صبح ہونے میں دیر ہی کتنی تھی۔ وہ

چوہدری فرید کی ٹانگیں نہ چھوڑتی تھی۔ تب چوہدری فرید نے زور سے پاؤں جھٹکا اور وہ دُبلی پتلی فریدہ اُچھل کر گری۔ برآمدے میں پڑے حمام کی ٹونٹی اس کے سر میں لگی اور سر سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ لیکن وہ خون کی پروا کئے بغیر سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔

''ٹھیک ہے۔ میں پھر چھت سے چھلانگ لگا دوں گی۔ لیکن صبح۔''

کچھ دیر ششدر کھڑا رہنے کے بعد چوہدری فرید اس کے پیچھے لپکا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی جا رہی تھی۔ چوہدری فرید نے آخری سیڑھی پر اس کا بازو پکڑ لیا اور وہ سیڑھی پر ہی ایک بار پھر اس کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''ابا! آپ کو اللہ کا واسطہ، رسول ﷺ کا واسطہ۔''

چوہدری فرید نے غصے سے پاؤں جھٹکا اور اسے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا اور پھر اس کا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتی نیچے فرش پر آ گری اور اس کا سر کھل گیا۔

پوری سولہ پکی سیڑھیاں۔

حورعین کتنی ہی بار گن کر سیڑھیاں چڑھتی اور اُترتی تھی۔

وہ سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ فریدہ کو کچھ نہ ہوا ہو اور اس کے گرنے سے چوہدری فرید کو عقل آ گئی ہو۔

وہ سر جھکائے زمین پر انگلی سے لکیریں کھینچتی تھی اور اس کے آنسو نیچے زمین پر گرتے تھے۔ بڑی دیر بعد اس نے سر اُٹھایا۔

حورعین دروازے میں سہمی سہمی کھڑی مریم کو دیکھ رہی تھی، جو فریدہ کو گود میں سمیٹے فرش پر بیٹھی خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتی، اس کے بند ہونٹوں کو چومتی تھی۔ اس کے سر سے نکلنے والے خون سے اس کے ہاتھ بھرے جاتے تھے۔ چوہدری فرید بھی فرش پر بیٹھا اس کی نبض ٹٹول رہا تھا اور کن اکھیوں سے مریم کو تکتا پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھتا تھا۔ پتہ نہیں وہ فریدہ کے لئے روتا تھا یا اس لئے کہ اب شیر افگن بھی اپنی بیٹی کو واپس بلا لے گا۔ اور ابھی ایک رات میں ثریا سے جی کہاں بھرا تھا اس کا۔

''کیا.....کیا فریدہ؟'' میں ہکلا گیا۔

''ہاں۔'' حورعین نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے بری طرح کچل ڈالا۔

''پتہ نہیں کیوں۔ حالانکہ صرف سولہ سیڑھیاں ہی تو تھیں۔ بچپن میں ہم پانچوں ہی ایک دو بار ضرور ان سیڑھیوں سے گری تھیں۔ سر بھی پھٹے تھے، ٹانکے بھی لگے تھے۔ لیکن فریدہ کو پتہ نہیں، کتنی گہری چوٹ لگی تھی۔ دروازے میں کھڑی حورعین کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ تب رقیہ نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھیں۔ برابر والے پلنگ پر رابعہ گہری نیند سوتی تھی۔

تب چوہدری فرید اسے بازوؤں میں اُٹھائے اندر لایا اور رقیہ، مریم سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اس کے رونے سے رابطہ اُٹھ بیٹھی۔ چوہدری فرید نے اسے بتایا کہ فریدہ اندھیرے میں سیڑھیوں سے پھسل کر گر گئی تھی اور پورے گاؤں نے اسے ہی سچ جانا۔ کسی نے نہ پوچھا کہ رات کے وقت اندھیرے میں وہ چھت پر کیا کرنے گئی تھی اور حورعین جو سچ جانتی تھی، شکوہ بھری نظروں سے مریم کو دیکھتی تھی کہ وہ لوگوں کو کیوں نہیں بتاتی۔

چوہدری فرید کی بہنیں پورے صحن میں چکراتی، بین کرتی تھیں۔ صحن کے بیچوں بیچ پڑی چارپائی پر آنکھیں موندے لیٹی فریدہ کے چہرے کی زردی میں اب بھی سہم اور خوف جھلکتا تھا۔ جیسے ڈر خوف وہیں منجمد ہو گیا ہو۔ مدت کے بعد بھی مریم، چوہدری فرید کی بہنوں کو پتھر آنکھوں سے دیکھتی اور کہتی تھی۔

''تم نے اس وقت بین کیوں نہیں ڈالے؟ اس وقت کیوں نہیں روئیں، جب تمہارا بھائی اس کلیوں جیسی نازک تیرہ

سالہ لڑکی کو ستر سال کے بوڑھے سے بیاہ رہا تھا؟''
لیکن اس کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ وہ صرف ٹکر ٹکر اُنہیں دیکھتی تھی۔ شیر افگن کی حویلی کے بجائے چوہدری فرید کے گھر سے دو دن کی بیاہی دلہن کا جنازہ اُٹھا۔
کئی دنوں بعد جب حورعین نے مریم سے پوچھا۔''اماں! ابا کو پولیس کب پکڑ کر لے جائے گی؟''
''چپ کمسی!'' مریم نے اس کے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی اور حورعین سوچتی تھی۔
'جب ہاری غلام سرور نے اپنے دشمن کو چھت سے دھکا دے کر مار دیا تھا تو پولیس اسے پکڑ کر لے گئی تھی تو پھر ابا کو کیوں نہیں پکڑتی؟'
''کیونکہ مریم نے شوہر کو بیٹی کا قتل معاف کر دیا تھا۔'' مجھے اپنے لہجے کی تلخی خود ہی محسوس ہوئی اور میں مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
''اور شاید بیویاں ایسا ہی کرتی ہیں۔'' اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔ میں نے بمشکل سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔
''کاش! مریم نے فریدہ کے خون بہا میں باقی تینوں کی زندگیاں مانگ لی ہوتیں۔ لیکن مریم کو اتنی عقل ہی کہاں تھی؟''
اس کا سر گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا۔ اتنا کہ مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، جسے دیکھنے کی چاہ میں، میں اس کے سامنے بیٹھا اس کی وہ باتیں بھی سنتا رہتا تھا، جن میں مجھے دلچسپی نہیں تھی۔
اس کی آنکھیں برس رہی تھیں اور مجھے کشور ناہید کی ''قتل عمد'' یاد آ رہی تھی اور میں دل ہی دل میں دہرا رہا تھا۔

''یہ زندگی کی سل پہ پس چکیں تو رنگ آئے گا
عدم نصیب عورتیں، عدم کا راستہ بتائیں گی
سفر نصیب عورتیں
اجل نشان عورتیں
عدم نژاد عورتیں
سنو! کہ ایسا کیا ضرور ہے کہ
ان کے قتل کی سزا بھی قتل عمد ہو؟''

''آپی.....!'' فلک شاہ نے جو بہت دیر سے ایبک کو مسلسل لکھتے ہوئے دیکھ رہے تھے، آہستہ سے پکارا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ بیڈ پر اسی کی طرف کروٹ کئے لیٹے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔
''جی بابا!'' وہ ایک دم قلم ٹیبل پر رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔''آپ ابھی تک سوئے نہیں؟''
''نیند نہیں آ رہی تھی۔ تمہیں لکھتے دیکھ رہا تھا۔ تھکے نہیں ہو کیا؟''
''بس بابا! آج بہت دنوں بعد قلم اٹھایا تھا......تو بس لکھتا ہی چلا گیا۔ لفظ جیسے خود بخود نوکِ قلم سے پھسل رہے تھے۔''
وہ ان کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے بولا۔
''آپ ٹھیک تو ہیں نا بابا؟''
''ہوں۔'' انہوں نے ہاتھ بستر پر ٹکا کر اُٹھنے کی کوشش کی۔
''لیٹے رہیں بابا! اب رات کے ڈیڑھ بجے اُٹھ کر بیٹھنے کا ٹائم تو نہیں ہے نا۔'' اس نے سامنے کلاک پر نظر ڈالی۔
''لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں یار!......نیند نہیں آ رہی۔''
ایبک نے انہیں اُٹھنے میں مدد دی اور بیڈ کراؤن کے ساتھ تکیہ رکھا۔ فلک شاہ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔
''بابا! آپ نے آج وہ تکونی گولی نہیں کھائی نا، جو انکل شیر دل نے آپ کو دی تھی؟''
''نہیں یار! وہ کھاتے ہی نیند آ جاتی ہے۔''

''لیکن آپ کا ذہن پُرسکون ہو جاتا۔ میں پانی دوں آپ کو؟''
''ابھی نہیں۔ یہ بتاؤ! تمہارا ناول کب تک مکمل ہوگا؟''
''میرا خیال ہے، اگر میں باقاعدگی سے ہر روز ایک دو گھنٹہ لکھوں تو دس بارہ دنوں میں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بعض اوقات کئی کئی مہینے گزر جاتے ہیں، لکھ نہیں پاتا۔''
ایبک اس وقت فلک شاہ کے ساتھ کرنل شیر دل کے گیسٹ روم میں تھا۔ فلک شاہ یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو وہ ان کے پاس چلا آتا تھا۔ آج لکھنے کا موڈ ہو رہا تھا، اس لئے وہ اپنا لکھنے پڑھنے کا سامان بھی اُٹھا لایا تھا۔
کرنل شیر دل ہر طرح سے فلک شاہ کا خیال رکھ رہے تھے۔ بلکہ وہ انہیں گاڑی میں بٹھا کر ان بہت ساری جگہوں پر جو فلک شاہ کو بہت پسند تھیں، لے گئے تھے۔
''اور کالم لکھنے کے لئے کیسے وقت نکال پاتے ہو؟'' وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔
''وہ تو مجبوری ہے بابا! وقت نکالنا ہی پڑتا ہے۔''
''شیر دل کہہ رہا تھا، تم آج کل بہت سخت الفاظ استعمال کر رہے ہو۔ ہاتھ ہولا رکھو بیٹا!'' ان کا انداز سمجھانے کا سا تھا۔
''تم جانتے ہو نا، یہاں حق کی آواز بلند کرنے والوں کی زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں، ہاتھ کچل دیئے جاتے ہیں۔''
''لیکن مجھے اختلاف ہے بابا! ان کی پالیسیوں سے۔ ان کے کاموں سے۔ انہیں ملک سے محبت نہیں ہے بابا! انہیں صرف اقتدار کی ہوس ہے، پیسے کا لالچ ہے۔ یہ سب ملک بیچ کھانے والے لوگ ہیں۔ انہیں اس سرزمین سے محبت نہیں ہے۔ یہ صرف اس کا سودا کرنے اور اپنے خزانے بھرنے کے لئے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔''
''جانتا ہوں بیٹا! لیکن تم یا میں کیا کر سکتے ہیں؟''
''یہی تو مجبوری ہے بابا! ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ ہمارے ہاتھ بندھے ہیں۔ ہم آنکھوں کے سامنے انہیں ملک کو لوٹتا دیکھتے ہیں، لیکن ہم زبانیں سیئے بیٹھے ہیں۔ بابا پلیز۔'' اس نے ملتجی نظروں سے فلک شاہ کو دیکھا۔
''میں اس ملک کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ عملی طور پر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ ایسا بابا! جو میرے ملک کو ان گھرے اندھیروں سے نکال سکے۔''
''تم نے وعدہ کیا تھا ایبک! مجھ سے، اپنی ماں سے اور شیر سے کہ تم......''
''اسی وعدے نے تو مجھے زنجیر کر رکھا ہے بابا!'' اس کی آواز ایک دم مدھم ہوگئی تھی اور سر جھک گیا۔
''تم کیا کرنا چاہتے ہو آبی؟'' ان کا دل اس کے لئے دُکھا۔ وہ فلک مراد شاہ کا بیٹا تھا اور اس کے سینے میں بھی فلک مراد شاہ کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ دل جو ملک میں ہونے والی ناانصافیوں پر تڑپتا تھا۔ جسے پاکستان سے عشق تھا۔ جو اپنے محسنوں قائداعظم اور اقبال کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا تھا۔ جو مخلص لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اس چاہت نے انہیں کیا دیا۔ حق نواز مر گیا اور وہ.......
''میں......'' ایبک نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ''پتہ نہیں بابا! میرے سامنے کوئی راستہ واضح نہیں ہے۔ وہ لوگ جو بظاہر پاکستان اور مسلمانوں سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، جب ان کے چہروں سے نقاب اُٹھتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، بندہ کس کو فالو کرے۔''
''تم اپنے لئے خود راستہ بناؤ بیٹا! کسی کے پیچھے چلنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے؟ تم ایسے جوانوں سے رابطہ کرو، جن کے دل میں واقعی ملک و ملت کا درد ہے۔ یہ ملک اس لئے تو نہیں بنا تھا کہ چند لٹیرے اور ڈاکو اسے یرغمال بنا لیں۔''
فلک شاہ بھول گئے کہ انہوں نے ایبک سے سیاست اور ایسی کسی بھی سرگرمی میں حصہ نہ لینے کا عہد لے رکھا تھا۔
اُنہیں یاد نہیں رہا کہ حق نواز مارا گیا تھا......وہ معذور ہو گئے تھے۔
اس وقت اُنہیں لگ رہا تھا، وہ حق نواز ہیں اور ان کے سامنے فلک مراد شاہ بیٹھا ہوا ہے اور وہ اسے قائل کر رہے ہیں۔

''ہمیں اس وطن کے لئے کچھ کرنا ہے ایبک شاہ! ہم اسے یوں ہاتھوں سے جانے نہیں دیں گے۔ ابھی تو میرے سینے میں سقوطِ ڈھاکہ کا زخم تازہ ہے۔ ابھی تو اس سے خون رستا ہے آبی! میں تمہارے ساتھ ہوں آبی!...... بتاؤ، کیا کرنا چاہتے ہو؟ میں تمہیں ہر اس عہد سے آزاد کرتا ہوں، جو میں نے تم سے لیا تھا۔''

''بابا!'' ایبک نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''جانِ بابا'' فلک شاہ نے اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''تم جو کرنا چاہتے ہو، کرو۔ ہوسکتا ہے تم اس وطن کے لئے وہ کرسکو، جو میں نہیں کرسکا۔ میں نے اور حق نواز نے مل کر اس ملک کے لئے بہت سارے خواب دیکھے تھے۔ کوئی ایک خواب بھی تعبیر نہیں پا سکا۔ سردار اعجاز کہتے تھے، خواب ضرور دیکھو فلک مراد شاہ!''

وہ ذرا سا مسکرائے اور پھر نم ہو جانے والی آنکھیں پونچھیں۔ پتہ نہیں کیا کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔

''کل میں سردار اعجاز سے ملنے جاؤں گا۔ شیر دل بتا رہا تھا، بہت بیمار ہیں۔ اسّی سال عمر ہو چکی ہے ان کی۔ لیکن وہ آج بھی خواب دیکھتے ہیں وطن کے لئے، قوم کے لئے۔ تمہیں فنکشن میں نہ جانا ہوتا تو میرے ساتھ چلتے۔''

''تو آپ نے طے کر لیا ہے کہ آپ فنکشن میں نہیں جائیں گے؟''

''ہاں۔ مصطفیٰ بھائی اور عثمان بھائی سے بات ہو گئی تھی۔ کسی بھی قسم کی بدمزگی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ اور میں ڈرتا بھی ہوں کہ کہیں کوئی بات برسوں بعد ملنے والی اس خوشی کو نگل نہ لے۔ تمہاری ماما کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ وہ دوبارہ سے یہ جدائیاں برداشت نہیں کر سکے گی۔''

''اب بابا جان کو ساری بات کا پتہ تو ہے اور پھر مروہ پھپھو نے بھی تصدیق کر دی ہے آپ کی بات کی۔ اب کیا ہونا ہے بھلا؟''

''ٹھیک ہے۔ لیکن تم بھی محتاط رہنا۔ رابیل سے اور مائرہ سے دُور ہی رہنا۔''

''جی بابا! اب آپ سو جائیں۔ اور یہ ٹیبلٹ لے لیں۔'' اس نے اُٹھ کر بیڈ کی سائیڈ دراز سے گولی نکالی اور روم فریج سے پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی ڈالا۔

''تم بھی سو جاؤ۔ اب دو بج رہے ہیں۔ لکھنے نہ بیٹھ جانا۔''

''جی! بس چند لفظ ذہن میں چکرا رہے ہیں۔ لکھ کر سو جاتا ہوں۔''

اس نے گولی ان کی ہتھیلی پر رکھی۔

''ایبک! تم احمد حسن سے کیوں نہیں ملتے؟''

''احمد حسن؟'' اس نے گلاس اُنہیں پکڑاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

''ہاں! میں نے اُس کے چند پروگرام دیکھے ہیں۔ ''محبِ وطن'' آدمی ہے۔ میں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ اس نے اپنی ایک تنظیم بنائی ہے۔ جس میں زیادہ تر نوجوان لوگ ہیں اور ان کا منشور وطن اور اہلِ وطن کے لئے کچھ کرنا ہے۔''

''تنظیم کا تو مجھے علم نہیں ہے بابا! لیکن کچھ صحافتی حلقوں میں اس کے متعلق جو باتیں کی جا رہی ہیں، اس سے اس کی شخصیت متنازعہ ہو گئی ہے۔ بہرحال میں ملوں گا۔ کہیں سے تو شروع کرنا ہے۔ اگر وہ واقعی ملک و قوم سے مخلص ہے تو اس کے ساتھ مل کر کام کر لوں گا۔''

فلک شاہ نے سر ہلایا اور پانی کے دو گھونٹوں سے گولی نگل لی۔

ایبک نے انہیں لیٹنے میں مدد دی اور پھر جھک کر ان کی پیشانی چومی۔

''شب بخیر بابا!''

''میری جان! جیتے رہو، خوش رہو۔'' انہوں نے لیٹے لیٹے ہی اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔

ایبک سیدھا ہوا تو اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

’کتنے انمول ہوتے ہیں یہ رشتے۔ اور دُکھ کی بات یہ ہے کہ جب یہ ہمارے قریب ہوتے ہیں تو ہم ان کی وہ قدر نہیں کرتے، جو ان کا حق ہوتا ہے۔‘

فلک شاہ نے آنکھیں موند لیں تو وہ انہیں ایک بار پھر سونے کی تلقین کرتا ہوا ٹیبل تک آیا اور قلم ہاتھ میں لئے کچھ دیر یوں ہی فلک شاہ کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے کروٹ بدل کر رخ دیوار کی طرف کرلیا تو اس نے میز پر بکھرے کاغذات پر نظر ڈالی اور لکھنے لگا۔

’’قومِ ثمود پر بھی تو ہیبت ناک بادلوں کا عذاب آیا تھا۔‘‘ مجھے اچانک یاد آیا تھا۔

’’ہاں......!‘‘ حورعین جو کسی خیال میں ڈوبی ہوئی تھی، چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ’’دراصل بستی کو ہیبت ناک بادلوں نے گھیرا تو تھا لیکن ان سے نہ بارش برسی تھی، نہ آندھی۔ بلکہ تیسرے دن کی صبح ایک انتہائی زوردار کڑک پیدا ہوئی تھی۔ یہ کڑک اتنی زبردست تھی جیسے زلزلہ۔‘‘

اس کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوا۔ مجھے اسے کچھ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو......

’’اور تم جانتے ہو گے شاعر! کہ قومِ ثمود نے پہاڑوں کو تراش تراش کر خوب صورت گھر بنا رکھے تھے۔ ان پر اللہ کا بہت فضل تھا۔ ان کے کھیت سونا اُگلتے تھے اور درخت پھلوں سے لدے رہتے تھے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ وہ شرک کے مرتکب ہوئے بلکہ انہوں نے اللہ کے نبی حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کر دیا، جو معجزانہ طور پر اللہ کے حکم سے پیدا ہوئی تھی۔ اور پھر ان کے قتل کا منصوبہ بنایا تو جب قیداد، اُونٹنی کو مارنے کے بعد رات کے وقت حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بنا رہا تھا تو زمین تھر تھر کانپتی تھی اور جانتی تھی کہ حضرت صالح علیہ السلام نے جس عذاب کی وعید کی ہے، وہ آکر رہے گا اور وہ آیا۔‘‘

مجھے اب حورعین کی باتوں پر حیرت نہیں ہونا چاہئے تھے اتنے دنوں سے میں اس کی باتیں سن رہا تھا اور میں نے اپنے دل میں اعتراف کرلیا تھا کہ حورعین نے ’’تاریخ‘‘ کو بہت زیادہ جانا اور سمجھا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ ایک عام سی، چھوٹی سی لڑکی اتنا کچھ کیسے جانتی ہے؟ یکایک وہ کھڑی ہوگئی۔

’’مجھے دیر ہوگئی ہے۔ اب چلتی ہوں۔‘‘

’’ہاں..... اچھا۔‘‘ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ’’تم نے یہ نہیں بتایا کہ کیا شیر افگن نے چوہدری فرید کے ساتھ اپنی بیٹی واپس بھیج دی تھی یا فریدہ کے مرنے کے بعد اسے روک لیا تھا؟‘‘

’’نہیں......شیر افگن نے اپنی بیٹی کو نہیں روکا تھا۔‘‘

’کہیں کوئی ڈیل تو نہیں ہوگئی تھی؟‘‘ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

’ڈیل؟‘‘ مریم نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔

’’ہاں! ڈیل۔‘‘ لیکن رابعہ تو صرف بارہ سال کی تھی۔

اس کی نظریں مجھ سے ملیں۔ ان نظروں میں کیا تھا۔

بے بسی، دُکھ، اذیت۔

مجھے لگا، جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ وہ ایک دم مڑی اور تیز تیز چلنے لگی۔

وہ جا رہی تھی۔ میں اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ چپ، ساکت۔ اور میرے اندر کوئی کرلا رہا تھا۔

رابعہ جو چھوٹی بہن تھی۔ جو صرف بارہ سال کی تھی۔

’’نہیں......!‘‘ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور جب درد کی انتہا سے گزر کر میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ جا چکی تھی۔

ایبک نے قلم رکھ دیا۔

'بس، آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔'
ایک گہرا سانس لے کر وہ اُٹھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ کلپ بورڈ سے کاغذ اُتار کر اس نے فائل میں رکھے اور فلک شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ سو گئے تھے۔ اس نے نائٹ بلب جلایا اور بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں میں اریب فاطمہ کا سراپا لہرایا۔
کتنے سارے دن ہو گئے تھے اریب فاطمہ کو دیکھے۔ اُس نے ایک گہری سانس لی۔
'ایسا لگتا ہے، جیسے تمہیں دیکھے ہوئے صدیاں بیت گئی ہوں۔ تم میں ایسا کیا ہے اریب فاطمہ! کہ تم میرے اندر سرایت کرتی جا رہی ہو؟'
ایک لمحہ کو اس کا جی چاہا کہ وہ انجی کو فون کر کے پوچھے کہ اریب فاطمہ آ گئی ہے یا نہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کی نظریں وال کلاک پر پڑیں۔
رات کے تین بج رہے تھے۔ سچ کہا ہے کسی نے، محبت آدمی کے حواس چھین لیتی ہے۔
وہ مسکرایا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

❁○❁

''یہ احمد حسن....... کیا تم اُسے جانتی ہو فاطمہ؟''
سمیرا نے عبایا تہ کرتے ہوئے پوچھا تو اریب فاطمہ نے جو اپنی چادر تہ کر کے بیڈ پر رکھ رہی تھی، ایک دم مڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔
''مجھے ایسا لگا تھا، جیسے احمد حسن نے تمہیں آواز دی ہو۔ تمہارا نام لے کر بلایا ہو۔''
''ہاں۔'' اریب فاطمہ نے ایک گہرا سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے بھی لگا تھا، جیسے اس نے مجھے نام لے کر بلایا ہو۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ احمد حسن کو میرا نام کیسے پتہ چلا؟ یقین کرو سمیرا! میں تو آج سے پہلے کبھی اس سے نہیں ملی۔ بلکہ میں نے تو کبھی اس کا پروگرام بھی آج تک نہیں دیکھا۔ حالانکہ میری سیٹ فیلو اس کی بہت بڑی مداح ہے اور اس نے کئی بار مجھے احمد حسن کا پروگرام دیکھنے کے لئے کہا۔ لیکن مجھے یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ مجھے آج اس کا پروگرام دیکھنا ہے۔''
اس نے سمیرا کی طرف دیکھا، جو اب جھک کر جوتے اُتار رہی تھی۔
''ہو سکتا ہے، ہمیں وہم ہوا ہو۔ لیکن میرے کانوں نے اس کی آواز کو سنا تھا۔ جیسے کوئی بہت دُور سے کہہ رہا ہو۔ اریب فاطمہ!...... اریب فاطمہ!''
وہ جوتے اُتار کر اب دائیں ہاتھ سے آہستہ آہستہ پاؤں کو دبا رہی تھی۔ 'شاید جوتا تنگ تھا اور سمیرا کے پاؤں میں درد ہو رہا ہے۔' اریب فاطمہ نے سوچا اور پھر سمیرا کو دیکھتے ہوئے وہ جیسے ایک دم کوئی بات اچانک یاد آنے پر چونکی۔
''ایک منٹ سمیرا!...... ایک منٹ...... میرا خیال ہے، میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہاں، اپنے گاؤں میں۔ میں نے رکشے میں اسے دیکھا تھا۔ یہ وہی شخص تھا۔ گاؤں والا۔ اور یقیناً یہی نام تھا اس کا...... میں زینب آپا سے ملنے گئی تھی، ان کی ورکشاپ میں۔ وہاں ایک ورکشاپ بنی ہے...... خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے...... زینب آپا بھی وہاں کام کرتی ہیں۔ میں زینب آپا سے مل کر واپس آ رہی تھی کہ میں نے اسے وہاں ورکشاپ کے ایک کمرے سے اسفندیار کے ساتھ باہر آتے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے اسفند نے اسے میرا نام بتایا ہو کہ یہ میری بہن ہے۔ بلکہ ضرور بتایا ہو گا۔ اسفند کو بہت زیادہ اور غیر ضروری باتیں کرنے کی عادت ہے۔ کوئی اس کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھ جائے تو وہ اسے پورے خاندان، بلکہ اس پاس کے پڑوسیوں کی تاریخ بھی بتا دے گا۔'' وہ ذرا سا مسکرائی۔
''اسفند نے گھر میں اماں سے بھی ذکر کیا تھا، سمیرا! مجھے یاد آ رہا ہے۔ شیری بتا رہا تھا مجھے کہ بھائی کی ملاقات احمد حسن

سے ہوئی ہے، جو ٹی وی میں کام کرتے ہیں۔ اس روز جب میں ورکشاپ سے واپس آ رہی تھی تو اس نے بہت غور سے مجھے دیکھا تھا۔ یقیناً اسے میری شکل یاد رہ گئی ہوگی۔ اور سچ بتاؤں، مجھے اُس کا اس طرح دیکھنا بہت برا لگا تھا اُس روز۔ اور میں اسفند کا انتظار کئے بغیر ہی ورکشاپ کے گیٹ سے نکل آئی تھی۔ حالانکہ اسفند نے مجھے آواز بھی دی تھی۔ لیکن مجھے اس طرح کے نظر باز لوگ بہت برے لگتے ہیں۔''

''نہیں۔ وہ اس طرح کا نہیں ہے۔'' سمیرا کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

اریب فاطمہ نے حیرت سے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم نے اس کے پروگرام نہیں دیکھے۔ تم اس کے خیالات نہیں جانتیں۔ وہ بہت اچھی سوچ رکھتا ہے۔''

''مے بی۔ لیکن میں اسے نہیں جانتی تھی، اس لئے برا لگا۔'' اریب فاطمہ، مرینہ کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''الریان'' میں خاموشی تھی۔ یقیناً سب ملک ہاؤس میں ہوں گے۔ آج رات حفصہ کی مہندی تھی۔ سب لڑکیاں اور خواتین ناشتہ کر کے اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئی تھیں۔ حفصہ اور منیبہ صبح سے ہی ملک ہاؤس میں تھیں۔ وہ ناشتے کے بعد مرینہ کے کمرے میں آئی۔ سمیرا پڑھ رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر اس نے کتاب بند کر دی۔

''آ جاؤ فاطمہ!''

''نہیں۔ تم پڑھ رہی ہو۔ ڈسٹرب ہو گی۔''

''بیٹھ جاؤ نا فاطمہ!'' سمیرا نے اصرار کیا تو وہ بیٹھ گئی۔

رات ہی ابا اُسے ''الریان'' چھوڑ کر گئے تھے۔ اماں نے ابا کو کیسے رضامند کیا تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ نہ ہی اس نے پوچھا تھا۔ بس اماں نے اسے صرف اتنا بتایا تھا کہ صبح ابا جلدی نکلیں گے۔ سو وہ رات میں ہی اپنی پیکنگ وغیرہ کر لے۔ رات وہ اتنے لمبے سفر سے بے حد تھک گئی تھی۔ اس لئے ابا کے جانے کے بعد جلدی سو گئی تھی۔ ابا، عبدالرحمٰن شاہ کے اصرار کے باوجود نہیں رُکے تھے اور رات میں ہی اپنے کسی عزیز کے ہاں چلے گئے تھے۔ صبح انہیں واپس چلے جانا تھا۔

'اور پتہ نہیں، وہ واپس چلے بھی گئے ہوں گے اب تک۔' سمیرا کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا تھا۔

اسے حفصہ کے لئے کچھ گفٹ بھی لینا تھا۔ اس نے سوچا، وہ سمیرا سے کہے کہ وہ اس کے ساتھ چلے تو کہیں قریبی مارکیٹ سے وہ کچھ لے لے۔ بلکہ سمیرا سے مشورہ بھی کر لے کہ وہ کیا گفٹ لے۔ لیکن اس سے پہلے ہی سمیرا نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔

''مرینہ وغیرہ سب بزی ہیں، رات کے فنکشن کی تیاری میں۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تم چلو گی میرے ساتھ؟''

''ہاں چلو۔ واپسی پر میں گفٹ بھی لے لوں گی۔ لیکن مجھے یہاں کی مارکیٹوں اور راستوں کا کچھ پتہ نہیں ہے۔''

''مجھے پتہ ہے۔'' سمیرا فوراً کھڑی ہو گئی۔ اریب فاطمہ کو دیکھ کر اچانک اس نے احمد حسن سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب سے مرینہ کے ساتھ احمد حسن سے مل کر آئی تھی، بے حد بے چین تھی۔ ابھی تو مرینہ مصروف تھی اور اس اتوار کو تو بالکل نہیں جا سکے گی۔ تو کیوں نہ وہ آج ہی اریب فاطمہ کے ساتھ جا کر اس سے بات کر لے اور اس سے پوچھ لے کہ اگر وہ احمد رضا ہی ہے تو اپنی شناخت کیوں چھپا رہا تھا۔

اور پھر وہ مرینہ کو بتا کر گھر سے نکل آئی تھیں۔ اریب فاطمہ نے سمیرا سے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ سمیرا نے خود ہی راستے میں اسے بتایا تھا کہ اسے احمد حسن سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں ملنا ہے۔ اور وہ ایک بار پہلے بھی مرینہ کے ساتھ آ چکی ہے۔ ہر سنڈے کو اس کے گھر کچھ طلباء اور نوجوان اکٹھے ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ وہ ملکی مسائل پر بات کرتا ہے۔ اریب فاطمہ نے کام کی تفصیل نہیں پوچھی تھی۔ کالج میں بھی اکثر لڑکیاں، احمد حسن اور اس کے

پروگرام کے متعلق باتیں کرتی تھیں۔
''کیا تمہارے بھائی نے اس کے متعلق، میرا مطلب ہے احمد حسن کے متعلق کوئی اور بات بھی کی تھی؟'' سمیرا نے پوچھا تو اریب فاطمہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اریب فاطمہ کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اپنے عبایا کو پھر سے تہ کر رہی تھی۔
''کوئی اور بات؟'' اریب فاطمہ نے یاد کرنے کی کوشش کی۔
''سوری سمیرا! مجھے بالکل یاد نہیں آرہا۔ لیکن ہمارے گھر میں احمد حسن کا ذکر دو تین بار ہوا ضرور۔''
''کبھی اماں سے بات ہو تو پوچھ لینا۔'' سمیرا نے بظاہر لاپروائی سے کہا تھا۔ لیکن ایک دم وہ بے حد مضطرب سی نظر آنے لگی تھی اور ایک بار پھر اس نے اپنا عبایا اُٹھا لیا اور اب اسے تہ کر رہی تھی۔ اریب فاطمہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اس سے پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ کیا وہ کچھ پریشان ہے کہ دروازہ زور سے کھلا اور مرینہ اندر داخل ہوئی۔
''اللہ...... کس قدر خوب صورت مہندی لگائی ہے انجی نے۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ چلو نا! تم دونوں بھی مہندی لگوا لو۔'' اس نے حسبِ معمول تیز تیز بولتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھا۔
''ہاں! کب واپس آئی ہو تم؟ ...... سمیرا! تمہارا کام ہو گیا؟''
''نہیں۔'' سمیرا نے نفی میں سر ہلایا۔
''اور تمہاری شاپنگ؟'' سمیرا کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔
''نہیں...... ابھی ساری مارکیٹیں نہیں کھلی تھیں۔ کل تو کوئی فنکشن نہیں ہے نا۔ تو کل کر لوں گی شاپنگ۔''
''ٹھیک ہے۔ پھر تو میں بھی چلوں گی ساتھ۔'' مرینہ نے اپنے ہاتھ پر، جس پر مہندی لگی ہوئی تھی، پھونک ماری۔
''پتہ ہے، بابا جان بہت ناراض ہو رہے تھے کہ تم دونوں رکشے میں کیوں گئی ہو۔ ابھی یاسین آ جاتا۔ میں نے کہہ دیا، یہاں قریب ہی جانا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد ہی یاسین بھی آ گیا تھا اور ایک اور ہمدان بھائی بھی۔ انکل فلک ابھی اِدھر ہی ہیں، انکل شیر دل کے گھر۔ تم تھوڑا انتظار کر لیتیں تو......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ بازو پھیلا کر اس کا جائزہ لینے لگی۔
''اچھی ہے نا؟'' اس نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ''دوسرے ہاتھ پر راحت آنٹی سے لگواؤں گی وہ بھی بہت خوبصورت مہندی لگاتی ہیں۔ مما بتا رہی تھیں، عمارہ پھپھو کی شادی پر انہوں نے ہی پھپھو کو مہندی لگائی تھی۔ ارے ہاں.....''
اس نے ایک دم اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔
''پھپھو صبح سے دو تین بار تمہارے متعلق پوچھ چکی ہیں۔''
اریب فاطمہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک آیا ہوا تھا۔ دل ایک دم ہی ایک نظر اسے دیکھنے کو مچلنے لگا تھا۔
''بے وفا لڑکی! وہ سب تو تمہیں اتنا یاد کر رہے تھے اور تم رات سے آئی بیٹھی ہو۔ اور ابھی تک پھپھو اور انجی سے ملنے نہیں گئیں۔''
''وہ...... بس میں جانے ہی لگی تھی۔ لیکن پھر سمیرا کے ساتھ چلی گئی۔''
''خیر! چلو اُٹھو اب۔'' مرینہ کھڑی ہو گئی۔
''اور سمیرا! تم بھی چلو نا پلیز...... مہندی لگوا کر آ جانا۔ تمہارے ان نازک نازک ہاتھوں پر مہندی بہت سجے گی۔''
''نہیں پلیز! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تم لوگ جاؤ۔''
اریب فاطمہ، مرینہ کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ وہ مسلسل سمیرا کے متعلق سوچ رہی تھی۔
''سمیرا کے ساتھ کچھ مسئلہ ضرور ہے۔ وہ بہت اپ سیٹ لگتی ہے۔ کچھ ہے جو اسے پریشان کر رہا ہے۔ آج رات کے فنکشن کے بعد میں ضرور اس سے پوچھوں گی۔''

اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اور مرینہ کے ساتھ ملک ہاؤس کی طرف بڑھ گئی۔

❁○❁

''تو کیا فلک شاہ نہیں جائے گا ہال میں؟......کیا کہہ رہے ہو آبی؟''

عبدالرحمٰن شاہ نے دکھ اور افسوس سے اپنے پاس بیٹھے ایبک کی طرف دیکھا تو ایبک نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے تھپتھپایا، جیسے اُنہیں تسلی دے رہا ہو۔

''یہاں ہوتے ہوئے بھی وہ شادی میں شریک نہیں ہوگا آبی!......ایسا کیوں کر رہا ہے وہ؟ مصطفیٰ اور عثمان کو دکھ ہوگا۔''

''یہی بہتر ہے بابا جان!'' ایبک کا ہاتھ بدستور ان کے بازو پر تھا۔''مصطفیٰ انکل اور عثمان انکل جانتے ہیں۔ بابا نے ان سے بات کر لی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی وجہ سے احسان انکل شادی میں شریک نہ ہوں۔ انہیں صرف بابا کے وہاں موجود ہونے پر اعتراض ہے۔ ہم سے کوئی مسئلہ نہیں ہے اُنہیں۔ میں، انجی، ماما اور جواد بھائی تو شریک ہوں گے۔''

''کیا شانی نے کہا ہے یہ؟'' عبدالرحمٰن شاہ جیسے بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔

''جی بابا جان!'' ایبک نے آہستگی سے کہا۔''مصطفیٰ انکل سے ان کی بات ہوئی تھی اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا ان سے۔ مصطفیٰ انکل بہت پریشان ہیں۔ انہوں نے بابا سے ذکر کیا تھا تو تب ہی بابا نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ ہال میں جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ وہ ایزی محسوس نہیں کریں گے وہاں۔''

لحہ بھر کے لئے وہ خاموش ہو گئے اور سر جھکا لیا۔

''اور عمو؟'' کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھا کر ایبک کی طرف دیکھا۔''کیا وہ مومی کو چھوڑ کر جائے گی؟''

''جی بابا جان! آپ پریشان نہ ہوں۔''

''اور مومی؟......کیا وہ اب شادی ختم ہونے تک وہیں رہے گا، شیر دل کے گھر؟......چلو، وہ فنکشن میں شرکت نہ کرے۔ لیکن یہاں گھر میں تو رہے۔ پھر پتہ نہیں کب......اس سے کہو آ جائے یہاں۔'' اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''جی بابا جان! میں کل لے آؤں گا اُنہیں۔'' ایبک نے انہیں تسلی دی اور تب ہی مرینہ اور اریب فاطمہ نے لاؤنج میں قدم رکھا۔

''السلام علیکم بابا جان!'' مرینہ نے بلند آواز میں سلام کیا تو ایبک نے رُخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مرینہ کے ساتھ اریب فاطمہ کو دیکھ کر ایک دم اُس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا اور اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''آپ کب آئیں؟''

اریب فاطمہ کی نظریں ایبک کی طرف اُٹھیں اور پھر جھک گئیں۔

''کل......رات کو آئی تھی۔''

مرینہ اور عبدالرحمٰن شاہ نے بیک وقت ایبک کے اس طرح غیر ارادی طور پر کھڑے ہو جانے پہ حیرت سے دیکھا خود ایبک نے بھی اپنی اس بے اختیاری کو محسوس کر کے فوراً ہی رخ بدل لیا اور عبدالرحمٰن شاہ کو دیکھنے لگا تھا۔

''بابا جان! میں ذرا انجی سے جواد کی فلائٹ کا ٹائم کنفرم کرلوں، پھر آتا ہوں۔'' عبدالرحمٰن شاہ نے سر ہلایا۔

وہ تیزی سے لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ شعوری کوشش سے اس نے اریب فاطمہ کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جذبے عیاں ہو کر اریب فاطمہ کو بے وقار کر دیں۔ مرینہ شاہ نے حیرت سے اسے باہر جاتے دیکھا تھا۔ اسے یاد آیا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو جب وہ انجی سے مہندی لگوا رہی تھی اور ایبک آیا تھا تو انجی نے بتایا تھا کہ جواد دو بجے پہنچے گا اور یہ کہ ایبک اسے ایئرپورٹ پر یاد سے لینے چلا جائے۔

پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ آگے پھیلایا اور اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ عبدالرحمٰن شاہ اُن کی طرف ہی دیکھ

رہے تھے۔
''تم لوگ کھڑی کیوں ہو؟ آ جاؤ نا۔''
''بابا جان! میری مہندی دیکھیں۔خوب ہے نا؟'' مرینہ نے بازو ان کے سامنے پھیلایا۔
''ہوں۔'' عبدالرحمٰن شاہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
''میں اریب فاطمہ کو بھی لے آئی ہوں، مہندی لگوانے کے لئے۔''
''ہاں بیٹا! یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں، انہیں انجوائے کرنا چاہئے۔ضرور لگواؤ۔اور اریب بیٹا! وہاں گاؤں میں سب ٹھیک ہے نا؟''
''جی بابا جان!'' اریب نے جھکی ہوئی نظریں اُٹھائیں۔
''تمہارے ابا تو رُکے ہی نہیں۔ بہت کہا کہ اب آئے ہیں تو شادی میں شرکت کر کے جائیں۔'' عبدالرحمٰن شاہ مسکرائے۔''ویسے تمہارے ابا بالکل بھی نہیں بدلے۔کافی سال پہلے میں نے اُنہیں مروہ کے سسرال میں دیکھا تھا۔تب بھی وہ ایسے ہی تھے۔یوں ہی چاق و چوبند اور صحت مند۔شاید یہ گاؤں کی خالص فضا کا اثر ہے۔''
'شاید۔لیکن اماں پر گاؤں کی اس خالص فضا کا رتی بھر اثر نہیں ہوا تھا' اُس نے سوچا اور ایک لحہ کے لئے ان کا سراپا اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔
دُبلی پتلی، کمزور سی، چہرے کی رنگت میں زردیاں گھلی رہتیں۔وہ ابا سے بارہ برس چھوٹی تھیں لیکن انہوں نے بہت جلد بڑھاپا اوڑھ لیا تھا۔جبکہ ابا کے سرخ و سپید چہرے سے صحت کی سرخی ٹپکتی تھی۔ان کا مطمئن اور بے فکر انداز بتاتا تھا کہ وہ زندگی کو پورے اطمینان اور خوشی کے ساتھ گزار رہے ہیں۔
اس نے ایک گہری سانس لے کر مرینہ کی طرف دیکھا جو اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔
''چلیں......سب اُدھر ہال میں ہیں۔''
''ہاں، ہاں......بیٹا! جاؤ۔'' عبدالرحمٰن شاہ نے اخبار اُٹھالیا۔
ڈائننگ ہال میں کرسیاں اور ٹیبل ایک دیوار کے ساتھ لگا دی گئی تھیں اور نیچے کارپٹ پر سب بیٹھی تھیں۔انجی، اسماء، عثان کی بیگم کو مہندی لگا رہی تھیں۔راحت، منیبہ کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔جبکہ عاشی دونوں ہاتھوں پر مہندی لگائے اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی۔
''اور اب میری باری ہے راحت چچی! دوسرے ہاتھ پر مجھے آپ سے مہندی لگوانی ہے۔'' مرینہ نے ہال میں قدم رکھتے ہی بازو بلند کیا۔
''ٹھیک ہے۔'' راحت نے مڑ کر اسے دیکھا اور اس کے ساتھ آتی اریب فاطمہ پر ان کی نظر پڑی تو ان کے لبوں سے نکلا۔
''ارے اریب فاطمہ بھی آ گئی ہے۔'' سب نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
انجی بھی اسماء چچی کو مہندی لگانا چھوڑ کر اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی تھی۔''تمہیں میں مہندی لگاؤں گی فاطمہ!''
''نہیں......میں بھلا کیا کروں گی مہندی لگا کر؟''
''ارے یہ سب کیا کریں گی؟ یار! ہماری روایت ہے۔اور مجھے تو بہت پسند ہے ہاتھوں پر مہندی لگانا۔'' منیبہ نے اسے گھورا۔
''لیکن میں نے کبھی نہیں لگائی۔شاید بچپن میں اماں نے ایک دو بار عید پر زبردستی لگا دی تھی۔
''اور اب میں لگاؤں گی زبردستی۔'' انجی مسکرائی۔''یہاں ادھر آ جاؤ۔میرے پاس آ کر بیٹھو۔''
اریب فاطمہ نے مرینہ کی طرف دیکھا جو حفصہ کے پاس بیٹھ چکی تھی اور اب اس کے کندھے پر ٹھوڑی رکھے آہستہ

آہستہ کچھ کہہ رہی تھی۔ حفصہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ مایوں کے زرد کپڑوں میں وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔
اریب فاطمہ، انجی کے پاس آ کر بیٹھ گئی تو مرینہ نے حفصہ کے کندھے سے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔
''ایبک بھائی اِدھر نہیں آئے کیا؟''
''آئے تھے۔ لیکن وہ عادل کی طرف چلے گئے ہیں۔ وہ سب عادل کے پاس ہی ہیں۔''
''اچھا!'' مرینہ کے چہرے پر مایوسی سی نظر آئی۔
''کیا تمہیں ایبک سے کوئی کام تھا؟'' منیبہ کی آنکھوں میں شرارت تھی۔
''وہ تمہاری سہیلی کا مسئلہ...... وہ تمہیں ڈسکس کرنا تھا نا ایبک بھائی سے۔ اور......''
مرینہ نے ایک ناراض سی نظر اُس پر ڈالی اور حفصہ کی طرف دیکھنے لگی تو حفصہ نے مرینہ کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔
''تم مونی کی بات کا ہرگز برا نہ ماننا رینا! آج کل یہ اپنے ڈاکٹر صاحب کے خیالوں میں رہتی ہے۔''
''ہائے...... کیا وہ ڈاکٹر ہیں؟'' اس نے راحت چچی کو مخاطب کیا۔ راحت نے سر ہلایا۔
''کیسے ہیں وہ؟ کیا رینا آپی کی طرح عینک لگاتے ہیں؟''
راحت نے نفی میں سر ہلایا۔
''تو راحت مامی! کیا وہ ڈاکٹر شفیق کی طرح گنجے ہیں؟'' عاشی کی بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔
ڈاکٹر شفیق ان کے فیملی ڈاکٹر تھے اور عاشی اُن سے بہت چڑتی تھی۔ کیونکہ جب کبھی وہ بیمار ہوتی، اس کی منت سماجت اور رونے دھونے کے باوجود وہ اُسے انجکشن لگا دیتے تھے۔
''اگر نہیں بھی ہیں تو ہو جائیں گے گنجے، عاشی گڑیا!'' حفصہ ہنسی۔
''تو پھر میں ان سے بات نہیں کروں گی۔''
اریب فاطمہ بہت دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ جب انجی نے پاس پڑی ٹیبلٹ میں کون رکھی اور ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''میں ذرا ماما کو دیکھ آؤں۔''
''کیا اُن کی طبیعت خراب ہے؟'' اریب فاطمہ نے پوچھا۔
''نہیں۔ بس کچھ تھکن محسوس کر رہی تھیں۔ اس لئے لیٹ گئیں۔''
''میں بھی چلتی ہوں، ان سے مل لوں۔''
''ہاں چلو۔ وہ تمہارا صبح بھی پوچھ رہی تھیں۔'' وہ دونوں باہر نکل کر عمارہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔
''ہم تمہیں بہت مِس کر رہے تھے فاطمہ!'' اس کے ساتھ ساتھ چلتے انجی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''پھر پتہ نہیں کب آنا ہو یہاں۔ لیکن ہم جلد تمہارے گھر آئیں گے۔ میں اور ماما۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟ میرا بھائی بہت اچھا ہے۔''
اریب فاطمہ کی نظریں جھک گئی تھیں اور رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ انجی نے بہت دلچسپی اور محبت سے اسے دیکھا۔
''میرا جی چاہتا ہے، ایبک کی شادی جلد ہو۔ تاکہ ہم...... ماما، بابا اور میں، کسی خوشی کو پوری طرح محسوس کر سکیں۔ پتا ہے اریب! ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، کبھی کسی خوشی کو بھرپور طرح سے محسوس نہیں کیا۔ ہر خوشی کے موقع پر ماما اور بابا کو بابا جان اور ''الریان'' یاد آ جاتے۔ یوں وہ خوشی آنسوؤں میں ڈوب جاتی۔ چاہے وہ عید کا دن ہو یا ایبک کی اور میری کوئی کامیابی۔ میری شادی پر بھی ماما، بابا کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ اِن شاء اللہ اب ایبک کی شادی کو ہم بھرپور طرح سے انجوائے کریں گے۔''
اریب فاطمہ خاموش رہی لیکن اس کی پلکوں کی لرزش اور اس کے لبوں پر بکھری مسکان بتا رہی تھی کہ ایبک کے نام

نے کیسے اندر اودھم مچا دیا تھا۔
انجی نے آہستہ سے عمارہ کے کمرے کا دروازہ دھکیلا۔ وہ دونوں اندر آئیں۔ عمارہ سو رہی تھیں۔
''ماما سو گئیں شاید۔'' انجی نے اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔
''جگانا نہیں پلیز۔ پھر مل لوں گی۔''
انجی نے سر ہلاتے ہوئے اشارے سے اسے آگے آنے کو کہا۔
''عمارہ! پھپھو جاگ جائیں گی۔ ہم باہر چلتے ہیں۔''
''نہیں۔'' انجی مسکرائی۔ ''ماما نہیں جاگیں گی۔ میرا خیال ہے، انہوں نے اپنی میڈیسن لے لی ہیں۔ ان میں نیند ہوتی ہے۔ آؤ...... آ جاؤ نا۔ کچھ دیر بات کرتے ہیں، پھر مجھے تمہیں کچھ دینا بھی تو ہے۔''
''کیا...... کیا دینا ہے؟'' اریب فاطمہ نے حیرت سے پوچھا۔
''آؤ تو بتا دیتی ہوں۔'' انجی دوسرے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ یہ گیسٹ روم تھا اور یہاں دو سنگل بیڈ تھے۔
اریب فاطمہ دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔
''اریب فاطمہ!'' انجی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے محبت سے اسے دیکھا۔ ''جب ایبک نے تمہارے متعلق بتایا تو مجھے یقین تھا کہ وہ جسے ایبک نے چنا ہے، وہ کوئی بہت خاص لڑکی ہو گی۔ اور جب تمہیں دیکھا، تم سے ملے تو ماما، بابا سب نے تمہیں بہت پسند کیا۔ بابا نے کہا، ایبک کے لئے ایسی ہی لڑکی ہونی چاہئے تھی۔ میں تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی تھی۔ تمہارے بارے میں تم سے جاننا چاہتی تھی۔ لیکن تم بہت جلدی چلی گئیں۔''
''ارے!'' وہ ہولے سے ہنسی۔ ''میں ایک بہت معمولی سی لڑکی ہوں انجی آپا! مجھ میں کچھ خاص نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی، ایبک نے مجھے کیوں......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور نظریں جھکا لی تھیں۔
''تم ایبک کی نظروں میں بہت خاص ہو اریب فاطمہ!'' انجی نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔
اریب فاطمہ کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔
''میں بے حد عام سی شکل و صورت کی بے حد عام سی لڑکی ہوں انجی آپا! میرے ابا زمیندار ہیں۔ تھوڑی سی زمین ہے۔ لیکن ہمارا شمار خوش حال لوگوں میں نہیں ہوتا ہے۔ میرے دو بڑے بھائی، ابا کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں۔ دونوں نے زیادہ نہیں پڑھا۔ چھوٹا شہریار پڑھ رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے اور اِن شاء اللہ بن جائے گا۔ بہت لائق ہے، اماں کی طرح۔''
اس نے نظریں اُٹھائیں۔ اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔
''میرے پاس نہ بہت زیادہ ایجوکیشن ہے، نہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ ہو سکتا ہے ابا گریجویشن کے بعد میری تعلیم ختم کر دیں۔ میں شاید آپ کے بھائی کو ڈیزرو نہیں کرتی۔ ان کے لئے تو کوئی بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ......''
''نہیں اریب فاطمہ!'' انجی نے اُس کی بات کاٹی۔ ''تم آبی کو ڈیزرو کرتی ہو یا نہیں، یہ فیصلہ تم کو نہیں، آبی کو کرنا تھا اور اس نے کر لیا۔ ہم بہت جلد تمہارے گھر آئیں گے۔ جب تم اجازت دو۔''
اس نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر چھوڑ دیا اور کھڑی ہو گئی۔ اریب فاطمہ نے دائیں ہاتھ کی پشت سے اپنی بھیگی پلکیں پونچھیں۔ انجی اس کی طرف پشت کئے وارڈروب سے کچھ نکال رہی تھی۔ پھر وہ ایک شاپنگ بیگ نکال کر مڑی اور اریب کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔
''تم بہت پیاری ہو۔ لیکن تمہیں اپنی خوب صورتی کا ادراک نہیں ہے۔ تمہاری آنکھیں اتنی سحر انگیز ہیں کہ بندہ ان کے سحر میں ڈوب جاتا ہے۔ تم نہیں جانتیں، تم بہت انمول ہو ہم سب کے لئے۔''
''انجی آپا! آپ بھی......'' اریب فاطمہ شرمائی۔ ''اپنے بھائی کی طرح باتیں کرتی ہیں۔''
''اچھا......!'' انجی اس کے قریب بیٹھ گئی اور ہاتھ میں پکڑا بیگ گود میں رکھ لیا۔ ''سچ بتاؤ، کیا آبی نے بھی تم سے ایسا

ہی کہا؟''
اریب فاطمہ کی نظریں جھک گئیں۔ پلکیں لرزنے لگیں اور لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔
''خیر، اگر نہیں بھی کہا تو اسے آپی کی طرف سے ہی سمجھ لو۔'' انجی ہولے سے ہنسی۔ ''اور یہ بتاؤ آج رات کیا پہن رہی ہو؟''
''کچھ بھی پہن لوں گی۔ میرے پاس دو تین بہت پیارے ڈریسز پڑے ہیں۔ مروہ آنٹی نے جانے سے پہلے دلوائے تھے۔ بارات اور ولیمہ کے لئے تو ثنا آنٹی نے منیبہ اور مرینہ جیسے ہی بنوائے ہیں تقریباً۔ بابا جان نے کہا تھا انہیں......اور مہندی کا میں نے خود ہی منع کر دیا۔ شیور نہیں تھا نا کہ میں مہندی میں آ بھی پاؤں گی یا نہیں۔''
اس نے تفصیل سے بتایا تو انجی نے شاپنگ بیگ میں سے پنک اور فیروزی امتزاج کا سوٹ باہر نکالا۔
''دیکھو، یہ کیسا ہے؟''
''بہت پیارا، بہت خوب صورت۔ آپ یہ پہن رہی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں...... یہ تم پہنو گی اریب فاطمہ!'' انجی سوٹ تہہ کر کے بیگ میں رکھ رہی تھی۔
''میں......؟'' اریب فاطمہ نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا۔
''ہاں تم......میں ایبک کے ساتھ شاپنگ کے لئے گئی تھی۔ ایبک نے یہ تمہارے لئے خریدا ہے۔''
''لیکن......'' اس نے متذبذب نظروں سے انجی کی طرف دیکھا۔
''انکار مت کرنا بیٹا! دونوں بہن بھائیوں نے بہت شوق سے تمہارے لئے خریدا ہے۔''
انجی اور اریب فاطمہ نے چونک کر سامنے دیکھا۔ عمارہ آنکھیں کھولے مسکرا رہی تھیں۔
''ارے ماما! آپ جاگ گئیں؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' انجی اُٹھ کر ان کے قریب آئی۔
''ہاں......میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' عمارہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔
''سوری پھپھو! ہم نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔''
''بالکل بھی نہیں۔ مجھے اب جاگنا ہی تھا۔ بہت دیر سے سو رہی تھی۔ اِدھر آؤ اریب فاطمہ! میرے پاس آ کر بیٹھو۔ وہاں تمہارے گھر میں سب ٹھیک تھے نا؟''
''جی!'' اریب فاطمہ اُٹھ کر اُن کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ عمارہ نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی چومی۔
''میں روز مونی سے پوچھتی تھی کہ تم کب آؤ گی۔''
''آپ باتیں کریں۔ میں ذرا ہال کا چکر لگا کر آتی ہوں۔'' انجی کھڑی ہو گئی۔
عمارہ نے سر ہلایا اور اریب فاطمہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

❁○❁

رابیل نے تنقیدی نظروں سے خود کو آخری بار آئینے میں دیکھا۔ بلاشبہ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ شاید ''الریان'' کی ساری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت۔ ابھی کچھ دیر پہلے مائرہ نے یہ بات کہی تھی۔
''آج تو ہر نظر میری بیٹی کی طرف اُٹھے گی۔ اللہ تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔''
'آج کا دن میرا ہے۔' اس نے دل میں سوچا۔ 'ماما صحیح کہتی ہیں۔' آج سے پہلے وہ خود کو بھی اتنی خوب صورت نہیں لگی تھی۔
اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم نکال کر خود پر چھڑکا اور پھر بیڈ پر پڑا دوپٹہ اُٹھا کر اسٹائل سے کندھے پر ڈالتے ہوئے اس نے پھر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھا اور دروازہ بند کر کے لاؤنج میں آئی۔
پھر دوسری یا تیسری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس کی نظر نیچے ٹی وی لاؤنج میں موجود ایبک پر پڑی تھی۔ کرتہ شلوار میں ملبوس وہ بہت جچ رہا تھا۔ شاید وہ ابھی ابھی اندر آیا تھا۔ رابیل وہیں سیڑھی پر رُک کر اُسے دیکھنے لگی۔ اگر اُس کے دل نے

ایبک کو پسند کرلیا تھا تو یہ کچھ غلط بھی تو نہیں تھا۔ وہ ایسا تھا کہ اسے پسند کیا جائے۔ اور وہ لڑکی کتنی خوش نصیب ہوگی، جسے ایبک فلک شاہ کی رفاقت ملے گی۔ اور وہ خوش نصیب لڑکی بھلا میرے علاوہ اور کون ہوسکتی ہے؟

'میں رابیل احسان شاہ۔ میں نے آج تک تمہیں اگنور کیا ایبک فلک شاہ! لیکن اب اگنور نہیں کروں گی۔'

اس نے ریلنگ پر ہاتھ رکھا۔ ایبک نے یکدم رخ بدلا تھا۔ اب وہ اس طرح کھڑا تھا کہ رابیل اس کی بائیں سائیڈ دیکھ رہی تھی۔ وہ غالباً کسی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ کون تھا؟ اُس نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھا اور پھر ٹھٹک کر وہیں رُک گئی۔

وہ اریب فاطمہ تھی، جو ہولے ہولے قدم اُٹھاتی ایبک کی طرف آ رہی تھی۔ ایبک بے اختیار ایک قدم آگے بڑھا تھا۔

''اریب فاطمہ!'' رابیل کے کانوں میں ایبک کی مدھم سی آواز آئی تھی۔

رابیل نے ریلنگ کو مضبوطی سے تھاما۔ اب وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اریب فاطمہ کی نظریں جھکی تھیں اور ایبک گرد و پیش سے بے خبر اُسے دیکھ رہا تھا۔

'تو کیا ایبک اور اریب فاطمہ؟' اُس نے ڈوبتے دل سے سوچا۔

'نہیں۔ بھلا ریب فاطمہ میں ایسا کیا ہے کہ ایبک فلک شاہ اُس کے سامنے دل ہار جائے۔ دیہاتی ماحول کی پروردہ لڑکی، جسے مروہ پھپھو نے ازراہِ ہمدردی اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا۔ اور اب تعلیم مکمل کرنے کے لئے یہاں ''الریان'' میں چھوڑ گئی ہیں۔''

اس نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کی اور اس کا ڈوبا ڈوبا دل تیرنے لگا۔ اس نے ذرا سا جھک کر دیکھا۔ وہ دونوں ابھی تک ایسے ہی کھڑے تھے۔ شاید ایبک اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ حفصہ وغیرہ یا عمارہ پھپھو کے متعلق پوچھ رہا ہو۔ اُس نے اندازہ لگایا اور قدم نچلی سیڑھی پر رکھا۔ یہاں سے اریب فاطمہ کا چہرہ بہت واضح نظر آ رہا تھا۔ اُس کی اُٹھتی گرتی پلکوں کا نظارہ واقعی مبہوت کر دینے والا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ چھت پر لگے فانوس کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اس کے لبوں پر شرمیلی سی مسکان سجی تھی۔ 'شاید ایبک نے اس سے کوئی بے حد خوب صورت بات کہی ہے۔'

عین اسی لمحے اریب فاطمہ جھکی تھی۔ شاید اس کے ہاتھ سے کچھ نیچے گرا تھا، جسے وہ اُٹھانا چاہتی تھی۔ اُس کے ریشمی بال ایک دم ہی اس کے کندھوں پر پھسل آئے تھے اور انہوں نے اس کے چہرے کو بھی چھپا لیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بال پیچھے کرنے لگی تھی اور ایبک نے زمین پر گرنے والی چیز اُٹھا کر اسے دے دی۔ شاید ٹشو، رومال یا کچھ اور..... اس کے بالوں نے بھی تک اس کے دائیں کندھے اور دائیں رخسار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے بال بے حد لمبے اور گھنے تھے۔ کمر سے نیچے تک آتے تھے۔ اور آج شاید اس نے اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔

کسی نامعلوم احساس نے اس کی آنکھوں میں نمی پھیلا دی۔ آنسوؤں سے آنکھوں کے آگے دُھند سی چھا گئی تھی۔ دُھندلی آنکھوں سے اُس نے دیکھا، ایبک نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور بہت نرمی اور آہستگی سے اس کے رخسار پر بکھرے بالوں کو چھوا تھا۔ وہ ریلنگ کو مضبوطی سے تھامے کھڑی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں ہے۔ ایبک اس کے بال پیچھے ہٹا رہا تھا۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔ کسی پتھر کے مجسّمے کی طرح۔ اسی وقت اوپر لاؤنج سے عاشی کی آواز آئی تھی۔

''ہمدان بھائی! میں نیچے جا رہی ہوں۔ رابی آپی اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔'' کوشش کے باوجود وہ گردن موڑ کر پیچھے نہ دیکھ سکی۔

ایبک اب صوفے پر بیٹھ چکا تھا اور اریب فاطمہ، مرینہ کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے ریلنگ کو اتنی مضبوطی سے تھام رکھا تھا، جیسے ذرا سی بھی اس کی گرفت کمزور ہوئی تو وہ گر جائے گی۔

عاشی، رابیل کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

''رابی آپی! آپ اس طرح کیوں کھڑی ہیں؟'' اس نے رابیل کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''دیکھیں! میں کیسی لگ رہی ہوں؟ ویسے آپ بھی اچھی لگ رہی ہیں۔''

اس نے جھک کر نیچے دیکھا اور اس کی نظر مرینہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جاتی اریب فاطمہ پر پڑی تو کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''رابی آپی!'' اس کا انداز سرگوشی کا سا تھا۔ ''یہ فاطمہ آپی کا ڈریس دیکھا آپ نے؟ یہ وہی ڈریس ہے جو ایبک بھائی اپنی دوست کو گفٹ دینے کے لئے لائے تھے۔''

اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ''پھر اریب فاطمہ ہی ایبک بھائی کی دوست ہوئیں نا۔ مجھے لگتا ہے، ایبک بھائی، فاطمہ آپی سے ہی شادی کریں گے۔ ہے نا؟''

وہ اپنی عمر سے زیادہ ذہین تھی۔ رابیل نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا، جیسے وہ عاشی کی بات سمجھ ہی نہ پائی ہو۔ عاشی نے سمجھا، شاید اسے اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

''یہ بات پورے ''الریان'' میں صرف مجھے پتہ ہے کہ ایبک بھائی کس سے شادی کرنے والے ہیں۔ میں ایبک بھائی سے پوچھتی ہوں۔''

وہ زور سے ہنسی اور تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگی۔ رابیل نے اُسے سیڑھیوں سے اُترتے اور ایبک کے پاس جاتے دیکھا۔ ایبک مسکرا رہا تھا اور وہ ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ اس نے ریلنگ سے ہاتھ اُٹھایا اور تیزی سے واپس مڑی۔ اور جیسے ہی اس نے لاؤنج میں قدم رکھا، عمر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں آیا۔

''آؤ'' اس نے رابیل کو دیکھ کر حیرت انگیز آواز نکالی۔ ''یہ آپ ہی ہیں نا، رابیل آپی؟'' وہ اس کے قریب آ کر اسے پہچاننے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔ ''میں نے سمجھا شاید آسمان سے کوئی اپسرا اُتر آئی ہے یا پرستان سے کوئی پری آ گئی ہے۔''

وہ عمر کی بات کا جواب دیئے بغیر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کیا۔ عمر نے کندھے اچکائے اور زبیر کو جلدی نیچے آنے کا کہتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

رابیل اندر بیڈ پر اوندھی لیٹی رو رہی تھی۔ ابھی تو اس کے دل میں محبت کی کونپل پھوٹی تھی۔ نئی نویلی کونپل کھلنے سے پہلے ہی......

وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

وہ ایبک فلک شاہ کو پسند نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ ماما اُسے پسند نہیں کرتی تھیں۔

وہ ایبک فلک شاہ کے ''الریان'' آنے پر چڑتی تھی۔ کیونکہ ماما کو اُس کا ''الریان'' آنا برا لگتا تھا۔ عمر اُس کی تعریف کرتا تو اُسے غصہ آتا تھا۔ شاید وہ ایبک فلک شاہ سے نفرت کرتی تھی۔ کیونکہ ماما کو اس سے نفرت تھی۔ لیکن پھر یہ نفرت کی زمین سے محبت کہاں پھوٹ پڑی تھی؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ بالکل بھی نہیں جانتی تھی کہ نفرتوں کے تھوہر پر محبتوں کے گلاب کیسے اُگ آئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا اور وہ ایبک فلک شاہ سے محبت کرنے لگی تھی۔ اُس کے ساتھ کی تمنا کرنے لگی تھی۔ حالانکہ اس کی ایبک سے کبھی بہت زیادہ بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی..... پھر بھی۔

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور تکیے پر مٹھیاں مار رہی تھی۔

'کیوں ہوا ایسا؟

کیوں ایبک نے اریب فاطمہ کو اپنے لئے پسند کیا؟

کیا وہ رابیل احسان شاہ سے زیادہ خوب صورت ہے؟

نہیں..... وہ تو اس کے سامنے بالکل معمولی سی ہے۔

پھر ایک فلک شاہ کو میں کیوں نظر نہیں آئی؟
رابیل احسان شاہ جو ''الریان'' کی ساری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت، زیادہ طرح دار ہے۔'
اس نے بیڈ کی پٹی پر مُکا مارا۔ اب وہ ایک بار پھر رو رہی تھی۔ پہلی پہلی محبت کی ناقدری اُسے تڑپا رہی تھی۔
نیچے شور تھا۔ شاید سب تیار ہو کر لاؤنج میں اکٹھے ہو گئے تھے لیکن وہ رو رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی تھی، جب کمرے کا دروازہ کھلا اور مائرہ نے اندر قدم رکھا اور اسے روتے دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھیں۔
''رابی!......رابی بیٹا! کیا ہوا؟''
اُس نے سر اُٹھا کر مائرہ کو دیکھا۔ رو رو کر اُس کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔ رخساروں پر اب بھی آنسو ٹھہرے ہوئے تھے۔ مائرہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
''ماما!'' رابیل نے مائرہ کی طرف دیکھا۔ اس کا جی چاہا وہ شکوہ کرے کہ یہ سب ان کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہوں نے اسے ایک سے دُور رکھا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک کے سامنے ہوتی اور ایک اُسے نہ دیکھتا۔
''میری جان! بولو نا......میرا دل گھبرانے لگا ہے۔'' مائرہ نے اس کے گیلے رخساروں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھا۔ ''سب نیچے بار بار تمہارا ہی پوچھ رہے ہیں۔ میں نے کہا، وہ تو تیار ہے۔ آ ہی رہی ہو گی۔ ابھی تمہارے بابا جان کا پیغام ملا کہ سب بچیاں آئیں ملک ہاؤس میں۔ تم نہیں پہنچیں تو میں خود دیکھنے آ گئی۔ سب لوگ نکل رہے ہیں۔ اور تم نے کیا حلیہ بنا لیا ہے اپنا؟ آخر کیا ہوا ہے؟ عمر کہہ رہا تھا، تمہارا مزاج خراب ہے۔ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟'' مائرہ نے لمبی بات کی۔
''کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بس میرے سر میں اچانک درد اُٹھا۔ میں نیچے ہی جا رہی تھی تو بہت شدید درد اُٹھا۔ برداشت سے باہر۔ میں واپس کمرے میں آ گئی۔'' وہ نظریں جھکائے سوچ سوچ کر کہہ رہی تھی۔
''تو......'' مائرہ پریشان ہو گئی۔ ''میں تمہارے پاپا سے کہتی ہوں۔ پہلے ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں۔''
''نہیں ماما! آپ لوگ جائیں۔ اب درد نہیں ہے۔ میں آرام کروں گی۔''
''لیکن پہلے تو کبھی اس طرح درد نہیں ہوا تمہیں۔'' مائرہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ ''یہ اچانک درد۔''
''اگر پہلے کبھی درد نہیں ہوا تو ضروری تو نہیں کہ کبھی زندگی بھر نہیں ہو گا۔ شاید رات کو بہت دیر تک جاگتی رہی تھی، اس لئے۔''
مائرہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ ''لگتا ہے میری بیٹی کو نظر لگ گئی ہے۔'' مائرہ نے اُس کے سُتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔
''تم لیٹ جاؤ رابی! میں بابا جان سے کہتی ہوں، وہ تمہیں نظر کا دم کر دیں۔''
''ماما! کوئی نظر نہیں لگی مجھے۔ کسی نے مجھے دیکھا ہی نہیں سوائے آپ کے۔''
''اپنوں کی نظر بھی لگ جاتی ہے۔ میں دیکھتی ہوں، بابا جان چلے تو نہیں گئے؟''
''ماما پلیز! اس وقت کسی کو ڈسٹرب نہ کریں۔ اور آپ جائیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔''
''لیکن بعد میں تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تو؟...... میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ تمہارے پاپا کو بتا کر آتی ہوں۔''
رابیل تنہا رہنا چاہتی تھی۔ ابھی دل پر بہت بوجھ تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی چیخ چیخ کر۔ اپنی اس نومولود محبت پر، جس نے صرف اس کے دل میں جنم لیا تھا۔
''فار گاڈ سیک ماما!...... میں سونا چاہتی ہوں۔ ہم دونوں فنکشن میں شریک نہ ہوئے تو سب ناراض ہوں گے۔''
''مجھے کسی کی ناراضی کی پروا نہیں ہے میری بیٹی!''
''آپ کی بیٹی کوئی مر نہیں رہی ہے۔ آپ جائیں۔'' رابیل نے تلخی سے مائرہ کی بات کاٹی۔ تب ہی دروازہ زور سے کھلا اور منیبہ کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ شاید وہ دوڑتی ہوئی آئی تھی۔
''مائرہ چچی! سب گاڑیاں نکل گئی ہیں۔ احسان انکل نیچے انتظار کر رہے ہیں اور ناراض ہو رہے ہیں۔ جلدی کریں۔''

اس نے رابیل کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہوا تمہیں رابی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' وہ پریشان ہو گئی تھی۔

''ہاں۔ سر درد تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔''

''مونی!......منیبہ!'' نیچے سے کسی نے منیبہ کو آواز دی تھی۔

''تم جاؤ مونی! ہم آ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ جلدی آنا۔'' منیبہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

''ماما! آپ بھی جائیں پلیز۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ سو کر اُٹھوں گی تو فریش رہوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' مائرہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''لیکن تمہارے پاپا پریشان ہو جائیں گے تمہارے اس طرح گھر رہنے پر۔ اگر تم کچھ بہتر محسوس کر رہی ہو تو ہم کچھ دیر رُک جاتے ہیں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر میک اپ کر لو۔''

''ماما! میرا موڈ نہیں ہے اب جانے کا۔ میں صرف سونا چاہتی ہوں۔ پاپا ہارن دے رہے ہیں۔ پلیز۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے تمہاری فکر رہے گی۔ میں پھر رسم کے بعد جلدی آ جاؤں گی۔''

رابیل نے کچھ نہیں کہا۔ وہ لیٹ گئی تھی۔ مائرہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔

''اگر کوئی مسئلہ ہو تو تمہارے پاپا کے پاس فون ہے۔ اُنہیں فون کر دینا۔ نیچے سب ملازم بھی ہیں۔''

پھر ایک دم کسی خیال سے اُن کی آنکھیں چمکیں۔

''پھر بھی دل گھبرائے تو ''ملک ہاؤس'' میں موی ہو گا نا۔ وہ تو ہال میں نہیں جا رہا۔ اُدھر چلی جانا۔''

رابیل جانتی تھی کہ فلک شاہ، کرنل شیر دل کے گھر گئے ہوئے ہیں اور اب شادی تک اُدھر ہی رہنا ہے۔ لیکن اس نے مائرہ سے کچھ نہیں کہا۔ اس کا بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر سے بہت سارے آنسو اس کے اندر اکٹھے ہو رہے تھے۔ وہ رونا چاہتی تھی۔

زندگی میں اس نے جو چاہا تھا، اسے ملا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اس کی ہر خواہش پوری ہوئی تھی۔ لیکن اب دل نے ایک فلک شاہ کی خواہش کی تھی اور ایک شاہ اس سے پہلے ہی کسی اور کا ہو چکا تھا۔

اس کے آنسو بہت آہستگی سے اس کے رخسار پر سے پھسلتے ہوئے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

'ایک فلک شاہ نے اریب فاطمہ کو چنا اس لئے کہ میں اس کے سامنے نہ تھی۔ وہ جب جب آیا، میں نے اسے اگنور کیا۔ اگر میں اُسے یوں اگنور نہ کرتی تو وہ کبھی بھی اریب فاطمہ کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔'

دلِ خوش فہم نے زخموں پر مرہم رکھا تو وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

'اب بھی اگر میں اسے توجہ دوں تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مجھ سے......اور یہ ناممکن تو نہیں ہے۔ اگر وہ اریب فاطمہ کا اور میرا مقابلہ کرے تو ہر لحاظ سے میرا ہی پلڑا بھاری رہے گا۔'

اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں کہاں سے پڑھا ہوا نپولین کا جملہ اُسے یاد آ گیا تھا۔

If you have a leaver, use the right point and time. You can lift the world.

'اور یہ تو اب مجھ پر ہے کہ میں کیسے اپنی محبت حاصل کرتی ہوں۔'

وہ اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔ روئی روئی آنکھیں، دہکتے رخسار......وہ اس وقت بھی قیامت لگ رہی تھی۔ اریب فاطمہ اس کے سامنے تھی ہی کیا۔ گندمی رنگت کی عام سی شکل وصورت کی لڑکی۔ اپنی آنکھوں کی وجہ سے اٹریکٹو لگتی تھی بس۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر اپنے موی ہاتھوں کو دیکھا۔ سرخ سفید رنگت، تیکھے نقوش، دلکش سراپا۔

اصل چیز تو Right point, Right time تھا۔

اور وہ یہ کر سکتی تھی۔

بارات پر وہ مشہور پارلر سے تیار ہو کر جائے گی تو پھر اس کے سامنے کون ٹِک سکے گا؟ اُس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس سے ہٹ گئی۔

بہت زیادہ رونے سے سچ مچ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور گولی نکال کر پانی سے نگلی اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ 'تھوڑی دیر سونے سے فریش ہو جاؤں گی۔ جب تک یہ لوگ واپس آئیں گے، میں جاگ چکی ہوں گی۔ اور آج میں ادھر ہی رہوں گی حفصہ، انجی اور منیبہ کے ساتھ۔ انجی سے اور عمارہ پھپھو سے خوب گپ شپ لگاؤں گی۔ اور ایک...... کیا پتہ وہ وہاں ہو یا کرنل شیر دل کی طرف اپنے بابا کے پاس۔

اور پھر نہ جانے کب ایک کو سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو بارہ بج رہے تھے۔ نیچے خاموشی تھی۔ شاید ابھی تک وہ لوگ واپس نہیں آئے تھے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر ابھی تک بھاری ہو رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے سوچا، پھر سو جائے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اُٹھ کر واش روم کی طرف جا رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح منہ دھو کر اُس نے نیند بھگانے کی کوشش کی اور پھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش کرنے لگی۔ تب ہی دروازہ زور سے کھلا اور مائرہ بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں۔

''تم ٹھیک ہو...... ٹھیک ہو نا رابی؟...... تمہیں کچھ ہوا تو نہیں؟ کچھ کہا تو نہیں کسی نے؟''

''میں ٹھیک ہوں ماما!'' رابیل برش ڈریسنگ پر رکھ کر مڑی۔ ''اور مجھے کیا ہونا تھا؟ کسی نے کیا کہنا تھا مجھے؟''

''اوہ تھینک گاڈ...... شکر ہے میں پہنچ گئی۔ اگر ذرا سی بھی لیٹ ہو جاتی تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔''

''کیا ہو جاتا ماما؟'' رابیل نے حیرت سے اسے دیکھا۔ تب ہی سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور دروازہ کھول کر احسان شاہ اندر داخل ہوئے۔ ان کی پہلی نظر مائرہ پر پڑی تھی۔

''تم......'' انہوں نے مائرہ کو مخاطب کیا، جو مڑ کر احسان شاہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ''تم کس کے ساتھ آئی ہو؟ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ میں مصطفیٰ بھائی کو بتا کر آتا ہوں تو تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

''میں مسز صدیق کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ کھانا کھا چکی تھیں اور گھر آ رہی تھیں۔ میرا دل یکدم بہت گھبرانے لگا تھا۔ میں نے سوچا، کہیں رابیل کی طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو زیادہ۔ آپ نے تو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ مسز صدیق اسی بلاک میں تو رہتی ہیں۔''

''کم از کم مجھے بتا کر تو آتیں۔ میں......''

''شکر ہے، میں آ گئی احسان شاہ! ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔'' مائرہ نے احسان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''کیا ہو جاتا؟'' احسان شاہ گھبرائے۔

''میں آئی تو اندرونی دروازہ کھلا تھا۔ اندر سے بند نہیں تھا۔ گیٹ پر خان تھا۔ شاید ملازم لڑکی دروازہ کھول کر باہر گئی ہو اپنے کوارٹر میں کسی کام سے۔'' انہوں نے ذرا توقف سے کہا۔

''حالانکہ ثنا بھابی نے اُسے تاکید کی تھی کہ وہ ان کے آنے تک ادھر ہی رہے۔ ٹی وی دیکھتی رہے یا لاؤنج میں ہی سو جائے، نیند آئے تو۔''

''تو آخر ہوا کیا؟''

''میں نے اُسے دیکھا۔ وہ اوپر چڑھ رہا تھا سیڑھیوں پر۔ دروازہ کھلنے پر اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر ایک دم پلٹا اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر دوڑتا ہوا میرے پاس سے گزر کر دروازہ کھول کر لان کی طرف بھاگ گیا۔

''کون تھا وہ؟...... تم نے خان کو آواز کیوں نہ دی؟''

''وہ مومی تھا، احسان شاہ! مومی...... لان میں سے ملک ہاؤس میں چلا گیا'' مائرہ نے احسان شاہ کا بازو جھنجوڑا۔

''ماما! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ وہ بھلا یہاں کیسے آ سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں آ سکتا وہ یہاں؟...... مجھ سے انتقام لینا چاہتا تھا وہ۔ اور جب دل میں انتقام کی آگ لگی ہو تو کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ عقل رخصت ہو جاتی ہے۔ بھول گیا ہو گا وہ کہ ''الریان'' میں قدم رکھے گا تو عمارہ کو طلاق ہو جائے گی۔ ملازموں سے پتہ چل گیا ہو گا اُسے کہ رابی اکیلی ہے گھر میں۔ وہ میری بیٹی کو برباد کرنا چاہتا تھا احسان! میری بیٹی کو۔''

احسان شاہ دل پر ہاتھ رکھے خالی خالی آنکھوں سے مائرہ کو دیکھ رہے تھے۔ مائرہ جو کچھ کہہ رہی تھیں، وہ نا قابل یقین تھا۔

''فلک شاہ! ایسا ہو سکتا ہے؟ ایسی عمر میں وہ ایسی بات...... جبکہ اس کی اپنی بیٹی بھی ہے اور جبکہ عمارہ......''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی مائرہ!''

''غلط فہمی؟'' مائرہ چیخیں۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں، میں پاگل ہوں؟ میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ میں جھوٹ بولوں گی بھلا؟ ابھی بابا جان کو فون کریں، اُنہیں بتائیں سب۔ وہ جو ملک ہاؤس کو عمارہ کے لئے ''الریان'' بنا رہے تھے تو ''الریان'' کے دروازے کھل گئے عمارہ کے لئے۔ نکالیں مومی کو دھکے دے کر اور.....''

''ماما!'' رابیل ایک قدم آگے بڑھ کر اُن کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ احسان شاہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

''آپ نے کہا، انکل فلک شاہ یہاں آئے تھے۔ آپ نے اُنہیں بھاگ کر جاتے دیکھا؟''

''ہاں دیکھا...... دیکھا میں نے۔'' وہ اسی طرح بلند آواز میں چیخی تھیں۔

''مجھے نہیں پتہ، آپ کیوں جھوٹ بول رہی ہیں؟ لیکن انکل فلک شاہ، کرنل شیر دل کے گھر میں ہیں کئی دن سے۔ اور اگر وہ یہاں ہوتے بھی تو وہ نہیں آ سکتے تھے یہاں۔ اس لئے نہیں کہ ان کے آنے سے عمارہ پھپھو کو طلاق ہو جاتی۔ بلکہ اس لئے کہ وہ...... وہ تو اپنے قدموں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔ وہ تو بہت سالوں سے وہیل چیئر پر ہیں۔ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے وہ۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم، مومی؟...... وہیل چیئر پر؟'' احسان کے لبوں سے نکلا تھا۔

''جی پاپا! کئی سال پہلے ان کی ٹانگیں کسی حادثے میں کچلی گئی تھیں شاید۔ تفصیل مجھے معلوم نہیں۔''

مائرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی رابیل کو اور کبھی احسان شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔ کچھ غلط ہو گیا تھا۔ نہیں، بلکہ بہت کچھ غلط ہو گیا تھا۔ بازی اُلٹ گئی تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اُنہیں پہلے پتہ کیوں نہیں چلا کہ مومی...... لیکن کیسے پتہ چلتا؟ گھر کا کوئی فرد بھی ان کے اور احسان شاہ کے سامنے فلک شاہ کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ وہ کہاں پسند کرتے تھے کہ کوئی ان کے سامنے ان کا ذکر کرے۔

ہال میں بابا جان کے ساتھ عمارہ، ایبک اور انجی کو دیکھ کر اس کا خون کھول رہا تھا۔ اگر مومی بھی وہاں ہوتا تو وہ برداشت ہی نہ کر پاتیں۔ اور بابا جان مصطفیٰ، مرتضیٰ، احسان اور عثمان کو ساتھ کھڑے دیکھ کر کہہ رہے تھے۔

''اللہ پر یقین رکھو بیٹا! ایک دن مومی بھی ان کے ساتھ ہو گا۔ شانی کا دل ضرور صاف ہو گا۔''

'کبھی نہیں۔ میری زندگی میں نہیں بابا جان!...... ایسا کبھی نہیں ہو گا۔' انہوں نے سوچا تھا۔ لیکن جب وہ الریان میں داخل ہوئی تھیں تو پہلے سے ان کے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔ وہ صرف رابیل کے خیال سے ہی مسز صدیق کے ساتھ آ گئی تھیں۔

انہوں نے الریان میں داخل ہونے کے بعد ملازم لڑکی شمی کو اندرونی گیٹ سے باہر آتے اور اپنے کوارٹر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ عموماً سب ملازم آنے جانے کے لئے کچن کا پہلا دروازہ ہی استعمال کرتے تھے لیکن اس وقت وہ شاید ''الریان'' کی سجاوٹ دیکھنے کے خیال سے اندرونی گیٹ سے نکلی تھی۔ الریان میں آج خوب صورت لائٹنگ کی گئی تھی ابھی انہوں نے لونگ روم میں قدم رکھا ہی تھا کہ باہر گیٹ پر احسان شاہ کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ یقیناً اُنہیں وہاں نہ پا کر احسان شاہ پریشان ہو کر نکل آئے تھے اور مائرہ کے شاطر ذہن نے وہاں کھڑے کھڑے سب پلاننگ کر لی تھی۔ لیکن ان کی پلاننگ غلط ہو گئی تھی۔ اس پلاٹ میں بہت سے جھول تھے۔ بہت سی خامیاں تھیں۔ لیکن انہوں نے یہ ضرور صحیح کہا تھا کہ جب دل انتقام کی آگ میں جل رہا ہو تو کچھ نہیں سوجھتا۔ عقل رخصت ہو جاتی ہے۔ اگر فلک شاہ معذور نہ بھی

وتا تو بھی اس کا جھوٹ پکڑا جانا تھا۔ سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔ انہوں نے فلک شاہ سے کہا تھا کہ وہ کبھی کسی سے نظر نہیں ملا سکیں گے۔ لیکن اس وقت تو خود ان کی نظریں اُٹھ نہیں رہی تھیں۔ انہوں نے بمشکل نظریں اٹھائیں اور تھوک نگلتے ہوئے زردہ آواز میں کہا۔

''ہاں، ہوسکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ نیچے لاؤنج میں صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ وہ کوئی اور ہوگا۔ مجھے لگا کہ وہ موی تھا۔ سائیڈ سے بالکل موی جیسا لگا تھا مجھے۔''

انہوں نے احسان شاہ کی طرف دیکھا جو بہت سرد نگاہوں سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔

''آپ اس طرح کیوں مجھے دیکھ رہے ہیں؟'' وہ یکدم بھڑکی تھیں۔ ''کیا مجھے غلط فہمی نہیں ہوسکتی؟ وہ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔ ملک ہاؤس کی طرف سے دیوار پھلانگ کر آیا ہو......کوئی چور، ڈاکو......''

احسان شاہ ان کی پوری بات سنے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ مائرہ ان کے پیچھے لپکیں

''احسان!......احسان! پلیز میری بات سنیں۔''

رابیل کچھ دیر یوں ہی کھڑی کھلے دروازے کو دیکھتی رہی، پھر دروازہ بند کر کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

'ماما نے جھوٹ کیوں بولا؟......اگر وہ جھوٹ نہیں تھا تو کیا سچ مچ کوئی چور......' ایک لمحہ کے لئے اس کے ذہن میں خیال آیا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے وہ ایبک کے متعلق سوچنے لگی تھی۔

۞○۞

'اور کیا پتہ وہ لڑکیاں پھر دوبارہ آئیں گی یا نہیں؟' احمد رضا نے سوچا اور بے چینی سے کروٹ بدلی۔ وہ بہت دیر سے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔

بلاشبہ وہ لڑکی اریب فاطمہ تھی۔

اریب فاطمہ، اسفندیار کی بہن۔

اسفندیار جو ضلع رحیم یار خان کے چک نمبر 151 میں رہتا تھا اور جو ابو کی کسی سیکنڈ کزن کا بیٹا تھا۔

اور اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اریب فاطمہ ہی تھی۔ اس نے اریب فاطمہ کو دوبارہ دیکھا تھا۔ ایک بار جب وہ آفس میں رچی کے ساتھ بیٹھا تھا اور وہ اسفندیار کے ساتھ احاطے میں داخل ہوئی تھی۔ چند دن بعد دوبارہ جب وہ احاطے میں کھڑا رچی کا انتظار کر رہا تھا تو وہ اسفند کے ساتھ واپس جا رہی تھی۔ شاید وہ اپنی اسی سہیلی سے پھر ملنے آئی تھی۔ وہ سے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے دونوں بار ہی سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی، جس پر ننھے ننھے شیشے نفیس کڑھائی کے درمیان چمکتے تھے اور......اس کی آنکھیں بالکل سمیرا کی آنکھوں جیسی تھیں۔

ہاں اُس کی اس سیکنڈ کزن کی بیٹی کی آنکھیں بالکل سمیرا کی آنکھوں جیسی تھیں۔ وہ حیران ہوا اور ایک دم اُٹھ بیٹھا۔

'لیکن وہ یہاں مجھ سے ملنے کیوں آئی تھی؟

وہاں بھی تو......

لیکن اسفندیار کہتا تھا، وہ کسی احمد حسن کے پروگرام نہیں دیکھتا۔

تو پھر کہیں رچی......رچی جو شیخ عبدالعزیز تھا۔ کہیں اُس نے تو نہیں بھیجا اُسے؟

لیکن وہ عبایا والی لڑکی......کیا یہ وہی لڑکی تھی؟ کے۔ای والی۔ وہ جو اس عینک والی لڑکی کے ساتھ آئی تھی یا کوئی اور تھی؟ اُس نے لاشعوری طور پر پوری شام اس کے فون کا انتظار کیا تھا اور دو بار ثمینہ حیدر سے پوچھا تھا کہ ان لڑکیوں کا فون تو نہیں آیا؟ اور اسے تاکید کی تھی کہ انہیں کہہ دے کہ وہ کل صبح ان سے مل سکتا ہے۔ وہ سارا دن گھر پر ہی ہوگا۔ لیکن انہوں نے پھر فون نہیں کیا تھا۔

'اور اگر انہوں نے فون نہ کیا اور اگر وہ پھر ملنے نہ آئیں تو؟'

وہ بے چین ہوا۔
وہ آواز جو مدھم تھی، جو سنی ہوئی لگتی تھی۔ اور کیا آنکھوں کی طرح آواز بھی ملتی ہے؟
یا پھر، وہ دوسری لڑکی کی آواز تھی؟
دوسری لڑکی، جس نے نقاب سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا۔
اس کے پاس اسفندیار کا نمبر تھا۔ اس نے سوچا، وہ اسفندیار سے فون کر کے پوچھ لے کہ اس کی بہن یہاں کیوں آئی تھی۔ لیکن پھر اسے اپنا یہ خیال انتہائی احمقانہ اور فضول سا لگا۔
ہاں کچھ دنوں تک فون کر کے وہ احمد رضا کے متعلق پوچھ سکتا ہے کہ انہیں اس کے متعلق کچھ علم ہوا کہ نہیں......
اسفندیار نے بتایا تھا کہ اماں نے کہا ہے کہ رحیم یار خان سے جب کوئی عزیز ملنے آیا تو وہ ضرور احمد رضا کے متعلق پوچھیں گی کہ وہ لوگ کہاں ہیں آج کل۔
'ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ اور اسفندیار اتنا بولتا ہے کہ وہ خود ہی بتا دے گا کہ اریب فاطمہ......
اور رچی کی آنکھوں میں اریب فاطمہ کے لئے جو غلاظت تھی، ہوس تھی۔ میں کہہ دوں گا اسفندیار کو کہ وہ اریب فاطمہ کو رچی سے دُور رکھے۔
لیکن میں...... بھلا وہ میری بات سنے گا؟...... وہ تو شیخ عبدالعزیز کے ہاتھ عقیدت سے چومتا ہے۔ اسے گاؤں والوں کے لئے نجات دہندہ کہتا ہے۔ شیخ صاحب ہمارے محسن ہیں۔ ہم سب گاؤں والوں کے۔
اس نے ہولے سے اپنا ہاتھ بیڈ کی پٹی پر مارا۔ 'مجھے کیا؟...... میں آخر اس لڑکی کے متعلق اتنا کیوں سوچ رہا ہوں؟ شاید اس لئے کہ وہ ابو کی کسی سیکنڈ کزن کی بیٹی ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ وہ رچی جیسے شخص کے لئے کام کرے۔'
رچی کا خیال آتے ہی اسے ان پیپرز کا خیال آیا اور رچی نے آج بھجوائے تھے اور ابھی اسے انہیں دیکھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، کہیں کسی ٹیبل پر کوئی فائل نہیں پڑی تھی۔ ثمینہ بہت ذمہ دار لڑکی تھی۔ یقیناً اس نے انہیں سنبھال کر ہی رکھا ہوگا۔ اس نے سائیڈ ٹیبلز کی دراز چیک کیں اور پھر اُٹھ کر دیوار گیر الماری کو کھولا جس کی چابیاں لاک کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی ایک فائل پڑی تھی۔ اس نے فائل کھولی۔ اس میں یقیناً وہی پیپرز تھے جو آج رچی نے بھجوائے تھے۔ وہ فائل لے کر بیڈ پر آیا اور کاغذات کا مطالعہ کرنے لگا۔
اسلامی نظامِ تعلیم۔
اسلامی معاشرے کی گھٹن۔
مدرسہ کا نظام۔
اسلامی ممالک میں شراب نوشی عام کرنا۔
خواتین کو اعلیٰ جابز مہیا کرنا۔
اس نے چند ٹاپک پڑھے اور گھبرا کر فائل بند کر دی۔
'یہ کیا ہے؟...... یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ کیا کرنے لگا ہوں؟...... مجھے ان موضوعات پر بات کرنا اور لکھنا ہے جو...... نہیں۔ اسلام ایسا دین نہیں ہے۔'
''اسلام تو دینِ حیات ہے۔'' بچپن میں مولوی صاحب کی پڑھائی ہوئی باتیں ذہن میں گونج رہی تھیں۔
'یہ رچی کیا چاہتا ہے؟ یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ انہیں مسلمانوں سے کیا دشمنی ہے؟ وہ پاکستان کے اتنے خلاف کیوں ہیں؟'
رچی نام کا مسلمان ہے۔ وہ جانتا تھا۔
الوینا کون ہے؟ اس کی کوئی ایجنٹ، جس کا کام اُس جیسے لوگوں کو پھانسنا ہے۔ اور وہ اسمٰعیل جس نے نبوت کا دعویٰ کیا

تھا، وہ......

''مسلمانوں میں انتشار پھیلا دو۔''

اس نے امریکہ میں ایک باورچی کے گھر کسی کو کہتے سنا تھا۔

''فرقہ وارانہ فساد۔ شکوک وشبہات پیدا کرو۔''

شاید اسمٰعیل بھی اسی سلسلے کی کوئی کڑی تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ اس کے لئے کام کر رہے ہیں اور وہ بھی ان میں سے ایک ہوں۔ رات کے اس پہر وہ مضطرب سا ہو کر بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ چین تو کہیں نہیں تھا۔

وہ بہت سارے لوگوں کا پسندیدہ بن چکا تھا۔ نوجوان اُس کی بات سنتے تھے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور وہ.....وہ کیا کرتا تھا؟ وہ بھی ان لوگوں میں سے ایک تھا جو اس ملک کی جڑیں کھودنے والے تھے اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔

یہ بات اسے اب سمجھ میں آئی تھی۔

اور وہ ان کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا اور کہیں کوئی راہِ نجات نہیں تھی۔ وہ قصوروار تھا۔ اس سے غلطی ہوئی تھی۔

وہ اسمٰعیل کذاب کی باتوں کے سحر میں آ گیا تھا یا لالچ نے اس کے دل و دماغ کے دروازے بند کر دیئے تھے۔

کچھ تو تھا، جو وہ اس جھوٹے نبی کے جال میں پھنس کر یہاں تک آ پہنچا تھا کہ اسے اب اپنے ہی ملک کے خلاف کام کرنا تھا۔ اور یہ بات رچی نے صاف صاف کہہ دی۔ اتنے سالوں سے جو چھپا تھا، وہ واضح ہو گیا تھا۔ اسے آگے چل کر کیا کرنا تھا، وہ نہیں جانتا تھا۔ بظاہر ابھی اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا تو.....

وہ اندرونی گیٹ کھول کر لان میں آ گیا۔

چوکیدار گیٹ کے پاس اپنی چارپائی پر سویا ہوا تھا۔ اس کی گن اس کے پاس پڑی ہوئی تھی جو چاند کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھی۔ رات میں چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ اس نے لان میں رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور کتنی ہی دیر مبہوت سا اسے دیکھتا رہا۔

چوکیدار نے کروٹ بدلی۔ چارپائی کڑکڑائی تو وہ چونکا۔ اب چوکیدار اس کی طرف کروٹ کئے سو رہا تھا۔ شاید تھوڑی دیر کے لئے کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹا ہو۔ ابھی کچھ دیر میں اُٹھ کر بیٹھ جائے گا۔

'اگر میں رات کے اس پہر چپکے سے اپنا کچھ ضروری سامان اُٹھا کر چلا جاؤں کہیں اور کسی دُور دراز گاؤں میں رہنے لگوں تو رچی کو کیا خبر ہوگی کہ میں کہاں ہوں۔ لیکن رات کے اس پہر ہی کیوں؟ میں دن کے کسی وقت بھی جا سکتا ہوں۔ مجھ پر کہیں آنے جانے کی پابندی تو نہیں ہے نا......لیکن میں کہاں جاؤں گا؟ کیا کروں گا؟'

اسے اچانک وہ دن یاد آ گئے جو اس نے ان کالے لوگوں کے علاقے میں اس بدبودار فلیٹ میں گزارے تھے۔ ایک جھرجھری سی لے کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگا۔ اس کے پاؤں کے نیچے کوئی چیز آئی تھی۔ شاید کوئی پلاسٹک کا ٹکڑا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ پلاسٹک کا گلاس تھا۔ شاید چوکیدار کا ہو۔ وہ سیدھا ہوا تو اس نے چوکیدار کو اُٹھ کر بیٹھتے دیکھا۔

''صاحب آپ؟'' وہ گن ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو گیا۔

''ہاں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اندر پتہ نہیں کیوں دل گھبرا رہا تھا۔''

وہ واپسی کے لئے مڑا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اندرونی دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔

چوکیدار اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور کیا خبر یہ بھی رچی کا آدمی ہو۔ اس گھر میں جتنے بھی ملازم تھے، ان میں سے کسی ایک کو بھی اس نے ملازم نہیں رکھا تھا۔ یہ سب پہلے سے موجود تھے۔ اُس کے اس گھر میں آنے سے پہلے۔

''صاحب! اگر آپ کی طبیعت خراب ہو تو آپ کو ہسپتال لے چلوں؟''

اس کے مڑ کر دیکھنے پر چوکیدار نے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

اپنے بیڈ روم میں آ کر اس نے کلاک پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف تین بجے تھے اور صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔

اس نے ٹیبل سے فائل اٹھائی اور ایک بار پھر ان کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ کاغذات کے مطابق پوائنٹ نوٹ کر رہا تھا۔

'شاید واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔' اس نے خود سے کہا اور اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی۔ لیکن وہ مسلسل کام کرتا رہا۔ اس نے اگلے تین چار پروگراموں کا خاکہ تیار کر لیا تھا اور وہ سوالات بھی تیار کر لئے تھے جو اُسے طیب خان سے کرنے تھے۔ طیب خان کے بعد اگلے پروگرام میں اُس کے مہمان ڈاکٹر جہاں زیب تھے۔ وہ اس شخص کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ رچی نے اس کے متعلق صرف اتنا لکھا تھا کہ یہ ایک ماڈرن اسکالر ہیں۔ سوال نامہ رچی نے بھیج دیا تھا۔ باقی کا پروگرام اس نے اپنی ذہانت سے ہینڈل کرنا ہوتا تھا اور وہ بہت سے کامیاب پروگرام کر چکا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کہاں کیا کہنا ہے۔

ان پیپرز کو ایک طرف رکھ کر اُس نے وہ آرٹیکلز دیکھے، جو اُسے لکھے ہوئے ملتے تھے اور اسے اپنے نام سے چھپوانے ہوتے تھے۔ وہ جانتا تھا ان موضوعات پر وہ اس سے کہیں بہتر اور اچھا لکھ سکتا ہے۔ لیکن اسے اس کی اجازت نہیں تھی۔

اس نے تمام کاغذات فائل میں لگائے اور کرسی کی پشت پر سر رکھتے ہوئے ٹانگیں پھیلا کر آنکھیں بند کر لیں۔ صبح کی اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ مسجد نزدیک ہی تھی اور بیڈ روم کی کھلی کھڑکی سے اذان کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ وہ آنکھیں موندے اذان سنتا رہا۔

سمن آباد والے گھر میں بھی اذان کی آواز اس کے کمرے میں سنائی دیتی تھی۔ کئی بار اذان سن کر وہ پھر سو جاتا تھا تو سمیرا آکر اسے جگاتی تھی۔

''رضی! اُٹھ بھی جاؤ اب۔ میں جانتی ہوں تم جاگ رہے ہو۔ ابو نیچے انتظار کر رہے ہیں۔''

کبھی وہ اُٹھ جاتا اور کبھی سمیرا کے جانے کے بعد پھر سو جاتا تھا۔ وہ نماز کا اس طرح پابند نہیں ہو سکا تھا، جس طرح سمیرا، ابو اور امی تھے۔ لیکن پھر بھی جب وقت گزر جاتا تو اسے پچھتاوا ہوتا تھا اور وہ دل ہی دل میں عہد کرتا تھا کہ وہ کل ضرور نماز پڑھے گا۔

لیکن.......

اس نے آنکھیں کھولیں اور سوچا، وہ آج سالوں بعد فجر کی نماز پڑھے۔ لیکن پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ تقریباً پوری رات جاگتا رہا تھا۔ اب اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ پھر وہ یوں ہی کرسی کی پشت پر سر رکھے رکھے سو گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو سات بج رہے تھے۔ وہ اُٹھ کر لاؤنج میں آیا اور ریموٹ اُٹھا کر ٹی وی آن کیا۔

''چائے لاؤں صاحب؟'' گلزار (ملازم لڑکے) نے اندر آ کر پوچھا۔

''ہاں لے آؤ۔ مس ثمینہ آ گئیں؟''

''نہیں۔'' ناشتہ ثمینہ حیدر ہی کی نگرانی میں تیار کرواتی تھیں۔

'یہ بھی کیا زندگی ہے۔' اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور کیا کبھی احمد رضا نے اس زندگی کا تصور کیا تھا؟

سمیرا ناشتہ بناتی جاتی تھی اور کچن سے سر باہر نکال کر اسے آوازیں دیتی رہتی تھی۔ ''رضی! آ جاؤ...... جلدی کرو رضی!'' وہ ناشتہ ٹیبل پر لگا رہی ہوتی تھی تو وہ گنگناتے ہوئے سیڑھیاں اُترتا اور پھر بہت اطمینان سے سیڑھیوں کے نیچے موجود بیسن کے آئینے میں اپنا جائزہ لیتا اور وہ اس کے دیر کرنے پر چڑتی۔ اور اگر حسن رضا ٹیبل پر موجود ہوتے تو وہ صرف مسکرا دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی بہن بھائی کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا۔

ٹی وی پر تلاوت ہو رہی تھی۔ لمحہ بھر وہ سنتا رہا۔ قاری کی آواز بے حد پُرسوز تھی۔ اسے قرآن پڑھے کتنا عرصہ ہو گیا تھا، اسے یاد نہیں تھا۔

''رضی! اس رمضان میں تم بھی قرآن ختم کرلو۔ بھول جاؤ گے۔''
''میرا دماغ تمہاری طرح نہیں ہے۔'' وہ جواب دیتا تھا۔
'اگر میں نے قرآن پڑھا ہوتا سمجھ کر تو کیا میں تب بھی گمراہ ہو جاتا؟...... کیا تب بھی اسمٰعیل کذاب کے طلسم میں جکڑا جاتا؟'
اس نے خود سے پوچھا تھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ برش کر کے اور منہ ہاتھ دھو کر آیا تو تب بھی لاؤنج میں قرأت کی آواز گونج رہی تھی۔ اب وہ سورۃ الجاثیہ کی تلاوت کر رہے تھے۔ وہ بیٹھ کر سننے لگا۔ اب قاری صاحب ترجمہ کر رہے تھے۔ وہ دھیان سے سن رہا تھا۔
''پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا مقصود بنا لیا اور اللہ نے اُس کے ظلم کے باوجود اسے گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اور اللہ کے سوا اب کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ ایسے شخص کے ماضی و حال سے کوئی سبق نہیں لیتے؟''
قاری صاحب ترجمہ کر رہے تھے اور وہ سن رہا تھا۔ لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کا دماغ سویا سویا تھا۔ اس نے پوری طرح ان الفاظ کو سمجھا نہیں تھا۔ لیکن وہ اندر دماغ کے کسی کونے میں محفوظ ہو رہے تھے۔
وہ گمراہ ہو گیا تھا اپنے علم کے باوجود۔ یہ صحیح تھا۔
اللہ نے سچ کہا تھا۔
وہ بھی ان لوگوں میں سے تھا۔ ٹھیک ہے، اس نے زبان سے اسمٰعیل کذاب کو نبی نہیں کہا تھا لیکن دل میں...... ہاں دل میں تو کچھ تھا۔ کچھ غلط۔ دل میں اس نے اسمٰعیل کذاب کو تسلیم کیا تھا، تب ہی تو وہ وہاں تھا۔ اس کی محفل میں اس کے مقربِ خاص بننے پر اس نے اندر سے بڑی خوشی محسوس کی تھی۔ شاید کسی روز وہ زبان سے بھی کہہ دیتا۔ اور یہ گمراہی کس لئے تھی کہ اس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا مقصود بنا لیا تھا۔
اور یہ بھی سچ ہے۔ بلاشبہ اللہ کی کہی ہر بات سچ ہے۔
شہرت کی خواہش۔
دولت کی خواہش اور...... اور
اور اب کون ہے جو اُسے ہدایت دے؟
اُس کی آنکھیں نم ہوئیں۔
تو اب کون ہے جو۔
اس سے آگے بھی قاری صاحب نے کچھ کہا تھا۔ لیکن کیا؟ اُڑے اُڑے ذہن میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ تلاوت ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ٹی وی آف کر دیا۔
'اور اب کون ہے جو مجھے ہدایت دے سوائے اللہ کے۔'
'اللہ!' اُس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ 'کیا اللہ مجھے ہدایت دے گا اور مجھے معاف کر دے گا؟'
'شاید نہیں۔' اس نے جیسے خود ہی فیصلہ کر لیا۔ 'اب کچھ نہیں بچا۔ سوائے رُسوائی کے۔' اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر صوفے کی پشت پر رکھ دیا۔
وہ نہیں جانتا تھا کہ جب وہ بندہ سچے دل سے توبہ کرتا ہے تو اللہ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے۔ آنکھوں میں پھیلتے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس نے آنکھیں زور سے بھینچ لیں اور سوچا، وہ آج جنید علی کو منع کر دے گا کہ وہ ابو کو تلاش کرے۔ اس سے کیا فائدہ؟ اس رُسوائی میں وہ اُنہیں مزید شریک نہیں کرے گا۔ اور شاید اب کبھی اُنہیں دیکھ نہیں سکے گا، مل نہیں پائے گا۔ لیکن وہ ہمیشہ اُن سے محبت کرتا رہے گا۔ اپنے آخری سانسوں تک۔

'ابو! امی! سمیرا......! میں آپ سب سے بہت محبت کرتا ہوں۔ بہت...... میں نے آپ سب کو دکھ دیا۔ میں نے آپ کے خواب کرچی کرچی کیے۔ اس کے لئے آپ مجھے معاف کر دیجئے گا۔ اگرچہ میں معافی کے لائق نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔'

اس نے نچلے ہونٹوں کو دانتوں تلے کچلا۔ اسے لگا، جیسے ابھی اُس کی چیخیں نکل جائیں گی۔ اسے خود کو سنبھالنے میں بہت دقت ہوئی۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا اور ٹانگیں پھیلا کر، آنکھیں کھول کر ایک نظر اپنے سامنے ٹیبل پر پڑے چائے کے کپ کو دیکھا جو گلزار رکھ گیا تھا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد جب ثمینہ حیدر ناشتہ بنوا کر لائیں تو سامنے ٹیبل پر پڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور احمد حسن گہری نیند سو رہا تھا۔ ثمینہ نے گلزار کو ٹرالی واپس لے جانے کو کہا اور خود بھی اس کے پیچھے باہر نکل گئی۔

پھر اگلے کئی دن اس نے اریب فاطمہ اور اس عبایا والی لڑکی کا انتظار کیا تھا۔ لیکن پورا ایک ماہ گزر گیا تھا۔ وہ لڑکیاں پھر نہیں آئی تھیں اور نہ ہی وہ کے۔ ای والی لڑکیاں پھر آئی تھیں۔ تب ایک روز جب اس کا ڈرائنگ روم بھرا ہوا تھا، اس نے مونا کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے پوچھا تھا۔

''مس مونا! وہ آپ کی ڈاکٹر مرینہ اور وہ دوسری میڈم پھر نہیں آئیں۔ کیا میرے پروگرام اُنہیں پسند نہیں آئے؟''

''نہیں سر! آپ کے پروگرام تو پہلے سے زیادہ پسند کیے جا رہے ہیں۔ مگر انہوں نے پھر آنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ مرینہ کی دوست تو شاید اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ مرینہ نے بتایا تھا، اس کی والدہ شدید بیمار ہیں۔ زیادہ فین تو وہی تھی آپ کی۔ مرینہ تو اس کے اصرار پر چلی آئی تھی۔''

''اچھا تو خیر! آپ کیا کہہ رہی تھیں کہ آپ کے خیال میں امریکہ تیسری دنیا کے ذخائر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کی بقا اسی میں ہے؟''

''جی سر! اور اس مقصد کے لئے ہی اس کی نظریں پاکستان پر ہیں۔''

''آپ کا خیال صحیح بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ مسکرایا تھا۔

کئی اور طلبا نے بھی تائید کی تو سب کا مؤقف سننے لگا۔ کل رات جو پروگرام اس نے کیا تھا، وہ اس سلسلے کا آخری پروگرام تھا۔ وہاں موجود نوجوانوں میں سے اکثر کا اصرار تھا کہ یہ پروگرام جاری رہنا چاہئے تھا۔

''بھئی یہ تو چینل والوں کی مرضی ہے۔'' وہ مسکرایا تھا۔

''سر! کیا آپ کوئی اور پروگرام کریں گے؟'' کسی نے پوچھا تھا۔

''ابھی سے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''سر! آپ کو پتہ ہے، لوگوں نے ڈاکٹر جہاں زیب اور ظفر منصور والے پروگرام پر بہت اعتراض کیے ہیں؟''

''ہاں جانتا ہوں۔''

''شاید اس وجہ سے پروگرام بند کیا جا رہا ہے۔''

''نہیں خیر ایسا تو نہیں ہے۔ اور پھر ڈاکٹر زیب اور ظفر منصور کی رائے تھی، جو انہوں نے بیان کی۔ میں اس سے متفق نہیں تھا۔''

''لیکن ان غداروں کو آپ کو اپنے پروگرام میں انوائٹ نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' وہ دُبلا پتلا لڑکا غصے میں لگ رہا تھا۔

''آپ اُنہیں غدار کن معنوں میں کہہ رہے ہیں؟''

''جو شخص قائداعظم، اقبال اور پاکستان کے خلاف معمولی سی بات بھی کرتا ہے، میرے نزدیک وہ غدار ہے۔'' اس کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

''گڈ! میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ لیکن ینگ بوائے! یہ مہمان وغیرہ سب چینل والوں کی مرضی سے آتے ہیں۔ میرا ان میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔''

اسے لوگوں کے دلوں میں اُترنے اور اُنہیں مطمئن کرنے کا فن آتا تھا۔ آج بھی جب نوجوان طلبا اور کچھ دوسرے لوگ رخصت ہوئے تو اس کی ذات سے بے حد متاثر ہو کر گئے تھے۔ دل ہی دل میں سب نے اس کی وطن سے محبت اور بے باکی کو سراہا تھا۔

''ایسے ہی جوان ملک وقوم کی تاریخ لکھتے ہیں اور ملک وقوم سنوارتے ہیں۔'' ایک قدرے ادھیڑ عمر شخص نے جاتے جاتے تبصرہ کیا تھا اور ان کے جانے کے بعد وہ جنید علی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر، قہقہہ لگا کر بولا تھا۔

''ہاں ایسے ہی لوگ۔'' جنید علی نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔

''تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہوں...... نہ ٹھیک ہونے والی کیا بات ہے؟ تمہارے مشورے پر غور کر رہا ہوں کہ کچھ دنوں کے لئے گھوم پھر آؤں۔ چل رہے ہو ساتھ؟''

جنید علی نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے۔ سوچ کر پروگرام بنا لیتے ہیں۔ یوں بھی چینل پر پروگرام کا تو فی الحال کوئی پرابلم نہیں ہے۔ تو چلتے ہیں کاغان وغیرہ کی طرف۔ اگلا مہینہ صحیح رہتا ہے نادر ایریاز میں جانے کے لئے۔''

احمد رضا نے سر ہلایا۔

''ہاں یار! تمہاری فیملی کے متعلق کچھ کلیو تو ملا ہے۔ تمہارے ابو کے دفتر کے ایک بندے سے پتہ چلا تھا کہ پانچ سال پہلے وہ لوگ راولپنڈی منتقل ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ سے وہ لاعلم ہے۔ بہرحال پتہ چل جائے گا ایک دن۔''

جنید علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ احمد رضا کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس خبر سے اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں اُبھرا تھا۔

''اوکے، پھر میں چلتا ہوں۔'' جنید علی حسب معمول طلبا وغیرہ کے اس اجتماع میں موجود تھا اور اب واپس جا رہا تھا۔

''اوکے اللہ حافظ!''

اس نے جنید علی سے ہاتھ ملایا اور اس کے جانے کے بعد پھر قہقہہ لگایا۔ اونچا بلند قہقہہ۔

وہ کیوں ہنس رہا تھا، وہ خود نہیں جانتا تھا۔ پچھلے ایک ماہ سے اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی اور وہ خود اس کیفیت کو نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ کبھی اسے لگتا وہ دنیا کا بدنصیب ترین انسان ہے، جس کی جھولی خالی ہے۔ وہ اکیلا ہے اس بھری دنیا میں۔ رسوائی کی کالک سے اس کا چہرہ سیاہ ہو رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کالک کو اس کے چہرے سے ہٹا سکے۔ وہ ایسا شخص ہے جس کے لئے ہر در بند ہو چکا ہے۔

کبھی اسے لگتا، وہ دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہے۔ جس کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی کسی بھی آدمی کو خواہش ہو سکتی ہے۔ دولت اور شہرت اس کے قدموں کی لونڈی ہے۔ اور رچی نے کہا تھا۔

''ابھی تو کچھ بھی نہیں ہے احمد رضا! ایک دن آئے گا، جب تم دنیا کے دولت مند ترین آدمیوں میں سے ایک ہو گے۔''

''لیکن کیسے؟'' اس نے رچی سے پوچھا تھا۔

''بس دیکھتے رہو، رچی تمہارے لئے کیا کرتا ہے۔''

رچی اس کے لئے کیا کرنے والا تھا، وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن یہ جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، صحیح کہہ رہا ہے۔ ایک روز ایسا ہی ہو گا۔ وہ اس احساس سے خود کو خوش کرنا چاہتا تھا کہ ایک روز وہ دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں سے ایک ہو گا۔ یہ احساس اسے خوش نہیں کرتا تھا بلکہ اندر جیسے کہر سی گرنے لگتی تھی اور یہ کہر خوشی کے ہر احساس کو ڈھانپ لیتی تھی۔ تب وہ اونچے اونچے قہقہے لگاتا۔

وہ اس ایک ماہ میں ایک بار بھی حاجی صاحب کی طرف نہیں گیا تھا۔ وہ شاید کہیں گئے ہوئے تھے۔ اندر جو بدلاؤ کا عمل شروع ہوا تھا، اس میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ خوش نصیب ہے یا بدنصیب۔

'تو احمد رضا! تم کیا ہو؟...... بہروپیئے؟' اُس نے قہقہہ لگایا اور پھر بہت دیر تک ہنستا رہا۔

ثمینہ حیدر نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر ہاتھ میں پکڑے میگزین اور اخبار ٹیبل پر رکھے۔

احمد رضا نے ایک نظر اسے دیکھا اور اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ ایک دو اخبارات میں اُس کے اس آخری پروگرام کے متعلق بھی کالم تھے۔ اس نے سرسری نظروں سے دیکھا۔ تعریف ہی کی گئی تھی۔ سراہا گیا تھا۔ ایک کالم نگار نے تو اسے مردِ مجاہد کا خطاب دیا تھا۔ وہ مسکرایا اور آخری اخبار اُٹھا لیا اور پھر چونکا۔ اندرونی صفحات میں ایک چھوٹا سا آرٹیکل تھا۔ عنوان تھا۔

''احمد حسن کون ہے؟''

''احمد حسن کو ایک بے باک اور سچا صحافی کہا گیا ہے۔ کیا وہ واقعی صحافی ہے؟ اس نے کہاں سے تعلیم حاصل کی؟ وہ امریکہ سے آیا ہے۔ کیا وہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے؟ یا اُس کا تعلق موساد سے ہے؟ مثلاً غیر ملکی نظر آنے والا احمد حسن واقعی احمد حسن ہے یا کوئی جان، رچرڈ، ایڈورڈ ہے؟''

ہاں، وہ احمد حسن کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ کوئی جان، رچرڈ یا ہیری ہی ہو سکتا ہے۔

اس نے باقی کا مضمون نے پڑھا اور اس کے حلق سے پھر قہقہہ چھوٹ پڑا۔

'احمد حسن کون ہے؟' اور پھر ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اندر آتی ثمینہ حیدر نے ایک بار پھر حیرت سے اسے دیکھا۔

'کیا وہ نشے میں ہے؟' لیکن اس نے اسے کبھی پیتے نہیں دیکھا تھا۔

اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

''احمد حسن کون ہے؟.... یہ.... یہ اس اخبار میں لکھا ہے.... کیا تم جانتی ہو احمد حسن کون ہے؟ کوئی ایڈورڈ، جان، رچرڈ؟'' وہ پھر ہنسا تھا۔

''سر! وہ کوئی ایبک فلک شاہ آئے ہیں آپ سے ملنے۔''

''ایبک فلک شاہ۔'' اس نے پُرسوچ نظروں سے ثمینہ حیدر کو دیکھا۔ ''کیا تم جانتی ہو یہ کون ہے؟''

''سر! میں صرف ایک ایبک فلک شاہ کو جانتی ہوں جو ایک رائٹر ہے۔ میں نے تو اس کی کہانیاں نہیں پڑھیں لیکن میری فرینڈز بہت فین ہیں اس کی۔ شاید وہ ٹی وی کے لئے بھی لکھتا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اُنہیں بٹھاؤ ادھر ڈرائنگ رُوم میں۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔'' وہ فوراً ہی ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر وہ خود کو کمپوز کر کے اور فریش ہو کر واپس آیا تو ایبک ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں وہی اخبار تھا، جسے وہ اپنی ٹیبل پر چھوڑ گیا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر ایبک اخبار رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے بہت گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔

''السلام علیکم! میں ایبک ہوں۔''

پہلی نظر میں ایبک کی شخصیت نے اسے متاثر کیا اور پھر تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد وہ مزید متاثر ہوا۔ دھیمے دھیمے لہجے میں مدلل انداز سے بات کرتا یہ شخص یقیناً اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا تھا۔ اُس کی گفتگو سے اس ملک کے لئے محبت ٹپکتی تھی۔ اس نے اخبار میں چھپے اس مضمون کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی، جو اس کے سامنے کھلا رکھا تھا اور نہ ہی اس کے پروگراموں کے متعلق کچھ کہا تھا۔ وہ اپنے خواب اور اپنے پلانز اُس سے شیئر کر رہا تھا۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کسی بھی سیاسی پارٹی پر اعتبار نہیں ہے۔ میں کسی بھی پارٹی کو جوائن نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں

اپنے ملک کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے، جیسے میرا ملک کچھ غلط لوگوں کے پنجے میں ہے۔"

ایک لمحہ کے لئے احمد رضا کے دل میں خیال آیا تھا کہ متاثر کن شخصیت والا شخص جو اس کے سامنے بیٹھا ہے، کہیں اس کی طرح بہروپیا تو نہیں ہے؟ اور یہ خیال آتے ہی بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"کیا آپ کو......رچی......میرا مطلب ہے شیخ عبدالعزیز نے بھیجا ہے؟"

ایبک فلک شاہ کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

"میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ ایکچوئلی میرے والد صاحب نے مجھے آپ سے ملنے کے لئے کہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ مخلص اور محبِّ وطن شخص ہیں۔ اگر مجھے کسی پارٹی کو جوائن نہیں کرنا ہے تو میں آپ کے ساتھ مل کر کوئی لائحہ عمل طے کرلوں۔ دراصل انہوں نے آپ کے کچھ پروگرام دیکھے تھے، سیمل ٹی وی پر۔"

اور احمد رضا کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ لوگ اسے کیا سمجھتے ہیں اور وہ کیا ہے۔ شرمندگی کے احساس سے اس کی نظریں جھک گئیں۔ ایبک بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جی، جی یقیناً۔" اپنے چہرے پر اُس کی نظریں محسوس کر کے اس نے چونک کر ایبک کی طرف دیکھا۔

"مجھے آپ جیسے شخص کے ساتھ مل کر کام کرنا اچھا لگے گا جو اپنے دل میں ملک وقوم کے لئے اتنا درد رکھتا ہو۔"

اس روز ایبک کے ساتھ اس کی ملاقات مختصر رہی تھی۔ کیونکہ بار بار رچی کے میسجز آ رہے تھے کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ دو بار اس کی کال منقطع کر چکا تھا۔

کسی ضروری کام سے جانے کا بہانہ کر کے اس نے ایبک سے معذرت کی تھی کہ وہ زیادہ تفصیل سے بات نہیں کر سکتا اس وقت۔

"ٹھیک ہے۔ اِن شاء اللہ جلد ہی پھر ملیں گے۔" ایبک نے خوش دلی سے کہا۔ "اس دوران آپ بھی سوچئے گا اور میں بھی کہ ہم اپنے کام کا آغاز کس طرح کر سکتے ہیں۔ ہمارا طریق کار کیا ہوگا۔"

"ضرور۔" وہ ایبک کو گیٹ تک رخصت کرنے آیا تھا۔ اور جب واپس آیا تو اس کے بیڈروم والے فون کی بیل ہو رہی تھی۔ اس گھر میں دو فون کنکشن تھے۔ ایک فون اس کے بیڈروم میں تھا اور اس کا کوئی ایکسٹینشن وغیرہ نہیں تھا۔ اس فون پر صرف رچی ہی اس سے بات کرتا تھا یا پھر اس کے سیل فون پر اگر مختصر بات کرنا ہوتی تو۔

تیزی سے بیڈروم میں داخل ہوتے ہی اس نے فون ریسیو کیا۔

"فون کیوں نہیں اٹینڈ کر رہے تھے؟" رچی کے لہجے سے ناراضی جھلکتی تھی۔

"میں تنہا نہیں تھا۔" اس نے رسان سے جواب دیا۔

"کون تھا؟ کیا پہلے بھی ملتے رہے ہو اُس سے؟" رچی کے لہجے میں تجسّس تھا۔

"نہیں۔ پہلی بار آیا ہے۔ ایبک فلک شاہ نام بتایا ہے اس نے اپنا۔"

"ایبک فلک شاہ۔" رچی نے دہرایا۔

احمد رضا جو ابھی تک کھڑا تھا، فون اسٹینڈ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" رچی نے پوچھا تو اس نے مختصراً ایبک کے ساتھ ہونے والی گفتگو دہرا دی۔

"گڈ......انٹرسٹنگ۔" رچی کے لبوں سے نکلا۔ "کیا تم نے پہلے کبھی ایبک فلک شاہ کے متعلق نہیں سنا؟"

"نہیں۔" احمد رضا نے سنجیدگی سے کہا۔

"احمق ہو تم۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میڈیا سے متعلق ہر اہم شخصیت کے متعلق تمہیں معلومات ہونی چاہئیں۔ خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو خواہ الیکٹرانک میڈیا۔"

"کیا اس کا تعلق میڈیا سے ہے؟" احمد رضا نے پوچھا تو رچی نے کہا۔

''خیر اس پر پھر بات کریں گے۔ اس وقت میں نے تمہیں اس لئے فون کیا ہے کہ فی الحال سیمل پر تمہارے پروگرام ختم ہو گئے ہیں اور تم کل صبح ہی رحیم یار خان آ جاؤ۔ یہاں تمہیں کچھ زیادہ دن رُکنا ہے۔ ہوسکتا ہے ایک دو ماہ۔ اسی حساب سے تیاری کر کے آنا۔''

''لیکن میں تو جنید علی کے ساتھ ناردرن ایریا کی طرف جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔''

''جانتا ہوں۔ اسے فی الحال کینسل کر دو اور کل صبح پہلی فلائٹ سے یہاں کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ اور ہاں، وہاں مس ثمینہ یا کسی اور سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ جنید علی صبح تمہیں پک کر لے گا اور ایئرپورٹ چھوڑ دے گا۔''

احمد رضا خاموش رہا۔

''اور ہاں، میرے پاس تمہارے لئے کچھ اچھی اور کچھ بری خبریں ہیں۔ ویسے تم نے اخبار تو دیکھے ہوں گے۔''

''ہاں دیکھے ہیں۔''

''وہ آرٹیکل پڑھا تھا جس میں لکھنے والے نے تمہیں سی آئی اے کا ایجنٹ لکھا ہے؟'' دوسری طرف شاید رچی مزا لے رہا تھا۔

''یہ مضمون کیا تم نے چھپوایا ہے؟'' احمد رضا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''نو......ناٹ ایٹ آل۔'' رچی نے تردید کی۔ ''تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟''

''بس یوں ہی۔''

''اوکے۔ پھر کل ملاقات ہوتی ہے۔''

رچی نے فون آف کر دیا تھا۔ احمد رضا کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔

رچی اسے وہاں کیوں بلا رہا ہے اور وہ بھی زیادہ عرصہ کے لئے۔ وہاں ایسا کیا کام ہے؟

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

وہاں چک نمبر 151 میں لڑکیوں کے لئے ایک سینٹر بنایا گیا تھا اور وہاں صادق آباد میں بھی رچی نے ایک گھر لے رکھا تھا۔ وہ لوگ وہاں کیا کر رہے تھے، وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن بہرحال جانا تو تھا۔ وہ اُٹھا اور اپنی ضروری چیزیں پیک کرنے لگا۔ گو یہ کام ثمینہ حیدر بہتر طریقے سے کر سکتی تھی، لیکن رچی نے منع کیا تھا ثمینہ کو بتانے سے۔ اور اگر وہ اُسے پیکنگ کے لئے کہتا تو یقیناً وہ پوچھتی کہ اسے کہاں جانا ہے۔

ایک بڑا اٹیچی اور بیگ تیار کر کے وہ کمرے سے باہر نکلا تھا۔ اس کا ارادہ کچھ دیر ٹی وی دیکھنے کا تھا۔ اس نے ثمینہ حیدر کو چائے بنوانے کا کہا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ اور پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ لاؤنج سے نکل کر اندرونی دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ گیٹ پر موجود چوکیدار سے حال احوال پوچھ کر وہ گیٹ سے باہر نکل گیا اور کچھ دیر بعد وہ حاجی صاحب کے گیٹ پر بیل دے رہا تھا۔ ملازم نے گیٹ کھولا۔

''حاجی صاحب تو کراچی گئے ہیں۔''

''اچھا!'' وہ سر جھکائے دل گرفتگی سے واپس مڑا۔ وہ رحیم یار خان جانے سے پہلے حاجی صاحب سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ عالم آدمی تھے۔ دین دار تھے۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا۔

''کیا وہ قابلِ معافی ہے؟

کیا اللہ اُسے معاف کر دے گا؟''

اتنے سارے دن وہ خود کو باور کراتا رہا تھا کہ اب ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔

وہ جو کر چکا ہے، اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اسے اب تا عمر رچی کی غلامی کرنا ہے۔ اس کے گناہوں میں ہر گزرتے

دن کے ساتھ اضافہ ہونا ہے۔
اس کے نام کے ساتھ مرتد کے ساتھ اور جانے کیا کیا کچھ لکھا جانا ہے۔
وہ ایجنٹ ہے۔
وہ ملک کا غدار ہے۔
دھوکے باز ہے۔
خود کو یہ سب باور کرانے کے باوجود اندر کہیں خواہش ہمکتی تھی۔ معافی مل جانے کی خواہش...... احمد حسن سے دوبارہ احمد رضا بن جانے کی خواہش...... کہیں کوئی درد اندر ہی اندر چٹکیاں لیتا تھا۔ اذیت دیتا تھا۔ کوئی راستہ تو ہوگا پلٹنے کا۔ شاید کوئی روزن، کوئی کرن مل جائے روشنی کی۔
وہ یہ خیال آتے ہی گھر سے نکلا تھا۔ لیکن شاید اس کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ مایوسی نے ایک بار پھر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ سر جھکائے اپنے گیٹ میں داخل ہو گیا، جہاں ثمینہ حیدر چائے پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

❁○❁

''تو تم میری بات سمجھ رہے ہو نا احمد رضا؟'' رچی اس کے سامنے بیٹھا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔
احمد رضا نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''ہاں۔''
''تمہیں اب جلد ہی یہاں سے جانا ہوگا۔''
''کہاں؟''
''شام، لیبیا، مصر کہیں بھی۔ ابھی اس کا فیصلہ نہیں کیا گیا کہ تمہیں کہاں بھیجا جائے گا۔ ابھی تمہاری ٹریننگ بھی مکمل نہیں ہوئی۔''
وہ پچھلے دو ماہ سے یہاں تھا۔ فروری میں وہ پہلی بار آیا تھا اور چار ماہ بعد پھر رچی نے اسے بلوا لیا تھا۔
''تمہارے متعلق یہاں کچھ شکوک پائے جاتے ہیں۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ تمہیں کسی اور ملک میں بھیج دیا جائے۔''
''تمہارا اشارہ اگر اس مضمون کے متعلق ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مضمون تم نے خود ہی چھپوایا تھا۔''
رچی نے اس کی بات پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا تھا، پھر حتمی انداز میں بولا تھا۔
''تمہیں جانا ہوگا احمد رضا! یہ طے ہو چکا ہے۔''
''اور اگر میں نہ جانا چاہوں تو؟''
''تمہارے پاس انتخاب کا حق نہیں ہے۔''
''لیکن میں اسی ملک میں رہنا چاہتا ہوں رچی!'' اس نے ملتجی نظروں سے رچی کو دیکھا تھا۔
''تو تمہیں ہمیشہ کے لئے نہیں بھیجا جا رہا۔ بس کچھ عرصہ بعد جب ہمارا مشن کمپلیٹ ہو جائے گا تو تم لوٹ آنا۔ خیر اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ فی الحال تو تمہیں خوشخبری سنا دوں۔''
احمد رضا نے بنا کچھ کہے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
''الوینا نے تم سے شادی کی خواہش ظاہر کی ہے اور اگلے ہفتے اس کے والدین یہاں آ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اگلے ہفتے تم دونوں کی شادی ہو جائے۔ ہو سکتا ہے اس مشن میں وہ تمہارے ساتھ ہو۔''
''لیکن مجھے کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا جو پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہو۔ یقیناً اس شادی کی طرح اس کے والدین بھی جعلی ہوں گے۔''
احمد رضا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ رچی کو سنبھلنے میں چند منٹ لگے تھے۔
''لیکن اُس نے اپنے شوہر کو طلاق دے دی ہے۔ صرف تمہاری خاطر۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔''

رچی نے اس سے وضاحت طلب کرنے کے بجائے کہا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت چالاک تھا۔
''لیکن میں اس سے محبت نہیں کرتا رچی! اب تم مجھے وہ خبر سناؤ جو بری ہے۔''
''اوہ ہاں۔ احمد رضا! تمہارے والدین کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور تمہاری بہن شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا چلی گئی ہے۔''
''کیا یہ خبر بھی میری موت کی طرح جھوٹی ہے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے رچی کی طرف دیکھا جو اپنی بات کا اثر جاننے کے لئے اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔
''نہیں۔ ہرگز نہیں۔ تم جنید علی سے پوچھ سکتے ہو۔ اس نے اطلاع دی تھی مجھے......ابھی چند دن پہلے۔''
''نہیں......'' اس کا دل جیسے نیچے پاتال میں گرتا جا رہا تھا۔ ''جنید علی نے بتایا تھا تو......''
''نہیں......'' اس کے لبوں سے پھر نکلا تھا۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ ایسا نہیں ہوسکتا۔'' اسے تو ابھی ابو سے معافی مانگنی تھی۔ ابھی تو......شاید ابو معاف کر دیتے تو اللہ بھی معاف کر دیتا۔ لیکن ابو......امی......
اس کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔
اب کیا بچا تھا؟ کوئی اُمید، کوئی آس باقی نہیں رہی تھی۔
رچی اُس کا کندھا تھپتھپا کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر کے لئے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ اگلے دو تین دن بھی اس نے احمد رضا سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ رچی کے گھر میں مقیم تھا اور ناشتے اور کھانے کی ٹیبل پر بھی ہلکی پھلکی باتوں کے سوا کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ اسے سنبھلنے کے لئے وقت دے رہا تھا۔
بظاہر وہ سنبھل گیا تھا۔ لیکن اندر سے اُس کا دل بالکل خالی ہو گیا تھا۔
جس میں نہ کوئی خواہش تھی، نہ آرزو۔ وہ جیسے انسان سے ایک روبوٹ میں ڈھل گیا تھا۔
اس کی ٹریننگ شروع ہوگئی تھی۔ ٹریننگ میں عربی زبان سیکھنا بھی شامل تھا۔
رچی خود بہت اچھی عربی بولتا تھا۔
احمد رضا کی عربی سیکھنے کی رفتار بہت آہستہ تھی۔ اس کے اندر سے جیسے جینے کی اُمنگ ختم ہوگئی تھی۔ اُس کا مستقل قیام رچی کی قیام گاہ میں تھا جس کی بیسمنٹ میں ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ دو اور لڑکے بھی تھے۔ جن میں سے ایک اس سے عمر میں بڑا تھا۔ دوسرا تقریباً اُس کا ہم عمر تھا۔ لیکن احمد رضا نے کبھی ان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ کبھی کبھار چک نمبر 151 بھی جاتے تھے۔ ان دو ماہ میں وہ چھ سات دفعہ رچی کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے سینٹر کی عمارت کا فرسٹ فلور بھی مکمل ہوگیا تھا۔ اسفند اور عظمت سے بھی دو تین بار اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ عظمت کچھ اکھڑا سا تھا۔ کم بات کرتا تھا۔ لیکن اسفند پہلے کی طرح بہت خوش دلی سے ملا تھا اور گھر چلنے کی دعوت بھی دی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اس کے ساتھ گھر نہیں گیا تھا۔
''احمد رضا! میں چاہ رہا تھا کہ تمہاری ٹریننگ مکمل ہو جائے تو تم الوینا سے شادی کرلو۔''
''نہیں۔'' احمد رضا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''میں الوینا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔''
''تو کیا کوئی اور......کیا تم کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟......ثمینہ حیدر بھی اچھی لڑکی ہے۔''
''مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی۔'' اس نے سختی سے کہا اور رچی کی طرف دیکھا۔ ''میری ٹریننگ کب ختم ہوگی؟''
''شاید ایک ماہ یا دو ماہ مزید۔''
احمد رضا نے سر ہلا دیا تھا۔
اس وقت وہ چک نمبر 151 میں تھے اور سینٹر کے ساتھ والے گھر میں رچی کے کمرے میں بیٹھے تھے۔
''میں اب جاؤں؟'' احمد رضا نے کھڑے ہوتے ہوئے اجازت چاہی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں کچھ دکھانا بھی تھا۔ لیکن خیر پھر سہی۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم تو شادی کے لئے تیار نہیں ہو رہے، لیکن میں شادی کر رہا ہوں۔''

''مبارک ہو۔''

''یہ نہیں پوچھو گے، کس سے؟''

''تم خود ہی بتا دو۔'' احمد رضا نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''تمہاری فیانسی وہاں امریکہ میں...... کیا نام تھا اُس کا...... ایک بار تم نے تعارف کروایا تھا۔''

''نہیں۔ وہ تو شاید شادی بھی کر بیٹھی ہے۔ میں اسفند یار کی بہن اریب فاطمہ سے شادی کر رہا ہوں۔'' خوشی رچی کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

احمد رضا ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''یہ...... یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟'' رچی مسلمان نہیں ہے۔ اس بات کا اب اسے یقین ہو چکا تھا۔

''یار! پاکستانی عورت دنیا کی بہترین عورت ہے۔ میں پوری دنیا میں گھوما ہوں، لیکن میں نے پاکستانی عورت جیسی وفا، حیا کہیں نہیں دیکھی۔''

رچی کہہ رہا تھا۔ لیکن احمد رضا نہیں سن رہا تھا۔ وہ اریب فاطمہ سے شادی کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے کیا کہا تھا، احمد رضا نے نہیں سنا تھا۔

''کیا...... انہوں نے تمہارا رشتہ قبول کر لیا ہے؟'' بڑی دیر بعد اس نے خود کو کہتے سنا۔

''ہاں۔ میں نے عظمت یار سے بات کی اور پھر اس کے والد سے۔ اُس کی والدہ مجھے کچھ رضامند نہیں لگیں۔ لیکن باقی سب کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''اچھا...... کب کر رہے ہو شادی؟''

''شاید اگلے ہفتے...... اسفند یار اسے کل لاہور سے لے آیا ہے۔''

رچی اتنا خوش تھا کہ اس نے اپنی خوشی میں احمد رضا کے چہرے کے بدلتے تاثرات نوٹ نہیں کئے تھے۔ احمد رضا بھاری دل کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

نہیں...... یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ایک مسلمان لڑکی کی شادی کسی غیر مسلم سے ہرگز جائز نہیں ہے۔ بھلے وہ اہلِ کتاب ہی کیوں نہ ہو۔

پھر...... حیرت ہے وہ لوگ کیسے مان گئے؟ شیخ عبدالعزیز کا محل نما گھر۔ عرب شہزادوں سے اس کے تعلقات، مال و دولت کی فراوانی۔ انہوں نے سوچا ہو کہ ان کی بیٹی عیش کرے گی۔ لیکن شرعاً یہ شادی ہی جائز نہیں ہے۔' وہ بے چین ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا اور پھر گھر سے بھی باہر۔ اسے اسفند یار اور عظمت یار کا گھر ڈھونڈنے میں دقت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے ملنے والا بارہ سالہ لڑکا، گھر پوچھنے پر سیدھا اسے ان کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ اس گھر میں وہ ایک بار پہلے بھی آ چکا تھا، ابا کے ساتھ۔ اور اب دوسری بار وہ اس گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر آیا تھا۔ اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں سے کیا کہے گا۔

گھر میں سوائے ان کی والدہ کے کوئی نہیں تھا۔

''بیٹا! دونوں بھائی گھر پر نہیں ہیں۔ کسی کام سے آئے ہو کیا؟'' وہاں گاؤں میں سینٹر سے متعلقہ لوگوں کی سب بہت عزت کرتے تھے۔

اس نے دیکھا، ان خاتون کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

''اسفند کی والدہ کو کچھ اعتراض تھا۔'' اس کے کانوں میں رچی کی آواز گونجی اور اس نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کیا۔

''مجھے دراصل آپ سے ہی ملنا تھا۔''
خاتون کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ لیکن پھر انہوں نے کہا۔ ''آ جاؤ بیٹا!''
کچھ دیر بعد وہ ان کے سامنے بیٹھا رچی کی حقیقت بتا رہا تھا اور وہ حیرت سے سن رہی تھیں۔ اُنہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔
''ہم سیّد تو غیر سیّدوں میں بھی شادیاں نہیں کرتے۔ حیرت ہے، آپ لوگ کیسے مان گئے؟''
''اسفند کے ابا کہتے ہیں، شیخ صاحب کا سلسلۂ نسب، حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے اور...... کیا تم یہ ساری بات اسفند، عظمت اور ان کے ابا کو بتا سکتے ہو؟''
''نہیں...... وہ یقین نہیں کریں گے۔ اور پھر میں سامنے نہیں آنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں میرا نام اور اصل حقیقت ظاہر کئے بغیر آپ اس رشتے سے انکار کر دیں۔ کچھ بھی بہانہ بنا کر۔''
خاتون کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
''تم نے ابھی کہا تھا، ہم سیّد...... کیا تم سیّد ہو؟''
''ہاں!''
''تم...... تم شادی کرو گے اریب فاطمہ سے؟''
''میں؟'' احمد رضا نے اپنی طرف اشارہ کیا۔
''ہاں تم...... تم نے اپنا نام احمد حسن بتایا ہے نا...... اسفند نے بتایا تھا، تم احمد رضا کے دوست ہو۔ احمد رضا میرا بھتیجا لگتا ہے رشتے میں۔''
احمد رضا کا جی کیا، وہ بتا دے کہ وہ ہی احمد رضا ہے اور بہت سال پہلے وہ حسن رضا کے ساتھ یہاں آیا تھا اور اسی جگہ بیٹھا تھا موڑھے پر۔ اور وہ تخت پوش پر بیٹھی ہوئی تھیں آج کی طرح۔ انہوں نے پھر دہرایا۔
''تم شادی کرو گے اریب فاطمہ سے؟''
غیر ارادی طور پر اس کا سر اثبات میں ہل گیا۔
''ٹھیک ہے۔ تو پھر آج ہی شام تم نکاح کر لو اریب فاطمہ سے۔''
''جی......؟'' اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔
''ہاں۔ یہ نکاح آج شام ہی ہوگا۔'' وہ دُبلی پتلی خاتون جو کچھ دیر پہلے شکستگی اور دُکھ کا پیکر نظر آ رہی تھیں، ایک دم ہی بہت مضبوط اور بہادر نظر آنے لگی تھیں۔
''آج ہی شام نکاح؟'' احمد رضا کھڑا ہو گیا۔ وہ حیران سا اریب فاطمہ کی ماں کو دیکھ رہا تھا۔
''ہاں! اگر تم اریب فاطمہ سے شادی پر راضی ہو تو آج ہی شام...... بڑی مسجد کے مولوی صاحب کی بیوی میری بڑی بہنوں جیسی ہیں۔ جب میں بیاہ کر یہاں آئی تھی، تب سے انہوں نے مجھے بڑی بہن والا ارمان دیا ہے۔ بھائیوں کے آنے سے پہلے...... بولو! راضی ہو تم؟''
احمد رضا ششدر سا کھڑا تھا۔
''اور...... اریب فاطمہ؟'' کچھ دیر بعد اس کے لبوں سے نکلا۔ ''کیا وہ اس طرح نکاح پر راضی ہو جائے گی؟''
''اسے ماننا ہی ہوگا۔'' ان کی آواز دھیمی تھی۔ ''ورنہ وہ اپنی منوا لیں گے۔''
میں نے اریب فاطمہ کے معاملے میں ہمیشہ اپنی منوائی ہے۔ لیکن اس بار نہیں منوا سکی...... وہ تینوں اسفند، عظمت اور ان کے ابا تینوں نے......''
انہوں نے سر اٹھا کر احمد رضا کی طرف دیکھا، جو ابھی تک کھڑا تھا۔ کچھ دیر پہلے مضبوط نظر آنے والی عورت، دل شکستہ اور کمزور نظر آنے لگی۔ اس کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

''ان تینوں نے میری ایک نہیں سنی اور شیخ صاحب کو ہاں کہہ دی۔ دولت نے تینوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ ورنہ اس کی عمر انہیں نظر آتی، نہ انہوں نے یہ سوچا کہ وہ اس سرزمین پر اجنبی ہے۔ جانے کس ملک سے آیا ہے؟ اور جانے کب بیٹی کو بھی لے کر چلا جائے، ہمیشہ کے لئے۔''

آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔ احمد رضا چپ کھڑا انہیں روتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اس عورت کے دکھ کو کم کرے۔ یہ عورت جو اس کے باپ کی سیکنڈ کزن تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے سامنے کھڑا شخص اپنوں میں سے ہی ہے۔ انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے احمد رضا کی طرف دیکھا۔

''اور اریب فاطمہ...... کیا وہ مان گئی شیخ سے شادی کو؟'' اُس کی سُوئی ابھی تک اریب فاطمہ کی رضامندی، نارضامندی پر اٹکی ہوئی تھی۔

''نہیں۔ کہاں مانی؟...... تڑپ رہی ہے تب سے۔ پوری رات نہیں سوئی۔ لیکن اُس کی کس نے سننی ہے۔'' وہ ایک بار پھر موڑھے پر بیٹھ گیا۔

''تم؟'' انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ 'کیا خوبرو ہے...... شکل سے ہی اعلیٰ خاندان کا لگتا ہے۔' انہوں نے سوچا۔ پھر یکا یک چونکیں۔

اُس کی شکل بہت جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ جیسے انہوں نے پہلے بھی اسے دیکھا ہو۔

''تمہاری شکل دیکھی بھالی لگتی ہے بیٹا! تم احمد رضا کی طرح لگتے ہو۔'' ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''وہ بھی تمہاری طرح تھا۔ گورا چٹا...... انگریز لگتا تھا بچپن میں۔''

احمد رضا گھبرا گیا۔

''نو دس سال پہلے حسن بھائی سے ملاقات ہوئی تھی۔ تب دیکھا تھا احمد کو۔

''جی......!''

احمد رضا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیٹھے یا چلا جائے۔ اریب فاطمہ کی والدہ نے شاید اس کا تذبذب جان لیا۔

''ٹھیک ہے۔ عصر کے بعد آ جانا۔ وہ تو رات تک واپس آئیں گے۔''

''وہ اریب فاطمہ......'' احمد رضا جھجک گیا۔ ''اس کی مرضی بھی......''

''ہاں! اریب...... پوچھ لیتی ہوں اُس کی مرضی بھی۔''

''اریب فاطمہ......!'' انہوں نے اریب کو آواز دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے کے دروازے پر نظر آئی۔ اس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ملگجے سے سوٹ کے ساتھ بڑا سا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی تخت کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کی جھکی ہوئی لانبی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''اریب فاطمہ! یہ احمد حسن ہے۔'' انہوں نے احمد حسن کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے جھکی ہوئی پلکیں اُٹھائیں اور پھر جھکا لیں۔

''اریب فاطمہ! یہ احمد حسن کہتا ہے کہ شیخ مسلمان نہیں، کرسچین ہے۔ اور مذہب کی روح سے تمہارا نکاح جائز نہیں ہے اس سے تو......''

ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ وہ پوری آنکھیں کھولے احمد حسن اور اماں کو باری باری دیکھنے لگی۔

''تو کیا ابا، عظمت اور اسفند کو یہ بات بتائی ہے آپ نے؟ کیا وہ یہ جاننے کے بعد بھی......؟''

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نہیں! وہ تو صبح ہی چلے گئے تھے۔ اور احمد حسن تو ابھی آیا ہے۔''
''تو پھر جب وہ آئیں گے تو آپ اُنہیں بتا دیجئے گا۔ پھر تو.......'' اس کے اضطراب میں کمی ہوئی۔
''تمہارے ابا نہیں مانیں گے اریب فاطمہ!'' انہوں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ''شیخ کہے گا، احمد حسن جھوٹ بولتا ہے.....اور وہ صرف شیخ کی بات کا اعتبار کریں گے۔''
اُس کی آنکھیں بجھ گئیں اور ان میں نمی تیرنے لگی۔
''میں نے سوچا ہے، تمہارے ابا کے آنے سے پہلے احمد حسن سے تمہارا نکاح کر دوں۔ یہ بھی راضی ہے تم سے نکاح کرنے کو۔ تم بتاؤ! تم کیا کہتی ہو؟''
اریب فاطمہ نے جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا اور احمد حسن کی طرف دیکھا اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
''نہیں۔''
''کوئی جبر نہیں ہے اریب فاطمہ! یہ آپ کی اماں کی تجویز تھی۔ اگر آپ کو منظور نہیں تو ٹھیک ہے۔''
احمد رضا کو لگا، جیسے وہ ایک دم ہلکا پھلکا سا ہو گیا ہو۔ وہ ابھی ابھی جس آزمائش میں اسے ڈال گیا تھا، اس سے بخوبی نکل آیا ہو۔ بات یہ نہیں تھی کہ اریب فاطمہ میں کوئی کمی یا خامی تھی۔ بات یہ تھی کہ رچی اس نکاح کے بعد اس کے ساتھ کیا کرتا.....وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اپنی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتی اس عورت کے سامنے اس کا سر غیر ارادی طور پر ہل گیا تھا۔ احمد رضا کھڑا ہو گیا۔
''تو تمہیں شیخ عبدالعزیز کے ساتھ شادی منظور ہے؟''
اماں کا چہرہ سپاٹ تھا۔ بالکل بے تاثر۔
''نہیں اماں! پلیز نہیں۔'' اریب فاطمہ کے ساکت کھڑے وجود میں جنبش ہوئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور زمین پر دوزانو بیٹھتے ہوئے دونوں ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دیئے۔
''نہیں اماں! نہیں......اللہ کے لئے مجھے بچا لیں۔ مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی۔ نہ احمد حسن سے، نہ شیخ عبدالعزیز سے۔'' وہ زار و قطار رو رہی تھی۔
''آپ نے ہمیشہ میرے لئے ابا سے جھگڑا کیا اور اپنی بات منا لی۔'' اس نے ان کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔
''لیکن اس بار ہار گئی۔'' ان کا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر لمحہ بھر کو ٹھہرا تھا۔ ''تمہارے ابا سے کہا، مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے تو ٹھیک ہے، وہ مجھے طلاق دے دیں گے اور پھر.....اس عمر میں تمہارے لئے، بچوں کے لئے شرمندگی کا باعث نہیں بننا چاہتی اریب فاطمہ!'' ان کے آنسو بھی بہنے لگے۔
''پھر بھی...... پھر بھی اگر مجھے یقین ہوتا کہ طلاق کے بعد میں تمہیں بچا لوں گی تو میں تمہاری خاطر یہ داغ بھی برداشت کر لیتی۔ لیکن تمہارے ابا نے کہا.....طلاق کے بعد وہ تمہیں شیخ سے بیاہ دیں گے۔
''اماں!'' اریب فاطمہ نے دونوں بازو ان کے گھٹنوں کے گرد لپیٹ لئے اور شدت سے رونے لگی۔
''میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اریب فاطمہ! میں نے سوچا، شاید تُو خوش رہے اس کے ساتھ۔ اتنی دولت ہے اس کے پاس۔ اتنا امیر ہے وہ۔''
''میں بھلا اس کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہوں اماں! اُس سفید بندر کے ساتھ۔''
اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ احمد رضا کے ہونٹوں پر بے اختیار مبہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''آپ نے دیکھا اماں! اس کی آنکھوں میں کتنی غلاظت ہے۔ اماں! وہ شریف نہیں ہے۔ اچھا نہیں ہے۔''
''ہاں۔ لیکن یہ احمد حسن.......'' انہوں نے احمد حسن کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو اچھا لگا مجھے۔ بھلا مانس ہے۔ اپنے احمد رضا کا دوست ہے۔ اسی جیسا...... میں نے لاہور جاتے ہوئے تمہیں بتایا تھا نا کہ تمہارے رشتے کے ایک ماموں لاہور میں

رہتے ہیں۔ حسن رضا نام ہے ان کا۔ کبھی کوئی مسئلہ ہو تو......''

احمد رضا کے ہونٹ بھینچ گئے۔

اریب فاطمہ نے رخ موڑ کر شا کی نظروں سے احمد رضا کو دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔

''یہ تو بڑے بے باک صحافی ہیں اماں! ٹی وی پر پروگرام کرتے تھے۔ سچ بولنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کا تو پروگرام ہی اقبال کے اس شعر سے شروع ہوتا تھا۔

''میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند''

یہ تو مجرم چہروں کو بے نقاب کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں پھر......''

احمد رضا کا سر جھک گیا۔

''پھر یہ اسے کیوں نہیں بے نقاب کر سکتے؟ کیوں نہیں لوگوں کو بتا دیتے کہ وہ ایسا نہیں ہے جیسا نظر آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں یہ تسبیح اور یہ لمبا چغہ محض دھوکا ہے۔''

احمد رضا نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے بولنا چاہا لیکن آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔ ایسی بے بسی اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

''آپ کے متعلق تو اخبار لکھتے ہیں کہ آپ بے خوف انسان ہیں۔ امریکہ کو برا بھلا کہتے ہوئے نہیں ڈرتے۔ را، موساد اور سی آئی اے کے بندوں کے نقاب اُٹھانے سے خوف زدہ نہیں ہوتے......تو اب بتا دیں چک والوں کو کہ یہ شخص ڈھونگ رچائے ہوئے ہے۔''

'صحیح تو کہہ رہی ہے یہ۔ آخر میں رچی، طیب خان، الوینا کو بے نقاب کیوں نہیں کر سکتا؟ کیوں نہیں بتا سکتا کہ یہ لوگ وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں۔ بہت ہوا تو مار ڈالیں گے مجھے......اور اب میں جی کر کروں گا بھی کیا......نہ اماں نہ اماں۔ بس ایک سمیرا اور وہ بھی جانے کہاں کینیڈا۔'

اسے لگا، جیسے اندر سینے میں کوئی زخم ہو گیا ہو جس سے تیزی سے خون بہہ رہا ہو۔ وہ مردہ قدموں سے سر جھکائے مڑا۔

''نہیں اماں! مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی۔ نہ اِس سے، نہ اُس سے......میں خود بتا دوں گی ابا کو......خود انکار کر دوں گی۔''

وہ ایک دم اُٹھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ احمد رضا نے واپسی کے لئے قدم اٹھایا۔

'یہ اس قدر وجیہہ شخص، اتنی شاندار پرسنالٹی کا مالک......پھر صحافی ہے۔ پڑھا لکھا بھی بہت ہو گا۔ آخر اس سے شادی کرنے سے کیوں انکار کیا اریب فاطمہ نے؟' اس نے سوچا۔

''لڑکیاں تو اس کے ساتھ کی تمنا کرتی ہوں گی۔ پھر اریب فاطمہ......؟''

احمد رضا نے دوسرا قدم اُٹھایا۔

''کیا کوئی اور؟'' اماں نے گھبرا کر احمد رضا کی طرف دیکھا۔

''احمد......!'' انہوں نے بے اختیار آواز دی۔

احمد رضا نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

''ابھی وہ شاک میں ہے۔ اسفند اچانک اسے جا کر لے آیا میری بیماری کا کہہ کر۔ مجھے بھی نہیں بتایا کہ اسے لینے جا رہا ہے۔ مجھے پتہ چل جاتا کہ وہ اسے لینے جا رہا ہے تو میں کوئی تدارک کر لیتی۔ میں ابھی اس سے پھر بات کرتی ہوں۔ سمجھاتی ہوں۔ سمجھ دار ہے۔ سمجھ جائے گی......شیخ یا تم۔ اس کے پاس اور کوئی چوائس نہیں ہے۔ وہ تینوں اگر اپنی کرنے پر آ جائیں تو پھر کسی کی نہیں سنتے۔''

''میں رات میں آؤں گا انکل سے ملنے اور اُنہیں شیخ عبدالعزیز کے متعلق سب بتا دوں گا، جو جانتا ہوں......پھر جو

ہو، ہو ہو۔''
''لیکن اگر انہوں نے تمہاری بات کا یقین نہ کیا، تم سے ثبوت مانگا تو؟''
وہ اُٹھ کر اس کے قریب آئیں اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
''یاد رکھنا! چار بجے...... فاطمہ مان گئی تو میں شہر یار کو بھیجوں گی۔ تم تیار رہنا۔''
احمد رضا کو لگا جیسے اس کے کندھے پھر کسی بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں۔ وہ بوجھل قدموں سے صحن عبور کرتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔
اریب فاطمہ کے گھر سے اپنی رہائش گاہ تک کا فاصلہ اس نے کیسے طے کیا تھا، اسے خبر نہیں تھی۔ وہ بس سر جھکائے چلتا رہا۔ شاید کچھ لوگوں نے اسے سلام بھی کیا تھا۔ جس کا جواب اس نے سر کے اشارے سے دیا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے یہاں تھا اور کئی لوگ اسے شیخ کے آدمی کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ اپنے کمرے میں آتے ہی وہ بیڈ پر گر گیا۔
یہ اس نے کیا کر دیا۔
آخر کیا ضرورت تھی اسے اریب فاطمہ کے گھر جانے کی۔ اس کی بلا سے، اس کی شادی رچی سے ہوتی یا کسی اور سے۔
''لیکن وہ میرے خاندان کی لڑکی ہے اور اس کی شادی ایک غیر مذہب کے شخص سے ہو۔ ایسی شادی جو میرے مذہب میں جائز نہیں ہے، یہ میں کیسے برداشت کر سکتا تھا؟''
اس کے دل نے کمزور سا احتجاج کیا۔
''اور تم...... تم نے اپنے خاندان کو کون سی عزت بخش دی ہے؟ بڑا نام کمایا ہے؟'' کوئی اس کے اندر ہنسا۔
''تمہارے خاندان کے لوگ تو تمہیں مرتد کہتے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی اور کی نبوت کو تسلیم کرنے والا۔''
''ہاں! مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے غلطی کی۔ ایک ایسے شخص کا رفیق بنا، جو کذاب تھا، جھوٹا تھا۔ لیکن میں نے.....''
وہ چیخا تھا۔ لیکن اس کی آواز ہونٹوں سے نہیں نکلی تھی۔ ہاں، آنکھیں نم ہو گئیں۔
''میں گناہ گار ہوں، مجرم ہوں۔ تو اگر میں نے کسی اور کو مجرم اور گناہ گار بننے سے بچانے کی چاہ کی تو کیا غلط کیا؟''
''غلط نہیں کیا تو پھر پچھتا کیوں رہے ہو؟''
اندر سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔
''نہیں! پچھتا تو نہیں رہا۔''
''پھر؟''
''ہو سکتا ہے، رچی مجھے معاف کر دے۔ میں اس سے کہوں گا، میں اریب فاطمہ سے محبت کرتا ہوں۔ اس لئے ہم نے چوری چھپے نکاح کر لیا۔ ہاں! یہ بھی تو کیا جا سکتا ہے۔ تو اگر شہر یار مجھے بلانے آیا تو میں چلا جاؤں گا۔''
''کیا کسی ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزاری جا سکتی ہے، جس نے مجبوری کے تحت شادی کی ہو؟ محض سمجھوتا؟'' دل پھر بے ایمان ہوا۔
''ہاں! جب مقصد اچھا ہو تو۔''
''تو پھر ٹھیک ہے۔''
وہ جیسے فیصلہ کر کے مطمئن ہوا۔ لیکن کبھی اسے لگتا، اس میں ہمت کا فقدان ہے۔ وہ رچی کی مخالفت نہیں برداشت کر سکتا۔ کبھی اسے لگتا جیسے اسے کسی کی پروا نہیں ہے، کسی کا خوف نہیں ہے۔ حتیٰ کہ موت کا بھی نہیں۔ بس اُسے اس لڑکی کو بچانا ہے، جو اس کے باپ کے خاندان کی ہے۔ شاید ایسے کفارہ ادا ہو جائے۔
'یا اللہ! کچھ ایسا ہو جائے کہ اریب فاطمہ بچ جائے۔' اس نے دعا کی۔ پھر اس کے لب مسلسل دعا کرنے لگے۔ وہ

آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا، جب رچی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے بازو ہٹا کر اسے دیکھا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں! بس ایسے ہی لیٹ گیا تھا۔''

''میں ابھی اسلام آباد کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ اور پھر وہاں سے کل شام کی فلائٹ سے نیویارک جانا ہے مجھے۔''

''یوں اچانک...... خیریت؟''

''اوپر سے آرڈر آیا ہے۔ اسلام آباد میں طیب خان کے بندوں نے ٹکٹ وغیرہ لے کر سیٹ کنفرم کروا دی ہے۔''

رچی کھڑے کھڑے ہی بات کر رہا تھا۔

''واپسی کب ہو گی؟''

''شاید دو تین ماہ بعد۔ یا اس سے بھی زیادہ ٹائم لگ جائے۔ طیب خان بتا رہا تھا کہ شاید مجھے کچھ عرصہ کے لئے لیبیا یا مصر جانا پڑے۔''

''اور شادی؟...... تمہاری شادی؟''

''ہاں! شادی......'' رچی نے سر کھجایا۔ ''واپس آ کر...... تم بتا دینا، اسفند اور عظمت کو کہ مجھے ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے۔ شادی کی تقریب واپسی پر ہو گی۔ میں نے تمہارے علاوہ ابھی کسی اور سے شادی کا ذکر نہیں کیا۔ اس کم بخت ارباب کی نظر بھی اس لڑکی پر ہے۔ اسفند اور عظمت کو اچھی طرح سمجھا دینا کہ اب وہ میری منگیتر ہے۔''

''جی...... اور میں؟''

''تم......'' رچی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے لمحہ بھر سوچا۔ ''فی الحال تم یہیں رہو۔ تمہیں کب لاہور جانا ہے، الوینا تمہیں بتا دے گی۔ فی الحال تم عربی زبان پر عبور حاصل کرو۔ او کے! میں چلتا ہوں۔''

''بائے......!'' احمد رضا کھڑا ہو گیا اور پھر دروازے کے باہر تک رچی کے ساتھ آیا۔

''تم آرام کرو اور اپنا خیال رکھنا۔ تم نہیں جانتے، تم ہمارے لئے سب سے قیمتی ہو۔ ہم تمہارے متعلق کچھ اور پلاننگ کر رہے ہیں۔ الوینا تمہیں جلد ہی بتا دے گی۔''

اس نے دو انگلیوں سے احمد رضا کے رخسار کو چھوا اور آگے بڑھ گیا۔ احمد رضا نے دھیان نیں دیا تھا کہ اس نے کیا کہا ہے۔ اس کے اندر پھلجھڑیاں پھوٹ رہی تھیں۔

احمد رضا وہیں کھڑا اُسے وسیع احاطے میں کھڑی گاڑی کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ پھر واپس اپنے کمرے میں آیا تو اس کا جی چاہا، وہ خوشی سے ناچنے لگے۔ اللہ نے اس کی دعا سن لی تھی۔ ابھی آنکھوں پر بازو رکھے وہ یہ ہی دعا تو مانگ رہا تھا کہ خود بخود ایسا کچھ ہو جائے کہ اریب فاطمہ کی جان خود بخود ہی چھوٹ جائے اس سفید بندر سے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

'اور اللہ نے میری دعا سن لی۔'

وہ چونکا۔

'کیا اتنی جلدی بھی کوئی دعا قبول ہوتی ہے؟' اُسے حیرت ہوئی۔

''اللہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے بیٹا!'' دادا جان کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''اور جب ہم دعائیں مانگتے ہیں تو وہ ہماری دعائیں سنتا ہے۔''

'تو مجھے پہلے کیوں خیال نہیں آیا؟ اور میں نے پہلے دعا کیوں نہیں مانگی، امی، ابو اور سمیرا سے ملنے کی؟...... اگر میں مانگتا تو کیا وہ میری دعا قبول نہ کرتا؟ لیکن اب...... اب کیا فائدہ؟'

اُسے لگا جیسے اس کے دل کا کوئی کونا ٹوٹ کر گرا ہو اور اندر خون رِسنے لگا ہو۔

کچھ دیر نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کچلتے ہوئے وہ اس درد کو سہنے کی کوشش کرتا رہا جو اُسے اندر ہی اندر اذیت دے رہا تھا۔ پھر اُس نے جھک کر بیڈ کے نیچے سے جوتے نکالے اور جوتے پہن کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔
ایک بار پھر اس کے قدم اسفندیار کے گھر کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ اس بار اس کے قدموں میں تیزی تھی۔
اور ایک بار پھر وہ برآمدے میں اسی موڑھے پر بیٹھا تھا اور اریب فاطمہ کی اماں تخت پر بیٹھی سن رہی تھیں، جو وہ کہہ رہا تھا۔
''تو اللہ نے آپ کی سن لی۔'' بات ختم کر کے اس نے بڑے مطمئن انداز میں ان کی طرف دیکھا۔
''رچی کو دو تین ماہ سے زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔ اس دوران آپ اریب فاطمہ کی مرضی سے کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کر دیں۔''
''اریب فاطمہ کی مرضی.....؟'' انہوں نے سوچا اور احمد حسن کی طرف دیکھا۔
پتہ نہیں، اریب فاطمہ کی مرضی کیا ہے۔ گو اُس نے کچھ بتایا نہیں تھا۔ لیکن ان کے دل نے گواہی دی تھی کہ کوئی ہے، جس نے اریب فاطمہ کو یہ جرأت دی ہے۔ کوئی ہے، جسے اس کے دل نے چن لیا ہے۔
احمد حسن۔ یہ بھی لاکھوں میں ایک ہے۔ اگر اریب فاطمہ......
''اچھا! میں چلتا ہوں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''بس یہ ہی بتانے آیا تھا۔ کل کسی وقت آ کر اسفندیا عظمت کو رچی کا پیغام دے دوں گا۔''
''جیتے رہو بیٹا!......خوش رہو۔'' وہ بھی کھڑی ہو گئیں۔ پتہ نہیں کیوں، اس کے نقوش جانے پہچانے سے لگتے تھے۔
''آتے رہنا بھی کبھی۔ جب تک یہاں ہو۔''
''جی.....'' اس نے ذرا سا رخ موڑ کر دائیں طرف دیکھا۔ اریب فاطمہ سیاہ چادر اوڑھے دروازے میں کھڑی تھی۔
ایک نظر اُس کے روئے روئے، ستے ہوئے چہرے پر ڈال کر وہ تیز تیز چلتا ہوا برآمدے سے نکل کر وسیع صحن عبور کرنے لگا۔ اریب فاطمہ ہولے ہولے چلتی ہوئی اماں کے پاس آ گئی۔ انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔
''کہاں جا رہی ہو؟''
''زینب آپا کی طرف...... مجھے ایک کوشش کرنے دیں۔ ناکام ہو گئی تو بے شک احمد حسن سے میری شادی کر دیجئے گا۔ لیکن آج شام نہیں اماں! ایک دو دن کی مہلت دیں مجھے۔'' آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔
انہوں نے تڑپ کر اسے گلے لگا لیا۔
''سب ٹھیک ہو گیا ہے اریب فاطمہ! شیخ چلا گیا کسی ضروری کام سے ملک سے باہر۔ اب تین چار ماہ تک آئے گا۔ احمد حسن یہ ہی بتانے آیا تھا۔''
''اماں......!'' وہ ان سے لپٹ گئی اور اس کے آنسو اور شدت سے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔
''بس! اب چپ کر جا۔ مت رو۔''
انہوں نے اسے خود سے الگ کر کے اس کے آنسو پونچھے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر اپنے پاس بٹھا دیا۔ پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی۔
''اب بتا فاطمہ! وہ کون ہے؟''
''ایبک......ایبک فلک شاہ۔'' اس کی نظریں جھک گئیں۔ ''عمارہ پھپھو کا بیٹا...... بابا جان کا نواسہ۔''
''عمارہ کا بیٹا......مروہ بھابی کی بھتیجی کا؟''
اُس نے سر ہلا دیا۔
''کیا وہ...... میرا مطلب ہے تم دونوں......؟ تم ابھی کم عمر ہو۔ کہیں وہ تمہیں دھوکا تو نہیں دے رہا؟''
''نہیں اماں! وہ مجھے پسند کرتے ہیں۔ اور عمارہ پھپھو، انجی آپا اور انکل فلک شاہ سب آپ کے پاس آنا چاہتے تھے۔

لیکن میں نے منع کر دیا کہ مجھے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے۔اس کے بعد۔''
''تمہارا امتحان کب ہے اریب فاطمہ؟'' انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔
''تین ماہ بعد ہے۔''
''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ابا سے کہوں گی۔ یوں بھی شیخ تو چلا گیا ہے تو تم امتحان دے لو۔لیکن میں نے سوچ لیا ہے، تمہارے امتحان کے فوراً بعد تمہاری شادی کر دوں گی۔تم کہہ دینا ان سے، وہ آ جائیں۔ وہ کیا ''الریان'' میں رہتا ہے؟''
''نہیں اماں! وہ بہاول پور میں رہتے ہیں۔ ابھی شادی پر آئے تھے اور کبھی لاہور آئیں۔ تب الریان آتے ہیں بابا جان سے ملنے، تھوڑی دیر کو۔''
انہوں نے سر ہلایا۔ اطمینان ہوا تو اُنہیں۔
''نہا کر کپڑے بدل لو۔ کیسی حالت ہو رہی ہے تمہاری۔ تمہارے ابا آ جائیں تو ہو سکتا ہے، کل ہی تمہیں واپس جانا پڑے۔''
''ٹھیک ہے اماں! نہا کر میں زینب آپا سے مل آؤں۔''
انہوں نے لمحہ بھر سوچا اور پھر اجازت دے دی۔ اریب فاطمہ کمرے میں چلی گئی اور وہ تخت پر بیٹھ کر کسی گہری سوچ میں کھو گئیں۔

❁○❁

احمد رضا، اریب فاطمہ کے گھر سے نکلا تو غیر ارادی طور پر سینٹر کے دفتر چلا آیا۔شاید وہ ارباب حیدر سے ملنا چاہتا تھا۔ شاید ارباب خود ہی ذکر کر دے یا ہو سکتا ہے، ارباب اس کے متعلق کچھ بتا دے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔
رباب حیدر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔
''میں آ سکتا ہوں؟'' احمد رضا نے دروازے پر رُک کر پوچھا۔
اُس نے کرسی گھمائی اور احمد رضا کو دیکھ کر مسکرایا۔
''ہاں! آ جاؤ۔''
احمد رضا کرسی پر بیٹھ گیا۔
''کیا ہو رہا تھا؟''
''کچھ نہیں۔'' ارباب حیدر نے مڑ کر کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ ''یہ دیکھ رہا تھا۔''
''یہ کیا ہے؟'' احمد رضا تھوڑا سا جھکا۔
''یہ کسی نے فیس بک پر تصویریں ڈالی ہیں۔تم بھی دیکھو'' ارباب حیدر نے اپنی کرسی تھوڑی سی ایک طرف کی۔
احمد رضا نے دیکھا۔
ایک کھلی جگہ پر وہ ایک مکروہ صورت شخص کرسی پر بیٹھا تھا۔اس کے سامنے کچھ سیدھے سادے دیہاتی بندوں کی قطار سی بنی ہوئی تھی۔ ایک ایک شخص آگے بڑھتا، کرسی کے قریب آتا، زمین پر بیٹھتے ہوئے اس کرسی پر بیٹھے شخص کو سجدہ کرتا اور پھر اُٹھ کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا۔ وہ شخص نخوت سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔
''یہ کیا بکواس ہے؟'' احمد رضا سیدھا ہوا۔ ''اور کون ہے یہ شخص؟''
''مجھے کیا معلوم؟'' ارباب حیدر نے کندھے اچکائے۔ ''میں نے ابھی دیکھا ہے یہ سب۔ ٹھہرو! نیچے کچھ کمنٹس بھی لکھے ہیں۔''
''بند کرو۔ پتہ نہیں کس مذہب سے متعلق ہیں یہ لوگ۔'' احمد رضا کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔
''او کے۔'' ارباب حیدر نے کمپیوٹر آف کیا۔ ''یہ ہمارے ہی ملک کے لوگ ہیں میری جان! ان کا لباس نہیں دیکھا

تم نے۔"
"جہالت کی انتہا ہے۔نعوذ باللہ انسان کو سجدہ کرنا..... کسی نے ان کو بتایا نہیں کہ گناہ ہے یہ۔" احمد رضا بڑبڑایا
"ہمارے ملک کے علماء کو اتنی فرصت کہاں کہ ان دُور دراز علاقوں میں جا کر انہیں ایجوکیٹ کریں۔ انہیں تو ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے سے فرصت نہیں ملتی۔ ایک فرقہ دوسرے کو کافر قرار دے رہا ہے تو دوسرا پہلے کو۔" ارباب حیدر کا لہجہ طنزیہ تھا۔"خیر! یہ بتاؤ اس وقت سینٹر کیسے آ گئے؟"
"یوں ہی گھر بیٹھے بیٹھے دل گھبرایا تو۔"
"او کے! تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ ویسے اگر تم رچی کے متعلق جاننا چاہتے ہو تو میں بھی اتنا ہی بے خبر ہوں، جتنا تم۔" ارباب حیدر نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔"غالباً اسے کسی خاص مشن پر بھیجا گیا ہے کہیں کسی اور اسلامی ملک میں۔"
"رباب حیدر! کیا تم مسلمان ہو؟" احمد رضا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
رباب حیدر نے ایک لمحہ سوچا اور پھر مسکرایا۔
"اس لحاظ سے تم مجھے مسلمان سے کہہ سکتے ہو کہ میں نے مسلمان ماں باپ کے گھر جنم لیا۔بس اتنا ہی مسلمان ہوں۔ پیدائش پر میرے کان میں اذان دی گئی تھی اور مروں گا تو جنازہ پڑھایا جائے گا۔" وہ ہنسا۔"اور کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔"
"تم اپنی مرضی سے ان لوگوں کے ساتھ شامل ہوئے تھے؟"
"ہنڈرڈ پرسنٹ۔" ارباب حیدر نے اپنی ریوالونگ چیئر کو دائیں بائیں گھمایا۔"میرے والد کا تعلق غزنی سے ہے۔ والدہ کا ہندوستان سے۔ اور میں نیویارک میں پیدا ہوا۔ میرے والدین اب بھی امریکہ کی ایک ریاست میں مقیم ہیں، جہاں ان کے بڑے ہوٹلز اور مال ہیں۔"
"یعنی تم پاکستانی نہیں ہو؟"
"میں مسلمان ہوں...... پاکستانی یا افغانی، چہ معنی دارد...... ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے۔" اس نے قہقہہ لگایا اور میز پر پڑی فائل اپنی طرف کھسکا کر کھولی۔"یہ فائل الوینا نے تمہارے لئے یہاں رکھی ہے۔"
"الوینا یہاں ہے؟" احمد رضا نے پوچھا۔
"ہاں! اندر سینٹر کے ہال میں اس کا لیکچر ہے آج۔"
"کیا ہے اس میں؟"
"تمہارے لئے فیوچر پلان۔"
احمد رضا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"پوری بات تو تمہیں الوینا بتائے گی۔ لیکن فی الحال تمہیں کسی اور ملک بھجوانے کا پروگرام کینسل کر دیا گیا ہے۔ تمہیں یہاں اپنے ملک میں ہی رہ کر کام کرنا ہے۔"
"کیا یہاں رحیم یار خان میں؟" احمد رضا نے اپنے دل میں اطمینان محسوس کیا۔ وہ کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ اسی ملک میں رہنا چاہتا تھا۔
"نہیں۔ لاہور یا شاید کراچی۔ دراصل ہم یہاں اپنا ایک چینل لانچ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اور یہ چینل تم لانچ کرو گے۔ تم ہی اس کے مالک ہو گے۔ سارے معاملات تم ہی ڈیل کرو گے۔"
"لیکن میں......"
"پس پردہ ہم سب تمہارے ساتھ ہوں گے۔ کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے؟ یہ ہدایات ہم تمہیں دیتے رہیں گے۔ تم اس ملک کے شہری ہو۔ یہ چینل تمہیں ہی لانچ کرنا ہے۔"

''ٹھیک ہے۔ لیکن اتنا کھڑاگ پھیلانے کی کیا ضرورت ہے؟ ''سیمل'' سے ہم اپنی مرضی کے پروگرام کر تو رہے تھے۔''

''ان سے ان بن ہوگئی ہے۔ لالچ بڑھ گیا ہے ان کا...... جس کو جتنا دو، وہ ہل من مزید کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کے پیٹ نہیں بھرتے یار! کبھی بھی۔ رچی نے ہائی کمان کو اپنے چینل کی تجویز پیش کی تھی، جو منظور ہوگئی ہے۔ مستقبل میں ہم اس سے بہت فائدہ اُٹھائیں گے۔''

رباب حیدر نے فائل بند کر کے احمد رضا کو دینے کے بجائے دراز میں رکھ دی۔ تب ہی الوینا نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

''رباب حیدر! کافی کے ایک کپ کے متعلق کیا خیال ہے؟''

''نیک خیال ہے۔'' ارباب حیدر مسکرایا۔ احمد رضا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''احمد رضا بھی ہے۔'' الوینا مسکرائی۔ ''باہر ہی آ جاؤ...... موسم اچھا ہے۔'' وہ واپس مڑتے ہوئے بولی۔

باہر احاطے میں پلاسٹک کی کرسیاں اور میز پڑی ہوئی تھی۔ دھوپ ڈھل چکی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ باہر کا موسم اندر کی نسبت بہت اچھا تھا۔ احمد رضا ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور احاطے میں لگے درختوں کو دیکھنے لگا۔

'ہمارے ملک کا ہر گوشہ حسین ہے۔'

اس نے دل ہی دل میں کہا اور ارباب حیدر کی طرف متوجہ ہوگیا، جو کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔

''رحیم یار خان آنے سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنا خوب صورت علاقہ ہے۔'' ارباب حیدر نے اس کی طرف دیکھا۔

تب ہی الوینا ٹرے میں کافی کے تین کپ رکھے آ گئی۔ ٹرے ٹیبل پر رکھ کر اس نے احمد رضا اور ارباب حیدر کو پکڑایا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

''تمہارا لیکچر کیسا رہا؟'' ارباب حیدر نے پوچھا۔

''توقع سے زیادہ کامیاب۔''

''تو......؟'' اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ پوچھا تھا۔ وہ اب احمد رضا سے اکثر باتیں نہیں چھپاتے تھے۔

''ہیں کچھ ہمارے مطلب کی دو یا تین۔'' الوینا نے کافی کا گھونٹ لے کر احمد رضا کی طرف دیکھا، جو نہ جانے کس دھیان میں مگن ہولے ہولے کافی کے سپ لے رہا تھا۔

''یعنی کسی بھی ایشو کو لے کر ہم انہیں آگے بڑھا سکتے ہیں۔''

''شیور۔''

کافی پیتے ہی ارباب حیدر اُٹھ گیا۔ ''مجھے ایک دو ضروری کالز کرنا ہیں۔ تم لوگ بیٹھو۔ گپ لگاؤ۔''

''تم نے مجھ سے شادی سے انکار کیوں کیا؟'' ارباب حیدر کے جانے کے بعد الوینا نے پوچھا۔

''تم جانتی ہو۔''

''میں سمجھتی تھی، تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو۔'' الوینا اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں بھی یہی سمجھتا تھا۔''

''کیا محبت میں دو بچوں کی ماں اور شادی شدہ ہونا معنی رکھتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید نہیں...... لیکن ایک میرڈ عورت سے شادی نہیں ہوسکتی۔''

''میں نے جونی کو طلاق دے دی ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' احمد رضا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور الوینا نے نگاہیں جھکا لیں۔

''نہیں! میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ میں نے سچ مچ طلاق دے دی ہے۔'' اس نے دونوں کہنیاں میز پر رکھیں اور تھوڑا آگے جھکی۔ ''احمد رضا! میں شاید تمہیں یقین نہ دلاسکوں۔ لیکن میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ پتہ نہیں کب سے۔ لیکن مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''

احمد رضا نے کچھ نہیں کہا۔ بس سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

ممکن ہے الوینا صحیح کہہ رہی ہو۔ لیکن وہ اس وقت اس کے لئے اپنے دل میں کوئی جذبہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ الوینا بھی ان ہی میں سے تھی، جن کی وجہ سے وہ اپنوں سے بچھڑا تھا۔ امی اور ابو دونوں بھلا کیسے......؟ کیا کوئی حادثہ؟ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

اس نے غیر ارادی طور پر جیب سے فون نکال کر جنید علی کا نمبر ملایا۔

الوینا نے میز سے کہنیاں ہٹالیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

جنید علی نے اگر رچی کو میرے والدین کے متعلق بتایا ہے تو وہ یقیناً جانتا ہوگا کہ کیسے....... دوسری طرف بیل ہو رہی تھی۔ جنید نے فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ اس نے مایوس ہو کر فون آف کر دیا۔ الوینا اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''رچی کہتا ہے، پاکستانی عورت دنیا کی ساری عورتوں سے زیادہ خوب صورت، باوفا اور باحیا ہوتی ہے۔ میں کہتی ہوں، پاکستانی مرد بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ شاید دنیا کے سارے مردوں سے زیادہ اچھے، کیئرنگ اور لونگ۔''

احمد رضا کے اپنی طرف دیکھنے پر اس نے کہا۔ اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہوگئی اور وہ بہت وارفتگی سے احمد رضا کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی ارباب حیدر اندر سے بریف کیس اٹھائے باہر نکلا۔

''چلو الوینا!'' وہ ان کے پاس آکر رُکا۔

الوینا کھڑی ہوگئی۔ ''ہمیں کسی کام سے جانا تھا۔''

احمد رضا نے سر ہلا دیا۔

''ہم شاید کل تک واپس آئیں گے۔ یہاں مارتھا اور ریف ہیں۔ کوئی مسئلہ ہو تو ان سے کہہ سکتے ہو۔''

''کیا مسئلہ ہوسکتا ہے؟'' اس نے نظریں اُٹھائیں۔

''احتیاطاً کہا ہے۔''

مارتھا اور ریف اس کی ٹریننگ کر رہے تھے۔ ریف کو عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اگر وہ پردے کے پیچھے سے بولتا تو لگتا، جیسے کوئی اہلِ زبان بول رہا ہے۔

الوینا اور ارباب حیدر چلے گئے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد وہ وہیں بیٹھا رہا۔ کھلی فضا میں بیٹھنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ سینٹر کی عمارت کے ساتھ ہی وہ گھر تھا، جہاں اس کی رہائش تھی۔ لیکن ابھی اس کا گھر جانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ٹانگیں پھیلائیں اور سامنے درخت پر بیٹھی چڑیا کو دیکھنے لگا۔ اس کے پَر نیلے نیلے سے تھے۔ وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی ایک شاخ پر بیٹھتی۔ کبھی دوسری شاخ پر بیٹھ جاتی۔ وہ جب بولی تو اس کی آواز بھی اسے بہت پیاری لگی۔ عام چڑیوں سے مختلف......وہ چڑیا کو دیکھ رہا تھا اور اس کے کانوں میں سمیرا کی آواز آرہی تھی۔

ہم ہیں نیلی چڑیا
ہاتھ بٹانا سب کا کام
آؤ ہم کھیلیں اچھے کھیل
ہم ہیں نیلی چڑیا

وہ جب چھوٹی سی تھی اور نئی نئی اسکول میں داخل ہوئی تھی تو گھوم گھوم کر ہاتھ پھیلا کر گاتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے

سامنے سمیرا کے بچپن کا یہ منظر بار بار آ رہا تھا اور وہ درخت پر پھدکتی نیلی چڑیا کو دیکھ رہا تھا، جب احاطے کا دروازہ کھول کر اریب فاطمہ، شہریار کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اس نے دور سے ہی احمد رضا کو بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے شہریار کو وہیں سے واپس بھیج دیا اور خود ہولے ہولے چلتی ہوئی احمد رضا کی کرسی کے قریب آ کر رک گئی۔

احمد رضا نے چڑیا پر سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی وہی سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی، جس پر ننھے ننھے شیشے دمکتے تھے۔

''آپ.....!''

''میں زینب آپا سے ملنے آئی تھی۔ آپ کو دیکھ کر رک گئی۔ مجھے آپ سے سوری کرنا تھا۔''

''کس بات کے لئے؟'' احمد رضا نے ذرا کی ذرا نظریں اُٹھائیں۔

''وہ جو میں نے کہا، مجھے نہیں کہنا چاہئے تھا۔ میں بہت تکلیف میں تھی۔ بہت اذیت میں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں چلا، میں کیا کہہ رہی ہوں۔''

''آپ نے کچھ غلط نہیں کہا تھا اریب فاطمہ!'' احمد رضا کی نظریں جھک گئی۔ وہ اس کے خاندان کی لڑکی تھی اور یوں اس کی طرف اس طرح دیکھنا اسے معیوب لگا۔

''کچھ بھی غلط نہیں۔ میں واقعی کمزور ہوں۔ ان کی طاقت سے ڈرتا ہوں۔ اس کے لئے سوری کہنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔''

اریب فاطمہ سر جھکائے چادر کے پلّو کو اُنگلی پر لپیٹ رہی تھی۔

''اور مجھے آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا تھا۔ آپ نے شیخ کی حقیقت سے آگاہ کیا۔''

''اِٹس اوکے۔ اب آپ جائیں اور یہاں مت آیا کریں۔ زینب آپا سے ملنے چھٹی والے دن ان کے گھر چلی جایا کریں۔''

''جی......'' اریب فاطمہ نے آہستہ سے کہا اور مڑ گئی۔

''سنیں......'' احمد رضا کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ''ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟''

''جی......!'' اریب فاطمہ نے رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''اس روز آپ وہاں میرے گھر کسی لڑکی کے ساتھ آئی تھیں۔ کوئی خاص بات تھی کیا؟''

''اُس روز......وہ دراصل سیمی ملنا چاہتی تھی آپ سے۔''

وہی ناموں کو مختصر کرنے کی عادت۔ اس نے سمیرا کو سیمی کا نام دیا تھا۔ اب الریان میں سب ہی سمیرا کو سیمی کہہ کر بلاتے تھے۔

''وہ آپ کی بہت بڑی فین ہے۔ ایک بار پہلے وہ مرینہ کے ساتھ آئی تھی آپ کے گھر۔ لیکن مرینہ اس روز بزی تھی اور وہ بہت بے چین ہو رہی تھی۔ سو مجھے لے کر چلی آئی۔''

''ڈاکٹر مرینہ، کے۔ای کی اسٹوڈنٹ؟'' احمد رضا نے پوچھا تو اس نے سر ہلایا۔

''میں بہت سارے دن آپ کا انتظار کرتا رہا۔ آپ لوگ آئی نہیں پھر۔''

''سیمی کی امی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ ان کا آپریشن تھا۔ وہ راولپنڈی چلی گئی تھی اور پھر جب واپس آئی تو ہم دوبارہ گئے تھے۔ آپ کے چوکیدار نے بتایا کہ آپ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ کب آئیں گے، کچھ پتہ نہیں۔''

''کیا کوئی خاص کام تھا؟''

''پتہ نہیں۔ لیکن وہ آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ کچھ پوچھنا تھا اسے آپ سے۔''

''کیا نام بتایا تھا آپ نے ان کا؟'' اس نے پھر تصدیق چاہی۔

''سیمی۔''

وہ تو اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیوں وہ آواز جانی پہچانی سی لگی تھی۔ احمد رضا نے سر ہلا دیا۔
اریب فاطمہ نے جانے کے لئے قدم اٹھایا۔ احمد رضا پھر درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اِدھر اُدھر اُس نیلی چڑیا کو تلاش کر رہا تھا، جو ابھی کچھ دیر پہلے شاخوں پر پھدک رہی تھی۔

❁○❁

ایک سوتے سوتے ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں باہر کوئی شور ہوا تھا یا پھر اس کی نیند ہی پوری ہوگئی تھی۔ دائیں ہاتھ سے پیشانی پر بکھرے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے اس نے سامنے کلاک پر نظر ڈالی۔ چھ بج رہے تھے۔ یعنی وہ چار گھنٹے سویا تھا۔ وہ آج ہی تقریباً ایک ماہ بعد بہاول پور سے آیا تھا اور کرنل شیردل سے مل کر اور ان کے ساتھ لنچ کر کے تقریباً دو بجے انیکسی میں آیا تھا۔ اس کا ارادہ سونے کا نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا، وہ تھوڑا سا آرام کر کے اور تازہ دم ہو کر الریان جائے گا۔ لیکن جب وہ بیڈ پر لیٹا تو اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب سو گیا۔ بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہر چیز ہمیشہ کی طرح ترتیب سے اور صاف ستھری تھی۔ مسز شیردل ہمیشہ اپنی نگرانی میں انیکسی صاف کرواتی تھیں۔ چاہے وہ یہاں ہو یا نہ ہو۔

وہ حفصہ اور عادل کے ولیمے کے دوسرے ہی دن فلک شاہ اور عمارہ کے ساتھ بہاولپور چلا گیا تھا۔ انجی اور جواد بھی ان کے ساتھ تھے۔ اور پھر یہ پورا ایک ماہ بہاول پور میں ہی گزر گیا تھا۔ کئی کام کرنے والے تھے۔ زمینوں کے معاملات تھے جو نمٹانے تھے اور کئی دوسرے کاروباری مسائل بھی دیکھنے والے تھے۔ اور جب وہ ان سب سے فارغ ہوا تو بابا نے اسے روک لیا۔ اس بار وہ اسے آنے ہی نہیں دے رہے تھے۔

''تم یہیں کیوں نہیں رہ جاتے آبی! اب وہاں تمہارا کیا کام ہے؟''

وہ لمحہ بھر کو چپ ہو گیا تھا۔ وہ کیا کہتا کہ وہاں اریب فاطمہ ہے جسے دیکھے ایک ماہ گزر گیا تھا۔ کبھی کبھی الریان جا کر اریب فاطمہ کو دیکھ لینا اور اس سے ایک آدھ بات کر لینا اس کے لئے کتنا انمول ہوتا تھا۔ لیکن بات صرف اریب فاطمہ کی نہیں تھی۔ ابھی وہ وہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا، وہ یہاں رہ کر ممکن نہیں تھا۔

''ابھی کچھ عرصہ مجھے وہیں رہنے دیں بابا! مجھے ایک پلیٹ فارم مل جائے، جہاں سے مجھے اپنے کام کا آغاز کرنا ہے تو پھر آ جاؤں گا۔ ابھی مجھے احمد حسن سے بھی ملنا ہے۔ آج کل نہ تو اس کا پروگرام آ رہا ہے، نہ ہی کوئی آرٹیکل چھپ رہا ہے۔ میں اس شخص کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک مختصر سی ملاقات میں اس کے متعلق میں اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ محب وطن ہے یا رازی اکمل کے کہنے کے مطابق کسی دشمن ملک کا ایجنٹ۔''

اور فلک شاہ خاموش ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے اضطراب اور بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے وہ چاہتے ہوئے بھی بہاول پور سے نہیں آ سکا تھا۔ حالانکہ دل اریب فاطمہ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے ہمک رہا تھا۔ لیکن وہ ان لمحوں میں فلک شاہ اور عمارہ کو بھی تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ فلک شاہ جہاں اس بات پر خوش تھے کہ سالوں بعد وہ ان سب سے ملے اور عمارہ کو اس کا میکہ ملا، وہاں احسان شاہ سے نہ ملنے کا دکھ انہیں اندر ہی اندر کاٹتا رہتا۔ یہی حال عمارہ کا بھی تھا۔ خوشی بھی تھی اور فلک شاہ کے کسی فنکشن میں شریک نہ ہونے کا غم بھی۔ یہ دو متضاد کیفیات دونوں کو مضطرب کئے ہوئے تھیں۔ حالانکہ عبدالرحمٰن شاہ نے یقین دلایا تھا کہ ابھی شانی کچھ سننے کو تیار نہیں۔ لیکن کسی مناسب وقت پر وہ اس سے ضرور بات کریں گے اور پھر ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

''اور یہ سب کچھ کب ٹھیک ہو گا آبی! کب شانی کی غلط فہمی دُور ہو گی اور کب اس ناکردہ جرم کی سزا ختم ہو گی؟''

انہوں نے اسی کیفیت میں ایبک سے کہا اور ایبک نے انہیں تسلی دی تھی۔ یوں الریان سے نہ صرف بابا جان ہی نہیں، سب ہی فون کرتے رہتے تھے۔ ایبک کی بھی اکثر حفصہ، عمر، زبیر وغیرہ اور مصطفیٰ انکل سے بات ہو جاتی تھی۔ اس روز

اس نے ہمدان کو فون کیا تھا۔ فون عاشی نے اٹھایا تھا اور عاشی نے اسے الریان کے ہر فرد کے متعلق رپورٹ دی تھی، اریب فاطمہ سمیت۔

''فاطمہ آپی بہت پڑھ رہی ہیں آج کل۔ اور خوش بھی بہت ہیں۔ میں نے دیکھا ہے، اکثر اکیلے بیٹھی مسکراتی ہیں۔ اور رابیل آپی کا موڈ کبھی کبھی بہت خراب ہو جاتا ہے اور اکثر اُداس نظر آتی ہیں۔''

''وہ کیوں بھئی؟'' وہ مسکرایا۔ ''کہیں تم نے تو اپنی رابیل آپی کو ناراض نہیں کر دیا؟''

''نہیں۔ ان کی اپنی مما سے ناراضی ہے۔''

''اچھا......!''

''ویسے وہ یہیں آ رہی ہیں۔ آپ خود ہی پوچھ لیں۔'' اور وہ فون رابیل کو پکڑا کر چلی گئی۔

''ہیلو رابیل! کیسی ہیں آپ؟ میں ایبک ہوں۔''

''ٹھیک ہوں۔'' رابیل کو حیرت ہوئی۔ ''پھپھو، انکل، انجی وغیرہ سب ٹھیک ہیں نا؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

پھر اس نے اِدھر اُدھر کی دو تین باتیں کر کے فون بند کر دیا تھا۔

''یہ عاشی بھی۔'' وہ مسکرایا۔ اس نے تکیہ اٹھا کر گود میں رکھا اور اس پر کہنیاں ٹیکتے ہوئے اس کی نظر ان صفحات پر پڑی، جو تکیے کے نیچے پڑے تھے۔ اس نے صفحات اٹھا لئے۔

'ارے! یہ تو ''زمین کے آنسو' کے اندر کے صفحات ہیں۔ شاید فائل میں سے گر گئے ہوں گے اور مسز شیر دل نے اُٹھا کر یہاں رکھ دیئے ہوں گے۔' ان کی عادت تھی کہ وہ کوئی غیر ضروری کاغذ بھی ملازم کو پھینکنے نہیں دیتی تھیں، جب تک ایبک نہ دیکھ لے۔ انہیں ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ کہیں ایبک کا ضروری کاغذ نہ ہو۔ اس نے صفحات پر نظر ڈالی۔ یہ ترتیب سے نہیں تھے۔

'تھینک گاڈ! یہ ضائع نہیں ہوئے۔'

اس نے ایک صفحے پر نظر ڈالی۔

''پتہ نہیں تمہیں کیوں زمین کے آنسو نظر نہیں آتے شاعر! ورنہ زمین تو تب سے رو رہی ہے۔ جب سے حضرت آدمؑ کا پہلا آنسو زمین کی خشک دھرتی پر گرا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے آنسو کے ساتھ ہی زمین نے اپنا پہلا آنسو بنایا تھا اور جانتے ہو، جب قابیل نے اپنی بیوی عدرہ کے بجائے ہابیل کی بیوی اسدہ کی خواہش کی تھی تو زمین تب بھی روئی تھی۔ کیونکہ وہ اس کے انجام سے خوفزدہ تھی۔

ایبک نے پہلا صفحہ سب صفحات کے نیچے رکھا۔ اب ایک اور صفحہ اس کے سامنے تھا۔ اس کی نظریں صفحے پر دوڑ رہی تھیں۔

''اور زمین کا سینہ دُکھوں سے چھلنی ہے۔ اس کے آنسو اس کی ہنسی سے زیادہ ہیں۔ لیکن تم نہیں جان سکتے۔ کیونکہ تم نے یہ زمین کے آنسو دیکھے ہیں اور نہ اس کا درد جانا ہے۔ تمہیں کیا خبر کتنا گہرا درد اس کے دل کو چھلنی کرتا ہے۔ تم نے تو بس زمین کے سینے پر ہل چلایا ہے۔ اپنی مرضی کی فصل ملی تو ٹھیک۔ نہ ملی تو زمین کو ہی کوسا۔ اس کے سینے پر عمارتیں کھڑی کیں اور اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑے۔'' حورعین کہہ رہی تھی اور وہ سر جھکائے سن رہا تھا۔''

اس نے یہ صفحہ بھی نیچے رکھا۔

''زمین نے تو کبھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ تمہارے ہر دکھ پر تمہارے ساتھ مل کر آنسو بہائے۔ جب مکہ کی سرزمین پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو گرم ریت پر لٹا کر اور پتھر رکھ کر گلے میں رسّی ڈال کر گھسیٹا جاتا تھا تو زمین روتی تھی، کرلاتی تھی۔

اور جب ابوجہل حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے پیٹ میں نیزہ گھونپتا تھا اور حضرت سمیہؓ کہتی تھیں ''رب کی قسم، میں

کامیاب ہوگئی۔'' تو زمین ان کا منہ چومتی تھی اور روتی تھی۔ اور پھر جب حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اپنی عزیز رفیقِ حیات حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے خون آلود جسم کو اٹھانے کے لئے جھکے تھے اور ابوجہل نے اپنی تلوار اُن کی کمر میں اُتاری تھی تو زمین نے توحید کے ان نام لیواؤں کو اپنی گود میں بھر کے، ان کے خوبصورت چہروں کو اپنے آنسوؤں سے غسل دیا تھا۔''

ایبک نے اس صفحے کو بھی ایک طرف رکھ دیا۔

'پتہ نہیں، میرے اس ناول کو وہ پذیرائی ملے گی جس کی میں توقع رکھتا ہوں۔ پتہ نہیں، میں اسے اس طرح لکھ پاؤں گا، جیسا لکھنا چاہتا ہوں یا کہیں کوئی تشنگی اور ادھورا پن رہ جائے گا۔'

اس نے اگلے صفحے پر نظر ڈالی۔

''تمہیں پتہ ہے، جب فرعون کے جادوگروں کے سانپوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدھا بن کر نگل گیا تھا تو ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''ہم رب العالمین اور موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کے رب پر ایمان لائے۔''

''ہاں! پتہ ہے۔''

میں بور ہو رہا تھا اور اسے پتہ نہیں کیوں تاریخ کے ایوانوں میں گھسنے کا شوق تھا۔

''تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ جب قبطی قوم کے جادوگر اپنے رب پر ایمان لائے تھے تو فرعون کے حکم پر زندہ حالت میں ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹے گئے تھے اور باقی ماندہ دھڑ کو بڑی بڑی کیلوں سے زندہ حالت میں کھجور کے تنوں میں ٹھونک کر زمین پر گاڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اور زمین ان اہل ایمان پر آنسو بہاتی تھی۔''

''تو......'' میں نے حورعین کی بات کاٹی۔ ''آلِ فرعون پر عذاب بھی تو نازل ہوئے تھے۔''

''ہاں! قحط مسلط ہوئے۔ طوفان آئے۔ کبھی جوؤں کا، کبھی مینڈکوں کا عذاب اور کبھی ٹڈی دل کا حملہ اور کبھی کنوئیں خون سے بھر گئے۔ ہر بار حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا مانگ کر اس عذاب سے نجات دلاتے تھے۔

''ہاں! دعا میں بہت اثر ہوتا ہے۔ پھر پیغمبروں کی دعا۔'' میں نے حورعین کی طرف دیکھا۔

''ہاں......!'' اس نے نظریں اُٹھائیں۔ ''لیکن پتہ نہیں مریم کی دعا میں اثر کیوں نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کی دعائیں عرش سے ٹکرا کر پھر اس کی جھولی میں آ گرتی تھیں......اور وہ پھر سے ہاتھ دعا کے لئے اٹھا لیتی تھی......اگر حورعین کہتی۔ ''اماں! تمہاری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟ تو وہ حورعین پر ناراض ہوتی۔

''تجھے کیا پتہ میری دعائیں......آئندہ ایسا مت کہنا۔ ہمارا کام تو بس دعا کرنا ہے۔ قبولیت، نا قبولیت وہ جانے۔ اور ہمیں تو بس صبر کرنا ہے۔ شکر کرنا ہے۔'' پتہ نہیں اس میں اتنا صبر اور شکر کہاں سے اکٹھا ہو گیا تھا، جو حورعین میں نہیں تھا۔ فریدہ میں نہیں تھا۔ سعدیہ میں نہیں تھا......وہ صبر اور شکر نہ کر سکیں اور مریم کا آنگن سُونا کر کے چلی گئیں......وہ دونوں سعدیہ اور فریدہ......اب رقیہ تھی، جو سب سے بڑی تھی اور اُجڑ کر گھر بیٹھی تھی۔ اور رابعہ تھی، جو بارہ سال کی تھی۔ اور خمسہ تھی، پانچویں۔

ایبک سارے صفحے اکٹھے کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے فائل میں صفحات کے نمبر دیکھے تو انہیں ترتیب سے رکھا اور فائل دراز میں رکھ دی اور پھر کلاک پر نظر ڈالی۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔

'فریش ہو کر ایک چکر ''الریان'' کا لگا لوں گا...... بابا جان سے بھی ملنا ہے اور......اور اریب فاطمہ....' اُس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

'پتہ نہیں اس سے بات بھی ہو سکے گی یا نہیں۔ لیکن دیکھ لوں گا تو تسلی ہو جائے گی......اور پھر اب چند ماہ ہی تو رہ گئے ہیں اس کے امتحان میں۔' پھر وہ واش روم کی طرف مڑا ہی تھا کہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوا اس کا موبائل بج اُٹھا۔ اس نے فون اُٹھایا۔ دوسری طرف ہمدان تھا۔

''کب سے آئے ہوئے ہو؟'' اس کے ہیلو کہتے ہی ہمدان کی آواز آئی۔
''نہ سلام نہ دعا۔ یہ کیا انداز ہے؟ پولیس والوں کی طرح تفتیش شروع کر دی۔''
''وقت دیکھو بے وفا آدمی! کب سے آئے ہوئے ہو اور نہ فون، نہ اطلاع......وہ تو پھپھو کا ابھی فون آیا بابا جان کی طرف تو پتہ چلا، حضرت ایک بجے لینڈ کر چکے ہیں۔'' ہمدان نے ناراضی کا اظہار کیا۔
''سو گیا تھا یار! ابھی اُٹھا ہوں اور اب باتھ لے کر ادھر ہی آ رہا تھا۔''
''او کے! پھر ملاقات ہوتی ہے۔''
وہ ہمدان کے خلوص و محبت کی دل سے قدر کرتا تھا......اور صرف ہمدان ہی نہیں ''الریان'' کے سارے باسی ہی بہت مخلف تھے سوائے مائرہ آنٹی کے۔
'بابا یوں ہی تو اسیر نہیں تھے ''الریان'' کے۔' لبوں پر مسکراہٹ لئے وہ واش روم کی طرف بڑھ گیا اور کچھ دیر بعد وہ الریان کی طرف جا رہا تھا۔
''الریان'' میں کئی خوشخبریاں تمہاری منتظر ہیں۔'' ہمدان نے اُسے گیٹ پر ریسیو کیا تھا۔
''مثلاً کیا؟'' ایبک نے سیڑھی پر قدم رکھا۔
''ایک تو یہ کہ انکل عثمان مستقل پاکستان آ رہے ہیں۔ اگلے ماہ ان کی جاب ختم ہو رہی ہے۔ بلکہ انہوں نے خود جاب چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔''
''گڈ!'' ایبک مسکرایا۔
''اپنے عمر کو بڑی فکر تھی کہ اگر حفصہ دبئی چلی گئی تو ''الریان'' کا کچن ویران ہو جائے گا اور اس کی وقت بے وقت کی فرمائشیں کون پوری کرے گا۔''
ایبک کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
''اور دوسری خوشخبری؟''
''دوسری خوشخبری یہ ہے کہ کل رات ہی نیو میرڈ کپل اپنے طویل ہنی مون سے واپس آ گیا ہے......اور تیسری خوشخبری کا تعلق خاص میری ذات سے ہے۔''
ہمدان نے لکڑی کا بھاری دروازہ کھول کر لونگ روم میں قدم رکھتے ہوئے کہا تو ایبک نے پہلی بار غور سے ہمدان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے۔
''کیا؟'' ایبک نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
''میں صرف تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں نے سمیرا سے بات کی ہے۔''
ایبک نے کسی قدر حیرانی سے اسے دیکھا۔
''اُس روز یاسین نہیں تھا تو مرینہ کے کہنے پر بابا جان نے مجھے کہا کہ میں اُسے ہاسٹل چھوڑ آؤں۔ وہ اپنی امی کی بیماری اور آپریشن کی وجہ سے پورے ایک ماہ بعد آئی تھی۔ میں بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ کہیں اس کی منگنی یا شادی نہ ہو گئی ہو۔'' اس نے ایبک کی طرف دیکھا۔
''تو اس روز میں نے اس سے کہا کہ میری ماما ان کے گھر آنا چاہتی ہیں۔ لیکن میں پہلے آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض ہو تو میں اُنہیں منع کر دوں گا۔ میں نے حفصہ یا مرینہ سے کہنے کے بجائے خود آپ سے بات کرنا مناسب سمجھا۔''
''اور تیری ماما کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔'' ایبک ہنسا۔
''ہاں......لیکن وہ جس طرح کی لڑکی ہے، مجھے ایسے ہی بات کرنا مناسب لگا۔''

''اچھا تو پھر اس نے کیا کہا؟''
''اس نے کہا کہ اگر میرے والدین کو اعتراض نہ ہوا تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن اگر یہ سلسلہ اس کی تعلیم ختم ہونے کے بعد شروع کیا جائے تو وہ یکسوئی سے اپنی تعلیم مکمل کر لے گی۔''
''چلو! تمہاری ٹینشن تو ختم ہوئی۔''
''ہاں! میں اب مطمئن ہوں۔'' ہمدان طمانیت سے مسکرایا۔
''لیکن وہ لمبے لمبے ڈائیلاگ جو تم نے خواتین کے ڈائجسٹوں سے رٹے تھے۔'' ایبک نے اسے چھیڑا۔
''بکومت۔'' ہمدان نے اُسے مُکا مارا۔ ''وہ تو میں اس میں سے ایک کہانی پڑھ رہا تھا۔ منیبہ کے کمرے میں دیکھا تو یونہی اُٹھالیا۔ اچھی لگی تو......''
''میں جانتا ہوں یار! مذاق کر رہا تھا۔''
''وہ ایسی لڑکی ہے آبی! کہ اگر میں اس سے محبت کا اظہار کرتا تو شاید اسے کھو دیتا۔ وہ مجھے غلط سمجھ لیتی۔''
''ارے ایبک بھائی! آپ کب آئے؟'' منیبہ اپنے کمرے سے نکلی تو اس کی نظر ایبک پر پڑی تھی۔
''ابھی کچھ دیر پہلے ہی آیا ہوں۔''
''اس بار بہت دن لگا دیئے آپ نے۔ سچی بہت مس کر رہے تھے ہم سب آپ کو۔''
منیبہ بیٹھی ہی تھی کہ سیڑھیوں سے اُترتی عاشی کی نظر ایبک پر پڑی۔ اور اس نے پیچھے مڑ کر بلند آواز میں کہا۔
''رابی آپا! ایبک بھائی آئے ہیں۔''
اور خود تقریباً بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اُتر کر ایبک کے پاس آئی۔
''ارے کیسی ہے ہماری پرنسز؟'' ایبک نے اسے پیار کرتے ہوئے پاس ہی بٹھا لیا۔
''آپ مجھے کب بہاول پور لے کر جائیں گے؟''
''جب تمہاری چھٹیاں ختم ہوں گی۔''
''اور آپ چھٹیوں میں شادی کریں گے؟''
''نہیں۔'' وہ مسکرایا۔ ''ان چھٹیوں میں نہیں۔''
''ہاں! مجھے پتہ ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ باری باری ہمدان اور منیبہ کی طرف دیکھا اور پھر سر نیچے کر کے یوں مسکرانے لگی جیسے کسی راز کو جانتی ہو۔
ممو کولڈ ڈرنکس لے کر آئی تو منیبہ اُٹھی۔
''ایبک بھائی! آپ رات کا کھانا کھا کر ہی جایئے گا اب۔''
ایبک نے سر ہلا کر منیبہ کے بند کمرے کی طرف دیکھا تو عاشی نے شرارت سے آنکھیں پٹپٹائیں اور ایبک کے کان میں سرگوشی کی۔
''وہ نہیں ہیں، جنہیں آپ ڈھونڈ رہے ہیں۔''
ایبک نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔
''فاطمہ آپی اپنے گھر گئی ہیں۔ کل ہی ان کے بھائی لینے آئے تھے۔'' اس نے پھر ایبک کے کان میں سرگوشی کی۔ تب ہی ہمدان کا موبائل بج اٹھا تو وہ موبائل لے کر کچھ فاصلے پر چلا گیا۔
''عاشی! تم بہت خطرناک ہو۔'' وہ ہنس دیا۔ وہ بات جو الریان میں کوئی نہیں جانتا تھا، عاشی نے جان لی تھی۔
''میں کسی کو نہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ ویسے تمہاری فاطمہ آپی گھر کیوں گئی ہیں؟ خیریت تھی نا؟''
''ان کی اماں بیمار تھیں، اس لئے۔''

تب ہی ہمدان فون بند کر کے ان کے قریب آیا۔
''یار آبی! تم بیٹھو۔ میں پندرہ منٹ میں آیا۔''
''کیوں خیریت ہے؟'' ایبک نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''ہاں! وہ منیر ہے نا، میرا کولیگ۔ اس کے فادر کی میڈیکل رپورٹس آئی تھیں میرے پاس۔ اسے چاہئیں۔ میں اسے دے کر آتا ہوں۔ یہ ساتھ ہی بلاک سی میں جانا ہے۔''
ایبک نے سر ہلایا تو وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا اور اوپر سے آتی رابیل سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ایبک عاشی کی طرف متوجہ ہوا۔
''شیطان کی نانی! اُلٹے سیدھے اندازے نہ لگایا کرو۔''
''السلام علیکم!'' تب ہی رابیل نے قریب آ کر سلام کیا۔
''وعلیکم السلام!'' ایبک نے چونک کر اسے دیکھا اور عادتاً کھڑا ہو گیا۔ ''کیسی ہیں آپ؟''
''فائن!'' رابیل اُٹھ گئی تو ایبک بھی بیٹھ گیا۔
''میں بابا جان کے پاس جا رہی ہوں۔'' عاشی اُٹھ کر عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔
''اور آج کل کیا ہو رہا ہے رابیل؟'' ایبک نے بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔
''کچھ نہیں۔ بوریت ہی ہوتی ہے سارا دن۔ ممی کہہ رہی تھیں، ککنگ کلاسز جوائن کر لوں۔ اور میں سوچ رہی ہوں، کسی لینگویج کلاس میں ایڈمیشن لے لوں۔ فرنچ یا جرمن یا کوئی اور۔''
''میں نے بھی کچھ عرصہ فرنچ زبان سیکھی تھی۔'' ایبک نے اسے بتایا۔
''رئیلی؟'' رابیل نے پوچھا۔
''ہوں! رئیلی۔'' ایبک مسکرایا۔
رابیل کو اس کے ساتھ بات کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس روز جب عاشی نے اسے فون دیا تھا کہ ایبک بھائی کے ساتھ باتیں کر لیں تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ ایبک کا فون کر کے اس کی خیر خیریت پوچھنا بہت اچھا لگا تھا۔ اندر کہیں خوش گمانی کے پھول کھل اٹھے تھے۔ ایبک نے اسے یاد کیا تھا شاید۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس نے بہاول پور جا کر اس سے بات نہیں کی تھی۔ کئی بار اس کا فون ہمدان، عمر اور منیبہ کے لئے آتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی اس کا پوچھا تک نہ تھا۔ چہ جائے کہ اس سے بات کرتا۔ یقیناً وہ اس سے کچھ متاثر ہوا تھا۔ عادل اور حفصہ کی بارات اور ولیمے کے فنکشن میں سب نے ہی اسے سراہا تھا۔ عمارہ پھپھو اور انجی آپا نے بھی اسے نظرِ بد سے بچنے کی دعا دی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں اریب فاطمہ بھلا کیا تھی۔
ایبک اُسے بتانے لگا کہ جب اس نے فرنچ لینگویج کی کلاسز جوئن کی تھیں تو ایک سینئر اسٹوڈنٹ نے اسے جو پہلا جملہ سکھایا تھا، وہ Joie Gulle تھا۔ اور اس کا مطلب تھا ''واہ! کیا کہنے۔'' جبکہ اس نے اس کا مطلب بتایا تھا ''یس میم!'' اور جب وہ میڈم پاولن لیکاولی کی ہر بات کے جواب میں Joie Gulle کہتا تو وہ حیرانی سے اسے دیکھتیں۔
رابیل ہنس رہی تھی اور ایبک کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ جب مائرہ نے لاؤنج میں قدم رکھا، کچھ دیر بعد وہ یوں ہی حیران کھڑی رابیل کو مسکراتے اور دلچسپی سے ایبک کی باتیں سنتے دیکھتی رہیں۔ پھر تیر کی طرح آگے بڑھیں۔
''رابی! کیا کر رہی ہو یہاں؟'' ان کی آواز بلند بھی تھی اور اس میں غصہ بھی تھا۔
رابیل نے مڑ کر مائرہ کی طرف دیکھا۔
''ایبک سے باتیں کر رہی تھی۔''
ایبک جو احتراماً کھڑا ہو گیا تھا، اس نے مائرہ کو سلام کیا۔ لیکن اسے نظرانداز کر کے وہ رابیل سے مخاطب ہوئیں۔

''میں نے تمہیں اس لڑکے سے بات کرنے اور بے تکلف ہونے سے منع کیا تھا۔ پھر.....؟''
رابیل اور ایبک کے چہرے کا رنگ ایک ساتھ بدلا تھا۔ لیکن ایبک میں بلا کا ضبط تھا۔ جبکہ رابیل کے چہرے کا رنگ ہی نہیں بدلا تھا بلکہ وہ بہت غصے سے بولی تھی۔
''ضروری نہیں کہ میں آپ کی ہر فضول بات پر عمل کروں۔'' اس کا لہجہ سخت تھا۔
''رابیل پلیز! آپ جائیں۔ اگر آنٹی نے آپ کو منع کیا تھا تو آپ کو مجھ سے بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔''
ایبک نے رابیل کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا اور پھر مائرہ کی طرف دیکھا۔
''سوری! مجھے علم نہیں تھا کہ آپ نے انہیں منع کر رکھا ہے۔ ورنہ میں کبھی بھی بات نہ کرتا۔''
''بند کرو یہ ڈراما۔ اور معصوم بننے کی کوشش مت کرو۔'' مائرہ کی آواز بلند تھی۔ ''جانتی ہوں اچھی طرح سے تم باپ بیٹے کو۔ میٹھی میٹھی باتیں کر کے میری بیٹی کو ورغلانے کی کوشش مت کرو۔''
''مما! پلیز......'' رابیل نے مائرہ کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ لیکن مائرہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
''یہ خیال ذہن سے نکال دو ایبک فلک شاہ! کہ تم میری بیٹی کو شیشے میں اُتار لو گے۔''
احساسِ توہین سے ایبک کا رنگ سرخ ہو رہا تھا لیکن وہ ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔
''مجھے آپ کی ذہنیت پر افسوس ہو رہا ہے میم مائرہ شاہ! یہ آپ کے اپنے ذہن کی اختراع ہے۔ ورنہ میرے لئے رابیل، حفصہ، مرینہ اور انجی میں کوئی فرق نہیں ہے۔''
ایبک نے حتی المقدور اپنے لہجے کو نرم اور دھیما رکھنے کی کوشش کی تھی۔ رابیل کی آنکھوں میں یکدم آنسو آئے تھے۔
''میرے اختیار میں ہو تو میں تمہیں ''الریان'' میں قدم بھی نہ رکھنے دوں۔'' مائرہ کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔
''ممی......!'' رابیل نے پھر اسے روکنا چاہا تو مائرہ نے اسے ڈانٹ دیا۔
''جاؤ اپنے کمرے میں۔ اب یہاں کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہو؟''
رابیل یک دم مڑی اور تقریباً بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
''اور تم۔'' وہ ایبک کی طرف مڑیں۔ ''اگر ذرا بھی غیرت ہے تم میں تو آئندہ یہاں قدم مت رکھنا۔''
ایبک نے اسی آہستگی اور نرمی لیکن پورے سکون اور اعتماد سے کہا۔
''یہ میرے نانا کا گھر ہے۔ اور آپ مجھے یہاں آنے سے نہیں روک سکتیں۔ اور نہ ہی میں فلک مراد شاہ ہوں کہ آپ کی کسی چال کا نشانہ بن جاؤں گا۔''
اور تب ہی اس کی نظر لاؤنج کے داخلی دروازے پر کھڑے عبدالرحمٰن شاہ پر پڑی جو چھڑی کا سہارا لئے کھڑے تھے اور ان کے وجود میں واضح لرزش تھی۔
''بابا جان!'' ایبک نے دوڑ کر اُنہیں تھاما اور سہارا دے کر صوفے تک لایا۔ مائرہ نے ایک تیز نظر اُس پر ڈالی اور اپنے کمرے کی طرف مڑیں تو کمرے کے دروازے پر احسان شاہ کو کھڑا دیکھ کر لحہ بھر کو ٹھٹکیں اور پھر تیزی سے اندر چلی گئیں۔ احسان شاہ واپس کمرے میں جا چکے تھے۔ ایبک اور عبدالرحمٰن شاہ نے احسان شاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ ایبک نے عبدالرحمٰن شاہ کے ہاتھ تھام رکھے تھے جو اب بھی لرز رہے تھے۔
''تم......تم بیٹا! اس کی باتوں کو اپنے دل پر مت لینا۔ جانتے ہو نا وہ.....''
''جی بابا جان! آپ پریشان نہ ہوں۔ ریلیکس ہو جائیں۔'' وہ زبردستی مسکرایا تھا۔ ورنہ مائرہ کے الفاظ زہریلے کانٹوں کی طرح دل میں چبھے جا رہے تھے اور تکلیف دے رہے تھے۔
'بابا صحیح کہتے تھے، مجھے رابیل اور آنٹی سے محتاط رہنا چاہئے۔ لیکن اس میں رابیل کا کیا قصور؟'
''کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟'' عبدالرحمٰن شاہ کی آواز میں نمی تھی۔ ''بیٹا! یہاں آنا مت چھوڑنا۔ مجھ سے ملنے آتے رہنا۔

آؤ گے نا بیٹا؟'' ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ ملتجی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ''تم آتے ہو تو مجھے لگتا ہے، رے مومی اور عمو آئے ہیں۔ مجھے تمہارے وجود سے ان کی خوشبو آتی ہے۔''

''میں جب تک یہاں ہوں، آپ سے ملنے آتا رہوں گا۔ آپ پلیز پریشان مت ہوں۔'' ایبک نے ان کے ہاتھوں و چوم کر چھوڑ دیا۔

پھر وہ زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھا تھا۔ وہ کم از کم آج کے دن منیبہ، مرینہ اور ہمدان کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ کیا کچن میں ھڑی منیبہ نے مائرہ آنٹی کی باتیں نہیں سنی ہوں گی؟ وہ اتنا اونچا بول رہی تھیں کہ یقیناً مرینہ کے کمرے تک بھی ان کی واز گئی ہوگی۔

پھر وہ بہت دیر تک سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتا رہا اور پُرسکون ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ جب وہ گھر پہنچا تو کرنل شیر دل ابھی تک جاگ رہے تھے۔ جوں ہی اس نے اپنے بیڈروم میں قدم رکھا، فون بج اُٹھا۔ دوسری طرف کرنل یر دل تھے جو اس کے آنے کا جان کر مطمئن ہو گئے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی، جب تک وہ گھر نہ آ جاتا تو وہ جاگتے ہتے تھے۔ چاہے اسے کتنی ہی دیر ہو جاتی تھی۔ اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں دنیا میں، کرنل شیر دل جیسے بے غرض اور بے لوث۔ اور شاید دنیا ان ہی جیسے لوگوں سے قائم ہے۔ کرنل شیر دل کے متعلق سوچتے ہوئے اس کے بے سکون دل کو سکون ملا اور وہ مائرہ کی باتوں کو ذہن سے جھٹک کر چائے بنانے لگا۔

چائے پیتے ہوئے اس کا دھیان اپنے ناول کی طرف چلا گیا تو وہ اس کے متعلق سوچنے لگا۔ اور یہ وہ شعوری کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ آج شام کے واقعے کو ذہن سے نکال سکے۔ چائے پی کر وہ رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گیا اور دراز سے فائل نکال کر ورق گردانی کرنے لگا تاکہ ذہنی طور پر خود کو لکھنے کے لئے آمادہ کر سکے۔ شاید پیچھے سے پڑھتے ہوئے انسپائریشن ہو اور قلم چل پڑے کہ اس وقت نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ ورق گردانی کرتے کرتے وہ ایک جگہ رُکا۔

''تو یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم تھی، جو ملاوٹ اور ناپ تول میں کمی کرتی تھی۔''

''اور یہ سب کچھ تو ہم بھی کر رہے ہیں۔'' میں ایک دم تلخ ہو گیا۔ ''کچھ بھی خالص نہیں ملتا۔ دودھ پینے کو جی نہیں چاہتا۔ اللہ جانے دودھ کے نام پر کیا ملغوبہ دیا جاتا ہے۔ تو کیا ہم پر بھی عذاب مسلط ہونے والا ہے؟''

میں نے خوف زدہ ہو کر حورعین کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں کے کونوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تو یہ عذاب نہیں تو اور کیا ہے؟ ...... کیا پہلے ایسا ہوتا تھا جیسے اب ہو رہا ہے؟ اور یہ جو تم ہر وقت رونا روتے ہو کہ تمہیں اچھے حکمران نہیں ملتے تو کیا یہ بھی عذاب نہیں ہے؟...... لیکن خیر، تم جانتے ہو کہ حضرت یرمیاہؑ کی بعثت کے وقت بنی اسرائیل عراق کی آشوری سلطنت کے حکمران بخت نصر کے باج گزار تھے۔ وہ اخلاقی پستی کی انتہا پر تھے اور ان پر بخت نصر کی صورت میں عذاب مسلط کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے حضرت یرمیاہ کو پنجرے میں بند کر دیا تھا...... اور پھر یوں ہوا کہ یروشلم کی گلیوں میں بخت نصر کے فوجی دندناتے تھے اور زمین گناہگاروں اور بے گناہوں کے خون سے رنگین ہوتی تھی۔''

مجھے اب حورعین پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ یقیناً اس کا مطالعہ میرے علم سے زیادہ تھا۔

''تمہیں ڈر نہیں لگتا شاعر؟'' حورعین بڑی بڑی غزالی آنکھوں میں سہم بھرے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کس بات سے؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنے لوگوں کی اخلاقی پستی سے اور اس بات سے کہ تمہاری زمین بھی بے گناہوں اور گناہ گاروں کے خون سے رنگین ہوئی جاتی ہے۔''

ایبک نے کئی صفحات ایک ساتھ پلٹ دیئے۔

''تو جب زمین اُحد کے شہیدوں کو اپنی گود میں سمیٹتی تھی تو اس کے آنسوؤں سے ان کا خون آلود لباس بھیگتا تھا اور اس خون آلود لباس سے ایسی خوشبو اُٹھتی تھی کہ زمین سانس کھینچ کھینچ کر اس خوشبو کو اپنے اندر اُتارتی تھی اور اپنے آنسوؤں

سے ان کے خون آلود چہروں کو غسل دیتی تھی۔ اور پتہ ہے شاعر! آج بھی جب زائرین اُحد کے میدان میں کھڑے ہو کر سانس کھینچتے ہیں تو کبھی کبھی کوئی ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے جو ان کی سانسوں میں یہ انوکھی خوشبو اُتار دیتا ہے۔ ان غزوات کا احوال تو تم نے اپنی نصاب کی کتابوں میں پڑھ رکھا ہو گا شاعر؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو حورعین کی آنکھوں سے تاسف جھانکنے لگا۔

"لیکن افسوس! ہماری نئی نسلیں یہ سب نہیں جان پائیں گی۔ کیونکہ اب ان کے نصاب سے یہ سب نکال دیا گیا ہے اور گھروں میں والدین اتنے مصروف ہو چکے ہیں کہ ان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی تاریخ سے روشناس کرا سکیں۔"

وہ کتنی ہی دیر تک اسی تاسف کی حالت میں سر جھکائے بیٹھی رہی، پھر اس نے جھکا ہوا سر اُٹھایا اور میری طرف دیکھا۔

"تو ہم غزوۂ اُحد کی بات کر رہے تھے نا؟"

وہ اکثر ایک زمانے کی بات کرتے کرتے دوسرے زمانے میں چلی جاتی تھی۔ لیکن اس وقت اسے یاد تھا کہ ہم غزوۂ احد کی بات کر رہے تھے۔

"ہاں......!" میں نے سر ہلا دیا۔

"وہ احد کا میدان تھا شاعر! اور زمین کے اَن دیکھے آنسوؤں سے بھرا جا رہا تھا۔

جب وحشی، حضرت حمزہؓ کی طرف بڑھتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش پر کھڑے ہو کر کہتے تھے کہ مجھے کبھی اتنا غم اور صدمہ نہیں پہنچا، جتنا آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ہوا ہے تو زمین بلکتی تھی۔ اور انصار کی عورتوں کے ساتھ مل کر آنسو بہاتی تھی۔ اور جب ہندہ، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اعضاء کاٹ کر ان کا ہار اپنے گلے میں ڈال کر خوشی کا اظہار کرتی تھی تو زمین کے آنسو اور شدت سے بہنے لگتے تھے۔

اور جب عقبہ کے پتھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا لب مبارک کٹ گیا تھا اور دائیں طرف کا دانت ٹوٹ گیا تھا۔ اور جب ابنِ قیمہ کے وار سے خود کی کڑیاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ سلم کے رخساروں میں دھنس گئی تھیں اور عبداللہ بن شہاب وار کر کے اس مبارک پیشانی کو خون آلود کرتا تھا، جسے چومنے کو فرشتے بھی بے تاب ہوں تو زمین تڑپتی تھی اور......

جب طلحہ بن عبداللہ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سہارا دے کر گڑھے سے اُٹھاتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن کا ہاتھ تھامتے تھے اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ دانتوں سے ان کے رخساروں میں کھبی ہوئی کڑیاں نکالتے تھے اور مالک بن نسان، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چہرہ مبارک سے خون چوستے تھے تو زمین تڑپتی تھی اور اس کے آنسو رُکتے نہ تھے۔"

"ہاں......!" مجھے بھی کبھی کبھی حورعین پر اپنی معلومات کا اظہار کرنا اچھا لگتا تھا۔ "اسی غزوہ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہوئے تھے تو حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے اپنے سارے دانت توڑ ڈالے تھے۔"

اور حورعین نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی بڑا، کسی بچے کو اس وقت دیکھتا ہے، جب وہ اپنی معلومات کا رعب جھاڑ رہا ہو۔ میں نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

ایبک نے قلم اٹھا کر ایک دو جگہ نقطے لگائے اور آخری صفحہ نکالا۔

آخری صفحہ جو بہاول پور جانے سے پہلے اس نے لکھا تھا۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتا رہا.....اسے پڑھا۔ ایک بار نہیں ،، بار اور پھر قلم اٹھایا۔

"حورعین چلی گئی تھی اور میں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا سوچتا رہا تھا کہ کیا واقعی چوہدری فرید اور شیر افگن کے درمیان کوئی ڈیل ہوئی تھی؟ اور کیا یہ ڈیل رابعہ سے متعلق تھی؟ میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا اور حورعین جیسے جا کر آنا ہی بھول گئی

تھی۔ اور مجھے بے چینی تھی کہ وہ ڈیل۔
اور پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ میں ہر روز اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آتی تھی؟ میں نہیں جانتا تھا۔ پہلی بار میں نے اسے نیچے وادی میں سڑک کے کنارے بیٹھے دیکھا تھا اور پھر وہ اکثر مجھے نظر آنے لگی۔ کبھی چشمے کے کنارے پتھر پر بیٹھی...... کبھی میرے ریسٹ ہاؤس کے ٹیلے کے باہر کسی پتھر پر سوچوں میں گم۔ ہمارے درمیان خود بخود ہی بات چیت شروع ہوگئی تھی۔ وہ کبھی روز آ جاتی اور کبھی کئی کئی دن بعد۔ لیکن اتنے زیادہ دن تو اس نے کبھی نہیں لگائے تھے۔ اور میں صرف اس کی وجہ سے رُکا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے یا پھر یہ جاننے کے لئے کہ وہ ڈِیل کیا تھی، جس نے چوہدری فرید کو مطمئن کر دیا تھا۔
اُس روز بھی میں اپنے ریسٹ ہاؤس کی پتھریلی سیڑھیوں پر بیٹھا سوچ رہا تھا، بہت دن ہو گئے، مجھے اب واپس کراچی چلا جانا چاہئے۔ جب ایک بڑے پتھر کے پیچھے سے مجھے ایک سیاہ اوڑھنی والا سر نظر آیا اور پھر اس پتھر کے پیچھے سے ہولے ہولے وہ نمودار ہوئی اور پتھروں پر پاؤں رکھتی اپنی مخصوص جگہ کی طرف بڑھی۔ حسبِ معمول اس کی اوڑھنی کا ایک پلّو زمین کو چھو رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور ذرا فاصلے پر نیچے بہتے چشمے کو دیکھنے لگی۔ میں پڑھیاں پھلانگتا اس کے قریب آیا اور دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔
''حورعین! کہاں تھیں تم؟...... اتنے دن لگا دیئے۔ میں تمہیں بہت مِس کر رہا تھا۔'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
''طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' اس نے بس ایک نظر مجھے دیکھا۔
''اب...... اب کیسی ہو تم؟ مجھے لگتا تھا جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہو۔ حورعین! تم میرے......''
اپنی ہی جذباتیت سے خوف زدہ ہو کر میں نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اسے دیکھا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ سامنے پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''میں ٹھیک ہوں۔'' ہمارے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ آ گیا۔ میں نے ایک چھوٹا سا پتھر اُٹھا کر نیچے چشمے میں پھینکا اور حورعین کی طرف دیکھا۔
''تم ڈِیل کے متعلق جاننے کے لئے بے چین ہو نا؟'' وہ بلاشبہ بے حد ذہین تھی اور اندر تک کا حال کھوج لیتی تھی۔
''ہاں۔ وہ ثریا...... کیا وہ واپس آ گئی تھی؟'' میں ہکلایا۔
''ہاں، ثریا آ گئی تھی۔ اور چوہدری فرید بے حد خوش تھا۔ لگتا تھا اسے فریدہ کی موت کا کوئی دکھ نہ تھا۔ خوش تو ثریا بھی تھی۔ جب وہ اپنی شادی سے نا اُمید ہوگئی تھی تو اُسے چوہدری فرید مل گیا تھا جس عمر چالیس بیالیس سال سے زیادہ تھی۔ اور ان دنوں وہ ثریا پر دیوانہ وار نثار ہو رہا تھا...... اسے ڈیرے اور وہاں کی سرگرمیاں بھی بھولی ہوئی تھیں۔ اور مریم بھی مطمئن تھی کہ وہ گھر پر ہے۔ اور ثریا کی اور اس کی خاطر داری میں لگی رہتی، یہ بھول کر کہ وہ اس کی بیٹی کا قاتل ہے۔ ان دنوں تو اسے گھڑونچی کی جالیوں میں سے داور سائیں کو دیکھنا بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ لیکن جب رات کو سونے کے لئے لیٹتی تو سماعتیں دارو سائیں کی آواز سننے کو بے تاب ہو جاتیں اور دارو سائیں قبرستان میں فریدہ اور سعدیہ کی قبروں کے پاس بیٹھا جانے کیا سوچتا رہتا۔
ثریا کو اس گھر میں آئے تین ماہ گزر گئے تو چوہدری فرید کو ڈیرے کی یاد آئی اور پھر ڈیرے کی راتیں جاگ اُٹھیں اور ثریا کمرے سے گھبرا کر برآمدے اور پھر صحن میں نکل آتی۔ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی اور اِدھر سے اُدھر چکر لگاتی۔
''ثریا! بیٹھ جا۔'' مریم اُسے سمجھاتی۔ ''وہ آج رات نہیں آئے گا۔''
''آپ کو کیسے پتہ آپا؟ کیا بتا کر گئے ہیں؟'' ثریا بے چین سی ہو کر مریم کے پاس کھڑی ہوگئی جو گھڑونچی کے پاس کھڑی تھی۔
اور اب مریم اسے کیا بتاتی کہ اسے کیسے پتہ۔ اور اس نے ابھی ابھی گھڑونچی کی جالیوں میں سے نور و مصلن کو تیز

سرخ لپ اسٹک لگائے اور گلابی جارجٹ کے سوٹ کے نیچے گلابی ہی اونچی ایڑی کے جوتے پہنے ڈیرے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔

''بس مجھے پتہ ہے ثریا! تو جا کر آرام سے سو جا۔''

مریم جالی سے باہر دیکھنے لگی تھی جہاں بڑے دنوں بعد داروسائیں پیپل کے نیچے آ کر بیٹھا تھا اور اوپر آسمان کی طرف چہرہ اُٹھائے جانے کیا دیکھتا تھا۔

مریم نے ثریا کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن ثریا کو ڈیرے کے راز جاننے میں زیادہ دن نہیں لگے تھے اور اسے نورو اور میراں جیسی عورتوں کے ساتھ چوہدری فرید کی شراکت گوارا نہ تھی۔ اس لئے وہ رُوٹھ کر میکے جا بیٹھی۔

''ہوں۔'' مجھے اطمینان ہوا۔ ''جان چھوٹی۔''

حورعین نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور چھوٹے چھوٹے کنکر اُٹھا کر نیچے چشمے میں پھینکنے لگی۔

''تو کیا ثریا نے طلاق لے لی؟'' میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''نہیں۔'' حورعین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایک روز رابعہ صحن میں کھیل رہی تھی اور چوہدری فرید اس روز کئی دنوں بعد ڈیرے سے آیا تھا اور سرخ پایوں والے پلنگ پر بیٹھا بغور اسے دیکھتا رہا۔ اور لسی بلوتی مریم اُس کے اس طرح دیکھنے پر سہم سہم جاتی تھی اور رابعہ، مریم کے خوف سے بے نیاز ایک ٹانگ پر اُچھلتی ہوئی پاؤں سے مٹی کے گول ٹکڑے کو اگلے خانے میں پھینکتی تھی اور پھر لکیروں سے بچ کر اگلے خانے میں قدم رکھتی اور مسرور ہو کر پیچھے دیکھتی۔ مریم لسی کے گلاس میں مکھن کا پیڑا ڈال کر کانپتے قدموں سے چوہدری فرید کی طرف بڑھی تو چوہدری فرید نے ڈپٹتے ہوئے کہا۔

''یہ تُو اسے کھلاتی پلاتی نہیں ہے مریم؟ دیکھ کیسی سوکھی سڑی ہے۔ تیرہ کی ہونے والی ہے اور دس کی بھی نہیں لگتی۔ آخر گھر میں اتنا دودھ مکھن ہوتا ہے کس لئے؟''

مریم کا ہاتھ کانپ گیا اور لسی چھلک کر چوہدری فرید کے کپڑوں پر گری اور کچھ سخت بات کہتے کہتے چوہدری فرید نے ہونٹ بھینچ لئے۔

''اسے روز دیسی انڈا اور دودھ دیا کر۔ مرغی بھون کر کھلایا کر۔''

چوہدری فرید اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور مریم اسی پلنگ پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ بار بار ہاتھ دعا کے لئے اُٹھاتی اور پھر گرا دیتی۔ آخر وہ اُٹھی اور وضو کر کے جاءنماز پر بیٹھ گئی۔

''تو کیا......؟'' لفظ میرے حلق میں ہی اٹک گئے۔

حورعین نے کچھ نہیں کہا۔ بس کنکر اُٹھا اُٹھا کر پانی میں پھینکتی رہی۔ کچھ دیر بعد جب اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں شاید ضبط کی کوشش میں خون رنگ ہو رہی تھیں۔

''ہاں، اُس نے ڈیل کی تھی کہ رابعہ جب تیرہ برس کی ہوگی تو...... ثریا کو چودھری شیر افگن نے یونہی تو نہیں بھیجا تھا۔

''نہیں۔'' میں کانپ گیا اور تسلی دینے کے لئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور پھر فوراً ہی ہٹا لیا۔

''جب چوہدری فرید نے مریم کو بتایا کہ اب رابی کی رخصتی کرنی ہی ہوگی، ثریا تب ہی گھر آئے گی تو مریم نے رابعہ کو اس طرح اپنی گود میں چھپا لیا جیسے وہ دو تین سال کی بچی ہو۔ مریم مرغی کی طرح اسے پروں میں سمیٹے دونوں ہاتھ چوہدری فرید کے سامنے جوڑتی تھی اور اس کی آنکھوں سے صرف آنسو بہتے تھے اور ہونٹوں سے کچھ نہ نکلتا تھا۔ تب رقیہ، چوہدری فرید کے سامنے آ کر اس کی زبان بن گئی۔

''ابا! رابی بہت چھوٹی ہے۔ بچی ہے۔''

اور تب بیس سالہ رقیہ کو چوہدری فرید نے غور سے دیکھا تھا اور سوچا تھا۔ رقیہ کی بھی تو بات ہو سکتی تھی...... اور اسے خیال کیوں نہ آیا؟ لیکن اب کیا فائدہ؟ وہ تو زبان دے چکا اور وہ زبان سے پھرنے والا نہیں۔ اور رقیہ التجا کرتی تھی

رابی کو معاف کر دے اور چاہے تو اسے...... وہ راضی ہے۔"
"تو کیا پھر رابعہ یا رقیہ؟" میں از حد بے چین ہو رہا تھا۔
"مریم کی دعائیں بھی تو تھیں نا۔" حورعین نے جیسے میری بات ہی نہیں سنی تھی اور اپنے آپ میں گم کہہ رہی تھی۔
"اُس روز جب شیر افگن نے چوہدری فرید کو پیغام بھیجا کہ "اللہ نے تجھے بیٹا دیا ہے۔ اپنا وعدہ پورا کر اور ثریا کو گھر لے جا۔ نہیں تو طلاق بھجوا دے اور بیٹے کو بھول جا۔" تو چوہدری فرید بھاگتا ہوا شیر افگن کے گھر پہنچا تھا اور وعدے کی تجدید کر کے لوٹا تھا۔ اس روز وہ بات بے بات ہنستا تھا اور اس کے ہاتھ اپنی مونچھوں پر جاتے تھے۔ اب وہ بھی سر اونچا کر کے چلے گا۔ اس نے بڑی حقارت سے مریم کو دیکھا تھا اور مریم چادر اوڑھے سر جھکائے بِنا کچھ کہے گھر سے باہر نکل گئی تھی۔ اور جس وقت فوجا نائی پُورے گاؤں میں بتاشے بانٹتا تھا تو مریم قبرستان میں فریدہ کی قبر پر سر رکھے روتی تھی اور اِدھر اُدھر کوئی قریبی جگہ تلاشتی تھی، جہاں رابعہ کی قبر بننے والی تھی۔ رابعہ جو ابھی پورے تیرہ سال کی نہیں ہوئی تھی اور جو سارا دن گڈیوں، پٹولوں سے کھیلتی تھی اور زمین اس کے حوصلے اور صبر پر حیران ہوتی تھی اور قبرستان میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھے دارو سائیں کو مریم نے اُٹھتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ سعدیہ اور فریدہ کو سلام کر کے ہولے ہولے چلتی دارو سائیں کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔
"داراشکوہ!" مریم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو دارو سائیں نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔
آنکھیں، جن میں پہچان کی کوئی رمق نہ تھی۔ جو بالکل خالی خالی اور ویران لگتی تھیں۔
"داراشکوہ۔"
ایک لڑکی تھی جو اسے پورے نام سے بلاتی تھی۔ لیکن دارو کو کچھ یاد نہ آتا تھا کہ یہ عورت کس کا نام لیتی ہے۔
"میری رابی کے لئے دعا کرو داراشکوہ!...... وہ......" آنسو مریم کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔
دارو سائیں ویران آنکھوں سے اسے تکتا تھا۔ وہ پھر ایک دم اُٹھا اور تیز تیز چلتا ہوا قبرستان سے باہر نکل گیا۔
"میری دعائیں۔" مریم سر اٹھا کر آسمان کی طرف تکتی تھی۔ "میری حورعین، میری خمسی کہتی ہے میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ یہ تو صرف تُو جانتا ہے مولا!"
اور دعا تو قبول ہو چکی تھی۔
اور اس روز حورعین کو لگا، مریم کی دعائیں کھوئی نہیں تھیں بلکہ کہیں محفوظ تھیں۔
اس روز رابی اور حورعین صحن میں پٹھوگرم کھیل رہی تھیں، جب ثریا، بیٹا گود میں لئے بڑی شان سے حویلی میں داخل ہوئی تھی اور وہ دونوں کھیل چھوڑ کر بچہ دیکھنے بھاگی تھیں اور چودھری فرید، رابی کو ڈانٹتا تھا کہ وہ بچوں کی طرح کیوں کدکڑے لگا رہی ہے۔ اور عین اسی وقت شیر افگن کا بلڈ پریشر ہائی ہوا تھا اور اسے برین ہیمبرج ہو گیا تھا۔ ادھر چوہدری فرید، ثریا کے ساتھ بیٹھا رابی اور شیر افگن کے نکاح کا پروگرام سیٹ کر رہا تھا۔ اور ادھر شیر افگن آخری سانس لے رہا تھا۔ اٹیک کے تیسرے دن وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔"
اور میں نے کتنی دیر کا رُکا ہوا سانس باہر نکالا۔
اس روز بھی مریم بہت روئی تھی، پوری رات۔ اور رقیہ ماں کی طرح اس کا سر سینے سے لگا کر تھپکتی تھی اور ہولے ہولے کہتی تھی۔
"اماں!...... اماں! رابی ہمارے پاس ہے۔" وہ سوئی ہوئی رابی کی طرف اشارہ کرتی تھی۔
"زندگی اتنی مشکل کیوں ہے حورعین؟"
میں نے ایک کنکر اُٹھا کر نیچے پانی میں پھینکا۔ اس چشمے کا پانی سامنے والے پہاڑ سے ہوتا ہوا نیچے اکٹھا ہوتا تھا۔
ہاں، زندگی تو مشکل ہے۔"

حورعین اپنی چادر درست کرتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔''
لکھتے لکھتے ایبک کے ہاتھ تھک گئے تو وہ قلم ٹیبل پر رکھ کر اُنگلیاں دبانے لگا۔
ایبک نے سوچا، اپنے لئے کافی کا ایک کپ بنا لے اور کافی پی کر کچھ مزید لکھ لے۔ وہ بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی انگلیاں دباتے ہوئے اُٹھا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اس کی نظریں بے اختیار کلاک کی طرف اُٹھیں۔ دو بجنے والے تھے۔ 'اس وقت...... یا اللہ خیر'
اس نے تیزی سے فون اُٹھایا۔ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ پھر بھی اس نے اٹینڈ کیا۔
''ہیلو......!'' دوسری طرف کسی نے ہلکی سی سسکی لی تھی۔
''ہیلو! کون......کون ہے؟'' وہ بے تاب ہوا۔
''میں رابیل ہوں۔''
''اوہ رابیل......!'' ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ایبک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''آپ کو اس وقت فون نہیں کرنا چاہئے تھا۔ خیریت ہے؟'' شدید خواہش کے باوجود وہ فون بند نہیں کر سکا۔
''مما نے جو کچھ کیا، میں اس کے لئے بہت شرمندہ ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ پلیز مجھے معاف کر دیجئے۔''
''آپ کا بھلا اس میں کیا قصور رابیل؟'' ایبک کا لہجہ نرم تھا۔
''لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی۔ بار بار مجھے خیال آ رہا ہے کہ میری وجہ سے مما نے آپ کی انسلٹ کی۔ کاش میں آپ سے بات نہ کرتی۔'' وہ رونے لگی تھی۔
''اِٹس اوکے رابیل! پلیز، روئیں مت۔''
رابیل کی سسکیاں تیز ہوگئیں۔
''پلیز رابیل! اس طرح رو کر آپ مجھے پریشان کر رہی ہیں۔ میں نے کچھ محسوس نہیں کیا۔''
''عمر کو پتہ چلا تو وہ بھی مما سے لڑا۔ میں نے کہا تھا، وہ آپ کو فون کر کے معذرت کر لے۔ لیکن اُس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر میں نے اسے نمبر لے لیا کہ فون کروں گی۔ لیکن پھر سمجھ نہیں آتا تھا، کیا کہوں۔ عمر بھی بہت اپ سیٹ ہے۔'' اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔
''آپ پلیز آرام سے سو جائیں۔ بہت رات ہوگئی ہے۔ اور عمر سے میں خود بات کر لوں گا۔ اوکے!''
''سوری۔ میں نے اس وقت آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔''
''کوئی بات نہیں۔''
ایبک نے فون بند کر دیا تھا۔ ڈسٹرب تو وہ ہو گیا تھا......اس لئے کافی پینے اور لکھنے کا ارادہ ترک کر کے وہ بیڈ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

❁○❁

مائرہ نے کروٹ بدلتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو اس نے دیکھا، احسان شاہ صوفے پر بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ مائرہ کی نظریں سامنے دیوار پر لگے کلاک پر پڑیں۔ اڑھائی بج رہے تھے۔ تو کیا احسان شاہ ابھی تک سوئے نہیں؟ احسان شاہ سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ لیکن کبھی بہت ڈپریس ہوتے تو ایک آدھ سگریٹ پی لیتے تھے۔ مائرہ نے نیم وا آنکھوں سے اُنہیں دیکھا۔ وہ جلتا ہوا سگریٹ ہاتھ میں لئے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

'تو کیا احسان شاہ ابھی تک شام کے واقعے کی وجہ سے ڈپریس ہیں؟' مائرہ نے سوچا۔

پتہ نہیں ایک کو رابیل سے بات کرتے اور رابیل کو مسکراتے دیکھ کر اُنہیں کیا ہو گیا تھا۔ خود پر قابو ہی نہیں رکھ سکی تھیں۔ اُنہیں خیال ہی نہیں رہا تھا کہ احسان شاہ کمرے میں ہیں اور ان کی آواز یقیناً ان تک جائے گی۔ پہلے ہی اس رات کے بعد وہ کتنی مشکل سے اُنہیں قائل کر سکی تھیں۔ احسان شاہ اُس روز رابیل کے کمرے سے بنا کچھ بات کئے نیچے آ گئے تھے اور پھر اگلے کئی دن تک انہوں نے مائرہ سے بات نہیں کی تھی اور نہ ہی ان کی کسی بات کا جواب دیا تھا۔ حالانکہ کتنی بار انہوں نے بلانے کی کوشش کی تھی۔

''پلیز شانی! میری بات سنو۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس طرح بلا قصور مجھے سزا مت دو۔''

اس رات جب احسان شاہ سونے کے لئے لیٹے تو وہ رو پڑی تھیں۔ تب احسان شاہ اُن کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''میں مانتی ہوں۔ میں نے ٹھیک سے شکل نہیں دیکھی تھی۔ یہ میرے اندر کا ڈر تھا کہ میں نے سمجھا، وہ ضرور فلک شاہ ہو گا۔ تم نہیں جانتے جب سے فلک شاہ، ملک ہاؤس میں آ کر ٹھہرا ہے، میں خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا مجھ سے۔ تو میں نے تم سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا اس دھمکی کا۔ لیکن اب جب وہ آیا تو میں بہت ڈر گئی تھی۔ میرے لاشعور میں تھا کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھائے گا۔ اس لئے۔ پلیز شانی! میرا یقین کرو۔ میری شادی سے پہلے بھی ایک بار اُس نے زبردستی......''

''بس کرو مائرہ!'' احسان شاہ نے اُنہیں روک دیا تھا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''میرا یقین کرو۔ میں نے کسی کو دیکھا تھا سیڑھیاں چڑھتے۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔''

اور احسان شاہ نے ان کا یقین کر لیا تھا۔ کیونکہ شمو نے بھی اعتراف کر لیا تھا کہ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر چلی گئی تھی اپنے کوارٹر میں۔ اور ہو سکتا ہے کوئی لان کی دیوار پھلانگ کر آیا ہو اور دروازہ کھلا دیکھ کر اندر آ گیا ہو۔ ایسا ہو سکتا تھا۔ احسان شاہ نے مان لیا تھا لیکن مائرہ کا غصہ کم ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھولتی رہی تھیں۔ وہ ایسا کچھ نہ کر سکی تھیں جو فلک شاہ کو ہمیشہ کے لئے سب کی نظروں میں گرا دیتا۔ اس ناکامی نے ان کے اندر غصہ بھر دیا تھا۔ عادل اور حفصہ کی شادی میں ایک کو سب کے ساتھ ساتھ دیکھ کر وہ جلتیں۔ یہ ایک ہی تو تھا جس نے ٹوٹے رابطے جوڑے تھے۔ اُنہیں ایک پر بھی غصہ تھا۔ بلکہ وہ نفرت کرتی تھیں صرف ایک سے ہی نہیں، فلک شاہ کے خاندان کے ہر فرد سے۔ اور اب رابیل کو (ہنسی) اور شوق سے ایک کی بات سنتے دیکھ کر وہ بھڑک اُٹھی تھیں۔ لیکن پھر احسان شاہ کو دروازے سے اندر مڑتے دیکھ کر

وہ پریشان ہوگئی تھیں اور وہ جو رابیل کے پیچھے جانا چاہتی تھیں، کمرے میں آگئی تھیں۔ احسان شاہ سنجیدہ سے بیٹھے تھے۔
''وہ شانی......!''
وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ احسان شاہ نے اُنہیں ٹوک دیا۔
''یہ سب کیا تھا مائرہ؟''
''میں برداشت نہیں کرسکتی شانی! کہ اس شخص کا بیٹا اکیلے میں بیٹھ کر میری بیٹی سے گپ شپ لگائے۔ بیٹا بھی یقیناً ایسا ہی ہوگا، جیسا باپ ہے۔''
''تم یہ بات آرام سے بھی کرسکتی تھیں مائرہ!'' احسان شاہ نے تاسف سے کہا۔ ''اپنی ہی بیٹی کو تماشا بنانے کی کیا ضرورت تھی؟''
''تم ٹھیک کہتے ہو شانی! لیکن مجھے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔''
''جاؤ، رابی کو دیکھو۔ وہ یقیناً رو رہی ہوگی۔'' احسان شاہ نے کہا تھا اور پھر خود ہی منع کر دیا تھا۔ ''نہیں۔ اس وقت وہ اپ سیٹ ہوگی۔ بعد میں بات کر لینا۔''
اور انہوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ احسان شاہ ان سے ناراض نہیں ہوئے تھے۔ لیکن رات کے اس پہر وہ صوفے پر بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے تو یقیناً وہ شام کے واقعے سے اپ سیٹ ہوں گے۔
مائرہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔
''تم سوئے نہیں شانی! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''
''ہاں۔ ٹھیک ہوں۔ بس نیند نہیں آ رہی تھی۔ تم سو جاؤ۔'' احسان شاہ نے جلتا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اس میں ڈال دیا۔
''سوری شانی! شام مجھے....''
''اِٹس او کے مائرہ!'' احسان شاہ نے ہاتھ اُٹھا کر اُنہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔
''تم خود پر قابو رکھا کرو مائرہ! ایبک، بابا جان سے ملنے آتا رہے گا پھر بھی۔ اور یہاں سب بچوں سے اس کی دوستی ہے۔ عمر اور زبیر سے بھی۔ رابیل کی پھپھو کا بیٹا ہے وہ۔ اگر اس نے ایبک سے بات کر لی تھی تو یہ ایسی ٹیمپر لوز کرنے والی بات نہیں تھی۔'' احسان شاہ نے نرمی سے اُنہیں سمجھایا۔
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو شانی! لیکن میں...... اس کی اور ہمدان کی شادی ہو جاتی تو میں بھی مطمئن ہو جاتی۔ کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ کہیں ایبک کے ذریعے فلک شاہ انتقام نہ لے۔ تم..... تم کیوں نہیں سمجھاتے رابی کو؟ ہمدان میں آخر برائی کیا ہے؟'' مائرہ نے پریشانی کا اظہار کیا۔
''مائرہ! میں نے تم سے کہا تھا، اب ہمدان اور رابی کی شادی کا ذکر مت کرنا۔ جب وہ ہمدان سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' احسان شاہ بے حد سنجیدہ لگ رہے تھے۔
''میں نے تو سوچا تھا، ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ ہمدان اچھا لڑکا ہے۔ ہمدان سے اس کی شادی ہوگئی تو ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔''
احسان شاہ نے مائرہ کے لہجے میں چھپی افسردگی کو محسوس کیا اور تسلی دینے والے انداز میں کہا۔
''زبردستی کی شادیوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ مائرہ! پلیز یہ خیال ذہن سے نکال دو اب۔''
مائرہ نے سر ہلاتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ سے پانی گلاس میں ڈالا اور پانی پیتے پیتے یکدم چونکیں۔
''شانی پلیز! وہ مونا بھابی نے کچھ عرصہ پہلے اپنے بھتیجے کے لئے بات کی تھی مجھ سے۔ لیکن تب میرے ذہن میں ہمدان کا خیال تھا۔ ورنہ طاہر ہر لحاظ سے ایک بہترین لڑکا ہے۔ آپ ملے تو ہیں اس سے، ابھی جب ہم رحیم یار خان

گئے تھے۔"

"ہاں!" احسان شاہ نے سر ہلایا۔

"تو میں بھابی سے بات کروں صبح؟" مائرہ نے پوچھا تو احسان شاہ چونکے۔

"نہیں۔ پہلے رابی کی مرضی پوچھ لو۔ لیکن جلدی مت کرنا۔ ابھی اپ سیٹ ہو گی وہ۔ دو تین دن تک بات کرنا۔" احسان شاہ نے پاس پڑی کتاب اُٹھائی تھی۔

❁○❁

جنید علی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے احمد رضا لونگ روم کے دروازے تک آیا۔ ثمینہ حیدر کو آواز دے کر دو کپ چائے لانے کے لئے کہا اور جنید علی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

وہ دونوں ابھی ابھی تقریباً چار گھنٹے کا سفر کر کے آئے تھے۔ لیکن احمد رضا کو تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ موٹر وے پر سفر کرتے ہوئے وہ بالکل تھکن محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ سارا وقت وہ اردگرد کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ خوبصورت پہاڑ، سرسبز زمینیں، کینو اور مالٹے کے باغات۔

کل رات وہ جنید علی کے ساتھ موٹر وے کے ذریعے کلر کہار سے کچھ آگے ایک گاؤں میں گیا تھا۔ جنید علی نے کل سہ پہر اچانک ہی اسے فون کیا تھا کہ وہ تیار رہے، ایک جگہ جانا ہے۔ کہاں جانا ہے؟ نہ اس نے پوچھا تھا اور نہ جنید علی نے بتایا تھا۔ وہ عصر سے ذرا پہلے جنید کی گاڑی میں نکلے تھے اور مغرب کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ یہ ایک مدرسہ تھا۔ تین منزلہ شاندار عمارت جو گاؤں سے کافی ہٹ کر تھی۔ اتنے چھوٹے سے گاؤں میں آبادی سے ہٹ کر اتنا شاندار اور بڑا مدرسہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا اور اس نے جنید علی سے پوچھا تھا کہ آخر وہ یہاں اس مدرسے میں کیا کرنے آئے ہیں؟ اور جنید علی نے مسکراتے ہوئے اسے ٹال دیا تھا۔

"پتہ چل جائے گا یار!"

رات اُنہیں مدرسے میں ہی قیام کرنا تھا۔ یہ جنید علی نے اسے راستے میں بتا دیا تھا۔ "واپسی کل صبح ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔" اُس کا کون تھا جسے اُس نے بتانا تھا۔

اُنہیں فوراً ہی دو نوجوان لڑکوں نے ایک کمرے میں پہنچا دیا تھا۔

"مفتی صاحب سے رات کے کھانے پر ملاقات ہو گی۔ ابھی آپ آرام کریں۔"

اور جب وہ ڈرائنگ روم کی طرف جا رہے تھے تو اس کی ملاقات طیب خان سے ہوئی تھی۔ طیب نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔

"ہیلو احمد رضا! کیسے ہو؟"

"فائن!" وہ حیران ہوا تھا۔

"تم کتنا بھی بھیس بدل لو، طیب خان کی نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں...... یہ رچی بھی۔" وہ ہنسا تھا۔ "میں نے جب رحیم یار خان میں پوچھا تھا کہ کیا احمد حسن ہی احمد رضا ہے تو ٹال گیا تھا۔ لیکن جب میں نے تمہارے ساتھ پروگرام کیا تھا، تب ہی پہچان لیا تھا تمہیں کہ احمد حسن کے بھیس میں احمد رضا ہے۔ ہاں...... لیکن اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جلدی ہی مجھے تمہارے ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔ اور جب تم مجھے ملو گے تو خود ہی جان لو گے کہ احمد حسن کون ہے۔"

"ہاں۔ آگ اور پانی کا میل ہو تو نہیں سکتا لیکن رچی بہادر سب کچھ کر سکتا ہے۔ مجھے حکم ملا تھا کہ مجھے تمہارے ساتھ لاہور میں رہ کر کام کرنا ہے۔ لیکن پھر آرڈر آیا کہ فی الحال نہیں۔ فی الحال جو کر رہے ہو، وہی کرو۔"

"ہاں، رچی نے مجھے تمہارے وڈیو کلپس دکھائے تھے۔" وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آ ہاہا!" وہ پھر ہنسا۔ "تو رچی نے تمہیں دکھانے کے لئے وہ کلپس منگوائے تھے؟"

''مجھے لگا تھا تم خدائی یا نبوت کا دعویٰ کرنے والے ہو۔''
''ارے نہیں۔'' طیب خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔ ''اس میں مارے جانے کا رِسک ہے۔ سر پھروں کی کمی نہیں ہے یہاں تمہارے اس ملک میں۔''
''ہاں!'' اُسے ایک دم حسن رضا کا خیال آیا تھا۔ سر پھروں کی واقعی کمی نہیں ہے اس ملک میں۔ اگر حسن رضا سر پھرے نہ ہوتے تو بھلا یوں اس طرح ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے نکال کر دروازہ بند کر دیتے؟
''کیا سوچ رہے ہو دوست؟ پیری فقیری میں ایسا کوئی رِسک نہیں ہے۔ بہت ہوا تو یہی کہہ لیں گے کہ پیر جھوٹا ہے بس...... یوں سر قلم کرنے کو کوئی بے چین نہیں ہوگا۔''
''دیکھے تھے تمہارے پرستار۔''
''میں تو خود حیران ہوتا ہوں ان کی دیوانگی پر۔'' طیب خان نے تبصرہ کیا تھا۔ ''ویسے ہمیں مل کر ہی کام کرنا ہے۔ لیکن فی الحال دُور دُور رہ کر۔''
طیب خان نے مزید بات نہیں کی تھی اور کوریڈور سے ایک طرف مڑ گیا تھا۔
''کھانے پر ملاقات ہوتی ہے پھر۔''
جنید علی خاموش رہا تھا۔
اور پھر کھانے کی ٹیبل پر ہی اس کی ملاقات اختر مسعود سے ہوئی تھی۔ جنید علی نے اس کا تعارف کروایا تھا۔
''یہ مفتی اختر مسعود صاحب ہیں۔ اس درس گاہ کے سربراہ۔ ان ہی کی نگرانی میں سب کچھ ہوتا ہے یہاں۔''
اختر مسعود نے چغہ پہنا ہوا تھا اور سر پر پگڑی تھی۔ اسے اختر مسعود پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اسے کسی لومڑی کی طرح چالاک لگا تھا اور اس کی نظریں اسے اپنے وجود میں اُترتی محسوس ہوئی تھیں۔
اختر مسعود سے ان کی زیادہ بات نہیں ہوئی تھی۔ طیب خان کے آنے کے بعد کھانا خاموشی سے کھایا گیا تھا۔ پھر اختر مسعود کے کہنے پر دو لڑکوں نے اُنہیں درس گاہ دکھائی تھی۔ فی الوقت اس میں تین سو طلباء تھے۔ احمد رضا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ ایک کمرے میں بڑی عمر کے طلباء بھی تھے جن کی عمریں پچیس چھبیس سال سے زیادہ لگتی تھیں۔
''کیا یہ بھی پڑھتے ہیں؟'' اس نے جنید علی سے پوچھا تھا۔
''علم حاصل کرنے کے لئے عمر کی تو کوئی قید نہیں ہوتی احمد رضا!'' جنید علی نے آہستگی سے کہا تھا۔
آج صبح ناشتے کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ آتے ہوئے طیب خان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہاں، اختر مسعود اُنہیں خدا حافظ کہنے گیٹ تک آیا تھا۔
''اب ہم آپ سے رابطے میں رہیں گے۔'' اختر مسعود نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ کتنی دیر تک احمد رضا کی اُنگلیاں درد کرتی رہی تھیں۔
ایک ہفتہ قبل ہی وہ رحیم یار خان سے واپس آیا تھا۔ الوینا اور ارباب حیدر نے اُسے بریف کیا تھا کہ اسے فی الحال ابھی لاہور ہی میں رہنا ہے۔ اور خود کو ایک محبِ وطن پاکستانی ثابت کرنا ہے۔ پھر سے کام اور آرٹیکل لکھنے ہیں اور ایسے لوگوں سے تعلق رکھنا ہے جن کی حب الوطنی میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ ان طلباء سے دوبارہ رابطہ کرنا ہے جو دو ماہ پہلے اس کے گھر آیا کرتے تھے۔
اس کے بعد دوسرا مرحلہ چینل لانچ کرنے کا ہے۔ ہدایات اسے ساتھ ساتھ ملتی رہیں گی۔
'تو احمد رضا! تمہاری اب ساری زندگی منافقت اور بہروپ میں گزرنی ہے۔'
اس نے ایک گہرا سانس لے کر جنید علی کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
''کیا سوچ رہے ہو یار؟'' جنید علی مسکرایا۔

''کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم وہاں کیوں گئے تھے۔''

''فی الحال تو تمہیں اُن سے ملوانا مقصود تھا۔ حیرت ہے، تم پانچ سالوں سے ان کے ساتھ ہو اور نہیں سمجھے کہ ان کا نیٹ ورک پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ بہت مربوط نظام ہے۔ کس کو کس سے ملوانا ہے، کس سے رابطہ رکھنا ہے، کس کے آرڈر اوپر سے آتے ہیں۔''

''کیا اختر مسعود بھی ان کا آدمی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

جنید علی نے لحہ بھر کے لئے سوچا اور پھر آہستگی سے بولا۔

''احمد رضا! یہ شخص ختر مسعود وہ بندہ ہے جسے افغانستان کا صدر بنانے کا سوچا جا رہا تھا۔ لیکن پھر شاید یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا گیا کہ اس طرح وہ ایک اچھے ایجنٹ سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ ہے تو افغانی لیکن پاکستان آنے سے پہلے جرمنی میں رہائش پذیر تھا۔''

''کیا حساس ادارے اور ایجنسیاں نہیں جانتیں کہ یہ شخص ایجنٹ ہے سی آئی اے کا؟''

''سب جانتے ہیں لیکن......'' جنید علی کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''تم اس پر مت سوچو۔ ہم بھی تو ان کا دیا کھاتے ہیں۔''

اور اس کے اندر کہیں ندامت کے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا۔

ثمینہ حیدر ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر آئی اور چائے بناتے ہوئے اس نے احمد رضا کی طرف دیکھا۔

''سر! ایبک فلک شاہ کا فون آیا تھا، وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ اُنہیں ٹائم دے دیں کل شام کا۔'' احمد رضا نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیا۔

''ایبک فلک شاہ؟'' ثمینہ حیدر کے جانے کے بعد جنید علی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو احمد رضا نے اسے پہلی ملاقات کی تفصیل بتا دی۔

''لیکن یہ تو اور مزاج کا بندہ ہے۔ میں نے اس کے کالم پڑھے ہیں۔ وہ کسی اور نام سے کالم لکھتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے ہی اس اخبار کے ایڈیٹر نے مجھے بتایا تھا کہ دراصل یہ ایبک فلک شاہ ہے۔ کیا رچی نے تمہیں منع نہیں کیا اس سے ملنے سے؟''

''نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ایسے لوگوں سے ملنا فائدہ مند ہوگا۔''

''ہوں۔'' جنید علی نے سر ہلایا تھا۔

احمد رضا چائے پیتے ہوئے سوچنے لگا کہ کیا وہ جنید علی سے پوچھے، ابو اور امی کے متعلق۔ اور اگر اس نے کہہ دیا کہ یہ سچ ہے تو......؟ وہ جب سے رحیم یار خان سے آیا تھا، مسلسل اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن جنید علی نے سم تبدیل کر لی تھی اور کل شام اچانک وہ خود ہی آ گیا تھا اور کل وہ پوچھ نہیں سکا تھا تو آج۔

اُس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھا۔

''جنید علی! ایک بات پوچھوں؟''

''ضرور۔'' جنید علی مسکرایا۔ تب ہی اُس کا فون بج اُٹھا۔

''ہیلو...... ہاں کب؟ ......کہاں؟'' دوسری طرف کی بات سن کر وہ کہہ رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم فون آف کر کے کھڑا ہو گیا۔

''گھر سے فون آیا ہے۔ میرے بڑے بھائی کے متعلق کوئی اطلاع ہے۔ کسی کا فون آیا تھا گھر پر۔ او کے۔ پھر ملتے ہیں۔'' وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

احمد رضا کچھ دیر وہیں لونگ روم میں بیٹھا رہا۔ وہ جب سے لاہور آیا تھا، مسلسل سوچ رہا تھا۔ 'کیا خبر رچی نے جھٹ

بولا ہو۔ مجھے ضرور جنید علی سے تصدیق کرنی چاہئے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ پھر اس نے میرے بجائے رچی کو کیوں بتایا؟ شاید اسے حوصلہ نہیں ہو رہا ہوگا مجھے ان کی موت کی اطلاع دینے کا۔' اس نے سوچا اور دل پر آنسو گرنے لگے۔ 'لیکن مجھے جنید سے ایک بار خود بھی بات کرنی چاہئے۔' وہ اُٹھا اور ثمینہ حیدر کو آواز دی۔

''مس ثمینہ! میں اپنے بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔ ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ کوئی آئے تو بتا دیجئے گا، گھر پر نہیں ہوں۔''

''سر! لنچ تقریباً تیار ہے۔ لنچ کر کے ریسٹ کر لیجئے گا۔''

''نہیں۔ مجھے لنچ نہیں کرنا۔ ملازمین کو کھانا دے دیجئے گا۔''

بیڈ روم میں آ کر کچھ دیر وہ یونہی بیٹھا رہا۔

'پتہ نہیں، ابو نے مجھے آخری لمحوں میں یاد کیا ہو۔ کیا پتہ انہوں نے مجھے معاف کر دیا ہو۔ ہو سکتا ہے انہوں نے مجھے یاد کیا ہو لیکن معاف؟...... کیا وہ مجھے معاف کر سکتے ہیں؟...... میں تو اُن کی نظر میں مرتد ہو چکا تھا۔ سمیرا اگر مل جاتی تو وہ بتا سکتی۔ کاش سمیرا......!'

یکدم کسی خیال نے اسے چونکا دیا۔ وہ اُٹھا اور لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا کیا وہ اسے فیس بک پر تلاش کر سکتا ہے؟ سمیرا نام کی بے شمار لڑکیاں ہیں۔ اُس نے چند لڑکیوں کو چیک کیا اور پھر مایوس ہو کر لیپ ٹاپ بند کر دیا اور بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے اخبارات میں سے ایک اخبار اُٹھایا جو غالباً ثمینہ حیدر نے معمول کے مطابق اس کے بیڈ روم میں رکھ دیئے تھے۔

آج سفر میں ہونے کی وجہ سے وہ اخبار نہیں پڑھ سکا تھا۔ ایک اُردو اخبار ہاتھ میں لے کر اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی تو اس کی نظر تکیے کے پاس پڑے اپنے فون پر پڑی۔ وہ کل جنید کے ساتھ جاتے ہوئے اپنا فون یہاں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر نمبر چیک کئے۔ تین چار مس کالیں تھیں لیکن سارے نمبر انجان تھے۔

ریسیوڈ کالز میں سے آخری کال جنید کی تھی۔ یہ جنید کا نیا نمبر تھا۔ نمبر محفوظ کرتے ہوئے اس کی نظر ایک اور نمبر پر پڑی جس کے ساتھ نام نہیں تھا۔ یہ نمبر بھلا کس کا محفوظ کیا تھا میں نے؟ ایک لمحہ کے لئے اس نے سوچا اور پھر اسے یاد آ گیا کہ یہاں آنے سے پہلے وہ اریب فاطمہ کی والدہ سے ملنے گیا تھا۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ اریب فاطمہ لاہور چلی گئی ہے اور اس کے ابا اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ شیخ کی واپسی تک وہ پڑھ لے۔ اس دوران اگر اس کا امتحان ہو جاتا ہے تو ٹھیک ورنہ اگر شیخ پہلے آ گئے تو اسے واپس آنا ہوگا۔ انہوں نے اس کا نمبر لیا تھا اور اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر کوئی ایسا مسئلہ ہوا تو وہ فون کریں۔ وہ آ کر خود سب کو شیخ کی حقیقت بتا دے گا۔ احتیاطاً اس نے ان سب سے بھی نمبر لے لیا تھا کہ کبھی کبھار خود ہی فون کر کے خیریت معلوم کر لیا کرے گا۔

وہ اپنے ابو کی اس سیکنڈ کزن کے لئے دل میں بہت احترام محسوس کر رہا تھا اور اسے ان کے پاس سے ممتا کی خوشبو آتی تھی۔

یقیناً وہ بہت اچھی ماں ہوں گی۔ اس کی امی کی طرح شفیق، مہربان اور محبت کرنے والی۔

اس نے اس نمبر کو اسفندیار کے نام سے محفوظ کیا اور پھر اخبار اٹھایا۔ سرسری نظروں سے خبریں دیکھتے ہوئے اس نے اندر کا صفحہ نکالا اور اس کی نظریں ایک آرٹیکل پر رک گئیں۔

''جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب سے لے کر اسماعیل کذاب تک۔''

وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔

مسیلمہ کذاب کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فوج نے مارا تھا۔ یہ جھوٹے نبوت کے دعوے دار، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی اُٹھے تھے۔ جیسے طلحہ بن خویلد اور اسود الانسی۔ لیکن یہ بعد میں تائب ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

'تو کیا میں بھی...... کیا میری توبہ قبول ہو جائے گی؟'
اس نے سوچا اور مضمون پر نظر ڈالی۔ یہ ایک طویل فہرست تھی۔ راشد خلیفہ، جوزف اسمتھ، سیف بن سید، محمد بن فاراج، مرزا عباس، ابومنصور عیسیٰ وغیرہ۔ سب ہی دردناک انجام سے دوچار ہوئے تھے۔ راشد خلیفہ اور جوزف کو پھانسی ہوئی تھی۔ کچھ جیل میں مر گئے اور کچھ...... اس کی نظر آخری لائن پر پڑی۔
''اسماعیل کذاب خود تو جیل میں مارا گیا لیکن اس کے حواری کہاں ہیں؟ کیا ان میں سے بھی کوئی نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہے؟''
احمد رضا نے گھبرا کر اخبار رکھ دیا۔
'نہیں۔ میں ایسا نہیں ہوں۔ میں اسمٰعیل کذاب کو نبی نہیں مانتا۔ میں نے کبھی بھی اسے نبی نہیں مانا تھا۔ میں تو بس۔'
اُس کا جی چاہا، وہ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتائے۔ لیکن اس کے لب بھینچے ہوئے تھے۔
'اور اگر میں تائب ہوا تو معاف کر دیا جاؤں گا'
وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔
'شاید...... شاید معاف کر دیا جاؤں۔
لیکن یہ جال جو ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے گرد اپنا دائرہ تنگ کرتا جا رہا ہے، کیا میں اس جال سے نکل سکوں گا؟ کیا وہ سب جو کھو گیا ہے، مجھے واپس مل جائے گا؟ کیا میں اب عمر بھر ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلتا رہوں گا؟ یہ لوگ جو اس ملک میں جانے کیا کیا کر رہے تھے اور کیا کیا کرنا چاہتے تھے۔ وہ جب رحیم یار خان میں تھا تو اس نے ارباب حیدر کو الوینا سے کہتے سنا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔
''کیا وہ لڑکی اتنی بولڈ ہے کہ ہم اس سے وہ سب کہلوا سکیں جو چاہتے ہیں؟''
''یقیناً۔'' الوینا نے اسے یقین دلایا تھا۔
''تو پھر اُس پر کام کرو۔ ریپ کراؤ۔ چہرے پر تیزاب ڈالو اور اچھی طرح تیار کر کے میڈیا کے سامنے لاؤ۔ اس کے والدین کو بھی مٹھی میں لو۔''
'پتہ نہیں، یہ مجھ سے کیا کروائیں گے۔'
وہ وحشت زدہ سا کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر بیڈ پر لیٹ گیا۔ کانوں میں رچی کی آواز گونجی۔ اس روز وہ بہت نشے میں تھا۔
''دیکھنا رضی! ایک روز ہم تمام عالمِ اسلام کے ذخائر پر قابض ہوں گے۔''
اور اس روز اسے پہلی بار یقین آیا تھا کہ رچی اندر سے مسلمان نہیں ہوا۔ اس کا قبولِ اسلام محض ایک بہروپ ہے۔ اور اب رچی کو لیبیا بھیج دیا گیا تھا اور پتہ نہیں وہ وہاں کس سازش کے تانے بانے بُن رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھ کے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن نیند آنکھوں سے بہت دُور تھی۔ وہ خالی الذہن سا لیٹا رہا۔ شام ہو گئی تھی جب وہ اُٹھا۔ ثمینہ حیدر لاؤنج میں جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔
''مسز اسمٰعیل سے کال آئی تھی۔ ایک اخبار کے آفس سے بھی فون آیا تھا۔ اور ڈاکٹر فرینہ شاہ کا بھی۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی تھیں۔ میں نے سنڈے کا کہہ دیا تھا۔''
''ٹھیک ہے۔'' اس نے بے دھیانی سے اس کی بات سنی۔ ''آپ جائیں۔''
ثمینہ حیدر کے جانے کے بعد وہ بھی باہر نکل آیا۔ دو کم عمر لڑکیاں ٹہل رہی تھیں۔ ایک بچہ ٹرائیسکل دوڑا رہا تھا۔ یہاں عموماً سکون رہتا تھا۔ رہائشی علاقہ ہونے کی وجہ سے ٹریفک کم تھی۔ وہ کچھ دیر اپنے گیٹ کے باہر بے مقصد کھڑا رہا۔ وہ کیوں باہر آیا تھا؟ نہیں جانتا تھا۔

اسے کہیں جانا بھی نہیں تھا۔ پھر؟ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو حاجی صاحب اسے اپنے گیٹ سے نکلتے نظر آئے۔
''حاجی صاحب!'' وہ تیزی سے ان کی طرف لپکا۔
حاجی صاحب بڑے تپاک سے اس سے ملے۔
''ارے میاں! کہاں غائب تھے آپ؟''
''بس وہ کہیں باہر چلا گیا تھا۔ جانے سے پہلے ملنے آیا تھا آپ سے۔ آپ نہیں تھے۔''
''بس بیٹا! کراچی گیا ہوا تھا تو انہوں نے آنے ہی نہیں دیا۔''
''آیئے چلیں۔ بیٹھتے ہیں کچھ دیر۔'' حاجی صاحب اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لان میں لے گئے۔
''حاجی صاحب! اگر میں تائب ہو جاؤں تو کیا بخش دیا جاؤں گا؟ معاف کر دیا جاؤں گا؟'' وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ بار بار اس کے لبوں پر آتا اور پھر لفظ اندر ہی دم توڑ دیتے تھے۔
''پریشان لگ رہے ہو احمد حسن! سچی بات ہے ہر سچا مسلمان پریشان ہے۔ واقعہ ہی ایسا ہے۔''
''کیسا واقعہ؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے حاجی صاحب کو دیکھا۔
''یہی میاں! خاکوں والا۔ مجھے تو ساری رات نیند نہیں آئی۔''
وہ اُلجھی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
''کیسے خاکے؟'' وہ تو کچھ نہیں جانتا تھا۔
''یہی دو دن پہلے 30 ستمبر کو ڈنمارک کے اخبار یونڈلا پوسٹن میں خاکے چھپے اور پھر انٹرنیٹ کے ذریعے اُنہیں پھیلا دیا گیا۔''
وہ خالی الذہن سا حاجی صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔
''میاں! تم..... تمہارا قلم کیوں خاموش ہے؟ احتجاج کرو۔ لکھو۔ یہ بھی جہاد ہے۔ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا ثبوت دو۔ تمہارے پاس قلم کی طاقت ہے۔ ہم جیسے تو بس باتیں ہی کر سکتے ہیں۔''
اس نے حاجی صاحب کی طرف دیکھا جن کی پیشانی پر سجدوں کا نشان دمکتا تھا۔
'اور میں...... میرا قلم۔ میں اس قابل ہوں؟ میں، جو اس شخص کے گروہ میں شامل ہوا...... نہیں۔'
آنسو قطرہ قطرہ کر کے اندر گرنے لگے۔ وہ کچھ دیر حاجی صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ پھر انہیں پھر ملنے کا کہہ کر ان کے گھر سے نکل آیا اور یونہی بے مقصد سڑک پر ایک طرف چل پڑا۔ بہت دیر تک چلنے کے بعد اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں؟ اس کی منزل کہاں ہے؟...... شاید کہیں نہیں۔
وہ اپنی منزل کھو چکا...... پھر......
'حاجی صاحب کہہ رہے تھے میں لکھوں۔ لیکن میں کیا لکھوں گا؟...... میرا وجود...... میری ذات۔' وہ واپس مڑا۔
'میرے لفظ کھوکھلے ہوں گے۔ جذبوں سے خالی...... بے روح۔'
'نہیں...... جذبہ تو ہے۔ اندر کہیں آگ لگی ہے۔ شعلے بھڑکتے ہیں۔ کیسے لوگ ہیں گھٹیا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق کچھ کہنے کی ہمت کیسے کی؟' اُس نے زور سے مٹھیاں بھینچیں اور قریبی گھر کی دیوار پر مکا مارا۔
گھر آ کر وہ کچھ دیر لاؤنج میں بیٹھا رہا۔
ملازم لڑکے نے کھانے کا پوچھا لیکن اس نے منع کر دیا۔ دن کو بھی اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ لیکن ابھی بھی اسے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی...... وہ ملازم لڑکے کو کھانے کا منع کر کے اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس نے لیپ ٹاپ اٹھایا۔ لیکن پھر اُسے جنید کا خیال آ گیا۔ وہ جنید سے ابو، امی کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا۔ اُس نے فون اُٹھا کر جنید کا نمبر ملایا۔
''ہیلو!''

جنید کی آواز بھاری تھی اور پیچھے بہت شور تھا۔شاید کوئی رو رہا تھا۔

''جنید علی! میں احمد حسن۔''

''احمد!......احمد!'' جنید رو رہا تھا۔''میرے بڑے بھائی کا پتہ چل گیا۔ وہ کتنے سالوں سے جیل میں تھا۔ غیر قانونی ذریعے سے لے جانے والے نے اُسے امریکہ کے بجائے جیل پہنچا دیا۔ میری ماں اب ساری زندگی انتظار کرتی رہے گی۔ وہ لوگ اس کی ڈیڈ باڈی بھجوا رہے ہیں۔ وہاں ایک فلاحی تنظیم ہے۔ اس نے انتظام کیا ہے ڈیڈ باڈی بھجوانے کا۔''

جنید علی رو رہا تھا اور احمد رضا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے تسلی دے اُسے۔ اُسے جنید کی بات یاد آ رہی تھی۔

''میری ماں آنکھیں دہلیز پر رکھے بیٹھی رہتی تھی احمد حسن! کہ اس کا بیٹا ایک دن۔''

اور کیا پتہ، کوئی فلاحی تنظیم اُس کی ڈیڈ باڈی بھی کسی دن......اُس کی ماں نے بھی شاید اپنی آنکھیں دہلیز پر رکھ چھوڑی ہوں۔ لیکن رچی کہہ رہا تھا کہ وہ اب دنیا میں نہیں رہے اور اسے جنید علی سے تصدیق کرنا تھی۔ لیکن اب اس وقت کیا یہ مناسب تھا؟

''اپنے گھر کا ایڈریس سمجھاؤ جنید! میں آ رہا ہوں تمہارے پاس۔'' اُس نے ایک گہری سانس لی۔

جنید علی نے ایڈریس سمجھایا اور وہ فون آف کر کے باہر نکل آیا۔

❁○❁

''امی!'' سمیرا نے زبیدہ کے بازو پر ہاتھ رکھا تو زبیدہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''وہ......وہ ملا تجھے؟......واپس آیا؟......چینل والوں سے پتہ کرنا تھا۔ کہاں گیا؟''

''امی! میں دو بار گئی تھی مرینہ کو لے کر اس کے گھر۔ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے شاید۔ جیسے ہی آئے گا، میں جاؤں گی ملنے۔''

''اچھا......!'' زبیدہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ سمیرا افسردگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ دو ماہ پہلے ان کا پتّے کا آپریشن ہوا تھا۔ وہ پورے پندرہ دن کی چھٹی لے کر آئی تھی۔ آپریشن کوئی ایسا خطرناک نہ تھا۔ لیکن ان کی صحت بحال نہیں ہو رہی تھی۔ وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں اور ڈاکٹر سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کیوں؟ بظاہر سب ٹیسٹ ٹھیک تھے۔

سمیرا پریشان سی اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ اُنہوں نے پھر آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔

''منع کیا تھا تمہیں، ہر ویک اینڈ پر نہ آیا کرو۔ تمہاری پڑھائی کا حرج ہوتا ہے۔''

''آپ بھی تو اپنا خیال نہیں رکھ رہیں۔ ابو نے بتایا ہے، آپ کچھ کھا پی نہیں رہیں۔''

''جی نہیں چاہتا کچھ کھانے کو۔ اور تُو میری فکر مت کر سمیرا! تیری پڑھائی، میری صحت سے زیادہ اہم ہے۔''

''نہیں۔ میرے لئے آپ کی صحت و زندگی ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔ اگر آپ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھیں گی تو میں پڑھائی چھوڑ دوں گی۔ میں واپس نہیں جاؤں گی۔''

''ایسا نہ کہو سمیرا! ہم نے تم دونوں کے لئے خواب دیکھے تھے۔'' ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''تو پھر وعدہ کریں، آپ ابو کو تنگ نہیں کریں گی اور صحیح طرح سے کھائیں پئیں گی۔'' انہوں نے سر ہلا دیا۔

''بیٹا! صبح میں نے سُوپ بنایا تھا، لے آؤں؟'' حسن رضا نے سمیرا سے پوچھا تو سمیرا نے سر ہلا دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔

جب سے زبیدہ کا آپریشن ہوا تھا، وہ ہر ویک اینڈ پر آ جاتی تھی۔ ڈائیوو سے یا کوچ سے۔ جمعہ کو کالج سے نکل کر وہ سیدھی ڈائیوو کے اڈے پر آتی تھی۔ مرینہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ اُسے چھوڑ جاتی تھی۔ چونکہ رات ہو جاتی تھی، اس لئے حسن رضا اُسے لینے آ جاتے تھے۔ اتوار کو دو تین بجے واپسی کے لئے ڈائیوو پر بیٹھتی۔ وہاں مرینہ ڈرائیور یا ہمدان کے

ساتھ اُسے لینے آئی ہوتی۔ اُسے مرینہ کی دوستی پر فخر تھا۔ الریان میں بابا جان، حفصہ، مصطفیٰ انکل، منیبہ، ثنا آنٹی سب بے حد مخلص اور محبت کرنے والے تھے۔ وہ حیران ہوتی تھی۔ کیا آج کل کے دور میں بھی ایسے بے غرض لوگ ہوتے ہیں؟ ہمدان کے خیال سے اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

حسن رضا سوپ لے آئے تھے۔ سمیرا نے ان کے ہاتھ سے باؤل لے لیا۔

''امی! اُٹھیں، پی لیں یہ۔''

اس ویک اینڈ پر آنے کا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ بلکہ اُسے احمد حسن سے ملنے جانا تھا۔ وہ واپس آ گیا تھا اور مرینہ نے ثمینہ حیدر کو فون کر کے فائم بھی لے لیا تھا۔ لیکن پھر جب ابو نے بتایا کہ وہ تین دن سے کچھ کھا پی نہیں رہی ہیں تو وہ بھاگی چلی آئی۔ حسن رضا نے سہارا دے کر زبیدہ کو اُٹھایا۔

''جیسے ہی تجھے پتہ چلے سمیرا! کہ احمد حسن پاکستان آ گیا ہے تو فون کر دینا۔ میں اور تیرے ابو آ جائیں گے۔ گھر تو تُو نے دیکھ لیا ہے نا اس کو؟'' اُن کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''جی امی! میں فون کر دوں گی۔ لیکن پہلے آپ اپنی صحت بنائیں۔ تاکہ سفر کر سکیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' زبیدہ نے سر اُٹھا کر حسن رضا صاحب کی طرف دیکھا۔

''آپ لے چلیں گے نا مجھے؟'' حسن رضا صاحب نے سر ہلایا۔

''آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن وہ میرا احمد رضا ہے۔ رتی بھر بھی شک نہیں ہے مجھے اس پر۔''

اور حسن رضا صاحب نے نادم سا ہو کر سر جھکا لیا۔ وہ اکثر سوچتے تھے کہ احمد رضا صرف ان کا بیٹا تو نہیں تھا۔ زبیدہ کا بیٹا بھی تھا۔ انہیں اس کے متعلق تنہا فیصلہ کرنے کا حق نہیں تھا۔ زبیدہ ابھی تک ان کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں نا؟''

انہوں نے سر ہلاتے ہوئے ان کا بازو تھپتھپایا اور باہر چلے گئے۔ زبیدہ نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

سمیرا وہیں کرسی پر بیٹھ کر احمد حسن کے متعلق سوچنے لگی۔ زبیدہ کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ احمد حسن ہی احمد رضا ہے۔ اور اس یقین پر اریب فاطمہ نے مہر لگا دی تھی۔ جب گاؤں سے واپس آ کر اس نے بتایا کہ احمد حسن کو دراصل حسن رضا صاحب کی تلاش ہے، جو اماں کے کوئی کزن ہیں اور اسفند نے اماں سے احمد حسن کا ذکر اس لئے کیا تھا۔ وہ شاید حسن رضا صاحب کے بیٹے کا دوست ہے اور اریب فاطمہ نے ہی اسے بتایا تھا کہ ان دنوں وہ رحیم یار خان کے گاؤں چک نمبر 151 میں ہے۔ اس نے دیکھا تھا وہاں اُسے۔ اور جب مونا، رشیدہ سے پتہ چلا تھا کہ وہ لاہور آ گیا ہے تو وہ بے چین ہو گئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ میرا کی حیثیت سے بغیر عبایا کے جائے گی اور اس کا ردِّعمل دیکھے گی۔ لیکن اسے امی کی وجہ سے لاہور آنا پڑ گیا تھا۔ زبیدہ سے اس نے جان بوجھ کر کہا تھا کہ وہ ملک سے باہر ہے۔ ورنہ وہ لاہور جانے کی ضد کرنے لگتیں۔ اس نے جھک کر دیکھا، وہ سو گئی تھیں۔ وہ اُٹھی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے باہر آئی۔

حسن رضا لاؤنج میں بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھ میں والٹ تھا۔ وہ غالباً اخبار کا وہی ٹکڑا دیکھ رہے تھے۔

''ابو!'' سمیرا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اخبار کا ٹکڑا ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

''یہ جھوٹ ہے۔ وہ زندہ ہے۔ امی ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ احمد رضا ہی ہے۔''

''تم اس سے ملی تھیں؟'' انہوں نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں گئی تھی اپنی فرینڈز کے ساتھ۔ لیکن حجاب اور عبایا میں تھی۔ اُس نے مجھے نہیں پہچانا۔''

وہ کچھ دیر بے یقینی سے اُسے دیکھتے رہے۔

''آپ کی ایک کزن جو ضلع رحیم یار خان کے چک نمبر 151 میں رہتی ہیں۔ وہی کنیئرڈ کالج والی سائرہ۔''

حسن رضا نے آہستگی سے کہا۔ ''ہاں!''
''اُن کی بیٹی میری دوست ہے۔ لاہور میں پڑھتی ہے۔'' وہ اُنہیں تفصیل بتانے لگی۔
''میں واپس جا کر اس سے ملوں گی۔ مل لوں ابو؟''
وہ کچھ دیر اُسے دیکھتے رہے۔ پھر ایک گہری سانس لی۔
''ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے پوچھنا کہ کیا وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی مانتا ہے؟ اگر اُس نے کہا ''ہاں'' تو پھر ہمیں بتانا۔ ورنہ یہ مت بتانا کہ احمد رضا زندہ ہے۔ اور اب سو جاؤ۔ سحری میں اُٹھنا بھی ہے۔'' انہوں نے جھک کر اخبار کا ٹکڑا اُٹھا کر والٹ میں رکھا اور لاؤنج سے باہر نکل گئے۔

❁○❁

قریبی مسجد میں سحری کے لئے سائرن بج رہا تھا۔ احمد رضا کی آنکھ سائرن کی آواز سے کھلی تھی۔ وہ رات بہت دیر سے سویا تھا۔ پھر بھی اُس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کچھ دیر وہ یوں ہی بیڈ پر لیٹا سائرن کی آواز سنتا رہا۔ کتنے سالوں سے وہ ہر چیز سے دُور ہو گیا تھا۔ نماز اور روزوں کا اُس کے گھر میں کتنا اہتمام ہوتا تھا۔ بہت بچپن سے ہی اُسے رمضان کا احترام کرنے اور روزے رکھنے کی عادت ڈالی گئی تھی۔
وہاں سمن آباد والے گھر میں سحری کی کتنی رونق ہوتی تھی۔ مسجد کے سائرن کے ساتھ ہی ڈھول بجانے والا عین اُس کی کھڑکی کے نیچے آ کر ڈھول بجاتا اور جاگو، جاگو کی آواز لگاتا آگے چلا جاتا تھا۔ لیکن وہ جاگنے کے باوجود اس وقت تک بیڈ پر لیٹا رہتا، جب تک سمیرا اُسے بلانے نہ آتی۔ وہ اُٹھ کر کھڑکی کھول کر ایک بار ضرور گلی میں جھانکتا۔ گلی میں وہی دہی والی دکان پر لوگوں کی آوازیں، شور...... پھر سیڑھیاں اُترتے ہوئے پراٹھے اور آملیٹ کی خوشبو۔
اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُسے لگا جیسے ابھی سمیرا اُسے بلانے آئے گی اور وہ جان بوجھ کر سونے کی ایکٹنگ کرے گا۔
لیکن سمیرا...... دل میں کہیں درد اُٹھا تھا۔
اُس نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
کچھ دیر بعد منہ ہاتھ دھو کر وہ کچن کی طرف جا رہا تھا۔ کچن سے دودھ کا ایک گلاس اور ایک سلائس لے کر وہ واپس کمرے میں آ گیا۔ دودھ پی کر اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔ باہر بالکل خاموشی اور سکون تھا۔ اُسے ایک بار پھر سمن آباد کی رونق یاد آ گئی۔ کیسے سحری ہوتے ہی زندگی جاگ اُٹھتی تھی وہاں۔ کھڑکی بند کر کے اُس نے پانی پیا اور روزے کی نیت کی اور بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔
''لکھو...... احمد حسن! لکھو...... تمہارے پاس قلم ہے۔ اگر تم جیسے باشعور لوگ بھی احتجاج نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا؟'' حاجی صاحب کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔
وہ میکانکی انداز میں اُٹھا اور ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔ قلم اُٹھایا۔ دراز سے پیپرز نکالے اور لکھنے لگا۔
وہ کیا لکھ رہا تھا؟ اسے خود بھی نہیں پتہ تھا۔ بس لکھتا جا رہا تھا۔
آخری جملہ لکھ کر اُس نے قلم رکھا تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔
'کیا میں اس قابل ہوں؟'
اُس نے نیت کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور پھر نیچے گرا دیئے۔
کچھ دیر یوں ہی متذبذب سا کھڑا رہا۔
''دو سنت، دو فرض۔''
وہ دل ہی دل میں دہرا رہا تھا۔
اسے یاد تھا۔ پانچ سال کوئی زیادہ لمبا عرصہ تو نہیں ہوتا۔ پانچ سال پہلے وہ پوری پانچ تو نہیں لیکن تین نمازیں تو

با قاعدگی سے پڑھتا تھا۔ اور جو رہ جاتیں، ان کے لئے شرمندہ رہتا تھا اور ہر روز عہد کرتا تھا کہ کل سے پوری نمازیں پڑھے گا۔ لیکن پھر سستی ہو جاتی تھی۔

اس نے پھر نیت کے لئے ہاتھ اٹھائے اور یونہی چند لمحے ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا۔

'اور کیا میں ہدایت پانے والوں میں سے ہوں؟' اُس نے ہاتھ پھر نیچے گرا دیئے۔ لیکن پھر فوراً ہی اٹھا لئے۔

''اور کون ہے، اسے ہدایت دے۔ سوائے اللہ کے۔''

اُس کے کانوں میں آواز آئی تو دل ہی دل میں اس نے کہا۔ ''ہاں! اللہ۔''

''اور اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کو ہدایت دیتا ہے اور ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیتا ہے۔ اس وقت جب وہ گمراہی کے گڑھوں میں گر جاتے ہیں۔''

'تو کیا اللہ مجھے بھی ہاتھ پکڑ کر اس گڑھے سے نکال لے گا، جس میں، میں گر گیا ہوں؟'

اس نے سوچا اور آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ لیکن اس نے پلکیں جھپک کر اس نمی کو باہر نکلنے سے روکا اور نیت کرنے لگا۔

اور پھر نہایت یکسوئی سے نماز پڑھ کر وہ کتنی ہی دیر تک یوں ہی کارپٹ پر بیٹھا رہا۔

کیا دعا مانگے؟ ...... امی ابو سے ملاقات کی دعا، جو اس دنیا میں نہیں؟ ...... اپنے گناہوں کی معافی؟ ...... کیا اللہ اسے معاف کر دے گا؟ اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اس نے اپنے والدین کا دل دُکھایا۔

اُس نے ہاتھ اُٹھائے۔

''یا اللہ! مجھے معاف کر دے، ان غلطیوں پر، جو مجھ سے جانے انجانے میں سرزد ہوئیں اور ان ملعونوں کو تباہ و برباد کر دے، جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آنسو جو رخساروں سے پھسل کر ہونٹوں پر لمحہ بھر ٹکنے کے بعد ٹھوڑی سے ہوتے اس کی گردن کو بھگو رہے تھے۔

''یا اللہ! وہ انگلیاں مفلوج ہو جائیں جنہوں نے وہ خاکے بنائے تھے۔''

اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی اور دعا کے لفظ اندر ہی اندر کہیں چکرا کر رہ گئے۔

اس نے ایک دم ہاتھ نیچے گرا دیئے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

'میں نہ دعا مانگنے کے قابل ہوں، نہ معافی کے۔ پھر کیوں ہاتھ اٹھائے بیٹھا ہوں؟'

کچھ دیر وہ مضطرب سا اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ پھر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ٹی وی آن کر دیا۔ شاید اس طرح اندر کی بے چینی ختم ہو جائے اور دھیان بٹ جائے۔ ٹی وی پر سحری کے پروگرام چل رہے تھے۔ ایک قاری صاحب سورۃ النساء کی تلاوت کر رہے تھے۔ چند آیات پڑھ کر انہوں نے ترجمہ کیا۔

''اور جو شخص کوئی برا کام کر بیٹھے یا پھر اپنے حق میں ظلم کر لے اور پھر اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا۔''

''بے شک!'' اس کے لبوں سے نکلا۔ ''لیکن میں ...... میں نے تو ......''

اس کے ہاتھ میں ریموٹ تھا اور وہ اضطراب کی کیفیت میں چینل بدل رہا تھا۔

''دیکھو! شیطان کا کہا نہ ماننا۔'' ایک مولوی صاحب کہہ رہے تھے۔ ''وہ تمہیں تنگ دستی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے ...... اور اللہ نے تم سے بخشش اور رحمت کا وعدہ کیا ہے، اس مبارک مہینے میں۔''

اس نے غیر ارادی طور پر ریموٹ پر انگلی کا دباؤ ڈالا۔

''درِ قبولیت ہر اس کے لئے کھل جاتا ہے، جو سچے دل سے توبہ کرتا ہے۔''

'کیا میرے لئے بھی؟ ...... میں جو مرتدوں کا ساتھی تھا۔ کیا میری توبہ بھی قبول ہوگی؟'

''سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 268 میں ہے۔''اور اللہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''
'اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ میری توبہ ضرور قبول کرے گا۔'
دل میں اُمید کی لو چمکی تو وہ پھر اٹھا اور زمین پر دوزانو بیٹھتے ہوئے ہاتھ اٹھا دیئے۔
'یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ توحید اور شرک کے بیچ مجھ سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، معاف کر دے۔'
آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گر رہے تھے اور وہ بہت جذب سے دعا مانگ رہا تھا۔
''اے اللہ! تو بہت رحیم و کریم ہے۔ مجھ پر بھی رحم کر۔ مجھ پر ترس کھا۔ مجھے معاف کر دے۔ میرے گناہ بہت زیادہ ہیں۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو برف کے پانی سے اور اولوں سے دھو دے اور میرے دل کو گناہوں سے پاک کر دے۔ جیسے میلا کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے۔ یا اللہ! مجھ پر ترس کھا۔ مجھ پر رحم کر۔ مجھے معاف کر دے۔''
اب وہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس کے حلق سے ایک ہی جملہ نکل رہا تھا۔
''یا اللہ! مجھ پر رحم کر۔ مجھے معاف کر دے۔''
روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ہاتھ نیچے گر گئے اور سر سجدے میں جھک گیا۔
''ربی اغفرلی۔ ربی اغفرلی۔''
اُس کی زبان پر ایک ہی تکرار تھی۔
پتہ نہیں کتنی ہی دیر تک وہ یوں ہی سر سجدے میں رکھے روتا رہا۔ معافی مانگتا رہا۔ پھر اسے لگا، جیسے اس کے حلق میں کانٹے پھنس گئے ہوں۔ سر میں جسم کا سارا خون اکٹھا ہو رہا ہو۔ اس نے سجدے سے سر اٹھایا، اٹھا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ رات بھر وہ بہت بے چین رہا تھا۔ لیکن اس وقت وہ خود کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سمیرا کے متعلق سوچنے لگا۔
'پتہ نہیں ابو نے اس کی شادی اتنی جلدی کیوں کر دی؟ اُسے تو ڈاکٹر بننا تھا۔ ڈاکٹر سمیرا رضا۔'
اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن بند آنکھوں میں نمی پھیلتی گئی۔
اور اسے بھی تو انجینئر بننا تھا۔ وہ یوں ہی سوچتے سوچتے سو گیا۔ پھر اُس کی آنکھ صبح گیارہ بجے کے قریب کھلی تھی۔ وہ تیار ہو کر رات کے لکھے ہوئے صفحات لے کر باہر نکلا تو ثمینہ حیدر لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔
''سر! ناشتے میں کیا لیں گے؟''
''کچھ نہیں۔ میرا روزہ ہے۔''
اس نے ثمینہ حیدر اور ڈسٹنگ کرتی ملازمہ کی آنکھوں میں حیرت کو بہت واضح طور پر نمودار ہوتے دیکھا اور گاڑی کی چابی لے کر باہر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے ثمینہ حیدر کو بتا دیا تھا کہ وہ اخبار کے دفتر جا رہا ہے اور وہاں سے جنید کی طرف چلا جائے گا۔ اگر وہ نہ بتاتا تو ثمینہ حیدر خود پوچھ لیتی۔ اب تو اسے عادت ہو گئی تھی۔ وہ کہیں بھی جانے سے پہلے ثمینہ حیدر کو بتا دیتا تھا۔ اپنا آرٹیکل میل کرنے کے بجائے اس نے خود لے کر جانا مناسب سمجھا تھا۔ اخبار کے دفتر سے وہ جنید کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں اسے پتہ چلا کہ جنازہ عصر کے بعد ہے اور جنید چند عزیزوں کے ساتھ میت وصول کرنے ایئرپورٹ گیا ہوا ہے۔ جنید آیا تو جنازے تک وہ اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ جنید نے دو تین بار اسے متشکر نظروں سے دیکھا تھا۔ گھر کے اندر کہرام مچا تھا۔ پتہ نہیں جنید کی فیملی میں کون کون تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ جنید نے صرف اپنے بڑے بھائی کا ذکر کیا تھا، جو پیسہ کمانے کا خواب لے کر گھر سے نکلا تھا۔ ایجنٹ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور وہ جیل چلا گیا۔ یہ انسانوں کے اسمگلر نہ جانے کتنے گھروں کے چراغ گل کر چکے تھے اور کتنے لوگ جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے اور ایک دن جنید کے بھائی کی طرح وہیں زندگی ہار بیٹھیں گے۔ اس نے کتنی تکالیف اُٹھائیں۔ کیسے گرفتار ہوا؟ اس پر کیا بیتی؟ وہ دل میں ہی لے کر چلا گیا تھا۔ اور یہ جنید علی..... یہ بھی شاید ایسا ہی کوئی خواب لے کر ان لوگوں کے جال میں پھنسا تھا۔

اپنے گھر والوں کو خوش حال دیکھنے کا خواب۔ لیکن اس کا تو ایسا کوئی خواب نہیں تھا۔ وہ تو ٹھیک ٹھاک خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ حسن رضا نے کبھی کوئی تنگی نہیں ہونے دی تھی۔ اس کے سامنے ایک روشن مستقبل تھا۔ پھر وہ کیوں ان کے جال میں پھنسا؟ مزید کی طمع، لالچ، ہوس۔

جنازے کے بعد افطاری کا انتظار کیا جا رہا تھا اور یہ سب انتظام آس پاس کے گھروں کے لڑکے کر رہے تھے۔ بزرگ ہدایات دے رہے تھے، جانے والوں کو روک رہے تھے۔

'ابھی اس ملک میں پاسِ محبت اور مروّت باقی ہے۔'

اس نے سوچا اور معذرت کر کے گھر آ گیا۔ وہ بے حد تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے روزہ افطار کر کے وہ مغرب کی نماز کے لئے کھڑا ہوا تو جی چاہ رہا تھا، نماز نہ پڑھے اور سو جائے۔ اس کے کانوں میں جنید کے گھر کی عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے فجر پڑھی تھی۔ لیکن پھر ظہر نہیں پڑھ سکا تھا اور پہلے کی طرح دل میں کہتا رہا تھا۔ 'کل ضرور پڑھوں گا۔ آج نہیں پڑھ سکا تو کل ضرور۔'

عصر کی نماز جنید علی کے گھر کی قریبی مسجد میں سب لوگوں کے ساتھ پڑھی تھی۔ لیکن میکانکی انداز میں وہ ہاتھ اٹھاتا، رکوع اور سجدے میں جاتا رہا تھا۔ مغرب کی نماز بھی اس نے اسی انداز میں پڑھی اور پھر بیڈ پر گر گیا۔ تھکن سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

صبح اس کی آنکھ بیل کی آواز سے کھلی۔ اس نے آنکھیں کھول کر سامنے کلاک پر نظر ڈالی۔ دس بج رہے تھے۔

''اوہ'' وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ سونے سے پہلے وہ عہد کر رہا تھا کہ اب کوئی نماز مس نہیں کرے گا۔ لیکن پھر عشاء رہ گئی اور اب فجر بھی۔

بیل مسلسل ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کا ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف الوینا تھی اور بہت غصے میں بول رہی تھی۔

''یہ کیا لکھا ہے تم نے احمق آدمی؟...... کیا تمہیں فری ہینڈ اس لئے دیا تھا کہ تم...... ہمارا خیال تھا کہ تم پوری طرح ہمارے سانچے میں ڈھل چکے ہو۔ لیکن تم تو اندر سے وہی ہو۔ دقیانوسی خیالات کے مالک۔ اپنے باپ کی طرح روایت پسند، احمق، بے وقوف۔''

احمد رضا حیران سا اس کی بات سن رہا تھا۔ لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''تم نے ان کی شخصی آزادی پر حملہ کیا ہے۔ یہ ان کا رائٹ تھا احمد رضا! ہر شخص کو دوسروں کے متعلق آزادی رائے کا حق ہے۔''

''وہ دوسرے نہیں، ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ جن کی سیرت طیبہ پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔''

احمد رضا کو بہت دیر بعد اس کی بات سمجھ میں آئی تھی۔ لیکن الوینا نے اس کی بات سنی نہیں۔ وہ بدستور اس پر چلا رہی تھی۔ الوینا جو چند دن پہلے اس سے محبت کا دعویٰ کر رہی تھی اور ابھی تین دن پہلے کی ہی بات تھی۔

رات کو اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے الوینا کی مہربانیوں کو یاد کرتے ہوئے سوچا تھا۔ الوینا اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہے۔ اگر وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اس نے واقعی طلاق لے لی ہے تو پھر وہ کیوں نہ اس سے ہی شادی کر لے۔

''ٹھیک ہے! یہ آج کا ایشو ہے۔ تمہیں اس پر ضرور لکھنا چاہئے تھا۔ تاکہ ان میں شامل رہو۔'' الوینا کہہ رہی تھی۔

'یہود و نصاریٰ کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔' وہ سوچ رہا تھا۔

''تمہیں اتنے جارحانہ انداز میں نہیں لکھنا چاہئے تھا۔ بلکہ ہلکے ہاتھ سے..... لائٹ سا۔'' اب وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

وہ خاموشی سے سن رہا تھا کہ ارباب حیدر نے الوینا سے فون لے لیا۔

''الوینا صحیح کہہ رہی ہے۔ تمہیں ہلکا پھلکا لکھنا چاہئے تھا۔ جیسے کئی اور کالم نگاروں نے لکھا ہے۔ لیکن تم نے تو یوں لکھا، جیسے تم نے ہاتھ میں قلم کے بجائے بندوق تھام رکھی ہے۔ رچی اور چیف بہت ناراض ہوں گے۔ تمہیں خیال رکھنا چاہئے تھا۔''

''تم تو مسلمان ہو ارباب حیدر! تم کیا کہہ رہے ہو؟''

احمد رضا نے آہستگی سے کہا تو ایک لمحہ کے لئے ارباب حیدر خاموش ہو گیا اور پھر سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔

''میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں ایک ایمپلائی (ملازم) ہوں اور مجھے وہی کرنا ہے، جو میرے باس کا حکم ہے۔ اور تمہیں بھی وہی کرنا ہے، جو تمہارے باس چاہتے ہیں۔''

وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ ارباب حیدر نے بات ختم کر کے فون رکھ دیا۔ مگر وہ کتنی ہی دیر تک ریسیور ہاتھ میں پکڑے خاموش بیٹھا رہا۔

'میں نے بھی اپنی روح شیطان کے پاس گروی رکھ دی ہے اور میں غلام ہوں ان کا۔ کس لئے...... کس لئے کیا میں نے؟...... کس کے لئے؟'

'یہ......' اس نے ہاتھ میں بندھی گھڑی کو حقارت سے دیکھا۔ 'یہ کرسچن ڈائر کی۔' اور اُسے اُتار کر نیچے پھینکا۔

'یہ مونٹ بلیک کا والٹ......' اُس نے تکیے کے پاس پڑا والٹ اُٹھا کر کمرے کے وسط میں پھینکا۔

'یہ جارج ارمانی اور پلے بوائے لومانی کے پرفیومز۔' اب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ایک ایک پرفیوم کی شیشی اٹھاتا اور ایک ایک کر کے اُنہیں پھینکتا جا رہا تھا۔

'یہ جوتے...... یہ سینٹ مائیکل کے۔' اب وہ جوتوں کے ریک کے پاس کھڑا تھا اور اٹھا اٹھا کر پھینک رہا تھا۔

پھر اس نے وارڈ روب کھولا۔

'یہ جارج ارمانی کے گلاسز۔' دائیں طرف لگے گلاسز پھینکنے کے بعد کپڑوں کی باری آئی تھی۔ 'یہ شرٹ Gucci کی...... یہ رالف لورین کے ڈریسز......' وہ ہینگر اُتارتا، ایک ایک کپڑے کو دیکھتا اور اچھال کر پھینک دیتا۔

'ان کے لئے...... ان کے لئے کیا میں نے سب...... یہ سب میری خواہش تھی۔ من میں چھپی خواہش...... اور ان حقیر چیزوں کے لئے میں نے انہیں چھوڑ دیا جو میرے تھے...... میرے اپنے...... اور مرتد کہلوانا پسند کیا۔ میں نے سوچا، کیا فرق پڑتا ہے اگر کوئی مجھے مرتد سمجھ رہا ہے۔ میں مرتد ہوں تو نہیں۔ میں پورے دل و جان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی آخری نبی مانتا ہوں۔' اُس نے سر جھکا۔

'لیکن فرق پڑتا ہے۔ بہت فرق پڑتا ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا تھا۔ میں کبھی نہیں سمجھ سکا اور ان حقیر چیزوں پر خوش ہوتا رہا۔'

اُس نے پاؤں سے سامنے پڑے جوتے کو ٹھوکر ماری۔

'کیا میرے پاس جوتے نہیں تھے؟...... کیا میرے پاس گھڑی نہیں تھی؟...... کیا میں لباس سے محروم تھا؟...... پھر کیوں میرے اندر ان برانڈڈ کپڑوں کی ہوس تھی، گہرائی میں چھپی ہوئی؟'

وہ پھر وارڈ روب کے سامنے جا کھڑا ہوا اور باقی ماندہ کپڑے نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شرٹ کو حقارت سے دیکھا اور نیچے پھینک کر ذرا سا دروازہ کھولا۔ باہر ثمینہ حیدر تھی۔ جس نے ادھ کھلے دروازے سے زمین پر بکھری ہوئی چیزوں کو حیرت سے دیکھا۔

''مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔''

احمد رضا نے اس کی بات سنے بغیر کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر دروازے سے ٹیک لگا کر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا۔

"Die when life demands too much."

پتہ نہیں کب کا پڑھا ہوا جملہ اس کی زبان پر آیا۔
'مجھے بھی مر جانا چاہئے تھا اس وقت، جب میں رچی سے وہ بریف کیس لے رہا تھا۔ اس وقت جب اس نے مجھے بی۔ ایم۔ ڈبلیو کی چابیاں دی تھیں..... یا پھر اس وقت جب الوینا کی قربت کی خواہش میرے اندر جوش مارتی تھی اور میرا دل کسی آگ پر چڑھی ہانڈی کی طرح اُبلتا تھا۔ اس وقت جب میں نے مزید کی چاہ کی' پھر اسے پرانا وقت یاد آیا۔
'وہ سب کتنا قیمتی تھا۔ کتنا انمول۔ وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں..... وہ خوب صورت لمحے۔ وہ ان سب سے زیادہ قیمتی تھے۔'
اس نے ایک بار پھر زمین پر بکھری ہوئی چیزوں کو حقارت سے دیکھا۔
اُس کا سیل فون پتہ نہیں کب سے بج رہا تھا۔ اس نے بیڈ پر پڑا ہوا فون اُٹھایا۔ دوسری طرف جنید علی تھا۔ وہ اُسے ہدایات دے رہا تھا۔
آئندہ کوئی بھی کالم، کوئی بھی آرٹیکل چھپوانے سے پہلے وہ اسے چیک کرنے کے لئے دے گا۔
اس نے حیرت سے جنید علی کی بات سنی۔
یہ جنید علی تھا۔ جو رات بھائی کے غم میں نڈھال تھا۔ جس نے برسوں بھائی کی واپسی کا انتظار کیا تھا۔ وہ واپس آیا لیکن تابوت میں بند۔ اور وہ کبھی جان نہیں سکے گا کہ اس کے بھائی پر کیا بیتی۔ کیا ایک ہی رات میں اس کا غم ختم ہو گیا؟ نہیں، ابھی تو اس کے بھائی کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی ہو گی۔
'لیکن ارباب حیدر کہتا ہے، ہم صرف ملازم ہیں..... اور جنید علی نے بھی میری طرح اپنی روح ان کے پاس گروی رکھ دی ہے۔ وہ ان سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی رات ہی تو اس نے برسوں سے بچھڑے بھائی کو دفنایا ہے۔ ابھی تو..... لیکن شاید ہم کبھی آزاد نہیں ہوں گے۔' مایوسی نے اس کے دل میں پنجے گاڑے۔ 'ہماری روحیں ہمیشہ کے لئے ان کی غلام ہوئیں۔'
''ایسا کیا لکھ دیا ہے تم نے، جس پر سب اتنے خفا ہیں؟..... طیب خان کا بھی فون آیا تھا۔ بہت بول رہا تھا۔'' جنید علی پوچھ رہا تھا۔
اس نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو دیکھا۔
''میں نے وہ لکھا ہے جنید علی! جو ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی۔ لیکن میں بھول گیا تھا کہ جب میں نے ان کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالا تو مجھ سے میرے مسلمان ہونے کا اعزاز چھن گیا۔ خیر! تم اسے چھوڑو۔ مجھے تم سے ایک بات پوچھنا تھی۔ کیا تم میرے والدین.....''
''سوری احمد رضا!'' جنید علی نے اس کی بات کاٹی اور شرمندگی سے کہا۔ ''میں پتہ نہیں کروا سکا تھا۔ دراصل رچی کو نہ جانے کیسے پتہ چل گیا تھا کہ میں تمہارے والدین کے متعلق پتہ کروا رہا ہوں۔ اس نے مجھے سختی سے منع کر دیا اور میں رچی کی حکم عدولی کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تم جانتے ہو نا۔''
''تو..... تو تم نے رچی کو نہیں بتایا کہ وہ.....'' احمد رضا کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ مایوسی کے اندھیرے میں ایک دم اُمید کی کرن چمکی تھی۔
''او کے جنید علی! میں اب کچھ بھی تمہیں دکھائے بغیر نہیں چھپواؤں گا۔'' اس نے بات مکمل کرتے ہی فون بند کر دیا۔
'تو رچی نے میرے ساتھ جھوٹ بولا۔ بالکل ایسا ہی جھوٹ جیسا میری موت کی خبر چھپوا کر بولا تھا..... میں خود تلاشوں گا انہیں۔ میں دعا کروں گا کہ اللہ مجھے اُن سے ملا دے۔ اور اللہ ضرور میری دعا سنے گا۔ مجھے ایک بار پھر سمن آباد جانا چاہئے۔ کیا پتہ، ان پانچ سالوں میں ابو وہاں کسی سے ملنے آئے ہوں اور انہیں اپنی موجودہ رہائش کے متعلق بتایا ہو۔ اور پھر قاضی صاحب اور ملک صاحب کی بیٹیاں بھی تو سمیرا کی سہیلیاں تھیں۔ کیا خبر سمیرا کا اُن سے رابطہ ہو۔ کمال ہے۔ مجھے پہلے کیوں اس کا خیال نہیں آیا؟'
وہ ایک دم اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اسی رات کے لباس میں۔ اس کی گھڑی اور والٹ یوں ہی کمرے کے

وسط میں پڑا تھا۔ اس نے گاڑی کی چابی بھی نہیں لی تھی۔ اس کے پاؤں میں سلیپر تھے۔ ثمینہ حیدر نے اسے اندرونی گیٹ کھول کر بہت حیرت سے باہر جاتے دیکھا اور موبائل پر تیزی سے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

وہ گیٹ سے نکل کر بے دھیانی میں چلنے لگا تھا۔ اسے سمن آباد جانا تھا۔ اس کا والٹ کمرے میں رہ گیا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔

"Die when life demands too much."

اس کے کانوں میں کوئی مسلسل کہہ رہا تھا۔ لیکن وہ چل رہا تھا۔ وہ یہاں سے پیدل سمن آباد نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن وہ چلا جا رہا تھا۔

"احمد رضا!......احمد رضا!......احمد رضا! رُکو پلیز۔"

کسی نے اسے پکارا تو وہ چونک کر رک گیا اور مڑ کر دیکھا۔ احمد رضا کو اسے پہچاننے میں چند لمحے لگے تھے۔ وہ ابراہیم تھا۔

"ابراہیم!" اس کے لبوں سے نکلا اور وہ اسے قریب آتے دیکھنے لگا۔

❁○❁

رابیل دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ سُتا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ کل مائرہ نے جو کچھ کہا تھا، اس کے بعد وہ گھنٹوں روتی رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مائرہ نے ایسا کہا۔ بھلا مما ایسا کیسے کہہ سکتی تھیں؟ لیکن انہوں نے کہا تھا، وہ صرف اس کی ہی نہیں، ایبک کی بھی تو ہین تھی۔ حفصہ، مرینہ، منیبہ سب ہی ایبک سے بے تکلفی سے بات کرتی تھیں۔ لیکن کبھی ثنا چچی، اسماء یا راحت چچی نے ان سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن مائرہ......

ایبک سے رات بات کر کے اگرچہ وہ کچھ مطمئن ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں سکی تھی۔ بار بار اسے خیال آتا کہ 'ایبک کیا سوچتا ہوگا کہ کیسی لڑکی ہوں میں کہ میری ماں کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ میں نے ضرور کچھ ایسا کیا ہے کہ ایبک کے ساتھ بات کرتے دیکھ کر وہ بھڑک اُٹھیں۔'

پھر خود ہی خود کو تسلی دیتی۔ 'نہیں! ایبک ایسا نہیں ہے۔ ایسی سطحی سوچ رکھنے والا۔ وہ اس کے متعلق ایسا نہیں سوچ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ مما کو اس سے، انکل اور عمارہ پھپھو سے چڑ ہے۔'

وہ رات کھانے کے لئے بھی نیچے نہیں آئی۔ عمر اسے بلانے آیا اور اسے بری طرح روتا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ تب اس کے بار بار پوچھنے پر وہ ضبط نہ کر سکی اور اسے سب کچھ بتا دیا

عمر خود بھی شاکڈ رہ گیا کیونکہ وہ اس گھر میں ایبک کا سب سے بڑا قدر دان تھا۔

"مما نے ایسا کیوں کیا رابی آپی؟ ایبک بھائی ایسے نہیں ہیں۔" وہ روہانسا ہو گیا تھا۔

"یہ تو تم جا کر مما سے ہی پوچھو۔" اس نے کہا۔ وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ اور وہ شاید مما سے ناراض بھی ہوا تھا، لڑا بھی تھا۔ لیکن مائرہ کا مؤقف ایک ہی تھا کہ اس نے کچھ غلط نہیں کیا اور یہ بات عمر نے ہی اسے بتائی تھی۔ عمر کے بے حد اصرار پر بھی رات وہ کھانے کے لئے نیچے نہیں گئی۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مونی اور رینا نے بھی تو سنا ہوگا۔ مونی تو کچن میں ہی تھی اور مما اتنے زور زور سے بول رہی تھیں۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تب ہی مائرہ دروازہ کھول کر اندر آئیں۔ رابیل نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ مائرہ اس کے بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں۔

"تم ناشتے کے لئے نہیں آئیں۔ رات بھی تم نے کھانا نہیں کھایا۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

رابیل نے مائرہ کی بات کا جواب نہیں دیا اور یونہی گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیڈ شیٹ کو دیکھتی رہی۔

''میں نے جو کچھ بھی کہا، تمہارے بھلے کے لئے ہی کہا تھا رابی!'' مائرہ کا لہجہ نرم تھا۔
''میرے بھلے کے لئے؟'' رابیل نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا۔ ''نہیں مما! میری انسلٹ کے لئے۔'' اس کی آنکھیں نم تھیں۔ مائرہ نے تڑپ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
''میں تمہاری ماں ہوں۔ دشمن نہیں ہوں رابی! میں تمہاری انسلٹ کیوں کرنا چاہوں گی؟ تم جانتی ہو، میں تم سے عمر اور زبیر سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔ شادی کے کتنے سالوں بعد تم پیدا ہوئی تھیں۔ تم میری دعاؤں کا حاصل ہو۔ میں تمہارا برا کبھی نہیں چاہ سکتی رابی!''
''نہیں۔ آپ نے بہت غلط کیا مما!..... بہت برا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''وہ کوئی غیر نہیں تھا۔ دشمن نہیں تھا۔ عمارہ پھپھو کا بیٹا تھا مما! جیسے ہمدان ہے..... جیسے عادل ہے۔ اگر میں نے اس سے بات کر لی تھی تو کیا حرج تھا؟'' اُس کی آواز بھرّا گئی۔
''دشمن ہی تو ہے۔'' وہ آہستہ سے بڑبڑائی تھیں۔ لیکن رابیل نے سن لیا۔
''کیا صرف اس لئے کہ وہ عمارہ پھپھو کا یعنی آپ کی نند کا بیٹا ہے۔ مما! آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ پھر آپ کیوں روایتی نند بھاوج کا جلاپا دل میں لئے بیٹھی ہیں؟ اور پھر عمارہ پھپھو تو اپنے گھر میں رہتی ہیں۔ جب سے میں پیدا ہوئی ہوں، وہ ''الریان'' نہیں آئیں۔ پھر بھی......''
''ہاں! پھر بھی..... میں وہ سب کچھ نہیں بھول سکتی جو تمہاری عمارہ پھپھو نے میرے ساتھ کیا۔ میں روایتی بھابی نہیں تھی۔ لیکن وہ روایتی نند تھی۔ جتنا عرصہ بھی وہ یہاں رہی، اس نے مجھے بہت زِچ کیا۔''
''مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ دونوں تو اتنے شفیق اور محبت کرنے والے ہیں..... لیکن ہوسکتا ہے پھپھو، پاپا کی محبت کو تقسیم ہوتا دیکھ کر برداشت نہ کرسکی ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ پاپا سے سب بھائیوں سے زیادہ قریب تھیں۔'' رابیل نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی گیلی آنکھیں صاف کیں۔
''مما! آپ وہ سب کچھ بھول نہیں سکتیں، جو عمارہ پھپھو نے آپ کے ساتھ کیا؟''
''نہیں۔'' مائرہ کا لہجہ سخت تھا۔ رابیل نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔
''اب غصہ تھوک دو میری جان! اُٹھو، منہ ہاتھ دھو لو۔ میں شمو سے کہتی ہوں، وہ تمہارا ناشتہ اوپر ہی لے آئے۔'' مائرہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو پیچھے کیا۔
''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے نروٹھے انداز میں کہا۔
''مانا مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے اس طرح غصے سے بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ لیکن ایبک کو تم سے بات کرتے دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوسکا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا نا، ایبک سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''آخر اس میں برائی کیا ہے؟'' رابیل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
''یقیناً اُس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ لیکن اُس کا باپ..... وہ کوئی اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ اور میں...... مجھے ڈر لگتا ہے رابی! کہ بیٹا بھی کہیں باپ جیسا نہ ہو۔''
''لیکن مما!'' رابیل کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
''بس! اب اور کچھ نہیں۔ یہاں ''الریان'' میں سب لوگ اسے صرف عمارہ کی وجہ سے برداشت کرتے ہیں۔ ورنہ جیسا اُس کا کریکٹر تھا، کوئی اُسے ''الریان'' میں گھسنے ہی نہ دیتا۔''
''پھر بابا جان نے پھپھو کی شادی ان سے کیوں کی مما؟'' رابیل کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔
''یہ سب..... میرا مطلب ہے اس کے کردار کے متعلق شادی کے بعد پتہ چلا تھا۔ اب اُٹھو شاباش!''
رابیل نے پاؤں بیڈ سے نیچے رکھے۔

''اور ہاں! آئندہ میں تمہیں ایبک سے بات کرتے نہ دیکھوں۔ وہ اتنا ڈھیٹ ہے کہ اس بے عزتی کے بعد بھی ضرور بابا جان سے ملنے کے بہانے ''الریان'' میں آتا رہے گا۔ تم خود ہی محتاط رہنا۔''

رابیل نے پھر پاؤں اوپر کر لئے۔''

''مما پلیز! آپ جائیں۔ رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ میں کچھ دیر سوؤں گی۔ اُٹھوں گی تو ناشتہ کرلوں گی۔ اور پلیز! آئندہ مجھے ایبک سے بات کرنے سے مت روکیے گا۔''

''کیوں نہ روکوں؟'' مائرہ کو غصہ آ گیا۔ لیکن اس نے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔ ''ماں ہوں میں تمہاری۔ اور تمہیں برے بھلے کی پہچان سمجھانا میرا فرض ہے۔''

''میں اپنا برا بھلا سمجھتی ہوں۔ بچی نہیں ہوں۔ ماسٹرز کر چکی ہوں۔''

''اپنا برا بھلا سمجھتیں تو ہمدان سے شادی سے انکار نہ کرتیں۔ ساری زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے رہتیں۔ کتنی خواہش تھی ہماری کہ تمہاری شادی ہمدان سے ہوتی۔'' مائرہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔

''ہم اس موضوع پر پہلے ہی بہت بات کر چکے ہیں مما!'' وہ بے زار ہوئی۔

''لیکن موضوع ختم نہیں ہوا رابی! شادی تو ہونا ہی ہے ایک دن۔ ہمدان سے نہ سہی، کسی اور سے سہی۔ تمہاری ممانی نے طاہر کے لئے بھی کہا ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔ کوئی کمی نہیں ہے ماشاء اللہ۔ میں اور تمہارے پاپا اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔''

''لیکن مجھے شادی نہیں کرنا مما! نہ طاہر سے، نہ ہمدان سے۔'' اس کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں۔

''یہ کیا بچپنا ہے رابی؟'' مائرہ نے اسے ڈپٹا۔ ''شادی تو تمہاری کرنی ہی ہے۔ اور طاہر دیکھا بھالا لڑکا ہے۔''

''مما پلیز۔'' رابیل نے التجا کی۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔''

مائرہ نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اُسے خیال آیا کہ احسان شاہ نے اسے منع کیا تھا کہ وہ ابھی اپ سیٹ ہے۔ دو تین روز بعد بات کرنا۔ میری بھی مت ماری گئی ہے۔ اس نے رابیل کی طرف دیکھا۔

''اوکے! ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تم سو جاؤ۔ نیند پوری ہو گی تو تم فریش ہو جاؤ گی۔''

رابیل نے کوئی جواب نہیں دیا اور تکیے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ مائرہ نے کمرے سے باہر نکل کر آہستگی سے دروازہ بند کیا اور پُرسوچ انداز میں سیڑھیاں اُترنے لگیں۔

'کیا رابی کسی اور کو پسند کرتی ہے؟' وہ سوچ رہی تھیں۔ 'اُس روز اس نے کہا تو تھا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ میں نے سمجھا شاید غصے میں کہہ رہی ہے۔ لیکن کیا واقعی؟...... مگر کون ہو سکتا ہے؟ اُس کا کوئی یونیورسٹی فیلو؟...... لیکن کبھی ایسا کچھ محسوس تو نہیں ہوا۔ پھر ضرور اس نے غصے میں کہا ہوگا۔'

احسان شاہ ابھی تک لاؤنج میں اخبار کھولے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سیڑھیوں سے اُترتی مائرہ کو دیکھا اور مسکرائے۔

''ہو گئے بیٹی سے مذاکرات؟''

مائرہ نے چونک کر انہیں دیکھا اور انہیں مسکراتا دیکھ کر ان کے اندر دُور تک اطمینان اُتر گیا۔ گویا احسان کا موڈ ٹھیک ہے اب۔

''بہت ناراض ہو گی تم سے؟''

''ہاں۔ لیکن میں نے منا لیا۔'' مائرہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ ''میری غلطی تھی۔ بس پتہ نہیں کیوں، آج کل مجھے غصہ بہت آتا ہے۔''

''چلو! تم نے اپنی غلطی تسلیم تو کی۔ ویسے غصہ حرام ہے۔'' احسان شاہ بہت لگاوٹ سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''ارے!'' وہ ایک دم چونک کر سیدھے ہوئے اور اخبار اپنے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے۔ ''مجھے تو یاد ہی نہیں

رہا تمہیں بتانا۔ وہ تمہاری ایک دوست تھی۔ کیا نام تھا اُس کا، روبی۔ وہ مجھے ہسپتال میں ملی تھی اُس روز۔"

"روبی۔" مائرہ نے ان کی طرف دیکھا۔ "لیکن وہ تو ملک سے باہر چلی گئی تھی...... شاید کینیڈا۔"

"ہاں! لیکن وہ لوگ اب پاکستان میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ بیٹیوں کی شادی وغیرہ کے سلسلے میں۔"

"کیا وہ اسی پرانے گھر میں رہتے ہیں؟" مائرہ بہت پُر جوش ہو رہی تھی۔

"یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"تمہیں پتہ تو ہے، وہ میری بیسٹ فرینڈ تھی...... اکلوتی فرینڈ۔ لیکن اُس کے کینیڈا جانے کے بعد پھر رابطہ ہی نہیں رہا۔ کم از کم تم اُس کا فون نمبر تو لے لیتے۔"

"وہ کہہ رہی تھی کہ دو تین روز میں تم سے ملنے آئے گی۔"

"لیکن تمہیں اس سے نمبر لینا چاہئے تھا۔ میں فون کر کے اسے کھانے پر انوائٹ کر لیتی۔" مائرہ کو بہت افسوس ہو رہا تھا۔

"خیال نہیں رہا۔ سوری یار!" احسان شاہ بہت دلچسپی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ مائرہ اب بھی ویسی ہی خوبصورت تھیں۔ وہ آج بھی ان کے عشق میں مبتلا تھے اور وہ ان کے لئے اتنی ہی اہم تھیں۔

"تم اب بھی ویسی ہی ہو مائرہ! لیکن تمہاری دوست بہت بدل گئی ہے۔ ایک نظر میں تو میں اسے پہچان ہی نہیں پایا۔ اس نے مجھے پہچان کر آواز دی اور بتایا کہ وہ روبی ہے تو تب پہچانا۔ اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔"

احسان شاہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ مائرہ نے ان کی طرف دیکھا اور دل گرفتگی سے سوچا۔

'اگر اللہ مجھ پر مہربان ہوتا تو آج میں یہاں نہ ہوتی...... اور فلک شاہ میری محبت کو نہ ٹھکراتا۔'

دل میں آج بھی پھانس سی اٹکی تھی اور اندر کہیں اس آگ سے ہی شعلے بھڑک اُٹھتے تھے۔ جو دل و جان کو بھسم کرتے تھے۔ پتہ نہیں یہ آگ کبھی بجھے گی بھی یا نہیں۔

"افسردہ مت ہو ڈیئر! میری غلطی۔ میں نے اس سے نمبر نہیں لیا۔ میرے ذہن میں ہی نہیں آیا۔ لیکن پرامس کہ تمہاری دوست نہ آئی تو اسے ڈھونڈ لیں گے۔ تمہیں اس کے میکے کا ایڈریس تو یاد ہوگا نا؟ وہاں سے پتہ کریں گے۔" مائرہ کے چہرے پر چھا جانے والے بادل، احسان شاہ کی نظروں سے چھپے نہ رہ سکے۔

مائرہ نے سر ہلا دیا۔ اس وقت اس کے ذہن میں کچھ اور چل رہا تھا۔ جس سے احسان شاہ آج بھی بے خبر تھے۔

"اب خوش ہو جاؤ یار! میں کچھ دیر بابا جان کے پاس بیٹھوں گا اور پھر مجھے کسی کام سے جانا ہے۔ واپس آ کر تمہاری سہیلی کو تلاش کرتے ہیں۔"

احسان شاہ اُٹھ کر عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ مائرہ نے اخبار اٹھا لیا۔ لیکن اخبار سامنے رکھے وہ مسلسل روبی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ روبی اسکول کے زمانے سے ہی ان کی دوست تھی۔ دونوں نے ایک ہی سکول اور پھر ایف۔ اے تک ایک ہی کالج میں پڑھا تھا۔ پھر روبی کے والد لاہور سیٹل ہو گئے۔ پھر دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا تھا اور پھر دو سال کی جدائی کے بعد انہوں نے روبی کے اصرار پر ہی لاہور سے ماسٹرز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یوں مزید دو سال انہوں نے اکٹھے گزارے تھے۔ وہ ہر ویک اینڈ پر روبی کے گھر چلی جاتی تھیں۔ فلک شاہ سے محبت اور احسان شاہ سے شادی تک وہ ہر بات سے آگاہ تھی۔ مائرہ کی شادی کے چند ماہ بعد ہی اس کی بھی شادی ہو گئی اور وہ کینیڈا چلی گئی۔ یوں اتنی پرانی دوستی میں دُوریاں پیدا ہو گئیں۔

'یہ شانی بھی بس...... کم از کم اس سے نمبر ہی لے لیتے۔'

انہوں نے جھنجلا کر اخبار صوفے پر پھینکا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ یہ ان کے دل کی تڑپ اور روبی سے ملنے کی شدید خواہش ہی تھی کہ ابھی انہیں کمرے میں گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ روبی نے "الریان" کے گیٹ میں قدم رکھا اور کچھ ہی دیر بعد شمو کی رہنمائی میں وہ ہنستی کھلکھلاتی اس کے کمرے میں کھڑی تھی۔

''ہائے روبی! یہ تم ہو؟'' وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئیں۔
''اس وقت میں تمہیں بہت شدت سے یاد کر رہی تھی۔ اور مجھے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی کہ احسان نے تمہارا نمبر کیوں نہیں لیا؟''
''یہ غلطی مجھ سے بھی ہوئی تھی کہ تمہارا نمبر نہیں لیا۔ لیکن دیکھو! تم نے یاد کیا اور میں موجود۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور بیٹھ گئی۔
''شمو! احسان شاہ کو بتا دینا کہ روبی آئی ہے۔ وہ بابا جان کے پاس ہیں۔''
انہوں نے شمو سے کہا، جو ابھی تک وہاں کھڑی تھی۔
''چھوٹے شاہ صاحب تو مصطفیٰ صاحب کے ساتھ کہیں باہر چلے گئے ہیں۔''
''اچھا! ٹھیک ہے...... تم کولڈ ڈرنک لاؤ اور پھر چائے لے آنا۔ اور ہاں! یہ لنچ بھی یہیں کریں گی۔''
''یہ کیا تم لنچ وغیرہ کے چکر میں پڑ گئی ہو۔ میں بس کچھ دیر کے لئے تم سے ملنے آئی ہوں۔ لمبی ملاقاتیں، لنچ، ڈنر پھر کبھی۔ آج صرف چائے تک محدود رہوں گی۔'' وہ پھر ہنسی۔
''تمہاری ہنسی اور بات کرنے کا انداز بالکل وہی ہے۔'' مائرہ نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔
''لیکن تم بدل گئی ہو۔ کچھ اماں اماں سی لگنے لگی ہو۔''
''تین بچوں کی ماں ہوں یار! دو بیٹیاں، ایک بیٹا...... تو اماں تو لگنا ہی ہے۔ اور سچی بات ہے، مجھے اس طرح لگنا بہت پسند ہے۔ تھوڑا سا بھاری جسم، سیاہ بالوں میں سے جھانکتے کچھ سفید بال، لبوں پر مامتا بھری مسکراہٹ۔ بھئی! ماں تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ اب تمہاری طرح لڑکی لڑکی سی لگنے والی ماں نہیں لگتی۔ حالانکہ تین بچوں کی ماں تو تم بھی ہو۔ احسان بھائی نے بتایا تھا مجھے۔ لیکن یار! تم تو بالکل ویسی ہی ہو۔ وہی گورنمنٹ کالج والی طرح دار، نخریلی مائرہ حسین۔ سچ بتاؤ! یہ بچے کہیں سے اُدھار تو نہیں لئے؟''
وہ پھر اونچی آواز میں ہنسی۔ مائرہ بھی مسکرا دیں۔
''تم ظاہر میں کچھ بدلی ضرور ہو۔ لیکن تمہاری آواز کا والیوم وہی ہے۔ فل۔''
''ہاں یار! اسد بھی مجھے کہہ کہہ کر ہار گئے کہ ذرا آہستہ بولا کرو۔ لیکن اپنی یہ عادت نہیں بدل سکی۔ کیا کروں؟..... لگتا ہے میرے والیوم سیلز میں ہی کچھ خرابی ہے۔ خیر چھوڑو۔ تم بتاؤ، تمہارے بچے کیسے ہیں؟...... کیا کر رہے ہیں؟''
''میری بیٹی نے ماسٹرز کر لیا ہے۔ بیٹے ابھی پڑھ رہے ہیں۔ زبیر انجینئرنگ کے دوسرے سال میں ہے۔ جبکہ عمر اے لیول کر رہا ہے۔''
''یعنی وقفہ بہت ضروری ہے۔'' روبی ہنسی۔ ''میرا بیٹا جاب کر رہا ہے اور بیٹیاں بھی فارغ ہیں...... سچ تو یہ ہے کہ ہم ان کی شادیوں کے سلسلے میں ہی پاکستان آئے ہیں۔ تم نے بیٹی کا رشتہ طے کر دیا؟''
''نہیں۔ ابھی تو نہیں۔''
''کہاں ہے؟...... ملواؤ نا۔''
''اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ ابھی سوئی ہے۔ کچھ دیر تک بلواتی ہوں۔''
شمو نے آ کر جوس پیش کیا۔
''کیا ارادہ ہے اس کے لئے؟ تمہارے جیٹھوں وغیرہ کے لڑکے تو ہوں گے۔ اور وہ..... کیا نام تھے تمہاری نندوں کے...... عمارہ اور زارا۔''
وہ جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔ ''زارا کا تو انتقال ہو چکا ہے۔''
''اوہ! بہت افسوس ہوا۔'' روبی نے اسے یاد کرنے کی کوشش کی۔

''ارادہ تو تھا۔ مصطفیٰ بھائی کا بیٹا بہت پسند تھا مجھے۔ ثنا بھابی کی اور میری بھی خواہش تھی۔ لیکن رابی نہیں مانتی۔''
''کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟''
''پتہ نہیں یار! اُس نے ایسا کچھ کہا نہیں ہے۔ لیکن وہ شادی کے لئے ابھی راضی نہیں ہو رہی۔''
''بعض اوقات بچیاں ذمہ داری سے گھبراتی ہیں۔ میری اپنی بیٹی بھی یہی کہتی ہے کہ وہ فی الحال شادی کی ذمہ داریوں میں نہیں پڑنا چاہتی۔''
''ہاں! ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے پاپا کی لاڈلی بھی تو بہت ہے۔ احسان نے بہت لاڈ اٹھائے ہیں اس کے۔''
''اور احسان بھائی کیا تمہارے اب بھی اسی طرح دیوانے ہیں؟''
اور احسان شاہ جو کچھ دیر کے لئے مصطفیٰ شاہ کے ساتھ باہر گئے تھے اور شمو سے روبی کے آنے کا سن کر ادھر ہی آ رہے تھے، اپنا نام سن کر رک گئے۔ روبی کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یہ کوئی ان کے دل سے پوچھتا جہاں آج بھی مائرہ کی حکمرانی تھی۔ وہ آج بھی اس کے اتنے ہی دیوانے تھے۔ وہ بالکل غیر ارادی طور پر رک گئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ مائرہ کیا کہتی ہے۔ لبوں پر مدھم مسکراہٹ لئے وہ مائرہ کا جواب سننے کے منتظر تھے۔
''ہاں! احسان آج بھی میرا دیوانہ ہے۔ بہت خیال رکھتا ہے میرا۔ اسی طرح محبت کرتا ہے۔''
''پھر مانتی ہو نا مجھے؟ میں نے کیا کہا تھا، یاد ہے نا؟ کہ شادی اُس سے کرو، جو تم سے محبت کرتا ہے..... نہ کہ اس سے، جس سے تم محبت کرتی ہو۔ اگر تمہاری شادی کسی نہ کسی طرح فلک شاہ سے ہو بھی جاتی تو فلک شاہ تمہیں وہ محبت کبھی بھی نہ دیتا، جو احسان شاہ نے تمہیں دی۔''
اور احسان شاہ جنہوں نے دروازہ کھولنے کے لئے ناب پر ہاتھ رکھا تھا، وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔
''تم ٹھیک کہتی ہو روبی!'' مائرہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن یہ دل..... اس نے تو ہمیشہ فلک شاہ کی چاہ کی تھی۔ اسی سے محبت کی تھی۔ اسی کا ساتھ چاہا تھا۔''
''کیا تم اب بھی فلک شاہ سے محبت کرتی ہو مائرہ؟'' روبی نے حیرت سے پوچھا۔
''نہیں یہ محبت کب کی نفرت میں بدل چکی۔ بس ایک آگ دہکتی ہے اندر، جو دل و جان کو جلاتی ہے۔ انتقام کی آگ..... اپنے ٹھکرائے جانے کا انتقام۔ میں نے اس سے کہا تھا، اس نے میری محبت کی توہین کی ہے۔ مجھے ٹھکرایا ہے۔ اور میں اسے کبھی سکھی نہیں رہنے دوں گی۔ میں نے قسم کھائی تھی روبی! اس سے اپنی انسلٹ کا بدلہ لوں گی۔ اس نے مجھ پر عمارہ کو ترجیح دی۔ اور مجھ سے کہا کہ میں اس کے دوست کو دھوکا نہ دوں۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔''
برسوں پرانے زخم کے ٹانکے کھل گئے تھے۔
روبی حیرت سے سن رہی تھی۔
''اور میں نے بدلہ لے لیا۔ اللہ نے مجھے موقع دیا اور شانی نے میری بات پر یقین کر لیا۔ وہ ''الریان'' سے نکل گیا، ہمیشہ کے لئے۔ وہ اب یہاں قدم تک نہیں رکھ سکتا۔ اس نے کہا تھا کہ میں، احسان شاہ کے قابل نہیں ہوں اور میں نے احسان شاہ سے شادی کر لی۔ اور اب وہ عمر بھر یوں ہی جلتا کڑھتا رہے گا۔''
اور ناب پر ہاتھ رکھے، ساکت کھڑے احسان شاہ کو لگا تھا، ان کا دل ایسے ڈوبے گا کہ پھر کبھی اُبھر نہیں سکے گا۔
''یہ کیسی محبت تھی تمہاری مائرہ؟'' روبی کی آواز میں تاسف تھا۔ ''فلک شاہ بہت اچھا انسان تھا۔ تم نے کیا، کیا اُس کے ساتھ؟''
''میں نے اُسے ''الریان'' والوں کے دل سے نکال دیا تھا۔ لیکن روبی! ایک بار پھر وہ میرے لئے امتحان بن گیا ہے۔ اس کی بیوی، اس کا بیٹا.....''
اور احسان شاہ نے ناب سے ہاتھ اٹھا لیا۔ انہیں لگا، اگر وہ کچھ دیر اور یہاں کھڑے رہے تو گر جائیں گے۔ وہ

لڑکھڑاتے قدموں سے مڑے۔ آنکھوں کے سامنے فلک شاہ کا چہرہ آ رہا تھا۔ کتنی بے یقینی تھی ان کی آنکھوں میں۔ جیسے انہیں احسان کی بے اعتباری کا یقین ہی نہ ہو۔ اور پھر جب وہ ان کے آفس آئے تھے۔ اور جب جب انہوں نے فون کیا تھا۔

پتہ نہیں کیسے وہ لاؤنج اور پھر لاؤنج سے ڈرائنگ روم تک آئے تھے۔ اُنہیں اس وقت تنہائی کی ضرورت تھی اور ڈرائنگ روم ہی ایک ایسی جگہ تھی، جہاں اس وقت کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے صوفے تک آئے اور گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے۔

آنکھوں کے سامنے فلک شاہ کا چہرہ ٹھہر گیا تھا، جب انہوں نے فلک شاہ کو ''الریان'' سے نکلنے کو کہا تھا تو اُن کی نظریں......

'اُف!' اُنہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور گرم گرم آنسو ان کی آنکھوں کو بھگونے لگے۔

تو یہ چھبیس سال کی جدائیاں۔

اس کا ذمہ دار کون تھا؟......وہ اور مائرہ۔

کیوں کیا انہوں نے مائرہ کی بات پر یقین؟......کیوں حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی؟

زارا اور اماں جان کے چہرے ان کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ وہ آخری لمحوں میں اماں جان کی آنکھوں میں انتظار کی اذیت......وہ حسرت۔

ان کا دل چاہا، وہ چیخیں مار مار کر روئیں۔ وہ کتنے سالوں سے مائرہ کے ہاتھوں بے وقوف بن رہے تھے۔ انہوں نے مائرہ پر یقین کر کے مومی کو کھو دیا تھا۔ اپنے عزیز از جان دوست کو۔ گزرے سالوں کے کتنے ہی منظر آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ کتنی ہی بار مومی نے انہیں مائرہ کے متعلق بتانا چاہا تھا اور جب وہ مائرہ کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتے تو مومی کا مضطرب ہونا اور کبھی کبھی کہنا۔

''یار! تمہیں کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی محبت کے لئے؟''

اور پھر جب اُن کی منگنی ہوئی تھی۔

جب وہ مومی کو لے کر رحیم یار خان گئے تھے۔

نہ جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں گزر گئی۔ پھر وہ اُٹھے اور چہرے کو اچھی طرح رومال سے پونچھنے کے بعد انہوں نے باہر کی طرف قدم بڑھایا۔ پھر کچھ سوچ کر واپس مڑے۔ پاکٹ سے اپنا سیل فون نکالا اور مروہ کا نمبر ملانے لگے۔

''مروہ پھپھو! پلیز۔ مجھے وہ سب کچھ بتا دیں، جو آپ مائرہ، مومی اور میرے متعلق جانتی ہیں۔ ایک بات بھی مت چھپائیے گا پلیز! بہت کچھ میں جان چکا ہوں......جو نہیں جانتا، وہ مجھے آپ سے سننا ہے۔''

''کیا سننا چاہتے ہو شان؟ جو گزر گیا، اسے بھول جاؤ''

''کیسے پھپھو؟ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ اور آپ کہہ رہی ہیں کہ بھول جاؤں؟......آپ جانتی تھیں پھپھو! کہ مائرہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ مومی سے......''

''شانی بیٹا! تم......''

''پھپھو! پلیز۔ اب کچھ بھی چھپانے کا فائدہ نہیں ہے۔ میں مر رہا ہوں پھپھو!''

اور جب مروہ سے بات کر کے احسان شاہ نے فون بند کیا تو ایک بار پھر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

مومی ان کے لئے کیا تھا؟

اور اُنہوں نے کیا، کیا؟

کچھ دیر وہ کھڑے ضبط کرتے رہے۔ پھر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر آئے۔ لاؤنج میں کھڑے کھڑے انہوں

نے اپنے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اندر سے روبی کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اس وقت مائرہ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنا والٹ نکال کر دیکھا۔ اور پھر عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

❁○❁

فلک شاہ نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے براؤن لفافہ اُٹھا کر اس میں سے ایک فائل نکالی اور اسے کھول کر دیکھنے لگے۔ تب ہی عمارہ نے کمرے کا دروازہ کھول کر پوچھا۔

''آپ کی چائے یہاں لے آؤں یا لاؤنج میں چلیں گے؟''

عموماً شام کی چائے وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں ہی پیتے تھے اور ساتھ میں ٹی وی بھی دیکھ لیتے تھے۔

''یہیں بھجوا دیجئے۔'' فلک شاہ نے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ''میں ذرا یہ دیکھ رہا ہوں۔''

''یہ کیا ہے؟''

''یہ ایبک نے اپنے نئے ناول کے مسودے کی کاپی بھیجی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ میں اسے پڑھ کر مشورہ دوں۔''

''اچھا تو کیا اس کا نیا ناول مکمل ہو گیا ہے؟'' عمارہ نے پوچھا۔

''نہیں۔ ابھی آخری باب رہتا ہے۔ لیکن وہ کچھ مطمئن نہیں ہے۔ اس لئے مجھے بھجوایا ہے۔'' فلک شاہ مسکرائے۔ ''وہ دراصل ایک شاہکار تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ اس کے پہلے دو ناول بھی تو شاہکار ہی تھے۔''

عمارہ مسکرائیں تو ان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ ٹھہری ہو گئی۔ اور عمارہ کو لگا، جیسے وہ اضطراب اور بے چینی جو ہر وقت ان کے چہرے کا ہالہ کئے رکھتی تھی، اس وقت نہیں تھی۔ لاہور سے آنے کے بعد پہلی بار عمارہ نے انہیں آج کچھ پُرسکون اور مطمئن دیکھا تھا۔ وہ بھی مطمئن سی کمرے سے نکل گئیں تو فلک شاہ نے اپنے سامنے کھلے صفحے پر نظر ڈالی۔

''اور صدیوں پرانی زمین کا سینہ دُکھوں سے چھلنی ہے۔ اور ابتدائے آفرینش سے ہی اس کی آنسوؤں کے ساتھ یاری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے آنسو کے ساتھ اس نے پہلا آنسو بہایا تھا۔ اس نے تمہارے دکھ اوڑھے اور تمہارے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں پر سنبھالا۔ تمہارے دکھ کے کانٹے اپنی انگلیوں سے چنے اور پوروں کو لہولہان کیا۔ اور تمہارے راستے اپنی پلکوں سے صاف کئے۔ تمہارے ساتھ مل کر روئی تمہارے ہر دکھ اور ہر غم پر...... تم تو اپنے دکھ اس کی جھولی میں ڈال کر شانت ہو جاتے ہو۔ وہ تو ازل سے تمہاری غمگسار ہے۔ لیکن تم نے کبھی اس کی غمگساری نہیں کی۔ تم اکڑ کر زمین پر چلتے ہو اور اپنے قدموں کی دھمک سے اس کا سینہ زخمی کرتے ہو۔''

''ہاں! تم صحیح کہتی ہو۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن کتنی عجیب بات ہے شاعر! تم نے کبھی زمین کی قدر نہیں کی۔ اپنی غمگسار کو اور تمہارے دکھوں پر رونے والی کو تم نے ہمیشہ اپنی ملکیت جانا۔ کبھی اس کی روتی آنکھوں کو نہیں دیکھا اور کبھی نہیں سوچا کہ تمہارے قدموں تلے بچھنے والی نے تمہارے ہر دکھ کو اوڑھا ہے اور آنسو بہائے ہیں۔''

فلک شاہ نے ایک ساتھ دو تین صفحات اُلٹے۔

''اور جب نمازِ فجر کے وقت فیروز ابولولو نے خنجر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا تھا اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے ماتھے پر شہادت کا جھومر سجا تھا...... اور جب حُسن و حیا کے پیکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے قرآن کے صفحات رنگین ہوئے تھے تو زمین کے آنسو نہ رُکتے تھے۔''

انہوں نے ایک اور صفحہ پلٹا۔

''اور جب زرعہ بن شریق تمیمی، نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سر کاٹتا تھا...... اور سنان بن انس نخوی، سرِ مبارک نیزے پر اٹھاتا تھا اور خولی بن یزید اصبحی سرِ مبارک لے کر چلتا تھا تو زمین دھاڑیں مار مار کر روتی تھی اور فریاد کرتی تھی۔

اور جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا لٹے پٹے قافلے کو لے کر کربلا سے روانہ ہوتی تھیں تو زمین ان کے قدموں سے لپٹتی تھی اور آنسو بہاتی تھی۔"

عمارہ ملازمہ کے ساتھ چائے لے کر آئیں اور ملازمہ کو جانے کا اشارہ کر کے پلیٹ اور نگٹس ان کی طرف بڑھائے۔

"نہیں۔صرف چائے لوں گا۔" فلک شاہ نے نظر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا۔

"کیسا ہے؟" عمارہ نے چائے بناتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"اس کے پہلے دو ناولوں سے مختلف ہے۔ابھی تو یوں ہی سرسری سا بیچ بیچ میں سے دیکھ رہا ہوں۔تفصیل سے پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔ویسے اچھا لگ رہا ہے۔"

"ایبک کو اللہ نے بڑی صلاحیتیں دی ہیں۔اللہ اسے نظرِ بد سے بچائے۔"

عمارہ کے لہجے سے محبت چھلکتی تھی۔انہوں نے چائے کا کپ فلک شاہ کی طرف بڑھایا۔

"آج انجی آ رہی ہے۔میں نے کہہ دیا تھا، دونوں رات کھانا کھا کر ہی جائیں۔کیا پکواؤں؟"

"یہ آپ کا شعبہ ہے عمو جی! جو جی چاہے اور جو ہماری انجی اور جواد کو پسند ہو۔" وہ مسکرائے اور اس مسکراہٹ میں عمارہ کو وہی پرانے رنگ جھلکتے دِکھے تھے۔عمارہ بھی مسکرا دیں۔

"ٹھیک ہے۔انجی سے پوچھتی ہوں۔"

وہ باہر چلی گئیں فلک شاہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے پھر سے فائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ایک صفحہ پلٹتے ہوئے وہ رُکے۔

"اور جب حجاج بن یوسف، مکہ پر حملہ آور ہوا اور مکہ کی سرزمین پر عبداللہ بن زبیرؓ کے ماتھے پر شہادت کا تاج سجا اور حضرت اسمٰؓ بعد شہادت اپنے لختِ جگر سے مخاطب ہوتی تھیں تو زمین کے آنسو بہت خاموشی سے اس کی آنکھوں سے بہتے تھے۔"

انہوں نے صفحہ پلٹا۔

"اور تم جانتے ہو شاعر! کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت کے آخری ایام میں بحیرہ اوقیانوس سے کاشغر اور سندھ تک مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے جھنڈے لہرا دیئے تھے۔"

"ہاں! میں نے ایف۔اے میں اسلامی تاریخ رکھی تھی۔" میں نے حورعین کی طرف دیکھا۔

"حالانکہ تمہیں تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

حورعین کے لبوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔میں مبہوت سا اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں! لیکن میرے مضمون کے ساتھ میرے کالج میں ہسٹری کا کمبی نیشن (Combination) تھا۔سو......"

"تو تم پاس ہو گئے تھے؟" وہ دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"بس، ہو ہی گیا تھا۔چند سوال رٹ لئے تھے۔کام چل گیا۔"

اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔کچھ دیر وہ یوں ہی لبوں پر مسکراہٹ لئے مجھے دیکھتی رہی۔مجھے اچھا لگا۔پہلی بار اس نے آنسوؤں سے ہٹ کر کوئی بات کی تھی۔پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر اذیت کے علاوہ کوئی اور تاثر دیکھا۔میرا جی چاہا، آج وہ کوئی اور بات نہ کرے اور یوں ہی مجھ سے میرے بارے میں چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہے۔لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"مشرق کی طرف محمد بن قاسم دریائے سندھ کے کنارے سے ہوتا ہوا ملتان تک جا پہنچا تھا تو قتیبہ بن مسلم، کاشغر ترکستان کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔مغرب میں موسیٰ بن نُصیر کا لشکر فرانس کی حدود میں داخل ہونا چاہتا تھا۔اور طارق بن زیاد نے اُندلس میں فتح کے جھنڈے گاڑے تھے۔"

پتہ نہیں اُسے تاریخ کھنگالنے کا اتنا شوق کیوں تھا؟..... میں جھنجلایا۔

''ہاں! مجھے علم ہے کہ طارق نے کشتیاں جلائی تھیں اور محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو شکست دی تھی۔ اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ سلیمان بن عبدالملک نے خلیفہ بنتے ہی......''

میں چاہتا تھا، آج ہم اپنے متعلق باتیں کریں اور اس کے لبوں پر وہی پیاری سی مسکراہٹ ہو، جو ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھی تھی۔ لیکن وہ جب تاریخ کے ایوانوں میں گھوم رہی ہوتی تھی تو گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتی تھی۔

''ہم بڑی بدنصیب قوم ہیں شاعر! اپنے محسنوں کو مار کر ہم اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلے کاٹتے ہیں۔ تم نے تو اسلامی تاریخ پڑھی ہے، بھلے نصاب کے طور پر سہی۔ تم تو جانتے ہو نا، سلیمان نے موسیٰ بن نُصیر کے ساتھ کیا، کیا..... وہ موسیٰ بن نُصیر، جس نے آدھی دنیا کو فتح کیا تھا۔ جو افریقہ اور ہسپانیہ میں اسلامی سلطنت کا بانی تھا، اس پر خیانت کا الزام لگا کر اور سارا دن دھوپ میں کھڑا کر کے کوڑے لگائے جاتے تھے تو زمین کے آنسو اس 90 سالہ بہادر شخص کا حال دیکھ کر رُکتے نہ تھے۔'' وہ پھر افسردہ ہوئی۔

''اُس کے گلے میں طوق ڈالا گیا۔ اور پاؤں میں بیڑیاں پہنائی گئیں، جائیداد ضبط کر لی گئی اور اس کے بیٹوں عبدالرحمٰن، عبدالعزیز اور عبداللہ کو شہید کر دیا گیا۔ زمین نے اس فاتح کو سڑکوں پر بھیک مانگتے دیکھ کر لہو کے آنسو روئے۔''

''ہاں! میں نے پڑھا تھا۔ جرمانے کی رقم پوری کرنے کے لئے موسیٰ بن نُصیر کو گلے میں طوق ڈال کر اور ہاتھ میں کشکول پکڑا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں نابینا بھی ہو چکے تھے۔''

میں نے پھر اس کی بات کاٹی تھی۔

''اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سلیمان بن عبدالملک نے طارق بن زیاد، محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم کو بھی مروا دیا تھا۔''

اس نے ایک ناراض نظر مجھ پر ڈالی۔

''وہ چاہتے تو سلیمان کا حکم نہ مانتے۔ ان کے چاہنے والے ان کے سروں پر تاج رکھتے۔ لیکن وہ آج کے مسلمان نہیں تھے۔ انہیں ملت کا اتحاد اپنی زندگیوں سے زیادہ عزیز تھا۔''

اس نے نظریں میرے چہرے سے ہٹا لیں۔

''اور وہ محمد بن قاسم، جس نے اہلِ سندھ کو زندگی کی نوید دی تھی..... اور طارق بن زیاد جو موسیٰ بن نُصیر کا لے پالک بیٹا تھا۔ وہ بہادر...... آہ! ہم بڑی بدنصیب قوم ہیں۔''

اس نے دہرایا اور ایک آہ بھر کر خاموش ہو گئی اور سر جھکا لیا۔

''تو......'' بڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے المیے پر اتنا نہیں روتی تھی، جتنا اسلامی تاریخ کے المیوں پر آنسو بہاتی تھی۔

''تو میں کہہ رہی تھی کہ جب یزید بن ابو کبشہ، محمد بن قاسم کو گرفتار کرنے آ رہا تھا، تو زمین کے آنسو بہتے تھے اور وہ کم عمر سالار کی بلائیں لیتی اور اس پر نثار ہوتی تھی۔ اور جب مالک بن یوسف، صالح سلیمان کے حکم پر اسے قتل کرتا تھا تو زمین بلکتی تھی۔ آہ! ''واسط'' کی زمین پر وہ صبح کا ستارہ غروب ہو گیا۔

فلک شاہ نے چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھا اور بہت دھیان سے شروع سے پڑھنے لگے۔ انہیں یہ ناول بہت دلچسپ اور منفرد لگ رہا تھا۔ ایک دم دروازہ کھلا اور عمارہ اندر آئیں۔

''مومی!...... مومی! دیکھیں کون آیا ہے؟'' ان کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی اور سانس پھولا ہوا تھا۔

''کون؟'' انہوں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔

اور پھر جیسے اُن کی نظریں وہیں ساکت ہو گئیں۔ لمحہ بھر تو وہ بے یقینی سے دیکھتے رہے۔ پھر ان کے لبوں سے کانپتی ہوئی سی آواز نکلی۔

''شانی!'' انہوں نے ہتھیلیوں کے زور پر اُٹھنے کی بے اختیار کوشش کی۔ پھر اپنی بے بسی پر اُن کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ اُٹھ کر بھاگ کر ان کا استقبال نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے گلے نہیں لگ سکتے تھے۔

''شانی!'' ان کے لبوں سے پھر نکلا اور ان کی آنکھیں برس پڑیں۔

احسان شاہ تڑپ کر ان کے قریب آئے اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لئے۔

''موی! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں غلط جانا۔''

''شانی!'' فلک شاہ نے بازو پھیلا دیئے اور احسان شاہ بیٹھے بیٹھے ہی ان کے گلے لگ گئے۔ دونوں رو رہے تھے۔ لفظ جیسے دونوں کے پاس ہی نہیں تھے۔

''شانی بھائی! پلیز۔'' عمارہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اب بس کریں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

''مجھے کچھ نہیں ہو گا عمو!'' احسان شاہ نے مڑ کر عمارہ کو دیکھا اور پھر فلک شاہ کی طرف جو ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کر رہے تھے۔

''میں تو ہمیشہ سے بے وقوف تھا موی! مجھے تو بعض اوقات سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر تم نے مجھے کیوں نہ بتایا؟......صاف صاف...... پہلے ہی دن، جب تمہیں لگا تھا کہ وہ میرے ساتھ مخلص نہیں۔''

''جو گزر گیا، سو گزر گیا شانی!'' فلک شاہ نے پُرنم آنکھوں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ ''میں چاہتا تھا، مرنے سے پہلے تمہیں دیکھ لوں، سن لوں کہ تمہاری بدگمانی دُور ہوگئی ہے۔ میں اس طرح مرنا نہیں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے بدگمان ہو۔ میں نے بارہا دعا کی کہ میری قبر پر مٹی ڈالنے والوں میں تمہارے ہاتھ بھی ہوں۔ میرے لئے رونے والی آنکھوں میں تمہاری آنکھیں بھی ہوں۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہارا دل صاف ہوا۔''

''موی! تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟ مجھ سے خفا تو نہیں ہو نا؟'' احسان شاہ کی آنکھیں پھر برس پڑیں۔

''میں تم سے کبھی خفا تھا ہی نہیں یار! جانتا تھا، تمہیں بدگمان کیا گیا۔''

''اور میں بدگمان ہو گیا۔ لیکن کیوں ہوا میں بدگمان؟...... کیوں؟...... تمہیں تو میں بچپن سے جانتا تھا۔ اور وہ صرف چند برسوں کی رفیق تھی۔ میں نے اُس کا اعتبار کیا۔ تمہارا نہیں۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں کیوں نہیں دیکھا؟ تمہارے چہرے کو کیوں نہیں پڑھا؟''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کے بال نوچنے لگے۔

''کیا کر رہے ہو شانی؟'' فلک شاہ نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔

''کیا کروں؟..... کیا کروں میں موی! جو اس اذیت کو کم کر سکے۔ جو دل و جان کو ٹکڑے کئے دیتی ہے۔ کیسے کم کروں اس دکھ کو، جو صبح سے دل چیر رہا ہے؟''

فلک شاہ نے ہاتھ بڑھا کر اُنہیں پھر سے گلے لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکنے لگے۔ لیکن اُن کی آنکھوں سے پھر آنسو بہہ نکلے۔ اس دکھ نے چھبیس سال تک ان کے دل کو آرے کی طرح چیرا تھا، زخم لگائے تھے۔

''موی! میں کیا کروں؟...... کیا کروں ایسا، جو ان سارے گزرے برسوں کو واپس لے آئے؟''

احسان شاہ کہہ رہے تھے اور ان کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ایک بار پھر دونوں دوست بلک بلک کر رو رہے تھے۔ اور ان کے آنسو ایک دوسرے کے کندھے بھگو رہے تھے۔

۞○۞

ایبک بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ''زمین کے آنسو'' کی فائل تھی۔ اس نے فلک شاہ کو اس کی فوٹو کاپی بھیجی تھی۔ انہوں نے اسے پسند کیا تھا۔ لیکن نظر ثانی کرنے کو بھی کہا تھا۔ سو فجر کی نماز پڑھ کر وہ سویا نہیں تھا اور فائل اٹھالی تھی۔ وہ اس ناول کو یکسوئی سے لکھ نہیں سکا تھا۔ پہلے دو ناول اس طرح وقفہ دے کر نہیں لکھے تھے اس نے۔

'بابا صحیح کہتے ہیں۔ مزید لکھنے سے پہلے مجھے پچھلے لکھے ہوئے کو ایک نظر دیکھ لینا چاہئے۔' اُس نے ورق گردانی کرتے ہوئے سوچا اور اپنے سامنے کھلے صفحے پر نظر ڈالی۔ یہ صفحہ نمبر 253 تھا۔

''جب صلاح الدین ایوبی، بیت المقدس کی خاطر جنگ کر رہا تھا تو عباسی خلفاء عیش وعشرت میں پڑے تھے۔ بغداد کے چوراہوں پر مناظرے ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے فرقے کو برا کہا جاتا تھا۔ کون جانتا تھا کہ چھ سو سال پہلے ایک طرف کوہ البرز کی چوٹیوں پر اسلام کا جھنڈا لہرانے والے اور دوسری طرف افریقہ کے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں گھوڑے دوڑانے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

وہ صحرائے گوبی کا ایک چرواہا تھا۔ جس کا نام تموچن تھا اور تاریخ میں چنگیز خان کے نام سے مشہور تھا۔ اُس کی قیادت میں منگولیا کے وحشی قبائل ایک آندھی کی طرح اُٹھے اور شہروں اور بستیوں کو جلاتے چلے گئے تھے اور ان کے جرنیل اپنی فتح کی یادگار میں انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتے تھے تو زمین اپنے وجود پر ان میناروں کی تعمیر سے اذیت میں تھی۔ اور ان مسلمانوں کے لئے اس کا دل روتا تھا۔ اور جب جلال الدین خوارزم شاہ تھک کر اس قوم سے مایوس ہو کر اکیلا جاتا تھا تو زمین اُس کے اَن دیکھے آنسو اپنے نامعلوم ہاتھوں سے پونچھتی تھی۔ اور جانتے ہو شاعر! تاریخ کبھی کسی قوم کی اجتماعی غلطی معاف نہیں کرتی۔ وہ چنگیز خان کا پوتا ہلاکو خان تھا اور یہ معتصم باللہ کی خلافت کا تیسرا سال تھا، جب وہ بلا کی طرح نازل ہوا اور بغداد نے وہ تباہی دیکھی، جس کے سامنے بابل ونینوا کی داستانیں ہیچ ہیں۔ تب زمین نے اتنے آنسو بہائے تھے کہ ان کا شمار ہی نہیں۔ دجلہ کے سرخ پانی میں اس کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے اور کتب خانوں سے اُٹھنے والا دھواں اُس کے دل میں آگ لگاتا تھا۔''

اُس نے چند صفحات ایک ساتھ پلٹ دیئے۔

''تو زمین کے آنسوؤں کا تو حساب ہی نہیں ہے شاعر! وہ کب کب روئی۔ کب کب آنسو بہائے۔'' میں اُس کی بات خاموشی سے سن رہا تھا۔

''جب عبداللہ، فرڈیننڈ کو غرناطہ کی چابیاں دیتا تھا...... جب مسجد قرطبہ کو کلیسا میں تبدیل کیا جا رہا تھا......اور جب ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کو شہید کیا جا رہا تھا اور جب 1857ء میں برصغیر کے مسلمانوں کو سُولیوں پر چڑھایا جا رہا تھا...... اور جب بخت خان مایوس، سر جھکائے لال قلعہ سے نکلا تھا...... جب جلیانوالہ باغ میں نہتے لوگوں پر جنرل ڈائر گولیاں چلا رہا تھا تو کیا زمین اپنے آنسو روک پاتی ہوگی؟......نہیں نا!''

ایک نے پھر ایک ساتھ کئی صفحات پلٹ دیئے۔ یہ صفحہ نمبر 280 تھا۔

''تاریخ نے اتنی بڑی ہجرت دیکھی جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ ہجرت برصغیر کی تقسیم کے وقت دیکھی گئی۔ اور مشرقی پنجاب میں ظلم وستم اور بربریت کی جو داستانیں لکھی گئیں، انہوں نے تاتاریوں کے ظلم کو مات کر دیا۔ یہ پاکستان یوں ہی نہیں بن گیا تھا۔ بڑی قربانیاں دی گئی تھیں......آہ!'' اُس کے لبوں سے آہ نکلی۔

''کیا ہوا حور عین؟'' میں نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''آہ شاعر! تم لوگوں نے تاریخ کو مسخ کیا۔ تمہارے ادیبوں نے مشرقی پنجاب میں ہونے والے ظلم وشقاوت کی کہانیاں تو کم لکھیں لیکن یہاں ہونے والے اِکا دُکا واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔''

''نہیں خیر! ایسا تو نہیں ہے۔ لکھا تو ہے۔ لیکن شاید تم نے نہیں پڑھی، نسیم حجازی کی خاک وخون۔'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''ہو سکتا ہے، میں نے وہ سب نہ پڑھا ہو۔ لیکن شاعر! یہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔''

''کون سی؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہی، سقوطِ ڈھاکہ اور سانحہ مشرقی پاکستان۔ مکتی باہنی والوں نے جو مظالم کیے بہاریوں پر اور مغربی پاکستانیوں پر اور

مغربی پاکستان کے فوجیوں پر، انہیں بتاتے میرا دل کانپتا ہے۔ لیکن تمہارے بڑے بڑے ادیبوں کی اُنگلیاں تو صرف اپنی فوج کی طرف اُٹھتی رہیں۔ اپنی ہی فوج کو بدنام کرنے میں وہ غیروں سے بھی بڑھ کر نکلے۔ کسی نے حقیقت کو جاننے اور تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تیس لاکھ بنگالی مارے گئے۔ یہ ایسا جھوٹ تھا، جسے سب نے تسلیم کر لیا۔ کسی نے احتجاج نہیں کیا۔ حقیقت رکھنے والے تو دوسرے ہیں، جو صفحات اُلٹ اُلٹ کر دیکھتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں۔ لیکن تمہارا قلم پھر بھی خاموش رہتا ہے۔ تمہیں کیا؟..... تمہیں تو اپنی کرسی سے مطلب ہے اور دولت سے، جو تمہارے بینک میں بھر رہی ہے۔ تم نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ محصور بہاریوں پر کیا گزرتی ہے۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔

''میں کچھ نہیں جانتا حورعین! مجھے تاریخ سے کیا لینا دینا؟ مجھے زمین کے آنسوؤں سے کیا مطلب؟ مجھے تو تمہارے آنسو بے قرار کرتے ہیں اور تمہارا کرب میرے دل میں زخم ڈالتا ہے۔ میں، جو اتنے عرصہ سے اس ریسٹ ہاؤس میں پڑا ہوں تو تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کیوں؟ تمہارے لئے..... صرف تمہارے لئے حورعین! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

وہ آنکھوں میں حیرت لئے مجھے دیکھنے لگی۔

''میرا یقین کرو حورعین! یہاں کی سردی میری ہڈیوں کو کڑکڑاتی ہے۔ لیکن میرا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ میں تمہارے بغیر..... تم میرے ساتھ چلو حورعین!''

میں جذباتی ہو رہا تھا اور وہ یوں ہی آنکھوں میں حیرت لئے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''سوری!'' مجھے ایک دم ہی خیال آیا تھا۔ میں نے رابعہ، رقیہ اور مریم کے متعلق تو پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں؟ اور وہ اکیلی یہاں اس وادی میں کیا کر رہی ہے۔ میں اس کے قریب ہی دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔

''حورعین! رابعہ تو بچ گئی تھی۔ پھر کیا ہوا تھا؟..... کیا تمہاری حویلی یہیں قریب ہے؟''

حورعین نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں ایک دم پانیوں سے بھر گئیں اور وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''چوہدری فرید کی حویلی میں اب ثریا کی حکومت تھی۔ وہ سر اُٹھا کر تنی ہوئی گردن کے ساتھ چلتی تھی کہ اس کی گود میں چوہدری فرید کا وارث تھا۔ اسے تو اب نورو اور میراں کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ بلا سے وہ بن سنور کر ڈیرے پر جائیں اور چوہدری فرید کو لبھائیں۔ وہ وارث کی ماں تھی۔ اور اسے کوئی ڈر نہیں تھا۔''

وہ سر جھکائے ہولے ہولے بول رہی تھی اور میں ایک بار پھر اسے خاموش ہو کر سن رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی ساری گفتگو میں مجھے صرف مریم کی کہانی سے دلچسپی تھی۔

مریم جو حورعین کی ماں تھی۔

حورعین جو خمسہ تھی، پانچویں۔

''اور چوہدری فرید کو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ بھی اس گھر میں رہتی ہے اور ثریا جتنے ہی حقوق رکھتی ہے۔ اور ثریا سے زیادہ زمین کی مالک ہے۔ لیکن وہ اسے نظر ہی نہیں آتی تھی۔ وہ ثریا سے اُکتاتا تو ڈیرے کی راتیں رنگین ہو جاتیں اور میراں اور نورو سے بے زار ہوتا تو ثریا کے پہلو میں پناہ ڈھونڈتا۔ مریم تو اب کہیں بھی نہیں تھی۔ ایک بات بتاؤ گے شاعر؟''

حورعین نے یکایک سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں جو بہت دھیان سے اسے سن رہا تھا، ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''یہ نورو اور میراں جیسی عورتوں میں مرد کے لئے کیا کشش ہوتی ہے؟ کیا بات ہوتی ہے ان میں جو مریم جیسی خوبصورت اور صابر عورت اور ثریا جیسی طرح دار عورت میں نہیں ہوتی؟ وہ جو نہ خاندانی ہوتی ہیں، نہ شریف۔''

''پتہ نہیں۔'' میں گھبرا گیا۔ ''میرا اس طرح کی عورتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔''

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی اور سر جھکا لیا اور بات وہیں سے شروع کی، جہاں چھوڑی تھی۔
''تو مریم سارا دن مصروف رہتی اور شام ہوتے ہی گھڑونچی کی جالیوں سے جھانکنے لگتی کہ دن بھر گاؤں کی گلیوں میں گھومنے کے بعد شام کو دارو سائیں پیپل تلے آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ چپ، ساکت...... پتہ نہیں کیا سوچتا رہتا تھا۔ اُس کے گیت بھی مریم کو رُلاتے تھے اور اس کی چپ بھی اُسے رُلاتی۔ وہ رقیہ کے کندھے پر سر رکھے روئے چلی جاتی۔''
''سعدی اور فرو بہت یاد آتی ہیں رقی!'' اور رقیہ اس کا سر سینے سے لگائے ہولے ہولے تھپکتی رہتی۔ پھر ایک دن جانتے ہو کیا ہوا؟''
حورعین نے پلکیں اُٹھائیں۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
''چوہدری فرید کی بڑی بہن نے اپنا دوپٹہ چوہدری فرید کے قدموں میں ڈال دیا۔ وہ اپنے ذہنی معذور بیٹے کا رشتہ لائی تھی۔
''یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گی فریدے!...... بڑی آس لے کر آئی ہوں۔''
اور چوہدری فرید نے اُس کا دوپٹہ اُٹھا کر اُس کے سر پر ڈال دیا۔
''اپنے ہی اپنوں کا تن ڈھانپتے ہیں۔'' اس نے مریم کی طرف دیکھا، جو ساکت بیٹھی تھی۔
''میری بہن ہے اور اس کا دکھ مجھے ہی بانٹنا ہے۔ غیروں کو نہیں۔'' وہ وضاحت کر رہا تھا اور مریم پتھر ہو گئی تھی۔
یہ چوہدری فرید کی وہ بہن تھی، جس نے رقیہ کے بعد ہر بیٹی کی پیدائش پر چوہدری فرید کو پرسہ دیا تھا اور بین ڈالے تھے۔ لیکن اب اپنے ذہنی معذور بیٹے کے لئے بیوی چاہئے تھی اُسے۔
''یہ ظلم مت کرو۔'' مریم، چوہدری فرید کے پاؤں پر گر پڑی۔
''یہ ظلم نہیں ہے۔ وہ میری بہن ہے۔ اسے میں رشتہ نہیں دوں گا تو کون دے گا؟''
''کیا رقیہ؟'' میں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔
''نہیں۔'' اس نے نچلے ہونٹ کو بری طرح دانتوں سے کچل ڈالا۔ ''ہماری برادری میں لڑکی کی دوسری شادی کا رواج نہیں ہے۔ چاہے وہ بیوہ ہو یا مطلقہ۔ سولہ سال کی ہو یا بیس سال کی۔ اسے باقی ماندہ زندگی یوں ہی گزارنا ہوتی ہے۔''
''تو کیا رابعہ؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
لیکن وہ بھیگی پلکوں کو اوڑھنی کے پلو سے پونچھتی اور ہونٹ کچلتی رہی۔ کافی دیر بعد اس نے آہستگی سے کہا۔
''اور جس روز چوہدری فرید کی بہن گاؤں میں بتاشے بانٹ رہی تھی، اس روز مریم پیپل تلے بیٹھے دارو سائیں کے سامنے دو زانو بیٹھی زاروں زار رو رہی تھی۔
''لوگ کہتے ہیں، تُو سائیں ہے۔ اللہ کا پیارا۔ میری رابعہ کے لئے دعا کر۔ وہ بہت معصوم ہے۔ بہت چھوٹی ہے۔ میری زبان میں تاثیر نہیں ہے دارو سائیں! میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ تُو دعا کر میری رابی کے لئے۔''
اور دارو سائیں خالی خالی آنکھوں سے اسے تکتا تھا جیسے کچھ نہ سنتا اور سمجھتا ہو۔ بس ایک بار اُس کا ہاتھ اٹھا تھا اور اس نے مریم کے سر پر ہاتھ رکھ کر فوراً ہی اٹھا لیا تھا اور مریم مایوس ہو کر واپس آ گئی تھی اور پوری رات وہ جاگی تھی۔ کبھی اندر کبھی باہر۔ رقیہ کے ساتھ جاگتی اور آنسو بہاتی تھی اور حورعین اور رابعہ بے خبری کی نیند سوتی تھیں۔
رات کا جانے کون سا پہر تھا، جب مریم بے چین ہو کر صحن میں آ بیٹھی تھی اور دارو سائیں کی آواز ہوا کے دوش پر پڑتی مریم تک آئی تھی۔ آج بڑے دنوں بعد اس نے دارو سائیں کی آواز سنی تھی اور دارو سائیں کی آواز میں آج جیسے بہت کرب اور درد تھا۔ یوں جیسے اس کے گلے سے لفظ نہیں، آنسوؤں میں بھیگی سسکیاں نکل رہی ہوں۔
''نی میں نیل کرائیاں نیلکاں
میرا تن من نیلو نیل۔''

وہ بار بار یہی دہراتا تھا اور سسکیاں لیتا تھا۔ مریم بے چین ہو کر گھڑونچی تک آئی تھی۔ لیکن باہر گھپ اندھیرا تھا۔ اماوس کی رات تھی اور اس اندھیرے میں دارو سائیں نظر نہیں آتا تھا۔ بس اُس کی آواز تھی، جو ساعت میں سسکیوں اور آہوں کی صورت آتی۔ اور اس صبح مریم منہ اندھیرے ہی حویلی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی۔ گھٹنے موڑے دارو سائیں پیپل تلے اوندھا پڑا تھا۔ مریم نے دوڑ کر اُسے سیدھا کیا۔ اُس کا ماتھا لہولہان تھا۔

''دارا...... داراشکوہ!''

مریم ہاتھوں سے اور دوپٹے کے پلّو سے اس کی پیشانی سے بہتا خون پونچھتی اور روتی تھی۔

''داراشکوہ!'' وہ اُس کا پورا نام لیتی تھی کہ بچپن میں داراشکوہ کو اپنے پورے نام سے بلایا جانا پسند تھا۔

مریم بلاتی تھی اور دارو سائیں کے کانوں میں کوئی بھولی بسری آواز رس گھولتی تھی۔

''داراشکوہ! تم نے خود کو زخمی کیا تو پھر زخم صاف نہیں کروں گی۔ پھپھو نے منع کیا ہے نا درخت پر چڑھنے سے؟''

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔

''مریم!''

داراشکوہ نے اسے بلایا تھا، آواز دی تھی۔ مریم حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی اور ابھی اس کی آنکھوں کی حیرت ختم نہیں ہوئی تھی کہ دارو سائیں کی آنکھیں بند ہو گئیں اور سر پیچھے ڈھلک گیا۔

''نہیں.....'' مریم اُس کے بند پپوٹوں پر ہاتھ رکھے اُسے دیوانہ وار پکارتی تھی اور اس کے کانوں میں دارو سائیں کی آواز گونجتی تھی۔

''نی میں نیل کرائیاں نیلکاں۔''

''دارو سائیں مر گیا تھا کیا؟'' میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا تو حورعین نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا جیسے اُسے میری ناسمجھی پر حیرت ہوئی ہو اور وہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی سیاہ اوڑھنی سے اچھی طرح خود کو لپیٹا اور پتھر پھلانگتی نیچے وادی کی طرف جانے لگی۔

''حورعین! رُکو۔ سنو، مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔ پلیز!''

لیکن حورعین رُکی نہیں۔ وہ میری نظروں سے دُور ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کی اوڑھنی کا ایک پلّو پتھروں پر گھسٹتا تھا۔''

ایبک بہت دھیان سے پڑھ رہا تھا اور کہیں کہیں کچھ اضافہ بھی کرتا جا رہا تھا کہ عمر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

''ارے عمر! تم۔''

ایبک نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھی اور بڑے تپاک سے اُسے ملا۔ وہی ہمیشہ والی گرم جوشی اور محبت کا اظہار۔ لیکن عمر کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

''الریان'' میں سب ٹھیک ہیں؟''

''ہاں۔'' عمر نے سر ہلایا۔

''تم کچھ خاموش لگ رہے ہو عمر! خیر تو ہے نا؟'' ایبک نے بغور اسے دیکھا۔

''وہ...... آپ ناراض ہیں ایبک بھائی؟ ماما نے......''

''کچھ مت کہنا یار! میں ناراض نہیں تھا، بزی تھا۔'' ایبک نے اسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔

''سوری ایبک بھائی! وہ......'' عمر نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

''کہا نا، کچھ مت کہنا۔ ایسا کچھ نہیں ہے، جس کے لئے تمہیں سوری کرنے کی ضرورت پڑے۔'' ایبک نے محبت سے اُس کے بال بکھرائے۔

''ملت گُنیا جان بہت اُداس ہیں۔ اور آپ کو پتہ ہے، انہوں نے اس روز کے بعد سے سب کے ساتھ ٹیبل پر کھانا نہیں

کھایا۔ کیا آپ اب بھی ''الریان'' نہیں آئیں گے؟'' اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

''ارے نہیں یار! تم سے یہ کس نے کہا؟ تمہیں نہیں معلوم ایبک فلک شاہ کو بھی اپنے بابا کی طرح ''الریان'' سے عشق ہے۔ وہ اُس سے دُور نہیں ہو سکتا۔''

''انکل ''الریان'' سے دُور ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن دُور ہو گئے۔ حالات کا کیا پتہ ہوتا ہے ایبک بھائی!'' عمر بدستور سنجیدہ تھا۔

''زیادہ فلسفی بننے کی ضرورت نہیں یار!'' ایبک نے ہلکی سی اُس کی ناک دبائی۔ ''چلو ابھی چلتے ہیں۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔''

''سچ ایبک بھائی؟'' عمر کی بھوری آنکھیں چمکنے لگیں۔

''بالکل سچ۔'' ایبک مسکرایا اور وارڈروب سے کپڑے نکالنے لگا۔

❁○❁

رابیل لاؤنج میں تنہا بیٹھی تھی۔ اُس کی گود میں اخبار تھا، لیکن وہ اخبار نہیں پڑھ رہی تھی اور نہ ہی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ بڑے دنوں بعد وہ آج یوں لاؤنج میں آ کر نیچے بیٹھی تھی۔ ورنہ بس کھانا لگنے کے بعد آتی اور پھر چلی جاتی تھی۔ نیچے خاموشی تھی۔

رابیل ابھی تک سب کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔ حالانکہ مونی یا مرینہ نے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی تھی۔ لیکن رابیل کو لگتا تھا جیسے وہ اب نظر اُٹھا کر کبھی مونی یا مرینہ سے بات نہیں کر سکتی تھی۔

پتہ نہیں، وہ کیا سوچتی ہوں گی کہ مما نے اس طرح کی بات کیوں کی۔ اور ایبک، کیا وہ کبھی اس کا سامنا کر پائے گی؟ شاید کبھی نہیں...... اور کیا کبھی ایبک بھی جان پائے گا کہ ایک شام اچانک میرے دل کی دیواروں پر یہاں وہاں ہر جگہ اُس کی محبت کے چراغ جل اُٹھے تھے۔ کیا نارسائی میرا مقدر ہے؟...... اور کیا......

شمو کچن سے ڈسٹر اُٹھائے لاؤنج میں آئی۔

''باجی! ڈسٹنگ کر لوں؟''

''ہاں!'' رابیل نے چونک کر اسے دیکھا۔ تب ہی باہر گاڑی کا ہارن بجا۔

''عمر بھائی آ گئے ہیں شاید۔'' شمو دروازہ کھولنے کے لئے جانے لگی۔

''کیا عمر گھر پر نہیں ہے؟ آج تو چھٹی تھی۔'' رابیل نے پوچھا۔

''ہاں! وہ کچھ دیر پہلے ہی گئے تھے۔''

گیٹ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ شمو اندرونی دروازہ کھولنے لگی۔ رابیل نے مڑ کر دیکھا۔ عمر کے ساتھ ایبک بھی اندر آیا تھا۔ رابیل کا دل تیزی سے دھڑکا۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ شاید اب ایبک بھی ''الریان'' نہیں آئے گا۔ لیکن وہ آ گیا تھا۔ یقیناً عمر اسے لینے گیا تھا۔ شاید بابا جان نے اسے بھیجا ہو۔

ایبک اُسے لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹک گیا تھا۔ لیکن پھر ''السلام علیکم'' کہتا ہوا تیزی سے عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رابیل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے عمر سے پوچھا۔

''کیا وہ مجھ سے خفا ہیں؟''

''ارے نہیں رابی آپی! وہ تو ماما سے بھی خفا نہیں ہیں۔ کہہ رہے تھے، بڑی ہیں۔ انہیں جو بہتر لگا، انہوں نے کیا۔ وہ ایسے ہی ہیں، گریٹ۔'' رابی سے بات کر کے وہ بھی ایبک کے پیچھے لپکا، جہاں عبدالرحمٰن شاہ اُسے گلے لگائے کہہ رہے تھے۔

''بہت افسردہ تھا تمہارے لئے۔ ابھی میں اور شانی تمہاری طرف ہی آ رہے تھے۔''

''سوری بابا جان! بس بہت بزی ہو گیا تھا میں۔'' وہ شرمندہ ہوا اور احسان شاہ کو سلام کیا جو بیڈ کے پاس ''با

بیٹھے بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ آج پہلی بار انہوں نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ اور آج پہلی بار ہی انہیں احساس ہوا تھا کہ موی کا بیٹا کتنی سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔

وہ ایک دم ہی اُٹھے اور عمر احسان شاہ کی آنکھوں میں حیرت اُتر آئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مسکرا دیا۔

'تو پاپا بھی ایک فلک شاہ کے فین ہو گئے۔'

''ادھر میرے پاس بیٹھو ایبک!'' عبدالرحمٰن شاہ نے بیڈ پر اس کے لئے جگہ بنائی اور عمر کی طرف دیکھا۔ ''تم کیوں کھڑے ہو عمر؟ بیٹھ جاؤ۔'' عمر احسان حیرت زدہ سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی احسان شاہ کی طرف دیکھ رہا تھا، جو اس سے بے نیاز ایبک کی طرف متوجہ تھے۔

''بابا جان! کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ایبک شکل و صورت میں سلجوق انکل سے ملتا ہے اور عادت و مزاج میں بالکل موی ہے۔''

''ہاں۔ لیکن اس میں جو صبر اور تحمل ہے، وہ موی میں نہیں تھا۔ موی بہت جلد غصے میں آ جاتا تھا۔''

''ہاں! لیکن کبھی کبھی۔'' احسان شاہ مسکرائے۔

''لیکن یہ کبھی کبھی کا غصہ بہت نقصان کر گیا ہمارا۔''

''بابا جان!'' احسان شاہ شرمندہ ہوئے۔ ''غلطی میری تھی۔ میں نے اسے غصہ دلایا۔ میں اس کے لئے کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا کہ اماں جان......''

''جو ہوا، سو ہوا۔ اب تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی تو میں بہت خوش ہوں۔ ورنہ یہ دکھ لے کر قبر میں جاتا۔''

''بابا جان!'' احسان شاہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''بس اب پرانی باتوں کا ذکر کبھی مت کرنا۔ خوامخواہ تکلیف ہو گی۔ تمہیں بھی اور موی کو بھی۔''

''آپ کو کیا پتہ بابا جان! میرے اندر کتنے گہرے زخم ہو گئے ہیں۔ میری محبت مر گئی اور میں کس اذیت سے گزر رہا ہوں۔'' انہوں نے خود پر قابو پا کر ایبک کی طرف دیکھا۔

''موی مجھے بہت پیارا تھا۔ میرے دل کے سب سے زیادہ قریب۔ پھر ہمارے درمیان ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی اور میں اس سے ناراض ہو گیا۔ حالانکہ غلطی اُس کی نہیں تھی۔ میں موی سے ناراض تھا۔ اس لئے جب تم موی کے ساتھ ''الریان'' آئے تو میں نے تمہاری طرف کبھی دھیان سے دیکھا نہیں۔ حالانکہ عمر تمہارا بہت ذکر کرتا تھا۔ وہ ایسے ہی دیوانہ ہے تمہارا، جیسے میں موی کا تھا۔''

انہوں نے مسکرا کر عمر کی طرف دیکھا تو عمر شرما گیا۔

''میرا یہ بیٹا بہت حساس اور نرم دل ہے۔'' وہ عمر کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایبک بھی مسکرا دیا۔

''ایبک بیٹا! عمو اور موی کیسے ہیں؟ کل سے ان سے بات ہی نہیں ہوئی۔''

''بابا اور ماما بالکل ٹھیک ہیں اور بہت خوش بھی۔ جب سے احسان انکل ان سے مل کر آئے ہیں، خوشی ان سے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔''

''تو پچھلے دنوں جو پاپا غائب ہوئے تھے دو دن کے لئے تو بہاول پور گئے تھے۔ اور ہم سمجھ رہے تھے، اسلام آباد گئے ہیں۔''

''احسان انکل! میں بہت ممنون ہوں آپ کا اس خوشی کے لئے جو آپ نے بابا کو دی۔ میں بابا کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا تو اپنی بے بسی مجھے اذیت دیتی تھی۔ بہت شکریہ احسان انکل!''

''بعض اوقات ہماری چھوٹی چھوٹی غلطیاں، معمولی غلط فہمیاں ہمیں ایک دوسرے سے کتنا دُور لے جاتی ہیں۔ جب وقت گزر جاتا ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ کاش! ہم اس موڑ پر رُک کر، ٹھہر کر سوچ لیتے، سمجھ لیتے۔ ہم پتھر اور بے حس

کیوں ہو گئے تھے؟ ہم نے اپنے پیاروں کی بات کیوں نہیں سنی؟''

''احسان شاہ افسردہ ہو رہے تھے۔ عمر شاہ چپکے سے اُٹھا تا کہ لاؤنج میں بیٹھی رابیل کو اس انقلاب کی خبر دے۔ یعنی پاپا نہ صرف یہ کہ ایبک سے بات کر رہے تھے بلکہ وہ بہاولپور کا چکر بھی لگا آئے تھے اور انہوں نے ایبک کو گلے بھی لگایا تھا اور اس کی پیشانی بھی چومی تھی۔ واؤ......

لاؤنج خالی تھا۔ رابیل شاید اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ دوبارہ عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے میں نیں جانے کے بجائے وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ گیا اور ایبک کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی ایبک باہر نکلا۔

''او کے عمر! میں چلتا ہوں۔''

''ارے! اتنی جلدی؟'' عمر کھڑا ہو گیا۔

''کچھ کام تھا یار! یہ ہمدان کیا سو رہا ہے ابھی تک؟''

''نہیں۔ وہ تو اسٹڈی میں تھے۔ آج کل اسلامی کتب کے مطالعے کا شوق چڑھا ہے انہیں۔ آپ رُکیں، میں انہیں بتاتا ہوں۔ ورنہ ناراض ہوں گے مجھ سے کہ آپ کے آنے کا بتایا نہیں۔'' وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

'پتہ نہیں، اریب فاطمہ واپس آئی ہے یا ابھی تک گاؤں میں ہی ہے۔' ایبک نے لاؤنج میں کھڑے کھڑے سوچا۔

تب ہی منیبہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اریب فاطمہ نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کتابیں تھیں، جو وہ مرینہ کو دینے جا رہی تھی۔ ایبک کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

'یقیناً دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔' اس نے سوچا اور اریب فاطمہ کی طرف بڑھا۔

''کیسی ہیں اریب فاطمہ؟......اور اماں کیسی ہیں؟''

''اماں ٹھیک ہیں۔''

ایبک نے بغور اسے دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدہ اور پریشان لگ رہی تھی۔

''کیا بات ہے اریب فاطمہ! آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟''

''آپ پارک میں چلیں۔ میں وہیں آ رہی ہوں۔ ضروری بات کرنا ہے۔ یہاں کیسے کروں؟ مائرہ آنٹی نے دیکھ لیا تو ناراض ہوں گی۔'' اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔

''ٹھیک ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھتی ہیں تو۔'' ایبک پریشان سا ہو گیا تھا۔ یقیناً کوئی ایسی بات تھی۔ ورنہ اریب فاطمہ کو اس طرح کہیں باہر جا کر بات کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔

'کہیں اس کے والدین نے اس کی شادی تو طے نہیں کر دی؟'

وہ مرینہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی۔ ایبک رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اُسے ہمدان کا انتظار کرنا تھا۔ ہمدان آیا تو وہ اس سے مل کر فوراً ہی ''الریان'' سے نکل آیا۔ ہمدان اُسے روکتا ہی رہ گیا۔ مرینہ کے کمرے سے باہر نکل کر منیبہ کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اریب فاطمہ نے اسے باہر نکلتے دیکھا اور کمرے میں جا کر الماری سے چادر نکالی۔ منیبہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''بس یہ ذرا مدنی بک ڈپو تک جا رہی ہوں۔ کچھ پیپرز وغیرہ خریدنے ہیں۔''

''یاسین کو کہہ دیتیں۔''

''نہیں..... مجھے خود دیکھ کر لینے ہیں۔ کچھ بال پوائنٹ بھی لینے ہیں۔'' وہ منیبہ کی بات کا جواب دے کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

❁○❁

رابیل اپنے بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی، جب مائرہ نے سیڑھیوں کے پاس سے اسے آواز دی اور پھر جواب نہ پا کر خود ہی سیڑھیاں چڑھ کر اُس کے کمرے میں آئیں۔ رابیل نے جلدی سے آنکھیں پونچھیں۔

''کیا ہوا رابی بیٹا! تم رو رہی تھیں؟'' وہ پریشان ہو گئیں۔

''کچھ نہیں ماما! ایسے ہی سر میں درد ہو رہا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔''

''پتہ نہیں، یہ سر درد کیوں ہو جاتا ہے؟ تمہیں کہا بھی تھا، کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک کروا لیتے ہیں۔ لیکن تم مانتی ہی نہیں ہو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے ماما! جو ڈاکٹر کے پاس جاؤں۔ بس نیند پوری نہیں ہوئی میری۔''

''چلو! ٹھیک ہے۔ پھر تم آرام کرو۔ میں ذرا مارکیٹ تک جا رہی تھی۔ یہ بیڈ روم سلیپر لئے تھے، واپس کرنے ہیں۔ تم بھی کہہ رہی تھی چپل لینے کو تو میں نے کہا، ساتھ لے چلوں۔''

''نہیں ماما! مجھے یہاں اس مارکیٹ سے چپل نہیں لینے تھے۔''

''اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہوئی تو افطار کے بعد ذرا روبی کی طرف چلیں گے۔''

''مل تو لیا تھا اُس دن۔ اب کیا کروں گی جا کر؟''

''میں چاہ رہی تھی، تم اس کے بیٹے سے بھی مل لو۔ دراصل روبی کی باتوں سے لگا تھا مجھے کہ وہ اپنے بیٹے کے لئے تم میں انٹرسٹڈ ہے۔ ہمدان تمہیں پسند نہیں۔ طاہر کے لئے تم نے انکار کر دیا تو اب.....''

''ماما پلیز......!'' وہ بے زار ہوئی۔

''میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں اب۔''

''مجھے تمہارا یہ انداز بالکل بھی پسند نہیں ہے رابی! میں ان چند ماہ میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں بہرحال فیصلہ کرنا ہوگا۔'' رابیل نے کچھ جواب نہیں دیا۔

''ایک تو تمہارے پاپا کا موڈ مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ جب سے اسلام آباد سے واپس آئے ہیں، بابا جان کے کمرے میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔'' وہ بڑبڑائیں اور رابیل کی طرف دیکھا۔

''میں دو تین روز میں روبی کی فیملی کو افطاری پر بلوا رہی ہوں۔ تم اچھی طرح دیکھ لو، پرکھ لو۔ طاہر تو دیکھا بھالا ہے۔ بہرحال ہمیں تمہارا فیصلہ قبول ہوگا۔ جسے بھی پسند کر لو۔''

''کیا واقعی مما؟''

''ہاں۔ زندگی تم نے گزارنی ہے، میری جان! تو فیصلہ بھی تمہارا ہی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے مما!'' رابیل لیٹ گئی۔

''میں آج تمہارے بابا جان اور پاپا سے بات کر کے روبی کی فیملی کو انوائٹ کرتی ہوں۔''

وہ ایک بار پھر رابیل کو سونے کی تاکید کر کے کمرے سے نکل آئیں۔

❁○❁

ایبک نے پارک کے پچھلے دروازے کی طرف گاڑی پارک کی تھی اور اسی دروازے سے پارک میں داخل ہوا تھا۔ دوپہر کے ایک بجے پارک سنسان پڑا تھا۔ شاید رمضان کی وجہ سے۔ ورنہ اتنی ویرانی تو کبھی بھی نہیں ہوتی تھی۔ دوپہر میں بھی چند ایک بچے نظر آ جاتے تھے۔ وہ اسی جگہ بینچ کے پاس کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، جب اریب فاطمہ نے دوسرے گیٹ سے پارک میں قدم رکھا اور اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی اسی بینچ کی طرف آ رہی تھی کہ اُس کی نظر ایبک پر پڑی جو بے چین ہو کر ایک قدم آگے بڑھ آیا تھا۔

❁○❁

''سب ٹھیک ہے نا اریب فاطمہ! میں بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ اچانک آپ کی والدہ کو کیا ہو گیا تھا؟''
''کچھ نہیں۔'' اس نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے ایبک کی طرف دیکھا۔ ''اسفند بھائی نے جھوٹ بولا تھا۔ اماں کو بتائے بغیر وہ مجھے لینے آئے تھے۔'' وہ اپنی انگلی پر چادر کا پلو لپیٹتی بے حد مضطرب سی نظر آ رہی تھی۔
''کیا ہوا اریب فاطمہ؟ پلیز کچھ بولیں۔''
اور تب اریب فاطمہ نے ساری بات بتا دی۔
''نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟..... ایسا نہیں ہو سکتا اریب فاطمہ! میں نے صرف آپ کے ساتھ زندگی گزارنے کا سوچا۔ آپ سے پہلے میں نے کبھی کسی کے لئے اس طرح نہیں سوچا۔ لیکن میں آج ہی ماما سے بات کرتا ہوں۔ وہ مروہ پھپھو سے بات کرتی ہیں۔ اب ڈائریکٹ جانا مناسب نہیں لگتا۔ تمہارے ابا اور بھائی انکار ہی نہ کر دیں۔ مروہ پھپھو سے ہی بات کرنا مناسب ہوگا۔ کیا خیال ہے؟''
اریب فاطمہ نے سر ہلا دیا۔ لیکن اس کی بھیگی پلکوں نے ایبک کو بے چین کیا۔
''اریب فاطمہ! میں آپ کو نہیں کھو سکتا۔ آپ میرا یقین رکھئے گا ہمیشہ۔ میں آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اور کبھی کوئی مسئلہ ہو جائے تو مجھے فون کر دیجئے گا کسی پی۔ سی۔ او سے۔ میں......''
''پتہ نہیں کیوں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' اریب فاطمہ نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔ ''مجھے لگتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوگا، جیسا ہم نے چاہا۔ کاش میرے دل میں کبھی آپ کا خیال نہ آتا اور ابا، اماں جہاں چاہتے، جس کے ساتھ چاہتے مجھے رخصت کر دیتے۔ لیکن اب نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں کیسے آپ کا خیال دل سے نکالوں گی؟ میں جھوٹی زندگی نہیں گزار سکتی۔ یہ تو اس دوسرے شخص کو دھوکا دینے والی بات ہوئی نا کہ آپ کے دل میں کوئی اور ہو اور آپ کسی اور کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوں۔''
آنسو اُس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔
اس کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے پونچھنے کی خواہش دل میں چھپائے ایبک اس کے قریب ہی بینچ پر بیٹھ گیا۔
''پلیز اریب فاطمہ! روئیے مت۔ مجھے اپنا آپ مجرم لگنے لگا ہے۔ آپ کو چاہ کر، آپ کی تمنا کر کے میں نے آپ کو تکلیف دی۔ کاش میں بھی ہومی کی طرح سب کچھ دل میں رکھتا اور ایک دن اچانک آپ کے گھر اپنے والدین کو بھیج دیتا۔''
اریب فاطمہ جو اُس کے اس طرح بیٹھنے پر گھبرا گئی تھی، اس نے اس کی پوری بات سنی ہی نہیں اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔
''نہیں۔ آپ نے مجھے تکلیف نہیں دی۔ محبت تکلیف نہیں ہوتی، میں تو اپنی نظروں میں معتبر ہو گئی تھی۔ لیکن......''
اور وہ جو بہت کچھ کہنے کی خواہش میں بیٹھا تھا، سب دل میں چھپا کر کھڑا ہو گیا اور اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔
''ٹھیک ہے اریب فاطمہ! آپ اب جائیں۔ یہاں زیادہ دیر تک آپ کا رکنا مناسب نہیں ہے۔ اور آنسو پونچھ لیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ وہ یقیناً بہتر کرے گا۔''
اریب فاطمہ نے چادر کے پلو سے اپنا چہرہ پونچھا اور ایبک کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی سر جھکا لیا۔ ایبک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
''اللہ حافظ اریب فاطمہ! آپ جانتی ہیں نا، آپ کے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔''
اریب فاطمہ نے سر ہلایا اور سر جھکائے گیٹ کی طرف چل دی۔ چند لمحے ایبک وہاں ہی کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا، پھر پلٹ کر دوسرے گیٹ کی طرف چل دیا۔

❀○❀

مائرہ مارکیٹ سے جوتا تبدیل کر کے ''الریان'' کی طرف جا رہی تھیں کہ انہوں نے اریب فاطمہ کو پارک سے نکلتے دیکھا۔ 'یہ اس پہر یہاں پارک میں کیا کرنے آئی ہے؟...... کسی لڑکے سے ملنے؟...... کیا خبر، ماں کی طرح اس نے بھی

دوستیاں بنا رکھی ہوں۔'

مائرہ ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئیں اور اریب فاطمہ کو سر جھکائے پارک سے نکل کر سڑک کراس کرتے اور پھر مدنی بک ڈپو میں داخل ہوتے دیکھتی رہیں۔ جوں ہی اریب دُکان میں داخل ہوئی، وہ تیزی سے پارک کے گیٹ کی طرف بڑھیں اور پارک میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

پارک ویران پڑا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ غبارے اور قلفی بیچنے والے لڑکے بھی جو اکثر دوپہروں میں یہاں ہی ہوتے تھے، نظر نہیں آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ وہ نشئی بھی نہیں تھا جو دن رات درخت کے نیچے پڑا رہتا تھا۔

'پھر اریب فاطمہ بھری دوپہر میں یہاں کیا کر رہی تھی؟'

وہ سوچتی ہوئی پارک سے باہر آئیں۔

'یقیناً کسی سے ملنے ہی آئی ہو گی۔' مائرہ کو پورا یقین تھا۔

'مونی کو ضرور پتہ ہوگا، اگر کسی کے ساتھ اُس کا چکر ہے تو۔ ہر وقت اُسی کے ساتھ رہتی ہے۔ ضرور اُسے بتایا ہوگا۔'

وہ یوں ہی اریب فاطمہ کے متعلق سوچتی الریان میں داخل ہوئیں۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ وہ رُکے بغیر اپنے کمرے میں آئیں۔

احسان شاہ بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولے کچھ تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے مائرہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو شانی؟'' وہ بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

لیکن احسان شاہ نے جواب دیئے بغیر دوسری دراز کھولی اور اس میں پڑی فائل نکال کر کاغذات چیک کرنے لگے۔

''آخر ایسا کیا ہے شانی! کہ تم نے اپنا موڈ خراب کر رکھا ہے۔ تین دن سے تم کمرے میں نہیں آئے۔ بابا جان کے کمرے میں ڈیرا جما رکھا ہے۔ اب مجھ سے بات کرنا تو درکنار میری طرف دیکھتے بھی نہیں ہو۔ حالانکہ تمہارے اسلام آباد جانے سے پہلے میں نے تم سے سوری کر لیا تھا اور تم نے میری بات سمجھ بھی لی تھی کہ میں ماں ہوں اس کی۔ برے بھلے کی تمیز بتانا میرا فرض ہے۔ لیکن پھر آخر ایسا کیا ہو گیا ہے کہ تم ایسے ری ایکٹ کر رہے ہو، جیسے مجھ سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔''

''گناہ تو مجھ سے سرزد ہوا ہے مائرہ حسین!'' وہ ایک جھٹکے سے مڑے تھے۔ ''غلطی میں نے کی تھی جو تمہاری باتوں میں آ گیا اور تمہارا اعتبار کیا۔ وہ یہاں رہتا تھا مائرہ حسین! یہاں۔'' انہوں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ ''لیکن تمہارا یقین کر کے اسے نوچ کر پھینک دیا تھا میں نے اس دل سے۔''

''صاف بات کرو شانی!'' مائرہ نے اُلجھ کر اُنہیں دیکھا۔

''انجان مت بنو مائرہ! تم جانتی ہو، تم نے کیا کھیل کھیلا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میں تمہاری چال میں آ گیا اور نہ جانے کب تک دھوکے میں رہتا جو تم روبی سے دل کی بات نہ کرتیں۔''

مائرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

یہ کیا ہوا تھا؟ کیسے، کب احسان شاہ نے ان کی اور روبی کی بات سن لی تھی؟ کتنا غلط ہوا تھا۔ سب رائیگاں چلا گیا۔

''ساری عمر ایک دھوکے میں گزار دی میں نے۔ یہ اذیت ایک خنجر کی طرح گڑی ہے یہاں...... یہاں۔'' انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''تم جو یہاں اس وقت میرے کمرے میں موجود ہو تو صرف اس لئے کہ میرے بچوں کی ماں ہو۔ اور میں اُنہیں بے بھرم نہیں کرنا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ اُن کے سر جھکیں اور اُنہیں علم ہو کہ اُن کی ماں کس قدر فریبی عورت ہے۔''

''شانی!''

''مت کہو کچھ مائرہ حسین! تمہارے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں بچا۔ میں تم سے بات کرنا تو درکنار، تمہیں دیکھنا بھی

نہیں چاہتا۔ لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں تمہیں اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتا۔ اپنے بچوں کی خاطر اور الریان کی عزت کی خاطر۔ تمہارے جیسی ہی عورتیں ہوتی ہیں، جن پر لعنت کی گئی ہے اور جن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ جھوٹی تہمت لگانے والی عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے۔ تم نے جھوٹ بولا۔ بہتان لگایا، مجھے دھوکا دیا مائرہ حسین! اور......''

''شانی!'' مائرہ کے لبوں سے بمشکل نکلا۔ ''میری بات سنو......وہ سب جھوٹ تھا۔ میں تو یوں ہی مذاق.....''

احسان شاہ نے ایک تنفر بھری نظر ان پر ڈالی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے اور مائرہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح دونوں ہاتھ گود میں دھرے شکست خوردہ سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ بازی اُلٹ گئی تھی۔ وہ تو ابھی فلک شاہ کو اور سزا دینا چاہتی تھیں۔ اور ذلیل کرنا چاہتی تھیں ایبک کے ذریعے۔ اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے، کس طرح، کیا کریں کہ ایبک اور فلک شاہ کو الریان کے ہر فرد کی نگاہوں سے گرا دیں۔ لیکن وہ خود احسان شاہ کی نظروں میں گر گئی تھیں۔ وہ اس اُلٹی بازی کو کیسے اپنے حق میں کریں۔ ہاتھ گود میں رکھے وہ سوچ میں گم ہو گئیں۔ کوئی تدبیر، کوئی طریقہ ایسا کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ احسان شاہ بھی۔ کتنی شدید محبت کی تھی احسان شاہ نے۔ اور چند لمحے پہلے ان محبت برساتی آنکھوں سے کتنی نفرت جھلک رہی تھی۔

'نہیں.....' انہوں نے ایک جھرجھری سی لی۔ 'مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ کچھ ایسا کہ احسان شاہ کا دل پھر میری طرف پلٹ آئے۔' تب ہی دروازہ کھلا اور رابیل اندر آئی۔ وہ فریش ہو کر آئی تھی۔ مائرہ نے وحشت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پریشان ہو کر سوچا۔ 'کیا اس نے جان لیا ہے؟ کیا احسان نے اسے بتا دیا ہے کہ.....لیکن انہوں نے تو کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ بچوں کو پتہ چلے کہ.....'

''ماما کیا ہوا؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ آپ جوتے تبدیل کرنے نہیں گئیں؟'' رابیل پوچھ رہی تھی۔

''ہاں.....نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' وہ چونکیں۔ ''جوتے تبدیل کر لئے ہیں۔ یہ اسی اپنی مارکیٹ میں سے ہی لئے تھے۔ تمہارا سر درد؟''

''ٹھیک ہے مما!'' رابیل ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''کہیں جا رہی ہو؟''

''نہیں۔ میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی۔ آپ خوامخواہ تردّد نہ کریں۔ اگر روبی آنٹی کی فیملی کو صرف اس لئے بلا رہی ہیں تو مجھے ان کے بیٹے سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہاں، محض دوست سمجھ کر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''رابی! ادھر دیکھو میری طرف۔ مائرہ نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ وہ کچھ دیر کے لئے اپنی پریشانی بھول گئیں۔

''اس روز تم کہہ رہی تھیں کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو۔ میں نے سمجھا شاید غصے میں کہہ رہی ہو۔ لیکن کیا واقعی تم کسی اور کو.....''

رابیل کی نظریں جھک گئیں۔

''کون ہے وہ؟'' مائرہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کوئی بھی ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے مما؟''

''فرق پڑتا ہے رابی! اگر وہ اس قابل ہے کہ احسان شاہ کا داماد بن سکے تو پھر بتاؤ۔ ہمیں تمہاری خوشی ہر حال میں عزیز ہوگی۔''

''وہ اس قابل ہو بھی سکتا ہے۔ آپ اسے پسند نہ کریں گی۔'' وہ افسردہ ہوئی۔

''پہیلیاں مت بجھواؤ رابی!'' مائرہ نے اُلجھی اُلجھی نظروں سے اسے دیکھا۔ دل میں کسی وہم نے پنجے گاڑے۔

''ایبک.....مما! میں ایبک کو پسند کرتی ہوں۔'' رابیل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''ایبک.....؟'' مائرہ کی آواز بلند ہوئی۔ ''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے رابیل؟''

''مما! آپ نے میری پسند پوچھی تھی، میں نے آپ کو بتا دی۔ اب خوامخواہ چلائیں مت۔''
''یہ خیال اپنے دل سے نکال دو کہ تمہاری شادی ایبک سے ہو سکتی ہے۔''
''کیوں، ایبک میں کیا برائی ہے؟'' رابیل نے سوالیہ نظروں سے مائرہ کی طرف دیکھا۔ ''صرف اس لئے کہ وہ عمارہ پھپھو کا بیٹا ہے اور آپ کو ان سے روایتی نند، بھابی والا جلاپا ہے۔''
''ہاں ہے جلاپا...... پھر؟'' مائرہ ضبط کھوتی جا رہی تھیں۔ یہ دوسرا بڑا دھچکا تھا، جو ان چند گھنٹوں میں اُنہیں لگا تھا۔
''مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ وہ تمہیں اپنے جال میں پھنسا لے گا اور تم اُس کے جال میں پھنس جاؤ گی۔''
''مما پلیز!...... غلط الزام مت لگائیں۔'' رابیل نے ان کی بات کاٹ دی۔
''ایبک مجھے پسند نہیں کرتا۔ میں اسے پسند کرتی ہوں اور اسے تو اس کی خبر تک نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ کبھی مجھے نظر بھر کر دیکھا تک نہیں۔ اور آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ مجھے اپنے جال میں پھنسا رہا ہے۔ آپ اپنے مفروضے اپنے پاس رکھیں۔ وہ آپ کی بیٹی کو اس طرح پسند نہیں کرتا جیسے میں کرتی ہوں۔ وہ صرف میری عزت کرتا ہے۔ کیونکہ میں اس کے ماموں کی بیٹی ہوں۔''
اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ آواز بھرا گئی۔ مائرہ کو لگا جیسے رابیل کی جگہ وہ ہوں اور فلک شاہ کی یک طرفہ محبت میں مبتلا ہوں اور فلک شاہ ان کی طرف دیکھتا تک نہ ہو۔ یکایک ان کے دل میں رابیل کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی۔
''وہ تمہیں پسند نہیں کرتا۔ تم جو الریان کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو۔ ہے کوئی الریان میں تم جیسی؟ ایسا نہیں ہو سکتا رابی! وہ تمہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ جان بوجھ کر اپنی اہمیت جتانے کے لئے ایسا کرتا ہوگا۔''
''وہ ایسا نہیں ہے مما! اسے اپنی اہمیت جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔''
اسے ایک پرانی بات یاد آئی تھی۔ پتہ نہیں کس نے کہا تھا؟ شاید مومی نے یا پھر عمر نے کہ اسے اپنی طرف توجہ مبذول کروانے کے لئے کسی ڈرامے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی ہی یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات۔
''جو بھی ہو، میں کبھی بھی عمارہ اور فلک شاہ کے بیٹے سے تمہیں شادی کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔'' مائرہ کو پھر خیال آیا تھا کہ ایبک فلک شاہ اُس فلک شاہ کا بیٹا ہے، جس نے ان کی محبت کو ٹھکرایا تھا۔
ایک افسردہ سی مسکراہٹ رابیل کے لبوں پر نمودار ہوئی۔
''آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے وہ مجھ سے شادی کے لئے تیار ہو اور پروپوزل دیا ہو اس نے میرا۔'' تلخی سے کہتی وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔
اور مائرہ نے باہر جاتی رابیل کو دیکھ کر دکھ سے سوچا۔ 'تو کیا میری طرح میری بیٹی کے مقدر میں بھی نارسائی ہے؟..... نہیں میری بیٹی، میری طرح نارسا نہیں رہے گی۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ کچھ ایسا کہ رابیل کے دل سے ایبک فلک شاہ کا خیال نکل جائے۔'
'کیا میرے دل سے فلک شاہ کا خیال نکل گیا ہے؟'
انہوں نے خود سے پوچھا تو جواب نفی میں تھا۔ آج بھی یہ احساس ان کے دل میں کچوکے لگاتا تھا کہ فلک شاہ نے انہیں اور ان کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ تو کیا رابی بھی؟...... نہیں۔ انہوں نے خود ہی تردید کی۔ محض وقتی پسندیدگی ہے۔ ورنہ چند دن پہلے تک تو وہ اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ سو جلد ہی ایبک کا خیال اس کے دل سے نکل جائے گا۔ انہوں نے خود کو یقین دلایا اور مطمئن ہو گئیں۔ لیکن جلد ہی ان کا اطمینان رخصت ہو گیا۔ انہیں یاد آ گیا کہ احسان شاہ ابھی ابھی کیا کہہ کر گئے تھے۔
کس بری طرح انہوں نے انہیں جھٹک دیا تھا۔
ہر رشتے کو توڑ دیا تھا۔ وہ نہ ان کے لئے بیوی رہی تھیں، نہ محبت۔

وہ صرف اب ان کے بچوں کی ماں تھی۔ کتنا صاف صاف کہہ دیا تھا انہوں نے کہ وہ اب ساری زندگی ان کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ لیکن وہ مجبور ہیں۔ الریان کی عزت اور بچوں کی وجہ سے۔

انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

بہت برا ہوا تھا۔ کاش! روبی اُن کے گھر نہ آتی اور گھر آئی ہی تھی تو وہ احتیاط کرتیں۔

اب کیا کریں ایسا کہ احسان شاہ کا دل اُن کی طرف سے صاف ہو جائے۔ کیا کہیں؟ کچھ بھی کہنا بے کار ہوگا۔ انہوں نے جو کچھ اپنے کانوں سے سنا، وہ انہیں جھٹلا نہیں سکتیں۔ پھر...... اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لیں۔ وہ نرم دل ہیں۔ ان سے محبت نہیں، عشق کرتے ہیں۔ پھر وہ ان کے بچوں کی ماں ہیں۔ اس حوالے سے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ ضرور ہے۔ وہ اُٹھیں اور پھر بیٹھ گئیں۔

'نہیں...... ابھی شاید وہ بابا جان کے کمرے میں ہوں۔ پھر کبھی جب وہ اکیلے ہوں، اپنے بیڈ روم میں ہوں تو پاؤں پکڑنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔' اُنہوں نے سوچا۔ 'لیکن جلدی نہیں۔ ابھی وہ شاک میں ہیں، غصے میں ہیں۔ بہتر ہے کہ کچھ دنوں کے لئے رحیم یار خان چلی جاؤں۔ دُوریاں یوں بھی محبت کو بڑھاتی اور جگاتی ہیں۔ اگر رابیل کو بھی ساتھ لے جاؤں تو۔ یوں بھی فارغ ہے اب۔ وہاں ایک کا خیال ہوسکتا ہے دل سے نکل جائے۔ طاہر سے ملے گی، بات چیت کرے گی تو شاید دل میں طاہر کا خیال پیدا ہو جائے۔'

وہ فیصلہ کر کے اُٹھیں۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں تھی۔ لیکن بظاہر انہوں نے خود کو مطمئن کر لیا تھا اور وہ گہرائی تک نہیں جا پائی تھیں کہ احسان شاہ نے انہیں اپنی زندگی میں شامل رکھتے ہوئے بھی اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا۔

اریب فاطمہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ مائرہ کو باہر آتے دیکھ کر ایک دم کھڑی ہوگئی اور اس کی گود میں رکھا شاپر نیچے گر گیا۔ مائرہ نے ایک گہری نظر اُس پر ڈالی اور پوچھنا ہی چاہتی تھیں کہ وہ دوپہر کے وقت پارک میں کس سے ملنے گئی تھی؟ کہ منیبہ دروازہ کھول کر باہر آئی اور اریب فاطمہ سے پوچھا۔

''تم نے دیر لگا دی ریبا؟''

''ہاں...... وہ مجھے اس ٹک شاپ سے نہیں ملی تھیں مطلوبہ چیزیں تو مارکیٹ چلی گئی تھی۔''

مائرہ کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

'یعنی جھوٹ بولا جا رہا ہے۔'

اُنہیں یقین ہوگیا کہ اریب فاطمہ ضرور کسی سے ملنے گئی تھیں اور وہ کوئی، کون ہوسکتا ہے؟ ایک لمحہ کے لئے انہوں نے سوچا۔ لیکن اس وقت اندر سے وہ خود اُلجھی ہوئی تھیں اور اریب فاطمہ سے بات کرنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔

''تم کو ظہر کی نماز پڑھنی ہوگی ابھی؟'' منیبہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں۔'' اریب فاطمہ نے جھک کر شاپر اٹھایا۔

''تو جلدی سے نماز پڑھ کر ذرا کچن میں آ جاؤ۔ آج مصطفیٰ انکل نے اپنے دوستوں کو افطاری پر بلایا ہے۔''

اریب فاطمہ سر ہلا کر کمرے میں چلی گئی تو رابیل کچن سے باہر آئی اور مائرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ رابیل کو کوکنگ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اور اس وقت وہ منیبہ سے کہہ رہی تھی۔

''کیا مینیو ہے آج کا؟...... میں بھی ہیلپ کرا دوں گی۔ حفصہ کی طبیعت تو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''وہی جو ہمیشہ افطار پارٹی پر ہوتا ہے۔'' منیبہ مسکرائی اور کچن کی طرف بڑھی۔ ''آ جاؤ تم بھی۔ ابھی سے تیاری کریں گے تو کہیں وقت پر سب کچھ تیار ہوگا۔''

''رابی!'' مائرہ نے بے اختیار آواز دی تو رابیل واپس کچن میں جاتے جاتے مڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

''وہ ابھی تمہاری نانی اماں سے بات ہو رہی تھی میری۔ اُداس ہو رہی تھیں۔ کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگتی تھی۔ سوچ

رہی ہوں، کچھ دنوں کے لئے رحیم یار خان چلی جاؤں۔"

"ٹھیک ہے مما! پاپا سے بات کی آپ نے؟"

"نہیں۔ بس ابھی تو فون کیا تھا میں نے۔ تمہاری مرضی ہو تو تم بھی چلو۔ کافی عرصہ سے نہیں گئی ہو۔ بہت یاد کر رہی تھیں تمہیں۔" رابیل نے ایک لحہ کے لئے سوچا۔

"ٹھیک ہے مما! چلتے ہیں پھر۔"

اور مائرہ نے اطمینان بھری سانس لی۔ یہ اچھا ہوا تھا کہ رابیل نے انکار نہیں کیا تھا۔ ورنہ اگر وہ انکار کر دیتی تو وہ اسے زبردستی ساتھ نہیں لے جا سکتی تھیں۔ بہت مطمئن ہو کر وہ واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

❁○❁

"احمد رضا! تم کہاں چلے گئے تھے؟ ہم نے بہت ڈھونڈا تمہیں۔ تمہارے ابو کے ساتھ میں ہر اس جگہ گیا، جہاں تمہارے ملنے کا امکان تھا۔"

ابراہیم، احمد رضا کے سامنے اس کے بیڈ روم میں بیٹھا تھا۔ ثمینہ حیدر نے اسے ابراہیم کے ساتھ آتے بے حد حیرت سے دیکھا تھا۔

"سر! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ گاڑی کی چابی بھی یہاں ہی تھی اور آپ نے لباس بھی چینج نہیں کیا تھا۔"

"میں یوں ہی باہر واک کر رہا تھا۔" ثمینہ حیدر کی نظریں ابراہیم پر تھیں۔

"میرا دوست ہے، اچانک باہر روڈ پر نظر آ گیا۔ بہت عرصہ بعد ہم ملے ہیں۔" ثمینہ حیدر کی کھوجتی نظروں سے بچنے کے لئے وہ ابراہیم کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں آ گیا تھا۔ ثمینہ حیدر نے اتنی دیر میں بیڈ روم کی حالت درست کر دی تھی۔ اب سب چیزیں اپنے اپنے مقام پر تھیں۔

"پتہ ہے احمد رضا! میں تمہارے ابو سے بہت شرمندہ تھا۔ وہ جب آتے، میں ان سے نظریں نہ ملا پاتا کہ یہ میں تھا جو تمہیں اسماعیل کے پاس لے کر گیا تھا۔ پھر انہوں نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا۔ لیکن میں نے انہیں کئی بار یونیورسٹی میں دیکھا۔ وہ لڑکوں کو روک کر تمہارے متعلق پوچھ رہے ہوتے تھے۔" احمد رضا خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔

"یار! تم اتنے ذہین، اتنے عقل مند تھے۔ پھر کیوں پھنس گئے اس کے جال میں؟...... کیا تمہیں نہیں لگا تھا کہ وہ شخص جھوٹا ہے؟ کذاب۔" ابراہیم کے لہجے میں تاسف تھا۔

"جب تقدیر کا پہیہ اُلٹا چل پڑے تو عقل خبط ہو جاتی ہے۔"

"تمہارے ابو کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ دیوانوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اور میرا احساسِ جرم کئی بار مجھے اُس کوٹھی میں لے کر گیا، جہاں تم پہلی بار میرے ساتھ گئے تھے۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا، خالی تھی۔ آخری بار جب میں وہاں گیا تو ایک وکیل صاحب کی فیملی وہاں رہ رہی تھی۔"

"ابراہیم! کیا تم جانتے ہو، ابو کہاں ہیں آج کل؟" اس نے ابراہیم کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"کیا تم...... میرا مطلب ہے، تمہیں نہیں معلوم وہ کہاں ہیں؟ اور تمہاری اُس وقت سے اب تک اُن سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

"نہیں......" اُس نے اپنے آنسو اندر اُتارے۔ "انہوں نے اپنا سمن آباد والا گھر بیچ دیا اور کہیں چلے گئے۔ بہت ڈھونڈا۔ محلے میں کسی کو نہیں پتہ، وہ کہاں گئے ہیں۔ ابراہیم! اگر تمہیں پتہ ہے تو پلیز! مجھے بتا دو۔"

"نہیں......" ابراہیم نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں جب آخری بار اُن سے ملا تھا تو انہوں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی کہ ان کا ارادہ کہیں جانے کا ہے۔ بلکہ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جب بھی مجھے تمہارا پتہ چلے، اُنہیں بتاؤں۔ فون کر دوں۔ خود انہوں نے ایک دو بار فون کر کے پوچھا بھی تھا۔ پھر میں سعودیہ چلا گیا۔ تمہیں پتہ ہے، نا وہ میرا

فائنل ایئر تھا۔ مجھے فوراً ہی جاب مل گئی تھی۔ پھر وہاں سے فرم نے مجھے کینیڈا بھیج دیا۔ چند دن پہلے ہی وطن آیا ہوں۔ اِدھر کسی دوست سے ملنے آیا تھا۔''

''ابراہیم!'' اُس نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''میری مدد کرو پلیز..... میں خود سے انہیں تلاش نہیں کر سکتا۔ تھک گیا ہوں۔ میں ایک بار ابو اور امی سے مل کر ان سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان کا دل دُکھایا۔ میں اُنہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے وہ سب نہیں کہا تھا۔ میں آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے پر یقین رکھتا ہوں۔ میں ایک ایسے جال میں پھنس گیا ہوں، جس سے نہیں نکل سکتا۔''

''کیسا جال؟'' ابراہیم نے پوچھا تو بیڈروم کے باہر دروازے سے لگی کھڑی ثمینہ حیدر چونکی۔

''کچھ نہیں جانتا ابراہیم! یوں لگتا ہے، جیسے اسماعیل کذاب کے مرنے کے بعد بھی میں اُس کی قید میں ہوں۔''

باہر کھڑی ثمینہ حیدر کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تمہیں اپنا یقین پختہ رکھنا چاہئے احمد رضا! اور یہ یقین بھی کہ وہ ایک جھوٹا شخص تھا۔''

''میں اُسے جھوٹا ہی سمجھتا ہوں ابراہیم! لیکن خیر، تم یہ بتاؤ، میری مدد کرو گے؟''

''ہاں...... میں پوری کوشش کروں گا۔ شاید اس طرح میں اُس غلطی کا کفارہ ادا کر سکوں جو تمہیں وہاں لے جا کر مجھ سے سرزد ہوئی۔''

''تھینک یو ابراہیم! تمہیں دیکھ کر پتہ نہیں کیوں مجھے امید ہو چلی ہے کہ جس طرح اچانک تم مل گئے ہو، اسی طرح اچانک کسی روز وہ سب بھی مل جائیں گے۔''

''تم اپنی اُمید ہمیشہ زندہ رکھنا۔ مایوس مت ہونا۔ اِن شاء اللہ ایک روز وہ تمہیں ضرور ملیں گے۔'' ابراہیم نے بے حد خلوص سے اس کا کندھا تھپکا اور کھڑا ہو گیا۔ ''میں ابھی تقریباً دو ماہ تک یہاں ہوں۔ پھر ملاقات ہوتی رہے گی۔ اِن شاء اللہ۔''

''تم ایسا کیوں نہیں کرتے ابراہیم! کسی روز پورا ایک دن میرے ساتھ Spend کرو۔ کسی اپنے سے بات کرنے کو ترس گیا ہوں یار!''

''ٹھیک...... کسی روز پلان بنا لیتے ہیں۔ دراصل گھر میں میری اور میری سسٹر کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جیسے ہی وقت ملتا ہے، میں آتا ہوں۔''

''تھینک یو ابراہیم!'' احمد رضا بھی کھڑا ہو گیا۔ تب ہی اسے لگا، جیسے زمین اُس کے پاؤں کے نیچے کانپی ہو۔ پھر اُسے جھٹکا لگا اور اُس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

''زلزلہ.....'' ابراہیم کے لبوں سے نکلا۔

وہ دونوں بھاگ کر لان میں آئے تھے۔ آس پاس کے گھروں کے گیٹ بھی کھل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد زلزلے کے جھٹکے رک گئے تو ابراہیم دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ لیکن بعض وعدے صرف لفظوں میں ہی دھرے رہ جاتے ہیں۔ احمد رضا کی پھر کبھی ابراہیم سے ملاقات نہیں ہوئی۔

❁○❁

اُس رات وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا زلزلے کی خبریں سن رہا تھا۔ سب چینل ہی زلزلے کے متعلق اطلاعات دے رہے تھے۔ لاہور میں تو کچھ جھٹکے لگے تھے۔ لیکن شمالی علاقہ جات، مظفر آباد اور کئی دوسرے علاقوں کی خبریں مسلسل آ رہی تھیں۔ اسلام آباد کی خبر بھی آ چکی تھی۔ اور خوفناک خبریں دل دہلائے دے رہی تھیں۔ فلاں سکول میں اتنے بچے دب گئے۔ فلاں گاؤں پورا کا پورا زمین میں دھنس گیا۔ اتنے مکانات، اتنی عمارتیں، ہوٹلز، کالج۔

اینکرز کوئٹہ کے زلزلے کی باتیں کر رہے تھے۔ شاید اُس زلزلے میں بھی اتنی ہی تباہی ہوئی تھی یا اس سے زیادہ؟ ابھی کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

'کاش! میں بھی وہاں کہیں ہوتا اور دب جاتا ملبے تلے۔' ٹی وی دیکھتے دیکھتے وہ وہیں ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر سو گیا تھا۔ جب الوینا کے فون سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

اور اب رات کے اس پہر الوینا نہ جانے کیا کہہ رہی تھی؟ اُس نے بمشکل آنکھیں کھولی تھیں۔

''ہیلو الوینا......!''

''سنو.....صبح تمہیں زلزلہ زدہ علاقوں کی طرف جانا ہے۔''

''میں وہاں جا کر کیا کروں گا الوینا؟''

''مدد.....اُن لوگوں کی مدد، جو بے چارے ملبے تلے دبے ہیں۔ انسان کی پہچان ایسے ہی مشکل لمحوں میں ہوتی ہے ڈیئر! تمہارے ہم وطنوں کو تمہاری ضرورت ہے۔''

''اچھا......میرے ہم وطنوں سے تمہیں کب سے ہمدردی ہو گئی؟'' بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا

''مجھے ہمیشہ ہی تمہارے ہم وطنوں سے ہمدردی ہے۔ لیکن افسوس تم نہیں جانتے۔''

''لیکن مجھے جانا کہاں ہے؟ کیا کرنا ہے؟ زلزلہ زدہ علاقے تو بے شمار ہیں۔'' اس نے ٹی وی پر نظر ڈالی، جو ابھی بھی چل رہا تھا۔ ''میں نہ تو ڈاکٹر ہوں، نہ......''

''رضا کار تو بن سکتے ہو۔ ملبے تلے دبے لوگوں کو نکالنے میں مدد دے سکتے ہو۔''

''لیکن میں وہاں جاؤں گا کیسے؟ پتہ نہیں کوئی ذریعہ ہے وہاں جانے کا یا نہیں۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ جنید تمہارے ساتھ جائے گا۔ صبح تمہیں راولپنڈی کی طرف جانا ہے۔ وہاں دو تین دن قیام کرو گے۔ کہاں، کس ہوٹل میں؟ جنید کو معلوم ہے۔ وہاں تم کو انتظار کرنا ہے ریڈ کراس کی ایک ٹیم کا۔ وہ خود ہی تم سے رابطہ کر لیں گے۔ اور تمہیں ان کے ساتھ شامل ہونا ہے۔ ان کی ٹیم کا خصہ بن کر ان کے ساتھ جانا ہے۔''

'ان لوگوں کی رسائی بھی کہاں کہاں ہے۔' اس نے سوچا اور پوچھا۔

''کیا احمد حسن کی حیثیت سے یا......؟''

''اسی حیثیت سے۔ تمہیں اپنا امیج ریز کرنا ہے احمد رضا! جو تمہارے فین ہیں، ان کے دل میں تمہارا مقام بڑھے گا کہ تم مشکل کے ان لمحوں میں ان کے ساتھ ہو۔''

''کیا مقصد صرف یہی ہے ان آفت زدہ لوگوں کی مدد کرنا یا پس پردہ کچھ اور بھی ہے؟''
''احمد رضا! تم بہت حجت کرنے لگے ہو۔ اس کے علاوہ اور کیا مقصد ہو سکتا ہے بھلا؟ تم صبح تیار رہنا۔''
الوینا نے فون بند کر دیا تھا۔ احمد رضا جھنجلا گیا۔ وہ کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ آج ابراہیم سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ آج اس نے خود کو یقین دلایا تھا کہ بس بہت جلد وہ سب سے ملے گا۔ اور اب پتہ نہیں، وہاں کتنے دن لگ جائیں۔
'بھلا کتنے دن لگیں گے؟ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ۔' اس نے خود کو تسلی دی۔
'اور مجھ سے کتنی غلطی ہوئی؟ ...... نہ میں نے ابراہیم سے اُس کا نمبر لیا، نہ اپنا دیا۔ خیر، خان بابا کو دے جاؤں گا کہ اگر ابراہیم آئے تو اسے میرا نمبر دیدے۔' اس نے بہر حال خود کو صبح جانے کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیا، اس اُمید کے ساتھ کہ وہ جلد لوٹ آئے گا۔

❁○❁

سمیرا سحری کے بعد سوئی نہیں تھی۔ قرآن شریف پڑھنے کے بعد اُس نے اپنا بیگ تیار کیا تھا۔ اُسے واپس جانا تھا۔ ڈائیوو کا اڈہ اُن کے گھر سے کافی دور تھا۔ ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ پھر بھی ابھی کافی ٹائم تھا۔ وہ لیٹ گئی اور احمد رضا کے متعلق سوچنے لگی۔ احمد رضا اسے دیکھ کر کیا ردِعمل ظاہر کرے گا اور وہ کیا کہے گی؟ وہ دل ہی دل میں لفظ ترتیب دینے لگی۔ اگر اُس نے اُسے پہچان لیا تو وہ ناراضی کا اظہار کرے گی۔ وہ اس سے کہے گی، اس نے ایسا کیوں کیا اور اب یہ ایک اجنبی روپ دھار کر کیوں بیٹھا ہے۔ اس نے انہیں ڈھونڈا کیوں نہیں؟ ..... نہیں وہ پہلے پوچھے گی۔
'احمد رضا! کیا تم کلمہ طیبہ پر یقین رکھتے ہو؟ کیا تم مانتے ہو کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو.....'
وہ یوں ہی سوچتے سوچتے سو گئی تھی۔ ڈائیوو نے بارہ بجے جانا تھا۔ حسن رضا اُسے جگانے آئے تھے۔ دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی انہیں زور سے جھٹکا لگا۔ انہوں نے دروازے کو تھام لیا۔ سمیرا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔
زلزلے سے کیا تباہی آئی تھی اور کتنی؟ ابھی وہ اس بات سے بے خبر تھے۔ لیکن زبیدہ نے اسے جانے نہیں دیا۔
''امی! میری پڑھائی کا حرج ہوگا۔ لاہور میں زلزلہ نہیں آیا۔ معمولی جھٹکے لگے ہیں۔''
لیکن وقفے وقفے سے آنے والے آفٹر شاکس نے زبیدہ کو بوکھلا دیا تھا۔
''نہیں...... ہر گز نہیں۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ ابھی ایک کو کھو چکی ہوں، تمہیں کھونے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔''
''ٹھیک ہے امی! نہیں جاتی۔'' وہ زبیدہ کو اس طرح پریشان چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ ''لیکن اس طرح مت کہیں۔ وہ کھویا نہیں ہے، موجود ہے۔ بہت جلد وہ ہم سے آملے گا۔ اگلی بار آؤں گی تو وہ میرے ساتھ ہوگا۔ دیکھ لیجئے گا۔''
وہ تسلی آمیز انداز میں اُن کا بازو تھپتھپاتی رہی۔
لیکن زبیدہ اگلے کئی دن ٹی وی پر ہونے والی تباہی دیکھ کر دہلتی رہیں اور وہ پورا ہفتہ گزار کر لاہور آئی۔

❁○❁

''کل سنڈے ہے مرینہ! ہم احمد حسن سے ملنے جائیں گے۔''
''ٹھیک ہے، چلے چلیں گے۔ لیکن تم احمد حسن کی کچھ زیادہ فین نہیں ہو گئی ہو؟''
''نہیں، مجھے کسی اور سلسلے میں اُس سے ملنا ہے۔''
''کس سلسلے میں؟'' مرینہ حیران ہوئی تھی۔
''ملنے کے بعد بتاؤں گی۔ پلیز..... ابھی مجھ سے مت پوچھو۔''
اور مرینہ خاموش ہو گئی تھی۔

وہ اس وقت الریان میں تھی۔ مرینہ، یاسین کے ساتھ اسے ڈائیوو کے اڈے سے لے کر سیدھی الریان آئی تھی۔
''منڈے کو اکٹھے کالج چلیں گے۔ بلکہ میں کہتی ہوں، رمضان میں تم ادھر ہی رہو۔ الریان میں۔''
وہ دل سے مرینہ اور الریان والوں کے خلوص کی قدر دان تھی۔ لیکن وہ اس طرح پورا مہینہ بھر الریان میں نہیں رہ سکتی تھی۔

الریان میں ان دنوں زلزلہ، آفت زدہ علاقے، ملبے میں دبے لوگ ہی موضوع تھے۔ بلکہ الریان ہی کیا، شاید سب کے ہاں یہی موضوع تھا۔ مرینہ سے اسے پتہ چلا تھا کہ ایک اپنی تنظیم کے کارکنوں کے ساتھ آفت زدہ علاقوں میں گیا ہوا ہے اور کل صبح ہمدان بھی کچھ دنوں کے لئے جا رہا ہے۔
''یہ اچھی بات ہے۔ ہمارے عوام مصیبت کے وقت گھروں سے نکل آتے ہیں۔'' اُس نے کہا تھا۔ تب ہی مرینہ نے بغور اسے دیکھا۔
''ایک بات کہوں سمیرا! برا تو نہیں مانو گی؟''
''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں کبھی بھی تمہاری کسی بھی بات کا برا نہیں مان سکتی رینا! تم اس دنیا میں میری واحد دوست ہو۔''
مرینہ کچھ سوچنے لگی۔
''کیا کچھ ایسی بات ہے رینا! جو مجھے بری لگ سکتی ہے؟''
''ہو بھی سکتا ہے، تم میرے یا میری فیملی کے متعلق کچھ غلط سوچو۔''
''نہیں، پرامس۔ میں ایسا کچھ نہیں سوچوں گی۔''
''میرا خیال ہے چھوڑو۔ ہو سکتا ہے، مجھے وہم ہوا ہو۔'' مرینہ نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔
''نہیں رینا! اب تمہیں بتانا ہی ہوگا۔ مجھے تجسس رہے گا۔''
''میں نے کہا نا، ہو سکتا ہے میرا وہم ہو۔ لیکن مجھے لگا کہ ہمدان بھائی تمہیں پسند کرتے ہیں۔ زلزلے کی خبر سن کر جس طرح وہ پریشان ہوئے تھے اور جس طرح بار بار مجھ سے آ کر پوچھتے کہ تمہارا کوئی فون آیا اور مجھے کہتے کہ تمہیں فون کر کے تمہاری خیریت دریافت کروں۔ اس وقت تو یہی پتہ چلا تھا نا کہ زلزلے نے راولپنڈی، اسلام آباد میں نقصان پہنچایا۔ تفصیلات تو بعد میں آئی تھیں نا۔''
سمیرا خاموش رہی تھی۔
''کیا تمہیں برا لگا سمیرا؟ اسی لئے میں نہیں بتا رہی تھی۔'' مرینہ پریشان ہوئی۔
''نہیں۔'' سمیرا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن میرے پاس ابھی ان باتوں کے لئے وقت نہیں ہے مرینہ! ہمدان بھائی یقیناً بہت اچھے ہوں گے۔ الریان کا ہر فرد ہی اپنی جگہ بے مثال ہے۔ لیکن آئندہ مجھ سے اس طرح کی کوئی بات نہ کرنا۔ میں اپنے ذہن کو بھٹکانا نہیں چاہتی۔ بہت پہلے میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ مجھے اپنے ابو کا خواب پورا کرنا ہے۔ بغیر اِدھر اُدھر دیکھے سیدھے چلتے جانا ہے۔ اور اس کے بعد میری زندگی کا فیصلہ میرے والدین کریں گے۔''
''اور اگر ہمدان بھائی کا پروپوزل آیا تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''
''نہیں۔ مجھے کسی بھی پروپوزل پر، جسے میرے والدین قبول کریں گے، اعتراض نہیں ہوگا۔ چاہے وہ ہمدان ہو یا کوئی اور۔ چلو اب مجھے پڑھنے دو۔ ایک ہفتے کا نقصان پورا کرنا ہے۔''
''ٹھیک ہے۔ کوئی پرابلم ہوا تو میں تمہاری ہیلپ کر دوں گی۔''
مرینہ کا چہرہ چمک اُٹھا تھا۔ چند دن پہلے ہی تو عاشی نے چپکے سے آ کر اسے بتایا تھا کہ ہومی بھائی کو سمیرا باجی اچھی لگتی ہیں اور اس نے خود سنا ہے، وہ اور ایبک بھائی بات کر رہے تھے۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ رابیل نے ہمدان سے

شادی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ہمدان بھی ایسا نہیں چاہتا تھا اور سمیرا کتنی کیوٹ ہے۔ رابیل جتنی خوبصورت نہ سہی، لیکن کشش ہے اس میں۔ اور اگر وہ ہمدان کی دُلہن بن کر الریان میں آ جائے تو بچی کتنا مزا آئے گا۔ کتاب کھولے وہ آپوں آپ مسکرائے جا رہی تھی۔

''کیا کتاب میں کچھ لطیفے لکھے ہیں؟'' سمیرا نے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں......لیکن یوں ہی ایک خیال آ گیا تھا۔''

''سنو.....صبح کتنے بجے جائیں گے احمد حسن سے ملنے؟ ہم اکیلے چلے جائیں گے یا مونا کو ساتھ لے کر جانا ہوگا؟''

سمیرا نے کتاب بند کر دی تھی۔

''نہیں۔ ہم خود ہی چلے جائیں گے۔ یاسین کو پتہ ہے اس کا گھر۔ رابیل اپنی دوست کے ساتھ ایک بار گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔''

''تو کیا تم رابی کو ساتھ لے کر چلو گی؟'' وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ رابیل پہلی ملاقات میں اُسے کچھ خود پسند سی لگی تھی اور الریان کی لڑکیوں میں سے یہ واحد لڑکی تھی جو سمیرا کو پسند نہیں آئی تھی۔

''نہیں۔ رابیل اور آنٹی مائرہ تو رحیم یار خان گئی ہوئی ہیں۔ رابی کا ننھیال وہاں ہی ہے نا۔''

''اچھا'' وہ مطمئن سی ہو کر پھر کتاب کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ لیکن اس کا دھیان بار بار احمد حسن کی طرف چلا جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر احمد حسن کا کیا تاثر ہوگا؟ وہ اندازہ نہیں کر پا رہی تھی۔ احمد حسن ہی احمد رضا ہے۔ یہ تو اسے یقین تھا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی ایک ننھی سی شک کی لکیر اس یقین میں دراڑ ڈال رہی تھی۔ اسے صبح کا بے چینی سے انتظار تھا۔

اسے احمد حسن سے سمیرا کی حیثیت سے ملنا تھا اور یہ انتظار وہ کب سے کر رہی تھی۔ لیکن انتظار تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

❁○❁

ایبک نے کچھ دن پہلے ہی ایک فلاحی تنظیم ''وطن دوست'' جوائن کی تھی۔ سیاسی پارٹیوں سے وہ از حد مایوس تھا۔ احمد حسن سے پھر اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ چنانچہ اُس نے ''وطن دوست'' میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ یہ تنظیم بہت خاموشی سے فلاح و بہبود کے کام کرتی تھی۔ وہ اس کے منشور سے متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ دو دن بعد وہ اس تنظیم کے چند کارکنوں کے ساتھ خیموں اور دوسرے سامان سے لدے دو ٹرک لے کر آفت زدہ علاقوں کی طرف چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس کی عمارہ سے تفصیل سے بات ہوئی تھی اور عمارہ نے اُسے بتایا تھا کہ اُن کی بات مروہ سے ہو گئی ہے اور اتفاق سے مروہ دو تین روز تک پاکستان واپس آ رہی ہے۔ پھر اس کے ساتھ وہ خود جائیں گی اریب فاطمہ کے گھر۔ لیکن مروہ پھپھو ان سے فون پر بات کر لیں گی پہلے۔ اور وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

آفت زدہ علاقے میں بے حد کام تھا۔ لوگ ملبے میں دبے ہوئے تھے۔ وہ بے طرح مصروف ہو گیا تھا۔ ایک قیامت صغریٰ تھی جو بپا تھی۔ اس نے واقعی پہاڑوں کو رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑتے دیکھا۔

اٹھارہ اکتوبر......دس دن ہو چکے تھے۔ لیکن لوگ ابھی تک ملبے تلے دبے ہوئے تھے۔ یہ پہلی امدادی ٹیم تھی جو اس دور دراز جگہ تک پہنچی تھی۔ کچھ لوگ اپنی مدد آپ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ خاندان کے خاندان ختم ہو گئے تھے۔ ''وطن دوست'' کے کارکنوں نے کچھ فاصلے پر اپنا خیمہ لگا لیا اور کام میں مصروف ہو گئے۔

ان کے کارکنوں نے آفت زدہ لوگوں کے لئے بھی خیمے لگا لئے تھے اور انہیں ابتدائی طبی امداد دے رہے تھے۔ ایبک نے ملبے تلے دبی بچی کو اپنے ساتھی کی مدد سے نکالا۔

وہ بے حد خوف زدہ تھی اور اُس کا ایک بازو اور ٹانگ غالباً ٹوٹ چکی تھی۔ ایبک نے اُسے اُٹھا لیا اور اس خیمے کی طرف بڑھا جہاں ابتدائی طبی امداد دی جا رہی تھی۔ زیادہ سیریس لوگوں کو اسلام آباد اور راولپنڈی بھجوا دیا جاتا تھا۔ وہ میڈ

تیز جارہا تھا جب اُس نے سامنے سے احمد حسن کو آتے دیکھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ احمد حسن نے بھی اسے پہچان لیا۔
''آپ یہاں ایبک صاحب؟''
''یہی بات میں آپ سے بھی کہہ سکتا ہوں۔''
''مشکل کی اس گھڑی میں ہمیں یہاں ہی ہونا چاہئے تھا۔'' احمد حسن مسکرا دیا۔ ''میں دس تاریخ کو اس علاقے میں آیا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچا ہوں۔ میرے ساتھ ریڈ کراس کا عملہ ہے۔ آپ چلیں، اس بچی کو ادھر ہی لے چلتے ہیں۔ ہمارے پاس دو ڈاکٹر بھی ہیں۔''
وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے خیمے تک آئے۔ بچی کو عملے کے حوالے کر کے وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔
''میں ایک دو بار آپ سے ملنے گیا تھا۔ لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔''
''ہاں۔ میں رحیم یار خان چلا گیا تھا۔''
''پتہ چلا تھا۔'' ایبک نے کہا تو اس نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔
''آپ کو کیسے پتہ چلا؟''
ایبک مسکرا دیا اور اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔
''آپ کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی احمد حسن! کہ آپ صرف باتیں ہی نہیں کرتے، عملی طور پر بھی کچھ کر رہے ہیں۔''
''یہ میرے لئے بہت مشکل تھا ایبک شاہ! کہ میں وہاں کسی چینل پر بیٹھ کر تبصرہ کرتا رہتا، اس لئے یہاں آ گیا۔''
''اچھا کیا احمد حسن! یہاں بہت کام ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ ابھی بھی ملبے تلے دبے ہوئے ہیں۔ بہت رضا کاروں کی ضرورت ہے۔'' ایبک نے دل گرفتگی سے کہا اور کھڑا ہو گیا۔
''میں چلتا ہوں۔ امید ہے، اب ملاقات ہوتی رہے گی۔ آپ رُکیں گے یہاں یا ابھی واپس چلے جائیں گے؟''
''نہیں۔ ہم یہاں کچھ دن رہ کر کام کریں گے۔ اس علاقے میں ہماری ضرورت ہے۔'' احمد حسن نے جواب دیا۔
''زیادہ شدید زخمیوں کو بھجوانے کا کچھ انتظام کیا ہے یا ابھی کرنا ہے؟'' احمد حسن نے بات جاری رکھی۔
''ہاں۔ اطلاع کر دی ہے۔ ہیلی کاپٹر آرہا ہے۔''
اس ملاقات کے بعد بھی ایبک کی احمد حسن سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ کئی مقامات پر انہوں نے اکٹھا کام کیا۔ بلکہ دو تین بار تو انہوں نے ایک ہی خیمے میں رات گزاری۔ اگرچہ اس ماحول میں ذاتی باتیں کرنے کا کوئی موقع محل نہ تھا۔ وہ جب اپنے خیمے میں آتے تو بہت تھکے ہوئے ہوتے تھے اور لیٹتے ہی سو جاتے تھے۔
ان کے درمیان زیادہ تر گفتگو زخمی اور ملبے میں دبے ہوئے لوگوں کے حوالے سے ہوتی تھی۔ لیکن اس رات کو کافی پیتے ہوئے اچانک ہی ایبک نے احمد حسن کی طرف دیکھا۔
''مجھے آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔''
''کس لئے؟''
''اریب فاطمہ کو بچانے کے لئے۔'' احمد حسن نے بے حد حیرت سے چونک کر اسے دیکھا۔
''آپ..... آپ اریب کو کیسے جانتے ہیں؟'' ایبک کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''الریان میرے نانا جان کا گھر ہے۔''
اریب کی والدہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ لاہور میں، الریان میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کر رہی ہے۔ ''لیکن کیا اریب فاطمہ نے ہاں ''الریان'' میں سب کو بتا دیا ہے کہ.....'' احمد حسن گھبرایا۔
''نہیں۔'' ایبک نے اس کی بات کاٹی۔ ''اریب فاطمہ نے صرف مجھ سے ذکر کیا ہے۔''
''صرف آپ سے۔'' احمد حسن کی آنکھوں کی حیرت واضح تھی۔

''ہاں۔صرف مجھ سے۔اور اس لئے کہ اریب فاطمہ وہ لڑکی ہے جسے میرے والد نے میرے لئے منتخب کیا ہے اور اریب فاطمہ کے ایگزام کے بعد وہ اس کے ہاں جانے والے تھے۔''

احمد حسن نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

''آپ بہت لکی ہیں ایبک شاہ! اریب فاطمہ یقیناً ایک اچھی لڑکی ہے۔''

ایبک مسکرا دیا۔''احمد حسن! کیا آپ مجھے اس شخص کے متعلق کچھ بتائیں گے جو شیخ عبدالعزیز کے نام سے وہاں رہتا ہے۔اور.....'' ایبک جھجکا۔''آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ شخص مسلم نہیں ہے اور اس نے بہروپ بھر رکھا ہے۔''

''محض اتفاقاً۔'' احمد حسن نے آہستگی سے کہا۔''میں ضلع رحیم یار خان میں اپنے عزیزوں سے ملنے جاتا رہتا ہوں۔میرا ایک دوست ہے وہاں۔وہ اس کے پاس کام کرتا ہے۔میں اس سے ملنے گیا تھا تو وہاں اتفاقاً ہم نے اسے فون پر بات کرتے سن لیا تھا۔اسے خبر نہیں ہو سکی تھی۔احمد حسن ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

''وہ ضرور را، موساد یا سی آئی اے کا ایجنٹ ہو گا۔یہ لوگ ہمارے ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔آپ کو کسی ذمہ دار شخص کو اطلاع دینی چاہئے تھی۔''

''کوئی فائدہ نہیں تھا۔وہ ملک چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

''ضرور اُسے خبر مل گئی ہو گی کہ اس کی حقیقت کا علم ہو گیا ہے آپ کو۔''

''مے بی۔'' احمد حسن نے ٹھنڈی ہو جانے والی کافی ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اُتار لی تھی۔

رچی اس ملک سے جا چکا تھا اور شاید ابھی اُسے واپس نہیں آنا تھا۔اُسے لیبیا یا شام بھیج دیا تھا۔اسے اب وہاں اپنا جال پھیلانا تھا۔لیکن یہاں اُس کے کارندے موجود تھے اور اپنے کام میں مصروف۔جو ٹارگٹ لے کر وہ یہاں آئے تھے، اس پر مسلسل کام جاری تھا۔لیکن احمد حسن اُنہیں بے نقاب نہیں کر سکتا تھا۔وہ جانتا تھا، وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔لیکن وہ اسے ختم کر دیں گے۔اور ابھی وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔اسے ایک بار حسن رضا اور زبیدہ سے ملنا تھا اور ان سے معافی مانگنی تھی۔پھر چاہے زندگی ختم ہو جاتی، لیکن ایک بار وہ ان سے مل لیتا۔اسے لگتا تھا جیسے یہاں بھی کئی آنکھیں اُس کی نگران ہوں۔

''کیا سوچنے لگے احمد حسن؟'' ایبک نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔یوں ہی، ان لوگوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو چند دن پہلے ہنستے بستے تھے اور اب......''

گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا۔وہ دونوں اب ان کوششوں کے متعلق باتیں کرنے لگے جو دبے ہوئے لوگوں کو نکالنے کے لئے کی جا رہی تھیں۔

ایبک نے اُسے بتایا کہ وہ صبح پیچھے واپس جا رہا ہے۔دوائیاں، خوراک بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے، جو اُسے لانی ہیں۔وہ ''وطن دوست'' کے ایک کارکن کے ساتھ صبح کسی وقت ہیلی کاپٹر کے آنے پر چلا جائے گا۔

''تم تو ابھی یہاں ہی ہو۔واپسی پر شاید ملاقات ہو یا نہ ہو۔''

''ہاں۔ہو سکتا ہے، ہم کسی اور علاقے کی طرف نکل جائیں یا پھر پیچھے جائیں۔میرے چینل سے بھی لوگ آ رہے ہیں۔''

''سیمل سے؟'' ایبک نے پوچھا۔

''ہاں۔ویسے وہاں میرا پروگرام ختم ہو گیا ہے۔لیکن اب زلزلے کے حوالے سے میری رپورٹس وغیرہ وہاں سے دکھائی جاتی ہیں۔''

ایبک نے سر ہلا دیا۔

سیمل سے اکثر اُس کے بھیجے جانے والے ویڈیو کلپس دکھائے جا رہے تھے اور رپورٹس بھی۔اور یہ ارباب حیدر اور الوینا کے کہنے پر ہوا تھا۔بلکہ سیمل سے کئی بار اُس کی ان خدمات پر اسے سراہا گیا تھا کہ وہ آفت زدہ لوگوں کے لئے کام

کر رہا ہے۔ حالانکہ بے شمار لوگ بغیر کسی غرض کے اس سے زیادہ کام کر رہے تھے۔ ینگ ڈاکٹرز، نوجوان طلباء اور عام رضا کار۔ پاکستانی قوم میں یہ جذبہ بہت تھا۔

ایبک نے اسے پھر سوچوں میں گم دیکھا تو سونے کے لئے اُٹھ گیا۔

''گڈ نائٹ احمد حسن! یہاں دوبارہ ملاقات نہ بھی ہوئی تو اِن شاء اللہ! لاہور میں ملیں گے۔ اور میں آپ کو ''وطن دوست'' جوائن کرنے کی دعوت دوں گا۔'' احمد حسن مسکرایا۔

''اِن شاء اللہ!'' ایبک اُٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا تھا۔

آج اتنے دنوں بعد پھر اریب فاطمہ اسے شدت سے یاد آ رہی تھی۔ وہ لاہور جا کر اریب فاطمہ سے ملے گا، پھر ایک روز کے لئے بہاول پور جائے گا بابا اور ماما سے ملنے۔ یقیناً اب تک ساری بات طے ہو چکی تھی۔ مسکراہٹ نے پھر اُس کے لبوں کو چھوا تھا اور وہ اریب فاطمہ کا تصور آنکھوں میں بسائے سو گیا۔ احمد حسن بہت دیر تک جاگتا رہا اور پھر الوینا کی کال آنے پر باہر نکل گیا۔

ایبک گہری نیند سو رہا تھا۔ الوینا نے کوئی خاص بات نہیں کی تھی بلکہ اسے ابھی وہاں ہی رہ کر کام کرنے کی تلقین کی تھی اور فون بند کر دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک خیمے سے باہر پتھر پر بیٹھا رہا۔ اسے ایبک پر رشک آ رہا تھا۔ وہ اس کی طرح قیدی نہیں تھا، آزاد تھا۔ اور اس ماحول میں بھی سکون کی نیند سو رہا تھا۔ وہ بہت دیر سے سویا تھا، اس لئے صبح جب ایبک اُٹھا تو وہ سویا ہوا تھا۔ البتہ دوسرے لوگ اُٹھ چکے تھے۔ ایبک کی آتے ہوئے اُس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے اُسے جگایا نہیں تھا۔

❀○❀

لاہور پہنچتے ہی وہ پروگرام کے مطابق ''الریان'' گیا تھا۔ رات اسلام آباد میں گزار کر وہ صبح پانچ بجے اسلام آباد سے نکلا تھا۔ لیکن اریب فاطمہ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ کالج گئی ہوئی تھی اور اُسے ایک گھنٹے بعد کی فلائٹ سے بہاولپور جانا تھا۔ بہاولپور میں وہ دو دن رہا تھا۔ عمارہ نے اسے بتایا تھا کہ انہوں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا ہے۔

''لیکن کیوں ماما؟'' وہ پریشان ہوا۔

''لڑکی والے فوراً ہی تو جواب نہیں دے دیتے، سوچتے ہیں۔ تم سے ملیں گے، ہمارا گھر بار دیکھیں گے اور......''

''اچھا۔'' اُسے اطمینان ہوا۔

''تم بے فکر رہو۔ اِن شاء اللہ جواب ہاں میں ہی ہوگا۔'' عمارہ مسکرائی تھیں۔

اور وہ واقعی بے فکر ہو گیا اور واپس آفت زدہ علاقوں میں آ گیا۔ چھ ماہ تک وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری جگہ جاتا رہا۔ بحالی کا کام اگلے دو سالوں تک بھی مکمل ہونے والا نہیں تھا۔ چھ ماہ بعد وہ واپس بہاولپور آیا۔ اس کا ارادہ چند دن بہاولپور رہ کر واپس لاہور جانے کا تھا۔ فلاحی کاموں کے لئے پیسوں کی اشد ضرورت تھی اور انہیں اب یہ کام کرنا تھا۔

لوگوں نے حکومت کو دل کھول کر دیا تھا۔ لیکن کتنا خرچ ہو رہا تھا اور کتنا اکاؤنٹوں میں جمع ہو رہا تھا؟ دور دراز علاقوں میں بے شمار لوگوں کو خیمے بھی میسر نہیں تھے اور وہ کھلے آسمان تلے بیٹھے تھے۔

وہ بغیر اطلاع کے بہاولپور آیا تھا، سو فریش ہو کر جب فلک شاہ کے کمرے میں آیا تو اسے عمارہ اور فلک شاہ کچھ خاموش سے لگے۔ وہ اتنے مہینوں بعد آیا تھا اور عمارہ کی آنکھوں میں خوشی کی وہ چمک نہیں تھی جو ہمیشہ اس کے آنے پر ہوتی تھی۔

''کیا بات ہے بابا! سب ٹھیک تو ہیں نا؟'' اس نے پریشانی سے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہیں بیٹا!'' فلک شاہ مسکرائے۔ ''ابھی کل ہی تو شانی اور مروہ پھپھو لاہور گئے ہیں۔ ایک ہفتے سے آئے ہوئے تھے۔ پتہ ہوتا کہ تم آ رہے ہو تو اُنہیں روک لیتے۔''

''خیر! تین چار دن تک لاہور جاؤں گا تو ملاقات ہو جائے گی۔ آپ سے مروہ پھپھو کے متعلق سن سن کے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے مجھے۔'' دل اریب فاطمہ سے ملنے کو تڑپ رہا تھا۔

''مروہ پھپھو کیا کچھ دن رہیں گی لاہور میں؟''

عمارہ نے سر ہلایا۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ کیا جاننا چاہتا ہے۔ جتنی بار بھی فون پر اس سے بات ہوئی تھی، وہ بتا نہیں پائی تھی۔ اور اب بھی انہیں حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اسے بتائیں۔ وہ اریب فاطمہ کے متعلق اس کے احساسات کو سمجھتی تھیں۔ تب فلک شاہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ایبک! تمہاری ماما اور مروہ پھپھو، اریب فاطمہ کے گھر گئی تھیں۔''

''ہاں۔ ماما نے بتایا تھا۔ انہوں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا ہے۔''

''ایبک! انہوں نے انکار کر دیا ہے۔''

''نہیں......'' اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''انہوں نے کہا، وہ اس کا رشتہ اپنے خاندان میں ہی کریں گے۔ غالباً اریب فاطمہ کے ددھیال میں۔''

''لیکن یہ بات وہ پہلے بھی تو کہہ سکتے تھے، جب انہوں نے سوچنے کے لئے کہا تھا۔'' ایبک کے لبوں سے نکلا۔

''ہاں۔ لیکن مروہ پھپھو نے بتایا ہے کہ اریب کی اماں نے کہا ہے کہ اس کے ابا کی مرضی اپنے خاندان میں کرنے کی ہے۔'' عمارہ بتا رہی تھیں، لیکن وہ سن نہیں رہا تھا۔

اس نے کتنے یقین سے اریب فاطمہ سے کہا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن سب ٹھیک نہیں ہوا تھا اور اریب فاطمہ..... وہ تو بہت دُکھی ہو گی۔ بہت اُداس۔

''بابا! میں کل لاہور جاؤں گا۔''

''اریب فاطمہ ''الریان'' سے چلی گئی ہے واپس اپنے گھر۔'' عمارہ نے بتایا۔ وہ اس کے دل کی کیفیت سمجھ رہی تھیں۔

''آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں ماما؟'' اس نے گلہ کیا۔

''تم پریشان ہو جاتے بیٹا! ہم نے سوچا، تم آؤ گے تو بتا دیں گے۔''

پھر اگلے بہت سارے دن وہ اریب فاطمہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ زینب آپا کا نمبر اس کے پاس محفوظ تھا۔ لیکن زینب آپا نے صرف ایک بار فون اٹینڈ کیا۔

''وہ لوگ گاؤں سے چلے گئے ہیں۔'' انہوں نے بتایا۔

''کہاں؟'' وہ بے چین ہوا تھا۔

''پتہ نہیں۔''

''کیا..... کیا اریب فاطمہ کی شادی ہو گئی ہے؟''

''نہیں۔ لیکن انہوں نے گاؤں چھوڑ دیا ہے۔ میرے پاس اُن کا ایڈریس نہیں ہے۔ غالباً کراچی سیٹل ہونے کا کہہ رہے تھے۔''

''پلیز زینب آپا! اگر کبھی پتہ چلے تو مجھے ضرور انفارم کیجئے گا۔ میرا نمبر محفوظ کر لیں۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔''

زینب آپا نے وعدہ کیا کہ وہ اسے بتا دیں گی۔

❁○❁

لاہور آ کر اُس نے احمد حسن سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن احمد حسن کا فون مسلسل بند تھا۔ شاید اُس نے سم تبدیل کر لی تھی۔

''الریان'' میں بھی کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ منیبہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایگزام دیئے بغیر چلی گئی تھی۔ دو ماہ پہلے اس کا

بھائی آ کر اسے لے گیا تھا، یہ کہہ کر کہ اب وہ واپس نہیں آئے گی۔
''وہاں جا کر اس نے ایک بار بھی فون نہیں کیا اور ہم خوامخواہ اسے یاد کر کر کے مر رہے ہیں۔'' منیبہ نے گلہ کیا۔
''تو تم فون کر لیتیں۔'' ایبک کے لبوں سے نکلا۔
''آپ کا کیا خیال ہے ایبک بھائی! کیا ہم نے فون نہیں کیا ہوگا؟ اس کا جو پی ٹی سی ایل کا نمبر تھا، وہ بند ہے۔ اور سیل تو اس کے پاس تھا ہی نہیں۔''
وہ بے حد دل گرفتہ سا ''الریان'' آیا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
''کیا اس کے والد اور بھائیوں نے اسے شیخ عبدالعزیز کے ساتھ......''
''نہیں۔ اس کی امی تو سب جانتی تھیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتیں۔''
احمد حسن نے اسے بتایا تھا کہ وہ ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ احمد حسن کا دوست اس کے پاس کام کرتا تھا۔ کیا خبر وہ لوٹ آیا ہو۔ احمد حسن......صرف احمد حسن اسے بتا سکتا تھا کہ اریب فاطمہ کی شادی شیخ عبدالعزیز سے ہوگئی ہے یا......
وہ منیبہ کو پھر آنے کا کہہ کر عبدالرحمٰن شاہ سے ملے بغیر ہی ''الریان'' سے نکل آیا اور اب وہ احمد حسن کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

❁○❁

احمد حسن چھ ماہ آفت زدہ علاقوں میں خوار ہونے کے بعد ایک دن پہلے ہی لاہور آیا تھا اور اُس کا ارادہ کل صبح ابراہیم کے گھر جانے کا تھا۔ اگر وہ اتنا تھکا ہوا نہ ہوتا تو شاید ایک لمحے کا انتظار کئے بغیر وہ ابراہیم کے گھر پہنچ جاتا۔
ان چھ ماہ کا ہر دن اُس نے اس پچھتاوے کے ساتھ گزارا تھا کہ اُس نے ابراہیم کا نمبر کیوں نہیں لیا تھا۔ اور ہر دن اس نے واپس لاہور آنے کی خواہش کی تھی۔ چاہے چند دن کے لئے ہی سہی۔ لیکن نہیں آ سکا تھا۔
ثمینہ حیدر اس کے آنے کے کچھ دیر بعد ہی آ گئی تھی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی رات کا کھانا لگوا کر واپس گئی تھی۔ صبح میں اس کے آنے سے پہلے ہی نکل جاؤں گا۔ اسے ابراہیم کا گھر ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ ابھی تک اسی پرانے گھر میں رہتا تھا۔
'خدا کرے وہ کینیڈا واپس نہ گیا ہو۔' پورے چھ ماہ اس نے یہی دعا کی تھی۔
اس نے میز پر پڑے آج کے اخبارات کو دیکھا۔ وہ صبح سے یونہی سستی سے پڑا تھا اور اس نے آج کے اخبارات اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے تھے جو صبح ثمینہ حیدر اس کے کمرے میں رکھ گئی تھی۔ کل تھکا ہونے کے باوجود اسے نیند نہیں آئی تھی اور آج بھی یہی حال تھا کہ نیند نہیں آ رہی تھی۔
ابراہیم سے ملنے کے بعد وہ ایبک کا پتہ کرے گا۔ پتہ نہیں وہ اس وقت کہاں ہے۔ واپس آیا یا نہیں؟ ضرور وہ اب بھی اُن آفت زدہ لوگوں کے لئے کچھ نہ کچھ کر رہا ہوگا۔ اُسے ایبک اچھا لگا تھا۔ وہ بہت خلوص سے سرگرم تھا جب کہ وہ خود وہاں اس لئے موجود تھا کہ الوینا نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا۔
'اگر میں ان کے جال سے نکل آیا تو ضرور ''وطن دوست'' کو جوائن کروں گا۔'
تب ہی اُس کا سیل بجنے لگا تھا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کیا اور فون اُٹھایا۔ دوسری طرف الوینا تھی۔
''سو گئے تھے کیا؟''
''ہاں۔ کل نیند نہیں آئی تھی۔'' احمد رضا کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ ''الوینا! مجھے بہت سخت نیند آ رہی ہے۔ کیا ہم کل بات نہیں کر سکتے؟'' وہ سخت بے زار ہو رہا تھا۔
''ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ بارہ ہی بجے ہیں۔ احمد رضا! تم جانتے ہو، رضوان عامر نے اپنے اداریے میں تمہارے متعلق کیا لکھا ہے؟''

''میں نے چھ ماہ سے اخبارات نہیں دیکھے۔ تم جانتی ہو۔''
''لیکن میں آج کے اخبار کی بات کر رہی ہوں۔ کیا آج کے اخبار تمہارے ہاں نہیں آئے؟'' الوینا نے پوچھا۔
''میرے سامنے پڑے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھے نہیں۔ کون سا اخبار؟''
الوینا نے اخبار کا نام بتایا۔
''لیکن یہ اخبار تو کبھی بھی میرے ہاں نہیں آیا۔''
''ہر اخبار تمہارے زیر مطالعہ رہنا چاہئے تھا۔ میں نے ثمینہ حیدر سے کہا تھا کہ تمام اخبارات آنے چاہئیں۔ بہر حال رضوان عامر نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ احمد حسن دراصل احمد رضا ہے۔ اسماعیل کذاب کا مقرب خاص ہے۔''
''اچھا، پھر......؟'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ''یہ جھوٹ تو نہیں ہے۔''
''ہاں۔ جھوٹ نہیں ہے۔ لیکن اب دیکھنا، بہت سے صحافی تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے اور وہ ثابت کر کے ہی چھوڑیں گے کہ تم ہی احمد رضا ہو۔''
''تو کر لیں ثابت۔ کب تک اپنی شناخت چھپاؤں گا الوینا؟'' اس نے اپنے اندر ایک انجانی سی خوشی کی لہر اُٹھتی محسوس کی۔
'ہوسکتا ہے، کبھی ابو کی نظر سے بھی یہ خبر گزرے اور وہ جو مجھے مردہ سمجھ بیٹھے ہیں، مجھ تک پہنچ پائیں۔' ابراہیم نے بتایا تھا نا کہ وہ اسے بے چینی سے ڈھونڈ رہے تھے۔
''یہ کہنا آسان ہے احمد رضا! لیکن اس کے بعد کیا ہوگا، اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ خیر دیکھتے ہیں۔''
الوینا نے اس وقت فون بند کر دیا تھا، لیکن رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، جب دوبارہ بیل ہوئی تھی۔ احمد رضا نے یونہی بند آنکھوں کے ساتھ فون اٹینڈ کیا۔
''سوری احمد رضا! میں نے تمہیں پھر جگا دیا۔'' دوسری طرف پھر الوینا تھی۔
اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔
''ہمیں کچھ دیر پہلے ہی پتہ چلا ہے کہ لاہور کے ایک مولوی صاحب نے تمہارے خلاف ایک اشتہار چھپوایا ہے اور آج رات مختلف علاقوں میں تقسیم کرنے کے علاوہ دیواروں پر بھی چسپاں کر دیا گیا ہے۔ اسلام آباد میں بھی تمہارے کسی مفتی نے ایک پمفلٹ چھپوایا ہے، جس میں تمہیں مرتد اور اسماعیل کذاب کا قائم مقام کہا گیا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ صبح یہ اشتہارات مزید تقسیم کیے جائیں گے اور تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ کوئی سر پھرا تمہیں مار بھی سکتا ہے۔''
''تو مار دے۔ مجھے کہیں نہیں جانا الوینا! میں تھک چکا ہوں۔''
''ہم نے تم پر پیسہ خرچ کیا ہے احمد رضا! اور ہم تمہیں ضائع نہیں کر سکتے۔'' الوینا کا لہجہ سخت تھا۔ ''تیاری کر لو۔ جنید علی تمہیں لینے آ رہا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے تم وہاں سے نکل آؤ۔''
''الوینا پلیز! مجھے یہاں ہی رہنے دو...... مجھے......'' اس نے التجا کی۔
''پاگل مت بنو احمد رضا! زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اسے جان بوجھ کر ضائع کر دیا جائے۔ تمہارا تو مذہب بھی زندگی بچانے کی تلقین کرتا ہے۔'' الوینا نے لہجے میں نرمی پیدا کی۔
''تم میرے مذہب کے متعلق کتنا جانتی ہو الوینا؟'' وہ تلخ ہوا۔
''اس بات کو چھوڑو۔ تم تیاری کر لو۔''
''مجھے کہاں جانا ہوگا اب؟'' اس نے پوچھا۔
''فی الحال تو صبح کی فلائٹ ہے۔ تم رحیم یار خان آ رہے ہو۔ باس کا حکم ہے کہ تم جو ٹریننگ ادھوری چھوڑ گئے تھے، اسے مکمل کرو۔ اس کے بعد تمہیں رچی کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ یوں بھی وہ تمہارے لئے اُداس ہو رہا ہے ڈیئر!'' احمد

رضا کو لگا جیسے فون کے دوسری طرف وہ مسکرا رہی ہو۔
''یعنی ایک بار پھر جلاوطنی.....اور نہ جانے کتنے عرصہ کے لئے۔'' وہ بڑبڑایا۔
''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ فی الحال تو تمہیں یہاں آنا ہے ڈارلنگ! اور سچ تو یہ ہے کہ میں تمہارے یہاں آنے سے بہت خوش ہوں۔ او کے پھر ملتے ہیں جلد۔'' اُس نے فون بند کر دیا۔
''ہم صرف ایمپلائی (ملازم) ہیں احمد رضا!'' اُس کے کانوں میں ارباب حیدر کی آواز گونجی۔ ''اور ہمیں وہی کرنا ہے جو ہمیں کہا جائے۔ ورنہ ایک اَن چاہی موت ہمارا مقدر ہو گی۔ کوئی اَن دیکھی گولی.....کوئی بم دھماکہ......کوئی حادثہ...... اور پھر سب کچھ ختم۔''
تو کیا سب کچھ ختم ہو جائے گا اور وہ کبھی اپنے گھر والوں سے نہیں مل سکے گا؟.....کبھی حسن رضا کو نہیں بتا سکے گا کہ وہ سب جھوٹ تھا......ایک جال......حرص و ہوس کا جال جس میں وہ پھنس گیا تھا۔ اُس کے دل نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی آپ ﷺ کے سوا کسی اور کو نبی آخر الزماں نہیں مانا تھا۔ کیا حسن رضا یہ کبھی نہیں جان سکیں گے کہ......
'نہیں......' وہ جو کچھ دیر پہلے زندگی سے بے زار ہو رہا تھا، ایک دم اُس کے دل میں جینے کی اُمنگ جاگ اُٹھی۔ کیا خبر، کیا پتہ اب اِس طرح اس کے متعلق خبر چھپنے کے بعد ایک روز حسن رضا اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُس تک پہنچ جائیں۔ بھلے اُسے قتل کرنے کے لئے ہی سہی۔
'بس اتنی زندگی میرے اللہ! اتنی زندگی دے دے کہ میں ایک بار اُنہیں مل کر بتا سکوں کہ......' وہ اُٹھا اور جلدی جلدی اپنی پیکنگ کرنے لگا۔

❁○❁

''فاطمہ!'' سائرہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
وہ بہت دیر سے یونہی دیوار کی طرف کروٹ لئے لیٹی تھی۔ سائرہ بہت دیر سے سامنے موڑھے پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ جاگ رہی ہے اور اسے سائرہ کی کمرے میں موجودگی کا بھی علم ہے۔ لیکن وہ ان سے ناراضی کے اظہار کے لئے ان کی طرف نہیں دیکھ رہی۔
''اُٹھ جاؤ بیٹا! شام ہونے والی ہے۔''
وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔
''اماں! آخر آپ مجھے بتاتی کیوں نہیں ہیں کہ آپ نے اس طرح اچانک مجھے ''الریان'' سے کیوں بلوایا ہے؟ میرے امتحان میں تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا۔ پھر ایسا کیا ہو گیا تھا کہ آپ نے مجھے پیپرز بھی نہیں دینے دیئے۔ حالانکہ آپ چاہتی تھیں، میں کم از کم بی اے تو کر لوں۔ آپ کی تو خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ کتنی ہی بار آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر نہیں بن سکی لیکن ماسٹرز ضرور کروں۔ اور اب آپ نے مجھے بی اے بھی نہیں کرنے دیا۔'' اُس کی آواز بھرا گئی۔
سائرہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
''اریب فاطمہ! تم جانتی ہو کہ تمہارے ابا اور بھائیوں کو تمہارا پڑھنا پسند نہیں تھا۔''
''نہیں اماں! اب یہ مت کہئے گا کہ ابا نے مجھے بلوایا ہے۔ اس بار تو آپ نے مجھے بلوایا ہے اماں! اسفند بھائی نے مجھے بتایا تھا۔ اماں پلیز! مجھے سچ بتائیں، کیا ہوا؟ کیوں آپ نے ایسا کیا؟'' اس نے سائرہ کے ہاتھ پکڑ لئے۔ ''اماں پلیز! مجھے جانے دیں۔ میں ایگزام دے کر آ جاؤں گی۔ مجھے کون سا ہمیشہ وہاں رہنا تھا۔ صرف چند ماہ کی بات تھی۔''
اور وہ بات جو پچھلے تین مہینوں سے سائرہ اس سے نہیں پوچھ سکی تھیں، آج بھی نہیں پوچھ پائیں اور باہر نکل گئیں۔
یہ تین ماہ پہلے کی ہی تو بات تھی، جب انہیں اپنے تایا زاد بھائی کی وفات پر رحیم یار خان جانا پڑا تھا اور وہاں ہی کسی نے انہیں بتایا تھا کہ رافعہ آپا کی طبیعت خراب ہے۔ مائرہ بھی آئی ہوئی ہے۔ اور وہ ان کی مزاج پرسی کے لئے ''حسن لاج''

آئی تھیں۔ رافعہ آپا ان سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

''بہت عرصہ بعد آئی ہو سائرہ! بچے کیسے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہیں آپا! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ وہاں تایا جان کے گھر پتہ چلا تھا آپ کی بیماری کا۔''

''اللہ کا شکر ہے، اب بہتر ہوں۔ معمولی سا انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ شکر ہے، مائرہ آئی ہوئی تھی اور اس وقت میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔''

''مائرہ چلی گئی کیا؟ میں نے تو شادی سے پہلے دیکھا تھا اسے۔ شادی کے بعد وہ لاہور چلی گئی اور میرا بھی ادھر آنا ہی نہ ہوا۔ اماں جب تک زندہ رہیں، کبھی کبھار ان سے ملنے آتی تھی اور ایک دو دن رہ کر چلی جاتی تھی۔''

''تم مائرہ کی شادی میں بھی نہیں آئی تھیں۔ حالانکہ تمہارے بھائی صاحب خود گئے تھے دعوت دینے۔'' انہوں نے گلہ کیا۔

''میں آنے کی پوزیشن میں نہیں تھی آپا! جس روز مائرہ کی بارات آنا تھی، اسی روز تو اسفند پیدا ہوا تھا۔''

''خیر! تم تو بس گاؤں کی ہی ہو کر رہ گئی ہو۔ بندہ یوں اپنے رشتہ داروں، عزیزوں کو چھوڑ تو نہیں دیتا۔''

''آپا! میں نے مائرہ کا پوچھا تھا۔ چلی گئی کیا؟''

''ارے نہیں۔ رمضان میں آئی تھی، میں نے عید تک روک لیا کہ شادی کے بعد ساری عیدیں سسرال میں ہی تو کی ہیں اس نے...... احسان مانتا ہی نہیں تھا۔ ہر بار فون کرتی تو کہتا، نہیں عید تو ''الریان'' میں ہی کریں گے۔ لیکن اس بار مان گیا اور عید کے بعد میں ہی بیمار پڑ گئی۔ اب آیا ہوا ہے عثمان اُس کا جیٹھ، اُسے لینے۔ رات ہی آیا ہے۔ آج کل میں چلی جائے گی۔ رابی بہت اُداس ہو رہی ہے۔ اس کا دل نہیں لگ رہا یہاں۔ پہلی بار اتنے دن رہی ہیں دونوں ماں بیٹی یہاں۔ ارے ہاں، تمہاری بیٹی بھی تو وہاں رہ کر پڑھ رہی ہے۔ مائرہ نے بتایا تھا مجھے۔''

وہ کچھ دیر رافعہ سے باتیں کرتی رہیں۔ لیکن وہ بات کرتے کرتے سو گئی تھیں۔ شاید دواؤں کے زیرِ اثر...... وہ اُٹھ کر باہر آئیں تو اُنہیں مائرہ نظر آئیں۔ وہ لاؤنج میں کھڑی کسی ملازمہ سے بات کر رہی تھیں۔

''مائرہ!'' انہوں نے اُنہیں بلایا تو مائرہ نے مڑ کر دیکھا۔

''ارے یہ تم ہو سائرہ؟'' وہ ذرا سا حیران ہوئی تھیں۔ ''ابھی میں رانو سے پوچھ رہی تھی کہ کون مہمان آیا ہے اماں کے پاس۔''

''آپا سو گئیں تو میں باہر آ گئی۔ تم نے منیر بھائی کی ڈیتھ کا تو سنا ہوگا۔ ادھر ہی آئی تھی۔ وہاں رافعہ آپا کی بیماری کا پتہ چلا تو ملنے آ گئی تھی۔''

''اچھا کیا...... مجھے بھی تم سے ملنا تھا۔ آؤ لاؤنج میں بیٹھتے ہیں۔ رانو! تم یہاں کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو؟ جاؤ چائے بناؤ۔ اور ہاں، امی جان کو دوا دے دی تھی؟''

وہ رانو سے مخاطب ہوئیں اور اُنہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سائرہ نے بغور اُنہیں دیکھا۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھیں۔ عمر کے آثار ضرور دِکھتے تھے، لیکن آنکھوں میں وہی پُر غرور سی چمک تھی اور اندازِ گفتگو بھی وہی جس سے خود پسندی جھلکتی تھی۔

''تو تمہارے تایا کے خاندان سے تعلقات ہیں؟'' مائرہ نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ لیکن غمی خوشی میں ہی آنا ہوتا ہے۔''

''اچھا، لیکن میں نے تو یہی سنا تھا تب تمہاری شادی سے پہلے کہ تایا نے تم لوگوں سے میل جول ختم کر دیا ہے۔''

''نہیں۔ تم نے غلط سنا تھا مائرہ!'' سائرہ نے سنجیدگی سے کہا اور سوچا کہ وہ مائرہ سے وضاحت کریں کہ تایا ابا کو غلط فہمی ہوئی تھی اور انہیں حقیقت پتہ چل گئی تھی۔ کم از کم حقیقت جان لینے کے بعد وہ اریب فاطمہ سے ایسی کوئی بات نہیں کہیں گی جس سے اُس کا دل دُکھے۔

''ہوسکتا ہے۔'' مائرہ نے کندھے اُچکائے اور پھر چونکنے کی اداکاری کی۔
''ارے تم نے اپنی بیٹی کے متعلق نہیں پوچھا۔''
''ہاں۔'' اریب فاطمہ کے ذکر پر سائرہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''کیسی ہے وہ؟''
''بالکل تمہارے جیسی سائرہ!'' مائرہ کے لبوں پر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ''شکل وصورت میں بھی اور عادت ومزاج اور اخلاق وکردار میں بھی۔''
سائرہ چونکیں اور ان کے چہرے کی بدلتی کیفیات نے مائرہ کو محظوظ کیا۔ بچپن میں سائرہ جب کبھی رحیم یار خان آتی تھی تو مائرہ کو اس کی تعریف سن کر جلن محسوس ہوتی تھی۔ وہ تقریباً ہم عمر تھیں اور جب بھی وہ لوگ رحیم یار خان آتے تو خاندان بھر میں اُس کی ذہانت کا ذکر ہونے لگتا۔ جبکہ مائرہ چاہتی تھی کہ لوگ صرف اس کی خوبصورتی کی تعریف کریں اور صرف اسے ہی سراہیں۔
''یہ تم نے اپنی بیٹی کی کیسی تربیت کی ہے سائرہ! وہ سنسان دوپہروں میں پارک میں جا کر لڑکوں سے ملتی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں ''الریان'' کے لڑکوں پر بھی ڈورے ڈالنے نہ شروع کر دے۔ اس سے پہلے کہ ''الریان'' کی عزت اُچھلے، اپنی بیٹی کو وہاں سے لے آؤ۔''
''فاطمہ ایسی نہیں ہے مائرہ!'' بمشکل ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
''وہ ایسی ہی ہے سائرہ بی بی! بالکل تمہاری کاپی۔ اس سے پہلے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے، اُسے وہاں سے لے آؤ۔ مخلصانہ مشورہ دے رہی ہوں۔'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسی تھیں۔ ''کہتے ہیں بیٹیاں، ماں کا پرتو ہوتی ہیں۔ اور تمہاری بیٹی تو تم سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اسے تو کسی کا ڈر نہیں ہے۔ میں نے خود دو بارا سے پارک میں کسی لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے۔ مجھے تو ڈر ہی لگا رہتا ہے۔ جس طرح تم اپنے ساتھ کسی کو لگائے گھر تک آ گئی تھیں، کہیں تمہاری بیٹی بھی کسی روز اپنے ساتھ کسی کو لگائے ''الریان'' کے دروازے تک نہ لے آئے۔''
وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ سائرہ سن نہیں رہی تھیں۔ اور اگر سن بھی رہی تھیں تو الفاظ ان کی سماعت کی گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔
کاش وہ یہاں نہ آئی ہوتیں۔
کاش ان کی ملاقات مائرہ سے نہ ہوئی ہوتی۔ اُن کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ بول نہیں پا رہی تھیں اور نہ ہی مائرہ کی بات کی تردید کر پا رہی تھیں... جو اُن کے ماضی کے اوراق کھولے مسلسل اُن کی تذلیل کر رہی تھیں اور لاؤنج کے اندر آتے عثمان شاہ نے بہت تاسف سے مائرہ کی باتیں سنی تھیں۔ جب مائرہ خاموش نہیں ہوئیں تو وہ ایک قدم آگے بڑھے تھے۔
''کسی کی تحقیر کرنا اور بلا تحقیق بہتان لگانا قتل سے بڑا جرم ہے مائرہ بھابی! کسی پر بہتان لگانے والا ذلت کی عمیق پستا میں گر جاتا ہے۔''
وہ نے مڑ کر انہیں دیکھا اور یک دم خاموش ہو گئیں۔ ان کے سامنے بیٹھی سائرہ نے جھکا ہوا سر اُٹھایا اور پھر ایک دم ہی اس کی آنکھوں میں بہت ساری حیرتیں اُتر آئیں۔ اور وہ ایک دم کھڑی ہو گئیں۔ عثمان شاہ بے حد حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ پھر جیسے وہ چونک کر مائرہ کے پیچھے سے نکل کر اس کے دائیں طرف آ کھڑے ہوئے۔
''بہت افسوس کی بات ہے مائرہ بھابی! آپ وہ الزام لگا رہی ہیں، جس کی حقیقت سے آپ خود بے خبر ہیں۔ اور ان کے بزرگوں نے بھی بغیر سوچے سمجھے، بغیر تحقیق کیے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ان سے ہی غلطی ہوئی۔ آپ ایک بے بنیاد بات کو لے کر ان کے پیچھے پڑی ہیں۔ یہ میں تھا جس نے اُنہیں دیکھ کر، اُن کے کردار کی پختگی سے متاثر ہو کر اُنہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ یہ تو بے خبر تھیں میرے خوابوں اور میری سوچوں سے۔''
انہوں نے حیران کھڑی سائرہ کی طرف دیکھا۔ اتنے سال گزرنے کے بعد بھی اُنہیں مائرہ کو پہچاننے میں چند لمحے

لگے تھے۔ وہ بالکل ویسی ہی تھیں۔
وہ دوقدم سائرہ کی طرف بڑھے تھے۔
''میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر سکا کہ میری وجہ سے آپ کے خواب رکرچی رکرچی ہوئے اور آپ نے ایک اَن چاہی زندگی گزاری، خوشیوں سے دُور۔'' اُن کی آواز مدھم ہوگئی تھی۔
''نہیں.....نہیں......'' وہ کہنا چاہتی تھیں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ ایک خوشحال اور بہترین زندگی گزار رہی ہیں۔
''پلیز مجھے معاف کر دیجئے گا، میری اس غلطی پر جو آپ کی پوری زندگی پر محیط ہوگئی اور پوری زندگی کی خوشیوں کو کھا گئی۔ جس روز مجھے پتہ چلا کہ آپ کے تایا جان نے آپ کے ناکردہ جرم کی سزا میں آپ کی تعلیم ختم کر کے آپ کی اچانک شادی کر دی ہے، تب سے لے کر آج تک ہر رات جب میں بستر پر لیٹتا ہوں تو سوچتا ہوں، میں نے ایک لڑکی کے خواب رکرچی رکرچی کر دیئے، جو ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔''
انہوں نے پھر ایک تاسف بھری نظر مائرہ پر ڈالی۔
''سوری.....عثمان بھائی! وہ یہاں ادھر رحیم یار خان میں خاندان میں ایسا ہی مشہور تھا۔ اور مجھے تو کبھی پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ آپ تھے۔ میرا مطلب ہے، گھر میں بھی کبھی کسی نے ذکر نہیں کیا۔''
''کسی لڑکی کو دیکھ کر اس کے گھر رشتہ بھجوانا کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی مائرہ بھابی!''
اور سائرہ کو پہلی بار پتہ چلا تھا کہ اس شخص کا نام عثمان شاہ ہے جو اُن کی زندگی کے اُفق پر چند لمحوں کے لئے نمودار ہو کر زندگی کا پورا منظر نامہ ہی تبدیل کر گیا تھا۔ لیکن سائرہ کو ان سے کوئی گلہ نہ تھا۔ شاید روزِ ازل سے کتاب میں ایسا ہی ہونا رقم تھا۔
''آپ اُن سے سوری کریں مائرہ بھابی! جن پر بے بنیاد الزام لگا رہی تھیں۔ مجھ سے نہیں۔''
پتہ نہیں عثمان شاہ نے مائرہ کی کتنی بات سنی تھی۔ لیکن انہوں نے سائرہ کو مائرہ کے سامنے سرخرو کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں عثمان شاہ کی ممنون ہوئی تھیں اور انہوں نے دل میں بے حد فخر محسوس کیا تھا کہ انہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے کی چاہ رکھنے والا شخص ہر لحاظ سے اعلیٰ و افضل تھا۔ بلند ظرف، بلند کردار۔ اور عثمان شاہ، مائرہ سے کہہ رہے تھے۔
''بخدا مائرہ بھابی! جب میں اماں جان اور بابا جان کے ساتھ یہاں ان کے تایا کے گھر آیا تھا اور پتہ چلا تھا کہ ان کی شادی ہو چکی ہے تو میں نے اپنی سوچ کو بھی کسی خیانت کا مرتکب نہیں ہونے دیا اور آپ......''
انہوں نے پھر ایک تاسف بھری نظر مائرہ پر ڈالی جو اس اچانک صورت حال سے ابھی تک سنبھل نہ پائی تھیں۔
''بیٹھیں نا عثمان بھائی!......اور سائرہ! تم بھی۔ میں دیکھوں، رانو ابھی تک چائے کیوں نہیں لائی۔''
''نہیں مائرہ! میں بس اب چلوں گی۔'' سائرہ نے مائرہ کی طرف دیکھا اور اپنی چادر درست کرتی دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔
''اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا سائرہ!''
''میں نے تو کبھی آپ کو قصوروار گردانا ہی نہیں۔'' سائرہ نے آہستگی سے کہا تھا۔
''لیکن میں نے ہمیشہ خود کو مجرم سمجھا آپ کا۔'' اپنی بات کہہ کر عثمان شاہ وہاں رُکے نہیں تھے۔
''میں ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ مائرہ بھابی! آپ کا کیا پروگرام ہے؟ تیاری کر لیجئے گا۔ دو گھنٹے تک نکل جائیں گے۔''
''نہیں۔ امی کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔ رابی گھبرائی ہوئی ہے۔ آپ اسے ساتھ لے جائیں۔ میں دو چار دن میں آ جاؤں گی۔''
اور عثمان شاہ سر ہلاتے ہوئے چلے گئے تھے اور پھر سائرہ، مائرہ کے اصرار کے باوجود نہیں رُکی تھیں اور پھر وہ پوری رات نہیں سو سکی تھیں۔

اور صبح ہونے تک وہ فیصلہ کر چکی تھیں، اریب فاطمہ کو واپس بلانے کا۔ اور گاؤں واپس جاتے ہی انہوں نے اریب فاطمہ کے والد سے کہا تھا۔

''میں نے اریب فاطمہ کے متعلق بہت برا خواب دیکھا ہے۔ اسفند کو بھیج کر اسے واپس بلوا لیں۔''

''تم نے ہی ضد کر کے اسے بھیجا ہے۔ اچھی بھلی آ تو گئی تھی۔ کہا بھی تھا، لڑکیوں نے اتنا پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہوتا ہے۔ پھر شیخ صاحب کا کیا پتہ، کب آ جائیں۔ زبان دی ہے میں نے اُنہیں۔ صبح ہی اسفند کو بھیجتا ہوں لاہور۔ لیکن پھر دوبارہ اسے بھیجنے کی ضد نہ کرنا اب۔ ہم لاہور کے چکر ہی لگاتے رہیں گے کیا؟''

اور یوں اریب فاطمہ چک نمبر 151 آ گئی تھی۔

''اماں! آپ نے مجھے کیوں بلوا لیا؟ پیپرز تو دینے دیتیں۔''

''بس بہت پڑھ لیا فاطمہ! تم نے۔'' ان کی نظروں نے اس کے چہرے کو کھوجا۔

''اماں پلیز! ایسا مت کریں۔ ابا کو منا لیں۔'' اریب فاطمہ یہ جان کر کہ اب وہ مزید نہیں پڑھے گی، تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ ''آپ ابا کو منا سکتی تھیں اماں! آپ نے ہمیشہ اُنہیں منایا۔''

''ہاں۔ لیکن اب منانا نہیں چاہتی تھی۔''

''کیوں اماں! آپ تو چاہتی تھیں، میں پڑھوں۔''

''ختم کر دی میں نے اپنی خواہش۔''

انہوں نے اریب فاطمہ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی نہیں۔ حالانکہ کئی بار اُن کا جی چاہا تھا، وہ اس سے پوچھیں کہ وہ دوپہر کے وقت کس سے ملنے پارک گئی تھی۔ لیکن پھر نہیں پوچھ سکی تھیں۔

''نہیں، اُسے دکھ ہوگا۔ میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔ ضرور مائرہ نے الزام لگایا ہوگا۔''

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ نہیں پوچھ سکی تھیں۔

اریب فاطمہ بال ٹھیک کرتی ہوئی باہر آئی اور ایک نظر تخت پر خاموش بیٹھی سائرہ کی طرف دیکھا اور صحن میں پڑے حمام کے سامنے چوکی پر بیٹھ کر وضو کرنے لگی۔

''اریب فاطمہ!'' سائرہ نے ایک گہرا سانس لیا اور اُسے پکارا۔ اریب فاطمہ نے مڑ کر دیکھا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ''تم پرائیویٹ امتحان بھی تو دے سکتی ہو نا؟''

اریب فاطمہ نے ایک شاکی سی نظر اُن پر ڈالی اور پھر مڑ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ الریان میں سب کو ہی اُس کے اس طرح تعلیم یوں ادھوری چھوڑ کر آ جانے پر دُکھ تھا۔ منیبہ، حفصہ، مرینہ حتیٰ کہ سمیرا نے بھی فون کیا تھا۔ وہ کیا کہتی سوائے اس کے کہ ابا نے منع کر دیا ہے۔

''تم کہو تو بابا جان سے کہوں، تمہارے ابا سے بات کریں؟'' منیبہ ہمیشہ کی طرح پریشان ہو رہی تھی۔

''نہیں منیبہ! میں خود بھی ایسا نہیں چاہتی۔'' اُس نے اپنی افسردگی چھپائی تھی اور منیبہ سے ہی اسے پتہ چلا تھا کہ ایبک زلزلے والے علاقے میں گیا ہوا ہے اور یہ کہ وہاں موبائل کے سگنل نہیں ملتے۔ عمر دن میں چھ بار فون ملاتا ہے، تب کہیں اُس کی بات ہو پاتی ہے۔

'اور پتہ نہیں ایبک کب واپس آئے گا اور کب عمارہ آنٹی کو بھیجے گا۔' وضو کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ لیکن نہیں جانتی تھی کہ ایبک کا رشتہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

❀○❀

مروہ پھپھو نے باقاعدہ ایبک کا رشتہ مانگا تھا۔ وہ عمارہ کے ساتھ آئی تھیں۔

''مروہ آنٹی!'' وہ اُن کے گلے لگ کر بے تحاشا روئی تھی۔ ''میں نے آپ کو بہت مِس کیا۔''

''میں نے بھی میری جان!'' وہ اسے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں لیکن اماں نے منع کر دیا۔ پھر بھی وہ خوش تھی۔ اماں اور ابا نے انہیں سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا۔ ایبک نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ وہ پُریقین تھی کہ اماں، ابا کو ضرور منا لیں گی۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ ایبک کو پسند کرتی ہے۔

پھر پتہ نہیں کیوں، ایبک کے رشتے کا انکار کر دیا گیا تھا۔ ابا نے کہا تھا، وہ اُس کی شادی اپنی بہن کے گھر کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں زبان دے چکے ہیں۔

سائرہ خاموش رہی تھیں۔ حالانکہ پہلے جب بھی اس سلسلے میں بات ہوتی تھی تو وہ صاف صاف کہتی تھیں، میں اپنی بیٹی کی شادی ان اُجڈ لوگوں میں ہرگز نہیں کروں گی۔

مروہ پھپھو نے انکار سننے کے باوجود گاؤں کا چکر لگایا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ نہ ابا مانے تھے، نہ اماں نے کچھ کہا تھا۔

شہریار سے اُسے اتنا پتہ چلا تھا کہ شیخ عبدالعزیز واپس اپنے ملک چلے گئے ہیں اور ان کی واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔

ارباب حیدر نے عظمت یار کو بتایا تھا اور انہوں نے فوراً ہی پھپھو کو ہاں کر دی تھی، جو پچھلے کئی سالوں سے خواہشمند تھیں۔

''اریب فاطمہ! انسان کی عزتِ نفس ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔'' اُس رات سائرہ نے اُسے روتے دیکھ کر کہا تھا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ تمہاری شادی مائرہ کے خاندان میں ہو۔ وہ ہمیشہ تمہاری عزتِ نفس مجروح کرتی رہے گی۔''

''ایبک ''الریان'' میں نہیں رہتا اماں! آپ جانتی ہیں۔ پھر بھی..... پھر بھی آپ نے ابا کو اپنی مرضی کرنے دی۔''

''ہاں..... پھر بھی..... اس لئے کہ میں بھی نہیں چاہتی۔ جانتی ہو، مائرہ نے تمہارے متعلق کیا کہا؟''

''کیا کہا؟''

''اُس نے تمہارے کردار پر شک کیا۔ اُس نے کہا کہ تم ایسی لڑکی ہو کہ اُسے ڈر ہے کہ تم الریان کے لڑکوں کو بھی پھنسا لو گی۔ میں نہیں چاہتی کہ مائرہ کی بات سچ ہو اور وہ کل میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے کہ وہ سچی تھی اور تم نے......''

''لیکن اماں! آپ تو جانتی ہیں، ایسا نہیں ہے۔ آپ کی بیٹی ایسی نہیں ہے۔'' وہ رونے لگی تھی۔ ''صرف اتنی سی بات کے لئے آپ نے......''

''یہ اتنی سی بات نہیں اریب فاطمہ! یہ پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔ میں نے صرف اتنی سی بات پر ہی پوری زندگی لوگوں سے ڈر کر اور نظریں جھکا کر گزاری ہے۔''

''لیکن اماں! آپ کیوں ڈریں لوگوں سے؟ آپ نے کچھ نہیں کیا تھا۔ آپ کا ضمیر مطمئن تھا۔'' اریب فاطمہ کو سائرہ سے اختلاف تھا۔ لیکن وہ اُنہیں قائل نہیں کر سکی تھی۔

''اریب فاطمہ! مجھے شرمسار نہ کرنا۔ یہ شرمندگی میری جان لے لے گی۔'' ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ بے بسی تھی۔ اور اس پر یقین بھی کہ وہ ان کا مان نہیں توڑے گی۔

اور اس نے ایبک کا نمبر پھاڑ کر پھینک دیا کہ کہیں کسی کمزور لمحے میں اماں کی نظروں میں وہ بے اعتبار نہ ہو جائے۔

زینب نے اسے ایبک کے بار بار آنے والے فون کا بتایا تو اس نے کہہ دیا کہ وہ اُسے بتا دے کہ وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔ اس نے ہر وہ راستہ بند کرنے کی کوشش کی جو ایبک کو اُس تک لا سکتا تھا۔

عظمت یار، اسفند یار، ابا سب کے پاس اپنے اپنے سیل فون تھے۔ سو لینڈ لائن فون بند کر دیا گیا تھا کہ ابا کو فضول خرچی کی عادت نہ تھی۔ یوں ''الریان'' سے بھی اُس کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ مروہ پھپھو ایک بار پھر ملک سے باہر چلی گئی تھیں اور اماں سے چونکہ اس رشتے کی وجہ سے ناراض تھیں، اس لئے نہ تو جانے سے پہلے ملنے آئیں، نہ کوئی اطلاع بھجوائی۔ فون تو بند ہی ہو گیا تھا۔ یہ رابطہ بھی نہیں رہا کہ ایبک ان کے ذریعے ہی گھر تک آ جاتا۔

❁○❁

اور پھر سچ مچ ہی اُنہوں نے گاؤں چھوڑ دیا تھا اور زمینیں ٹھیکے پر دے دی تھیں۔ ارباب حیدر کے اصرار پر وہ صادق آباد منتقل ہو گئے تھے۔ بہت بڑا اور خوب صورت گھر رہنے کے لئے ارباب حیدر نے سیٹ کروا دیا تھا۔ اسفندیار اور عظمت یار اس کے ساتھ کام کرتے تھے اور ان کے پاس بے تحاشا پیسہ آ گیا تھا۔ اپنی گاڑی تھی جو رچی نے گفٹ کی تھی۔ اس کے علاوہ اسفندیار نے بھی ایک گاڑی خرید لی تھی۔ وقت گزاری کے لئے اس نے بھی ان کے ادارے میں جاب کر لی تھی۔ اس کا کام سلائی کرنے والی عورتوں کی نگرانی کرنا تھا۔ یوں اُس نے خود کو مصروف کر لیا تھا۔

صادق آباد کا مرکز چک 151 کے مرکز سے خاصا چھوٹا تھا۔ یہاں صرف آٹھ، دس عورتیں کام کرتی تھیں۔ ایک گھر کی نچلی منزل میں یہ کام ہوتا تھا۔ جبکہ فرسٹ فلور پر ارباب حیدر کا آفس تھا، جو ہفتے میں تین دن صادق آباد اور چار دن چک میں رہتا تھا۔ جب وہ صادق آباد آتا تو اسفندیار یا عظمت میں سے کوئی ایک اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ پس پردہ یہاں کیا ہوتا تھا، اریب فاطمہ نہیں جانتی تھی۔ گھر میں اسفندیار، عظمت یار اور ابا کے درمیان اس کے رشتے کے سلسلے میں تکرار رہنے لگی تھی۔

ابا چاہتے تھے کہ وہ اریب فاطمہ کی شادی اپنے بھانجے سے کر دیں۔ جبکہ دونوں کا خیال تھا کہ شیخ کا انتظار کیا جائے۔ وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ اپنے بزنس کے سلسلے میں مصروف ہو گیا ہے۔

''ارباب حیدر نے بتایا ہے مجھے کہ اس کے جلد آنے کا امکان نہیں ہے۔ میں ساری زندگی اُسے نہیں بٹھا سکتا۔'' ابا کا مؤقف تھا۔ لیکن اسفندیار اور عظمت یار کا اسٹیٹس بدل چکا تھا اور انہیں اپنا پھوپھی زاد پسند نہیں تھا۔ وہ بھول گئے تھے کہ کبھی وہ بھی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ اریب فاطمہ نے خود کو بے نیاز کر لیا تھا۔ وہ صبح مرکز میں چلی جاتی، دو بجے گھر آتی اور اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ کوئی کام ہوتا، کر دیتی۔ کوئی بات کرتا، جواب دے دیتی۔ ورنہ چپ رہتی اور ایبک کو بھلانے کی کوشش کرتی۔ لیکن اسے بھولنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وقت گزر رہا تھا اپنی رفتار سے۔ لیکن اریب فاطمہ کو لگتا جیسے ایک ایک لمحہ، ایک ایک صدی بن کر گزر رہا ہو۔

❀○❀

احسان شاہ اپنے بیگ کی زپ بند کر رہے تھے کہ رابیل دستک دے کر کمرے میں آئی۔

''آپ کہیں جا رہے ہیں پاپا؟''

''ہاں..... آ جاؤ بیٹا! کیا بات ہے؟'' احسان شاہ نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔

''پاپا! میں ایم فل کرنا چاہتی ہوں۔''

''ضرور کرو بیٹا!'' انہوں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر کچھ کاغذات نکالے اور بیگ کی زپ کھول کر بیگ میں رکھے۔

''تو پاپا! میں اپلائی کر دوں ایڈمیشن کے لئے؟ سارا دن گھر میں بور ہوتی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ایم فل کرنے کی۔'' مائرہ واش روم کا دروازہ کھول کر باہر آئی تھیں۔ ''اگلے ماہ منیبہ کی شادی ہے۔ پھر مرینہ کی ہو جائے گی۔ تم بیٹھی پی ایچ ڈی کرتی رہنا۔ چند دن میں فیصلہ کر لو۔ اس وقت اچھے رشتے آ رہے ہیں۔ بعد میں کسی نے پوچھنا تک نہیں۔''

رابیل نے کوئی جواب نہیں دیا اور احسان شاہ سے پوچھنے لگی تھی۔

''پاپا! آپ نے بتایا نہیں، آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''بہاول پور جا رہا ہوں۔'' انہوں نے بیگ اٹھا لیا۔

''پھپھو کی طرف؟'' رابیل کی آنکھیں چمکیں۔ ''مجھے بھی لے چلیں پاپا! میں نے آج تک پھپھو کا گھر نہیں دیکھا۔ ہمدان بھائی نے بتایا تھا ایک دفعہ..... پرانے اسٹائل کا بنا وہ گھر بہت خوب صورت ہے۔ کھڑکیوں پر رنگین شیشے اور چھتوں پر بھی آئینے لگے ہیں۔ اور گھر کا نام بھی مراد محل ہے۔'' وہ بہت اشتیاق سے کہہ رہی تھی اور مائرہ غصے سے بل کھا رہی تھیں۔

''ہاں۔ پھر کبھی گیا تو لے چلوں گا۔ اس وقت تو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔''

''سچ بابا!'' وہ بے حد خوش ہوئی۔

''ہاں۔ تمہاری پھپھو کو بھی بہت خوشی ہوگی۔'' انہوں نے سر ہلایا۔ اس کے سر پر پیار کیا۔ ''اور ہاں، تم ایم فل، پی ایچ ڈی جو کچھ کرنا چاہو، میری طرف سے اجازت ہے۔''

انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر مائرہ پر ڈالی، جس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور رابیل کو خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

رابیل نے مڑ کر مائرہ کی طرف دیکھا۔

''تھینک گاڈ! پاپا نے پھپھو اور مومی انکل سے اپنی ناراضی ختم کر دی۔ اب آپ بھی ختم کر دیں ماما!''

مائرہ ہونٹ بھینچے کھڑی تھیں۔

''اب جبکہ پاپا سمیت سب ہی کی صلح ہوگئی ہے تو..... آپ اکیلی رہ جائیں گی اس طرح۔''

اکیلی تو وہ ہوگئی تھیں۔ لیکن اس کے لئے وہ مومی کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔ کبھی نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب وہ رحیم یار خان چلی جائیں گی تو احسان شاہ ان کی جدائی برداشت نہیں کر پائیں گے۔ اتنی ہی شدید محبت تھی اُنہیں مائرہ سے۔ لیکن مائرہ کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ نہ ایک ماہ کے عرصہ میں احسان نے انہیں فون کیا تھا اور نہ ہی واپس آنے کو کہا تھا۔ رابیل سے ان کی بات ہوتی رہتی تھی۔ لیکن......

عثمان شاہ، رحیم یار خان آئے تو وہ سمجھیں، ضرور احسان شاہ نے بھیجا ہوگا۔ لیکن پھر پتہ چلا تھا کہ وہ اپنے کسی کام سے رحیم یار خان آ رہے تھے تو عبدالرحمٰن شاہ نے انہیں کہا تھا کہ وہ مائرہ کو بھی لیتے آئیں۔

عبدالرحمٰن شاہ نے دو تین بار احسان شاہ سے پوچھا تھا کہ مائرہ کے ساتھ ان کا کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟ اور احسان شاہ نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن عبدالرحمٰن شاہ مطمئن نہیں ہوئے تھے اور انہوں نے عثمان سے کہا تھا کہ وہ مائرہ کے گھر ضرور جائیں اور ساتھ لے کر آئیں۔

وہ بہت خوش خوش واپس آئی تھیں۔ عثمان شاہ کے واپس آنے کے چند دن بعد ان کا خیال تھا کہ احسان شاہ والہانہ ملیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ احسان شاہ رات گئے کمرے میں آئے تھے اور ان سے بات کئے اور ان کی طرف دیکھے بغیر سو گئے تھے اور وہ تب سے لے کر اب تک جل رہی تھیں۔ غصے، نفرت اور انتقام سے...... انہیں اپنے کئے پر کوئی شرمندگی نہ تھی۔

رابیل نے مائرہ کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بغور دیکھا اور مسکرائی۔

''آپ سوچئے گا ضرور۔ پھر اکٹھے جائیں گے بہاول پور۔ عمر بھی بہت خوش ہوگا۔''

وہ جانے کے لئے مڑی تو مائرہ نے چونک کر اس کا بازو پکڑا۔ ان کی گرفت کافی سخت تھی۔ ''بیٹھ جاؤ ادھر رابی!''

''اوہ مما! کیا مسئلہ ہے؟''

''رابی!'' وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔ ''میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔ تم طاہر سے مل چکی ہو۔ بات چیت بھی کی ہے۔ روبی کا بیٹا بھی اچھا ہے۔ مجھے دو تین دن میں تمہارا فیصلہ چاہئے۔''

''مما! میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ مجھے نہ طاہر بھائی سے اور نہ ہی آنٹی روبی کے بیٹے سے شادی کرنی ہے۔''

''دیکھو رابی! احمقانہ بات مت کرو۔ یہ تم اس لئے کہہ رہی ہو کہ تم ایبک کو پسند کرنے لگی ہو۔ جبکہ اگر عقل سے کام لو تو طاہر اور روبی کا بیٹا دونوں ہی ایبک سے اچھے ہیں۔ پھر ایبک تمہیں پسند بھی نہیں کرتا۔''

رابیل نے ایک نظر مائرہ کو دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

'آپ کو کیا پتہ مما! میں ایبک کو صرف پسند نہیں کرتی، اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اور محبت..... یہ کیا ہے، آپ نہیں

جانتیں۔ میں بھی نہیں جانتی تھی، لیکن اب جان گئی ہوں۔ اس محبت نے مجھے سرتا پا بدل ڈالا ہے۔ میری روح تک کو مہکا دیا ہے اس محبت نے۔ میں دن رات ایبک کو سوچتی ہوں۔ میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ اُس کے ساتھ بِتانا چاہتی ہوں۔ اس میں کسی طاہر یا ہمدان کی گنجائش نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں، میں نے محبت نہیں کی، نارسائی خریدی ہے۔ پھر بھی میں خود کو اس محبت سے باز نہیں رکھ سکتی، جو خودرو پودوں کی طرح میرے دل میں اُگ آئی ہے۔'

وہ سچ مچ اس محبت کے معاملے میں بے بس ہو چکی تھی۔ خود کو بے طرح معروف کر دینے کے باوجود وہ ایبک کا خیال دل سے نکال نہیں سکی تھی۔ پڑھتے ہوئے، تھیسس لکھتے، لائبریری میں بیٹھے ہر وقت اُس کے ذہن میں ایبک کا خیال رہتا تھا۔ ایبک بہت کم الریان آتا تھا۔ لیکن جب آتا تو یہ ایک ملاقات اُسے مہینوں شاد رکھتی تھی اور وقت یوں ہی گزر رہا تھا۔ ہولے ہولے رینگ رینگ کر۔

❁○❁

تین سال بیت گئے تھے۔ پورے تین سال۔ اور یہ ستمبر 2008ء کی صبح تھی۔ ملک ہاؤس کے ایک بیڈروم میں احسان شاہ اور فلک شاہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ فلک شاہ کے ہاتھ میں ''زمین کے آنسو'' کا مسودہ تھا اور دونوں اس کا آخری باب ایک ساتھ پڑھ رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے احسان شاہ نے صفحات اپنی طرف کھینچے اور ہنس پڑے۔

''یاد ہے مومی! جب ہم یو ای ٹی میں تھے تو یوں ہی ایک ہی نوٹ بک سے اکٹھا پڑھا کرتے تھے۔ زیادہ تر نوٹس تو تم ہی تیار کرتے تھے۔''

فلک شاہ مسکرا دیئے۔ ان کا دھیان مسودے کی طرف تھا۔ تین سال پہلے ایبک نے اس ناول کو ادھورا چھوڑ دیا تھا اور اب تین سال بعد انہوں نے بے حد اصرار کر کے اسے مکمل کروایا تھا۔

''یار! پڑھنے دو نا۔'' وہ جھنجلائے۔

''ہاں، ہاں۔ تم پہلے پڑھ لو۔ بعد میں پڑھ لوں گا میں بھی۔'' وہ بالکل ماضی کی طرح رُوٹھے تھے اور فلک شاہ اُن کی ناراضی تو برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ بالکل ماضی کی طرح انہوں نے مسودہ ان کی طرف بڑھایا تھا۔

''لو۔ پہلے تم پڑھ لو شانی!''

''اچھا چلو، دونوں پڑھتے ہیں۔'' احسان شاہ مسکرائے اور اب صفحات احسان شاہ کے گھٹنوں پر تھے اور دونوں پڑھ رہے تھے۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ لیکن الریان کی جگہ ملک ہاؤس تھا۔ سارے تلخ اور اذیت ناک سال دونوں نے اپنی زندگی سے نکال دیئے تھے۔ دونوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کریں گے۔ شروع شروع میں فلک شاہ نے احسان شاہ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ مائرہ کو معاف کر دیں۔ لیکن احسان شاہ نے کہہ دیا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔ یہ ان کا اور مائرہ کا معاملہ ہے۔ وہ اپنا دل اتنا بڑا نہیں کر سکتے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتے لیکن اسے دیکھتے ہیں۔ اسے الریان میں ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتے، لیکن کرتے ہیں۔ اس سے بات نہیں کرنا چاہتے، لیکن دوسروں کے سامنے بات کرتے ہیں۔ اسے سننا نہیں چاہتے، لیکن سنتے ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟ اس سے زیادہ نہیں مومی! بس۔

اور فلک شاہ پھر کبھی کچھ نہ کہہ سکے تھے۔

''تو دارو سائیں مر گیا تھا اور دُور گاؤں سے اُس کے چچیرے اور ممیرے بھائی اُس کی میت لینے آئے تھے۔'' احسان شاہ نے بلند آواز میں پڑھا۔

''دل میں پڑھو یار!''

''اچھا.....!'' احسان شاہ برا سا منہ بنا کر صفحات پر جھک گئے۔

''اب یہ تو غلط تھا نا کہ شریکے اُس کا کفن دفن کرتے۔ عمر بھر کا طعنہ۔ آنے والوں میں مریم کا چھوٹا بھائی چوہدری ایاز

بھی تھا۔ جو اپنے پھوپھی زاد بھائی کی میت لینے والوں کے ساتھ آیا تھا اور اس وقت چوہدری فرید کی حویلی کے بڑے کمرے میں بیٹھا مریم کو روتے دیکھ رہا تھا اور غصے سے بل کھا رہا تھا۔ رقیہ نے اسے سب بتا دیا تھا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

''ماما! رابعہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ اسے بچالیں۔ پھپھو کا بیٹا تو پاگل ہے۔''

چوہدری ایاز پڑھا لکھا تھا اور اپنے بڑے بھائیوں سے مختلف مزاج رکھتا تھا۔ اس نے چوہدری فرید سے بات کی تو وہ بھپر گیا۔

''رابعہ میری بیٹی ہے۔ مجھے اس کا رشتہ کہاں کرنا ہے، اس کے لئے مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے، چوہدری ایاز!''

''تُو اُسے مارنا چاہتا ہے، فریدہ کی طرح۔ میری بہن جس دن سے تیری حویلی میں آئی ہے، اس کی آنکھیں خشک نہیں ہوئیں۔ لیکن اب وہ رابعہ کو نہیں روئے گی چوہدری فرید!''

''تیری بہن، بیٹی کو نہیں روتی۔ دارو کو روتی ہے، اپنے عاشق کو۔ میں نے خود دیکھا ہے، اُسے دارو کے پاس بیٹھ کر روتے۔''

''خبردار! اس سے آگے ایک لفظ مت کہنا چوہدری فرید! ورنہ میرے ہاتھوں سے قتل ہو جاؤ گے۔'' اُس کے لہجے میں کچھ تھا ایسا کہ چوہدری فرید خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن مریم پھٹی پھٹی آنکھوں سے چوہدری فرید کو دیکھتی تھی اور سوچتی تھی، کیا صرف اس تہمت کی کسر رہ گئی تھی؟

وہ دس سال کی تھی تقریباً جب دارو آخری بار پھپھو کے ساتھ گاؤں آیا تھا۔ واپس جا کر پھپھو مر گئی اور اس کے بعد دارا کو اس نے تب دیکھا تھا، جب اس کی گود میں رابعہ تھی اور دارا اس کے گاؤں کی گلیوں میں ننگے پاؤں بھاگتا پھرتا تھا۔ دور گاؤں سے نکل کر جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا وہ یہاں ٹھہر گیا تھا۔

اس روز تو ایاز میت کے ساتھ چلا گیا تھا، لیکن وہ پھر آیا تھا۔ چوہدری فرید ڈیرے پر تھا اور ثریا نے اُس کی مدد کی تھی اور وہ مریم، حورعین، رابعہ اور رقیہ کو لے کر چلا گیا اور ثریا نے چوہدری فرید کو ان کی طرف پلٹنے ہی نہیں دیا۔ اب وہ حویلی کی تنہا مالک تھی اور اس نے چوہدری فرید کی بہن کو بھی قابو میں کر لیا تھا۔ لیکن مریم کے بڑے دونوں بھائیوں اور بھابیوں کو ان کا اپنی حویلی میں رہنا پسند نہیں آیا تھا۔''

حورعین بتا رہی تھی اور وہ چپکے چپکے اُس کے ملیح چہرے کو تکتا تھا۔

''ایاز ماما فاریسٹ آفیسر تھے اور یہاں وادی میں رہتے تھے۔ وہ مریم اور اس کی تینوں بیٹیوں کو ساتھ لے آئے تھے اور مریم بھائی اور بھابی کے ساتھ اس بنگلے میں رہنے لگی تھی جو اُسے ملا ہوا تھا۔ مامی بھی اچھی تھی۔ سب کا خیال رکھتی تھی۔ مریم روتی تو اُس کے آنسو پونچھتی تھی۔

چوہدری ایاز نے رابعہ اور حورعین کو سکول میں داخل کروا دیا تھا اور رقیہ کو گھر پر خود ہی پڑھانے لگا تھا۔ اسے نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنے علاقے کے زمیندارانہ نظام سے نفرت کرتا تھا۔ سو اسے زمینوں سے دلچسپی نہ تھی۔ حورعین نے پہلی بار مریم کو مطمئن اور پُرسکون دیکھا تھا۔ گو اُس کی آنکھیں اب بھی نم رہتی تھیں، لیکن چہرہ پُرسکون ہوتا۔ لیکن پھر سب کچھ اُلٹ پلٹ گیا۔

8 اکتوبر 2005ء کی صبح نے حورعین سے سب کچھ چھین لیا۔ رقیہ، رابعہ، مریم اور چوہدری ایاز کا اکلوتا بیٹا سب ملبے تلے دب گئے۔ حورعین اکیلی رہ گئی۔ مہینوں اُس کے آنسو خشک نہیں ہوئے۔ لیکن پھر ماما، ایاز اور مامی کے بار بار سمجھانے پر اس نے پڑھائی شروع کی اور پڑھ کر وادی کے اسکول میں ہی ٹیچر لگ گئی۔

لیکن حورعین کے آنسو خشک نہیں ہوئے۔ اُس کی آنکھیں لہو روتی ہیں۔ اسے سب یاد آتی ہیں۔ سعدیہ، فریدہ، رقیہ،

رابعہ، مریم۔''

وہ رو رہی تھی اور میری آنکھیں حورعین کے ساتھ آنسو بہا رہی تھیں۔

اس زلزلے نے لاکھوں زندگیوں کے چراغ بجھا دیئے تھے۔ میں کتنی ہی بار مظفر آباد اور دوسرے زلزلہ زدہ علاقوں میں گیا تھا۔ مجھے اپنی ہی لکھی ہوئی ایک نظم یاد آ رہی تھی، جو میں نے اس سانحے کے بعد لکھی تھی۔

''ایک نظم سنو گی حورعین!''

اُس نے سر ہلا دیا تو میں نے اپنی نظم کے کچھ حصے اُسے سنائے۔

''وہ ملبے کے اِک ڈھیر کے پاس
آنکھوں میں آنسو لئے چپ کھڑا سوچتا تھا

وہ پیارا سا بچہ
یہاں میرا کمرہ تھا
یہاں میرے بابا کا اور میری ماما کا
یہیں پر کہیں میری تختی پڑی تھی
اور یہیں پر کہیں میری ماما بھی سوئی ہوئی ہیں
یہیں پر کہیں میری آپا کا کمرہ بھی تھا
میری پیاری سی، اچھی سی آپا
کہاں، کس جگہ ہے
شاید یہاں کہ یہاں
یہ چھوٹی سی گڑیا اُس کی پڑی ہے
میری اچھی آپا، میری پیاری آپا
ملبے کے اس ڈھیر سے ڈھونڈ لو
کوئی ننھا سا رستہ''

احسان شاہ جھرجھری لے کر سیدھے ہو گئے۔ ''کیا قیامت تھی وہ بھی۔ اتنی تباہی و بربادی۔ تین سال گزر گئے، لیکن ابھی تک بحالی کا کام مکمل نہیں ہو سکا۔''

اب وہ اکتوبر 2005ء میں آنے والے زلزلے پر بات کر رہے تھے۔

''یار! یہ پڑھنے دو۔ ابھی ایک آ جائے گا لینے۔ جب تک میں پورا ناول نہیں پڑھوں گا، تبصرہ کیسے لکھوں گا؟''

احسان شاہ نے کچھ صفحات ان کے ہاتھ سے لے لئے۔

''حورعین بتا رہی تھی اور میں کہہ رہا تھا۔

''مت روؤ حورعین! میں نے تمہاری ہنسی کی آواز کبھی نہیں سنی۔ اور تمہارے رونے کی آواز مجھے اذیت دیتی ہے۔ تمہارے رونے سے میرا بدن اور میرا دل تڑخ تڑخ کر ریت کی طرح آہستہ آہستہ مٹی میں ملنے لگتا ہے۔ حورعین! میری تمام اذیتوں میں سے سب سے بڑی اذیت یہ ہے کہ میں تمہارا دکھ کم نہیں کر سکتا۔ لیکن خود دُکھی ہو سکتا ہوں تمہارے لئے۔ اتنا زیادہ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔''

میں نے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اس نے اپنے ہاتھ چھڑائے نہیں۔ بس نم آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

''حورعین!'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میں تمہارے ماموں اور مامی کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں

ہمیشہ کے لئے شریکِ زندگی بنانا چاہتا ہوں حورعین! مجھے تمہاری رفاقت کی بہت شدید تمنا ہے۔ بہت نزدیک سے تمہاری مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری ہنسی سننا چاہتا ہوں۔ تمہارے آنسوؤں کے بدلے تمہیں اپنی محبت دان کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے آنسو مجھے دے دو حورعین!''

حورعین نے اپنے ہاتھ چھڑا لئے اور کھڑی ہو گئی۔

''ایاز ماما نے جاب چھوڑ دی ہے۔ اور ہم آج کراچی جا رہے ہیں۔ تمہارے شہر۔''

''تو؟'' میں اُس کے پیچھے لپکا۔ ''میں کہاں ڈھونڈوں گا تمہیں اس اتنے بڑے شہر میں؟ مجھے اپنا اتا پتا تو دے دو پلیز!''

''میں تمہیں ڈھونڈ لوں گی۔'' اس نے مڑ کر دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے گمان ہوا کہ اُس کی بھیگی آنکھوں میں مسکراہٹ کا جگنو سا چمکا ہو۔

''حورعین! رُکو پلیز۔''

لیکن وہ رُکی نہیں تھی اور میں اُس کے لفظوں کے معنی ہی ڈھونڈتا رہ گیا تھا۔''

''اس کے بعد والے صفحات دو یار۔''

احسان شاہ نے پڑھتے ہوئے صفحات اُنہیں پکڑائے۔ فلک شاہ اوراق اُلٹ پلٹ کر رہے تھے۔

''آخری صفحات تو نہیں ہیں شانی! یہ تمہارے پاس 451 صفحہ ہے۔ اس کے بعد کوئی صفحہ نہیں ہے۔''

''دکھاؤ۔'' احسان شاہ نے مسودہ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور صفحات کے نمبر دیکھنے لگے۔ تب ہی عمارہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

''چائے بھجواؤں؟''

''ضرور۔'' فلک شاہ نے ان کی طرف دیکھا۔ ''اور ذرا ایبک سے کہنا، آخری صفحات نہیں ہیں فائل میں۔''

ایبک بھی اس وقت ملک ہاؤس میں ہی تھا۔ ان بیتے تین سالوں میں کتنی ہی بار عمارہ اور فلک شاہ، ملک ہاؤس آئے تھے اور کتنی ہی بار احسان شاہ بہاول پور گئے تھے۔ فلک شاہ اور عمارہ، ملک ہاؤس میں آتے تو احسان شاہ بھی بابا جان کے ساتھ ادھر منتقل ہو جاتے اور ''الریان'' کی رونقیں ملک ہاؤس میں منتقل ہو جاتیں۔ عمر نے ملک ہاؤس کو 'الریان ثانی'' کا نام دے رکھا تھا۔

احسان شاہ، فلک شاہ کے کمرے میں براجمان رہتے تو عمارہ، بابا جان کے کمرے میں ڈیرہ ڈال لیتیں اور پھر اس سارے عرصہ میں احسان شاہ، فلک شاہ کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتے۔ ان کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے ہمیشہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور ہر بار ہی پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر فلک شاہ جان جاتے کہ اس کی آنکھیں نم ہو رہی ہیں اور وہ ہنس کر کہتے۔

''شانی یار! اب اس معذور کو اسی ٹوٹی پھوٹی حالت میں قبول کر لو۔ کب تک سوگ مناتے رہو گے؟''

احسان شاہ مصنوعی طور پر ناراض ہوتے، خفا ہونے کی دھمکی دیتے۔ لیکن ان کی وہیل چیئر دھکیلتے رہتے اور کچھ دیر بعد ہی ملک ہاؤس اُن کے قہقہوں سے گونج اُٹھتا۔

ایبک ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا برش کر رہا تھا۔ آج اُسے اپنے پبلشر سے ملنا تھا۔ فلک شاہ کے بے حد اصرار پر اُس نے اپنا ناول مکمل کر لیا تھا۔ ورنہ پچھلے تین سال سے وہ عجیب مشینی سی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے لگتا تھا، جیسے وہ انسان سے ایک روبوٹ میں ڈھل گیا ہو۔ صبح، دوپہر، شام کام اور کام۔ اُس نے اپنی زندگی بہت سے خانوں میں بانٹ لی تھی۔ شاید اس طرح وہ اریب فاطمہ کو بھلانا چاہتا تھا۔

لیکن کیا واقعی وہ اریب فاطمہ کو بھلانے میں کامیاب ہو گیا تھا؟...... اس نے بارہا خود سے سوال کیا تھا۔ لیکن ہر بار اسے اس کا جواب نفی میں ملا تھا۔

وہ اریب فاطمہ کو شاید کبھی نہیں بھلا پائے گا۔ کبھی نہیں۔ اُس نے کبھی اریب فاطمہ سے بڑے بڑے ڈائیلاگ نہیں بولے تھے۔ ان کے درمیان بہت کم بات ہوئی تھی۔ لیکن وہ اُس کے دل میں براجمان تھی، روزِ اوّل کی طرح جب وہ چھپ چھپ کر منیبہ کی اوٹ سے اُسے دیکھتی تھی۔ تب ہی وہ چپکے سے اُس کے دل میں اُتر آئی تھی۔

سہمی ہوئی ہرنی جیسی۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا اس کے ساتھ اور کہاں تھی وہ؟ اور کس کے شبستان میں دمکتی تھی؟

اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

وہ قلم اُٹھاتا تو اریب فاطمہ کا چہرہ اُس کے سامنے آ جاتا۔ حورعین کا سراپا اُس نے اریب فاطمہ کو ہی سامنے رکھ کر تراشا تھا۔ پھر رات جاگتے اور سگریٹ پھونکتے گزر جاتی تھی اور سگریٹ پینا اس نے تین سال پہلے ہی تو شروع کیا تھا۔

فلک شاہ چاہتے تھے، وہ اپنا ناول مکمل کر لے اور اُس فیز سے باہر نکل آئے جو اچانک ہی اُس کی زندگی میں آ گیا تھا۔ سو.....

''ایبک!'' عمارہ نے کھلے دروازے سے جھانکا۔ ''تمہارے بابا کہہ رہے ہیں، آخری صفحات نہیں ہیں۔''

''یہ رہے۔'' ایبک نے بیڈ پر پڑے کلپ بورڈ کی طرف دیکھا۔ ''میں ایک نظر دیکھ کر لا رہا ہوں۔''

''میں چائے بنوانے جا رہی تھی۔ تم بھی پیو گے؟''

''یس پلیز۔'' ایبک مسکرایا اور پرفیوم کا اسپرے کر کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے کلپ بورڈ اٹھایا۔ جس میں آخری چند صفحات لگے ہوئے تھے۔ اس نے سرسری سی نظر ڈالی۔

''یہ میرا شہر کراچی ہے۔

میرا شہرِ محبت.....

لیکن اس شہر نے مجھے بہت دُکھ دیئے ہیں۔ زخم زخم ہوں۔ کرچی کرچی ہوں۔''

جانتی ہو، اس میں زندگی کو کتنی سفاکی سے ختم کیا جا رہا ہے؟

موت ارزاں ہے۔

میرے اس شہرِ محبت کو اُجاڑا جا رہا ہے۔

میری آنکھوں میں رو، رو کے زخم ہو گئے ہیں۔

میں جتنا تمہاری جدائی میں، تمہارے بچھڑ جانے کے دُکھ سے رویا ہوں، اس سے کہیں زیادہ اس شہر کے لئے رویا ہوں۔

یہ شہر، جس کی گود ماں کی طرح مہربان تھی۔

اور جس نے ہر زبان بولنے والے کو ایک ماں کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا۔

اب یہاں گولیاں چلتی ہیں حورعین!

بوری بند لاشیں ملتی ہیں۔

اس نے آنسوؤں کی سوداگری کر لی ہے۔ اور اب آنسو بیچتا اور خریدتا ہے۔

گلیاں، چوک، راستے لاشوں سے بھر جاتے ہیں۔

لوگ لاشیں اُٹھاتے اُٹھاتے تھک گئے ہیں۔

میرے ملک کے سارے شہروں میں آنسوؤں کی برسات ہوتی ہے۔ خون کی ندیاں بہتی ہیں اور لاشوں کی فصل اُٹھائی جاتی ہے۔ یہ آج کی تاریخ ہے۔

میرے بلوچستان کی۔

میرے سرحد اور پنجاب کی۔

میرے سندھ اور کراچی کی۔

تم تاریخ کے المیوں پر روتی ہو۔ ماضی کے المیے۔ مجھے آج کی تاریخ رُلاتی ہے۔ حورعین! ہماری تاریخ کی جھولی میں اتنے آنسو، اتنے المیے کہاں سے آ گئے؟ کیسے آ گئے؟...... کبھی اس پر ضرور سوچنا۔ اور کچھ جان پاؤ تو مجھے بھی بتانا۔ میں تو تمہارے لئے ہنسی خریدنے نکلا تھا حورعین! میری جھولی آنسوؤں سے بھری ہوئی ہے اور میں آنسو بیچتا پھرتا ہوں۔ میرے شہر میں اب لہو کا کاروبار ہوتا ہے۔''

آج میں کہہ رہا تھا اور حورعین سن رہی تھی۔ اس نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا۔

''تم نے مجھے اتنی دیر سے کیوں ڈھونڈا حورعین؟'' میں نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غم پھیلتا جا رہا تھا۔ آج اس نے سفید اوڑھنی لے رکھی تھی۔

سیاہ اور سفید دونوں ہی رنگ اُس پر سجتے تھے۔

''میرا خیال تھا کہ تم اتنے نامور شاعر ہو۔ جس کسی سے پوچھوں گی، تمہارا پتہ مل جائے گا۔ لیکن تمہیں ڈھونڈنے میں اتنا وقت لگ گیا۔''

''ہاں حورعین! لوگ اب ادیبوں اور شاعروں کو نہیں جانتے۔ ان سے تو دھماکوں، گولیوں اور بموں کا پوچھو۔ کس شہر میں کتنے دھماکے، کتنے ڈرون حملے ہوئے، کتنے لوگ مرے، لوگوں نے ایک دن میں کتنی لاشیں اُٹھائیں، وزیرستان میں ہونے والے ڈرون حملوں میں کتنے بے گناہ مارے گئے۔ وہاں کے لوگ تو اب ان بے گناہوں کی لاشیں اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے ہیں۔''

''ہاں، تم صحیح کہتے ہو۔ لوگوں کو آنسو بہت پسند آ گئے ہیں۔ وہ صرف آنسوؤں کا کاروبار کرنے لگے ہیں۔'' حورعین کے آنسو اُس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

''تم نے کہا حورعین! ہرمیاہ نبی نے یروشلم کا مرثیہ لکھا تھا۔ عراق و ڈھاکہ کے مرثیے کون لکھے گا؟ اب میں تم سے پوچھتا ہوں، میرے شہروں کی سڑکوں پر بے گناہ مرنے والوں کے مرثیے کون لکھے گا؟ ان بچوں کے، جن کے ابھی کھیلنے کے دن تھے۔ اُن جوانوں کے، جنہوں نے بوڑھوں کا سہارا بننا تھا۔''

میں نے اپنے ٹیبل پر پڑے اخبار کی طرف دیکھا، جسے حورعین کے آنے سے پہلے میں پڑھ رہا تھا۔ پہلے صفحے پر اس کی تصویر تھی۔ اس بچے کی، جو گھر سے شاید کچھ لینے نکلا تھا۔ اب سڑک پر اوندھا پڑا تھا اور اس کے ایک ہاتھ کی بند مٹھی میں شاید پیسے تھے اور زمین پر چند ٹافیاں پڑی تھیں اور زمین اُس کے خون سے رنگین ہو رہی تھی۔

''آہ......'' میرے لبوں سے نکلا۔ لوریاں سننے والا، لہو کی گلابی رِدا اوڑھ کر سو گیا۔ غضب کا نشانہ ضروری نہیں۔

اور وہ جو کچے گھروندے کا ماہ پارہ تھا۔ شب کا مقدر لکھا جا چکا تھا۔

''ایبک!...... ایبک بیٹا! چائے بن گئی ہے۔ آ جاؤ۔'' عمارہ نے باہر سے آواز دی تو وہ کاغذ سمیٹ کر باہر آ گیا۔ عمارہ خود ہی چائے لئے فلک شاہ کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

''یار! ناول تو تمہارا اچھا ہی ہے۔'' اُسے کمرے میں آتے دیکھ کر احسان شاہ مسکرائے تھے اور اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

''پتہ نہیں، اب اسے پذیرائی ملے گی یا نہیں، جو پہلے ناولوں کو ملی تھی۔ میں نے اس میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔''

''بھئی...... مجھے تو بہت پسند آیا۔ یہ بتاؤ، تم اپنی حورعین سے کب ملوا رہے ہو؟''

اور ایبک کے مسکراتے لب بھنچ گئے۔ اندر دل میں درد کی ایک لہر سی اُٹھی تھی۔

''تم اور ہمدان اب قسم توڑ دو۔ تاکہ بے چارے زبیر کی باری آئے۔''

''آپ زبیر کو انتظار کیوں کرواتے ہیں ماموں جان! میرا اور ہمدان کا کیا پتہ، بس اچانک ہی دھماکہ کریں گے۔'' ایبک زبردستی مسکرایا۔

فلک شاہ نے اس کی آنکھوں میں تیرتے درد کو محسوس کیا اور احسان شاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے موضوع تبدیل کیا۔

''بابا جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے شانی! ابھی تک نظر نہیں آئے؟''

''وہ صبح صبح الریان چلے گئے تھے۔ مصطفیٰ بھائی کے ساتھ کہیں جانا تھا اُنہیں۔'' عمارہ نے چائے بناتے ہوئے جواب دیا اور چائے کا کپ اُن کی طرف بڑھایا۔

''عمو! تم آج بھی چائے بہت اچھی بناتی ہو۔'' شانی نے چائے کا گھونٹ بھرا اور محبت سے اُنہیں دیکھا۔ جبکہ فلک شاہ بغور ایبک کو دیکھ رہے تھے اور اس کے دل میں کروٹیں لیتے درد کو محسوس کر رہے تھے جو چھپانے کے باوجود اس کی آنکھوں سے جھلکتا تھا۔

'یا اللہ! میرے بیٹے کی نارسائی ختم کر دے۔ کیا تھا، اگر اریب فاطمہ اس کی زندگی میں شامل ہو جاتی اور.....'

ایک گہری سانس لے کر وہ چائے پینے لگے۔ انہوں نے اپنے طور پر کسی کو بتائے بغیر مروہ پھپھو کے ذریعے کوشش کی تھی کہ بات بن جائے، لیکن مروہ پھپھو نے جانے سے پہلے انہیں بتایا تھا کہ چند روز بعد اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اور اس صورت میں ان کا یا عمارہ کا وہاں جانا اریب فاطمہ کی آئندہ زندگی کے لئے مسئلہ بن سکتا ہے۔ انہیں اریب فاطمہ اپنی بیٹی کی طرح عزیز تھی۔ انہیں سائرہ بھی عزیز تھی۔ اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اریب فاطمہ کی زندگی بھی اپنی ماں کی طرح گزرے۔ سر جھکائے۔ وہ چاہتی تھیں کہ اریب فاطمہ اپنے سسرال میں سر اُٹھا کر اس طرح زندگی گزارے کہ ماضی کا کوئی حوالہ اس کے ساتھ نہ ہو۔ بار بار وہاں جانے اور منتیں کرنے سے ان لوگوں کو شک ہو سکتا ہے۔

یہ بات انہوں نے فلک شاہ کو ہی نہیں، ایبک کو بھی سمجھائی تھی۔

''اس کا باپ اور بھائی بڑے اکھڑ ہیں اور اس کے ددھیال والے بھی۔ اگر تمہیں اریب فاطمہ کا ذرا سا بھی خیال ہے تو تم ایسا کچھ نہیں کرو گے، جس سے اس کی زندگی خراب ہو۔''

اور فلک شاہ نے ہی نہیں، ایبک نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی۔

'محبت صرف پا لینے کا نام نہیں ہے۔' ایبک نے خود کو سمجھایا تھا۔

'اور محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔'

یہ اُس نے ان تین سالوں میں جان لیا تھا۔ خود کو بے طرح مصروف کر لینے کے باوجود اریب فاطمہ اس کے دل میں روزِ اوّل کی طرح موجود تھی۔ ان تین سالوں میں اس کا نام ایک بے باک صحافی کے طور پر جانا جانے لگا تھا۔ وہ ایک چینل پر سیاسی تبصرے بھی کرنے لگا تھا۔ گو ''وطن دوست'' ایک فلاحی تنظیم تھی۔ لیکن وہ خود کو سیاست سے دُور نہیں رکھ پا رہا تھا۔ شاید کوئی بھی محب وطن شخص خود کو ان حالات میں دُور نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب تین سالوں میں کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔

چیف جسٹس کا معطل ہونا۔

لال مسجد کا خونی واقعہ۔

پوپ بینڈکٹ کی گستاخی اور معذرت۔

نواز شریف کی واپسی۔

سمجھوتا ٹرین بم بلاسٹ۔

بلوچستان کے حالات۔

فاٹا میں دہشت گردی کی خود ساختہ جنگ۔

بے نظیر کی واپسی پر سینکڑوں افراد کی ہلاکت۔

نارتھ وزیرستان میں سینکڑوں افراد کی اموات۔

ملک میں ایمرجنسی کا نفاذ۔
بے نظیر کی شہادت۔
اور پھر مشرف سے چھٹکارا اور پی پی کی حکومت۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو زرداری نے صدارت کا حلف اٹھایا تھا۔
2005ء سے 2008ء تک کے اوراق آنسوؤں اور خون سے بھیگے ہوئے تھے۔ اور ابھی نہ جانے کتنے آنسو برسنا تھے اور کتنا خون بہنا تھا۔ وہ سیاسی پروگرام کرتا تو اُس کی آواز بھیگ جاتی تھی۔ اُس نے اس وطن کو بنتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ وطن اور آزادی کی اہمیت جانتا تھا۔ دن بھر مصروف رہنے کے بعد جب وہ رات کو بیڈ پر لیٹتا تو اریب فاطمہ کا خیال بے چین کر دیتا۔
'پتہ نہیں کہاں ہوگی، کس حال میں؟'
یہ خیال آتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔
'تم کیا جانو اریب فاطمہ! ایبک فلک شاہ نے کسی کی اتنی چاہ نہیں کی اور کبھی اتنا تڑپ کر کسی کا ساتھ نہیں چاہا، جتنا تمہارا۔ میں بابا اور ماما کی منتظر سوالیہ نظروں سے ہر روز نظر چرا لیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، وہ کیا چاہتے ہیں۔ لیکن اریب فاطمہ! پتہ نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے اگر میں نے تمہارے تصور سے منہ موڑا تو یہ بہت بڑی بد دیانتی ہوگی۔ دغا بازی۔ تم نے کہا تھا نا اریب فاطمہ! کسی کو دل میں بسا کر کیسے کسی اور کے ساتھ زندگی بسر کی جا سکتی ہے؟ تو میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اور کیا تم نے ایسا کر لیا ہے اریب فاطمہ؟'
وہ اکثر راتوں کو سو نہ پاتا تھا۔
''ایبک! تمہارا کیا خیال ہے، میریٹ ہوٹل میں بم بلاسٹ کرنے والے کون لوگ تھے؟'' فلک شاہ نے خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا تو ایبک نے چونک کر اُنہیں دیکھا اور ٹھنڈی چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اُتار کر خالی کپ ٹیبل پر رکھا۔
''آپ نے ایک بار کہا تھا بابا! وہ ہماری خامیوں اور غلطیوں کے سوراخوں سے چیونٹیوں کی طرح اندر در آئے ہیں اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہر گزرتا دن اُن کی تعداد میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ یہاں وہاں ہر جگہ اُن کا عمل دخل بڑھ گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے بابا! جیسے اس وقت ہم اس دنیا کا سب سے بے بس ملک اور سب سے بے بس قوم ہیں جس کی ڈوریاں اس کے سیاست دانوں اور لیڈروں کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ خود کسی اور کی ڈگڈگی پر ناچ رہے ہیں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے جانا ہے بابا! پبلشر سے ملنا ہے۔ شام کو ملاقات ہوتی ہے۔''
''اللہ حافظ بیٹا!''
عمارہ، احسان شاہ اور فلک شاہ نے باری باری اُس کی پیشانی چوم کر اُسے رخصت کیا۔ وہ لاؤنج سے گاڑی کی چابیاں لیتا ہوا باہر نکل گیا۔
اور ہر بار کی طرح اس بار بھی ایبک فلک شاہ سے ملتے ہوئے احسان شاہ کو رابیل کا خیال آیا تھا اور ہر بار کی طرح بہت دُکھی دل سے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مائرہ ایسا کبھی نہیں چاہے گی۔ وہ اپنی پُرسکون زندگی میں کسی طرح کا طوفان نہیں چاہتے تھے۔ ان تین سالوں میں مائرہ کے ساتھ ان کا رویہ ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دُور ہیں۔ ان تین سالوں میں ایک بار بھی مائرہ کی آنکھوں میں اپنے کئے پر ندامت نظر نہیں آئی تھی۔ ایک بار بھی اُس نے پچھتاوے کا اظہار نہیں کیا تھا۔
اور انہوں نے اس عورت سے محبت کی تھی، جس نے کبھی ان سے محبت نہیں کی تھی۔ کیسی عورت تھی وہ۔ منتقم مزاج، ظالم۔ اور اس نے اپنی اس فطرت کی وجہ سے اپنے گھر کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ اگر عمر، زبیر اور رابیل کا خیال بار بار اُن کا دامن نہ پکڑتا تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اسے اپنے گھر میں برداشت نہ کرتے۔

نا رسائی بہت سے لوگوں کا مقدر بنتی ہے۔ وہ اپنی محبت کو نہیں پا سکتے۔ لیکن وہ مائرہ کی طرح نہیں کرتے۔ شاید مائرہ نے فلک شاہ سے بھی محبت نہیں کی تھی۔ اسے صرف اپنی ذات سے محبت تھی، بس۔

کبھی کبھی وہ بے حد دُکھی ہو جاتے تو بیگ میں کپڑے رکھتے اور بہاول پور چلے جاتے یا پھر فلک شاہ کو فون کرتے۔

''مومی! میری طبیعت خراب ہے۔ آ جاؤ۔ میں نہیں آ سکتا۔''

کبھی بابا جان کا بہانہ بناتے۔

''وہ بہت یاد کر رہے ہیں مومی! عمو کو لے کر آ جاؤ۔ زندگی کا کیا بھروسہ؟''

''تمہیں بہت ڈرامے کرنے آ گئے ہیں شانی!'' فلک شاہ ہنسے۔

''کیا سوچنے لگے ہو شانی؟'' فلک شاہ نے بغور اُنہیں دیکھا۔

''آ..... ہاں کچھ نہیں۔'' احسان شاہ چونکے۔

احسان شاہ کیا سوچتے تھے، فلک شاہ نہیں جانتے تھے۔ لیکن ان کے دل میں بارہا خیال آیا تھا۔ اگر اریب فاطمہ نہ ہوتی تو ایبک اور رابیل......

رابیل کی آنکھوں میں ایبک کے لئے جو جذبہ نظر آیا تھا، ایبک اُس سے بے خبر تھا؟ لیکن انہوں نے جان لیا تھا کہ رابیل کے دل میں کیا ہے۔

اگر ایبک، اریب فاطمہ سے محبت نہ کرتا ہوتا تو وہ رابیل کو اس کے لئے مانگ لیتے، ہر بات فراموش کر کے۔ اُنہیں رابیل کی آنکھوں کی اُداسی اور خاموشی سے دُکھ ہوتا تھا۔

''یار! یہ آخری صفحات تو دو۔ ایبک کے ناول کا انجام پڑھ لوں۔''

احسان شاہ نے بیٹھتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھائے تو فلک شاہ نے صفحات ان کی طرف بڑھا دیئے۔ عمارہ نے چائے کے خالی برتن سمیٹے اور باہر نکل گئیں۔

''شانی! اونچا اونچا پڑھو۔ میں بھی سن لوں۔'' فلک شاہ نے تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور احسان شاہ پڑھنے لگے۔

❁○❁

اپنے مخصوص انداز میں رابیل دونوں بازو گھٹنوں کے گرد حمائل کئے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے نہ جانے کن سوچوں میں گم اپنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی جب مائرہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

''رابی!'' انہوں نے رابیل کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ اپنی کیا حالت بنا لی ہے تم نے؟ ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ باہر نکلو، ہنسا بولا کرو۔ مونی نے اپنے بیٹے کی تصاویر بھیجی ہیں۔ سب مرینہ کے کمرے میں بیٹھے تصویریں دیکھ رہے ہیں۔''

''اچھا!'' اس نے خالی خالی نظروں سے مائرہ کی طرف دیکھا۔

تین سال گزر گئے تھے۔ مونی بیاہ کر کینیڈا چلی گئی تھی اور اب اُس کا بیٹا بھی پیدا ہو گیا تھا اور وہ جو مونی سے عمر میں بڑی تھی۔

''دیکھ لوں گی ماما! جب نیچے جاؤں گی تو...... ابھی تو میں سوچ رہی تھی کہ......''

''کیا سوچ رہی تھیں؟'' مائرہ پاس ہی بیٹھ گئی تھیں۔

''مما! وہ..... میں...... مجھے اسکالرشپ مل رہا ہے، پی ایچ ڈی کے لئے...... امریکہ میں۔ سوچ رہی ہوں کہ ایکسپٹ کرلوں۔ میرے پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے کہ مجھے......''

''تم نے ایم فل کر لیا۔ ٹھیک۔ اب مجھے اور مت ستاؤ۔ روبی کے بیٹے کی شادی ہو گئی ہے۔ لیکن طاہر کے لئے بھابی اب بھی خواہش مند ہیں۔ ہمدان نے بھی ابھی تک شادی نہیں کی۔ ایک دو رشتے اور بھی ہیں۔ تم ہامی بھرو تو۔''

''مما! آپ جانتی ہیں کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔''
''رابی! کیوں سزا دے رہی ہو خود کو اور مجھے؟.....ضد چھوڑ دو۔''
مائرہ اُس کی ضد سے تھکنے لگی تھیں۔
''میں کسی کو سزا نہیں دے رہی مما! بس مجھے شادی نہیں کرنی۔''
''عثمان بھائی اور تمہارے پاپا، مرینہ اور زبیر کی شادی کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ مرینہ ڈاکٹر بن گئی۔ زبیر کی تعلیم ختم ہو گئی۔''
''تو کر دیں۔''
''بڑی ہو تم زبیر سے۔''
''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، جب مجھے شادی ہی نہیں کرنا۔''
''ایبک سے بھی نہیں؟'' مائرہ کے لبوں پر بجھی بجھی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ تین سال سے رابیل کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ وہ رابیل نہیں تھی۔ شوخ و شنگ، تنک مزاج۔ یہ اس سے بالکل مختلف رابیل تھی۔ سنجیدہ اور خاموش طبع۔
'کیا وہ اتنی شدید محبت کرتی ہے ایبک سے؟' وہ اُسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔ جبکہ رابیل کی حیران نظریں مائرہ کے چہرے پر تھیں۔
''آپ کیا کہہ رہی ہیں مما؟''
''میں کہہ رہی تھی، کیا ایبک سے بھی شادی نہیں کرو گی؟''
''مذاق مت کریں مما!'' وہ افسردہ ہوئی۔
''میں مذاق نہیں کر رہی رابی! لیکن میں تمہارے سامنے ہار گئی ہوں۔ تم میری بیٹی ہو، میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتی۔ میں بابا جان سے بات کرتی ہوں کہ وہ عمارہ اور موی سے بات کریں۔ میرا عمارہ اور فلک شاہ کے ساتھ کتنا بھی اختلاف کیوں نہ ہو، وہ بابا جان کی بات نہیں ٹالیں گے۔''
''نہیں مما! پلیز۔ بابا جان سے کچھ مت کہیں۔ میں نے کہا نا، مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی۔ بس مجھے پاپا سے باہر جانے کی اجازت دلوا دیں۔ پتہ ہے، سر کہہ رہے تھے میں بہت لکی ہوں کہ مجھے یہ اسکالرشپ ملا۔ مجھے اسے ضائع نہیں کرنا چاہئے۔''
''پاگل ہو تم رابی! ایسے زندگی نہیں گزرتی۔''
''جب زندگی نہ گزری تو کر لوں گی۔ لیکن ابھی نہیں ماما!''
''تم نے کہا تھا، تم ایبک کو پسند کرتی ہو تو اب تمہیں ایبک سے شادی کرنے میں کیا اعتراض ہے؟''
''میں نے آپ کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔''
''کیا وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے؟''
''ہاں!''
''پھر اس نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک؟ تمہارا وہم ہے۔ اگر وہ کسی کو پسند کرتا تو اب تک شادی کر چکا ہوتا۔''
''اس نے شادی نہیں کی تھی ابھی تک۔ لیکن کبھی اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا بھی تو نہیں تھا اس نے۔'' اس نے افسردگی سے سوچا۔
ان تین سالوں میں وہ جب جب ''الریان'' آیا، اس کے دل نے خواہش کی کہ وہ اس کے سامنے بیٹھ کر باتیں کرے ہر موضوع پر ایسے ہی، جیسے وہ مرینہ اور حفصہ سے کرتا تھا۔ لیکن اس نے سوائے رسمی سلام دعا کے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ آنکھوں میں حسرت لئے ملتجی نظروں سے اسے دیکھتی تو وہ نظر چرا لیتا۔

کیا وہ اُس کی نظروں کی التجا سمجھتا تھا اور اسے نظرانداز کرتا تھا؟...... اس روز وہ دیر تک سر ریاض کے ساتھ اپنے تھیسس کے سلسلے میں کام کرتی رہی تھی۔ یاسین کو اس نے گھر بھیج دیا تھا کہ اسے دیر ہو جائے گی اور وہ اپنی فرینڈ کے ساتھ گھر آ جائے گی۔ جو اس کے ساتھ ہی سر ریاض کے ماتحت ایم فل کر رہی تھی۔ ماما کو کہیں جانا تھا، اس لئے اس نے فون کر کے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ یاسین کو واپس بھیج رہی ہے، وہ چلی جائیں۔ وہ کام ختم کر کے باہر نکلی تھی۔ دونوں روڈ کے کنارے کھڑی انتظار کر رہی تھیں۔ ابھی فرینڈ کی گاڑی نہیں آئی تھی، ایبک کی گاڑی قریب آ کر رکی۔

''رابیل! کیا گاڑی نہیں آئی گھر سے؟...... کیسے جانا ہے؟''

''میری دوست مجھے ڈراپ کر دے گی۔''

''میں ''الریان'' جا رہا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو آ جائیں۔''

اور وہ خاموشی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

''آپ کی مما کو شاید اعتراض ہو۔ لیکن اس وقت مجھے مناسب نہیں لگا کہ آپ یہاں کھڑے ہو کر انتظار کریں۔ میں کارنر پر آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔''

اور ٹپ ٹپ آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

''آپ مما کی بات کو ابھی تک دل میں رکھے ہوئے ہیں۔''

''کیا ہوا رابیل؟..... پلیز روؤ نہیں۔ میں نے احتیاطاً بات کی تھی کہ مائرہ آنٹی کو اعتراض نہ ہو۔ اپنے لئے نہیں، صرف آپ کے لئے ڈر رہا تھا۔ پلیز روئیں مت۔ میں نے تو سنا تھا کہ آپ دوسروں کو رُلا دیتی ہیں...... جبکہ آپ......''

وہ مسکرایا تھا۔ رابیل نے ایک شاکی سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

''غلط سنا تھا آپ نے۔''

''آپ کے برادرِ خورد نے ہی بتایا تھا۔''

''سنی سنائی پر اعتبار نہیں کرتے۔ آنکھوں دیکھے پر یقین کرتے ہیں۔''

''کبھی کبھی آنکھوں دیکھا بھی دھوکا ہوتا ہے رابیل بی بی!'' ایبک یک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' اُس نے سوچا تھا پھر ایسا موقع نہیں ملے گا۔

''پوچھ لیں۔''

''آپ شادی کیوں نہیں کر رہے ہیں؟''

''یہ بات میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کیوں نہیں شادی کرنا چاہتیں؟...... رینا نے بتایا تھا مجھے، آپ نے منع کر دیا۔''

''میں.....'' اُس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں لیکن اس نے ایبک کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پھر سوال کر دیا تھا۔

''کیا آپ کسی سے محبت کرتے ہیں؟''

''ہاں!'' ایبک لمحہ سوچنے کے بعد ایبک نے کہا تھا۔ وہ رابیل کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا بالکل۔ اُس کی نظریں سامنے تھیں اور ہاتھ اسٹیئرنگ پر سختی سے جمے تھے۔

''اریب فاطمہ سے؟'' رابیل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ایبک نے چونک کر اسے دیکھا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ جو کوئی بھی ہے، اُس کی محبت میرے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ میں اس محبت کے ساتھ خیانت نہیں کر سکتا۔ اس لئے میری زندگی میں کسی اور کی گنجائش نہیں ہے۔''

اور رابیل احسان شاہ کو لگا تھا کہ جیسے ایبک فلک شاہ نے اس کی آنکھوں میں چھپے جذبوں کی تحریر پڑھ لی ہے، اس لئے اسے بتا رہا ہے کہ اس کے دل میں کوئی اور بستا ہے اور وہاں کسی اور کی گنجائش نہیں۔ مائرہ، رابیل کی طرف بغور دیکھ

رہی تھیں۔ ان تین سالوں میں اس کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔
اور یہ ایبک کی وجہ سے تھا۔
پہلے فلک شاہ اور اب ایبک۔
کئی بار مائرہ نے سوچا تھا کہ اگر رابیل، ایبک کو پسند کرتی ہے تو پھر بابا جان سے کہہ کر یہ شادی کروا دیں۔ لیکن پھر نفرت ہر جذبے پر غالب آ جاتی تھی۔ مگر آج ایک بار پھر بیٹی کی محبت، نفرت پر غالب آ گئی تھی اور وہ سوچ رہی تھیں کہ انہیں اپنی محبت نہیں ملی تھی، لیکن رابی کو اس کی محبت ضرور ملنی چاہئے۔ ان کی بیٹی ان کی طرح نارسا نہیں رہے گی۔ وہ ضرور بابا جان سے بات کریں گی۔
''رابی! میں بابا جان سے آج ہی بات کروں گی۔ تم پریشان مت ہو۔''
''ماما پلیز! اس موضوع کو ختم کر دیں۔ وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ اتنی شدید محبت کہ کوئی دوسری لڑکی اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسے اپنی محبت ملے یا نہ ملے، لیکن اس کے دل میں موجود محبت اسی طرح رہے گی۔ وہ بابا جان کی بات نہیں مانے گا۔ چلیں مونی کے بیٹے کی تصویریں دیکھ آئیں۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
اُس روز اُس نے جان لیا تھا کہ ایبک فلک شاہ، اریب فاطمہ سے محبت کرتا ہے۔ ایسی محبت، جو جلا کر راکھ کر دے، لیکن ختم نہ ہو۔
''کیسے نہیں مانے گا بابا جان کی بات۔'' مائرہ کی آواز میں غصہ اور ناراضی تھی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ ہر صورت میں بابا جان کے ذریعے یہ شادی کروائیں گی۔ اور دیکھتی ہیں، فلک شاہ اور عمارہ کیسے انکار کرتے ہیں بابا جان کو۔ اُن کی بیٹی نامراد نہیں رہے گی ان کی طرح۔ اور وہ رابیل کے ذریعے انتقام لیں گی اب فلک شاہ سے ان کا بیٹا چھین کر۔ ایک بار ایبک اور رابیل کی شادی ہو جائے، تب وہ رابی کے ذریعے موی سے اس کا بیٹا چھین لیں گی۔ حیرت ہے، انہیں یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا؟
اور رابیل سوچ رہی تھی، وہ آج احسان شاہ سے اپنے اسکالرشپ کی بات ضرور کرے گی۔
دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم سیڑھیاں اُتر رہی تھیں۔

❁○❁

اپنے کمرے میں اریب فاطمہ آنکھیں موندے لیٹی تھی اور باہر صحن میں سائرہ بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھیں۔ باپ بیٹوں میں فیصلہ ہو گیا تھا۔ شیخ کی واپسی جانے کب ہو۔ ہو بھی یا نہیں۔ ارباب حیدر نے انہیں یقین دلایا تھا۔
''بہتر ہے کہ آپ اپنی بیٹی کی شادی کر دیں اور یہ بات شیخ نے خود کہی ہے مجھ سے فون پر۔''
اسفند اور عظمت مایوس تو ہوئے تھے، لیکن انہوں نے باپ سے کہہ دیا تھا۔ ''ٹھیک ہے۔ آپ اریب کی شادی پھپھو کے بیٹے سے کر دیں۔''
اور جب وہ چک 151 میں آنے کی تیاری کر رہے تھے تو ارباب حیدر نے اپنا پروپوزل دے دیا تھا۔ اسفند اور عظمت خوش ہو گئے تھے اور انہوں نے باپ کو بھی قائل کر لیا تھا۔ اب گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اور وہ لوگ شادی کے سلسلے میں گاؤں آئے ہوئے تھے۔
اریب فاطمہ سارا دن اپنے کمرے میں لیٹی رہتی تھی۔ اُس کی روئی روئی آنکھیں سائرہ کو تڑپاتی تھیں۔ وہ بے بس تھیں، لیکن اریب فاطمہ نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ فیصلہ کر کے اُٹھی اور باہر صحن میں آ کر تخت پر بیٹھ گئی۔ سائرہ بھی ٹہلتے ٹہلتے تھک کر تخت پر بیٹھ چکی تھیں۔
''اماں! اللہ کے لئے ابا کو منع کر دیں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔'' اریب فاطمہ نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔ سائرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ان تین سالوں میں کتنی بجھ گئی تھی۔

''کسی سے بھی نہیں۔ آپ ابا کو منع کر دیں۔ میں آپ کی طرح بہادر نہیں ہوں۔ اور میں آپ کی طرح کی زندگی نہیں جی سکتی۔''

''میری طرح کی زندگی؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔

''میں نے کب گلہ کیا اپنی زندگی سے فاطمہ! ٹھیک ہی تو ہے۔''

''آپ نے گلہ نہیں کیا اماں! لیکن آپ نے پورے من سے زندگی کو جیا بھی نہیں اور میں پورے من سے زندگی جینا چاہتی ہوں۔ ٹھیک ہے اماں! میں نے تسلیم کر لیا۔ مان لیا کہ میری زندگی کی کتاب میں اس کا ساتھ مقدر نہیں ہے۔ لیکن میں کسی اور کی ہمراہی میں بھی یہ سفر کاٹنا نہیں چاہتی۔'' وہ رونے لگی۔

''اماں پلیز! مجھے خود سے جدا نہ کریں۔ مجھے اپنے پاس رہنے دیں ہمیشہ۔''

سائرہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''میں نے کبھی ان تین سالوں میں آپ سے گلہ نہیں کیا، کبھی ضد نہیں کی۔ میں نے ہر وہ راستہ بند کر دیا جو ایبک کی طرف جاتا تھا تاکہ آپ کو مائرہ آنٹی کے سامنے شرمندگی نہ ہو۔ میں اب بھی گلہ نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔ لیکن آپ مجھے کسی اور کے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کریں۔ آپ نے محبت نہیں کی تھی اماں! پھر بھی پورے من کے ساتھ جی نہیں سکیں۔ میں نے تو محبت کی ہے اماں! میں تو مر جاؤں گی۔ مجھے اس کانٹوں بھرے راستے پر چلنے پر مجبور نہ کریں۔''

اُس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔ سائرہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

یہ عثمان شاہ اور یہ اریب فاطمہ دونوں نے کیسے جان لیا تھا کہ انہوں نے زندگی پورے من کے ساتھ نہیں جی؟...... عثمان شاہ نے بھی کہا تھا کہ وہ دُکھ اُن کی پوری زندگی پر محیط ہو کر اُن کی زندگی کی خوشیاں کھا گیا۔ تو کیا انہوں نے زندگی کو پورے من کے ساتھ نہیں جیا؟...... وہ ایک شخص جو محض چند لمحوں کے لئے ان کی زندگی میں آیا تھا۔ جبکہ ایبک اور اریب فاطمہ۔

انہوں نے پھر روتی ہوئی اریب فاطمہ کو دیکھا۔

انہوں نے تو زندگی آدھے من کے ساتھ جی لی تھی۔ اور اریب فاطمہ۔ وہ کہہ رہی تھی، وہ مر جائے گی۔

اریب فاطمہ ملتجی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

''ارباب حیدر اچھا آدمی ہے۔ زیادہ عمر کا بھی نہیں ہے۔ تم خوش رہو گی۔'' ان کے لہجے میں بے یقینی تھی اور وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''مجھے زندگی سے اب کسی خوشی کی چاہ نہیں ہے۔ اماں! پلیز آپ منع کر دیں ابا کو کسی بھی طرح۔ آپ نے ابا کو منا لیا تو اسفند یا عظمت کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

سائرہ بغیر کچھ کہے اُٹھ کر کمرے میں چلی گئیں اور اریب فاطمہ یونہی تخت پر بیٹھی آنسو بہاتی رہی اور وہ کمرے میں پرانی ڈائری سے مروہ کا نمبر تلاش کر رہی تھیں۔ تین سال پہلے انہوں نے مروہ سے درخواست کی تھی کہ وہ ایبک کو ادھر آنے سے روکیں گی۔ وہ انہیں اور اریب فاطمہ کو بے بھرم ہونے سے بچا لیں گی۔ مروہ نے ہمیشہ ان کا مان رکھا تھا اور ڈائری میں اس کا نمبر ڈھونڈتے ہوئے اب بھی انہیں یقین تھا کہ وہ ان کا مان رکھیں گی۔

❀○❀

احمد رضا لاؤنج میں ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا اور ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں۔ خبروں کے بعد میریٹ ہوٹل میں ہونے والے بم بلاسٹ پر تبصرہ ہونے لگا تو اس نے ٹی وی آف کر دیا۔

'شاید ہمارے میڈیا جتنا غیر ذمہ دار میڈیا کسی ملک کا نہیں ہے۔ کیا دکھانا ہے، کیا نہیں دکھانا؟ کون سی خبر ملکی سالمیت کے لئے نقصان دہ ہے اور کون سی فائدہ مند؟ کسے اچھالنا ہے، کسے ہلکا پھلکا لینا ہے، کسے چھپانا ہے؟ ہر بات سے بے خبر۔'

اُس نے سر جھٹک کر میز پر پڑا اخبار اٹھا لیا۔

''تو تم صبح لاہور جا رہے ہو، ایک بار پھر؟'' ارباب حیدر نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ اس کے قدموں میں ہلکی لڑکھڑاہٹ تھی اور آنکھوں میں سرخی۔ غالباً اس نے بہت پی رکھی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''غالباً تین سال بعد۔'' احمد رضا نے سر ہلایا۔ تین سال پہلے جب وہ جنید کے ساتھ اس کے گھر اور پھر وہاں سے رحیم یار خان آیا تھا تو نہیں جانتا تھا کہ اگلے تین سال تک اس کے قدم یہاں کی سڑکوں کو نہیں چھوئیں گے۔ اور وہاں کے مناظر اس کے لئے اجنبی ہو جائیں گے۔

کئی دن تک اخبارات میں اس کے متعلق کالم چھپتے رہے تھے۔ کسی نے اسے احمد رضا کہا اور کسی نے احمد حسن۔ کسی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ وہ اسے اس کی اسپینش ماں کے ساتھ دیکھ چکا ہے اور وہ احمد رضا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اگر کسی نے اس کی مذمت کی تو چند ایک نے اس کی تعریف بھی کی۔ ایک مداح نے تو اس کا توہین آمیز خاکوں کی مذمت میں لکھا جانے والا مضمون مختصراً دوبارہ چھاپ کر دعویٰ کیا کہ کوئی مرتد شخص ایسا مضمون نہیں لکھ سکتا۔

''مجھے بیان دینے دو۔ میں ایک پریس کانفرنس کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے الوینا سے درخواست کی۔ ''میں تسلیم کرلوں گا کہ میں ہی احمد رضا ہوں اور کچھ عرصہ کے لئے ضرور اس ملحد کا رفیق رہا ہوں۔ لیکن میں......''

''ہرگز نہیں۔ ہم احمد رضا کی حیثیت سے تمہاری شناخت نہیں چاہتے۔''

''تو کیا میں اب ساری زندگی یہاں چھپا رہوں گا؟''

''کچھ عرصہ بعد دھول بیٹھ جائے گی تو تم واپس چلے جانا۔''

اور اس دھول کو بیٹھنے میں تین سال لگ گئے تھے یا اُسے باور کرائے گئے تھے۔ یہ تین سال اس نے مختلف جگہوں پر گزارے تھے۔ کچھ عرصہ رحیم یار خان رہنے کے بعد وہ اختر مسعود کی درس گاہ میں آ گیا تھا۔ درس گاہ میں زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی محدود رہتا تھا۔ اس نے اختر کے پاس ملکی اور غیر ملکی لوگوں کو دن رات آتے دیکھا تھا۔ کئی نام اور چہرے۔ جن میں کچھ اینکرز، صحافی اور سیاست دان بھی شامل تھے۔

یہاں کیا ہو رہا ہے؟ اُس نے کھوج لگانے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ پھر بھی اسے لگتا تھا، جیسے پس پردہ کچھ نہ کچھ سازشوں کے تانے بانے بُنے جاتے تھے اور شاید کچھ مخصوص افراد کو خاص تربیت بھی دی جاتی تھی۔ وہاں سے اُسے حیات آباد جانے کا حکم ملا تھا اور کچھ دن طیب خان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس کے عقیدت مندوں کو دیکھ کر وہ حیران ہوتا رہا کہ کیسے لوگ ہیں جو اللہ کے بجائے، اس کے بندوں سے اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔

حیات آباد کے قیام کے دوران ہی اس پر انکشاف ہوا تھا کہ طیب خان ڈبل ایجنٹ ہے۔ ''را'' کا بھی اور ''سی آئی اے'' کا بھی۔ وہ نہ افغانی ہے، نہ مسلمان۔

پتہ نہیں کس کس نے کیا کیا بہروپ بھر رکھا تھا؟

خود وہ بھی تو بہروپیا تھا۔ احمد رضا سے احمد حسن اور پھر احمد حسن سے عبداللہ۔

عربی پر دسترس حاصل کرنے اور ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد اسے پہلے انگلینڈ اور پھر لیبیا رچی کے پاس جانے کا حکم ملا تھا۔

وہ جب انگلینڈ سے روانہ ہوا تھا تو اس کے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ یوں تقریباً دو سال اُس نے رچی کے ساتھ لیبیا میں گزارے تھے۔ یہاں وہ عبداللہ تھا۔

اور اب ایک بار پھر وہ پاکستان کے ضلع رحیم یار خان کے چک نمبر 151 میں تھا اور صبح اسے لاہور کے لئے روانہ ہونا تھا۔

''تو اب تم مستقل لاہور میں ہی رہو گے؟'' ارباب حیدر پوچھ رہا تھا۔

''ہاں...... پتہ نہیں۔ یہاں آنے سے پہلے رچی نے کہا تھا کہ مجھے اب اپنے پرانے منصوبے پر ہی کام کرنا ہے۔ یعنی چینل لانچ کرنے کا۔''

''ہاں۔ یہ بہت ضروری ہے اب۔'' ارباب حیدر نے کہا۔ ''میڈیا کے ذریعے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔''
''ہوں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''اپنا چینل ہو گا تو ہمارے کام میں تیزی آ جائے گی۔'' ارباب حیدر نے جیب سے ایک چپٹی شیشی نکالی اور گھونٹ بھرا۔
''پیو گے؟''
''نہیں۔''
اس نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر پھر گھونٹ بھرا۔
''میرے خیال میں تم پہلے ہی کافی پی چکے ہو۔'' احمد رضا نے اس کی طرف دیکھا۔
''تمہیں لگ رہا ہے۔ ورنہ میں نے اتنی نہیں پی، جتنی پینی چاہئے تھی۔ آؤ میرے ساتھ میرے کمرے میں۔ مل کر خوشی سیلیبریٹ کرتے ہیں۔''
''کیسی خوشی؟''
''بھئی تم پاکستان آئے ہو، واپس اپنے وطن۔ اور میں شادی کرنے والا ہوں۔''
''کیا تم پہلے سے شادی شدہ نہیں ہو ارباب حیدر؟''
''ہرگز نہیں۔ میں جس ملک میں رہتا تھا، وہاں شادی کا رواج نہیں تھا۔ اور یہاں آ کر بس فرصت ہی نہیں ملی۔''
''مبارک ہو۔ کس سے شادی کر رہے ہو؟''
''رچی کی منگیتر سے۔''
''کیا؟'' احمد حسن چونکا۔
''کیوں، تمہیں حیرت ہوئی؟''
''ہاں۔ وہ رچی.....'' احمد حسن سنبھلا۔
''رچی کو اب یہاں نہیں آنا۔ اور وہ لڑکی.......وہ ہر روز میرا صبر آزماتی تھی۔ تم نے دیکھا ہے اُسے۔ اسفندیار کی بہن ہے.....کیا نام ہے اُس کا.....اریب فاطمہ۔'' اس نے پھر ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی چپٹی شیشی سے گھونٹ بھرا۔
''اریب فاطمہ.......اُس کے باپ کی سیکنڈ کزن کی بیٹی جو......''
اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر آیا۔ آفت زدہ علاقوں میں پتھروں پر بیٹھے بیٹھے ایک شاہ نے بتایا تھا کہ.....تو کیا ہوا پھر؟ ان تین سالوں میں اریب فاطمہ کی ایک سے شادی کیوں نہیں ہوئی۔
ارباب حیدر اُٹھ کھڑا ہوا اور لہراتا ہوا لاؤنج سے باہر نکلا۔ اور جاتے جاتے مڑ کر اسے دیکھا۔
''دل کہیں وہاں کسی عرب دوشیزہ کے پاس تو نہیں چھوڑ آئے ہو؟'' وہ زور سے ہنسا۔ ''موڈ بنے تو آ جانا میرے کمرے میں......بہت اعلیٰ چیز ہے میرے پاس۔'' وہ پھر ہنسا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔
وہ کچھ دیر یونہی چپ بیٹھا رہا۔
یہ شخص ارباب حیدر اگرچہ تھا تو مسلمان، لیکن اریب فاطمہ کے ہرگز قابل نہ تھا۔
'تو مجھے کیا؟' اس نے کندھے اچکائے۔
'کیا اریب فاطمہ کی جگہ اگر سمیرا ہوتی تو تب بھی تم یہی کہتے؟' دل نے سرگوشی کی تو وہ چونکا۔ 'شاید نہیں۔'
ان تین سالوں میں اس نے اللہ سے صرف ایک ہی دعا کی تھی۔ یا اللہ! سمیرا، امی، ابو جہاں بھی ہوں، اُن کی حفاظت کرنا۔ اور مجھے اتنی مہلت ضرور دینا کہ ایک بار میں ان سے مل سکوں۔
ان تین سالوں میں وہ بہت بار اپنے کمرے میں اکیلا رویا تھا اور توبہ کی تھی۔ سجدے میں گر کر بار بار دعائیں مانگی تھیں۔ معافی طلب کی تھی۔ رحم کی التجا کی تھی۔

حاجی صاحب کہتے تھے، وہ ہر رات رو رو کر، گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں اللہ سے رحم کی اور معافی کی۔ سو اُس نے بھی تین سالوں میں یہی کچھ کیا تھا۔ جب وہ یہاں تھا اور جب وہ رچی کے ساتھ تھا۔

رچی مختلف عرب ممالک میں گھومتا پھر رہا تھا اور وہ اُس کے ساتھ تھا۔ کبھی وہ اکٹھے سفر کرتے اور کبھی الگ الگ۔ جس روز رچی نے کہا تھا کہ وہ امریکہ جا رہا ہے، وہ پاکستان چلا جائے تو اس روز وہ لندن میں تھے۔ اور اس روز اسے لگا تھا، جیسے اللہ نے اس کی دعا سن لی ہے اور اللہ نے اسے معاف کر دیا ہے۔ وہ سمیرا، امی اور ابو سے ضرور ملے گا۔

اس بار وہ لاہور میں خاموش نہیں بیٹھے گا۔ وہ خود تلاش کرے گا اُنہیں۔ اُس نے سوچا تھا۔

'سمیرا تو اب ڈاکٹر بن چکی ہوگی۔ ہوسکتا ہے، اس کی شادی بھی ہوگئی ہو۔'

اس نے پھیلے ہوئے پاؤں سیدھے کئے اور جھک کر جوتے پہننے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ چک نمبر 151 کی اس رہائش گاہ سے نکل کر اسفندیار کی حویلی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ وہاں کیوں جا رہا تھا اور اسے وہاں جا کر کیا کہنا تھا؟ نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی جا رہا تھا۔

❁○❁

ایبک نے انیکسی میں آ کر کھڑکیوں سے پردے ہٹائے۔ باہر موسم خوشگوار تھا۔ اگرچہ ستمبر کا آخری ہفتہ تھا۔ لیکن فضا میں اس وقت ہلکی خنکی تھی۔ حالانکہ دن کے وقت کافی گرمی تھی۔ وہ بہت دنوں بعد یہاں آیا تھا۔ اب بھی اس کا قیام انیکسی میں ہی ہوتا تھا۔ ہاں جن دنوں فلک شاہ اور عمارہ، ملک ہاؤس میں ہوتے تو وہ بھی وہاں منتقل ہو جاتا تھا۔ آج کچھ دیر پہلے ہی وہ عمارہ اور فلک شاہ کو ایئرپورٹ چھوڑ کر آ رہا تھا۔ جواد کسی کام سے لاہور آیا تھا تو انہوں نے بھی واپسی کا پروگرام بنا لیا۔ وہ تقریباً ایک ماہ یہاں رہ کر جا رہے تھے اور احسان شاہ منہ پھلائے ایئرپورٹ پر کھڑے تھے۔

''تمہیں تو بس جانے کی پڑی رہتی ہے ہمیشہ۔''

اور فلک شاہ دھیمے دھیمے مسکرا رہے تھے۔

''یار! ہماری بیٹی ہے وہاں۔ اُداس ہوگئی ہے ہمارے لئے۔''

''تو بیٹی کو بھی ساتھ کیوں نہیں لاتے؟''

''شادی شدہ ہے میری جان!''

اور جواد اُن کی باتوں پر مسکرا رہا تھا۔ ایئرپورٹ پر ہی کرنل شیر دل کا فون آ گیا تھا۔

''تمہاری آنٹی صبح سے کچن میں گھسی ہوئی ہیں۔ یاد رکھنا، وہ تمہارا ماموں وہاں سے ہی تمہیں اغوا کر کے نہ لے جائے۔''

''نہیں انکل! میں گھر ہی آ رہا ہوں۔'' وہ مسکرا دیا تھا۔

''شیر دل کا فون ہوگا۔'' احسان شاہ سمجھ گئے تھے۔ ''یہ شخص تو رقیب ہی بن گیا ہے میرا۔ جب لاہور آتے ہو، بھگا کر لے جاتا ہے دو چار دن کے لئے۔''

اور فلک شاہ نے قہقہہ لگایا تھا۔

اُن کی گفتگو یاد کر کے ایبک کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور پھر کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر وہ دروازہ بھیڑ کر انکل شیر دل کی طرف چلا آیا تھا۔ کھانے کے بعد بھی دیر تک ملکی حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے ناول کا ذکر بھی ہوا۔ اور جب مسز شیر دل نے ہمیشہ کی طرح اس کی شادی کی بات چھیڑی تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ وہ موضوع تھا، جس سے وہ کتراتا تھا۔ انیکسی میں آ کر وہ بہت دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑا باہر آسمان پر پھیلے ستاروں کو دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا، عمارہ اور فلک شاہ کی خواہش کو۔ اُسے انجی کی آرزو کی بھی خبر تھی۔ اور اُسے مسز شیر دل کی محبتوں اور شفقتوں کا احساس بھی تھا جو اُس کے لئے لڑکیاں ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔

وہ سب چاہتے تھے کہ وہ اریب فاطمہ کا خیال دل سے نکال کر کسی بھی لڑکی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا لے۔ لیکن وہ

اریب فاطمہ کو بھلانے پر قادر نہیں تھا۔
اس نے اریب فاطمہ کو کھو دیا تھا اور اسے حاصل کرنے کے لئے کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ مروہ پھپھو نے اسے روک دیا تھا۔
''ایبک! کبھی اس کے گھر مت جانا۔ اگر تم اس سے محبت کرتے ہو تو ایسا کچھ مت کرنا کہ زندگی اس کے لئے مشکل ہو جائے۔''
اور وہ اریب فاطمہ سے محبت کرتا تھا۔ کبھی کبھی دل شدت سے اُسے دیکھنے کی تمنا کرتا تھا لیکن ...کتنا خوش نصیب ہو گا وہ، جس کے نصیب میں وہ ہے۔
وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور جھک کر جوتے اُتارنے لگا۔ تب ہی اُس کا سیل فون بج اُٹھا۔ اُس نے نمبر دیکھا۔
''احمد حسن!'' بے حد حیران ہو کر وہ بڑبڑایا اور فون اُٹھا لیا۔

❁○❁

احمد رضا نے بیڈ روم میں قدم رکھا اور اپنا فون اور والٹ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ باہر روشنیاں جل رہی تھیں۔ گیٹ کے پاس چارپائی پر خان لیٹا ہوا تھا۔ وہ تین سال بعد لاہور آیا تھا اور اسے آئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، جیسا تین سال پہلے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے وہ گیا ہی نہیں تھا۔
گیٹ پر خان چاچا موجود تھا۔ لان، لاؤنج، پورچ سب صاف ستھرے تھے۔ یقیناً یہ ثمینہ حیدر کا کمال تھا۔ اسے گھر میں داخل ہوتے ہی ثمینہ کا فون ملا تھا۔
''سر! صبح آ جاؤں گی۔ کھانا میں نے آرڈر کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد آ جائے گا۔ گھر کی دیکھ بھال ہوتی رہی تھی۔ اُمید ہے، آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔ صبح دوسرے ملازم بھی آ جائیں گے۔''
''تھینک یو ثمینہ! مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اور کھانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ خیر صبح بات کریں گے۔''
اس نے فون بند کر دیا تھا اور اب وہ بیڈ روم میں کھڑا کھڑکی سے لاہور کا آسمان دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔
اور یہ لاہور کی ہوا کی خوشبو تھی۔
لاہور کی خوشبو۔
میرے ملک کی خوشبو۔
اس جیسا ملک دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ وہ اس وقت خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ کتنے سالوں بعد وہ خود کو یوں پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، اب وہ کہیں نہیں جائے گا۔ اور ہر صورت امی، ابو اور سمیرا کو ڈھونڈے گا۔
وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔
ایبک نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس تلاش میں اس کی مدد کرے گا۔
'ایبک!' اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
ایبک اور اریب فاطمہ۔ سب ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ بچھڑ کر پھر مل گئے تھے تو یقیناً وہ بھی ایک دن بچھڑے ہوؤں سے ملے گا۔ اُس کے اندر اُمید جاگی تھی اور ایبک نے اسے یقین دلایا تھا کہ اِن شاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔ اس شام وہ اریب فاطمہ کے گھر کی طرف جاتے جاتے واپس پلٹ آیا تھا۔ اگر انہوں نے کہا کہ تم کون ہوتے ہو ہمارے گھر کے معاملات میں دخل دینے والے؟ پہلے بھی ایک بار تم نے.....اور اریب فاطمہ سے تمہارا کیا تعلق ہے جو......

'نہیں، یہ مناسب نہیں ہے.....تو.....'

'ایبک.....' اُسے ایبک کا خیال آیا تھا۔ اس نے ایبک کی آنکھوں میں اریب فاطمہ کے لئے محبت دیکھی تھی۔ اریب فاطمہ کو اس کے والدین نے پسند کیا تھا۔ لیکن ہوسکتا ہے، اس کی اب تک شادی ہو چکی ہو۔ تین سال کم تو نہیں ہوتے۔ ہوسکتا ہے نہ ہوئی ہو۔ کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟

اور ایبک کا نمبر۔ اپنی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ جب وہ پاکستان آ رہا تھا تو سامان پیک کرتے ہوئے اسے اپنے پرانے والٹ میں وہ پرانی سم نظر آئی تھی، جو پاکستان سے جانے سے پہلے اس نے نکال دی تھی۔ پھینکتے پھینکتے وہ رک گیا تھا۔

اس میں پرانے نمبر تھے۔ شاید کسی کی ضرورت پڑ جائے.....وہ پرانا والٹ کہاں تھا؟ شاید اُس کے بیگ میں۔ اور پھر تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے وہ سم مل گئی تھی۔ اور جب وہ ایبک کو فون کر رہا تھا تو اس نے ارباب حیدر کو اپنے کمرے سے باہر نکل کر گیٹ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور پہلی بار احمد رضا نے اسے اتنا مدہوش دیکھا تھا۔ شاید اس نے بہت زیادہ پی لی تھی۔

بعد میں اریب فاطمہ سے اسے پتہ چلا تھا کہ وہ نشے میں اس کے گھر پہنچ گیا تھا اور صحن میں اسفندیار کے ساتھ بات کرتی اریب فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا تھا۔

''چلو..... یوں بھی تو تم نے میرا ہی ہونا ہے۔ تو آج رات کیوں نہیں؟.....آج میں بہت تنہا ہوں۔ چلو میری جان! میرے ساتھ۔ آج میری پیاس بجھا دو۔''

اسفندیار سادہ تھا۔ اُسے چالاکیاں نہیں آتی تھیں۔ لیکن وہ بے غیرت نہیں تھا۔

''کمینے!'' اُس نے ارباب حیدر کو دھکا دے کر اریب فاطمہ کا ہاتھ چھڑایا تھا۔ ''گندے، غلیظ انسان!''

اندر سے عظمت یار اور شہریار بھی نکل آئے تھے اور ارباب حیدر جو کئی لوگوں پر بھاری تھا، نشے کی زیادتی کی وجہ سے پٹ رہا تھا۔

''چھوڑ دو اسے۔ کہیں مر مرا گیا تو.....'' اریب فاطمہ کے والد نے کہا تھا۔

اور انہوں نے اسے گھر سے باہر پھینک دیا تھا۔ اور اب باپ کے سامنے سر جھکائے شرمندہ کھڑے تھے کہ ارباب حیدر کا انتخاب ان کی ضد پر ہی کیا گیا تھا۔

''میری بہن تو اب ناراض ہوں گی۔ پھر بھی منت کرتا ہوں ان کی۔''

''نہیں۔'' سائرہ کمرے سے نکلی تھیں۔ ''منت کر کے رشتہ دینے پر میری بیٹی کا سر سسرال میں ہمیشہ جھکا رہے گا عظمت کے ابا! وہ ہمیشہ اس کو طعنہ دیں گے کہ تمہارے باپ نے زبردستی رشتہ دیا۔ میری بیٹی میرے جیسی زندگی نہیں گزارے گی۔''

''تو ہے کوئی رشتہ تمہارے پاس؟ میں جلد از جلد اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' ان کی آواز دھیمی تھی۔

''ہاں۔'' سائرہ مسکرائی تھیں۔ ''کل ہی میری مروہ بھابی سے بات ہوئی تھی۔ وہ اپنی بھتیجی کے بیٹے کے لئے اب بھی خواہش مند ہیں۔ آپ جانتے ہیں، اُنہیں فاطمہ سے کتنا پیار ہے۔ اپنی بیٹی کی طرح چاہتی ہیں وہ اُسے۔''

''ٹھیک ہے۔ بلا لو اُنہیں۔''

او پھر سب کچھ فلمی انداز میں ہو گیا تھا۔

ایبک، عمارہ کو لے کر رحیم یار خان آیا تھا۔ مروہ بھی آ گئی تھیں۔ اور سادگی سے نکاح ہو گیا تھا۔

اور جب وہ لاہور کے لئے روانہ ہو رہا تھا تو ارباب حیدر بھی حیات آباد کے لئے تیار ہو رہا تھا۔

''اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ گاؤں کے لوگ جتنی محبت دیتے ہیں، اتنی ہی نفرت بھی کریں گے۔ جانے مجھے کیا

ہو گیا تھا؟ میں نے اتنی کبھی نہیں پی۔ اور پی بھی لوں تو آپے سے باہر نہیں ہوتا۔"
یہ سب قدرت کی طرف سے تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔ اور احمد رضا دل ہی دل میں مسکرایا تھا۔
"تمہارا یہاں رہنا اب ہمارے کاز کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ تمہارا جانا ہی بہتر ہے۔" الوینا نے تائید کی تھی۔
"یہاں کوئی اور آ جائے گا۔ میرا خیال ہے، فی الحال جنید علی کو بلواتے ہیں۔ اچھا ہے اور خالص پاکستانی۔ لوگوں کو جلد متاثر کر لے گا۔"

احمد رضا نے الوینا کی بات پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو خوش تھا کہ اریب فاطمہ بچ گئی تھی۔
ڈور بیل بج رہی تھی۔ وہ اُٹھا۔ ثمینہ نے جو کھانا آرڈر کیا تھا، وہ شاید آ گیا تھا۔ بیڈ روم سے نکل کر وہ لاؤنج میں آیا۔ اندرونی گیٹ پر دستک ہوئی تھی۔ اس نے کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرے سے صرف گیٹ اور گیٹ کے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ اندرونی گیٹ کے پاس کھڑا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے گیٹ کھولا اور حیران ہو گیا۔ باہر طیب خان کھڑا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی وہ اندر چلا آیا۔ احمد رضا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ پینٹ شرٹ میں تھا اور اس کی داڑھی بھی کافی چھوٹی تھی۔ پہلی بار وہ آج اُسے اس لباس میں دیکھ رہا تھا۔
"خیریت ہے طیب خان؟"
"نہیں۔" طیب خان نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ "کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہیں۔ مجھے ایک رات یہاں رہنا ہے۔ کل رات چلا جاؤں گا۔"
"ٹھیک ہے۔ اندر بیڈ روم میں جا کر آرام کرو۔ میں تمہارے لئے چائے بناتا ہوں۔"
طیب خان کو کمرے میں بھیج کر وہ کچن کی طرف جا رہا تھا کہ بیل ہوئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف جنید تھا۔
"طیب خان پہنچ گیا ہے؟"
"ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔ اندر کی روشنیاں بند کر دو اور خان سے کہو کہ بیرونی گیٹ کو لاک کر کے اپنے کوارٹر میں چلا جائے۔ طیب خان کے متعلق ایجنسیوں کو پتہ چل گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا، وہ وہاں سے نکل آیا ہے۔ کل رات اس کے آدمی اسے بارڈر کراس کرا دیں گے۔ تمہارا ٹھکانہ محفوظ ہے۔ لیکن پھر بھی احتیاط اچھی ہے۔ صبح کسی مناسب ٹائم میں وہ تمہارے گھر سے نکل جائے گا کیونکہ باس نہیں چاہتے کہ تم کسی کی نظر میں آؤ۔"
اور احمد رضا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ ابراہیم کے گھر جا کر اس کا نمبر لے سکتا تھا۔ طیب خان کھانا کھا کر جلد ہی سونے چلا گیا تھا اور اس نے جنید علی کی ہدایت کے مطابق گیٹ لاک کروا دیا تھا۔
صبح ناشتے کے بعد طیب خان مسلسل فون پر مصروف رہا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب جنید علی کا فون آیا تھا۔
"تم پچھلے گیٹ سے طیب خان کو لے کر نکلو۔ بی بلاک کے پارک کے پاس میں گاڑی لے کر منتظر ہوں۔"
اس نے طیب خان کو بتایا اور کچھ دیر بعد وہ دونوں گھر سے نکلے۔ جنید کے کہنے کے مطابق وہ پیدل جا رہے تھے۔ سی بلاک سے نکل کر وہ جیسے ہی بی بلاک میں داخل ہوئے، کسی سمت سے گولیاں آئی تھیں۔ احمد رضا نے طیب خان کو لڑکھڑا کر گرتے ہوئے دیکھا اور غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور اسے لگا جیسے اس کے پیٹ میں کوئی انگارہ گھس گیا ہو۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے اوندھا گر گیا۔

❀○❀

سمیرا نے گاؤن اتار کر کرسی پر رکھا اور خود بھی کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ وہ مسلسل چار گھنٹوں سے لیبر روم میں تھی اور کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔ ڈاکٹر عاصمہ نے آج سات سیزیرین نمٹائے تھے اور وہ مسلسل ان کے ساتھ تھی۔ چند ماہ پہلے ہی اسے اور مرینہ کو یہاں ہاؤس جاب ملا تھا۔ اس کی نائٹ تھی۔ لیکن ڈاکٹر عاصمہ نے اسے روک لیا تھا

اور اب اسے مرینہ کا انتظار تھا، جسے ایک بجے آف کرنا تھا۔ آج کل وہ ''الریان'' میں ہی رہ رہی تھی۔

اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور آنکھوں کے سامنے احمد رضا کی تصویر آ گئی تھی۔ تین سال۔ تین طویل سال گزر گئے تھے۔ اب جبکہ تصدیق ہوگئی تھی کہ احمد حسن ہی احمد رضا ہے تو وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ بہت سارے صحافیوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اسے یقین تھا۔ بند آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی۔

'یا اللہ! کب ہماری دعائیں مستجاب ہوں گی۔'

زبیدہ نے ایک بار پھر چپ سادھ لی تھی۔ انہوں نے احمد رضا کے متعلق پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔

''مس سمیرا! میں اندر آ سکتا ہوں؟'' ہمدان دروازے میں سے جھانک رہا تھا۔

سمیرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کبھی کبھار ہمدان آ جاتا تھا اُنہیں لینے۔

''رینا ابھی مصروف ہے۔ آج بہت رش ہے مریضوں کا۔'' اس نے ہاتھوں کی پشت سے نم آنکھوں کو پونچھا۔ ہمدان نے بغور اسے دیکھا۔

''آپ اتنا روتی کیوں ہیں مس سمیرا؟ مانا آپ کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔ کسی ٹھہری ہوئی جھیل کی طرح۔ اگر ان میں جھانکا جائے تو بندہ ڈوب ہی جائے۔ اتنے آنسو مت بہایا کریں کہ ہم ہی ڈوب جائیں۔'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''آپ کو بہت باتیں بنانی آ گئی ہیں۔ رومانی ناول کم پڑھا کریں۔''

''سمیرا!'' وہ یک دم سنجیدہ ہوا تھا۔ ''کیا میں اپنے والدین کو اب آپ کے گھر بھیج سکتا ہوں؟ مجھے ڈر ہے کہ کسی روز پاپا کو غصہ آ گیا تو مجھے سہرا باندھ کر کہیں بھی ہنکا کر لے جائیں گے۔''

سمیرا کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ہمدان نے دیکھا، اس کی آنکھیں اس کی مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ان میں ہمیشہ جیسی اُداسی تھی۔

''سمیرا! میں......'' وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک وارڈ بوائے اندر داخل ہوا۔

''ڈاکٹر سمیرا! ڈاکٹر فیروز نے آپ کو ایمرجنسی میں بلایا ہے۔ بیک وقت کئی زخمی آ گئے ہیں۔ ایک گاڑی اور وین کا حادثہ ہوا ہے اور ایک شخص کو گولی لگی ہے۔''

سمیرا ایک دم کھڑی ہوگئی۔ اس نے ہمدان کو وہاں ہی انتظار کرنے کا کہا اور وارڈ بوائے سے پوچھا۔

''ایمرجنسی میں کون کون ڈاکٹر ہے؟''

''ڈاکٹر حبیب، ڈاکٹر فیروز اور ڈاکٹر عاصمہ ہیں۔ حادثے میں زخمی ہونے والوں کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ ہے۔ چند ایک کی حالت تو بہت نازک ہے۔''

وہ تیزی سے باہر نکلی۔ یقیناً وہاں اس کی ضرورت تھی۔

''مس سمیرا! مجھے اسسٹ کیجئے۔'' ڈاکٹر حبیب نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ آپریشن ٹیبل کے پاس کھڑے تھے۔ ''اس شخص کے پیٹ میں گولی لگی ہے اور بازو پر بھی۔ مجھے پہلے اس شخص کے پیٹ سے گولی نکالنی ہے۔ خون بہت بہہ گیا ہے۔''

سمیرا نے ان کے قریب جا کر جھک کر دیکھا اور اس کی چیخ نکل گئی۔

''رضی!......رضی!'' اس نے ایک دم ہی اُسے جھنجوڑ ڈالا۔ ''رضی! آنکھیں کھولو۔ اِدھر دیکھو۔''

احمد رضا نے ایک دم آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''سمیرا......!'' اس نے ذرا سا ہاتھ اونچا کیا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اس کا ہاتھ نیچے گر گیا اور آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس کے لب ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ شاید وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

''رضی!......احمد رضا!'' وہ دیوانوں کی طرح اس سے لپٹی جا رہی تھی۔ ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا بھائی!......آنکھیں کھولو۔

مجھے دیکھو۔ میں سمیرا ہوں۔''

''اسٹاف! ڈاکٹر سمیرا کو کچھ دیر کے لئے باہر لے جائیں۔'' ڈاکٹر حبیب نے اسٹاف سے کہہ کر سمیرا کی طرف دیکھا۔
''ریلیکس ڈاکٹر سمیرا!''

''ڈاکٹر حبیب! یہ میرا بھائی ہے۔ پلیز اسے بچالیں۔ میرا اکلوتا بھائی......ڈاکٹر پلیز۔''

''بچانے والی ذات اللہ کی ہے ڈاکٹر سمیرا!''

انہوں نے اشارہ کیا اور نرس، سمیرا کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی۔

''نہیں پلیز۔ مجھے اندر ہی رہنے دو۔ کیا پتہ، وہ آنکھیں کھولے اور مجھے......''

''ڈاکٹر سمیرا! پلیز۔''

اسٹاف نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ایمرجنسی زخمیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز، نرسیں سب مصروف
تھے۔ ایمرجنسی کے باہر کچھ زخمیوں کے عزیز بھی تھے۔ پولیس بھی نظر آرہی تھی۔ وہ تھیٹر کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور
اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ رو رہی تھی، جب مرینہ نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شاید کسی نے اسے
بھی حادثے کا بتا دیا تھا۔

''سمیرا! کیا ہوا؟......کیوں رو رہی ہو؟''

''رینا!'' وہ اس سے لپٹ گئی۔ ''میرا بھائی......ہمارا رضی......وہ اندر ہے۔ زخمی ہے۔ پلیز اُس کے لئے دعا کرو۔''

اتنے سارے برسوں میں اس نے مرینہ سے صرف اتنا شیئر کیا تھا کہ اس کا ایک بھائی ہے جو برسوں پہلے ملک سے
باہر چلا گیا تھا اور پھر پلٹ کر نہیں آیا۔

''آٹھ سالوں بعد میں نے اسے دیکھا ہے اور وہ مر رہا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا، اس نے کہا، سمیرا!......وہ
مسکرایا۔'' وہ جیسے ہوش وحواس سے بیگانہ ہو رہی تھی۔ مرینہ نے اسے لپٹا لیا۔ تسلی دی۔

اس روز ہمدان اور مرینہ سارا وقت اس کے ساتھ رہے تھے۔ ڈاکٹر حبیب نے آپریٹ کر کے گولی نکال دی تھی۔
ہمدان نے خون بھی دیا تھا۔ اُسے آئی سی یو میں منتقل کرنے کے بعد ڈاکٹر حبیب نے اسے ہلکی سی سرزنش بھی کی تھی کہ ڈاکٹر
کی حیثیت سے اسے خود پر قابو رکھنا چاہئے تھا۔ اس نے سوری کر لیا تھا۔ لیکن اسے اپنے اوپر اب بھی اختیار نہیں تھا۔ آنسو
اب بھی اس کے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔

مرینہ اور ہمدان اسے بہت ساری تسلی دے کر تھوڑی دیر کے لئے گھر گئے تھے۔ ''ہم ابھی آجائیں گے۔ تم پریشان
مت ہونا۔''

اُس نے سر ہلا دیا تھا اور احمد رضا کے بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھی وہ قطرہ قطرہ خون اُس کی رگوں میں اُترتا دیکھ
رہی تھی جب اس نے آنکھیں کھولیں۔

''رضی!'' وہ بے اختیار اس کی طرف جھکی۔

''سمیرا! تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟......کہاں کھو گئے تھے؟''

''رضی!'' سمیرا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور روتے ہوئے کہا۔ ''تم کھو گئے تھے رضی!''

''امی، ابو کہاں ہیں؟......بہت ناراض ہیں مجھ سے؟'' اس کی آنکھیں بند ہوئیں۔

''وہ راولپنڈی میں ہیں رضی!'' وہ اُس کی طرف جھکی۔

''سمیرا......!'' احمد رضا نے پھر آنکھیں کھولیں۔ ''ابو سے میری سفارش کرنا۔ ان سے کہنا، میں لڑکھڑایا ضرور تھا، لیکن
گرا نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھیوں میں شامل ہونے کا گناہ کیا تھا، لیکن میں نے اسے نبی کبھی نہیں مانا۔ گواہ رہنا
سمیرا! کہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی مانتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے

گا۔ میری موت کے بعد میرے ایمان کی گواہی دینا۔''
احمد رضا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
''سمو! امی، ابو سے میری طرف سے معافی مانگنا۔ میں نے اُنہیں دکھ دیا، تکلیف دی۔ لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس پر اُنہیں شرمندگی ہو۔ کاش! میں مرنے سے پہلے ان سے معافی مانگ سکتا۔'' اُس کی آواز لڑکھڑا گئی اور سانس اُکھڑنے لگی۔
''رضی!......رضی!'' وہ چیخی اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو آواز دی۔
''ڈاکٹر!......ڈاکٹر!''
ڈاکٹر، سمیرا کو پیچھے ہٹا کر چیک کرنے لگا تو وہ حسن رضا کو فون کرنے آئی سی یو سے باہر بھاگی۔

❁○❁

مائرہ لاؤنج میں خاموش بیٹھی تھیں، کسی گہری سوچ میں ڈوبی۔ انہوں نے لاؤنج میں آتی رابیل کو بھی نہیں دیکھا جو مرینہ کے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں دائیں طرف والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور مائرہ سوچ رہی تھیں، پتہ نہیں بابا جان نے عمارہ سے بات کی یا نہیں۔ اُس رات انہوں نے عبدالرحمٰن شاہ سے بات کی تھی۔ وہ کچھ دیر اُنہیں دیکھتے رہے تھے۔
''کیوں بابا جان! کیا ایسا ممکن نہیں ہے؟'' اُنہیں سوچ میں ڈوبے دیکھ کر مائرہ نے پوچھا تھا۔
''ممکن ہو سکتا تھا، اگر درمیان میں یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا کہ میں نے بھی ایسا ہی چاہا تھا۔''
مائرہ نے چونک کر اُنہیں دیکھا۔
'کیا شانی نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے؟' لیکن ان کے چہرے سے وہ کچھ اندازہ نہ کر سکیں۔
'جب ایک پہلی بار الریان آیا تھا تو میرے دل میں خیال آیا تھا ایک بار......دل نے چاہ بھی کی تھی کہ الریان کی کوئی لڑکی مراد محل کی بہو بنتی۔'
''بابا جان! اگر آپ چاہیں، اگر آپ عمارہ سے کہیں تو کیا اب بھی یہ ممکن نہیں ہے؟ یہ میری خواہش ہے اور شانی کی بھی۔''
''کیا شانی نے تم سے ایسا کہا؟'' وہ چونکے تھے اور مائرہ نے نظریں چرا لی تھیں۔
''ہمدان اور رابیل ایک دوسرے سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو میرا دل بار بار ایک کی طرف لپکتا ہے۔''
عبدالرحمٰن شاہ کو مائرہ کی بات پر حیرت ہوئی تھی اور مائرہ نے اس حیرت کو محسوس بھی کر لیا تھا۔ پھر بھی اصرار کیا تھا۔
''بابا جان! آپ بات کریں گے نا؟.....رابی بھی شاید ایک کو ہی پسند کرتی ہے۔ اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔''
مائرہ دبے لفظوں میں کہہ کر اُٹھ کر چلی آئی تھیں۔ لیکن انہوں نے عبدالرحمٰن شاہ کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو نوٹ کیا تھا اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ بابا جان اب ہر ممکن کوشش کریں گے رابی کی خاطر۔ پھر میں دیکھ لوں گی۔ مومی کو بھی اور عمارہ کو بھی۔
اور پتہ نہیں، انہوں نے عمارہ اور مومی سے بات کی تھی یا نہیں۔
مائرہ نے جھکا ہوا سر اُٹھایا اور ان کی نظر رابیل پر پڑی۔
'رابی.....' ان کے دل پر چوٹ پڑی تھی۔
یہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ اس وقت بکھرے بالوں اور شکن آلود کپڑوں کے ساتھ افسردہ سی بیٹھی تھی۔ ایسا حلیہ کب ہوتا تھا اُس کا۔
''رابی!'' وہ اٹھ کر اس کے قریب آئیں۔ ''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟......کل سے کپڑے بھی نہیں بدلے۔''
''مما......!'' رابیل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''میرا دل نہیں چاہتا۔ پلیز آپ پاپا سے اجازت دلوا دیں مجھے

ں۔ایچ۔ڈی کرنے کی۔‘‘
’’میری جان! شادی کے بعد جو دل چاہے، کرتی رہنا۔‘‘ مائرہ نے اس کی پیشانی پر بکھرے بال پیچھے کئے۔’’میں ایبک کے ساتھ ہی تمہاری شادی کرنے کا بھی سوچ رہی ہوں۔‘‘
’’مما.....!‘‘ رابیل نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھا۔
’’میں نے بابا جان سے بات کر لی ہے رابی! اور وہ بات کریں گے عمارہ سے۔ اور پھر جیسا تم چاہتی ہو، ویسا ہی ہو گا۔ بابا جان کی بھی یہی خواہش ہے۔‘‘ انہوں نے اپنا یقین رابیل کے دل میں انڈیل دیا تھا۔
’’کیا بابا جان نے کہا آپ سے ایسا؟‘‘
’’ہاں۔‘‘
رابیل کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اُٹھے تھے اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔
’’مما! آپ کو یقین ہے کہ.....‘‘ رابیل کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔
’’پورا یقین میری جان! تم جاؤ، فریش ہو کر آؤ تو ذرا مارکیٹ چلتے ہیں۔‘‘
رابیل دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتی کھڑی ہو گئی تھی۔ مائرہ کچھ دیر لاؤنج میں کھڑی رابیل کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھتی رہیں اور پھر عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ عبدالرحمٰن شاہ کتاب پڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر کتاب رکھ دی۔
’’آؤ بیٹا! آ جاؤ۔‘‘
’’بابا جان! میں پوچھنے آئی تھی کہ آپ نے بات کی عمارہ اور مومی سے؟‘‘
’’یہ باتیں فون پر کرنے کی نہیں ہوتیں بیٹا! دو تین روز میں وہ لوگ آنے والے ہیں۔ ایبک کی کتاب کی تقریب رونمائی ہے۔ تب بات کروں گا میں عمو سے۔ لیکن......‘‘
’’بابا جان! رابی، ایبک سے محبت کرتی ہے اور وہ اس کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔‘‘
مائرہ بات کر کے وہاں رُکی نہیں تھیں۔ عبدالرحمٰن شاہ کو پریشان کر کے وہ اپنی مسکراہٹ چھپاتی ان کے کمرے سے نکل آئی تھیں۔

❀○❀

آج الحمرا آرٹس کونسل میں ایبک فلک شاہ کے ناول ’’زمین کے آنسو‘‘ کی تقریب رونمائی تھی۔ ہمدان نے تمام انتظامات کا جائزہ لیا۔ چند کرسیوں پر کچھ مہمان بیٹھے تھے، کچھ آ رہے تھے۔ وہ مہمانوں کے استقبال کے لئے ہال کے دروازے کی طرف بڑھا تو ایک جگہ رُکا۔
’’ارے میم پاؤلن! آپ؟‘‘ ہمدان بھی ایبک کے ساتھ کچھ دن فرنچ سیکھنے جاتا رہا تھا۔’’میں نے سمجھا، آپ فرانس واپس چلی گئی ہوں گی۔ بہت محبت تھی آپ کو فرانس سے۔‘‘
’’آہ فرانس..... پیارا فرانس اور پیرس.....خوب صورت پیرس.....اُداس اور غم زدہ پیرس۔ کسی دُلہن کی طرح سجا ہوا، خوب صورت اور اُداس...... میں اسے بہت یاد کرتی ہوں، ہوم دان!‘‘
وہ ہمیشہ اسے ہوم دان کہتی تھیں اور ایبک بہت ہنستا تھا۔
’’لیکن میں یہاں تمہارے پاکستان میں بہت خوش ہوں۔ جب میں وہاں تھی تو مجھے وہاں مہینے میں دو تین بار بھوکا سونا پڑتا تھا اور کبھی شاید زیادہ بار۔‘‘ وہ بڑبڑائی تھیں۔’’مجھے ایبک کا دعوت نامہ پا کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ کہاں ہے وہ؟‘‘
’’آتا ہی ہو گا۔ میں چلتا ہوں۔‘‘ اس نے ہال میں داخل ہوتے سمیرا اور احمد رضا کو دیکھ لیا تھا اور ان کے استقبال کے لئے بڑھا۔
’’کیسے ہیں آپ احمد رضا؟‘‘

''فائن.....لیکن ابھی کچھ زخم کچے ہیں اور بھرنے میں وقت لگے گا۔'' اُس نے ذومعنی بات کی۔
ہمدان نے مسکرا کر اگلی نشستوں کی طرف اشارہ کیا۔ سمیرا کی آنکھوں میں آج اُداسی کے رنگ نہ تھے بلکہ آنے والی خوشیوں کے رنگ جھلملا رہے تھے۔ احمد رضا لوٹ آیا تھا اور ہمدان کے والدین اس تقریب کے بعد ان کے گھر آنے والے تھے۔

احمد رضا نے پریس کانفرنس کر کے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ اسماعیل سے وقتی طور پر متاثر ضرور ہوا تھا۔ لیکن اُس نے اُسے نبی تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ لیکن اب لوٹ آیا ہے اور سچے دل سے ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔

طیب خان کے متعلق اخبار میں چھوٹی سی خبر چھپی تھی کہ افغان مجاہد کسی دہشت گرد کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ جبکہ پاس سے گزرنے والا ایک راہ گیر بھی زخمی ہو گیا تھا۔ احمد رضا کا کہیں نام نہ تھا۔
الوینا نے فون کیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ ان کے بارے میں اگر اس نے کوئی ایک لفظ بھی کسی سے کہا تو انجام وہ جانتا تھا۔

اُسے انجام کی پروا نہیں تھی۔ حسن رضا نے اس کا یقین کر لیا تھا۔ اسے معاف کر دیا تھا۔ اب اگر راہ چلتے کوئی گولی آ کر اس کی زندگی ختم کر دیتی تو اسے اپنے مرنے کا کوئی دکھ نہیں تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ، جن کے جال سے وہ نکل آیا تھا، وہ معاف نہیں کرتے۔ شاید کسی گولی پر اس کا نام بھی لکھا جا چکا ہو۔ لیکن ابھی سب ٹھیک تھا۔ اس کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں اور جتنی بھی زندگی تھی، اسے وہ ملک وقوم کے لئے وقف کر چکا تھا۔
ہال آہستہ آہستہ مہمانوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ عمر، زبیر اور عادل، ہمدان کے ساتھ ہی مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے، جب رابیل اور مائرہ نے ہال میں قدم رکھا۔ رابیل آج بڑے دنوں بعد بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔ عمر اور زبیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ ان دونوں کے آنے کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ عمر کو بے تحاشا خوشی ہوئی۔
''رابی آپی! ادھر اگلی نشستوں پر۔'' عمر نے سرگوشی کی تو اس نے ایبک کو دیکھنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا اور عبدالرحمٰن شاہ کے پاس والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''ایبک نہیں آیا؟''
''آتے ہی ہوں گے ابھی۔'' عمر نے جواب دیا۔
''ہاں بھئی۔ باراتی تو آ گئے ہیں۔ دولہا کی کمی ہے بس۔'' مصطفیٰ شاہ مسکرائے تھے۔
''ایبک کہاں رہ گیا بھئی؟ کیا آپ کے ساتھ ہی بہاول پور سے نہیں آیا تھا؟'' عثمان شاہ نے پاس بیٹھے فلک شاہ سے پوچھا۔ وہ لوگ رات ہی بہاول پور سے آئے تھے اور ان کا قیام کرنل شیر دل کے گھر پر تھا۔
''لو بھئی۔ دولہا بھی آ گیا اور دلہن بھی۔''
کرنل شیر دل نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور قہقہہ لگایا۔ رابیل نے یک دم رخ موڑ کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔
ایبک، اریب فاطمہ کا ہاتھ تھامے سیٹوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ اریب فاطمہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔
رابیل کو ایک دم کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔ یہ اریب فاطمہ تین سالوں بعد ایبک کے ساتھ؟
اُسے اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہوا۔
ابھی کچھ دیر پہلے وہ کتنی خوش تھی۔ مائرہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ آج رات جب وہ لوگ ملک ہاؤس آئیں گے تو بابا جان ان سے بات کریں گے۔
اور اب عمارہ، عبدالرحمٰن شاہ کے سامنے اریب فاطمہ کا ہاتھ تھامے کھڑی تھیں۔ ایبک اسٹیج کی طرف بڑھ گیا تھا۔
''بابا جان! یہ اریب فاطمہ۔ ہماری بہو...... چند دن قبل ہی نکاح ہوا ہے ایمرجنسی میں۔ اب ولیمہ دھوم دھام سے

کریں گے اِن شاء اللہ۔ ایک سرپرائز دینا چاہتا تھا، اس لئے اطلاع نہیں کی۔"

عبدالرحمٰن شاہ نے بے اختیار پاس بیٹھی رابیل کو دیکھا، جس کی آنکھیں ایک دم بجھ گئی تھیں اور عبدالرحمٰن شاہ کے چہرے پر سکون اُتر آیا تھا۔ برسوں سے جو ان کے دل میں ایک ناکردہ جرم کی پھانس چھپی تھی، اس میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ سائرہ کی بیٹی ان کے خاندان کا حصہ بن گئی تھی۔ انہیں لگا جیسے ان کے اس جرم کا کچھ کفارہ تو ادا ہو گیا ہو۔

"دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا آبی بھائی ریبا آپی سے ہی شادی کریں گے۔ اور میں کبھی غلط نہیں کہتی۔"

رابیل کے پیچھے بیٹھی عاشی نے مرینہ کے کان میں سرگوشی کی جو سرگوشی ہرگز نہ تھی۔ رابیل کا جی چاہا وہ مڑ کر عاشی سے کہے۔ 'ہاں، تم نے صحیح کہا تھا' لیکن اُس کے اندر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ ضبط کئے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کو سہہ رہی تھی۔ اس نے پاس بیٹھی مائرہ کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ مائرہ کا چہرہ چیخ رہا تھا۔ انہوں نے کرسی کے ہتھے پر رکھے رابیل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ان کی بیٹی کے مقدر میں جو نارسائی آئی تھی، اس کے لئے وہ قصوروار تھیں۔ اُن کے جرم کی سزا اُن کی بیٹی کو ملی تھی۔

بلاشبہ جھوٹی تہمت لگانے والا گناہ گار ہے۔

آج پہلی بار مائرہ نے دل میں پچھتاوا محسوس کیا تھا۔ پہلی بار انہیں احساس ہوا تھا کہ انہوں نے جو کیا تھا، غلط کیا تھا۔ محبتیں اس طرح حاصل نہیں کی جاتیں۔

وہ مجرم تھیں۔ عمارہ اور موی کی۔

اور الریان کے ہر فرد کی اور اپنی بیٹی کی بھی۔

انہوں نے رابی کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کی۔ شاید اس طرح وہ اسے حوصلہ اور تسلی دینا چاہتی تھیں۔ لیکن نہیں جانتی تھیں کہ محبت کھو دینے کا دکھ لفظوں سے کم نہیں ہوتا اور کوئی حرفِ تسلی، رابیل کا درد کم نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ رابیل نے ایک سے محبت کی تھی اور محبت کبھی نفرت میں نہیں بدل سکتی۔ جبکہ انہوں نے فلک شاہ کو صرف جیتنا چاہا تھا اور ہارنے پر نفرت کرنے لگی تھیں۔

ایک اسٹیج پر بیٹھ چکا تھا۔ دو تین سینئر ادیب بھی وہاں بیٹھے تھے۔ ہمدان روسٹرم کے پیچھے کھڑا کتاب کا تعارف کروا رہا تھا۔ دو تین لوگوں نے کتاب پر تبصرہ کیا۔ اس کے بعد ہمدان نے کتاب کے چیدہ چیدہ پیراگراف پڑھے اور اب وہ آخری صفحہ پڑھ رہا تھا۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف ہمدان کی آواز گونج رہی تھی۔

"اور حورعین اپنی سفید اوڑھنی سنبھالتی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں چلتی ہوں۔"

باہر کہیں گولیاں چلنے کی آواز آئی تھی۔

"لگتا ہے، کہیں خون کی برسات ہوئی ہے۔" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

ہاں، ہاتھ اُٹھاؤ کہ قیامت کی گھڑی ہے۔

"رُکو حورعین!......ابھی رُک جاؤ۔"

حورعین نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اُس کی غزال آنکھوں میں سہم تھا اور اُس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔

"میرے شہروں سے یہ خون کی برسات کب ختم ہوگی شاعر؟" اُس نے رخ موڑا اور تیزی سے آفس سے باہر نکل گئی۔

"رُکو حورعین!.....میری بات تو سن لو......میں تمہارے گھر آنا چاہتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کچھ اتا پتا بتاؤ۔"

وہ فٹ پاتھ پر رک گئی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا اس کے قریب آیا تھا۔

"حورعین پلیز!..... بتاؤ، کیا مجھ سے شادی کرو گی؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک دم رخ موڑ کر چلنے لگی۔ میرا جی چاہا، میں ناچنے لگوں۔ میرے اردگرد جیسے رنگ ہی رنگ اُتر آئے تھے۔

یہ اتنی خوب صورت دنیا۔ میں نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ سالِ نو کا یہ پہلا دن میرے لئے ہر دن سے زیادہ حسین ہے۔

حورعین خراماں خراماں جا رہی تھی۔

''حورعین! رُکو۔''

میں اُس کی طرف لپکا۔ وہ مڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ اُس کی ہر دم بھیگی رہنے والی آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ میں وارفتگی سے اُسے دیکھ رہا تھا کہ یک دم فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ ہوئی۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے قریب سے گزرتے موٹر سائیکل سوار کو دیکھا، جس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ اور پھر حورعین کو، جو لڑکھڑائی تھی۔

''حورعین!''

میں چیخ کر اُس کی طرف بڑھا۔ اُس کی سفید اوڑھنی خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ میں اُسے بانہوں میں سنبھالے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اُس کا سر میری گود میں تھا۔

''حورعین!...... حمسی!...... آنکھیں کھولو۔''

میں اُسے دیوانہ وار پکار رہا تھا اور میرے اردگرد لوگ اکٹھے ہو رہے تھے اور اس کے ساتھ دوسرے زخمی ہونے والوں کو دیکھ رہے تھے۔

''پھر زمین روتی ہے
پھر لہو کا اِک دریا
شور ہے قیامت کا
سالِ نو کا اِک تحفہ
صرف ایک گولی ہے
پھر زمین روتی ہے
پھر لہو کا اِک دریا بہہ رہا ہے بستی میں''

حورعین کے لب ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ پھر اُس کے لب ساکت ہو گئے اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں دیوانہ وار اُسے پکارتا تھا۔ لیکن میری آواز اس کے کانوں تک نہیں جاتی تھی۔ اور زمین کے آنسو، سمندر کے نمکین پانی میں اکٹھے ہوتے تھے۔

(تمت بالخیر)